اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سورۃ البقرۃ آیت 189 تا 286

سورۃ ال عمران

(جلد۔۲)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سورۃ البقرۃ آیت 189 تا 286
سورۃ ال عمران

(جلد۔۲)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

297.14
109507

نام کتاب : تفسیر روح القرآن
مؤلف : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر : ادارہ هُدًى لِلنَّاسِ
کمپوزنگ : زاہد حسین
پرنٹرز : محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت : فروری 2011ء
تعداد : 1000
قیمت : 700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343-مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون: 042-35426800
۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔
۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔
۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔
۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ فون: 042-37248676-37320961
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074
۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔
موبائل: 0300-8485030۔ فون: 042-37225030

Marfat.com

صاحبِ تالیف

نام : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دار العلوم ربانیہ)

ولادت : 4 اپریل 1940ء

تعلیم : ا......حافظِ قرآنِ مجید
۲......تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
۳......فاضل عربی، پنجاب بورڈ لاہور
۴......بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۵......ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۶......پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۷......فاضل مدینہ یونیورسٹی (مدینہ منورہ سعودی عرب)

تدریس : ا......ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
۲......وزیٹنگ پروفیسر ھیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
۳......وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
۴......وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
۵......وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سنٹر برائے ایم فل

خطابت : ا......خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
۲......خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد
۳......خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

مناصب : ۱ ...... چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۲ ...... چیئرمین ادارہ ھُدًی لِلنَّاسِ ،لاہور

تالیفات : تفسیر روح القرآن (12 جلدوں میں)
خطباتِ صدیقی (3 جلدوں میں)
معرفت حق کا سفر (الاسماء الحسنٰی کی شرح)

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ ھُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

فہرست

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ	1
اَهِلَّةِ کا مفہوم	3
ایک بدعت کا ازالہ	5
دین سے دوری، فہمِ دین سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے	5
حج کے بعد جہاد کے ذکر کا سبب	6
فتنہ سے مراد	8
اسلامی انقلاب کا ہدف	9
عرب قوم کی خصوصیت	10
اشہرِ حرم کی حیثیت	12
اعتداء کا مفہوم	13
جہاد اور انفاق باہم لازم وملزوم ہیں	13
سابقہ آیات کا خلاصہ اور ربط	15
حج کی فرضیت	16
احکامِ حج وعمرہ	16
احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے تو اس کا حکم	17
احرام سے نکلنے کی شرعی صورت، حلق یا قصر کی وضاحت	18
حالتِ احرام میں کوئی بال منڈوانے پر مجبور ہو جائے تو کیا کرے؟	19
اشہرِ حج میں حج وعمرہ کو جمع کرنے کے احکام	19
میقات کا مفہوم	20
حج اور عمرہ کو جمع کرنے کا شکرانہ	20
تمتع و قِران	21
مَعْلُوْمٰتٌ کا مفہوم	25
حج میں رَفَث، فسوق اور جدال کی ممانعت	25
رَفَث کا مفہوم	26

Marfat.com

فسوق کا مفہوم 26
جدال کا مفہوم 27
دورِ جاہلیت کی ایک رسم کی تردید 27
حج میں حصولِ رزق کی اجازت 28
عرفات اور مشعر الحرام کا تعارف 29
ذکر اللہ کا صحیح طریقہ 30
ایک رسم بد کی اصلاح 31
مزید اعمال بد کی اصلاح 33
ذہنی تصورات کی اصلاح 34
پسندیدہ دعا 35
کردار میں دو عملی نفاق کو جنم دیتی ہے 41
کردار سے خالی گفتار کے غازی ہوتے ہیں 41
تَوَلّٰی کا مفہوم 42
فساد فی الارض کا مفہوم 43
تکبر، ہدایت کے راستے کی رکاوٹ 45
اسلامی قافلے کا اصل اثاثہ 46
سِلْم کا مفہوم 47
منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت 47
طاغوت سے مراد 48
کَآفَّۃً کا مفہوم 49
اسلام مکمل نظام حیات ہے 50
اتمام حجت کے بعد 51
بینات کا مفہوم 51
معتبر ایمان کیا ہے؟ 53
روئے سخن کس کی طرف ہے 56
بنی اسرائیل کو بطورِ عبرت پیش کیا جا رہا ہے 56

Marfat.com

حیات دنیا کی تزئین کا مفہوم 58
بے حساب رزق کا مفہوم 59
ایک فکری غلطی کا ازالہ 60
انبیاءِ کرام کی دعوت کے دو مقاصد 61
انسانی گمراہی کا اصل سبب بَغْیًا بَیْنَھُمْ 63
مسلمانوں کو اپنی حیثیت کے ادراک کی ہدایت 64
مسلمانوں کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی قربانی کی طالب ہے 66
انفاق کے سلسلہ میں سوال کا جواب 69
جہاد و قتال کا مفہوم 71
اشہرِ حرم سے متعلق سوال اور اس کا جواب 75
اشہرِ حرم سے متعلق اسلام کا موقف 77
فتنہ کی حقیقت 78
مشرکین کے آئندہ کے عزائم 80
مسلمانوں کو مناسب تنبیہ 80
مرتد کے اعمال ضائع ہو جانے کا مفہوم 81
ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت اور جہاد ضروری ہیں 82
خمر اور قمار سے متعلق سوال کا مفہوم اور منشأ سوال 83
حرمتِ خمر کی تاریخ اور تدریج 85
قمار کی تعریف اور تفصیل 87
قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات 88
سوال میں تکرار کی وجہ 90
عفو کا مفہوم 90
یتیموں سے متعلق سوال کی نوعیت 91
سوال کا جواب 92
مشرکات سے نکاح کی ممانعت 93
یہاں مشرکات اور مشرکین سے مراد کون ہیں؟ 93

Marfat.com

شادی بیاہ کے اثرات 94
سوال کا پس منظر 96
سوال کا جواب 97
یَطْهُرْنَ اور تَطَهَّرْنَ کا مفہوم 99
مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ کی وضاحت 99
مومن کے ظاہر و باطن کی پاکیزگی مطلوب ہے 100
زوجین کے تعلق کی حقیقت اور اس کے تقاضے 100
بیویوں کے حرث ہونے نے خاندانی منصوبہ بندی کی جڑ کاٹ دی ہے 101
معاشرے میں قسم کی اہمیت 103
قسم پر دو حوالوں سے تنقید 103
قسم کی اقسام 104
ا۔ یمینِ لغو 104
۲۔ یمینِ غموس 105
۳۔ یمینِ منعقدہ 105
ایلاء کی وضاحت 105
مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے 107
اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ 107
عدت گزرنے سے پہلے عقد ثانی کی ممانعت کی حکمت 108
طلاق دینے کا صحیح طریقہ 108
شوہر کو عدت کے دوران رجوع کا حق 109
زوجین کے تعلقات میں لگاؤ کا اصلی سبب 109
اسلام میں نکاح کی حیثیت 112
عربوں کی عادتِ بد اور آیت کا شانِ نزول 115
معروف کا مفہوم 116
تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ کا مفہوم 116
شوہر بیوی سے عطیات و تحائف واپس نہیں لے سکتا 117

Marfat.com

صورتِ مستثنیٰ، خلع کا بیان	117
تیسری طلاق کے احکام	120
ایک ساتھ تین طلاق دینا سخت گناہ ہے	121
ایک ساتھ تین طلاقیں بھی تین ہی واقع ہوتی ہیں	122
ایک غلط فہمی کا ازالہ	122
حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے پیدا ہونے والے دو سوال اور ان کا جواب	124
معروف کی مزید وضاحت	126
طلاق کے بعد بیوہ یا مطلقہ پر ممکنہ مظالم کو روکنے کے لیے ہدایات اور احکام	130
آیت کا شانِ نزول	132
اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کا مفہوم	132
ان معاشرتی ہدایات پر عمل کے لیے ایمان باللہ وایمان بالآخرت ضروری ہے	133
یہ ہدایات معاشرے کو اخلاقی فساد سے محفوظ رکھنے کا سب سے مؤثر نسخہ ہیں	133
رضاعت کے مسائل	134
بیوہ کی عدت اور اس کی طوالت کی حکمت	138
مرحوم شوہر اور بیوہ کے جذبات کا احترام لازم ہے	139
پیغامِ نکاح میں بعض نزاکتوں کی پاسداری	140
خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کے اسباب	143
طلاق قبل الدخول اور مہر مقرر نہ ہونے کی صورت میں مہر کے احکام	144
طلاق قبل الدخول اور مہر مقرر ہونے کی صورت میں مہر کے احکام	145
یعفون کا مفہوم	145
سابقہ آیات سے ربط	147
اَلصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی سے کیا مراد ہے؟	148
صلوٰۃ الخوف	150
پیغمبر کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے	150
بیوہ کے لیے وصیت کا عبوری حکم	151
ربطِ آیات	155

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ کا مفہوم 156
واقعہ کیا تھا؟ تین نقطہ ہائے نظر 156
قتال کا حکم 162
انفاق کا حکم 162
بنی اسرائیل کا مطالبہ 164
مَلِکْ کا مفہوم 164
طالوت کا تقرر اور بنی اسرائیل کے اعتراضات 166
تابوتِ سکینہ کی حقیقت 168
فوج کی ثابت قدمی کا امتحان 173
یہ قول کس کا ہے؟ 174
فتح و شکست کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں 174
راہِ حق میں نکلنے والوں کی دعا 176
اصل قوت اللہ پر بھروسہ ہے 177
حضرت داؤد کا حیرت انگیز کارنامہ اور آپ کی پر افتخار زندگی کا آغاز 178
حکمت و دانش 179
فلسفۂ جہاد اور اس کی ضرورت 179
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کی رسالت کا اثبات 181
تورات کے تضادات کی اصلاح 181
اہلِ کتاب پر تنقید 184
ایک اشتباہ کا ازالہ 186
ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی 186
اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ 194
سِنَةٌ ...... نَوْمٌ 194
شفاعت کی وضاحت 195
شفاعتِ کبریٰ 197
شفاعت کا غلط تصور اور اس کی تردید 197

Marfat.com

کرسی کا مفہوم	198
اقتدارِ الٰہی کی ہمہ گیری	199
دین کا مفہوم	200
اِکْرَاہ فِی الدِّیْن کا مفہوم	200
طاغوت کا مفہوم	202
ایک غلطی کا ازالہ	204
ولی کا مفہوم	205
الذی سے کیا مراد ہے؟	209
مابہ النزاع چیز کیا تھی؟	209
ظالم کا مفہوم	211
الذی سے کون مراد ہے؟	212
قریہ سے کیا مراد ہے؟	213
سوال کی نوعیت	213
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کی نوعیت	215
ایک غلطی کی تردید	216
ربطِ کلام	221
انفاق پر زور دینے کا سبب	221
فی سبیل اللہ کا مفہوم	223
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کا مفہوم	224
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ کا مفہوم	225
انفاق کرنے والوں کے لیے نمونہ	227
احساسات کی اصلاح	228
صفوان. صلداً کا معنی ومفہوم	229
تمثیل کی وضاحت	230
انفاق......تربیت اور تشکیل کردار کا ذریعہ بھی ہے	231
تمثیل کی وضاحت	233

Marfat.com

اعصار کا مفہوم 234
تمثیل کی وضاحت 234
ربطِ کلام 235
طیبات کا مفہوم 236
غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ کا مفہوم 238
انفاق کے موانع 238
فقر کا خوف اور بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہونا 239
یأمر کم بالفحشاء کا مفہوم 241
حکمت کا مفہوم 243
نذر کی تعریف 244
پوشیدہ اور علانیہ انفاق کے دو طریقے 245
آیت کریمہ کے دو مفہوم 246
انفاق کا بہترین مصرف 248
الحاف کا مفہوم 249
ربطِ کلام 252
تُعۡرَفُ الۡاَشۡیَآءُ بِاَضۡدَادِهَا 253
سود کھانے والوں کا انجام 253
سود اور ربا کا مفہوم 255
عہد نبوت کو سمجھنے میں کوتاہی 256
ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی تھا 256
عہد صحابہؓ میں بینکاری کی مثال 257
بینکنگ انٹرسٹ بھی حرام ہے 257
تجارت اور سود میں فرق 258
تجارت اور سود کے درمیان اصولی فرق کی وجہ 259
سود کے نقصانات 260
مشارکت 262

Marfat.com

اجارہ 262

مرابحہ 262

امرہ الی اللہ کا مفہوم 263

صدقات کے بڑھنے اور سود کے گھٹنے کا مفہوم 264

سود کے مضر اثرات مختلف پہلوؤں سے 265

معاشی نقطۂ نظر سے 266

کفار اثیم کا مفہوم 268

سود چھوڑنے کا قطعی اور آخری حکم 269

سودخوروں کو الٹی میٹم 270

عہد نبوت میں سودی کاروبار کے بارہ میں ایک غلط دعویٰ اور اس کا جواب 272

انسان معاملات میں بے احتیاطی کرتا ہے 277

معاملات و معاہدات میں نزاع سے تحفظ کے لیے ہدایات 278

رہن کی اجازت 281

مرہونہ چیز سے مرتہن کو فائدہ اٹھانے کی اجازت 282

خاتمۂ سورۃ کی آیات 283

بنیادی عقیدہ 284

اللہ کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے 285

آخری دو آیتوں کی فضیلت 286

اسلامی عقائد 286

مسلمانوں کا طرزِ عمل 287

جملہ معترضہ 288

☆☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ
قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا
الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ
مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ
الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ
فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ
الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹۳﴾
اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ
اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ۪

Marfat.com

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ
اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ
اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ
فَاِذَآ اَمِنْتُمْ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ
سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ
اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

رکوع: ۲۴۔ (لوگ تم سے اَھِلَّةِ کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو! یہ لوگوں کے فوائد کیلئے اور حج کے اوقات ہیں اور نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ نیکی اس کی ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے۔ تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ ○ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے مت بڑھو بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○ اور قتل کرو ان کو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا تھا اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے ○ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ○ اور ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو کر رہ جائے اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام ان

Marfat.com

کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں O ماہِ حرام، ماہِ حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری مختلف چیزوں کا بھی قصاص ہے تو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر اس کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو، بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے O اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کیلئے پس اگر تم گھیر لئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے اور اپنے سروں کی حجامت نہ کرو جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اسے تکلیف ہو اسکے سر میں تو وہ بدلہ دے روزے یا خیرات یا قربانی پھر جب تم مامون ہو جاؤ تو جو شخص فائدہ اٹھائے عمرہ کو حج سے ملا کر تو اس پر ہے جو اسے قربانی میسر ہو تو پھر جو شخص قربانی نہ پائے تو تین روزے رکھے حج کے دنوں میں اور سات روزے جبکہ تم لوٹو یہ پورے دس ہوئے یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قرب و جوار میں نہ رہتے ہوں اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے) (آیت: ۱۸۹ تا ۱۹۶)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O (۱۸۹)

(لوگ تم سے اَهِلَّةِ کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو! یہ لوگوں کے فوائد کیلئے اور حج کے اوقات ہیں اور نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ نیکی اس کی ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے۔ تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)

اَهِلَّةِ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کا ایک ایک لفظ گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو لوگوں کے سوال کو دیکھئے! سوال اَهِلَّةِ کے بارے میں ہے۔ اَهِلَّةِ ''ھلال'' کی جمع ہے اور ہلال ہر مہینے کے پہلی تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں۔ جبکہ وہ ایک شاخ کی طرح باریک ہوتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے بدر بن جاتا ہے۔ اگر تو سوال صرف ھلال کے بارے میں ہوتا تو یقیناً اس میں گھٹنے بڑھنے کا تصور شامل نہ ہوتا کیونکہ پہلی رات کا چاند ہلال ہے اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے اور وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہلال کے نام سے نکلتا جاتا ہے۔ جمع جس طرح افراد کی تعداد پر دلالت کرتا ہے اسی طرح بعض دفعہ تغیرات پر بھی دلالت کرتا ہے۔ تو اَهِلَّةِ کو جمع لا کر معلوم ہوتا ہے چاند کے تغیرات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ اور آفتاب کی طرح ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا؟ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق سوال سائنسی اور فلکیاتی پہلو سے نہیں تھا بلکہ اس کی افادیت کے پہلو سے تھا۔ اس میں جو مصلحت مضمر ہے اس

Marfat.com

کے پہلو سے تھا اور بطورِ خاص ان اوہام وخرافات کے بارے میں تھا جس میں عرب بری طرح بتلا تھے۔چاند سے اچھے یا برے شگون لینا،بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا،کسی تاریخ کو سفر کیلئے اور کسی کو ابتدائے کار کیلئے اور کسی کو شادی بیاہ کیلئے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی یا بیشی اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر بھی پڑتا ہے۔چاند کے زیر اثر مدوجزر سے انہوں نے بعض عقائد وابستہ کر رکھے تھے ان کے کاہن چاند اور ستاروں کی حرکت،گردش اور ان کی منزلوں سے عجیب وغریب نتائج اخذ کرتے تھے اور اسی سے لوگوں کو آنے والے حالات کی خبر دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔مظاہر قدرت اور مظاہر فطرت کی پوجا تو عام طور پر جاہل قوموں میں موجود رہی ہے اور وہ کسی نہ کسی حوالے سے چاند اور سورج کو اپنی زندگیوں کے حالات پر اثر انداز سمجھتے رہے ہیں۔مسلمان دورِ جاہلیت میں چونکہ ان باتوں میں مبتلا رہ چکے تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے انہیں باتوں کو سمجھنے کیلئے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا۔

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں نہیں تھا کیونکہ اگر یہ سوال چاند یا اس کی مختلف تبدیلیوں کے حوالے سے ہوتا تو پھر ہلال کو جمع نہ لایا جاتا بلکہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ کی بجائے عن الھلال ہوتا۔ان کا خیال ہے کہ جمع کی صورت میں اس لفظ کا استعمال مہینوں ہی کیلئے معروف ہے۔مزید یہ کہ اس پر ال اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں کے بارے میں کیا جارہا ہے اور سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے یہ سوال اشھر حرم اور ان کے احکام وآداب سے متعلق ہے۔بات ان کی بھی غلط نہیں اس عاجز کا گمان تو یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں دونوں باتوں کی گنجائش موجود ہے کہ سوال چاند کی مختلف تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے اعتقادات کے بارے میں بھی ہے اور اشھر حرم کے بارے میں بھی۔چنانچہ نہایت جامعیت اور معجزانہ اختصار کے ساتھ اس کا جواب دیا گیا ہے۔

قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ''کہہ دو!یہ لوگوں کے فوائد کیلئے اور حج کے اوقات ہیں''۔دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہوسکتا ہے ''یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے''۔ مَوَاقِیت، میقات کی جمع ہے۔اس کا معنی ''اوقات'' بھی ہوسکتا ہے اور ''اوقات بتانے کا ذریعہ'' بھی۔اس جملے میں نہایت گہرائی ہے۔پہلی بات تو یہ فرمائی جارہی ہے کہ تم نے چاند کے بارے میں ایسے ایسے اعتقادات بنا رکھے ہیں کہ گویا تم نے اسے الوہیت کے مقام پر فائز کردیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہاری خدمت کیلئے مقرر کیا ہے۔جہاں اس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ تمہارے پھلوں میں مٹھاس پیدا کرے،تمہارے غلے میں گداز پیدا کرے،تمہارے سمندروں میں مدوجزر کی کیفیت پیدا کرکے سمندر کی تہہ سے تمہارے لئے موتی اچھالے،اسی طرح اسے تمہاری خدمت کیلئے ایک قدرتی جنتری بھی بنایا ہے جو آسمان پر نمودار ہوکر دنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔وہ جس طرح تمہارے لئے نظر افروزی کا سامان ہے،اداس دلوں کیلئے مرہم ہے اور حسن کا استعارہ ہے،اسی طرح وہ برابر تمہیں اوقات کی تبدیلی کی اطلاع دیتا رہتا ہے۔مسلمانوں کا ہجری کیلنڈر تمام تر اسی پر انحصار کرتا ہے۔ہماری عبادات کا نظام قمری حساب سے چلتا ہے۔اسی طرح ہمارے حج کے طریقے اور اس کے ایام کا تعین بھی اسی سے ہوتا ہے۔جو چاند اس طرح تمہاری ڈیوٹی پر لگا ہوا ہے اور تمہارے خادم کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دے رہا ہے اور اسی خدمت کے سلسلے میں وہ فراخیِ افلاک میں محوِ گردش رہتا ہے۔تم سے بڑھ کر کم عقل کون ہوگا؟ کہ تم نے اسے خادم سمجھنے کی بجائے نہ صرف اپنا مخدوم سمجھا بلکہ اپنا معبود بنالیا۔

دوسری بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ انہی مہینوں کے تعین میں جو قمری حساب سے ہوتے ہیں تمہارے لئے مفادات کا ایک جہان مضمر ہے۔وہ اس طرح کہ اسی چاند کی مدد سے تم اشھر حرم کا تعین کرتے ہو جو چار مہینے ہیں۔یعنی رجب،ذی القعد،ذی الحج اور محرم۔ان چار مہینوں میں پورے جزیرۂ عرب میں قبائل کی باہمی لڑائیاں رک جاتی تھیں۔عرب اس اعتقاد میں بندھا ہوا تھا کہ اشھر حرم میں لڑنا حرام

Marfat.com

ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ لوگ آزادانہ مالِ تجارت لے کر نکلتے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے اور بے حد و بے حساب مالی مفادات حاصل کرتے ۔لڑائیاں رک جانے اور راستے محفوظ ہو جانے کے باعث وہ پوری طرح تجارت کرنے میں آزاد تھے اور دوسرا بڑا فائدہ یہ تھا کہ انہیں مہینوں میں حج ہوتا اور رجب میں عام طور پر عرب عمرے کے لئے آتے اور اپنے ساتھ فراوانی کے ساتھ مالِ تجارت بھی لے کر آتے۔جس کے نتیجے میں مکہ کے قرب وجوار میں تجارتی میلے کا سماں پیدا ہو جاتا اور مکہ کے بازار قسم قسم کے سامان سے لد جاتے۔اس تجارت سے جس طرح دوسرے قبیلوں کے لوگ فائدہ اٹھاتے اس سے بڑھ کر قریش کو فائدہ پہنچتا اس لئے فرمایا کہ یہ چاند کے ذریعے مہینوں کا تعین تمہارے فوائد کا ذریعہ ہے اور حج کے اوقات مقرر کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہر صورت میں اس سے تمہیں جہاں امن ملتا ہے وہیں تمہاری زندگی کے اسباب بھی فراہم ہوتے ہیں۔

ایک بدعت کا ازالہ

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ''گھروں میں پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں''۔حج کی مناسبت سے بعض احکام شروع کیے جارہے ہیں۔ان میں سب سے پہلی بات ایک ایسی بدعت کا ازالہ کیا جارہا ہے جو عربوں نے اپنے طور پر ایجاد کر لی تھی لیکن اس کی نسبت ملتِ ابراہیم کی طرف کرتے تھے۔قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو ان میں یہ عجیب خصلت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو نظر انداز کرتی ہیں لیکن اپنی خانہ ساز بدعات وخرافات پر اس حد تک اصرار کرتی ہیں کہ انہیں کو اصل دین کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔دینی احکام پر عمل کرنے کیلئے ان سے کہا جائے تو کبھی ان پر اثر نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ وہ اس کا برا مانتے ہیں۔لیکن اپنی بدعات وخرافات پر وہ اس قدر متشدد ہوتے ہیں کہ اس کی مخالفت کرنے والے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر چلنے کا دعویٰ کرتے تھے اور اسی کے زیرِ اثر حج کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔لیکن فریضۂ حج کی ادائیگی میں انہوں نے اپنے طور پر ایسی ایسی باتیں ایجاد کر رکھی تھیں جس کا شریعتِ ابراہیمی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا لیکن انہیں ان باتوں پر اصرار تھا۔ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ یہ لوگ جب حج کر کے واپس آتے یا حج کے دوران انہیں گھروں میں آنے کی ضرورت پڑتی تو ان دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے جن دروازوں سے وہ نکلنے کے عادی تھے بلکہ گھر کے پچھواڑے سے کسی دوسرے راستے سے داخل ہوتے۔اس کیلئے انہیں دیوار بھی توڑنا پڑتی تو توڑ ڈالتے۔اس کے پس منظر میں عجیب وغریب فلسفہ کار فرما تھا کہ جن دروازوں سے ہم گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں حج کے نتیجے میں پاک ہو جانے کے باعث انہیں دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا یقیناً تقویٰ کے خلاف ہے۔

دین سے دوری، فہمِ دین سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے

ذرا غور فرمایئے! جب کوئی قوم دین سے دور ہوتی ہے تو دین کے فہم سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔بالکل سامنے کی بات ہے کہ اگر پاک ہو جانے کے بعد گھروں کے دروازوں سے گھروں میں جانا خلافِ تقویٰ ہے تو پھر کیا ان گھروں میں رہنا خلافِ تقویٰ نہیں؟ اگر تم واقعی اپنے اس نام نہاد تقویٰ کی پابندی کرنا چاہتے ہو تو پھر راستوں کی کیا بحث ہے؟ سرے سے پرانے گھر مسمار کر کے نئے گھر بنایئے تا کہ تمہارے تقویٰ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔لیکن ان کے ذہن میں جو فلسفہ بیٹھ چکا تھا وہ نکلنے کا نام نہ لیتا تھا۔اسی طرح کا ایک وہم اور بھی تھا جس میں وہ حج ہی کے سلسلے میں مبتلا تھے وہ یہ کہ بعض قبائل کے لوگ بالکل برہنہ حالت میں مرد بھی اور عورتیں بھی بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور دلیل ان کی یہ تھی کہ

Marfat.com

یہ لباس جو خالص دنیاداری ہے اور زینت و آرائش کی چیزوں میں شامل ہے اسے ہم خالص اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہوئے کس طرح اپنے جسموں پر باقی رکھ سکتے ہیں کیونکہ دنیاداری اور دینداری تو جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے جس حال میں ہمیں اللہ نے دنیا میں بھیجا تھا ہمیں اس کے گھر کا طواف بھی اسی حالت میں کرنا چاہئے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس طرح کی خرافات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ گھروں میں سامنے کے دروازوں سے آنے یا پچھواڑے کے دروازوں سے آنے کا تقویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ تقویٰ تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا نام ہے۔ اس کی منزل اللہ کی خوشنودی ہے اور اس کے حدود کی پاسداری ایک مومن کی فکر ہے۔ اسی مقصد کیلئے ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا یہ اس کا اصل مطلوب ہے لیکن تم نے ایسی خرافات کو مطلوب بنالیا ہے جس کا تقویٰ اور دین سے کوئی تعلق نہیں۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○

(اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے مت بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا) (۱۹۰)

حج کے بعد جہاد کے ذکر کا سبب

حج کے ذکر کے بعد قتال اور جہاد کا ذکر عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آپ حالات کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو تب اندازہ ہوتا ہے کہ پروردگار نے یہاں قتال کا ذکر کیوں فرمایا۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین ہجری میں حج فرض کردیا تھا اور سورۃ البقرۃ نے نازل ہوکر مسلمانوں کو یہ آگاہی دی تھی کہ ملتِ ابراہیمی کے اصل وارث تم ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس پیغمبر کے آنے کی دعائیں مانگی تھیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور جس امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے کی استدعا کی تھی وہ امتِ مسلمہ وہ ہے جو آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے نتیجے میں آپ پر ایمان لاکر اور آپ کی دعوت کو قبول کرکے تشکیل پارہی ہے۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے سے ایک بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ چونکہ بیت اللہ اس امت کا قبلہ ہے اور یہ امت ہی اس کی وارث ہے اور وہ اللہ کا گھر اس انقلاب کا مرکز ہے جو اس امت کے ہاتھوں برپا کیا جارہا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گھر ملتِ ابراہیمی کے ایسے نام نہاد دعوے داروں کے ہاتھ میں رہے جن کا کوئی رشتہ ملتِ ابراہیم سے نہیں۔ حضرتِ ابراہیم نے اس گھر کو توحید کا مرکز بنایا تھا اور انہوں نے اس گھر کو بت خانے میں تبدیل کردیا ہے۔ وہ اگرچہ اس گھر کا طواف کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بتوں کا طواف بھی کرتے ہیں اور ان کی پوجا کے تمام مراسم بھی بجالاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اس گھر کو واگزار کرانا اور دوبارہ اس کو توحید کا مرکز بنانا اور وہاں سے تمام دنیا کو ہدایت فراہم کرنا اب امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے اور یہ بات سمجھنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ جب وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کیلئے نکلیں گے یا کم از کم اس گھر کا طواف کرنے کیلئے ہی جائیں گے تو قریش یقیناً مزاحم ہوں گے۔ اس صورتحال میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو بتایا جائے اگر اس مزاحمت کی نوبت آجائے اور قریشِ مکہ کسی طرح بھی اس گھر کی تولیت سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہوں اور معاملہ جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ تو اس آیتِ کریمہ میں اس بات کا حکم دیا جارہا ہے کہ ایسی صورت میں تمہیں نہ صرف اجازت ہے بلکہ ہمارا حکم ہے کہ ان سے قتال

Marfat.com

کرو کیونکہ تمہارا یہ قتال اللہ کے راستے میں ہے نفس کے راستے میں نہیں اور پھر تم خود حملہ آور نہیں ہو رہے ہو بلکہ دشمن کی برپا کی ہوئی جنگ میں مجبوراً شریک ہو رہے ہو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ جب تک کفر تمہیں لڑنے پر مجبور نہ کر دے اس وقت تک پہل نہ کرنا اور جب تم دیکھو کہ جنگ کے علاوہ کسی اور طرح سے کعبۃ اللہ کا راستہ کھل سکتا ہے جیسے معاہدہ حدیبیہ سے کھل گیا تو پھر خود طاقت استعمال کرنا حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ اس لئے دیکھنا حدود سے تجاوز نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ نفرت کرتا اور ان کو سزا دیتا ہے۔

اس حکم کے بعد سوال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ قریش کے ساتھ یہ تصادم حدود حرم میں ہو جو بڑھتے بڑھتے مسجدِ حرام تک بھی پہنچ سکتا ہے اور حدودِ حرم تو ایسی جگہ ہے جہاں کسی جاندار کو چھیڑنے کی بھی ممانعت ہے۔ ایسی جگہ میں تو جنگ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور حرم کے بارے میں یہ تصور صرف مسلمانوں کا ہی نہیں قدیم سے عربوں کا بھی چلا آ رہا ہے وہ بھی بہت حد تک اس پر کاربند تھے۔ اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ لیتے تو حرم کے احترام میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ تو کیسے ممکن تھا کہ مسلمان حدودِ حرم میں ان سے لڑیں اس لئے آنے والی آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○

(اور قتل کرو ان کو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا تھا اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے) (191)

اس آیتِ کریمہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا اگر وہ حدودِ حرم میں تمہارا راستہ روکیں تو تم بھی حدودِ حرم میں انہیں قتل کر سکتے ہو کیونکہ انسانی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ دشمن تلوار تمہارے گلے تک پہنچا دے اور اگر تم ایک لمحہ تامل کرو تو تمہارا سر کندھے سے اتر جائے۔ لیکن تم کھڑے یہ سوچتے رہو کہ یہ حرم ہے اس لئے میں حرم کی حرمت کو پامال نہیں کر سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ تم جہاں ان کو پاؤ یعنی جہاں کہیں ان سے تصادم ہو تو ان کو قتل کرو اسی طرح تمہیں یہ بھی حق ہے کہ انہوں نے تمہیں جس مکہ سے نکالا ہے تم بھی انہیں وہاں سے نکالو کیونکہ مکہ کی سرزمین پر اس کا حق نہیں جو ابراہیم علیہ السلام سے نسل اور نسب کا تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے جو ان کی ملت پر قائم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے صاف فرما دیا تھا کہ تمہاری جانشینی کا حق ان لوگوں کو نہیں ملے گا جو تیرے طریقے پر چلنے والے نہیں ہوں گے۔ اس لئے بجا طور پر اس وقت ملتِ ابراہیمی کے وارث چونکہ مسلمان ہیں تو مکہ معظمہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز تھا اس کے وارث بھی مسلمان ہی ہوں گے اس لئے ان کو یہ حق دیا جا رہا ہے کہ اگر وہاں لڑائی کی نوبت آ جائے تو تمہیں حق ہے کہ انہیں مکہ سے نکال باہر کرو۔

Marfat.com

فتنہ سے مراد

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ سے جو قتال کی اجازت دی گئی ہے اور انہیں مکہ سے نکالنے کا حق دیا گیا ہے یہ اس کی دلیل بیان کی جارہی ہے۔ فتنہ عام طور پر ''آزمائش'' کو کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ''کسی کو جبر اور ظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے'' کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے مختلف جگہوں میں اسے اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ قریشِ مکہ کا جو رویہ مسلمانوں کے ساتھ رہا اور جب تک مکہ فتح نہیں ہو گیا وہ برابر جس رویے پر قائم رہے اس کے حوالے سے بیسیوں واقعات اس کے شاہد ہیں۔ حضرت بلالؓ کو جس طرح تپتی ریت پر لٹایا جاتا، گلیوں میں گھسیٹا جاتا اور سینے پر بھاری سل رکھ دی جاتی۔ یہ سب کچھ کس لئے تھا؟ صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ لیکن وہ جواب میں نا قابلِ برداشت تکلیفیں اٹھاتے تھے لیکن ان کی زبان سے احد احد کے سوا کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا کہ ''اللہ ایک ہے۔ اللہ ایک ہے'' تم جو چاہو کر لو میں اس ایک اللہ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ حضرت عمارؓ پر قیامت گزرتی رہی، حضرت یاسرؓ پر مظالم کی چکی چلتی رہی، حضرتِ خبابؓ کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا رہا، یہ وہ فتنہ ہے مسلمان جس کا شکار تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدودِ حرم اور اشھر حرم میں قتل وقتال بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم کا نشانہ بنایا جارہا ہو کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لاتے ہیں۔ یہ ظلم وستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس سنگین فتنے کو مٹانے کیلئے مسلمانوں کو اجازت دی جارہی ہے کہ اگر جنگ کی نوبت آجائے تو تم کفار کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرو جس کے وہ مستحق ہیں اور جہاں کہیں وہ تمہارے مقابل آئیں انہیں قتل کرو۔ یہ چیز نہ احترامِ حرم کے منافی ہے اور نہ اشھر حرم کی حرمت کے۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ: آیت کے اس حصے میں مسلمانوں کو مزید احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ قتال اور جہاد کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن حرم اور مسجدِ حرام کے احترام کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جب تک کفار تمہیں مسجدِ حرام کے پاس لڑنے پر مجبور نہ کر دیں اس وقت تک تم پہل نہ کرنا۔ لیکن اگر ایسا ضروری ہو جائے تو پھر ان کو منہ توڑ جواب دینا کہ کفار اگر مسلمانوں کی دشمنی میں مسجدِ حرام اور حرم کے احترام کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے تو وہ خود بھی کسی رعایت کے مستحق نہیں رہتے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کی حرمت کو بے حد اہمیت دی ہے۔ کسی کی جان لینا تو بہت دور کی بات ہے آنحضرت نے تو یہاں تک فرمایا: مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا ''جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں''۔ یعنی جس نے ابھی قتل نہیں کیا البتہ وہ کسی مسلمان پر ارادۂ قتل سے ہتھیار اٹھاتا ہے تو امت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے یعنی وہ اسلام کے رشتے سے نکل جاتا ہے۔ یہ حرمتِ جان جس کی شریعت میں اس قدر اہمیت ہے اس وقت تک اس کا احترام باقی رہتا ہے جب تک ایک شخص دوسرے کی حرمتِ جان کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا اب اس کی جان کسی احترام کی مستحق نہیں وہ یقیناً قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح کفارِ قریش اگر مسلمانوں کو قتل کرنے سے نہیں رکتے تو پھر وہ خود بھی کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا: كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكٰفِرِيْنَ: ''کافروں کا یہی بدلہ ہے۔'' وہ جو کریں گے اس کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے گا۔

Marfat.com

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (۱۹۲)

''اگر وہ باز آجائیں'' کے دو مفہوم لئے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے جو فتنہ پر مبنی رویہ اختیار کر رکھا تھا اور مسلمانوں کو اذیت پہنچا کر لطف حاصل کرنا ان کا معمول بن گیا تھا اور جو مسلمان پیچھے مکہ میں رہ گئے تھے ان پر طرح طرح کے مظالم بدستور جاری تھے اور اجتماعی طور پر انہوں نے مسلمانوں پر بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور وہ کسی طرح بھی اسے گوارا کرنے کو تیار نہ تھے کہ مسلمان اللہ کے گھر تک پہنچ سکیں۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اگر وہ اپنے اس رویے سے دستبردار ہوجائیں اور مسلمانوں کے جائز حقوق کو تسلیم کرلیں اور اسلام کی تبلیغ اور اس کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنیں تو مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ پھر تم بھی ان کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرو جس طرح اللہ تعالیٰ بدتر سے بدتر مجرم کو توبہ کے بعد معاف کردیتا ہے تم بھی یہی صفت اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ تمہاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کیلئے نہیں ہونی چاہیے بلکہ اللہ کے دین کا راستہ صاف کرنے کیلئے ہونی چاہیے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اپنے ظالمانہ رویے سے باز نہ آئیں بلکہ ایمان لے آئیں۔ ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے مغفرت اور رحم کا معاملہ کرے گا اور مسلمانوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اسلامی اخوت کا معاملہ کرو اور یہ مت سمجھو کہ چونکہ ہمارے درمیان لڑائی چھڑ چکی ہے اس لئے عین حالتِ جنگ میں وہ اگر اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے ایمان کی طرف آرہے ہیں تو ہمیں ان کا ایمان ہرگز قبول نہ کرنا چاہئے۔ کہا: تمہارا رویہ بھی بخشش اور رحم وکرم پر مبنی ہونا چاہیے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

(اور ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو کر رہ جائے اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں) (۱۹۳)

اسلامی انقلاب کا ہدف

اس آیت کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس ہدف کا اعلان کردیا جائے اور وہ ہدف یہ ہے کہ مشرکین سے مسلمانوں کیلئے صرف چند مراعات حاصل کرلینا مقصود نہیں اور نہ یہ مطلوب ہے کہ قریشِ مکہ اگر اپنے ظالمانہ رویہ سے رک جائیں تو باقی انہیں ہر کام کیلئے آزاد چھوڑ دیا جائے کیونکہ اسلام نے جس آزادی اور رواداری کا درس دیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے عقائد، اپنے تصورات اور اپنی تہذیب کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہیں بشرطیکہ وہ اسلام کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرلیں اور اسلام کے نظام کی بالادستی کیلئے کسی رکاوٹ کا باعث نہ بنیں۔ یہی رویہ مسلمانوں نے ان تمام شہروں اور ملکوں میں اختیار کیا جنہیں انہوں نے فتح کیا۔ جب وہاں کے رہنے والوں نے اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے سپرد کردیا اور خود فرمانبردار رعایا کی حیثیت اختیار کرلی تو مسلمانوں نے انہیں مذہب، روایات اور تہذیب کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا۔ البتہ! پبلک لائف (Public Life) میں ملک کے اسلامی قانون کی انہیں پابندی کرنا ہوتی لیکن پرسنل لاز (Personal Laws) میں انہیں فی الجملہ آزادی حاصل تھی۔

Marfat.com

عرب قوم کی خصوصیت

لیکن عربوں کا معاملہ ان سے یکسر مختلف تھا کیونکہ عرب بلاواسطہ اور براہِ راست آنحضرت ﷺ کی امتِ دعوت تھے۔ان کی طرف اللہ کے رسول کا آنا، اللہ کی طرف سے حجتِ بالغہ،حجتِ قائمہ اور آخری دلیل تھا جس کے بعد مزید کسی حجت و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ۔رسول اپنی ذات میں ایک معجزہ ہوتا ہے،اس کی دلآویز شخصیت،اس کا بے عیب کردار،اس کا اعلیٰ خاندان، اس کا روشن پس منظر،اس کی مبہوت کردینے والی دعوت، اس کی بے پناہ قوتِ استدلال،اس کی اپنی دعوت پر ناقابلِ تغیر استقامت اور قوم کیلئے گہری ہمدردی،محبت اور شفقت ان میں سے ایک ایک چیز قوم کیلئے آخری حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔اللہ کے نبی بھی دلیل و برہان بن کر آتے ہیں،لیکن قومیں اگر ان کی تکذیب کردیتی ہیں حتی کہ انہیں قتل بھی کردیتی ہیں تو اللہ تعالیٰ مزید پیغمبر بھیج دیتا ہے اور قوموں کو سنبھلنے کا موقعہ دیتا ہے۔لیکن رسول چونکہ اتمامِ حجت کیلئے آتا ہے اس کے آنے کے بعد پھر دو ہی راستے ہوتے ہیں کہ یا اس کی مخاطب قوم ایمان لے آئے اور یا پھر اسے تباہ کردیا جائے ۔تباہی دو صورتوں میں آتی ہے کبھی اللہ کی جانب سے عذاب آتا ہے جیسے قومِ عاد،قومِ ثمود،قومِ لوط اور قومِ نوح وغیرہ پر آیا اور ان کی جڑ کاٹ دی گئی یا اللہ تعالیٰ رسول پر ایمان لانے والوں کو اتنی طاقت عطا فرمادیتا ہے کہ وہ مکذب قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹادیتے ہیں۔مشرکینِ عرب کے سامنے بھی دو ہی راستے کھلے رکھے ہیں کہ یا تو اللہ کا دین اختیار کرلو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ دین سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت پر مبنی جو نظامِ حق نافذ کیا جارہا ہے اس کی پوری طرح اطاعت کرو،اس کے اعتقادات پر ایمان لاؤ،اس کے احکام پر عمل کرو،اس کے آداب کو زندگی کا زیور بنالو،اس کی ذمہ داریوں کو آخری ذمہ داریوں کے طور پر قبول کرلو۔جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ فتنے کی حالت ختم ہوجائے یعنی تم نے غیر اللہ کی پرستش اور عبادت پر مبنی جو نظام اختیار کررکھا ہے اور دوسروں کو بالجبر اس پر چلنے کیلئے مجبور کرتے ہو یہ تمہارا دین ہے ۔اللہ کے دین کے مقابلے میں ایسے تمام ادیان ختم ہوجانے چاہئیں کیونکہ یہی آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد ہے۔ایک دوسری آیتِ کریمہ میں اسی مقصد کو واضح انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ارشاد فرمایا:

هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ

(وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا اپنی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو سارے دینوں پر غالب کردے اگرچہ مشرکین اس چیز کو ناپسند کریں)

یہی بات پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی فرمائی گئی۔صاف صاف مشرکین عرب کو وارننگ دی جارہی ہے کہ تم سے اس وقت تک جنگ جاری رہے گی جب تک اس دھرتی پر اللہ کا دین پوری طرح بلا کم و کاست جاری وساری اور نافذ نہیں ہوجاتا۔اس لئے یا تو اس حقیقت کو قبول کرلو اور یا پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کو مزید مبرہن کرنے کیلئے کچھ مزید ہدایات جاری فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ دوسری قوموں کو تم کسی معاہدے کے ساتھ یا جزیہ لے کر اپنے اعتقادات کے مطابق رہنے کا حق دے سکتے ہو لیکن عربوں کیلئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اس پورے علاقے کو غیر اسلامی قبضہ یا مداخلت سے بالکل محفوظ کر کے اسلام کا Base بنا دینا مقصود ہے تاکہ یہاں آزادی سے وہ امت تیار ہو اور انقلاب کی وہ صالح اور طاقتور بنیاد قائم ہو جس سے پوری دنیا کو اسلام کی برکات سے بہرہ ور کیا جائے۔ اس لئے آپ نے جزیرۂ عرب کے متعلق یہ ہدایت دی: لَایَجْتَمِعُ فِیْهِ دِیْنَانِ ''جزیرۂ عرب میں دینِ حق کے ساتھ کوئی اور دین جمع نہیں ہو سکتا''۔ اپنی آخری وصیت میں آپ نے یہود و نصاریٰ کو اس سرزمین سے نکال دینے کا حکم دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی تعمیل فرمائی۔ اس طرح مسلمانوں کو وہ Base میسر آیا جس میں کسی اور دین اور کسی اور تہذیب کیلئے کوئی گنجائش نہ تھی۔

یہاں ایک بات واضح کرنا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ جزیرۂ عرب کو کفر کے تمام اثرات سے پاک کرنے اور تمام دوسرے مذاہب کو وہاں سے نکال دینے کی پالیسی وقتی نہیں تھی بلکہ یہ ایک مستقل پالیسی تھی جسے اسلام کے سیاسی نظام میں ایسی بنیادی حیثیت حاصل تھی جس کی حیثیت دین کی تھی اور اس کا فیصلہ کسی خلیفۂ وقت یا شوریٰ نے نہیں کیا تھا بلکہ یہ اللہ کے آخری رسول کا حکم تھا۔ جس کی تعمیل فرض ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی اور ابدی ہے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں اور پھر آج کی صورتحال پر غور فرمائیں کہ آج کا جزیرۂ عرب کن سیاسی قوتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور کون سی تہذیب ہے جس کے اثرات حدودِ حرم تک میں داخل ہو چکے ہیں اور جن غیر اسلامی قوتوں کو حضرت عمر فاروقؓ نے اللہ تعالیٰ کے رسول کے حکم سے جزیرۂ عرب سے نکال دیا تھا انہیں کی آج فوجیں جزیرۂ عرب کی سرحدوں پر بیٹھی ہیں اور انہیں کی حکومتوں کے فیصلے مسلمان حکومت کے واسطے سے لوگوں پر مسلط کیے جا رہے ہیں۔ وہ جزیرۂ عرب جو اسلام کا Base اسلام کا مرکز اور اسلام کی چھاؤنی تھا آج وہاں غنیم کا لشکر دراتا پھر رہا ہے۔ باقی عالمِ اسلام کی طرح وہاں بھی حق گوئی کی پاداش میں زبانیں بند کی جا رہی ہیں اور اگر کوئی زبان ایسی ہی زور آور ہے تو اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی بے بسی اور اسلام سے ان کی محرومی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے آئینہ میں آنے والے دنوں کی دھندلی سی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ: ''پھر اگر وہ باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں''۔

عُدْوَان کے اصلی معنی تو ''تعدی اور زیادتی'' کے ہیں۔ لیکن یہاں یہ لفظ تعدی اور زیادتی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ تعدی اور زیادتی کو روکنے کیلئے جو اقدام کیا جاتا ہے یا اس کی پاداش میں مجرموں کو جو سزا دی جاتی ہے اس کیلئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست اور ہم آہنگی کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم ہو جائے تو عام لوگوں کو تو معاف کر دیا جائے گا لیکن ایسے لوگوں کو سزا دینے میں مسلمان بالکل حق بجانب ہوں گے جنہوں نے اپنی دورِ اقتدار میں نظامِ حق کا راستہ روکنے کیلئے ظلم و تعدی کی حد کر دی۔ اگرچہ اس معاملے میں بھی مومنینِ صالحین کو زیب یہی دیتا ہے کہ عفو و درگذر سے کام لیں اور فتح یاب ہو کر ظالموں سے انتقام نہ لیں۔ مگر جن کے جرائم کی فہرست بہت ہی زیادہ سیاہ ہو ان کو سزا دینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اس ذاتِ والاصفات کی سنت ہے جس سے بڑھ کر عفو و درگزر کسی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کا قتل اور فتح مکہ کے بعد آپ کا سترہ آدمیوں کو عفوِ عام سے مستثنیٰ فرمانا اور پھر ان میں سے چار کو سزائے موت دینا اسی حقیقت پر مبنی تھا۔

Marfat.com

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ○

(ماہِ حرام، ماہِ حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری مختلف چیزوں کا بھی قصاص ہے تو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر اس کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے) (۱۹۴)

اشہرِ حرم کی حیثیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے عربوں میں یہ عقیدہ چلا آ رہا تھا کہ ذی القعدہ اور ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کیلئے خاص تھے اور رجب کا مہینہ عمرے کیلئے خاص کیا گیا تھا۔ انہیں چار مہینوں کو اشہر حرم یعنی حرمت والے مہینے یا حرام مہینے کہا جاتا ہے۔ عرب ان مہینوں کا اس حد تک احترام کرتے تھے کہ ان مہینوں میں ان کی وہ تلواریں جو ہمیشہ دوسروں کا خون بہانے کیلئے بے نیام رہتی تھیں نیام میں چلی جاتی تھیں۔ اس احترام اور پابندی کا فائدہ یہ تھا کہ وہ ان مہینوں میں حج اور عمرہ بھی نہایت اطمینان کے ساتھ کر سکتے تھے اور اس کے علاوہ ان چار مہینوں میں پورے عرب میں تجارت زور و شور سے ہوتی تھی۔ خود مکہ معظمہ حج کے دنوں میں تجارت کا مرکز بن جاتا تھا۔

ان مہینوں کا احترام چونکہ عربوں کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا تھا اس لئے وہ کبھی اس کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ البتہ! جب کبھی ان کو لڑائی کی شدید ضرورت پیش آتی یا لڑائی کے حالات پیدا ہو جاتے یا وہ کسی کا انتقام لینے یا غارت گری کرنے کے لئے بے چین ہوتے تو کسی حرام مہینے میں یہ جنگ کر گزرتے اور جس کسی پر بھی چھاپہ مارنا ہوتا اس سے بھی دریغ نہ کرتے اور کسی سے انتقام لینا ہوتا تو انتقام لے لیتے۔ لیکن اس مہینے کی جگہ کسی دوسرے مہینے کو حرام کر کے اپنے تئیں اس حرمت کا بدلہ پورا کر دیتے تھے۔ اندازہ فرمائیے! اشہر حرم کا احترام ان کا ایمان بن چکا تھا۔ لیکن ان کی نفسانی یا قبیلے کی ضرورتیں جب کبھی اس عقیدے سے مزاحم ہوتیں تو وہ اپنی خواہشات یا قبیلے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اس حرمت کو پامال کرنے سے دریغ نہ کرتے لیکن اپنے نفس کی تسکین کیلئے اس کی جگہ کسی دوسرے مہینے کو حرمت والا مہینہ قرار دے دیتے۔ اس کا نام انہوں نے "نسی" رکھا تھا۔ ان کی اس حرکت کے باعث مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کفار اپنے نسی کے حیلے کو کام میں لا کر کسی حرام مہینے میں جنگی کارروائی کر بیٹھیں تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ حرام مہینوں کا احترام اور حرمتوں کی پاسداری یکطرفہ نہیں ہوتی اگر ایک فریق تلوار لے کر چڑھ دوڑے اور دوسرا احترام کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ اشہر حرم اور حدودِ حرم کا احترام مسلّم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں۔ لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں اور اس بلدِ امین میں بے نیام ہونے سے دریغ نہ کریں تو اس کے قصاص میں وہ بھی امن و احترام کے حقوق سے محروم کئے جائیں گے۔ اس لئے تم اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ اگر کسی محترم مہینے میں لڑنا پڑا یا حدودِ حرم میں جنگ ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟ جو بھی ہوگا اس کا وبال لڑائی میں پہل کرنے والوں پر ہوگا۔ البتہ! یہ ضروری ہے کہ تم کسی حال میں بھی حدود سے آگے مت بڑھو تم ان کے حملوں کا جواب تو پوری قوت سے دو لیکن تقویٰ کی حدود کا ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت ہمیشہ ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں تقویٰ کی حدود کا لحاظ رکھتے ہیں اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

اعتداء کا مفہوم

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُم: ''تو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر اس کو جواب دو''۔ اس جملے میں صنعتِ تجانس استعمال کی گئی ہے۔ یعنی سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے اس کا ہم جنس لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہ مفہوم میں اس سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے: جزاء سیئةٍ سیئة بمثلها ''برائی کا بدلہ اسی کے مانند برائی ہے۔'' ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ برائی نہیں ہوتا بلکہ انصاف اور عدل ہوتا ہے، لیکن یہاں صرف ہم آہنگی کی وجہ سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح پیشِ نظر آیت میں بھی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جاتا ہے اس کو ''اعتـــداء'' سے تعبیر فرمایا ہے حالانکہ یہ اعتداء یا زیادتی نہیں بلکہ زیادتی کا جواب ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ تم حدودِ حرم اور اشھر حرم کا پوری طرح احترام ملحوظ رکھو۔ لیکن اگر مشرکین اس کی پرواہ نہ کریں تو پھر ان کی ہر زیادتی کا جواب ہر حال میں دیئے جانے کی اجازت ہے۔ اس میں کسی طرح کا تأمل نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ! تمہارا ہر قدم انصاف کے مطابق اٹھنا چاہئے، تمہارا ہر فیصلہ عدل کے ترازو میں ٹھیک تلنے کے لائق ہونا چاہئے کیونکہ تمہاری بنیاد تقویٰ پر ہے اور تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور ادائے حقوق کی پاسداری کا نام ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

(اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو، بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) (۱۹۵)

جہاد اور انفاق باہم لازم و ملزوم ہیں

سابقہ آیات میں چونکہ جہاد کا مضمون بیان ہوا ہے اور مسلمانوں کو بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے خاتمہ کیلئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے تو جہاد کے حکم کے بعد انفاق کے حکم کا آنا تو لازمی تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ایک مستقل اسلوب ہے کہ جہاں بھی جہاد کا ذکر آیا ہے وہاں انفاق کا ذکر ضرور آیا ہے۔ مثلاً: تجاهدون فی سبیل الله باموالکم وانفسکم ''اور تم جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مال اور اپنی جان سے۔'' دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ اسلوب بے سبب نہیں۔ قرآنِ کریم ایک ایسی انقلابی کتاب ہے، جس نے اپنے ماننے والوں کو یہ تصور دیا ہے کہ تمہارا اصل مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کرنا ہے۔ اس مقصد کیلئے جہاد کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ دنیا میں شر اور لادینیت کے بڑے بڑے جتھے اور بڑے بڑے گروہ ہیں جن کی قوت توڑے بغیر اللہ کا کلمہ غالب نہیں آسکتا۔ ان کی قوت کو توڑنے کیلئے قدم قدم پر لڑائی ہوگی اور جب تک حق و باطل ہیں اس وقت تک اس کشمکش میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ جب سے دنیا خیر و شر سے آگاہ ہوئی ہے اس وقت سے یہ کشمکش جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔

Marfat.com

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

یہ بات ہر سمجھدار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ کوئی سی جنگ بھی وسائلِ جنگ کے بغیر نہیں لڑی جاسکتی۔ بڑے سے بڑا صاحب ایمان بہادر بھی بغیر اسلحۂ جنگ کے جہاد نہیں کرسکتا۔ اسے تلوار چاہیے، زرہ چاہئے، بکتر چاہیے، نیزہ چاہئے، گھوڑا چاہئے، یہ ایک سپاہی کی معمولی ضرورتیں ہیں۔ جتنا بڑا لشکر ہوگا اس کی اتنی ہی ضرورتیں وسیع ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ وسائلِ جنگ مسلمانوں کے انفاق سے ہی مہیا ہوں گے۔ اور اگر لڑائی کیلئے کہیں جانا بھی ہے تو پھر رسد اور کمک بھی چاہئے۔ ان ضرورتوں کے پیشِ نظر پروردگار ہمیشہ انفاق کا حکم دیتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ اس میں صرف انفاق کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ انفاق چونکہ جہاد کا ایک جز ہے بلکہ جہاد بالمال ہے اس لئے اس جہاد کو چھوڑ کر خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان نہ کرنا۔ اس بات کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ایک ایسے شخص کی تصویر کھینچی گئی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو جس طرح ایسے شخص کی تباہی میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اسی طرح جہاد اور انفاق کے ترک کرنے والی قوم کی تباہی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک حدیث سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

> ''حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم اس کی تفصیل بخوبی جانتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمادی تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنے وطن میں ٹھہر کر اپنے مال وجائداد کی خبر گیری کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے یہ بتلایا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترکِ جہاد ہے''۔

چونکہ اس کا تعلق انفاق سے ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد جہاد بالنفس بھی ہے اور جہاد بالمال بھی۔ مزید فرمایا کہ جہاد بالنفس ہو یا جہاد بالمال دیکھنا اس کو بیگار نہ سمجھنا، اس کو بوجھ محسوس نہ کرنا، یہ صرف اللہ کا حکم ہی نہیں بلکہ تمہاری زندگی ہے۔ اس کو دل کی آمادگی کے ساتھ بہتر سے بہتر انداز میں انجام دینے کی کوشش کرنا کیونکہ احسان ''کسی کام کو بہتر سے بہتر طریقے اور خوبی کے ساتھ کرنے'' کو کہتے ہیں۔ اس لئے جہاد اور انفاق بھی احسان کے ساتھ یعنی بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی کوشش کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسی قوم کو زندگی دیتا ہے جو جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کو اپنی اجتماعی زندگی کا عنوان اور اپنی قومی زندگی کا ہدف بنا لیتی ہے۔ وہ زندگی موت سے ڈرنے میں نہیں بلکہ موت کی خواہش میں تلاش کرتی ہے۔ بقول اکبر ؎

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

Marfat.com

مَرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًی مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۥ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

(اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کیلئے پس اگر تم گھیر لئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے اور اپنے سروں کی حجامت نہ کرو جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اسے تکلیف ہو اسکے سر میں تو وہ بدلہ دے روزے یا خیرات یا قربانی سے پھر جب تم مامون ہو جاؤ تو جو شخص فائدہ اٹھائے عمرہ کو حج سے ملا کر تو اس پر ہے جو اسے قربانی میسر ہو تو پھر جو شخص قربانی نہ پائے تو تین روزے رکھے حج کے دنوں میں اور سات روزے جبکہ تم لوٹو یہ پورے دس ہوئے یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قرب وجوار میں نہ رہتے ہوں اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے) (۱۹۶)

سابقہ آیات کا خلاصہ اور ربط

گزشتہ رکوع میں حج کا ذکر آیا ہے تو اس زمانے کے حالات کے تناظر میں جن جن ہدایات کی ضرورت تھی مسلمانوں کو وہ ہدایات دے دی گئیں۔ اسی نسبت سے جہاد کا ذکر بھی آیا ہے اشھر حرم بھی زیر بحث آئے اور یہ بات بھی کہ اگر جنگ حدودِ حرم یا مسجدِ حرام میں چھڑ گئی تو اس صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا ہوگا اور اسی ضمن میں اس حقیقت کو بھی منکشف کیا گیا کہ امتِ مسلمہ کا اصل فریضہ اس فتنہ کو ختم کرنا ہے جو اللہ کی دھرتی پر اللہ کے دین کے غلبہ کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ اس حیثیت سے مسلمانوں کو ان کا فریضہ یاد دلایا گیا اور چونکہ کسی بھی نظامِ زندگی کے غلبے اور اس راستے میں پیش آنے والی کشمکش اور اس کے لئے ضروری مصارف کا حصول ایسی باتیں ہیں جو ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ اس لئے آخر میں انفاق کا حکم دیا گیا اور جہاد اور انفاق سے ہاتھ اٹھانے یا اس کی طرف سے لاپرواہی برتنے کو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے تعبیر کیا گیا اور مستقل پالیسی کے طور پر یہ حکم دیا گیا کہ تم اللہ کی بندگی اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں بہتر سے بہتر جذبہ اور بہتر سے بہتر عمل بروئے کار لانے کی کوشش کرو۔ یہی وہی چیز ہے جو اللہ کی بارگاہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ تمہارے پیشِ نظر ہمیشہ یہ حقیقت رہنی چاہیے۔

ان تمام ضروری حقائق کو منکشف کرنے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد حج کے احکام شروع کیے جارہے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ کے پہلے جملے سے بعض اہلِ علم کو نجانے یہ کیسے گمان ہوا ہے کہ اس میں حج اور عمرے کی فرضیت بیان کی جارہی ہے حالانکہ اس جملے میں اس بات کا کوئی امکان نہیں۔ جہاں تک فرضیتِ حج کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ آل عمران میں ۳ ہجری میں ہو چکا ہے وہاں پروردگار کا ارشاد ہے:

Marfat.com

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○

(اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا بیت اللہ کا اللہ کیلئے (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے) (آل عمران: ۹۷)

حج کی فرضیت

اس آیت سے مسلمانوں پر حج فرض کیا گیا ہے۔ اس میں فرضیت کے اعلان کے ساتھ ساتھ شرائط کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ حج اس پر فرض ہوگا جو مکہ معظمہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مصارفِ سفر اپنے پاس رکھتا ہو اس کی صحت سفر کی متحمل ہو سکتی ہو، اپنے پسماندگان کی گزر بسر کیلئے واپسی تک کے انتظامات کر چکا ہو، راستے سفر کیلئے محفوظ ہوں۔ ان شرائط کے ساتھ ہر مسلمان پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں حج کی فرضیت کا انکار کرنے والوں یا اس عمل سے تمام وسائل کی موجودگی میں لاپرواہی کی حد تک رویہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی اس آیت کی تائید اور وضاحت کیلئے کافی ہے۔ آپ نے فرمایا: "جو شخص سفر کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی حج نہیں کرتا وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے یا میری امت سے اس کا کوئی رشتہ نہیں کیونکہ جس شخص کو وسائل کی موجودگی کے باوجود مرکزِ اسلام میں آنے اللہ کے گھر کی زیارت کرنے، امتِ مسلمہ کی طاقت کے سرچشمے کو بچشمِ سر دیکھنے اور وہاں دس سال تک جو کشمکش برپا رہی اس کی حقیقی روح کو سمجھنے اور پھر مدینہ منورہ جا کر ایک ایک غزوہ میں ایثار و قربانی کی مضمر حقیقتوں کو جاننے اور آنحضرت ﷺ کے روضۂ اطہر کی زیارت کرنے اور ان تمام احساسات اور ترغیبات کو دل و دماغ میں زندہ کرنے جو حضور نے دم واپسیں ارشاد فرمائے تھے کی توفیق نہیں ہوتی تو اس کا آخر اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے کیا تعلق؟

احکامِ حج وعمرہ

اس آیتِ کریمہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا فرضیت حج کا کوئی ذکر ہے نہ عمرہ کی فرضیت کا بلکہ اس میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب تم حج یا عمرہ کی نیت کر لو اور نیت کا عملی اظہار یہ ہے کہ تم احرام باندھ لو تو پھر تم اسے درجہ اتمام کو پہنچائے بغیر کھول نہیں سکتے کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ کوئی بھی نفلی عبادت جب اس کا آغاز کر دیا جائے تو وہ فرض ہو جاتی ہے۔ اب اس کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر پورا نہ کیا جا سکے تو اس کا قضا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ حج اگر فرض کی نیت سے ادا کیا جا رہا ہے تو وہ ویسے ہی فرض ہے لیکن اگر وہ فرض حج کی ادائیگی کے بعد نفلی حج کر رہا ہے یا حج بدل کر رہا ہے تب بھی احرام باندھنے کے بعد اس کا پورا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تم حج یا عمرہ کرو تو محض اللہ کیلئے۔ ان دونوں باتوں کا دراصل ایک پس منظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یا تو حدیبیہ کا سفر پیش آ گیا تھا اور اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئی ہیں یا پیشگی تیاری کیلئے یہ ہدایات دی جا رہی ہیں کیونکہ پروردگار تو خوب جانتے تھے کہ حضور عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ جائیں گے اور وہاں مشرکین مکہ انہیں عمرہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے تو ایسی صورت میں جبکہ وہ حالتِ احرام میں ہوں گے تو

Marfat.com

انہیں کیا کرنا ہوگا؟ اور دوسری بات کا پس منظر یہ ہے کہ حج تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہو رہا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرب ملتِ ابراہیمی سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے۔ وہ اس بات کے تو قائل تھے کہ حج ایک فریضہ ہے جو بہر صورت ادا ہونا چاہیے لیکن حج کے مناسک اور اس کے احکام سے بے خبری یا سرکشی کے باعث انہوں نے اپنے تئیں ان کے اندر بہت کچھ کمی بیشی کر دی تھی۔ کچھ چیزیں بڑھا دی تھیں کچھ کم کر دی تھیں حج اور عمرہ کی حقیقی روح سے وہ بالکل بے گانہ ہو چکے تھے حتی کہ وہ اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہوئے بت پرستی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ جب بیت اللہ کا طواف کرتے تو ساتھ ان تمام بتوں کا بھی طواف کرتے جو وہاں رکھے گئے تھے اور ان بتوں میں چونکہ ہر قبیلے کا الگ الگ بت تھا اس لئے وہ اپنے اپنے بت کے سامنے بطورِ خاص ڈنڈوت بجالاتے ماتھا ٹیکتے، چڑھاوے چڑھاتے، مرادیں مانگتے اور منتیں مانتے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر کے سائے میں ہوتا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ ہم اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کر رہے ہیں۔ جب سعی کرتے تھے تو صفا اور مروہ پر انہوں نے اساف اور نائلہ کے نام سے دو دیویاں نصب کر رکھی تھیں اس لئے جب وہ صفا اور مروہ کا طواف کرتے تو ساتھ ان کا بھی طواف کرتے۔ شرک کے اس کاروبار کے ساتھ ساتھ انہوں نے حج کو تجارتی میلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ حج کے ایام میں مناسکِ حج بھی ادا ہوتے لیکن حقیقت میں تجارتی کاروبار ہوتا اور تمام دلچسپیاں قریش اور دوسرے قبائل کی تجارت کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوتا اس وقت تک یہ آلودگیاں وہاں موجود رہیں گی اور تمہیں اگر اللہ نے حج یا عمرے کیلئے جانے کا موقعہ دیا تو تمہیں صرف اللہ کیلئے حج یا عمرہ کرنا ہے۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے تو اس کا حکم

آیتِ کریمہ کے پہلے جملے سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ احرام باندھنے کے بعد چاہے وہ حج کا ہو یا عمرہ کا، حج یا عمرہ کو مکمل کیے بغیر احرام کھولا نہیں جا سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے جس سے حج اور عمرہ ادا کرنا ممکن نہ رہے تو پھر کیا کیا جائے؟ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ سے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ مجبوری کی ایک صورت تو وہ ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم نے اس لفظ سے کیا ہے جس کا معنی ہے "اگر تم گھیر لئے جاؤ"، یعنی دشمن تمہارا راستہ روک لے اور آگے بڑھنا بغیر قتال کیے تمہارے لئے ناممکن ہو جائے تو پھر تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ جو قربانی تمہیں میسر ہو چاہے وہ بکری ہو، گائے ہو، اونٹ ہو اللہ کے حضور پیش کر دو۔ آنحضرت ﷺ جب چھ ہجری میں عمرہ کے ارادے سے عازمِ مکہ ہوئے تھے تو آپ کو بھی حدیبیہ کے موقع پر آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ تو آپ کو مجبوراً وہیں احرام کھولنا پڑا تھا۔ اس طرح سے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی ایک صورت سنت کی شکل میں وجود میں آگئی اور امت کو اسے سمجھنے میں آسانی ہو گئی۔

مجبوری کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بیماری یا کسی حادثے کے باعث حج یا عمرے کا سفر ممکن نہ رہے۔ حوادث مختلف صورتوں کے ہو سکتے ہیں چاہے وہ زمینی ہوں یا آسمانی، جسمانی ہوں یا حکومت کی جانب سے انتظامی۔ کوئی بھی ایسی رکاوٹ جو سفر کو ممکن نہ رہنے دے وہ ایک مجبوری ہے جس سے موجود قربانی دے کر احرام کھولا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

احرام سے نکلنے کی شرعی صورت، حلق یا قصر کی وضاحت

لیکن اس آیت کا اگلا جملہ ایک اور ہدایت کی طرف راہنمائی کر رہا ہے وہ یہ کہ احرام سے نکلنے کی شرعی صورت یہ ہے کہ آپ سر کے بال منڈوا دیں یا کٹوا دیں کیونکہ احرام کھولنے کیلئے دونوں کی اجازت دی گئی ہے۔عورتوں کیلئے اپنے بالوں کی گردن کے قریب سے ایک لٹ لے کر اس کا آخری حصہ انگلی پر لپیٹ کر کاٹ دینا کافی ہے۔لیکن مردوں کیلئے ضروری ہے وہ بالکل بال صاف کرائیں یا پورے سر سے بال چھوٹے کرائیں۔بال صاف کرانے کو ''حلق'' کہتے ہیں اور چھوٹے کروانے یعنی کٹوانے کو ''قصر'' کہتے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے بال صاف کروانے کیلئے کٹوانے والے کی نسبت تین گنا فضیلت کا ذکر فرمایا ہے اور تین مرتبہ زیادہ دعا فرمائی ہے۔اس لئے عمرہ کرنے والوں یا حج کرنے والوں کو اس معاملے میں اپنی زلفوں سے زیادہ اللہ کی رضا کی فکر ہونی چاہیے۔بہر حال کہنا یہ ہے کہ احرام کھولنے کی شرعی صورت سر کے بال کٹوانا یا منڈوانا ہے اور یہ سر کے بال اس وقت تک نہیں کٹوائے جاسکتے جب تک مُحرم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔اس حکم کی تعمیل کی صورت میں ائمہ فقہ میں اختلاف ہوا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ قربانی کے اپنی جگہ پر پہنچنے سے مراد حدودِ حرم میں پہنچنا ہے۔حج یا عمرے کا احرام باندھنے والا چاہے کسی جگہ روک دیا جائے، دشمن کی جانب سے یا کسی اور مجبوری کے باعث، وہ اس وقت تک احرام کھولنے کیلئے سر کے بال نہیں کٹوا سکتا جب تک اس کی قربانی حدودِ حرم میں پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ حدودِ حرم میں پہنچنا ضروری نہیں بلکہ جہاں بھی حج یا عمرہ کرنے والے کو روک دیا گیا ہے وہی جگہ اس کی قربانی کی ہے۔چنانچہ جو قربانی اسے میسر آئے وہیں اسے وہ قربانی ذبح کر دینی چاہیے۔

وَلَاتَحْلِقُوْارُءُ وْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ: اس جملے پر اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم احرام کھولنے کیلئے اپنے سروں کی حجامت نہ کراؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔اگر یہ کہنا مقصود ہوتا کہ جہاں تمہیں روک دیا جائے وہیں قربانی دے دو تو پھر قربانی کی جگہ تک پہنچنے کی بات بے معنی معلوم ہوتی ہے۔اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ رک جانے کی جگہ قربانی کی جگہ نہیں بلکہ وہ جگہ ہے جہاں ہمیشہ قربانیاں دی جاتی ہیں اور وہ حدودِ حرم ہے۔آج حاجی منیٰ میں قربانیاں کرتے ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ اصل قربانی کی جگہ تو کوہِ صفا کے قرب وجوار میں تھی۔حجاج کی کثرت کے باعث رسول اللہ ﷺ نے اس کو منیٰ تک بڑھا دیا اور آپ جانتے ہیں کہ منیٰ بھی حدودِ حرم کے اندر ہے۔البتہ! یہ بات ضرور ہے کہ اگر رک جانے کی جگہ سے حدودِ حرم تک قربانی یا اس کی قیمت بھیجنے کی کوئی صورت نہ رہے تو پھر یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب قربانی کی جگہ وہی ہے جہاں آگے بڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مُحرم کیلئے اس بات کا امکان ہو کہ وہ کسی قاصد کے ذریعے حدودِ حرم میں قربانی ذبح کرنے کا انتظام کر سکتا ہے اور پھر وہاں سے اسے اطلاع بھی پہنچ سکتی ہے تو پھر تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر جہاں روکا گیا ہے وہیں قربانی اللہ کے حضور پیش کر دینی چاہیے۔مزید ایک بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ اسی جگہ قربانیاں پیش کی تھیں جہاں سے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا اور اس جگہ کا نام ''حدیبیہ'' ہے اور آجکل اسے ''شمیسیہ'' کہتے ہیں۔یہ جگہ بالکل حرم کے کنارے پر ہے۔آپ کا پڑاؤ یقیناً حرم سے باہر تھا لیکن آپ کی قربانیاں حرم کے اندر ذبح کی گئی تھیں۔چنانچہ آپ نے جانور ذبح کرنے کے بعد احرام کھول دیا سب صحابہ نے بھی ایسا ہی کیا اور مدینہ منورہ واپس تشریف

Marfat.com

لے گئے اور آئندہ سال آپ نے اس عمرہ کی قضا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مجبوراً راستے میں احرام کھولنا پڑے تو پھر جس نیت سے احرام باندھا گیا اسے پورا کرنا چونکہ ضروری ہے اس لئے آئندہ سال اس کی قضا کرنا ضروری ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا کہ سرمنڈوانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ احرام میں سرمنڈوانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سر میں یا بدن کے کسی دوسرے حصہ میں کوئی ایسی تکلیف لاحق ہو جائے جس سے سر کے بال منڈوانا یا جسم کے کسی حصے کے بال منڈوانا ضروری ہو جائے تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ اس آیتِ کریمہ کے اگلے جملے میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔

حالتِ احرام میں کوئی بال منڈوانے پر مجبور ہو جائے تو کیا کرے؟

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ: جو شخص تم میں سے بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو جائے تو ایسی صورت میں بقدرِ ضرورت بال منڈونے جائز ہیں مگر اس کا فدیہ ادا کرنا پڑے گا۔ وہ فدیہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ ایسا بیمار شخص بال منڈوانے کے بعد سفر جاری رکھنے پر قدرت رکھتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ حدودِ حرم میں پہنچ کر قربانی دے۔ البتہ! روزہ رکھنے اور صدقہ دینے کی کوئی جگہ متعین نہیں ہر جگہ ادا کرسکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے روزوں کی کوئی تعداد اور صدقہ کی کوئی مقدار ذکر نہیں فرمائی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی۔ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے سر میں بے تحاشہ جوئیں پڑ گئیں۔ ان کی انتہائی اذیت کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم تین روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔

اشہرِ حج میں حج وعمرہ کو جمع کرنے کے احکام

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ: اس کا معنی تو یہ ہے کہ ''جب خطرے سے بے خوف ہو جاؤ اور دشمن سے مامون ہو جاؤ'' تو اب تمہارے لئے موقعہ ہے کہ تم عمرہ یا حج کا سفر جاری رکھو چنانچہ ان دونوں کے لئے ضروری احکام دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان احکام کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کا معمول یہ تھا کہ انہوں نے حج اور عمرہ کیلئے الگ الگ مہینے مقرر کر رکھے تھے۔ عمرہ کیلئے رجب کا مہینہ مقرر کیا گیا تھا اور حج کے مہینوں میں عرب عمرہ کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ایک وقت میں یا عمرہ ہوسکتا ہے یا حج، دونوں عبادات اکٹھی نہیں کی جاسکتیں۔ حج کے مہینے شوال، ذیقعد اور ذی الحج کے دس دن ہیں۔ ان دنوں میں وہ عمرہ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس جاہلانہ تصور کو ختم کر دیا۔ البتہ! لوگوں کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے اس حکم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا کیونکہ حج اور عمرہ کرنے والے بھی دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو ان حاجیوں کی ہے جو حدودِ میقات سے باہر سے آتے ہیں اور دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے اللہ کے گھر کی زیارت کے ارادے سے طویل سفر کر کے حدودِ حرم میں داخل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بار بار سفر کرنا آسان نہیں بالخصوص دور دراز کے ملکوں کے رہنے والے تو بسا اوقات ایک دفعہ آنے کیلئے بھی مصارف کے متحمل نہیں ہوسکتے چہ جائیکہ وہ بار بار

Marfat.com

آئیں۔اس لئے ان کی دینی مصلحت کو دیکھتے ہوئے اور اللہ کے گھر کے ساتھ ان کے والہانہ تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری تھا کہ انہیں اس بات کی رعایت دی جاتی کہ وہ چاہیں تو عمرہ اور حج کو اکٹھا کر کے دونوں نیکیوں کے اجر وثواب سے متمتع ہو سکتے ہیں تا کہ انہیں یہ حسرت نہ رہے کہ زندگی میں ایک دفعہ اللہ نے اپنے گھر آنے کا موقعہ دیا ہے تو وہاں ہم حج کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔

میقات کا مفہوم

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو حدودِ میقات کے اندر رہتے ہیں۔میقات وہ معین مقامات ہیں جو اطرافِ عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں۔ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جو شخص بھی مکہ کا ارادہ کر کے یہاں سے گزرے اس کیلئے یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا ضروری ہے کیونکہ اللہ کے گھر کے احترام کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ کوئی شخص اپنی مصنوعی شخصیت اور اپنے ظاہری کروفر کے ساتھ وہاں حاضر ہونے کی جرأت نہ کرے بلکہ جیسے ہی میقات سے آگے بڑھے تو اسے احساس ہو کہ یہاں سے اللہ کے گھر کا خاص ادب شروع ہو جاتا ہے اور اس سرزمین کے خاص آداب ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ان آداب کو بجالاتے ہوئے اس گھر میں پہلی حاضری دی جائے تا کہ تمہارے اندر اللہ کی کبریائی اور اپنی بندگی کا احساس توانا ہو۔میقات کے اندر رہنے والے چونکہ بیت اللہ سے بہت دور نہیں ہیں بعض تو بہت قریب ہیں اور بعض اتنے فاصلے پر ہیں جس فاصلے کو طے کر کے آنا کوئی مشقت کا کام نہیں اس لئے ان کے بارے میں حکم دیا کہ ان کے لئے حج اور عمرہ ایک ہی احرام اور ایک ہی نیت کے ساتھ اور ایک ہی سفر میں کرنا جائز نہیں۔یہ لوگ حج کے مہینوں میں صرف حج کریں البتہ اشہرِ حج کے علاوہ جب جی چاہے عمرہ کر سکتے ہیں۔

حج اور عمرہ کو جمع کرنے کا شکرانہ

البتہ! جو لوگ حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ کو جمع کریں ان پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں۔وہ شکرانہ یہ ہے کہ جس طرح کی قربانی دینے کی قدرت ہو اس طرح کے جانور کی قربانی دی جائے ، بکری ، گائے ، اونٹ ، جو بھی آسان ہو اپنی مالی حیثیت کے مطابق قربانی دی جانی چاہیے۔البتہ! جو شخص مالی حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں ہے اسے اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ دس روزے رکھے اور یہ روزے رکھنا اس کے لئے واجب ہیں۔طریقہ ان کا یہ ہوگا کہ تین روزے ایامِ حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحج تک پورے کر دے۔باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے۔حج سے فارغ ہونے کے بعد اگر مکہ مکرمہ میں مزید قیام ہو تو وہاں رکھ لئے جائیں اور اگر مدینہ منورہ چند دن ٹھہرنے کا اتفاق ہو تو وہاں بھی رکھنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر ان دونوں مقدس شہروں میں اتنا موقع نہ ملے تو اپنے وطن واپس آ کر سات روزے رکھنے کا اختیار ہے۔یہ بات یاد رہے! اگر کوئی شخص تین روزے ایامِ حج میں نہ رکھ سکا تو پھر امام ابوحنیفہ اور اکابر صحابہ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی لازم ہوگا۔جب قدرت ہو کسی کے ذریعے حرم میں قربانی کرا دے۔

Marfat.com

تمتع و قِران

یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ حج کے مہینوں میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ان دونوں کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک کو ''قران'' کہتے ہیں اور دوسری کو ''تمتع''۔قران یہ ہے کہ میقات سے جب احرام باندھا جائے تو حج اور عمرہ دونوں کی نیت کی جائے۔اس میں حج اور عمرہ ایک ہی احرام میں اکٹھے ادا کئے جائیں گے اور دو چیزوں کو اکٹھا کرنے کو چونکہ عربی میں قران کہتے ہیں اس لئے حج کی اس صورت کو حجِ قران کہتے ہیں۔اس میں پابندی یہ کرنا پڑتی ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد احرام نہیں کھولا جا سکتا اگر ابھی ایامِ حج کے آغاز میں چند دن باقی ہیں تو وہ بھی احرام ہی میں گزارنے پڑیں گے پھر اسی احرام میں حج ہوگا۔حج کے اختتام پر عمرہ اور حج دونوں کا احرام کھولا جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میقات سے احرام باندھتے ہوئے صرف عمرہ کی نیت کی جائے اس صورت میں آسانی یہ ہوگی کہ مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کھول دیا جائے گا۔پھر آٹھ ذی الحج کو حج کے ارادہ سے حرم کے اندر سے احرام باندھا جائے گا اور پھر اختتامِ حج پر حج کا احرام کھولا جائے گا۔اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے۔تمتع کا معنی ہے ''فائدہ اٹھانا اور نفع اٹھانا''۔قران اور تمتع چونکہ دونوں میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کی عبادتیں کی جاتی ہیں اس لئے دونوں پر لغوی طور پر تمتع کا لفظ صادق آتا ہے۔لیکن اصطلاح میں حج کی دوسری قسم کو تمتع کہا جاتا ہے۔اس آیتِ کریمہ میں فَمَنْ تَمَتَّعَ سے دونوں صورتیں مراد ہیں۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں تنبیہ کے انداز میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ایک تو یہ کہ تمہارے لئے لازم ہے کہ حج اور عمرہ کی ادائیگی میں قدم قدم پر تقویٰ کو ملحوظ رکھو۔تقویٰ کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ ان دونوں عبادتوں کا جو حق ہے اس سے نظر ہٹنے نہ پائے۔پھر ان دونوں عبادتوں کا ایک مقصد ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں پوری طرح اللہ کی یاد اور اس کی بندگی کا احساس اس طرح گہرا ہو جائے کہ نیکی کی طرف دل لپکتا جائے اور گناہ سے شدید نفرت ہو جائے،اس مقصد کو بھی نقصان نہ پہنچے اسی طرح حج اور عمرہ کے مسائل اور احکام کو پوری طرح سمجھ کر ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ جو آدمی ان عظیم عبادات کے مسائل کو جاننے اور ان کی پابندی کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر نہ عبادت کا شوق ہے اور نہ اللہ کی ذات کی پرواہ۔شاید اسی تقویٰ کی کمی کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ حج کی ادائیگی کا ارادہ کرتے کرتے عمر گزار دیتے ہیں۔اللہ وسائل عطا فرماتا ہے لیکن ہم دوسری ذمہ داریوں کو حج پر ترجیح دیتے ہیں اور جب تک تمام ذمہ داریوں سے فراغت نہیں ہو جاتی اور دنیا کے ہر معرکے کو سر کرنے کی جب تک ہوس ختم نہیں ہوتی اور جسم جواب نہیں دے جاتا اس وقت تک ہم عازمِ حج ہونے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ حج کے دنوں میں یہ دیکھ کر انتہائی پریشانی ہوتی ہے کہ پوری امت میں سے آئے ہوئے حاجیوں میں سے سب سے کمزور اور سب سے عمر رسیدہ برصغیر کے حجاج ہوتے ہیں۔جن کیلئے نماز پڑھنا بھی آسانی سے ممکن نہیں ہوتا،وہ مناسکِ حج کی ادائیگی کو کس طرح آسانی سے ادا کر سکتے ہیں۔جہاں تک مسائل کا تعلق ہے اس کی طرف سے لاپرواہی تو تشویشناک حد تک پہنچی ہوئی ہے۔کتنے حجاجِ کرام کو دیکھا ہے کہ تفصیلی مسائل تو ایک طرف رہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ احرام کس طرح باندھنا ہے اور کیا نیت کرنی ہے۔آپ انہیں پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ آپ نے ماشاء اللہ احرام باندھا ہے تو آپ کس نیت سے جا رہے ہیں؟ تو وہ بڑی وارفتگی کے انداز میں فرمائیں گے کہ سوہنے نے بلایا ہے ہم تو سوہنے کی زیارت کیلئے جا رہے ہیں۔اندازہ فرمایئے! مدینہ کی حاضری ایک بہت بڑی سعادت ہے لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ اس کا

Marfat.com

مناسکِ حج سے کوئی تعلق نہیں۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد حاجی حضور کے درِ دولت پر حاضری دیتے ہیں۔ نیت کرتے ہوئے تو آپ کو یا تو عمرہ کی نیت کرنی ہے اور یا حج کی اور جب آپ نے ان دونوں میں سے کسی کی نیت نہیں کی تو آپ کا حج کیسے ادا ہوگا؟ اور پھر جو احرام کی پابندیاں ہیں مکہ معظمہ اور بیت اللہ کے آداب ہیں، طواف اور باقی مناسکِ حج کے تفصیلی مسائل ہیں، اس کا تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حشر ہوگا؟ اس لئے شاید پروردگار نے آخری جملے میں شدید تنبیہ فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والے ہیں"۔ یعنی جو ان عبادات کی ادائیگی میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرے گا یا احکام کے جاننے میں لاپرواہی برتے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ معاملہ اللہ کے گھر کا، حرم کا اور شعائرِ اسلام کا ہے۔ اس میں کوتاہی عام درجے کی کوتاہی نہیں، جان بوجھ کر کسی بھی کوتاہی کرنے والے کو اللہ سخت عذاب دیں گے۔

چونکہ یہاں اس کا طریقہ سیکھنے اور اس کے مسائل جاننے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں بنیادی مسائل بیان کیے جارہے ہیں۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ
الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَ
اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ
عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ
قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ
وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ

109507

Marfat.com

خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي
الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا
كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ
عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ
اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى
فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا
يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ
فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ
نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا
جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ
اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗئِكَةُ وَ
قُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾

Marfat.com

رکوع: ۲۵۔ (حج کے جانے پہچانے مہینے ہیں، پھر جس شخص نے لازم کرلیا ان میں حج، پھر حج کے زمانے میں نہ تو شہوت کی بات کرنی ہے، نہ گناہ کرنا ہے اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو بیشک بہترین توشہ تقویٰ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو O تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو پس جب عرفات سے چلو تو اللہ کو یاد کرو مشعرِ حرام کے پاس اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں سے تھے O پھر تم پلٹو جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی چاہو، بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے O جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں O اور کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا O یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کئے کا حصہ ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے O اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا O یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کئے کا حصہ ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے O اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی ٹھہر رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں' یہ رعایت اس کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کئے جاؤ گے O اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں اس دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں اور وہ گواہ بناتے ہیں اللہ کو اس پر جو ان کے دل میں ہے اور وہ کٹر دشمن ہیں O اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں' ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچا دیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا O اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو' تو گھمنڈ اور تکبر ان کو پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے' سو ایسے کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے O اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں' اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے O اے ایمان والو اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے O اگر تم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمہارے پاس آچکی ہیں پھسل گئے تو جان رکھو اللہ غالب اور حکمت والا ہے O کیا یہ لوگ منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے اور اللہ کی طرف معاملات لوٹائے جاتے ہیں) (۱۹۷ تا ۲۱۰)

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ

Marfat.com

خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ ○

(حج کے جانے پہچانے مہینے ہیں، پھر جس شخص نے لازم کرلیا ان میں حج، پھر حج کے زمانے میں نہ تو شہوت کی بات کرنی ہے، نہ گناہ کرنا ہے اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو بیشک بہترین توشہ تقویٰ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو) (۱۹۷)

مَعْلُوْمٰتٌ کا مفہوم

اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: ''حج کے معلوم اور جانے پہچانے مہینے ہیں''۔ بعض اہلِ علم نے مَعْلُوْمٰتٌ کو معدودات کے معنی میں لیا ہے یعنی ''گنے چنے'' اور پھر اس سے انہوں نے تسلی کا مضمون پیدا کیا ہے حالانکہ بتانا یہ مقصود معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آج تک عرب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ حج کے مہینے شوال ذی القعد اور ذی الحج کے دس دن ہیں۔ اس لئے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ عربوں نے جو ایک نسی کا قاعدہ بنالیا تھا جس سے وہ اشھرِ حرم میں تبدیلی کرتے رہتے تھے۔ ان کے اس قاعدے سے نہ اشھرِ حرم تبدیل ہوسکتے ہیں اور نہ اشھرِ حج بدل سکتے ہیں۔ نیز یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ شوال سے پہلے فریضۂ حج کی ادائیگی کی نیت نہیں ہوسکتی اور نہ احرام باندھا جاسکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے ایسا کیا تو بعض ائمہ کے نزدیک ایسا کرنا نہ صرف گناہ ہے بلکہ اس احرام میں حج بھی ادا نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ اگرچہ ادائیگی کے قائل تو ہیں لیکن مکروہ قرار دیتے ہیں۔

حج کے دنوں میں حج کی ادائیگی کے سوا کوئی اور مقصود نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد میں جو چیزیں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہیں اور یا اس کو بے روح بناسکتی ہیں اور یا اس کو تربیت کے اعتبار سے بے اثر کرسکتی ہیں انہیں سب سے پہلے بیان کیا جارہا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ حج کے دنوں میں نہ رفث ہے نہ فسوق اور نہ جدال۔

حج میں رفث، فسوق اور جدال کی ممانعت

یہاں غور فرمایئے! ''لا'' ''نہی'' کیلئے نہیں ہے بلکہ ''نفی'' کیلئے ہے۔ اگر لا نہی کیلئے ہوتا تو اس کا معنی ہوتا: لَا تَرْفُثُوْا وَلَا تَفْسُقُوْا وَلَا تُجَادِلُوْا یعنی ان برائیوں کو چھوڑنے کا حکم دیا جاتا۔ اس کی بجائے لائے نفی لا کر یہ اشارہ کیا جارہا ہے کہ یوں تو رفث اور فسق اور جدال ہمیشہ کیلئے ناجائز ہیں لیکن ایامِ حج میں بطورِ خاص ان برائیوں کا کوئی تصور ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی سوال جواز اور عدم جواز کا نہیں بلکہ اس کی جڑ مار دینے کی بات ہورہی ہے۔ جو آدمی حج کے ارادے سے مکہ معظمہ پہنچا ہے اس کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ تم جس عبادت کی انجام دہی کیلئے یہاں آئے ہو اس کا ان بداخلاقیوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ جس طرح آگ اور پانی اکٹھے نہیں ہوسکتے اسی طرح فریضہ حج اور یہ تین برائیاں اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

Marfat.com

رَفَث کا مفہوم

رَفَث کا معنی ہے' بے حجاب ہو جانا' لیکن شریعت میں بے حیائی کی کھلی باتوں کو بھی رَفَث کہا گیا ہے۔ بے حیائی کی معمولی بات بیوی کے علاوہ کسی اور سے تو ویسے ہی حرام ہے یہاں دوسرے لوگوں کے بارے میں نہیں بلکہ بیوی کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ میاں بیوی کا آپس میں بے حجاب ہونا، مباشرت کرنا یا آپس میں شہوانی باتیں کرنا حج کے دنوں میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ رَفَث کا ذکر سب سے پہلے اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ فریضہ حج کیلئے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ بعض دوسری کوتاہیوں کی حج کے دوران کوئی نہ کوئی تلافی ہوسکتی ہے لیکن میاں بیوی کا آپس میں ملنا بعض صورتوں میں حج کو ختم کر دینے کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے عرفات میں حاضری سے پہلے اپنی بیوی سے مباشرت کر لی تو اس کا حج فاسد ہو جائے گا۔ اسے جرمانے کے طور پر اونٹ یا گائے ذبح کرنا پڑی گی اور پھر آئندہ سال اس حج کی قضا لازم ہوگی۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی سب سے پہلے ذکر کرنے کی حکمت کیا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حج ایک اجتماعی اور پرہجوم عبادت ہے جس میں قدم قدم پر مرد و زن کا اختلاط ہوتا ہے اور پھر احرام کی حالت میں عورتوں کے چہرے ویسے بھی کھلے ہوتے ہیں ہر وقت ایک دوسرے پر نظر پڑنے کا موقعہ رہتا ہے ایسی صورت میں حاجی اگر اپنے نفس کو لگام نہ دے اور اپنی خواہشات پر تقویٰ کی زنجیر نہ باندھے تو اس کی نگاہیں کسی وقت بھی آوارہ ہو سکتی ہیں۔

فسوق کا مفہوم

دوسری برائی جس سے روکا گیا ہے وہ ہے، فسوق. فسوق اور فسق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا مطلب تو ہوتا ہے "حد سے گزر جانا"۔ لیکن یہاں شریعت کے احکام کی نافرمانی مراد ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جن جن باتوں سے روکا ہے انہیں کرنا اور جنہیں کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں نہ کرنا فسق اور نافرمانی ہے۔ اگر اس کو عام معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حج کے دوران شریعت کے کسی حکم کی بھی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یوں تو ایک مومن کی عام زندگی بھی اللہ کے احکام کی پابند ہے لیکن حج کے دوران اس پابندی کا احساس کئی گنا بڑھ جانا چاہیے۔ لیکن اگر اسے خاص معنوں میں لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ احرام کی حالت میں حج کے دوران جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کا توڑنا فسق ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات تو یہی ہے جس کا رَفَث کے نام سے ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ حدودِ حرم میں کسی جانور کا شکار کرنا یا کسی کو شکار کی اطلاع دینا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، اپنے ناخن کاٹنا اور جسم کے بال اکھیڑنا یا توڑنا حتی کے اگر جوئیں پڑ جائیں تو جوئیں مارنا، مردوں کیلئے بطورِ خاص سر اور چہرہ کھلا رکھنا اور عورتوں کیلئے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چہرہ کھلا رکھنا سر کا تو ایک بال بھی ننگا نہیں ہونا چاہیے، چہرہ کھلا رکھنا ضروری ہے مگر مردوں کی نگاہوں سے بچنے کیلئے اپنے چہرے کے سامنے کوئی اوٹ کر لینی چاہیے۔ یہ وہ پابندیاں ہیں جن کی مخالفت کرنا اور جن کی پرواہ نہ کرنا فسق اور فسوق کہلاتا ہے۔

Marfat.com

جدال کا مفہوم

تیسری چیز جس سے روکا گیا ہے وہ جدال ہے۔ جدال کا لفظی معنی تو ''جھگڑا کرنا'' ہے۔ یہاں بھی جھگڑا کرنا ہی مراد ہے۔ البتہ اس میں جھگڑے کی تمام اصناف شامل ہیں۔ اس کا حکم بطورِ خاص اس لئے دیا گیا ہے کہ سفر کے دوران یا مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کی حالت میں پھر خصوصاً ایام حج میں منٰی اور عرفات میں قدم قدم پر جھگڑے کا امکان ہوتا ہے۔ انسان جو اپنی شخصیت اور طبیعت کی تہوں میں اپنی بہت ساری کمزوریوں کو چھپائے رکھتا ہے سفر کے دوران یہ ساری کمزوریاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور اگر یہ سفر طویل بھی ہو اور کئی دنوں پر محیط بھی تو پھر تو شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو گا جو اپنے آپ کو سفر کے اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں جہاں مختلف طبیعتیں باہمی طبعی اختلاف کے باعث ایک دوسرے سے الجھتی ہیں۔ ایک کمرے میں رہنے والے سامان رکھنے اور بستر بچھانے میں اختلاف کرتے ہیں، بس پر چڑھتے ہوئے سیٹ کے حصول کیلئے اور معمولی آرام کی طلب میں ایک دوسرے کی عزتِ نفس پامال کرتے ہیں، وضو خانوں اور بیت الخلا کے سامنے لگی قطاروں میں نجانے کتنی زبانیں بے لگام ہوجاتی ہیں، بازاروں میں اشیائے ضرورت خریدتے ہوئے نجانے کس کس سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے، دوسروں کو تو جانے دیجئے خود میاں بیوی اور رفقائے سفر میں سے قریبی عزیز تک ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے تنبیہ کردی گئی ہے کہ اگر تم واقعی حج کو ایک عبادت سمجھ کرادا کر رہے ہو تو تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیے کہ جب تک تم اپنی نگاہوں کو پاکیزہ، اپنے قلب و دماغ کو شائستہ اور اپنے جذبات کو ہر حال میں آسودہ رکھنے کی کوشش نہیں کرو گے اور یہ فیصلہ نہیں کرلو گے کہ یہاں مجھے کسی کا دل نہیں دکھانا کیونکہ اس سے بڑی برائی کوئی نہیں مجھے ہر حال میں اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اس کی رضا کیلئے نوافل کی کثرت اور طوافوں کا کثیر سرمایہ بھی درکار ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات، اپنی عادات اور اپنے رجحانات کی اصلاح بھی ضروری ہے جو اس سفر کے ذریعے کی جارہی ہے۔ وہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ ہم ان تین بنیادی کمزوریوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ مزید فرمایا:

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ: ''تم جو بھی بھلائی کا کام کرو گے اسے اللہ جانتا ہے''۔ تم صرف یہ نہ سمجھو کہ ان چند منفی ہدایات پر عمل کرنا ہی کافی ہے بلکہ تمہیں خیر اور نیکی کا حریص ہونا چاہیے۔ اس لئے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارنے کی کوشش کرو۔ زیادہ سے زیادہ طواف کرو کیونکہ طواف وہ عبادت ہے جو دنیا کے کسی اور حصے میں ممکن نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔ تم کسی کی معمولی تکلیف میں کام آؤ گے تو وہ بھی اللہ کے علم میں ہے، وہ نجانے کس قدر بیش بہا اجر سے نوازے گا۔ اس کے بعد فرمایا:

دورِ جاہلیت کی ایک رسم کی تردید

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى: ''اور زادِ راہ لے کر چلو بیشک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے''۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عربوں نے نیکی کے بعض تصورات ایسے بنالیے تھے جو سراسر جہالت اور بے خبری پر مبنی تھے اور جس کے نتیجے میں کئی مفاسد پیدا ہو رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے گھر کا طواف اور اس کا حج سراسر ایک عاشقانہ عبادت ہے۔ احرام دیوانگی کا لباس ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں دیوانۂ عشق بن کر اللہ کے گھر میں پہنچنا چاہئے۔ دیوانے اپنے ساتھ توشۂ سفر لے کر تو نہیں نکلا کرتے۔ یہ

Marfat.com

کمانا اور کھانا پینا تو دنیاداری ہے تو کیا اللہ کے گھر جاتے ہوئے بھی ہم دنیاداری سے توبہ نہیں کریں گے؟ چنانچہ وہ جب حج کے ارادے سے نکلتے تو خالی ہاتھ نکلتے راستے میں جو نہیں میسر آجاتا اس سے پیٹ بھر لیتے یا پھر لوگوں سے مانگ کر اپنی ضرورتیں پوری کرتے اور اسے وہ بہت بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ یہاں ان کے اس تصور کی تردید کی جارہی ہے اور حکم دیا جارہا ہے کہ تم جب حج کیلئے نکلو تو زادِ سفر لے کر نکلو، لوگوں سے مانگنا اور لوگوں پر بوجھ بننا یہ کون سی نیکی اور کون سی عقل کی بات ہے؟ اگر ہر آدمی اس تصور کو قبول کر لے تو اب تو کتنے لوگ بیت اللہ تک زندہ پہنچیں گے یا زندہ واپس آئیں گے۔ رہی یہ بات کہ تم اسے دنیاداری سمجھتے ہو اور تمہارے نزدیک دیوانگی کے اس سفر میں تمہیں خالص اللہ والا بن کر وہاں پہنچنا چاہیے۔ تو یہ تمہاری بھول ہے، اللہ سے تعلق مانگنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جب تم نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے تو اللہ سے تعلق تو اسی وقت ختم ہو گیا۔ اللہ سے تعلق دل کی پاکیزگی اور دل کے اللہ کی طرف میلان سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دل میں اس بات کا یقین اتر جاتا ہے کہ میں اللہ کے علم کے حصار میں ہوں اس کی قدرت مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ میں معمولی بندہ ہوں وہ میرا آقا ہے مجھے ہر حال میں اسی کی بندگی کرنی ہے تاکہ وہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ اصل میں یہ وہ زادِ سفر ہے جو زندگی کے سفر میں کام آتا ہے۔ اگر تم واقعی اس حقیقت کو سمجھتے ہو تو پھر اے عقل والو! مجھ سے ڈرو اور میرا ہی تقویٰ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۪ وَاذۡکُرُوۡہُ کَمَا ہَدٰىکُمۡ ۚ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ ○

(تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو پس جب عرفات سے چلو تو اللہ کو یاد کرو مشعرِ حرام کے پاس اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں سے تھے) (۱۹۸)

حج میں حصولِ رزق کی اجازت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ حج کا اصل مقصود تقویٰ ہے۔ اس کا زادِ راہ بھی تقویٰ ہے۔ اس لئے حج کے دوران کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہیے جس سے تقویٰ کی کیفیت کو نقصان پہنچے اور دل کی وہ کیفیت جس میں اللہ کا خوف اور محبت بسی ہونی چاہیے اس میں کسی طرح کی کمی آئے۔ اس دور کے مسلمان جنہیں ہم اصحابِ رسول کے نام سے یاد کرتے ہیں ان کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ وہ قرآن کی ہر ہدایت کو حرزِ جان بنا لیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی تربیت ان کا اصل سرمایہ تھی۔ انہوں نے جب قرآنِ کریم اور آنحضرت کی تربیت کا سارا زور تقویٰ پر دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ حج کے دوران کسی طرح کا بھی کام جس سے مقصود کچھ کمانا اور فائدہ اٹھانا ہو نہیں ہونا چاہیے۔ حالات چاہے مالی لحاظ سے کتنے ہی ناموافق ہوں ہمیں ساری توجہ مناسکِ حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ ذکر اللہ اور عبادت پر رکھنی چاہیے۔ چنانچہ صحابہ میں سے جو لوگ حج کے دوران جائز طریقے سے تجارت کے ذریعے یا مزدوری کر کے اپنی کچھ ضرورتیں پوری کر لیتے تھے۔ انہوں نے بھی اس سے ہاتھ کھینچ لیا اور جن لوگوں کا حج کے دوران کوئی کاروبار تھا ان کیلئے پریشانی پیدا ہوئی اور ان میں سے بعض لوگوں نے اس کے بارے سوال بھی کرنا چاہا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک صاحب حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آئے اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ

Marfat.com

پہلے سے یہ ہے کہ ہم کرایہ پر اونٹ چلاتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کیلئے کرایہ پر لے جاتے ہیں، ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔ کیا ہمارا حج صحیح نہیں ہوگا؟ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور آپ سے وہی سوال کیا تھا جو تم مجھ سے کر رہے ہو۔ آنحضرت ﷺ نے اس وقت اس کو کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اس وقت آپ نے اس شخص کو بلایا اور فرمایا کہ ہاں! تمہارا حج صحیح ہے۔ مختصر یہ کہ اس آیت نے مسلمانوں کیلئے ایک سہولت پیدا کر دی اور بتایا کہ حج یقیناً اللہ کی عبادت کا نام ہے اور عبادت نہایت مخلصانہ ہونی چاہیے اور آئندہ زندگی کی اصلاح کیلئے حج کو ذریعہ بن جانا چاہیے۔ وہ اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ للّٰہیت، اخلاص، اللہ اس کے رسول اور اس کے دین سے وارفتگی اور مرکزِ اسلام سے بے پناہ تعلق اور دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے ایک تڑپ پیدا ہو۔ لیکن اگر اس دوران ضروریات کے حصول کیلئے کوئی چھوٹی موٹی تجارت یا کوئی مزدوری کر لی جائے تو اس میں تمہارے لئے کوئی گناہ نہیں۔ البتہ! اس میں دو باتوں کی احتیاط ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ تجارت اور مزدوری حج کی مصروفیات پر غالب نہ آنے پائے اور تعلق باللہ کو کمزور کرنے کا باعث نہ بنے اور دوسری یہ کہ تجارت یا مزدوری یا کسبِ معاش کا کوئی طریقہ اسلام کے بتائے ہوئے جائز اور حلال طریقوں کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ جو کسب اور اکتساب اور کمائی حلال طریقے اور باہمی رضامندی سے ہوتی ہے اسے قرآن کریم نے اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ یہاں بھی فضل کا لفظ بول کر اسی جانب اشارہ ہے اور مزید یہ بات کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کام کرنا حج کے دوران بہت پسندیدہ تو نہیں لیکن اگر ضرورت کے تحت تم کر لو تو تمہیں اس کا گناہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے علماء کرام نے احتیاط سکھاتے ہوئے یہ نصیحت کی ہے کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں افعالِ حج ادا کئے جاتے ہیں ان میں تجارت یا مزدوری کی کوئی مشغولیت نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان ایام کو خالص عبادت اور ذکر میں گزارا جائے۔ بعض علماء نے شدتِ احساس کے پیشِ نظر ان ایام میں تجارت اور مزدوری کو ممنوع قرار دیا ہے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ: ''پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کی یاد کرو''۔ یہ دوسرا حکم ہے جو اس آیتِ کریمہ میں دیا گیا ہے۔ اس میں عرفات اور مشعرِ حرام کا ذکر آیا ہے۔ سب سے پہلے انہیں سمجھ لیجیے۔

عرفات اور مشعر الحرام کا تعارف

''عرفات'' وہ میدان ہے جو مکہ معظمہ سے تقریباً نو میل کے فاصلے پر ہے۔ 9 ذی الحج کو حجاجِ کرام عرفات پہنچتے ہیں۔ اگر امام کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھیں تو ظہر اور عصر اکٹھی پڑھتے ہیں اور حج کا خطبہ سنتے ہیں اور اگر اپنے خیموں میں پڑھیں تو ظہر اور عصر کو اپنے اپنے وقتوں میں پڑھتے ہیں۔ زوالِ آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے۔ جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہو سکتا اس طرح سے صعوبتِ سفر اٹھانے اور مصارفِ حج ادا کرنے کے باوجود حاجی حج سے محروم رہتا ہے اور اگلے سال یا جب توفیق ہو اس حج کی قضا کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی میدان میں ''جبلِ رحمت'' ہے، جس کے دامن میں حضور نے دعائیں مانگی تھیں اور اونٹنی پر خطبۂ حج ارشاد فرمایا تھا۔ اور وہ خطبہ، ''خطبۂ حجۃ الوداع'' کے نام سے مسلمانوں کی ہدایت کا بہت بڑا سرمایہ اور انسانیت کا عظیم ورثہ ہے۔

Marfat.com

عرفات کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کوئی ایک بات کہنا بہت مشکل ہے۔لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں جن میں کوئی بھی مصدقہ نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام اور حضرتِ حوا علیہا السلام زمین پر اترنے کے بعد یہیں ایک دوسرے سے ملے تھے اور ہوسکتا ہے یہیں کہیں ان کا قیام رہا ہو۔اس لئے کہ حضرتِ حوا کی قبر جدہ میں بتائی جاتی ہے اور جدہ کو حضرتِ حوا کی نسبت کی وجہ سے شاید جدہ (دادی) کہا جاتا ہے۔لیکن تاریخی طور پر ان میں کوئی بات یقینی نہیں۔بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ اسے عرفات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت اور ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے۔نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقعہ ملتا ہے۔۹ تاریخ کی شام غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی مغرب کی نماز ادا کئے بغیر وہاں سے نکلنا ہوتا ہے۔

مکہ معظمہ کی طرف آتے ہوئے عرفات سے تین میل کے فاصلے پر ایک میدان آتا ہے جسے ''مزدلفہ'' کہا جاتا ہے یہ مزدلفہ وہ میدان ہے جو مشعر الحرام کے اردگرد پھیلا ہوا ہے اور مشعر الحرام ایک پہاڑ ہے۔مشعر کا معنیٰ ''شعار اور علامت'' کے ہیں۔اور حرام ''محترم اور مقدس'' کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ یہ پہاڑ شعارِ اسلام کے اظہار کیلئے ایک مقدس مقام ہے۔اس پہاڑ کے قریب میدان کے کسی حصہ میں رات گزارنا اور مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کا ایک وقت میں پڑھنا واجب ہے۔یہاں پہنچتے پہنچتے رات ڈھلنے لگتی ہے مغرب کی نماز کا وقت گزر چکا ہوتا ہے لیکن اسے قضا نہیں کیا جاتا بلکہ باری باری دونوں نمازیں امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔مشعر الحرام کے پاس ایک مسجد ہے جس میں امامِ وقت نماز پڑھاتا ہے لیکن دور دور پھیلے ہوئے لوگ اپنے طور پر نماز پڑھ لیتے ہیں یا جماعت کا انتظام کر لیتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم عرفات سے واپسی پر نہ تو سیدھے منیٰ نکل جاؤ اور نہ ایسا کرو کہ تم مزدلفہ میں اپنی خواہشات کے مطابق اپنی دلچسپیوں میں رات گزار دو۔دورِ جاہلیت میں عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب مزدلفہ میں پہنچتے آگ جلاتے مجلسیں جماتے، مشاعروں کی مجالس منعقد ہوتیں، پوری رات مختلف تفریحات میں گزار دی جاتی۔وہ احرام میں ہوتے ہوئے بھی یہ بات بھول جاتے تھے کہ احرام کا تقاضا کیا ہے اور ہم صرف اللہ کی یاد کیلئے ان دنوں گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔اس لئے انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ مشعر الحرام کا پہاڑ اپنے نام سے ہی تمہیں کچھ پیغام دے رہا ہے کہ تمہیں یہاں صرف اللہ کا ذکر کرنا چاہیے خواہشات پر مبنی مصروفیات اور تفریحات اس میدان میں نہیں ہونی چاہئیں۔

ذکر اللہ کا صحیح طریقہ

دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ''تم نے اگر ایک طرف حج کو بھی تفریح میں بدل دیا ہے تو دوسری طرف تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں جو لوگ اللہ کا ذکر کرنا چاہتے بھی ہیں وہ بھی اپنی مرضی اور اپنی منشا کو سب سے بڑا رہنما سمجھتے ہیں۔جو ان کے جی میں آتا ہے اور جیسا مناسب سمجھتے ہیں ویسے اللہ کو یاد کرتے ہیں اب مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے اب تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی۔ان میں سب سے بڑی ہدایت یہ ہے کہ تم مغرب اور عشا کو ملا کر مزدلفہ میں ادا کرو کیونکہ یہ اس رات اور اس میدان کی مخصوص عبادت ہے اور پھر جس طرح آنحضرت ﷺ نے اس رات میں دعائیں مانگیں اور نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک آپ ذکر اللہ میں مصروف رہے یہ وہ طریقہ ہے جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے۔اس جملے سے ہمیں ایک اصولی ہدایت ملتی ہے کہ ذکر اللہ اور

Marfat.com

عبادت کی ادائیگی میں انسان خود مختار نہیں کہ جس طرح چاہے اور جس وقت چاہے اللہ کو یاد کرے بلکہ اس کے ذکر اور اس کی عبادت کے خاص آداب ہیں ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے اس کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ اس میں کمی بیشی یا تکریم و تعظیم کسی طرح روا نہیں۔ عربوں نے بھی اس میں یہی غلطی کی تھی کہ ملتِ ابراہیم میں ان کو جو مناسکِ حج سکھائے گئے تھے اور ذکر اللہ کا جو طریقہ بتایا تھا ان میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر ڈالی۔ مسلمانوں سے بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ تم یہ غلطی نہ کرو اور یہ ہدایت فریضہ حج کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ باقی تمام عبادات میں بھی یہی اصول پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں عقل کام نہیں دیتی اور نہ اس میں اپنی مرضی چلتی ہے۔ اذان، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور اس کے ذکر کے طریقے یہ سب عبادات ہیں۔ اس میں قرآن و سنت نے جس طرح ہدایات دی ہیں ہم اس کے پابند ہیں۔ اس میں اپنی طرف سے یہ سمجھ کر اضافہ کرنا کہ اس سے شاید زیادہ ثواب ملے گا اور اللہ خوش ہوگا یہی وہ گمراہی ہے جس نے امتوں کو صراطِ مستقیم سے دور کیا ہے۔ مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیے اور اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(پھر تم پلٹو جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی چاہو، بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (۱۹۹)

ایک رسم بد کی اصلاح

اس آیتِ کریمہ میں قریش کی ایک رسمِ بد کی اصلاح کی جا رہی ہے۔ حضرتِ ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے سے عربوں کا طریقہ حج یہ تھا کہ وہ نو ذی الحج کو منیٰ سے عرفات جاتے تھے اور شام کو وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ پھر اگلے دن صبح کو منیٰ کا رخ کرتے تھے لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جب قریش میں ملتِ ابراہیم سے انحراف شروع ہوا تو جہاں ان میں اور خرابیاں آئیں وہیں مناسکِ حج کی ادائیگی میں بھی کمی بیشی ہوئی۔ پہلے وہ اپنے آپ کو بیت اللہ کے خدام سمجھتے تھے اور حاجیوں کی خدمت اور دینی ماحول کی نگرانی ان کی ذمہ داری تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اللہ کے گھر کے پروہت بن گئے اور برہمنیت کی ذہنیت ان میں پیدا ہوگئی۔ اس جھوٹے پندار کا شکار ہو کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم چونکہ اہلِ حرم ہیں ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں کیونکہ حرم کی حدود عرفات سے کچھ پہلے ختم ہو جاتی ہیں اور عرفات کا سارا علاقہ حدودِ حرم سے باہر ہے۔ حرم کے پروہت ہونے کی وجہ سے وہ یہ بات اپنی شانِ امتیاز کے خلاف سمجھتے تھے کہ ہم حج کی ادائیگی کیلئے حرم کی حدود سے باہر نکلیں۔ چنانچہ یہ مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے واپس لوٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کیلئے چھوڑ دیتے۔ شروع میں تو یہ امتیاز صرف قریش میں پیدا ہوا پھر رفتہ رفتہ بنی خزاعہ اور بنو کنانہ اور چند دوسرے ایسے قبیلوں نے بھی یہی روش اپنالی کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قریش کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتوں میں شریک ہونے کے باعث ان کا مرتبہ بھی قریش کے برابر ہو گیا ہے۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے وہ بھی اپنے آپ کو باقی عربوں سے ممتاز سمجھنے لگے اور انہوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں ان سب کے فخر و غرور کے بت کو توڑا گیا ہے اور سب کو حکم دیا گیا ہے کہ جس طرح باقی تمام لوگ عرفات سے ہو کر لوٹتے ہیں تمہیں بھی عرفات سے عرفات کے وقوف کے بعد لوٹنا چاہیے اور اسے قیامت

Marfat.com

تک مسلمانوں کیلئے لازم کر دیا گیا بلکہ آنحضرت ﷺ نے یہاں تک فرمایا: الحج عرفۃ ''حج تو عرفات کی حاضری کا نام ہے''۔کوئی آدمی اگر عرفات میں حاضر نہیں ہوتا تو یہ ایسا اہم رکن ہے کہ ایسے شخص کا حج ادا نہیں ہوتا۔ حاجی وہاں زوالِ آفتاب تک پہنچ جاتے ہیں۔جن لوگوں کو مسجد نمرہ میں جگہ مل جاتی ہے وہ مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ امام کے پیچھے ادا کرتے ہیں اور اس سے پہلے حج کا خطبہ سنتے ہیں۔اور جن لوگوں کو مسجد میں جگہ نہیں ملتی وہ اپنے اپنے خیموں میں ظہر اور عصر اپنے اپنے وقتوں میں پڑھتے ہیں اور پھر ظہر یا عصر کے بعد لوگ اپنے خیموں میں یا باہر کھلی جگہ میں یا جبلِ رحمت کے دامن میں غروبِ آفتاب تک دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں کا ایک ایک لمحہ زندگی کا حاصل ہے۔اس لئے ہر سمجھدار حاجی ایک ایک لمحے کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے لئے کچھ مانگ لینا چاہتا ہے۔اللہ کی یاد میں ڈوب کر اس کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔پھر جیسے ہی توپ کا فائر غروبِ آفتاب کا اعلان کرتا ہے حاجی فوراً عرفات سے روانہ ہو جاتے ہیں کیونکہ عرفات میں مغرب کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔اب حکم یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچو اور وہاں مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ ادا کرو۔

قریش چونکہ اس سے پہلے عرفات کی حاضری کو چھوڑ کر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر چکے تھے اس لئے انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ اب اگرچہ اسلام لانے کے بعد تمہارے پہلے گناہ معاف ہو چکے ہیں لیکن وہ فخر و غرور جو تمہاری گھٹی میں پڑ چکا ہے ممکن ہے اس کے اثرات کچھ اب بھی باقی ہوں۔اس لئے بار بار اللہ سے استغفار کرو اور اپنے اس تصور کی اصلاح کیلئے اللہ سے معافی مانگو تاکہ تمہارے اندر کا یہ بت ٹوٹ جائے۔

اسلام نے جن برائیوں سے بڑی تاکید کے ساتھ روکا ہے اور جس کے ارتکاب کرنے والے کیلئے سخت ترین وعید سنائی ہے ان میں سے ایک نہایت خطرناک برائی کبر اور نخوت ہے۔آنحضرت نے یہاں تک فرمایا کہ جس آدمی کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت کی بو نہیں سونگھ سکے گا۔پھر نماز کے ذریعے مسلمانوں میں مساوات اور یکسانی پیدا کرنے کی پانچ وقت اس طرح تربیت دی گئی کہ اگر یہ عبادت شعور کے ساتھ انجام دی جائے تو کبر اور نخوت کا کوئی شائبہ بھی دل میں باقی نہیں رہ سکتا۔لیکن حج کی عبادت ایک ایسی عبادت ہے جس میں قدم قدم پر انسانی مساوات اور اونچ نیچ کے خاتمے کا درس دیا گیا ہے۔سب کو ایک جیسے لباس میں ملفوف کر دیا جاتا ہے۔سب کی زبانوں پر ایک ہی ترانہ گونجتا ہے، سب ایک طرح کے اعمال بجالانے کے پابند کیے جاتے ہیں۔کالے گورے، امیر و غریب، حاکم و محکوم کے فرق کے بغیر یکساں طور پر سب کو اللہ کے گھر کا طواف کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔یہ سب کچھ اس لئے کرایا جاتا ہے تاکہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مرض اور سب سے بڑا عارضہ جسے فخر و غرور اور چھوٹے بڑے میں امتیاز کا نام دیا جاتا ہے وجود میں نہ آنے پائے۔چونکہ یہ ایک ایسا مرض ہے کہ جب بھی کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔باہمی احساسات تباہ ہو جاتے ہیں۔محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔اور امتِ مسلمہ جو کسی ایک رنگ یا نسل کے لوگوں کا نام نہیں بلکہ ایک عقیدے اور عمل کی وحدت کا نام ہے۔جس میں مختلف انسانی گروہ اور مختلف انسانی نسلیں اور مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف جغرافیاؤں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہو کر محض ایک نظریے کی قوت اور ایک عقیدے کی وحدت کی وجہ سے ایک امت کو تشکیل دیتے ہیں۔اس میں ابوذر غفاری اور بلال نہ صرف کہ ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں بلکہ زندگی کے ہر مرحلے میں ہر لحاظ سے یکساں ہیں۔اس امت میں حضور کے حقیقی چچا کیلئے ایمان نہ لانے کے باعث کوئی جگہ نہیں لیکن حسن جو بصرہ سے آئے ، بلال حبش سے اور صہیب روم سے ان کا اس امت میں ایک نمایاں مقام ہے۔اگر ایسی امت میں تفریق، اونچ نیچ، نسلی تفاوت اور طبقاتی احساس پیدا ہو جائے تو یہ امت نہ صرف اپنی قوت کھو دے گی بلکہ اپنا وجود بھی باقی نہ رکھ سکے گی۔اس لئے حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید سے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔
جہاں کہیں بھی امتِ مسلمہ کی اس وحدت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو حضور نے اس کیلئے سخت احکام جاری فرمائے اور قرآنِ کریم نے نہایت ہولناک انجام سے ڈرایا۔ حج جیسی عبادت جو سرتاپا اس بنیادی احساس کو پیدا کرنے والی عبادت ہے اس میں اگر اس طرح کا کوئی حادثہ واقع ہو جائے جیسے قریش کا عمل تھا تو یہ اس امت کے لئے نہایت تباہ کن بات ہوگی۔ اس لئے یہاں بطورِ خاص اس برائی کی تردید فرمائی گئی۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ
فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝
(جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ۝ (۲۰۰)

مزید اعمال بد کی اصلاح

ان آیاتِ کریمہ میں پروردگار نے کچھ اعمالِ بد کی اصلاح فرمائی ہے جن میں عرب مبتلا تھے اور کچھ خیالات اور تصورات کو صحیح رخ عطا فرمایا ہے جن کے غلط ہونے کے باعث عربوں کی زندگی یا تو بے مقصد ہو گئی تھی اور یا غلط مقاصد کیلئے وقف ہو گئی تھی۔
حاجی جب مزدلفہ سے منیٰ پہنچتے ہیں تو اب انہیں احرام کھولنے سے پہلے دو کام کرنا ہوتے ہیں ایک ہے رمیِ جمرات اور دوسرا ہے حج کے شکرانے کے طور پر کسی جانور کی قربانی۔ ان دو کاموں کے بعد حاجی احرام کھول دیتے ہیں اور حج کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد طوافِ زیارت کیلئے کسی وقت بھی جایا جا سکتا ہے۔ منیٰ کے باقی قیام میں رمیِ جمرات کے سوا اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔ دورِ جاہلیت میں عربوں نے اس فراغت کے وقت کو جسے ذکر اللہ میں گزرنا چاہیے تھا ایسے معمولات اور مصروفیات کی نذر کر دیا تھا جس نے حج کے تمام اثرات کو زائل کر کے رکھ دیا۔ پورے جزیرۂ عرب میں پھیلے ہوئے قبیلوں سے چھن چھن کر لوگ ہر سال یہاں جمع ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شعرا بھی ہوتے تھے اور بڑے بڑے خطبا بھی۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں اپنی جسمانی قوت پر ناز ہوتا تھا اور ایسے لوگ بھی جو ڈھیروں مالِ تجارت لے کر یہاں آئے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے ذوق کی تسکین اور تفریحِ طبع کیلئے مصروفیات پیدا کر لیتا تھا۔ بڑے بڑے مشاعروں کی مجلسیں جمتیں اور شعر و شاعری کے مقابلے ہوتے۔ چونکہ عرب حافظے میں بے مثل واقع ہوئے تھے اس لئے ایک ہی نشست میں سنے ہوئے اشعار ان کے حافظے میں پیوست ہو جاتے تھے۔ مجالسِ مشاعرہ کے ساتھ ساتھ زبان دانی اور طلاقتِ لسانی کے بھی معرکے ہوتے۔ خطیب اور زبان آور لوگ اپنی اپنی مہارت کے جوہر دکھاتے۔ جس کے نتیجے میں عربی زبان کو نادر الفاظ، ضرب الامثال، تلمیحات، تشبیہات، اور محاورات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہاتھ آتا۔ جسمانی توانائی کے حامل لوگ کشتی اور اس طرح کے دوسرے فنون کا اظہار کرتے۔ بڑے بڑے دنگل ہوتے، بڑے بڑے پہلوانوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہوتا۔ جو ان معرکوں میں سرخرو ٹھہرتا پورے عرب میں اس کی شہرت پھیل جاتی۔ پھر انہی لوگوں میں سے طبقۂ امرا سے تعلق رکھنے والے اپنے مالِ تجارت سے بازاروں کی صورت پیدا کر دیتے۔ اور ایک سے ایک

Marfat.com

بڑھ کر کاروباری منڈیاں وجود میں آجاتیں۔ ہر سال یہ ہنگامے، یہ رنگا رنگی، یہ مصروفیات اور یہ تفریحِ طبع کا سامان عربوں کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکا تھا اور اس کے اپنے فوائد بھی تھے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ فریضۂ حج جس مقصد کیلئے فرض کیا گیا تھا اور بیت اللہ سے جو پیغام دیا جا رہا تھا اور احرام، تلبیہ، اور قربانیاں جس کی یاد کیلئے کی جا رہی تھیں وہ تو سب کچھ اس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ چنانچہ اس پوری صورتحال کو بدلنے کیلئے حکم دیا جا رہا ہے کہ تم جو سینکڑوں میلوں کا سفر اہل و عیال کی مفارقت اور ہزاروں روپے کے مصارت کے بعد یہاں پہنچے ہو تو کیا اس کا حاصل یہی چند روزہ ہنگامے ہیں تمہیں تو یہاں اللہ کی یاد تازہ کرنے کیلئے بلایا گیا تھا۔ تمہارے دل و دماغ کو اس آبِ حیات سے سیراب کرنا تھا جس کا سرچشمہ یہاں پھوٹتا ہے۔ ماضی میں جو ہوا سو ہوا اب آئندہ کیلئے اچھی طرح یہ بات سمجھ لو کہ مناسکِ حج سے فراغت کے بعد تمہیں اپنے اللہ کو اس سے بڑھ کر یاد کرنا ہے جتنا تم ان میلوں ٹھیلوں میں اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے تھے۔ ان کی عظمت کے گیت گاتے تھے، اور دوسروں کے دلوں میں ان کی عظمت کی دھاک بٹھا دینا چاہتے تھے حالانکہ تم جانتے ہو اس میں حقیقت کتنی ہے۔ اب تمہیں صرف اللہ کی کبریائی کے گن گانے ہیں۔ اس کی بڑائی اور عظمت کو یہاں ایک حقیقت ثابت کرنا ہے کیونکہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں۔

ذہنی تصورات کی اصلاح

عربوں کے اعمالِ بد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی تصورات اور ذہنی رویوں کی بھی اصلاح فرمائی۔ فرمایا: یہ صحیح ہے کہ سارے لوگ ہی محولہ بالا مصروفیات میں کھوئے نہیں رہتے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ سے دعائیں مانگنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان مانگنے والوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے دل و دماغ کے ہر گوشہ پر محبتِ دنیا کا غلبہ ہے۔ ان کے نزدیک دنیا میں آنے کا اصل مقصد دولتِ دنیا کا زیادہ سے زیادہ حصول ہے۔ اگر کوئی آدمی دنیا طلبی میں پیچھے رہ گیا اور وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل نہ کر سکا تو ان کی نگاہ میں وہ ایک محروم آدمی ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، رہنا سہنا، انسانی زندگی کی ضرورتیں ہیں مقصد نہیں، انسانی زندگی صرف اسی کا نام تو نہیں کہ آدمی کھائے پیئے، آرام کرے، اچھا مکان بنا لے، اچھی سواری حاصل کر لے، گھر میں دولت کی ریل پیل ہو اور زندگی کی ہر ضرورت میسر ہو سوال یہ ہے کہ ان بنیادی ضرورتوں کیلئے زندگی بھر محنت تو حیوان بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی جبلت کے مطابق کھانے پینے، بچے پیدا کرنے اور رہنے سہنے کے تمام اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس کیلئے اسے دوسروں کے بھٹ پر قبضہ کرنا پڑے، کسی دوسرے جانور کا شکار کر کے اس کا پیٹ پھاڑنا پڑے۔ وہ اس سے دریغ نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے ہر صورت اپنی ضرورت پوری کرنی ہے۔ اگر یہی کام انسان بھی کرتا ہے اور اسی کام میں زندگی گزار دیتا ہے، اس کیلئے جائز اور ناجائز، حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں کرتا اور اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ دوسروں کے حقوق اس سے متاثر ہوتے ہیں یا نہیں۔ تو پھر اس میں اور حیوان میں بنیادی فرق کیا ہے؟ وہ بھی ضروریات کے حصول کیلئے زندگی گزار دینے کو زندگی سمجھتا ہے اور یہی کچھ انسان بھی کرتا ہے تو دونوں میں کوئی جوہری فرق تو باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ ذہنیت ہے کہ جس کے حامل کو اگر حج کی سعادت بھی میسر آجائے تو وہ حج کے دوران اللہ کے گھر کے سامنے، اس کے پردوں میں لپٹ کر، اس کے ملتزم سے چمٹ کر، مسجدِ حرام میں ہاتھ پھیلا کر یا عرفات میں آنسو بہا کر بھی صرف یہ مانگتا ہے کہ مجھے دولت دے دے، عہدہ و منصب دے دے، فلاں چیز دے دے، لیکن اس کے علاوہ اس کے ذہن میں نہ حقوق اللہ کا کوئی تصور ہے نہ حقوق العباد کا، نہ اقدارِ حیات کوئی شے ہیں اور نہ مقاصدِ حیات کوئی چیز۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ ان کو جب بھی موقع ملتا ہے تو وہ اللہ سے صرف یہ دعا کرتے ہیں: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا۔

Marfat.com

انہیں صرف دنیا چاہیے، دنیا ہی ان کا مطلوب ہے اور دنیا ہی ان کا مقصود۔ یہی ان کا مقصدِ زندگی ہے اور یہی حاصلِ زندگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے مانگتے ہوئے بھی اور اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ اللہ کے سامنے جوابدہی بھی کرنی ہے اور اصل کامیابی یا ناکامی اسی دن کی کامیابی یا ناکامی ہے۔ لیکن وہ بھول کر بھی آخرت کا نام نہیں لیتے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، دنیا تو انہیں مل جائے گی، وہ تو کافر کو بھی مل جاتی ہے لیکن وہ زندگی جو ابدی اور ہمیشہ کی زندگی ہے جس سے محرومی حقیقی محرومی ہے، اس سے وہ محروم کر دیئے جائیں گے۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایک آدمی جو اللہ کا مانتا ہے اسی کی خاطر فریضۂ حج کی ادائیگی کیلئے آتا ہے پھر اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آخرت کے لئے کبھی دعا نہ کرے؟ یقیناً یہ عجیب بات ہے لیکن اس کا کیا جائے کہ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے، کہ لوگ حج اور عمرہ کے لئے سفر کرتے ہی بزرگوں کے پاس جاتے ہیں، ان سے اوراد و وظائف سیکھتے ہیں، ان سے دعائیں کراتے ہیں، لیکن ان میں بکثرت لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی غرض حج و عمرہ اور ان تمام وظائف اور دعاؤں سے صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، یا ایسی ہی اور دنیوی اغراض ہوتی ہیں اور اس میں کسی خاص طبقہ کی خصوصیت بھی نہیں۔ چند خوش نصیبوں کو چھوڑ دیجئے ورنہ بیشتر لوگ اپنی عبادات کے بعد یا بزرگوں کے پاس حاضری کے وقت ایسی چیزوں کی طلب کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو کسی اللہ والے کے پاس اپنی آخرت سنوارنے کیلئے جاتے ہوں ۔ چنانچہ اس کے بعد ان لوگوں کی خبر دی گئی ہے کہ جو صحیح معنی میں دین سے رشتہ رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ اللہ سے مانگنے کا طریقہ کیا ہے اور کیا دولت ہے جو اللہ سے مانگنی چاہیے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

(اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا) (۲۰۱)

پسندیدہ دعا

آیت کریمہ کے اس حصے میں بظاہر ان لوگوں کا تذکرہ ہے کہ جن کے دعا مانگنے کا انداز اور اسلوب بالکل صحیح ہے اور جو دعا میں وہ چیز مانگ رہے ہوں جو اللہ کی نگاہ میں بہتر ہے لیکن حقیقت میں لوگوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ زاویۂ نگاہ کی اصلاح بھی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جن لوگوں کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے وہ اپنے اللہ سے جو کچھ مانگتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دین کے بارے میں اور اپنے پروردگار کے بارے میں ان کا رویہ اور ان کا زاویۂ نگاہ بالکل غلط ہے۔ ان کے غلط زاویۂ نگاہ نے ان کی پوری زندگی میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ دنیا اور آخرت کے حوالے سے ان کے خیالات بگڑ گئے۔ اس بگاڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ حج جو خالصتاً ایک عاشقانہ اور مخلصانہ عبادت ہے وہ بھی دنیاداری کی تصویر بن کر رہ گیا اور وہ مقدس مقامات جہاں مناسک حج ادا کئے جاتے ہیں وہ میلوں کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔ اب اسی زاویۂ نگاہ کی اصلاح کے لیے ایسے لوگوں کی تصویر کشی کی جا رہی ہے جو اپنے پروردگار اور دین کے بارے میں صحیح تصور اور صحیح زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں اور اسی نے ان کی پوری دینی زندگی میں ایک ایسا حسن پیدا کر دیا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

Marfat.com

اس میں جو تصور دیا گیا ہے اس میں تین باتیں بہت نمایاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے پہلے متذکرہ لوگوں نے صرف دنیا مانگی جس میں آخرت کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف دنیا پر یقین رکھتے ہیں۔ آخرت کے بارے میں شاید ان کا خیال یہ ہے کہ یہ محض ڈھکوسلہ ہے۔ مذہبی لوگوں نے جسے اختراع کر رکھا ہے۔ محض ایک مصنوعی تصور پر کون اپنی زندگی کا حسن غارت کرے۔ اسی دنیا کی خوشیاں اصل خوشیاں ہیں۔ یہیں کے غم اصل غم ہیں۔ یہاں کی کامیابیاں حقیقی کامیابیاں ہیں اور یہاں کی محرومیاں انسان کے لیے سب سے بڑا لمحہ فکریہ ہیں۔ اس لیے جس چیز کی حقیقت مسلم نہیں اللہ کے گھر کے سامنے یا دیگر مقامات مقدسہ میں اسے مانگنے کی ضرورت کیا ہے اور جس کی حقیقت مسلم ہے صرف اسی پر اکتفا نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے۔ ہم محض بہلاووں کے پیچھے بھاگنے والے لوگ نہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پیش نظر آیت میں سب سے پہلی بات یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کو جو لوگ پسند ہیں اور جو زاویہ نگاہ پروردگار عطا فرمانا چاہتے ہیں اس میں صرف دنیا کا کوئی تصور نہیں۔ دنیا کے بعد آخرت بھی ایک حقیقت ہے اور یہ دنیا اسی کی تیاری کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہ دنیا انسان کے لیے دارالابتلاء ہے کہ وہ یہاں رہ کر اور یہاں کی نعمتوں میں مگن ہو کر اور یہاں کی دلچسپیوں میں کھو کر آخرت کو یاد رکھتا ہے یا بھول جاتا ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جس نے آخرت کو یاد رکھا اس کی دنیا کے معاملات بھی ٹھیک ہو گئے۔ اس نے اپنی دنیا کو آخرت کا مقدمہ بنا دیا۔ اس نے دنیا کا ہر کام اس احتیاط سے کیا کہ اس کے لیے آخرت میں جواب دہی آسان ہو گئی۔

دوسری بات اس آیت کریمہ میں جو فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ متذکرہ بالا لوگوں نے اللہ سے صرف دنیا مانگی اور دنیا میں بھی حسنہ کی دعا نہیں کی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی دنیا چاہتے ہیں جس میں حسنہ کا کوئی تصور نہ ہو۔ چنانچہ اس تصور کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا مانگو لیکن صرف دنیا نہ مانگو اس کے ساتھ حسنہ بھی مانگو۔ یہ وہ چیز ہے جو انسان کو دنیا کے مضر پہلوؤں سے بچاتی ہے کیونکہ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کا نام ہے۔ مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت، سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمال صالحہ، اخلاق محمودہ، علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراط مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں۔ ان چیزوں پر غور فرمایئے تو آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو شخص دنیا میں حسنہ کے لیے دعا کرتا ہے وہ آخرت کے تصور سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کریمہ میں دنیا کے ساتھ آخرت کے لیے دعا کرنے کا تصور دیا ہے لیکن میں نے جو تفصیل "حسنہ" کے سلسلے میں عرض کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصور بجائے خود آخرت کے تصور کا مقدمہ ہے اور پھر آخرت کے لیے دعا کا جو سلیقہ سکھایا گیا اس میں بھی حسنہ کا ذکر موجود ہے کہ دنیا میں بھی اللہ سے حسنہ مانگو اور آخرت میں بھی حسنہ مانگو اور آخرت کی حسنہ جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار ہے۔

تیسری چیز جو آیت کریمہ کے اس حصے میں بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے محبوب بندے جب اللہ سے دعا مانگتے ہیں تو وہ دنیا اور آخرت کی بھلائیاں مانگنے کے ساتھ ساتھ ایک بات کی دعا کرنا کبھی نہیں بھولتے وہ یہ ہے کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب سے ہمیں بچانا۔ کیونکہ دنیا میں بھلائیاں آخرت کا پیش خیمہ ہیں اور آخرت کی بھلائیاں دنیا میں ایک کامیاب دینی زندگی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن دونوں کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ ہمیں قیامت کی گرفت سے محفوظ فرمائے۔ ہمارے لیے حساب کتاب آسان کر دے، ہمیں اپنے فضل و کرم سے

Marfat.com

نوازے۔جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچایا جائے۔کیونکہ وہ چیز جس سے مومن کا دل پگھلتا اور پتہ پانی ہوتا ہے اور جس سے اس کی آنکھیں اشکبار ہوتی اور جس سے اس کی تنہائیاں شدت احساس میں ڈوب جاتی ہیں، وہ صرف یہ تصور ہے کہ میں اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں کہیں جہنم میں نہ جھونک دیا جاؤں۔اس لیے اصل کامیابی جس کا تصور ایک مومن کرسکتا ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔قرآن کریم نے بجاطور پر فرمایا: **فمن زحزح عن النار و ادخل الجنة فقد فاز** O جو شخص جہنم کے عذاب سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہی کامیاب ٹھہرا۔" جہنم سے بچنے کے لیے جن چیزوں کو مقدمہ بنایا گیا وہ دنیا میں آخرت کی تیاری ،ایمان اور حسن عمل کا سرمایہ ہے اور اس آیت کریمہ میں چونکہ انہی بنیادی باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اس لیے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بکثرت یہی دعا فرمایا کرتے تھے اور طواف کے دوران اس دعا کا زیادہ سے زیادہ مانگنا مسنون بھی ہے۔

اس آیت کریمہ میں چونکہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مانگنے کا تصور دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جس طرح صرف دنیا کی طلب ایک مومن کا نہیں ایک کافر کا شیوہ ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو نظرانداز کرکے اللہ سے صرف آخرت کی بھلائی مانگنا یہ بھی صالح مومن کا طریقہ نہیں۔اللہ کے نبیوں نے بھی ضروریات کی حد تک دنیا سے فائدہ اٹھایا۔وہ بھی کھاتے پیتے رہے، اوڑھتے پہنتے رہے، انہوں نے بھی بیویوں سے تعلق رکھا۔اللہ کی نعمتیں استعمال کیں تو ان کا شکر بھی ادا کیا۔دنیا سے محبت نہیں کی نہ دنیا کو مقصود بنایا لیکن دنیا کو نظرانداز بھی نہیں کیا۔کیونکہ آخرت یا دین کا مقصود دنیا کو نظرانداز کرنا نہیں اور نہ دنیا کو چھوڑنا ہے۔بلکہ دنیا کو اس طرح برت کے دکھانا ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ ایک مومن اور کافر کی دنیا بسری میں فرق کیا ہے۔ایک مومن دنیا میں رہتا ضرور ہے لیکن وہ دنیا کو ایک مسافر خانہ سمجھتا ہے، اس کے ایک ایک معاملے میں دخل دیتا ہے لیکن اس سے دل نہیں لگاتا۔وہ دنیا میں اس لیے رہتا ہے تاکہ دنیا کو سنوار دے۔وہ دنیا سے لیتا کم ہے اسے دیتا زیادہ ہے۔اس کا حال یہ ہوتا ہے:

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

اس سے ان نام نہاد درویشوں اور صوفیوں کی اصلاح ہوجاتی ہے جو ترک دنیا میں دین کی معراج سمجھتے ہیں اور دنیا کے جھمیلوں میں شریک ہونا ان کے ہاں دین داری کے خلاف ہے۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ O

(یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کیے کا حصہ ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) (۲۰۲)

اس آیت کریمہ میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔پہلی یہ بات کہ اس سے پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ جن لوگوں نے صرف دنیا مانگی، ان کے لیے پروردگار نے فرمایا کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ہم ان کو دنیا دیں گے لیکن یہ آخرت میں محروم رہیں گے۔اس کے بعد ان پسندیدہ لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا اور آخرت دونوں مانگتے ہیں اور دونوں میں اللہ سے بھلائیوں کے طلب گار ہوتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی تعمیل میں جس طرح زندگی گزاری جیسی کچھ محنت کی، جس طرح مشکلات کا سامنا کیا۔بہت سی محرومیوں پر صبر کیا، پھر غلبہ دین کی کوششوں کے سلسلے میں صعوبتیں اٹھائیں۔ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جس کا انہیں آخرت میں اللہ کی طرف سے اجروثواب

Marfat.com

نہ ملے۔ ان کی ہر نیکی محفوظ ہے اور ہر نیکی وہاں اپنا اجر پائے گی۔ جس طرح مزدور کی محنت ایک دیانت دار مالک کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح پروردگار جیسا کریم اپنے بندوں کی کسی محنت اور کسی اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ انہوں نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جو کوششیں کی ہیں جب انہیں ان کوششوں کا صلہ ملے گا تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش اللہ کے دین کے راستے میں ہماری کھالیں کاٹی گئی ہوتیں اور آج ہم زیادہ زیادہ اس کا اجر وثواب پاتے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ قرآن کریم میں یہ بات متعدد دفعہ دہرائی گئی ہے کہیں تنبیہ اور تہدید کے انداز میں اور کہیں تحسین اور حوصلہ افزائی کے انداز میں۔ یہاں سیاق کلام دلیل ہے کہ تسلی اور تحسین کے لیے یہ جملہ فرمایا گیا ہے۔ بتانا شاید یہ مقصود ہے کہ تمہیں اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جن مصائب سے گزرنا پڑ رہا ہے اور ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں دینی زندگی گزارنے کے لیے تمہیں جس طرح صبر آزما مراحل سے واسطہ ہے دنیا میں بھی اس کا اجر وثواب دور نہیں۔ مسلمانوں نے چند ہی سالوں میں صورتحال کو بدلتے دیکھا۔ ایک نئی ریاست وجود میں آئی۔ طاقت کے پیمانے بدل گئے۔ مذاق اڑانے والے عبرت بن کر رہ گئے۔ جغرافیہ تبدیل ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فتنے مٹ گئے اور اللہ کا دین غالب آ گیا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس میں ایک مومن جب جنت اور خدا کی رضا کی صورت میں اپنا اجر دیکھے گا تو وہ یوں محسوس کرے گا کہ عمل اور اجر میں کوئی فاصلہ نہیں۔ میرا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مجھے مزدوری دے دی گئی۔ حدیث شریف میں آتا ہے: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ ''جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو آ گئی۔'' نیک آدمی دفن ہوتے ہی جنت کے مبادیات کی لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور برا آدمی اپنی بداعمالیوں کی سزا کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ آنکھیں بند ہوتے ہی وہ کیفیات انسان پر طاری ہونے لگتی ہیں جس کی تعبیر وہ قیامت کے دن دیکھے گا۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ اس سے زیادہ سرعت حساب اور کیا ہوگی کہ زندگی کا فانوس بجھا تو عمل اور جزا کا فرق مٹ گیا۔ ادھر انسان نے زندگی کا بوجھ اتارا ادھر جزا و سزا کی دنیا اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

(اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی ٹھہرا رہا' اس پر بھی کچھ گناہ نہیں' یہ رعایت اس کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے) (۲۰۳)

گزشتہ آیات میں عربوں کے اعمال قبیحہ اور ان کی رسومات بد پر کافی تنقید ہو چکی ہے اور اس بات پر بجا طور پر زور دیا گیا کہ حج نہایت مخلصانہ عبادت ہے' جس میں تمام عبادات کی روح جمع کر دی گئی ہے۔ اس کی اصل حقیقت ذکر اللہ کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے تمہیں حج کے چند ایام کے دوران ایسی ہر بات سے دستکش ہو جانا چاہیے جس سے اس عظیم عبادت کی روح پر اثر پڑتا ہو۔ اب اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اور مناسک حج کی تکمیل فرماتے ہوئے ایک اور اختلاف کی اصلاح فرمائی جا رہی ہے اور ساتھ ہی مکرر اس بات کو ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ چند گنتی کے دن ہیں مراد اس سے ایام تشریق ہیں۔ تم بظاہر دس تاریخ کو مناسک حج سے فارغ ہو جاؤ گے اس کے بعد منیٰ میں ٹھہرنا اور رمی جمرات کی سنت ابراہیمی کو ادا کرنا ہے لیکن یہ چند دن تمہاری زندگی کا حاصل ہیں نہ جانے کتنا طویل سفر اور کتنے کثیر مصارف صرف کر کے تم یہاں پہنچے ہو۔

Marfat.com

ممکن ہے زندگی میں پھر کبھی آنے کا موقع نہ ملے۔اس لیے ان چند دنوں کے ایک ایک لمحے کو غنیمت جانو اور زیادہ زیادہ اللہ کا ذکر کرو۔اسی کی یاد ہے جو دنیا کے بحران کو سرد کر سکتی ہے اور اسی کی یاد سے زندگی کی ہر کل اپنی جگہ بیٹھ سکتی ہے اور اسی کی یاد سے فکر وعمل میں تطہیر پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ان چند دنوں میں بھی تم نے اپنے آپ کو اس کی یاد سے وابستہ نہ کیا تو پھر دنیوی مصروفیات کے دنوں میں تم کیسے اسے یاد کرو گے۔

عربوں میں مناسک حج کے بارے میں بہت سے اختلافات موجود تھے۔ان میں ایک اختلاف یہ بھی تھا کہ منیٰ میں قیام اور جمرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے۔بعض لوگ بارہ تاریخ تک ٹھہرنا کافی سمجھتے تھے اور بعض لوگ تیرہ تاریخ کو ٹھہرنا بھی ضروری قرار دیتے تھے۔چنانچہ ان کے اس اختلاف کی اصلاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ جو آدمی بارہ تاریخ تک ٹھہرے اور پھر کسی وجہ سے مکہ معظمہ جانا ضروری سمجھے اس کے لیے گناہ کی کوئی بات نہیں اسے جانے کی اجازت ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ بارہ تاریخ کا سورج منیٰ میں غروب نہیں ہونا چاہیے اگر اس کی موجودگی میں سورج غروب ہو گیا تو اب وہ منیٰ سے نہیں جا سکتا۔اب اسے تیرہ تاریخ کو بھی ٹھہرنا ہو گا۔البتہ اس کے لیے یہ رعایت ہے کہ وہ زوال آفتاب سے پہلے صبح کے بعد ہی رمی کر سکتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی آدمی تیرہ تاریخ کو ٹھہر جائے اور پھر زوال آفتاب سے پہلے پہلے رمی کر کے وہاں سے روانہ ہو جائے اس کے لیے بھی کوئی گناہ کی بات نہیں بلکہ تیرہ تاریخ کو ٹھہرنا زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔ آخر میں ایک لفظ نہایت قابل غور ہے وہ ہے لِمَنِ اتَّقٰی کہ منیٰ میں بارہ تاریخ تک ٹھہرا جائے یا تیرہ تاریخ تک۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا دونوں ہی کی اجازت ہے البتہ جس بات پر انتہائی توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ مناسک حج کی ادائیگی اور منیٰ کا قیام اور ذکر اللہ کی پابندی یہ صرف اس کے لیے مفید ہے اور وہ شخص اس کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرے گا جس کے اندر تقویٰ کی دولت پائی جاتی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بندگی کی صورت کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقی روح کو بھی دیکھتا ہے۔اگر یہ سارے اعمال تقویٰ کی روح سے خالی ہوں اس سے حج کی ایک ذمہ داری تو ضرور ادا ہو جائے گی لیکن اللہ کے یہاں قبولیت کا یقین پیدا نہیں ہو سکتا۔کیونکہ اس کا ارشاد ہے: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ''اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں۔'' اور جو شخص حج سے پہلے بھی شریعت سے آزاد زندگی گزارتا تھا اور حج کے دوران بھی اس نے محض مناسک حج کی صورتاً ادائیگی کو کافی سمجھا تو ایسے آدمی کو حج کی ادائیگی سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ حج کا فرض ادا ہو گیا۔اب اسے ترک حج کا مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔

آخر میں ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ اس میں ایک اور بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جس طرح انسانی کمزوریوں میں سے ایک یہ کمزوری ہے کہ ہم بظاہر شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں لیکن ہمارا دل تقویٰ یعنی اس کی حقیقی روح سے خالی رہتا ہے۔اسی طرح انسانوں میں یہ کمزوری بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی اطاعت دل وجان سے کرتے ہیں۔نیکی کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔اللہ نے تقویٰ کی دولت سے بہت حد تک انہیں مالا مال کیا ہے۔لیکن ان میں سے بعض لوگوں میں نیکی کا پندار پیدا ہونے لگتا ہے۔وہ آہستہ آہستہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ ہم نے اس قدر نیکیاں کی ہیں اور ہم نے اپنی پوری زندگی کو اس طرح سے شریعت کا پابند بنا لیا ہے کہ اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی نہ ہو اور ہمیں جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور نہ فرمائے۔نیکی کا یہ پندار آدمی کے زندگی بھر کے سرمائے کو ڈبو دیتا ہے۔اس کے اندر سے تواضع اور انکسار ختم ہو جاتا ہے۔آہ سحر گاہی سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔دعاؤں کی لذت جاتی رہتی ہے۔وہ جو شب وروز اللہ کی خشیت اور اس کی اطاعت میں آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا' اب وہ ایک جگہ رک کر کھڑا ہو جاتا

Marfat.com

ہے۔آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسے شخص کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ اسی خطرناک انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: کہ تم نے حج کی سعادت پائی بہت بڑی دولت کمائی۔ یقیناً حج مقبول کے نتیجے میں آدمی اس طرح پاک ہو جاتا ہے' جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو لیکن یاد رکھو اگر اس حج نے تمہارے اندر اللہ کی خشیت اور اس کی عبادت کے شوق میں بجائے اضافہ کرنے کے کمی کردی اور تم یہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے حج مقبول کی دولت پالی' اب میری بخشش میں کیا شبہ ہے تو یاد رکھو تم سب ایک دن اللہ کے ہاں جمع کیے جاؤ گے' وہاں تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ تمہاری نیکیوں کے انبار میں وہ روح موجود نہیں جو ان کی قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی برائیوں کی وجہ سے تباہ ہوں گے لیکن تم اس لیے محروم کردیے جاؤ گے کہ تمہیں تمہاری نیکیوں کا پندار لے بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامیؒ کے مرید تھے' ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ وہ حج کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر واپس آئے تو بجائے اس نورانیت میں اضافہ ہونے کے یہ کیفیت ہی سرے سے ختم ہوگئی۔ انہوں نے اپنے مرشد مولانا جامیؒ سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع اور انکسار تھا۔ اپنے آپ کو گناہ گار سمجھ کر اللہ کے سامنے الحاح وزاری کرتے رہتے تھے' حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حج تمہاری ترقی کا ذریعہ بننے کی بجائے تمہارے زوال کا باعث بن گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جب حج کی سعادت سے مشرف فرمائے تو آدمی کے اندر خشیت اور تقویٰ میں اضافہ ہونا چاہیے اور اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے میرا حج قبول نہیں فرمایا۔ اس لیے بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ حج کرنے والا اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا ترے کرم سے ہو گا

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُهٗ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَیُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَافِیۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ○

(اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں اس دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں اور وہ گواہ بناتے ہیں اللہ کو اس پر جو ان کے دل میں ہے اور وہ کٹر دشمن ہیں) (۲۰۴)

گزشتہ آیات میں ہم نے یہ پڑھا ہے کہ حج پر آنے والوں کے دینی احساسات اور اعمال کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم ایسے لوگوں کی ہے کہ وہ کہنے کو تو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں لیکن ان کے احساسات کا حال یہ ہے کہ وہ حج کو بھی اپنی دنیوی تمناؤں کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کی دعائیں دنیا اور علاقات دنیا کے سوا کسی اور چیز کے لیے نہیں ہوتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے تصور سے بالکل بیگانہ ہیں۔

Marfat.com

کردار میں دوعملی نفاق کو جنم دیتی ہے

پیش نظر آیت کریمہ اور اس کے بعد کی بھی دو آیتوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ فریضۂ حج ادا کرنے والوں میں انسانوں کی یہ تقسیم کہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے بھی آخرت کے تصور کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ذہن کو یقیناً منافقین کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ نفاق بھی انسانی زندگی میں دوعملی کا نام ہے کہ زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور۔ اور عمل دل کے مضمر احساسات کی چغلی کھاتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ بھی اپنے عمل کے اعتبار سے نفاق کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے اسی نسبت سے اب منافقین کا ذکر کیا جارہا ہے اور اسی بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب کسی بھی انسان میں یہ دوعملی پیدا ہوجائے کہ وہ بظاہر اللہ کے احکام کی تعمیل کرتا دکھائی دے لیکن حقیقت میں اس کے دل ودماغ اللہ کی بندگی کے تصور سے خالی ہوں تو ایسا شخص مومن کہلانے کے باوجود اپنے اعمال کے اعتبار سے منافقوں میں شمار ہونے کے لائق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی موجودہ حالت میں اگر کوئی صالح تبدیلی نہ آئی تو یقیناً وہ منافقوں کے گروہ میں شامل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسی حوالے سے پیش نظر آیات کریمہ میں منافقین کی سیرت وکردار کی ایک جھلک دکھائی جارہی ہے تاکہ مسلمان اس منظر کشی اور اس پر تبصرے سے اس مکروہ حالت میں مبتلا ہونے سے بچیں۔

کردار سے خالی گفتار کے غازی ہوتے ہیں

منافقین کی شناخت کے سلسلے میں ان کی جن نمایاں خصوصیات کو بیان فرمایا جارہا ہے ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ لوگ زبان کے دھنی ہوتے ہیں۔ اپنی عملی کمزوریوں اور عقیدے کی خرابیوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردہ ڈالے رکھتے ہیں۔ اپنی طلاقتِ لسانی سے مخاطب کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم جس قدر آپ کے ساتھ مخلص ہیں کوئی اور نہیں ہوسکتا اور ہمارے اخلاص میں کسی شبے کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن چونکہ خود عمل کے چور ہوتے ہیں اور ان کے اندر کی ویرانی خود انہیں پریشان کرتی ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس میں دور دور تک کوئی حقیقت نہیں۔ تو وہ اس پریشانی پر قابو پانے اور مخاطب کو مزید اطمینان دلانے کے لیے اپنی ہر بات پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں۔ اللہ کو گواہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو ہماری کسی بات میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ گواہ ہے کہ ہم سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ سورۃ المنافقون میں قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کی تصویر کھینچی ہے اور جو بات اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ وہاں فرمایا گیا ہے: وَ اِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ۔

(اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمہیں اچھی لگتی ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ سے تم ان کی بات سنتے ہو لیکن حقیقت میں یہ لکڑی کے کندوں کے مانند ہیں، جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں۔ اصلی دشمن یہی ہیں پس ان سے بچ کر رہو۔ اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں)

Marfat.com

غور سے دیکھئے کس طرح قرآن کریم نے ان کی تصویر ہمارے سامنے لاکر کھڑی کر دی کہ وہ اپنے جسموں کے اعتبار سے نہایت صحت مند شکلیں ان کی نہایت تابندہ' وہ اپنی شخصیت میں شاندار شخصیت کے مالک اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت چکنی چپڑی باتیں کرنے میں مشاق' دوسروں سے آگے بڑھ کر حمایتِ اسلام کا جوش دکھانے والے۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی انہیں دیکھتا رہے اور ان کی باتیں سنتا رہے لیکن حقیقت میں یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ اپنی خوش حالی اور فارغ البالی کے باعث جسم تو نہایت پلے ہوئے ہیں لیکن دل چونکہ ایمان سے خالی ہیں اور ہر وقت اس کھٹکے میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ہمارا پول نہ کھل جائے۔ اس لیے ہر معمولی بات کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ معنوی اور نظریاتی قوت سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے لکڑی کے کھوکھلے کندوں کے مانند ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کندوں کو لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ ایمان سے خالی ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بزدل ہیں اولوالعزمی اور حوصلہ مندی ان کے قریب تک نہیں پھٹکی وہ صرف جھوٹ اور چرب زبانی سے اپنا کام نکالنے اور دوسروں کو دھوکہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ ان کی ظاہری حالت پر مت جایئے یہی حقیقت میں دشمن ہیں۔ اور اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ وہ اَلَدُّ الْخِصَام ہیں۔ الد کا معنی شدید الخصومة ہے اور خصام خصم کی جمع ہے اس کا مفہوم ہے کہ وہ بدترین دشمن یا کٹر دشمن ہیں۔ ان سے بچتے رہیے' ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری آیت کریمہ میں ان کی مزید خصوصیات کو بیان فرمایا گیا۔

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

(اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں' ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچادیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا) (۲۰۵)

تولّٰی کا مفہوم

تَـوَلّٰـی کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ والی بننا اور پیٹھ پھیرنا۔ قاضی بیضاویؒ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا اَدْبَـرَ وَانْـصَـرَفَ عَنْکَ وَ قِیْلَ اِذَا غَلَبَ وَ صَارَ وَالِیًا قاضی صاحب نے دونوں معنی مراد لیے ہیں۔ یہاں بھی دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔ تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ منافقین کی خصلت یہ ہے کہ وہ بظاہر کتنا بھی اسلام اور پیغمبر کے ساتھ مخلص ہونے کا دعوی کریں اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنی فدائیت کا یقین دلائیں لیکن حقیقت میں جب بھی انہیں کہیں اقتدار مل گیا یا کسی بھی دائرے میں غلبہ نصیب ہوگا تو وہ اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کے دعوؤں کو بالکل بھول جائیں گے اور وہ وہی روش اختیار کریں گے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اپنی طاقت کو اللہ کے دین کی سربلندی اور خلق خدا کی خدمت میں صرف کرنے کی بجائے ان کے پیش نظر صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنے طاقت کے اظہار سے اپنی طاقت کا بھرم قائم کریں۔ انہیں اس کے لیے کوئی ایکشن کرنا پڑے' کھیتیاں تباہ کرنی پڑیں' قتل عام کرنا پڑے وہ کبھی اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اسلام سے جن کا تعلق محض زبانی حد تک ہے اور ان کے دل و دماغ میں اسلامی حمیت کا کوئی اثر نہیں تو انہیں اپنے اقتدار کو بچانے اور اپنی طاقت کا رعب بٹھانے کے لیے جو بھی کرنا پڑتا ہے وہ کر رہے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے ہاتھوں

Marfat.com

سے مسلمان مر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی روایات تباہ ہو رہی ہیں، مسلمانوں کی تاریخ اندھیروں میں ڈوب رہی ہے۔ انہیں صرف اپنی اقتدار کی فکر ہے۔ اس کی خاطر اللہ کی بندگی کے مقابلے میں جس کی بھی بندگی کرنا پڑے اور جیسا بھی ظلم توڑنا پڑے انہیں اس سے دریغ نہیں۔ وہ بھول گئے ہیں کہ کسی مسلمان کا ناحق قتل قیامت کے دن کتنے بڑے عذاب کا باعث بنے گا۔

فساد فی الارض کا مفہوم

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں چونکہ منافقین کے پاس کوئی اختیار اور اقتدار نہیں تھا اور اس آیت میں براہ راست انہی کا تذکرہ ہے اگرچہ انہی کے تذکرہ تک یہ آیت محدود نہیں۔ بہر حال ان کے حوالے سے یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین دو طرح کے اعمال کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے' وہ مدینہ منورہ' مکہ معظمہ یا پورے جزیرہ عرب میں کہیں نہ کہیں فساد کی آگ مچائے رکھتے ہیں۔ درپردہ مسلمانوں کی کھیتیوں اور فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مسلمانوں کے قتل سے بھی نہیں چوکتے۔ مفسرین نے اخنس بن شریق جیسے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے' جو درپردہ اسی طرح کی حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے ایمان اور اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے زبان و بیان کی ساری توانائیوں کو صرف کر دیتے۔ لیکن حضور کے سامنے سے ہٹتے ہی جہاں کہیں انہیں اپنی حرکات شنیعہ کے ارتکاب کا موقع ملتا تھا تو وہ اس میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ بعض اہل علم نے اس کا ایک اور مفہوم بیان کیا ہے' وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو دعوت لے کر آئے ہیں اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ زمین پر اللہ کے سوا کسی اور کی غیر مشروط اطاعت نہ کی جائے۔ اس کی زمین پر اسی کے دین کا غلبہ ہو۔ اسی کے نام کا چرچا ہو اور زندگی کے تمام اداروں میں اسی کا دین حاکم ہو۔ اگر اس دعوت کو قبول کر لیا جاتا ہے تو زمین سے ہر طرح کا فساد اور ہر طرح کی انارکی ختم ہو جاتی ہے۔ کھیتیاں محفوظ ہو جاتی ہیں' نسلیں مامون ہو جاتی ہیں۔ پوری کائنات کو دیکھیے۔ ہمیں کہیں بھی کوئی ظلم کوئی خرابی اور کوئی افراتفری نظر نہیں آتی۔ ہر ستارہ ہر سیارہ اور ہر کرہ اللہ کے قانون کی اطاعت میں بندھا ہوا ہے۔ اس اطاعت کاملہ کے باعث ایک مکمل امن دکھائی دیتا ہے۔ تمام مخلوقات میں کسی مخلوق کو کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں امن کی ضمانت صرف اللہ کی اطاعت کاملہ ہے۔ زمین پر رہنے والوں کو چونکہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت بھی کر سکتے ہیں اور نافرمانی بھی۔ اگر یہ اطاعت کر کے باقی کائنات کے ہم سفر ہو جائیں تو زمین بھی ہر طرح کے فساد سے محفوظ ہو جائے۔ لیکن جب یہ اللہ کی اطاعت کی بجائے غیر اللہ کی اطاعت میں حق تلفی اور حق شکنی کا ارتکاب کرتے ہیں تو وہیں سے فساد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پوری کائنات کا سفر اللہ کی اطاعت میں اس کی خوشنودی کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن جب انسان الٹی طرف سے چلنا شروع کرتا ہے تو چونکہ کائنات کا سفر یکطرفہ ہے جس کے مقابل کی طرف سے آنے کا کوئی جواز نہیں۔ تو یہیں سے تصادم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ منافقین کی ساری کوشش یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا میں امن قائم کرنے اور فساد سے بچانے کی جو دعوت لے کر آئے ہیں اور جو اللہ کی غیر مشروط اطاعت پر مشتمل ہے' اسے ناکام کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے تو سر تا پا اطاعت بنے رہتے ہیں لیکن وہاں سے ہٹتے ہی اطاعت کی اس دعوت کو ناکام کرنے کے لیے لگ جاتے ہیں جس کا نتیجہ فساد اور حرث و نسل کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہاں منافقین کے حوالے سے جو کہا جا رہا ہے وہ اگرچہ بعض معاملات میں حقیقت بھی ہے لیکن مجموعی طور پر جو کچھ وہ کر

Marfat.com

رہے ہیں'اس کے نتیجے کوحقیقت کی شکل میں بیان فرمایا گیا ہے۔کہ تم بالفعل بے شک قتل ونہب کا ارتکاب نہ کرو لیکن جو کچھ کر رہے ہو اس کے نتیجہ میں یہی کچھ ہو کے رہے گا اور تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اللہ نے زمین بنائی اور بسائی ہے وہ کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی بسائی ہوئی زمین میں فساد مچایا جائے۔ اسی لیے وقتاً فوقتاً وہ اس کی اصلاح کے لیے پیغمبر بھیجتا رہتا ہے۔ اب جو شخص اس کی اصلاح کی دعوت اورا سکیم کو ناکام کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اصلاً فساد کا باعث بنتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ کبھی پسند نہیں فرماتا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب وہ انہیں ان کے کئے کی سزا دے گا۔

یہ آیت ہمارے لیے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہے کہ اگر اللہ کے دین کا غلبہ اللہ اور اس کے رسول کا محبوب اور مقصود ہے اور یہی انسانوں کے امن وعافیت کا باعث بھی ہے اور مزید یہ کہ اس غلبے کو ناکام کرنا اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا بدترین منافقت ہے' جس کی پروردگار ضرور سزا دیتا ہے۔ تو پھر ہمارا رویہ کیا ہے۔ ہمیں اللہ نے ملک دیا ہے اور ہم نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم اس ملک میں تیرے دین کو نافذ کریں گے۔ یہاں کا آئین اسلامی شریعت ہوگا۔ لیکن ہم نے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ان قوتوں کی کردار کشی اور انہیں اُدھیڑنے کھدیڑنے میں صرف کیا جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ بار بار حکومت سے اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں اور ہم نے اس نصف صدی میں صرف یہ کوشش کی ہے کہ اپنے تعلیمی اداروں' پرنٹ میڈیاز اور الیکٹرانک میڈیاز کے ذریعے اسلام کے نفاذ کا تصور دلوں سے نکال دیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ اسلامی حمیت سے دماغوں کو اتنا بیگانہ کر دیں کہ اس ملک میں اسلام کے خلاف جو کچھ بھی ہوتا رہے' لوگوں کو کبھی اس کے خلاف شکایت نہ ہو۔ چنانچہ ہم ان کوششوں میں یقیناً کامیاب رہے ہیں۔ ہمارا ٹی وی اور ہمارا کیبل سسٹم شب وروز زہر اُگل رہے ہیں۔ ہمارے چوراہوں پر لگے ہوئے بڑے بڑے بورڈز اور بڑی بڑی ہورڈنگز پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اس ملک میں شرم وحیا کا جنازہ نکل گیا ہے اور یہاں کے بسنے والوں کا شرم وحیا سے کوئی رشتہ نہیں۔ ہماری اس منافقانہ روش نے ہمیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم عوام کی خاطر اسلام کا نام لینے پر مجبور ہیں لیکن اپنی منافقت' اپنے مفادات اور بیرونی دباؤ کے باعث اس نام کو تعبیر دینے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار نہیں اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہم نے پاکستان شاید صرف نام بدلنے کے لیے بنایا تھا ہمیں ہندوستان اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے اپنے علاقے کا نام پاکستان رکھ دیا۔ اگر صرف نام بدلنے سے کوئی کام ہو سکتا تو یقیناً یہاں بھی ہر چیز درست ہو جاتی لیکن نام بدلنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تو یہاں ہر غیر اسلامی چیز کو ختم کر کے اور ہر غیر اسلامی قانون کو بدل کر اللہ کے قانون کو نافذ کرنا تھا۔ کسی شاعر نے عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے ٹھیک کہا تھا:

ہم بدلنا چاہتے تھے نظمِ میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن ایک میخانے کا نام

یہ صورت حال ہمارے لیے لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہے کاش ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو گھمنڈ اور تکبر ان کو پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے' سو ایسے کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے) (۲۰۶)

Marfat.com

تکبر، ہدایت کے راستے کی رکاوٹ

منافقین کی ایک اور بری خصلت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ جب کبھی ان کے کرتوتوں کی طرف انہیں متوجہ کر کے اللہ سے ڈرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم مسلمان ہو‘ تم نے اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی فرمانبرداری کا عہد کر رکھا ہے لیکن تمہارا ایک ایک فیصلہ اور ایک ایک عمل اللہ کے احکام کا منہ چڑاتا ہے۔ تمہیں ذرا احساس نہیں ہے کہ کل کو اللہ کے سامنے جا کر کیا جواب دو گے۔ تو بجائے اس کے کہ اس بات پر منافقین اپنے طرزِ عمل پر غور کریں‘ ان کی گردنیں اور اکڑ جاتی ہیں اور ان کا تکبر‘ ان کا گھمنڈ‘ ان کا مرتبہ و مقام یا ان کا عہدہ و منصب انہیں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ تم اتنا بڑا مقام حاصل کر چکے ہو۔ اب کیا تم ہر چیز کو چھوڑ کر غریب مسلمانوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ انہیں دنیوی مفادات‘ اُخروی مفادات کے حوالے سے سوچنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتے۔ چونکہ انہیں آخرت کا یقین نہیں‘ اس لیے وہ کسی طرح بھی اپنے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچانا گوارا نہیں کرتے اور مزید یہ کہ چونکہ وہ اپنے سیرت و کردار میں کوئی توانائی نہیں رکھتے اور اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں‘ انہیں باہر کا بھرم اور اندر کی بے اعتمادی اپنی حالت پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے ذرا بھی لچک دکھائی تو ہمارا سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن کریم نے متعدد جگہ ان کی اس کمزوری کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ منافقون میں ارشاد فرمایا گیا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْلَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آ کر توبہ کرو‘ اللہ کا رسول بھی تمہارے لیے خدا سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردن موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ استکبار کے ساتھ اعراض کرتے ہیں‘ ان کے لیے یکساں ہے‘ تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے‘ اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔“

آخر میں فرمایا فحسبہ جھنم۔ پس ان کے لیے جہنم کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کرتوت تو ہر وقت عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ اس قابل نہیں رہے کہ انہیں زمین پر زندہ چھوڑا جائے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ان کی سنگین شرارتوں کے باوجود وہ انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ڈھیل ان کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آگے جو جہنم تیار ہے وہ ساری کسر پوری کر دینے والی ہے۔ اس کی ہولناکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ولبئس المھاد۔ وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے‘ انہیں قیامت کے بعد ایسے برے ٹھکانے سے واسطہ پڑنے والا ہے‘ ان کے لیے اس دنیا میں کسی عذاب کی کیا ضرورت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ ۝

(اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں‘ اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے) (۲۰۷)

Marfat.com

اسلامی قافلے کا اصل اثاثہ

منافقین کی اس مایوس کن اور حوصلہ شکن تصویر کشی کے بعد پروردگار اس آیت کریمہ میں ایک اور تصویر دکھا رہے ہیں۔ اس تصویر دکھانے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے گردوپیش میں ایسے ہی کم ظرف اور تھڑدلے لوگ موجود ہیں جن پر کسی طرح بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں دکھایا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کی رضاجوئی کے لیے قربان کرنے کا عزم کر رکھا ہے، جن کی زندگی کا مقصد اللہ کی رضاجوئی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ اللہ ہی کے لیے جینا اور اللہ ہی کے لیے مرنا پسند کرتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو تنہا مت سمجھو۔ تم ایک ایسے قافلے کے فرد ہو جس میں اگر کہیں کہیں منافقت کے داغ دکھائی دیتے ہیں تو وہیں ایک قطعی اکثریت ان مخلص مسلمانوں کی ہے جن کے پیش نظر اسلام کی سربلندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ اپنا تن من دھن اللہ کی راہ میں لٹانے کا عہد کر چکے ہیں۔ جب بھی کبھی حالات نے ان کو پکارا ہے، انہوں نے آگے بڑھ کر کھرا سونا ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مال کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے بڑھ چڑھ کر ایثار کرنے سے تامل نہیں کیا۔ جان دینے کا وقت آیا ہے تو انہوں نے گردن کٹوانے سے دریغ نہیں کیا۔ ہجرت کا حکم آیا تو انہیں وطن چھوڑنے میں ذرا پس وپیش نہیں ہوا۔ بدر اور اُحد کے میدان میں اپنے خونی رشتوں کے خلاف تلوار نکالنے میں انہیں تامل نہ ہوا۔ اللہ کے رشتے کے سامنے وہ اپنا ہر رشتہ کاٹ چکے ہیں اور اسلام کے مفاد کے مقابلے میں ہر مفاد کو شکست دے چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کا اثاثہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں کہ قیامت تک ان کے اعمال کی روشنی تاریخ کو روشن رکھے گی۔ اور آج تک مسلمان انہی کے حوصلوں سے گرمی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مقدس لوگوں کا کوئی گروہ بھی ہر چھوٹی بڑی غلطی سے یکسر مبرا نہیں ہو سکتا۔ معصوم صرف اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔ بالخصوص وہ مسلمان جو ابھی نئے نئے آنحضرت ﷺ کی تربیت میں آئے ہیں، ان کے حوصلوں اور عزائم میں تو کوئی کمی نہیں، ان کے اخلاص میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن کبھی نہ کبھی کسی غلطی کا صدور یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ”اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔“ صحابہ اپنی ہمت سے بڑھ کر اخلاص کا ثبوت دے چکے ہیں اور انہوں نے اپنا سب کچھ اس کی جنت کے عوض میں بیچ دیا ہے لیکن یہ عہد اتنا کٹھن ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ ایسی بھول چوک پر بھی تمہارا مؤاخذہ کرے وہ تو بہت مہربان ہے۔ اس نے لغزشوں اور کوتاہیوں کی معافی کے لیے بہت سے دروازے کھلے رکھے ہیں، جس سے وہ اپنے نیک بندوں کو ہمیشہ نوازتا رہتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اصحاب رسول ﷺ کے حوالے سے بیع وشراء کے جس عہد کا ذکر فرمایا گیا ہے، حقیقت یہ ہے یہ محض الفاظ نہیں بلکہ ان الفاظ کے پیچھے ایک ایک صحابی کا زندہ عمل اور فدائیت اور ایثار کا بیش بہا نمونہ موجود ہے۔ جس طرح ہر مرحلے پر صحابہ نے ایثار وقربانی کی تاریخ رقم کی ہے۔ دنیا ہزار کوشش کے باوجود اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ نمونہ دکھانے سے بھی قاصر ہے۔ کوئی بھی مشکل مرحلہ آتا تو صحابہ کی زبان پر ایک ہی جملہ رقصاں ہوتا تھا۔ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا ”میں نے اللہ کو اپنی پسند سے رب مانا ہے اور اسلام کو بطور دین اختیار کیا ہے اور محمد ﷺ کو نبی تسلیم کیا ہے۔“ ان میں سے ہر عقیدے کے پیچھے میرے دل کی آمادگی اور میرے جذبات کی فراوانی شامل ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں تو اسی کی خاطر زندہ ہوں اور جب میں مروں گا تو میری اللہ سے دعا ہے کہ میری موت بھی اسی راستے میں آئے۔ میری تمنا یہ ہے:

Marfat.com

میں تو کیا میرا سارا مال و منال — میرا گھر بار میرے اہل و عیال
میرے ان ولولوں کا جاہ و جلال — میری عمر رواں کے ماہ و سال
میرا سب کچھ میرے خدا کا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ O

(اے ایمان والو اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے) (۲۰۸)

سِلْم کا مفہوم

سِلْم اور سَلْم دونوں قرأتیں ہیں دونوں کا معنی سر تسلیم خم کرنا اور غیر مشروط اطاعت کرنا ہے۔ بعض اہل علم نے اس کا معنی اسلام کیا ہے۔ دونوں معنوں میں کوئی تضاد نہیں محض ظاہر کا فرق ہے۔ کیونکہ اسلام کی اصل حقیقت بھی اللہ اور رسول کی اطاعت ہی ہے۔ كَآفَّةً کا معنی جمیعاً ہے۔ اسے جماعت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حال ہے اس کا ذوالحال ادْخُلُوْا میں ضمیر مستتر' انتم بھی ہو سکتی ہے اور السلم بھی ہو سکتا ہے۔

منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا کا خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام ہے لیکن سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر سابقہ آیات میں گزرا ہے۔ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہاری منافقت کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہاری اطاعت کا اصل رشتہ صرف اللہ سے نہیں بلکہ تم نے اس اطاعت کو مختلف آستانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ تم اللہ سے اطاعت کا دم بھی بھرتے ہو لیکن ساتھ ساتھ اسلام کے مخالفین سے بھی تمہارے اطاعت کے رشتے قائم ہیں۔ اسلام کے آنے سے پہلے اوس وخزرج کے لوگ بھی اور مدینہ کے گردونواح میں رہنے والے قبائل بھی یہود سے حلیفانہ تعلق رکھتے تھے اور جن کا تعلق حلیفانہ سطح تک نہیں پہنچا تھا' وہ بھی مختلف کاروباری رشتوں میں منسلک تھے۔ جب اسلام آیا تو ایمان لانے والوں میں اکثریت تو مخلص مسلمانوں کی تھی لیکن کچھ لوگ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں جیسے ایسے ضرور موجود رہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن یہود سے تعلقات سے دستبردار بھی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بعض دفعہ مسلمانوں کی خبریں انہیں پہنچاتے تھے اور ان کی مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ مدینہ کے اطراف وجوانب میں رہنے والے قبائل کے بعض لوگوں کا حال ان سے بھی بدتر تھا۔ وہ آ کر اسلام کا اظہار کرتے تھے لیکن درپردہ یہود سے اخلاص کا رشتہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ محمد میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ منافقین نے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا منایا' یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے۔ اللہ ان کی اس راز داری کو خوب جانتا ہے۔

Marfat.com

یہاں لِلَّذِیْنَ کَرِھُوْا سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہوسکتا ہے۔ سورۃ نساء میں ان کی اس منافقانہ روش کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا بہ و یرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیداً ○ و اذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ و الی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدوداً.

(ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں پھینک دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں)

طاغوت سے مراد

یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ یہود نے اپنی کتاب میں ترمیم وتحریف کے ذریعے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیے تھے اور مزید یہ کہ ان کی عدالتوں میں ہماری عدالتوں کی طرح رشوت کا کاروبار چلتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ وہاں انصاف بکتا تھا۔ اس لیے جب کبھی ایسے لوگوں کو کوئی معاملہ پیش آتا جس کے لیے عدالت میں جانے کی ضرورت ہوتی، تو وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود آنحضرت ﷺ کی عدالت میں آنے کی بجائے یہود کی عدالت کا رخ کرتے تھے تاکہ وہ رشوت کے ذریعے یا ان کے قانون کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرانے میں کامیاب ہوجائیں اور جب ان سے یہ کہا جاتا کہ تم ایمان واسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود یہود کی عدالتوں میں کیوں جاتے ہو۔ کیا تمہارا ایمان تمہیں اس کی اجازت دیتا ہے تو مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے روش کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ وفاداری کی یہ تقسیم جس نے منافقین کو دو کشتیوں کا سوار بنا دیا تھا۔ اس آیت کریمہ میں اسی بات سے روکا جا رہا ہے کہ تم اگر واقعی مومن ہو اور تمہاری اسلام سے وابستگی کا دعویٰ سچا ہے تو پھر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

Marfat.com

کَآفَّۃً کا مفہوم

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کَآفَّۃً حال ہے اور اس کا ذوالحال اُدْخُلُوْا کی ضمیر خطاب بھی ہو سکتی ہے اور السلم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اسے اُدْخُلُوْا کی ضمیر سے حال مانیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارا کوئی رشتہ بھی اسلام کے سوا کسی اور سے نہیں ہونا چاہیے۔ تم جس طرح ایک مسلمان کی حیثیت سے نماز پڑھتے ہو اور تمہارا جسم اللہ کے سامنے جھکتا ہے اسی طرح تمہارے دل و دماغ کی قوتوں کو بھی اللہ کے سامنے جھکنا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم نماز تو اللہ کے لیے پڑھو لیکن تمہارا دماغ اس کے دیے ہوئے شرعی احکام سے مطمئن نہ ہو۔ کبھی تمہیں اسلامی تہذیب پر اعتراض ہو کبھی اسلامی تمدن پر، کبھی اسلامی ثقافت پر، کبھی اس کے دیے ہوئے آئین پر، کبھی اس کی قانونی دفعات پر۔ مختصر یہ کہ تمہارے جسم کے ایک ایک عضو کے ساتھ ساتھ تمہارے دل و دماغ کی ایک ایک صلاحیت اور ایک ایک احساس اسلام سے وابستہ ہونا چاہیے۔ تم ایک مسلمان کی طرح زندگی گزارو اور ایک مسلمان کی طرح سوچو۔

اور اگر ہم کَآفَّۃً کو السلم سے حال بنائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح تمہاری پوری شخصیت کو اسلام کی تصویر بننا چاہیے۔ اسی طرح مکمل اسلام کو تمہارا عقیدہ اور تمہارے عمل کی روح بننا چاہیے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں اسلام کے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو تو مانتا ہوں لیکن اس کی معاشرت، اس کی معیشت، اس کی تہذیب، اس کی سیاست، اس کے آئین اور اس کے طرز حکومت کو نہیں مانتا۔ ان چیزوں کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام چند عقائد اور چند عبادات کی رسموں کا نام ہے۔ مولویوں نے بلاوجہ اسے ایک مکمل نظام بنا دیا ہے۔ اس میں فوجداری، مالیاتی اور عائلی قوانین کا کوئی تصور نہیں۔ ہمارے ملک کے ایک مشہور ماہر قانون گزرے ہیں جن کا تعلق سندھ سے تھا اور وہ وزیر قانون بھی رہے۔ وہ عالمی شہرت کے قانون دان ہونے کے باوجود ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ اسلام میں کوئی نظام نہیں اور نہ اس کا اپنا کوئی آئین ہے۔ تفہیم القرآن مکمل ہونے پر جو تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں انہوں نے خود تسلیم کیا کہ میں اسلام کو ایک نظام زندگی ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ اس سلسلے میں مولانا مودودی مرحوم سے میری مراسلت ہوئی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ قرآن کریم سے میری بے خبری ہے، جس کی وجہ سے میں اتنی بڑی گمراہی کا شکار تھا۔ قدرت اللہ شہاب صاحب کی وفات پر غالباً مدیر تکبیر جناب صلاح الدین مرحوم کا ایک مضمون چھپا تھا، جس میں انہوں نے اسلام آباد میں شہاب صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ جس میں جناب نعیم صدیقی صاحب مرحوم بھی موجود تھے، اس میں شہاب صاحب نے تسلیم کیا کہ ہم لوگ تو ساری عمر فائلوں کی ورق گردانی میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی اسلام کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں پھر اس پر جمے رہتے ہیں۔ انہوں نے صلاح الدین صاحب سے کہا کہ اگر میں آپ کا مضمون نہ پڑھتا جو آپ نے مولانا مودودیؒ پر لکھا اور میرے بعض خیالات پر تنقید کی تو میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا کہ واقعی اسلام نے ہمیں کوئی نظام نہیں دیا۔ اس کے بعد میں نے خود قرآن حکیم کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے یقین آیا کہ میں واقعی غلطی پر ہوں۔ یہ میں نے آپ کے سامنے دو صالح دانشوروں کے واقعات ذکر کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے اور کس طرح ان کی وفاداریاں مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عہد نبوت کے منافقین تو اپنی منقسم وفاداریوں کے باعث منافق کہلائے

Marfat.com

لیکن آج کے مسلمان کو نہ جانے کیا نام دیا جائے کہ اس نے اپنی شخصیت کو بھی مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اسلام کا بھی ایک من پسند سیٹ اپ یا قالب تیار کر رکھا ہے' جس میں وہ قرآن وسنت کی وضاحتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے ایک مصور سے اپنے بازو پر شیر کی تصویر گودنے کے لیے کہا تھا۔ مصور نے جب بازو سے ماس نکال کر رنگ بھرنے کا آغاز کیا تو اس نے پوچھا کہ کیا بنا رہے ہو۔ کہا دم بنا رہا ہوں۔ کہنے لگا دم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کون سا سچ مچ کا شیر ہے۔ پھر اس نے سوئی چبھوئی۔ تکلیف ہوئی۔ پوچھا اب کیا بنا رہے ہو۔ کہا ٹانگیں بنانے لگا ہوں۔ کہنے لگا کہ یہ کوئی سچ مچ کا شیر ہے جو کہیں بھاگ کر جائے گا۔ غرضیکہ وہ جس عضو کو بنانے کے لیے سوئی چبھوتا' تصویر بنوانے والا تکلیف کی شدت کی وجہ سے اسے روک دیتا۔ مصور نے تنگ آ کر پرکار زمین پر رکھ دی اور کہا اللہ نے تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا۔ جس کا کوئی عضو نہ ہو اور وہ پھر بھی شیر ہو۔ ہمارا آج کے دانشور' سیاست دان اور حکمران ایسے ہی اسلام کی تصویر چاہتے ہیں۔ جس میں سوائے چند رسوم کی پابندی کے اور کچھ بھی نہ ہو اور باقی ان کی پوری زندگی پر غیر اللہ کی حکومت ہو۔ جس طرح عہد نبوت کا منافق اپنی منقسم وفاداری کے باعث اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں تھا اور اسے حکم دیا گیا تھا کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے مسلمان کو بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ کی وفاداری کو تقسیم کرنا' اس کے اسلام میں غیر اسلام کو داخل کرنا یہ شرک ہے' جسے پروردگار کبھی برداشت نہیں کرتا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اسلام مکمل نظام حیات ہے

اسلام جس طرح اپنے عقائد رکھتا ہے۔ اسی طرح اپنا ایک نظام زندگی بھی رکھتا ہے۔ توحید' رسالت اور آخرت اس کے عطا کردہ عقائد ہیں۔ ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اس کی معاشرت' معیشت' اخلاق' معاملات' سیاست' آئین اور آداب زندگی میں بھی کوئی تبدیلی اور قلم کاری قابل برداشت نہیں۔ یہ وہ خالص راستہ ہے جس پر چلنا ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں' وہ شیطان کے راستے ہیں اور ان پر چلنا شیطان کا اتباع کرنا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ شیطان کا اتباع مت کرو۔ اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ شیطان تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے۔ اس نے تمہارے باپ آدم کو جنت سے نکلوانے کی کوشش کی۔ اس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی۔ اور جب اسے وہاں سے نکال دیا گیا تو اس نے چیلنج کیا کہ میں آدم کی اولاد کو اللہ کے راستے پر چلنے نہیں دوں گا۔ میں ہر طرح سے انہیں گمراہ کروں گا۔ فکری راستے سے بھی حملہ کروں گا اور تہذیبی اور تمدنی راستے سے بھی۔ تعلیم کے ذریعے سے میں ان کے تصورات بگاڑ دوں گا۔ میں ان کے سامنے آرزوؤں اور اُمیدوں کے ایسے جال پھیلاؤں گا جس کی وجہ سے یہ اسلام کے راستے پر ثابت قدم نہیں رہ سکیں گے۔ قرآن کریم نے اس کی ان تمام باتوں کو دہرایا تاکہ مسلمان اس کی دشمنی کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی گمراہ کن کوششوں سے بچنے کی کوشش کرے۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ انسان قدم قدم پر اس کا اتباع کرتا ہے اور پھر اسے گالی بھی دیتا ہے۔ وہ جن راستوں پر چلانا چاہتا ہے بڑی آمادگی سے انہی راستوں پر چلتا ہے لیکن وہ اسے احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ تم شیطان کے راستے پر چل رہے ہو۔

Marfat.com

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَ تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اگرتم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جوتمہارے پاس آچکی ہیں پھسل گئے تو جان رکھو
اللہ غالب اور حکمت والا ہے) (۲۰۹)

اتمام حجت کے بعد

بینات سے مراد وہ تنبیہات ہیں جو قرآنِ کریم نے شیطان کی چالوں سے بچانے اور اُس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کیلئے جا بجا بیان فرمائی ہیں۔ تخلیق آدم اور خلافتِ آدم کے واقعہ سے لے کر پورے قرآنِ کریم میں یہ تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں اور اِس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوچکی ہیں اُن میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں شیطان کے حملوں سے بچنے کی تاکید نہ کی گئی ہو اور نہ بچنے کی صورت میں عذاب سے نہ ڈرایا گیا ہو اور مزید یہ کہ جا بجا معذب قوموں کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کا ایک ایک واقعہ شیطنت کی تصویر اور اُس کے نتائج کو نمایاں کرتا ہے اور پھر جن لوگوں نے شیطان کی چالوں سے بچ کر انبیائے کرام کی دعوت کو قبول کیا وہ جس طرح کامیابیوں اور اجر وثواب سے نوازے گئے اس کی تفصیل سے بھی قرآنِ پاک کے اوراق معمور ہیں۔ منافقین کو بالخصوص اور کمزور ایمان کے مسلمانوں کو بالعموم خطاب فرما کر اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان جوہر عقل کے باوجود زندگی کے تمام معاملات کو باحسن طریق چلانے پر قادر نہیں۔ قدم قدم پر اسے خواہشات اور جذبات سے تصادم مول لینا پڑتا ہے اور اس تصادم میں عموماً جذبات غالب آجاتے ہیں اور بعض دفعہ خواہشات کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی ایسا ذریعۂ ہدایت ہونا چاہیے جو انسان کو صراط مستقیم پر چلنے میں مدد دے۔ اس کے سامنے حسن وقبح کے معیار کو واضح کرے۔ مکارم اخلاق کو اس کی زندگی کا حسن بنا دے اور رفتہ رفتہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اللہ کی ذات اس کا مطلوب اور محبوب بن جائے۔ اللہ کے نبیوں نے انسانی خیر خواہی کے لیے ہمیشہ یہی کام کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اور انسانی مخالفتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محض انسان کی بھلائی کی خاطر اسے قدم قدم پر رہنمائی فراہم کی اور اس کے لیے زندگی گزارنا آسان کر دیا۔ لیکن اللہ نے اس کا امتحان لینے کے لیے ساتھ ہی گمراہ کرنے والی سب سے بڑی قوت شیطان اور اس کے متبعین کو بھی موقع دیا کہ تم انسان کو بھلائی سے ہٹانے اور برائی کی طرف راغب کرنے میں آزاد ہو۔ جس طرح انبیائے کرام انسان کو صراط مستقیم کی ہدایت دیں گے، تم بھی ان کے مقابلے میں انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی کوششیں بروئے کار لاؤ گے۔ اب یہ انسان کی آزمائش ہے کہ وہ انبیاء کے ذریعۂ ہدایت کو قبول کرتا ہے یا شیطان کے نقوش قدم پر چلتا ہے۔

بینات کا مفہوم

انبیائے کرام کی حقانیت کو واضح کرنے کے لیے اللہ نے انہیں معجزات عطا کیے۔ ان کی زندگی کو کمزوریوں سے محفوظ رکھا۔ ان کو معصوم پیدا فرمایا۔ جس طرح پتھروں کے ڈھیر میں ہیرا چمکتا ہے اس طرح وہ اپنی ذاتی حیثیت میں انسانی معاشرہ میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کی سیرت وکردار ان کی پاکیزہ زندگی، ان کی دلآویز شخصیت، ان کے معاملات کا حسن پھر ان کی زبان سے ابلنے والا ہدایت وحکمت کا سرچشمہ اور پھر ساتھ ساتھ معجزات کی تائید اور حق وباطل کی کشمکش میں اللہ کی نصرت یہ وہ بنیات ہیں، جن سے ان کی شخصیت اور دعوت کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ اور لوگوں

Marfat.com

کے لیے ان کا ماننا آسان کر دیا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو یہ تمہارے انتہائی خیر خواہ اور ہمدرد اللہ کے نبی اور ان کے بینات ہیں اور دوسری طرف شیطان کی چالیں' اس کی تزویر کے پھندے' اس کی برائی کی طرف دعوت اور پھر اس کی شعبدہ بازیاں یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر انسان عقل سے کام لے کر حقیقت کو جاننا چاہے تو اس کے لیے حقیقت کو سمجھنا کوئی دور کی بات نہیں اور مزید یہ بھی کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی تک ہر پیغمبر اور ہر مذہب نے شیطان کی دشمنی کو واضح کیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر تم ان بینات کے آ جانے کے بعد بھی بار بار راہِ حق سے پھسلتے ہو اور شیطان کے نقوش قدم کی طرف لپکتے ہو تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حق تمہارے سامنے واضح ہو چکا' بینات سے تمہیں پوری طرح مطمئن کر دیا گیا۔ لیکن تمہاری باطل پسندی اپنی جگہ رہی اور تم نے شیطان کے نقوش قدم پر چلنا نہ چھوڑا تو پھر یاد رکھو کہ تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اس کی سلطنت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ اس کی بے پناہ قدرت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ البتہ تم اپنا انجام ضرور برباد کر لو گے۔ کیونکہ تمہارا واسطہ کسی کمزور اور ناتواں سے نہیں کہ تم اس کی پکڑ سے بچ نکلو۔ تمہیں سابقہ ایک عزیز ذات سے ہے۔ وہ اس قدر غالب اور توانا ہے کہ جب وہ تمہیں پکڑنا چاہے گا تو تم ہزار کوشش کے باوجود اس سے بچ نہیں سکو گے۔ البتہ وہ کمزور حکمران کی طرح پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا کیونکہ اسے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ اگر میں نے ان مجرموں کو آج نہ پکڑا تو کل یہ میری گرفت میں نہیں آ سکیں گے۔ بلکہ اس کا پکڑنے میں تاخیر کرنا یہ دراصل اس کی صفت حکمت کا اظہار ہے۔ وہ بار بار ڈھیل دیتا ہے تاکہ لوگ اگر سنبھلنا چاہیں اور اپنے انجام کو درست کرنا چاہیں تو کر لیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پکڑے گا نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اس کے نزدیک اچھائی کرنے والے اور برائی کرنے والے سب برابر ہیں۔ اس نے جس طرح نیکی کرنے والے کو پنپنے کا موقع دیا ہے' اسی طرح برائی کرنے والے کو بھی دیا ہے۔ اگر ایسا سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ حکیم نہیں بلکہ کھلنڈرا ہے۔ یہ دنیا اس نے محض کھیل تماشے کے لیے بنائی ہے، جس کا کوئی حقیقی مقصد نہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیے بلکہ ان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یعنی ان کا ایک سنجیدہ مقصد ہے اور انسان اس کائنات کا گل سرسبد ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اس لیے انسان کو اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے اور اس سے پہلے کہ اس عزیز ذات کی گرفت میں آ جائے' اسے اس کی اس ڈھیل سے فائدہ اٹھانا چاہیے' جو اس نے حکیم ہونے کی وجہ سے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے عطا کی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

(کیا یہ لوگ منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے اور اللہ کی طرف معاملات لوٹائے جاتے ہیں) (۲۱۰)

سب سے پہلے اس آیت کے الفاظ پر غور فرمائیے۔ ینظرون' ینتظرون کے معنی میں ہے اور باقی الفاظ اپنے مفہوم و معنی میں بالکل واضح ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے ہر لفظ کا لغوی معنی مراد لیا جائے تو ہمارے مسلمہ عقائد کے اعتبار سے بڑی الجھن پیدا ہوگی۔ ہم اللہ کریم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ جسم سے پاک ہے۔ کہیں آنا جانا' دکھائی دینا یہ ساری جسم کی صفات ہیں۔ یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائے میں آئے اور ہم اس کو دیکھیں۔ بادلوں کے سائے میں آنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جس طرح بادلوں کا جسم ہے اور وہ محدود ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے محدود جسم کے ساتھ اس طرح نمودار ہو کہ تخت سلطنت پر فائز ہو اور فرشتوں کی فوجیں اس کے اردگرد ہوں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی صفات کو جانتے ہوئے ہم یہ مفہوم مراد نہیں لے سکتے۔ اسی لیے علمائے سلف کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ایسی تمام آیتیں متشابہات میں سے ہیں اور ان کا حقیقی مفہوم اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن علمائے متاخرین کا مسلک یہ ہے کہ ایسی آیات کی اس طرح تاویل کرنا جو ان کی شایان شان ہو' صحیح ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے اس آیت کی اپنے اپنے طریقے سے تاویل فرمائی ہے اور سب سے آسان تاویل وہ ہے جس میں اللہ سے پہلے مضاف محذوف مانا گیا ہے۔ پھر اصل عبارت اس طرح ہوگی۔ ان یاتیھم امر اللہ و باسه۔ امام بیضاویؒ جیسے قدیم مفسرین نے اسی تاویل کو اختیار کیا ہے۔ لیکن ہماری اس سلسلے میں ایک عاجزانہ رائے ہے' وہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کی تاویل کی ضرورت جب ہے جب کہ اسے پروردگار کا قول ٹھہرایا جائے لیکن یہاں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کافروں یا منافقوں کی خواہش یا ان کے مطالبے کی حکایت ہے اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں جابجا موجود ہیں۔ ان کی طرف سے یہ مطالبہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو اس وقت راہ راست پر آئیں گے اور اس وقت اسلام کی دعوت قبول کریں گے جب ہم یہود کی طرح جنہوں نے یہ کہا تھا: لن نومن حتی نری اللہ جھرۃ۔ ''ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تاوقتیکہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔'' ہم بھی اپنی آنکھوں سے اس طرح اپنے پروردگار کو دیکھیں کہ وہ شاہانہ جلال سے تخت سلطنت پر فائز ہو اور اس کے گردوپیش فرشتوں کا لشکر جرار ہو اور بادل اس کے سر پر سایہ کناں ہوں۔ اس کے بعد ہمارے لیے گنجائش کا کوئی موقع باقی نہیں رہے گا تو ہم اسلام کی دعوت کو قبول کرلیں گے۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ کی ذات کو' کہ انسانی نگاہوں کے لیے دنیا میں جس کا دیکھنا ممکن نہیں' دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہو

معتبر ایمان کیا ہے؟

تو پھر تمہارے اس ایمان کی قدر و قیمت کیا ہوگی۔ کیونکہ اللہ کے یہاں اس ایمان کی قیمت ہے' جو بن دیکھے لایا جائے۔ جو ایمان بالغیب کہلاتا ہے۔ اللہ کی ذات پر یقین اس کی صفات اور اس کی قدرتوں کے ذریعہ پیدا کرنا ایمان کا تقاضا ہے اور اگر غیب کی تمام حقیقتوں کو آنکھوں کے سامنے کھول دیا جائے تو پھر انسان کی آزمائش تو ختم ہوجاتی ہے۔ تو پھر جزا اور سزا کس بات پر ہوگی۔ یعنی تم ایک ایسا مطالبہ کررہے ہو' جس کو مان لینے کا نتیجہ ایمان کی حقیقت کو بے وقعت کردینا ہے اور تخلیق انسانی کا جو اصل مقصد ہے' اسے ناکام کردینا ہے اور اگر فرض کیجئے ایسا ہوجائے کہ غیب کی ایک ایک حقیقت تمہاری آنکھوں کے سامنے کھول دی جائے تو پھر زندگی اور اس کائنات کی صف لپیٹ دی جائے گی۔ کیونکہ اصل امتحان ختم ہوجائے گا اور یہاں کا قیام بے مقصد ہوکر رہ جائے گا۔ تمہیں تو صرف اس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیے کہ یہاں کا ایک ایک معاملہ تمہارا ایک ایک عمل اور مخلوقات کی ایک ایک ضرورت اللہ کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے تو اسی کے فیصلوں کے ساتھ قائم ہے اور جب قیامت برپا ہوگی تو تمہارے وہی معاملات جو اعمال کی شکل میں اللہ کی طرف لوٹائے گئے ہیں جزا اور سزا کا ذریعہ بنیں گے۔

Marfat.com

ایک مفہوم اس آیت کا اور بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک بینات یا ہدایت کا تعلق ہے اس میں تو کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ لیکن اگر کچھ لوگ اب بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں شاید اس بات کا انتظار ہے کہ اللہ تخت سلطنت پر فائز فرشتوں کے جلو میں اور بادلوں کے سایے میں ان کے سامنے آموجود ہو اور پھر اپنی قوت سے ان کے سروں کو اپنے سامنے جھکائے اور ان کی سرکشی کا انہیں مزا چکھائے لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں کہ یہ بات سراسر کائنات کی تخلیق کی سکیم کے خلاف اور جزا و سزا کے قانون کے بالکل برعکس ہے۔ تمہیں جو فیصلہ کرنے کے لیے ڈھیل پہ ڈھیل دی جارہی ہے وہ اسی لیے ہے تاکہ تم اپنی عقل، اپنے حواس اور شعور سے کام لے کر ان بینات پر غور کرو اور پھر اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرلو۔ لیکن اگر اس صورتحال کو الٹ دیا جائے تو پھر تو ہر معاملہ ختم ہو کر رہ جائے۔ اس طرح سے تم اپنی موت اور کائنات کی تباہی کو دعوت دے رہے ہو۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا
فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾
كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ
وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ
النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا

Marfat.com

الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ
الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ
مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ
الْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ
لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا
شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع

رکوع: ۲۶۔ (بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے پانے کے بعد بدل ڈالے تو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ○ مزین کردی گئی ہے دنیا کی زندگی کافروں کی نگاہوں میں اور یہ ان لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جو ایمان لائے ہیں' حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں' قیامت کے دن وہ ان پر بالا ہوں گے' اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے ○ لوگ ایک امت تھے۔ پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا' بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اور ان پر کتاب اتاری حق کے ساتھ۔ تاکہ وہ فیصلہ کریں لوگوں میں ان باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اور نہیں اختلاف کیا کتاب میں مگر ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ اس کے بعد کہ آچکے تھے ان پر واضح دلائل آپس میں ضد کی وجہ سے۔ پھر اب اللہ نے ہدایت کی ہے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اس سچی بات کی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اپنے حکم سے۔ اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ○ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا۔ ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی؟ بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے ○ وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ والدین' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اسے جاننے والے ہیں ○ تم پر جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لیے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے) (۲۱۱ تا ۲۱۶)

Marfat.com

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○

(بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے پانے کے بعد بدل ڈالے تو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے) (۲۱۱)

روئے سخن کس کی طرف ہے

سیاق کلام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا روئے سخن بھی منافقین کی طرف ہے۔ لیکن اس کے مفہوم کو اگر غور سے سمجھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ ساتھ مسلمانوں سے بھی کچھ کہا جا رہا ہے۔ بات لپیٹ کے کہی جا رہی ہے لیکن روشنی کا سامان دونوں کے لیے ہے اور اس سے دو آیتیں پہلے خطاب بھی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر کیا گیا ہے جس میں منافقین اور مسلمان دونوں شریک ہیں۔ رسول کریم ﷺ کے صحابہ جس ایمان کامل اور اخلاص تام کے حامل تھے انہیں تو ایسی باتیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن چونکہ آئے دن اسلام کے قافلے میں نئے نئے لوگوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ اسلام کی آغوش میں آنے والا ہر شخص ایک ہی سطح کا تو نہیں ہو سکتا۔ تربیت سے آہستہ آہستہ ان باتوں کی اصلاح ہوتی ہے جو اسلامی مزاج کے خلاف ہیں اور پھر آئندہ بھی اُمت مسلمہ کا قافلہ رکنے والا تو نہیں تھا۔ ان ہدایات کی ضرورت تو ہمیشہ باقی رہنے والی تھی۔ اس لیے وہ باتیں جو آج کچھ لوگوں میں موجود ہیں یا آئندہ کچھ لوگوں میں ہو سکتی ہیں' ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں ممکن ہے یہ حکمت بھی شامل ہو کہ منافقین یا تو بنی اسرائیل ہی سے تعلق رکھتے تھے اور یا بیشتر ایسے تھے جن کے بنی اسرائیل سے گہرے تعلقات تھے اور وہ ان کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اسلام کے بارے میں یکسو نہیں ہو رہے تھے۔ مختصر یہ کہ منافقین ہوں یا کمزور مسلمان یا آئندہ ان کمزوریوں کے حامل مسلمان سب سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم تمہیں معذب قوموں کی تاریخ پڑھنے کی دعوت نہیں دے رہے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم پرانی تہذیبوں کے کھنڈرات میں تاریخ تلاش کرتے پھرو بلکہ ہم تمہارے سامنے ایک ایسی قوم کو پیش کر رہے ہیں' جو ایک زندہ قوم ہے لیکن اپنی بداعمالیوں کے باعث دوسروں کے لیے عبرت بن چکی ہے۔

بنی اسرائیل کو بطور عبرت پیش کیا جا رہا ہے

ذرا اس قوم کو دیکھیے ان کا انتساب اللہ کے ایک جلیل القدر نبی کی طرف ہے۔ ان کی تاریخ کا اصل آغاز حامل دعوت ہونے کے حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے برسوں تک فرعون کے سامنے کلمۂ حق کہا اور اللہ کے دین کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کے انکار بلکہ تمرد کے باعث جس طرح مختلف شکلوں میں اہل مصر پر عذاب آتے رہے اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دور ہوتے رہے ان میں سے ایک ایک نشانی کو بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر

Marfat.com

ہجرت کے ارادے سے نکلے تو ایک طرف بحر قلزم کی موجوں نے ان کا راستہ روک لیا اور دوسری طرف فرعون کی فوجیں سر پر آ پہنچیں اور پھر جس طرح اللہ نے بحر قلزم میں بنی اسرائیل کے لیے راستے نکالے اور ان کے پار اتر جانے کے بعد ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون اور اس کی فوجوں کو غرق کیا وہ بھی انہوں نے بچشم سر دیکھا۔ پھر وادی تیہ اور صحرائے سینا میں جس طرح اللہ نے ان کے سر پر بادلوں کا چھتر تان دیا' من وسلوٰی سے انہیں غذا پہنچائی۔ ایک چٹان سے ان کے لیے بارہ چشمے نکالے۔ کوہ طور کو ان کے لیے شق کیا۔ تورات جیسی کتاب عطا فرمائی۔ غرضیکہ بے شمار معجزات انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ایسے کھلے کھلے معجزات دیکھنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کی قوت ایمان میں کوئی کمی نہ رہتی' ان کا ایک ایک عمل تقویٰ کی تصویر ہوتا لیکن اس کے برعکس ان کی بے اعتقادی' ایمان کی کمزوری' ناشکری کی عادت اور بے صبری کی خصلت برابر ان کے سروں پر مسلط رہی اور پھر اسی پر بس نہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے کتاب ہدایت دے کر حامل دعوت اُمت کا منصب بخشا۔ ساری دنیا میں توحید کی امانت انہیں سپرد کی گئی۔ لیکن انہوں نے اس امانت کا حق ادا کرنے میں صدیوں تک جو کمزوریاں دکھائیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اللہ کی یہ نعمت یعنی کتاب اللہ اور شریعت کی نعمت اور حامل دعوت ہونے کا منصب آہستہ آہستہ بدل ڈالا۔ وہ رفتہ رفتہ اس بات کو بالکل بھول گئے کہ اللہ نے ہمارے سپرد جو عظیم ذمہ داری کی تھی' ہم نے اس کے ساتھ کیا حشر کیا ہے۔ ہر دور میں نبی آتے رہے اور انہیں جھنجھوڑتے رہے لیکن سلیمان علیہ السلام کے دور کے بعد جو بنی اسرائیل کا انتہائی عروج کا دور ہے۔ جب ان کے زوال میں انتہا درجے کی تیزی آ گئی۔ ایک سلطنت کی بجائے دو سلطنتیں قائم کر ڈالیں اور پھر آپس میں لڑ لڑ کر اس طرح کمزور ہو گئے کہ جب کوئی حکمران چاہتا ان پر چڑھ دوڑتا۔ حتیٰ کہ بخت نصر نے ان کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد بھی مختلف وقتوں میں دوسرے حکمران ان پر عذاب الٰہی بن کر مسلط ہوتے رہے۔ اس تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ زندہ قوم تمہارے لیے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اللہ جب کسی اُمت کو شریعت دیتا ہے' نبوّت اور کتاب سے نوازتا ہے تو انہیں ساتھ حکومت و سلطنت بھی عطا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس نعمت کا حق ادا نہیں کرتے تو پھر اللہ کا عذاب بڑا شدید ہے۔ اس کی شدت ملاحظہ کرنی ہو تو تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی اسرائیل پر برسنے والے عذاب کے کوڑوں کو دیکھ لیجیے' اس سے مسلمانوں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ اب ہمیں بھی ایک حامل دعوت اُمت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ ہمیں بھی ملک عظیم عطا کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے بنی اسرائیل کی طرح اس امانت اور نعمت کا حق ادا کیا تو ہمارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اگلی آیت کریمہ میں اس بنیادی بیماری کی اطلاع دی گئی ہے جس میں عموماً قومیں اور افراد مبتلا ہوتے ہیں اور پھر اس میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد زندگی کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

(مزین کردی گئی ہے دنیا کی زندگی کافروں کی نگاہوں میں اور یہ ان لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جو ایمان لائے ہیں' حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں' قیامت کے دن وہ ان پر بالا ہوں گے' اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے) (۲۱۲)

Marfat.com

حیات دنیا کی تزئین کا مفہوم

دعوت الی اللہ اور غلبۂ دین کی خاطر انبیائے کرام کی جدوجہد ان کی قربانیوں، ان کے ایثار و خلوص، پھر ان کے متبعین کی وفاشعاریوں کو دیکھتے ہوئے بعض دفعہ حیرانی ہونے لگتی ہے کہ آخر یہ دعوت کفار کے لیے قابل قبول کیوں نہیں ہوتی، اور اس دعوت کو نفوذ اختیار کرنے میں اس قدر تاخیر کیوں ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض انبیائے کرام کی طویل جدوجہد گنتی کے صاحب ایمان پیدا کر سکنے میں کامیاب ہوئی۔ لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں، جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے تو پھر یہ ہماری حیرانی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص جو من مرضی کی زندگی گزارتا ہے۔ ہر معاملے میں اس کی خواہشات اس کی رہنما ہوتی ہیں۔ حیوانوں کی طرح کھانا پینا اور عیش کرنا اس کی زندگی کا مقصد بنا رہتا ہے۔ کسی کی حق تلفی یا حق شکنی کرنا اس کے لیے کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہوتی۔ وہ صرف عزت اور لذت کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ زندگی میں زندگی سے محظوظ ہونا زندگی کا اصل ہدف سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی خواہشات کو حاصل کرنا اصل مقصد ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اجتماعی ذمہ داری، کوئی اخلاقی قدر، کوئی انسانی حق، کوئی روحانی فلسفہ، کائنات کے بارے میں کوئی سوال، خالق کائنات سے متعلق کوئی سوچ، زندگی کی ابتدا اور انتہاء کے بارے میں کوئی فکر اس کے دل و دماغ پر کبھی دستک نہیں دیتی۔ ایسے آدمی کو جب پیغمبر اچانک اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں نئے نئے سوالات اٹھاتا ہے۔ اسے زندگی کے مقاصد کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کے سامنے حقوق و فرائض کا در کھولتا ہے اور اسے سمجھاتا ہے کہ تم یہاں صرف کھانے پینے اور عیش و عشرت کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو بلکہ تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جس کے حصول کے لیے تمہیں ہر قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ تمہاری اپنی ذات تمہارا مقصود نہیں ہے بلکہ اللہ کی ذات اور اس کا دین تمہارا مقصد ہے۔ غور فرمایئے، اس کی زندگی کا پہلا تصور جسے حیاتِ دنیا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور زندگی کا دوسرا تصور جسے اللہ کے رسول نے اس کے سامنے پیش کیا ہے، دونوں کے درمیان کس طرح مشرق و مغرب کا فاصلہ ہے۔ ایک شخص جو زندگی کے پہلے تصور پر جان دیتا ہے اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور اس زندگی میں اس کے لیے مزے ہی مزے ہیں۔ وہ اس دوسری زندگی کو کیسے قبول کر لے۔ جس کا حال یہ ہے کہ:

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

یہی وہ حقیقی کشمکش ہے جو دنیا کے پرستاروں یعنی کافروں کو آخرت کی طرف دعوت دینے والوں کے قریب نہیں آنے دیتی اور جب وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ آخرت کے مسافر اور جنت اور اس کی نعمتوں کے دعوے دار اپنے پاس سوائے محرومیوں کے اور کچھ نہیں رکھتے۔ یہ معاشرے کے نہایت گرے پڑے لوگ مالی اعتبار سے نہایت نادار اور معاشرتی اعتبار سے نہایت بے کس اور سیاسی اعتبار سے نہایت بے اثر اور ظاہری وجاہتوں کے اعتبار سے درویش اور مسکین ہمیں جس مستقبل کی نوید دے رہے ہیں۔ وہ مستقبل اسی طرح کا ہوگا جس طرح کے یہ لوگ ہیں۔ چنانچہ جب مسلمان انہیں غلبۂ دین کے نتیجہ میں ملکوں کے ہاتھ آ جانے کی خبر دیتے تھے، تو وہ ان کا مذاق اُڑاتے تھے کہ یہ ہیں کل کے حکمران جنہیں آج جوتا پہننے کو نہیں ملتا اور جب وہ ان کے سامنے جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے تو وہ تمسخر کرتے کہ ماشاء اللہ یہ ہیں جنت کے وارث جنہیں دو وقت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ چنانچہ دنیا کے اعتبار سے یہ فرقِ مراتب ان کے دل و دماغ کا ایسا حصہ بن جاتا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر سوچنے پر قادر نہیں رہتے۔ ان کی اس بیماری کا ذکر کرنے کے بعد پروردگار فرماتے ہیں کہ کاش ان لوگوں کو اس بات کی خبر ہوتی کہ تم

Marfat.com

نے اپنے لیے زندگی کا جو رویہ اپنایا ہے' غور کرو تمہارے چند اُمراء کی عیش پرستیوں کے سوا تمہیں اس رویے نے کیا دیا ہے۔ تم جن غریبوں پر ہنستے ہو یہ تمہارے اسی رویے نے پیدا کیے ہیں اور تمہیں اپنے معاشرے میں جو اونچ نیچ نظر آتی ہے' یہ تمہارے ہی تصورات کا نتیجہ ہے۔ خود تمہارے اپنے گھروں میں تمہاری بیویاں جس طرح تم سے خیانت کرتی ہیں اور تم اپنی بیویوں سے خیانت کرتے ہو اور تمہاری اولاد جس طرح تمہاری گستاخیاں کرتی ہے اور تمہارا سماج جس طرح ظلم کی بنیادوں پر کھڑا ہے' یہ سب کچھ تمہاری زندگی کے اس تصور نے پیدا کیا ہے' جسے تم کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے اور زندگی کا وہ تصور جو پیغمبر تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس میں بظاہر تمہیں ایثار و قربانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن حقیقت میں اسی کے نتیجے میں وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کا ہر فرد پُر امن زندگی گزارتا ہے اور وہ صرف اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسے دوسروں کے فاقوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہی احساس بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے پر رحمت بن کر چھا جاتا ہے اور یہی لوگ جن پر تم آج ہنستے ہو' یہی تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے کے بعد اس سوسائٹی کے بالا بلند لوگ ہوں گے' جو اسلام کی بنیاد پر وجود میں آئے گی۔ اور یہی لوگ ہوں گے جو قیامت کے دن ان تمام لوگوں سے برتر ہوں گے جو آج انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یعنی دنیا کی زندگی میں بھی اللہ ان کو عزت دے گا اور انہی سے عزت کا صحیح مفہوم وجود میں آئے گا اور آخرت میں ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہوگا۔

بے حساب رزق کا مفہوم

آیت کے آخر میں مزید فرمایا: وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ''اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''

تقویٰ کی بنیاد پر زندگی گزارنے والے قیامت کے دن تو اللہ کی بے پایاں نعمتوں سے یقیناً مالا مال ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اگرچہ دار الابتلاء ہے دار الجزاء نہیں۔ اس لیے یہاں ہر عمل کا بدلہ ملنا ضروری نہیں۔ لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ بعض دفعہ وہ دنیا ہی میں متقی لوگوں کے لیے اپنے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اپنے کاروبار میں کبھی حرام کی آمیزش نہیں ہونے دی اور اللہ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی طرف سے اپنے کاروبار کو ہر طرح کے حرام سے پاک رکھیں گے۔ چنانچہ چند سال تک تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا لیکن جب وہ ثابت قدم رہے' تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رزق کی فراوانی کے دروازے کھول دیئے۔

یہاں ایک بات یاد رہے کہ اللہ کا کوئی کام حساب کے بغیر نہیں ہوتا۔ صحرا میں پتہ بھی گرتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ یہاں بِغَیْرِ حِسَابٍ ہمارے حوالے سے کہا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض دفعہ اتنی فراوانی سے عطا کرتا ہے کہ توقعات اور اندازوں اور قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے اسے ناپنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ
الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

Marfat.com

(لوگ ایک امت تھے۔ پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اور ان پر کتاب برحق اتاری تاکہ وہ فیصلہ کریں لوگوں میں ان باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اور کسی اختلاف نہیں کیا اس کتاب میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ اس کے بعد کہ روشن دلیلیں ان کے پاس آ گئیں ایک دوسرے سے حسد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے ان لوگوں کو ہدایت بخشی جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے۔ اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف) (۲۱۳)

ایک فکری غلطی کا ازالہ

اس آیت کریمہ میں انسانی تاریخ کے بارے میں مختلف قوموں کے نام نہاد دانشوروں نے ہدایت و ضلالت کے اعتبار سے جو مفروضے قائم کر رکھے ہیں اور پھر ان پر مختلف عمارتیں اٹھا رکھی ہیں ان پر ایک پہلو دار طریقے سے گفتگو فرمائی گئی ہے۔ اور بعض حقائق سے اس طرح پردہ اٹھایا گیا ہے کہ غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ عبرت اور ہدایت کا سامان ہے۔

سب سے پہلی غلط فہمی جسے علم و دانش کے سوداگروں نے عالمگیر شہرت دے رکھی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ انسان کو بھی باقی مخلوقات پر قیاس کرتے ہیں۔ کہ جن کی زندگی کی ضروریات جسمانی غذا اور بقا کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہیں اللہ نے حواس کی صورت میں رہنمائی عطا کی ہے لیکن اس راہنمائی میں وقت کے ساتھ ساتھ اور ضروریات کے مطابق ترقی کرنے کے بے حد امکانات رکھے ہیں۔ چنانچہ حیوانوں کی مختلف اقسام کا جن لوگوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے حواس نے عہد بہ عہد کیسے ترقی کی ہے؟ لیکن یہ ان کی ساری ترقی حیوانیت کی حدود سے باہر نکلنے نہیں پاتی۔ چنانچہ ان نام نہاد دانشوروں نے انسان کو بھی محض ایک حیوان سمجھ کر اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر بالکل اس طرح کھینچی ہے جس طرح حیوانوں کی کھینچی گئی ہے۔ وہ جس طرح غاروں سے اور پتھر کے دور سے نکل کر آبادی میں اور حضری حدود میں داخل ہوا ہے اور اپنی غذائی ضروریات کو جس طرح مرور زمانہ کے ساتھ بہتر بنایا ہے اسی پر وہ اس کی معنوی اور روحانی صلاحیتوں اور ضروریات کو قیاس کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان پہلے مظاہر پرستی اور بت پرستی میں مبتلا رہا۔ آہستہ آہستہ انسانوں نے انسانوں کی پرستش شروع کی۔ آخر ایک وقت آیا جب وہ توحید کی عظمت کا قائل ہوا اور اس طرح اس نے اپنی معنوی اور روحانی ضرورتوں کا سفر طے کیا۔ لیکن اس آیت کریمہ میں دو باتیں ارشاد فرما کر ان کے ان تمام مفروضوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ ایک تو یہ بات کہ اگر انسان نے اللہ کی معرفت اور حقیقی مذہب کا شعور اپنی بنیادی صلاحیتوں کے ذریعے حاصل کیا ہوتا تو اس میں آپ کو مختلف تاریخی دوائر میں انسان مختلف حالتوں اور مختلف کیفیتوں میں مبتلا نظر آتا۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ انسان اپنی آغازِ حیات میں آبادی کے پھیلنے کے باوجود بھی ایک امت اور ایک گروہ تھا۔ جن میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کسی کا مذہب کچھ ہوتا اور کسی کا کچھ' کوئی کسی کی پوجا کرتا اور کوئی کسی کی' بلکہ تمام انسان اپنے بنیادی خیالات' اپنے رب کی معرفت اور اپنے مقصد زندگی کے شعور میں بالکل یکساں تھے۔ اور دوسری یہ بات کہ انسانوں میں جو وحدت کا شیرازہ بکھرا ہے اور اختلاف کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یہ بعد کی بات ہے۔ یہاں اگرچہ اس اختلاف کا ذکر نہیں ہے' لیکن قرآنِ کریم کے اسلوب کے شناسا لوگ یہاں فَاخْتَلَفُوْا کے لفظ کو محذوف مانتے ہیں۔ اور اس کی دلیل خود اس آیت کے اندر موجود ہے۔ اور قرآنِ کریم میں دوسری آیات میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ اس کی بہت ساری خصوصیات میں

Marfat.com

سے ایک خصوصیت ''ایجاز'' بھی ہے۔اس لیے اگر ایک لفظ ایک آیت کریمہ میں آجاتا ہے اور اسی آیت میں دوسری جگہ کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے تو پھر اس لفظ کا تکرار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ یہ اصولِ فصاحت وبلاغت کے خلاف ہے۔اس آیت کریمہ میں اگلی ہی سطر میں فرمایا گیا ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ یہاں اس لفظ کو ذکر کرنے کی وجہ سے آیت کے آغاز میں اس کو حذف کر دیا گیا ہے۔اور جہاں تک قرآنی شواہد کا تعلق ہے سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ''سب آدمی ایک ہی امت تھے' پھر آپس میں اختلاف پڑ گیا اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی فیصلہ نہ ہوتا کہ (اس عالم دنیا میں حق و باطل' کھرا کھوٹا' سچ اور جھوٹ ملے جلے چلیں گے) تو قدرتِ الٰہیہ ان سب جھگڑوں کا ایسا فیصلہ کر دیتی کہ حق سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔''

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ''یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں اس لیے سب میری ہی عبادت کرتے رہو۔''

اسی طرح سورۂ مومنون میں فرمایا اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ''یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں اس لیے مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔''

ان دلائل اور شواہد کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسان کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور وہ اللہ کے نبی تھے۔ان کی اولاد پھیلی تو جب تک شیطان کو گمراہی پھیلانے میں کسی حد تک کامیابی نہیں ہوئی اس وقت تک انسانی جماعت اور امت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔پھر شیطانی کارگزاری کے نتیجے میں انسانوں میں اختلافات پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے انبیاءِ کرام کو مبعوث فرمایا۔اور اس بات کو تسلیم کرنے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ کے نبی انسانوں کے ان اختلافات کو جن کا تعلق انسانی احساسات مفادات اور مزاجوں سے ہے ختم کرنے کے لیے تشریف نہیں لاتے۔وہ تو ان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے آتے ہیں جو دین اور شریعت کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں۔توحید میں شرک کی آمیزش کی جاتی ہے' اللہ کے آستانے کے ساتھ ساتھ دوسرے آستانے بنا لیے جاتے ہیں' اللہ کی غیر مشروط اطاعت کرنے سے انحراف کیا جاتا ہے یا اس اطاعت میں اور قوتوں کی اطاعت شامل کر لی جاتی ہے' عبادتیں بے روح ہو جاتی ہیں' حقوق و فرائض کا تصور اور احساس دھندلا جاتا ہے اور انسانی زندگی اللہ کے راستے سے منحرف ہونے لگتی ہے تو دوبارہ اسے اللہ کے راستے پر ڈالنے' صراطِ مستقیم پر چلانے' توحید کو خالص اور بے میل بنانے اور انسانوں میں ظلم اور حق تلفی ختم کرنے کے لیے اللہ کے نبی تشریف لاتے ہیں۔ہمارے نام نہاد دانشوروں نے اختلاف کو جن دائروں میں تقسیم کر رکھا ہے یہاں مقصود وہ اختلاف نہیں بلکہ وہ اختلاف ہے جو بندے کو بندگی سے محروم کر دیتا ہے۔اور بندہ اپنے اللہ کے آستانے سے دور ہٹ جاتا ہے۔

انبیاءِ کرام کی دعوت کے دو مقاصد

مزید فرمایا کہ ہم نے جو انبیاءِ کرام کو بھیجا تو ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے نمبر ایک تبشیر اور نمبر دو انذار۔ان کی دعوت کی اصل روح صرف یہ تھی کہ لوگو! تمہیں اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنی چاہیے۔اور اگر تم واقعی اسی کی بندگی اور اطاعت کرتے ہو تو ہم تمہیں دنیوی اور اخروی کامیابیوں کی بشارت دیتے ہیں۔ہوسکتا ہے دنیا میں تمہیں اس راستے میں تکلیفیں اٹھانی پڑیں اس لیے کہ شیطانی جتھے آسانی سے تمہیں اس

Marfat.com

راستے پر چلنے نہیں دیں گے اور کوئی بڑی بات نہیں کہ تم اس راستے میں قربان ہو جاؤ۔ لیکن جہاں تک اخروی کامیابی کا تعلق ہے وہ صرف تمہارے لیے ہے۔ تمہیں اللہ تمہارے ایمان و عمل پر جنت عطا کرے گا' اپنی خوشنودی سے نوازے گا' جنت میں اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا اور دنیا کے چند روزہ ایمان و اطاعت کے بدلے میں وہ اخروی نعمتیں نصیب ہوں گی جن کا نہ تمہارے دل و دماغ میں کبھی خیال گزرا نہ تمہاری آنکھوں نے کبھی انہیں دیکھا اور نہ تمہارے کانوں نے کبھی انہیں سنا۔ ایک مومن فرد اور ایک مومن جماعت کو بعض دفعہ دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابیوں سے بھی نوازا جاتا ہے۔ لیکن ایک مومن کے لیے حقیقی خوشی اور بشارت جنت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی بشارت ہے۔ یہی وہ بشارتیں تھیں جس پر اہل ایمان ہمیشہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اور آج بھی جو لوگ جان وتن کی آزمائش سے کامیابی سے گزرتے ہیں ان کے سامنے بھی جنت کی نعمتوں اور اللہ کی خوشنودی کے حصول کے سوا کوئی اور ہدف نہیں ہوتا۔ یہی ایک مومن کی اصل معراج تھی۔ افسوس یہ ہے کہ آج ہمارے نیک لوگ بھی اس حقیقی ہدف سے دور ہوتے گئے ہیں۔

پیغمبروں کا دوسرا کام انذار ہے۔ یعنی وہ دنیا کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر تم اللہ اور رسول کی دعوت پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر دردناک عذاب جہنم سے واسطہ پڑے گا۔ اللہ کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ جس کا غضب ساری کائنات کو ایک آن میں بھسم کر سکتا ہے۔ اور کوئی بڑی بات نہیں کہ تم دنیا میں ہی اس کے غضب کے مستحق ہو کر عذاب کا شکار ہو جاؤ۔ کتنی قومیں اللہ کے غضب کا شکار ہوئیں اور دنیا سے نیست و نابود کر دی گئیں۔ اور قیامت کے دن تمہیں جب اس کے غضب اور ناراضگی سے واسطہ پڑے گا تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم کتنی بڑی غلطی کر چکے ہو۔ چنانچہ اللہ کی بے پناہ عظمت اور اس کی ناراضگی کا ہولناک نتیجہ جیسے جیسے انسانوں کے دل و دماغ میں اترتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ سے ان کا تعلق مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ وہ برے عمل سے بچتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ برے عمل کے نتیجے میں اللہ کی ناراضگی پیدا ہوتی ہے اور ہر نیک عمل کی طرف لپکتے ہیں کیونکہ خوب سمجھتے ہیں کہ اسی کے نتیجے میں وہ حقیقی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے جس کا تصور بھی دنیا میں ایک مومن کے لیے سب سے بڑی متاع ہے۔ ہم صحابہ کرامؓ اور بعض مجاہدین کے جہاد و حرب کے واقعات پڑھتے ہیں کہ شدید بھوک میں انہیں کھانے کے لیے چند کھجوریں ملیں۔ کھجوریں کھاتے ہوئے دیکھا کہ سامنے معرکہ کارزار برپا ہے تو خیال ہوا کہ اگر اس معرکے میں میں کام آ گیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ مجھے جنت عطا فرمائیں گے۔ جنت کی نعمتوں کا تصور کر کے اس نے کھجوریں اٹھا کر پھینک دیں اور کہا "یہ کھجوروں کا ختم کرنا لمبی مدت ہے۔ کون اتنی مدت تک جنت سے دور رہے۔" چنانچہ یہ کہہ کر لڑتی ہوئی تلواروں میں جا گھسے' داد شجاعت دیتے ہوئے جان اللہ کے حوالے کر دی اور جنت میں جا پہنچے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں ایک شخص کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ شدید بھوکا ہونے کی وجہ سے اسے تھوڑے سے چاول اور دال دستیاب ہوئی تو اس نے ہنڈیا کا چولہا بنا کر اس پر کھچڑی پکانا شروع کر دی۔ اور لکڑی لے کر اس کو ہلانے لگا اور سامنے پہاڑی کی طرف دیکھا کہ دشمن کی فوج بڑھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اپنے آپ کو خطاب کر کے کہنے لگا "دیکھو سامنے جنت سے حوریں اشارہ کر رہی ہیں کہ جلدی پہنچو ہم تمہاری منتظر ہیں۔" "اب اگر میں کھچڑی پکانے اور کھانے میں وقت ضائع کروں گا تو جنت میں پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ بھوکا رہنا منظور ہے لیکن یہ تاخیر گوارا نہیں۔" چنانچہ لڑتے ہوئے جان دے دی اور اپنی منزل پر جا پہنچا۔ اللہ کے نبیوں کی دعوت ان دو بنیادوں پر اٹھائی جاتی ہے۔ لیکن ہماری دینی تنظیموں اور ہمارے مبلغین نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دنیوی اسلامی برکات کے مضمون کو اس کثرت سے بیان کرنا شروع کیا کہ دنیوی برکات مقصد ہو کر رہ گئیں اور جنت کا جاں فزا اور روح پرور تصور پس پشت چلا گیا۔

Marfat.com

اس کے بعد آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ان نبیوں پر کتابیں اتاریں اوران کی دینی ضرورت کے مطابق وہ تمام حقائق ان پر کھولے جن میں وہ اب تک اختلاف کر رہے تھے اور صراطِ مستقیم کی ایک ایک ضرورت اور نزاکت کو واضح کیا۔ جن کو کھو دینے کے باعث انسان گمراہی کے راستے پر پڑ گئے تھے۔ انہوں نے عقائد' احکام اور معاملات میں اپنی طرف سے اختلاف کے جو راستے نکالے ہیں ان کی حقیقت ان پر واضح فرمائی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اختلاف کرنے والے اس راہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنے اختلافات سے تائب ہو جاتے اور انبیاءِ کرام کی دینی راہنمائی کو قبول کر کے صراطِ مستقیم پر چل نکلتے انہوں نے یکسر اس ہدایت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انبیاءِ کرام نے اپنی دعوت کی ایک ایک بات اور کتابوں کے بیان کردہ ایک ایک حکم پر دلائل فراہم کیے۔ ان کے تمام اشتباہات کو ایک ایک کر کے ختم کرنے کی کوشش کی اور ان کے ایمان کی پختگی یا ایمان کی آسانی کے لیے معجزات بھی دکھائے۔ لیکن جن مخالفین کو ایمان نہ لانا تھا وہ کسی طرح بھی اپنی جگہ سے ہلنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اور یہ بات انسانی زندگی کے قرونِ اولیٰ ہی کی نہیں' بلکہ ہر دور کی کہانی ہے۔ کیونکہ انسانوں نے ہدایت و ضلالت کا جتنا سفر بھی کیا ہے اس میں ہر جگہ یہی حقیقت کارفرما دکھائی دیتی ہے کہ انسانوں کا بگاڑ جب حد سے بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بھیجے۔ انہوں نے اپنی دلآویز شخصیت' بے عیب کردار' دل میں اتر جانے والے دلائل اور گنگ کر دینے والے معجزات سے اپنی دعوت کو مؤثر بنایا۔ لیکن ان تمام بے پناہ مساعی کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کو راہِ راست پر نہ لایا جا سکا۔ تاریخ مذاہب کا طالب علم اس صورت حال کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ آخر یہ راز کیا ہے؟ کسی بات کو سمجھنے اور ماننے کے لیے علمی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایسے حقائق کو تسلیم کرنے کے لیے جو حواس اور عقل سے ماوراء ہوں ایک ایسے مخبر' راہنما اور ہادی کی ضرورت ہوتی ہے جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور جس کی سیرت و کردار میں کوئی جھول نہ ہو۔ لیکن جب یہ تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں تو اسے مان کر نہ دینا یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب سمجھ نہیں آتا۔

انسانی گمراہی کا اصل سبب بَغْيًا ' بَيْنَهُمْ

یہاں پروردگار نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا بَغْيًا ' بَيْنَهُمْ ''آپس کی ضد کی وجہ سے'' یعنی ان کا ایمان نہ لانا کسی دلیل کی کمزوری یا دعوت کی نارسائی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا کہ یہ لوگ جس گروہی انانیت اور عصبیت میں مبتلا تھے اور جس تفاخر کے مرض کا شکار تھے وہ انہیں پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے نہیں دیتا تھا۔ ابوجہل نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں کہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا' لیکن مشکل یہ ہے کہ بنی ہاشم بھی ہماری طرح ایک قبیلہ ہے۔ ہم نے ہمیشہ ان سے برابری کے لیے بڑھ چڑھ کر کارنامے سرانجام دیئے۔ انہوں نے شجاعت کی داستانیں رقم کیں تو ہم نے بھی کیں۔ انہوں نے سخاوتیں کیں تو ہم نے بھی کیں' انہوں نے حاجیوں کی خدمت کی تو ہم نے بھی کی' انہوں نے بیت اللہ کے حقوق ادا کیے تو ہم نے بھی کیے۔ اب جب کہ ہم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے ہیں تو وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ ہمارے خاندان میں نبوت آ گئی ہے۔ اب اگر ہم ان کے نبی کو تسلیم کر لیں تو یہ ایک ایسا اعزاز اور امتیاز ہے جس میں ہم ان کے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم خاندانی طور پر ان کی برابری کرنے سے محروم ہو گئے اور یہ بات میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

بنی اسرائیل باوجود اس کے کہ حامل کتاب تھے' صدیوں تک ان میں نبیوں کی تشریف آوری جاری رہی' ان میں بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ بااین ہمہ یہ واحد گروہ ہے جنہوں نے من حیث القوم اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ ہم مفروضوں پر بات نہیں کرتے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ "ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو بغض اور حسد ہے وہ انہیں اسلام قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو میرے والد اور میرے چچا آپ سے ملنے کے لیے گئے۔ دن بھر وہاں رہے' آپ کو خوب جانچا پرکھا' شام کو گھر پہنچے تو تخلیہ ہوتے ہی میرے چچا نے والد سے پوچھا کہ "بھائی آپ کا اس نبوت کے دعویدار کے بارے میں کیا خیال ہے؟" والد نے کہا "یہ یقیناً اللہ کے وہی نبی ہیں جس کا ذکر ہماری کتابوں میں کیا گیا ہے۔" چچا نے پوچھا "پھر اب کیا ارادہ ہے؟" حضرت صفیہ فرماتی ہیں کہ میرے والد نے کہا "جب تک جان میں جان ہے میں اس کی بات نہیں چلنے دوں گا اور ہر طرح سے اس کی مخالفت کروں گا۔" ان واقعات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ گروہی انانیت اور عصبیت اس قدر بڑی بلا ہے کہ جو قوم اس کا شکار ہو جاتی ہے اس کے لیے بڑی سے بڑی حقیقت کو بھی تسلیم کرنا آسان نہیں رہتا۔ قرآنِ کریم نے ہر دور کی ہر قوم کے حوالے سے یہ ایک مستقل حقیقت بیان کی ہے جس نے لوگوں کو ہمیشہ حق کو قبول کرنے سے محروم رکھا۔ آج بھی مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اور اس کا سلسلہ آج شروع نہیں ہوا بلکہ اسلام کی آمد سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ البتہ صلیبی جنگوں نے اس میں تیزی پیدا کر دی۔ اسلام کی ظاہری' معنوی اور روحانی قوت نے ہمیشہ یہود و نصاریٰ کو اسلام دشمنی میں پوری طرح غالب نہیں آنے دیا۔ لیکن جہاں تک ان کے اندر کے مرض کا تعلق ہے وہ ہر دور میں یکساں رہا۔ ساری دنیا نے اسلام کی برکات سے فائدہ اٹھایا لیکن یہود بالخصوص اور نصاریٰ بالعموم اپنی گروہی انانیت اور قومی عصبیت کا بری طرح شکار رہے اور مزید رنگ و نسل کے تفاوت نے انہیں ناقابلِ شفا مریض بنا دیا۔ آج امریکہ اور پورا یورپ جس طرح پوری قوت سے مسلمانوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے اس میں حقیقی اسباب کا تو نام و نشان موجود نہیں۔ مصنوعی اسباب پیدا کیے جاتے ہیں' پھر ان کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں کو نشانے پر رکھ لیا جاتا ہے۔ اقبال مرحوم نے چونکہ اہل کتاب کو یورپ کے اندر رہ کر بڑی گہری نظر سے دیکھا اور ان کے فلسفے اور ان کی تہذیب کی بنیادوں کو سمجھنے کی کوشش کی اس کی رائے اس معاملہ میں ممکن ہے انتہا پسندی کہا جائے لیکن میرا ناقص خیال یہ ہے کہ خلاف واقعہ ہرگز نہیں۔ اس نے کہا تھا۔

کرے قبول اگر دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

مسلمانوں کو اپنی حیثیت کے ادراک کی ہدایت

آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ پہلی امتوں کی تاریخ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اب تاریخ کا رشتہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اہل کتاب چاہے کیسی ہی نسلی اور مذہبی برتری کا شکار رہیں ہم نے انہیں ہدایت کے سرچشمے سے بالکل محروم کر دیا ہے اور اب مسلمانوں کو ان تمام حقائق کی ہدایت سے بہرہ ور فرمایا ہے جس میں دنیا ہمیشہ اختلاف کرتی رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور قرآنِ حکیم کے نزول سے وہ آخری ہدایت اور آخری شریعت مسلمانوں کے سپرد کی جا رہی ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے منارۂ نور بنی رہے گی۔ اب نیا نبی اور نئی

Marfat.com

کتاب تو کوئی نہیں آئے گی۔ لیکن ہدایت کی تمام ضرورتیں قیامت تک اسی کتاب سے پوری ہوں گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہر دور کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنی خصوصی حیثیت کو سمجھ کر اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے کہ انہوں نے اگر پہلی امتوں کی طرح اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی تو نہ صرف یہ کہ وہ خود ہدایت سے محروم رہ جائیں گے بلکہ پوری نوع انسانی کی ہدایت کی جو عظیم ذمہ داری ان پر ڈالی گئی ہے اس کے ادا نہ کرنے کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔ البتہ ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ پوری دنیا کو ہدایت دینا اور ان کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنا اور اس کے لیے ان کے سامنے دعوت پیش کرنا یہ کوئی آسان کام نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک مکہ میں یہ کام کیا تو کوئی ایسی اذیت اور تکلیف ایسی نہیں جس کا ہدف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور مسلمانوں کو نہ بنایا گیا ہو۔ پھر اسی ذمہ داری کے ساتھ جب ہجرت کر کے آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مدینے کی سرزمین ایک بھٹی کی طرح سلگ اٹھی۔ وہاں کے اہلِ کتاب اور منافقین نے ہمیشہ آپ کو پریشان رکھا۔ اور مکے والوں نے بیسیوں جنگوں میں آپ کو آنے پر مجبور کیا۔ اسلامی دعوت کی تاریخ کے یہ وہ لازمی ابواب اور وہ ناگزیر سنتیں ہیں جن سے ہر دور میں مسلمان گزرتے رہے ہیں اور جب بھی دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے گا تو انہی جاں گسل مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو واضح ہدایات دی جارہی ہیں۔

آیت کریمہ کے آخر میں باذنہ کا لفظ اور بعد کا جملہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں روئے سخن شاید اہل کتاب کی طرف ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس نبوت کی دعوت دے رہے ہیں اور جس کتاب کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں یہ آپ کی ذاتی پسند نہیں اور نہ آپؐ اس کے موجد اور مصنف ہیں اور نہ یہ ذمہ داری آپؐ نے خود سے اختیار کی ہے۔ بلکہ اس ذمہ داری کے پیچھے اللہ کا حکم، اس کا اذن، اس کی توفیق اور اس کا اختیار کارفرما ہے۔ اس لیے اہل کتاب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کریں یا آپؐ پر تنقید کریں تو انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی مخالفت اور تنقید کا ہدف کون ہے؟ مزید فرمایا کہ اہل کتاب کو ساری ناراضگی یہ ہے کہ اللہ نے نبوت کی دولت آل اسماعیل کو کیوں عطا کی۔ یہ تو ہمارا نسلی اور نسبی حق تھا جو ہم سے چھین لیا گیا۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ نبوت اور ہدایت کا کلی اختیار باقی تمام اختیارات سمیت اللہ کے پاس ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اسے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ تمہیں آخر یہ اعتراض کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

(کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا۔ ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی؟ بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے) (۲۱۴)

Marfat.com

مسلمانوں کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی قربانی کی طالب ہے

مسلمانوں کو ایک عظیم منصب اور کٹھن ذمہ داری سپرد کرنے کے بعد یہ آگاہی دی جارہی ہے کہ تمہیں جس منصب پر فائز کیا جارہا ہے اس کی ذمہ داریاں آسانی سے ادا ہونے والی نہیں ہیں۔ اس میں تمہیں اپنی ذات کو بدلنا ہے' اپنے معاملات کی تطہیر کرنی ہے' جس معاشرے میں شب و روز رہتے ہو' اس کی اصلاح کا فرض انجام دینا ہے' جس قوم کے تم فرد ہو اس سے کہیں کٹنا ہے اور کہیں جڑنا ہے' اندھیرے تمہارے راستوں میں قدم قدم پر حائل ہوں گے لیکن تمہیں مشعل حق کو نہ صرف کہ بجھنے نہیں دینا بلکہ اس کی لو کو مدھم بھی نہیں ہونے دینا۔ حق سے وابستگی تمہیں اہل زمانہ سے بالکل الگ کردے گی' تمہیں اپنا ایک الگ گروہ اور برادری بنا کر رہنا ہے جس کی بنیاد صرف اللہ اور اس کے رسول کا تعلق ہے۔ ممکن ہے یہ کشمکش اس حد تک بڑھے کہ جان وتن کی قربانی کا سوال پیش آجائے اس میں اپنے آپ کو کٹوانا بھی ہے اور اپنے قریبی غیر مسلم عزیزوں کی گردنوں پر چھری چلانی بھی ہے۔ ایک ایسی زندگی ہے کہ اس میں قدم قدم پر ایثار اور قربانی کے تقاضوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہی قربانیاں ہیں جو ایک دن کامیابی کی مہک دیں گی۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ برگ و بار پیدا ہوں گے جس سے روحانیت کی بہار آئے گی۔ اور یہی وہ دنیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر آخرت کی نعمتیں میسر آئیں گی۔ ان تمام باتوں کا احساس انسان کو وہ حوصلہ اور توانائی عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ اس کٹھن وادی کا مسافر اور اس قافلۂ حق کا ہمراہی بنتا ہے۔ اور پھر اپنی جانفروشی اور جانثاری سے آگے بڑھتا ہوا کامیابی سے تمام مراحل سر کرتا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں کو پس منظر میں رکھتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جو پہلے لوگوں پر گزرتے تھے۔ یعنی جنت تمہاری منزل ہونی چاہیے۔ لیکن وہ منزل اتنی سستی نہیں کہ جو محض ایمان لانے اور خواہش کرنے سے مل جائے۔ اس کے لیے تمہیں ان تمام مراحل سے گزرنا ہوگا جس کا تذکرہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور یہ اللہ کی ایسی لازمی سنت ہے کہ جب بھی کوئی اللہ کا رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوا ہے اس رسول پر اور اس پر ایمان لانے والوں پر وہ قیامتیں گزری ہیں جو تاریخ مذاہب میں آج بھی جلی عنوانوں سے لکھی جاتی ہیں۔ نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے صدیوں تک ستائے گئے' ابراہیم علیہ السلام کیسے کیسے جانگسل مراحل سے گزرے۔ گھر چھوٹا' وطن بدر کیے گئے' مختلف ملکوں کی خاک چھانی' نہ جانے اس شب و روز کے سفر میں جان وتن پر کیا گزری' جب اپنوں نے برداشت نہ کیا تو غیروں نے کیا برداشت کیا ہوگا۔ اللہ نے بڑھاپے میں اولاد دی تو ایک وقت آیا جب کہ ماں بیٹے دونوں کو وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑ آنے کا حکم ہوا۔ ایک دلِ درد مند رکھنے والے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا آزمائش ہوسکتی ہے۔ لیکن چند ہی سالوں بعد اسی اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگ لی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام پر کیا کیا مصیبتیں نہ گذریں۔ نبوت سے پہلے بھی غریب الوطنی کی آزمائش میں ڈالے گئے اور نبوت کے بعد ایک ایسے دشمن خدا سے واسطہ پڑا جسے اپنے تخت و تاج' ملک کی وسعتوں اور بے شمار فوجوں کی قوت پہ ناز تھا۔ اس نے کس کس طرح آپ کے حوصلوں اور آپ کے عزائم کا قدم قدم پر امتحان لیا۔ پھر صحرائے سینا میں خود ایک ایسی قوم کی تربیت کے ذمہ دار بنائے گئے جن کے اندر غلامی کی طویل رات نے کوئی خوبی باقی نہ رہنے دی تھی۔ چالیس سال تک اسی صحرا میں مختلف صعوبتوں کا سامنا کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حق کے راستے میں قربانیوں کا یہ سفر اس قدر طویل ہے کہ جسے تاریخ بھی پوری طرح محفوظ نہیں رکھ سکی۔ کتنے ایسے انبیاء گذرے ہیں جنہیں زندہ دیواروں میں چن دیا گیا' اندھے کنوؤں میں لٹکا دیا گیا' بھوک کی اذیت میں مبتلا کیے گئے پہاڑوں کی غاروں میں چھپ کر جان بچانی پڑی۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے مقدس پیغمبر کا سر کاٹ کر بادشاہِ وقت نے محبوبہ کے سامنے پیش کیا'

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس قدر سازشوں میں مبتلا کیے گئے حتیٰ کہ یہود نے اپنے طور پر انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ یہ تو تاریخ کے وہ ابواب ہیں جن سے دنیا واقف ہے۔ اس کے علاوہ اس داستان کے کتنے گوشے ہیں جو وقت کی گرد میں ڈوب گئے۔ لیکن ان سے پھوٹنے والی روشنی ہمیشہ دنیا کو منور کرتی رہے گی۔ اس پوری تاریخ کو سمیٹ کر مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم جس عظیم کام کے لیے اٹھے ہو تمہارے سامنے یہ پوری تاریخ رہنی چاہیے تا کہ جب تم ان مراحل میں مبتلا کیے جاؤ تو تمہارے عزائم میں کمزوری نہ آنے پائے۔ اس کی بہترین وضاحت حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ہوگی کہ ایک روز حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو بے پناہ اذیتوں سے گذارا گیا' جلتے کوئلوں پر لٹایا گیا' گلیوں میں گھسیٹا گیا' تشدد کی انتہا کر دی گئی' جب جان چھوٹی تو آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتے ہوئے مسجد حرام میں پہنچے۔ دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحن کعبہ میں موجود ہیں۔ سلام کہہ کر بیٹھے تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ ایک بچہ جس طرح شدید تکلیف میں اپنے ماں باپ سے شکایت کرتا ہے آپؓ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ سرکار! مصیبتوں کی انتہا ہو گئی' اب تو برداشت جواب دیتی جا رہی ہے' آپ ان بدبختوں کے لیے بددعا کیوں نہیں فرماتے کہ اللہ ان پر اپنا عذاب نازل فرمائے۔ یہ بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے تمتمانے لگا' آپؐ نے فرمایا ''خباب! تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں جنہیں اسلام لانے کی پاداش میں تم سے زیادہ اذیتیں پہنچائی گئیں۔ لوہے کی کنگھیوں سے ان کی ہڈیوں سے ماس نوچ ڈالا گیا لیکن انہوں نے شکایت نہ کی۔ خباب تم جلدی کر رہے ہو۔ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ صورتِ حال تبدیل فرما دیں گے' اسلام کو عمومی غلبہ ملے گا۔ آج جب کہ تمہیں ایک وقت کھانے کو ملتا ہے تو دو وقت فاقہ کرتے ہو۔ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب کہ مسلمان زکوٰۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر زکوٰۃ لینے والوں کو تلاش کریں گے۔ لیکن انہیں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملے گا۔ ایک مسافر تنہا اونٹ پر ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرے گا لیکن راستے میں کوئی اسے میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کرے گا۔ لوگ سونا اچھالتے ہوئے نکل جائیں گے لیکن کوئی ان سے چھیننے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اللہ کی حاکمیت پورے جزیرۂ عرب پر غالب آ جائے گی۔ اور یہ پھل ہوگا تمہاری ان محنتوں اور قربانیوں کا جن سے آج تم گذر رہے ہو۔ استقامت سے اس راستے پر چلتے رہو اور اللہ سے شکایت کرنے میں جلدی نہ کرو۔ یہی بات اس آیت کریمہ میں فرمائی جا رہی ہے کہ اس راستے میں آنے والی مشکلات تو اس راستے کی سنتیں ہیں جس طرح زمین کا سینہ اگر نہ چیرا جائے تو زمین سے روئیدگی نہیں پھوٹتی اور درخت کی ٹہنیاں نہ کاٹی جائیں تو نئے شگوفے نہیں نکلتے۔ اسی طرح حق کی گواہی کے لیے جب تک خون نہ بہے' قربانیاں نہ دی جائیں اس وقت تک حق برگ و بار نہیں لاتا اور اللہ کی تائید و نصرت نازل نہیں ہوتی۔ رہی یہ بات کہ اس تائید و نصرت کے نازل ہونے کا وقت کونسا ہوتا ہے؟ اسے یوں تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن قرائن سے اسے کسی نہ کسی حد تک سمجھا ضرور جا سکتا ہے۔ اور اسباب کی دنیا میں اللہ کا جو قانون کارفرما ہے اسے دیکھتے ہوئے فی الجملہ ادراک بھی کیا جا سکتا ہے۔ دیگچی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیجیے پانی اس وقت تک نہیں ابلے گا جب تک مطلوب حرارت اسے نہیں پہنچے گی۔ ایثار و قربانی اور ایمان و اخلاص یہ وہ آگ ہے جس سے حق کی ہنڈیا ابلتی ہے۔ جب تک قافلۂ حق کے لوگ اپنی ایک ایک صلاحیت اس راستے میں نچوڑ نہیں دیتے اللہ کی تائید و نصرت نہیں آتی۔ حدیبیہ کے موقع پر جب پانی ختم ہو گیا' لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی' آپؐ نے اس انصاری کو مشکیزہ لانے کے لیے کہا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی رکھا جاتا تھا۔ آپؐ نے ایک پیالہ منگوا کر اس میں اپنا دست مبارک رکھا اور فرمایا یہ مشکیزہ اس پر الٹ دو۔ اس میں پانی کے چند قطرے جو باقی رہ گئے تھے جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر ٹپکے تو آپ کی پانچوں انگلیوں سے پانچ فوارے پھوٹے۔ لوگوں نے اپنی ضرورت کے لیے پانی بھرنا

Marfat.com

شروع کیا۔ ڈیڑھ ہزار آدمی نے پیا' جانوروں کو پلایا' مشکیزے بھرے' لیکن جب تک آپؐ نے اپنا ہاتھ پیالے سے نہیں اٹھایا' پیالہ پانی سے ابلتا رہا۔ یہ آپؐ کے ہاتھ سے فواروں کا پھوٹنا اور پانی کا پھیل جانا آپ کی دعا کا ثمر اور اللہ کی تائید ونصرت تھا۔ لیکن اس کے لیے مشکیزے سے پانی کے آخری قطرے بھی نچوڑ لینا یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جب تک تم اپنے جسم وجان کے آخری قطرے بھی اللہ کے راستے میں نہیں نچوڑ و گے اس وقت تک اللہ کی تائید نہیں آئے گی۔ اور جب ایسا کرو گے تو پھر تائید آنے میں ہرگز دیر نہیں ہوگی۔

بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ میں متذکرہ بالا حقیقت کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ مخالفین کی جانب سے اس قدر اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں اور اس قدر زندگی دشوار کردی جاتی ہے کہ جب وہ پوری طرح ناقابل برداشت ہوجاتی ہے تو رسول اور ان پر ایمان لانے والے بھی پکار اٹھتے ہیں کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ اس سے ایک تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جو لوگ معمولی محنت' معمولی قربانی اور ایثار کرنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی انقلاب آ جانا چاہئے انہیں اللہ کی اس سنت پر غور کرنا چاہئے کہ اسلامی انقلاب کا برپا ہونا سراسر اللہ کی تائید ونصرت پر منحصر ہے۔ مسلمانوں کے کسی گروہ میں ازخود یہ طاقت کبھی نہیں ہوسکتی کہ اپنی مرضی سے اتنا بڑا کارنامہ انجام دے دے۔ اور اس کی تائید ونصرت اس وقت تک نہیں آتی جب تک مسلمان اسباب کی حد تک بے بسی کا شکار نہیں ہوجاتے۔ اور سب کچھ اس راستے میں جھونک نہیں دیتے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ سے ایک طرح سے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کی جانب سے اللہ پر اعتماد میں کمزوری کا اظہار ہے۔ حالانکہ معمولی غور وفکر سے بھی کام لیا جائے تو عقل اس بات کی تائید نہیں کرتی۔ ایک بچے کو شدید بھوک لگی ہو وہ بار بار اپنی امی کو پکارتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے مجھے کھانا دیا جائے۔ لیکن جب اس کی یہ بھوک ناقابل برداشت ہونے لگتی ہے تو وہ اپنی امی کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس نہیں جاتا۔ البتہ اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ پہلے وہ زبان سے کہتا تھا اب وہ اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ پہلے وہ عام انداز میں کہتا تھا اب وہ چیخنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی چیخ میں بھی احتجاج نہیں بلکہ ایک اعتماد ہے کہ امی آپ کا گھٹنا چھوڑ کر میں اور کہاں جاؤں تو آپ کی طرف سے عطا کرنے میں تاخیر کیوں ہورہی ہے؟ آپ دیں یا نہ دیں مجھے بہرصورت آپ ہی سے مانگنا ہے۔

قسم آستاں کی نہ اٹھیں گے ہرگز
یہیں دن چڑھے گا یہیں رات ہو گی

یہی کیفیت قافلۂ حق کے سالار اور قافلۂ حق کے شرکاء کی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے مسائل بڑھتے جاتے ہیں' ویسے ویسے ان کی دعاؤں میں تیزی آتی جاتی ہے۔ ان کی عبادت میں کثرت پیدا ہوجاتی ہے' آنکھوں سے برکھا پہلے سے زیادہ برستی ہے' دل پہلے سے زیادہ پگھلنے لگتے ہیں' پھر جب وہ بے ساختہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ کہتے ہیں تو ادھر سے جواب آتا ہے اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ''بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔'' اس کے بعد کفر کے قلعے سرنگوں ہوجاتے ہیں اور قافلۂ حق کے بے خانماں' بے سروسامان' بے بس اور بے کس لوگ وقت کی قوت کی علامت بن جاتے ہیں۔

Marfat.com

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

(وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اسے جاننے والے ہیں) (۲۱۵)

انفاق کے سلسلہ میں سوال کا جواب

آیاتِ بالا میں جو کچھ آپ نے پڑھا وہ حج کے مضمون سے بطورِ التفات کے پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اس کی مناسبت سے منافقین کی طرف روئے سخن پھر گیا۔ پھر منافقین پر ضروری حد تک تنقید کی گئی اور بعض معاملات میں ان کو تنبیہ بھی کی گئی۔ اور مسلمانوں کو بھی ایک برمحل تذکیر کر دی گئی۔ اب پھر اسی سلسلہ بیان کو دوبارہ لیا جا رہا ہے جس کا تعلق حج اور جہاد و انفاق سے ہے۔ اور اس سلسلے میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ہیں' ان کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلا سوال انفاق کے بارے میں ہے۔ کیونکہ حج کے سلسلے میں بنیادی سوال بیت اللہ کا کفار سے آزاد کرانا تھا۔ اور یہ آزادی محض اپیلوں یا مذاکرات سے تو ممکن نہ تھی۔ اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ جس طرح انہوں نے جبر و طاقت سے اللہ کے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے' حالانکہ گذشتہ دو اڑھائی ہزار سال سے کبھی ایسا نہیں ہوا تو اس قبضہ کو ختم کرنے کے لیے طاقت کا جواب طاقت سے دینا ضروری تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس جہاد پر ابھارا گیا کہ تمہارا مرکز بیت اللہ ہے' وہی تمہارا قبلہ ہے' اسی گھر میں تمہاری امت کے تشکیل دیے جانے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں کیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی اسی گھر کے حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے مانگی۔ اب وہی مرکز اور وہی قبلہ کفار کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس امت کو اس گھر کی پاسبانی کے لیے اٹھایا گیا اور جس امت نے اسے مرکز بنا کر پوری دنیا کی ہدایت کا سامان کرنا ہے' اسے اس گھر کے طواف کرنے' حتیٰ کہ اس کے قریب تک پھٹکنے کی اجازت نہیں۔ یہ اتنا بڑا ظلم ہے' جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اس ظلم کے ہاتھ کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اس قوت کا سامان کریں اور اپنے اندر ایک ایسی مضبوط شیرازہ بندی کریں جس کے نتیجے میں اللہ کے گھر کو کفر کے ہاتھوں سے آزاد کرایا جا سکے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جس طرح کسی ظلم کے مقابلے اور اس کے خاتمے کے لیے قوت درکار ہے' جس کی علامت جہاد اور قتال ہے۔ اسی طرح اس جہاد کو عملی جامہ پہنانے اور اس کے وسائل فراہم کرنے کے لیے انفاق بھی ضروری ہے۔ کوئی جماعت چاہے کیسی ہی مقدس کیوں نہ ہو' وہ اپنے اندر جہاد و قتال کا کیسا بھی بے پناہ جذبہ کیوں نہ رکھتی ہو' یہ ممکن نہیں ہے کہ وسائلِ جنگ کے بغیر وہ اتنا بڑا اقدام کر ڈالے۔ آپ کو جنگ بدر کے لیے اچانک نکلنا پڑا' لیکن جو آپ کے بس میں تھا اس کی فراہمی میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ بعد کی جنگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ وقت سے پہلے تیاری کی' جنگ تبوک سب سے بڑی جنگ ہے جو قیصر سے لڑی جانے والی تھی۔ اس کے لیے آپ نے نفیرِ عام کا بھی حکم دیا لیکن ساتھ ہی ہر ایک کو اپنی ہمت کے مطابق انفاق کا پابند بنایا۔ لوگوں نے اپنے اثاثے تک دے ڈالے' مزدوروں نے اپنی مزدوریاں نچھاور کر دیں' ایک ایک مسلمان اگر ایک طرف جذبۂ شجاعت و حمیت سے بہرہ ور تھا تو دوسری طرف اس کے تمام مالی وسائل اسلام کے لیے وقف تھے۔ کہنا یہ ہے کہ جہاد اور انفاق میں

Marfat.com

لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اس لیے جہاں بھی اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم دیتے ہیں وہاں انفاق کی تاکید ضرور فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاد چونکہ مکہ معظمہ کی زندگی کے لیے نیا تھا اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی۔ اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف مثلاً والدین، اقربا، یتامیٰ اور مساکین وغیرہ کی طرف وہ توجہ نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ حالانکہ جس طرح جہاد فرض تھا اور ایک اہم ترین ضرورت بھی۔ اسی طرح جن لوگوں کی ذمہ داریاں مسلمانوں کے سپرد تھیں ان کی ادائیگی بھی از حد ضروری تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو اس بارے میں سوالات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ عمرو بن جموح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ما ننفق من اموالنا و این نضعھا "ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟" اور ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ سوال تنہا ابن جموح کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا۔ اس سوال کے دو اجزا ہیں۔ ایک یہ کہ اموال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں؟ اور دوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو اور کن لوگوں کو دیں؟ دوسرے سوال کا جواب نسبتاً تفصیل سے دیا گیا ہے اور پہلے سوال کا جواب اختصار سے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ "یعنی جو کچھ بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو اس کے مستحق ماں باپ اور رشتہ دار اور یتیم اور مسکین اور مسافر ہیں۔ یعنی انسانی معاشرے میں ان کی ضرورتیں بھی تمہاری توجہ کی مستحق ہیں۔ اگر تم انہیں نظر انداز کر دو گے تو کئی محرومیاں معاشرے کے بارے میں ان کے رویے کو متاثر کریں گی۔ اور ان میں مخلصین اسلام کے لیے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی ضرورتوں میں الجھ کر اس سے محروم ہو جائیں گے۔ بیت اللہ کی آزادی کے لیے جہاد کی تیاری کے سلسلے میں جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔ اس لیے اگر انسانی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے بعد تمہارے پاس کچھ بچتا ہے تو وہ تھوڑا ہو یا زیادہ یقیناً اللہ کے علم میں ہے۔ تم اگر اسے خرچ کرو گے تو یقیناً اس پر اجر و ثواب سے محروم نہیں رہو گے۔ بعض اہل علم نے اس کو اس طرح بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ تم ہم سے پوچھتے ہو کہ ہم کیا اور کتنا خرچ کریں۔ تمہارا جذبہ اپنی جگہ اللہ اس کی قدر کرنے والا ہے لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو کچھ بھی تم بیت المال کو دیتے ہو وہ لوٹ کر تمہارے اپنے ضرورتمندوں ہی کی طرف آ جاتا ہے۔ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا تھا کہ تُؤۡخَذُ مِنۡ اَغۡنِيَآئِهِمۡ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَآئِهِمۡ "ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے۔" یعنی اللہ کے راستے میں دینا صرف اپنی ہی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ آدمی خرچ کرتے ہوئے بعض دفعہ یہ بھی سوچتا ہے کہ مجھے اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ تو اس کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا جو بھلائی بھی کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔ جب وہ جانتا ہے تو اس پر اجر بھی دے گا۔ ایک کے بدلے میں دس گنا دینا تو اس کا عام معمول ہے۔ اور اگر اخلاص میں فراوانی ہو تو پھر سات سو گنا سے لے کر بے حد و بے شمار حد تک صلہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں جس انفاق کا ذکر ہو رہا ہے یہ انفاق واجب یعنی زکوٰۃ وغیرہ نہیں بلکہ یہ صدقاتِ نافلہ ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ والدین کو نہیں دی جا سکتی اور یہاں سب سے پہلے والدین کا ذکر ہے۔ والدین کی ضرورتوں کو پورا کرنا اولاد کی سب سے پہلی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر وہ اس میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے جذبے کو شامل کر لیں تو ذمہ داری بھی ادا ہو جائے گی اور اجر و ثواب بھی ان کو پہنچ جائے گا۔

Marfat.com

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(تم پر جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لیے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے) (۲۱۶)

جہاد وقتال کا مفہوم

اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ انفاق اور جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں۔ پہلے انفاق کا ذکر فرمایا اب قتال کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ جہاد وقتال کا مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک اور حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے جس کا اس آیت کریمہ میں اظہار فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جنگ اور قتال انسانوں کے لیے کوئی خوشگوار معاملہ نہیں۔ کوئی بھی مہذب آدمی جنگ کو پسند نہیں کر سکتا۔ اور آج تو یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ جنگ مسائل کا حل نہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں جہاد وقتال کو فرض کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر لڑائیاں لڑیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کو لڑائی کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ نہ وہ کوئی حکومت قائم کر سکے اور نہ لوگوں کی کوئی بڑی تعداد ان پر ایمان لائی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ ان پر جہاد وقتال کو فرض نہ کرتا۔ یہاں اس حقیقت کو واشگاف فرمایا جا رہا ہے کہ انسان جنگ کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کریں' لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ جنگ انسانی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ انسانوں کا بھی عجیب معاملہ ہے کہ ان کے دانشور اور ان کا مہذب طبقہ ہمیشہ جنگ کی مخالفت کرتا رہا ہے' لیکن یہی وہ طبقہ ہے جو اپنے قومی تفوق اور نسلی برتری کی خاطر ہمیشہ انسانوں کو جنگوں میں جھونکتا رہا ہے۔ کوئی مذہبی لڑائی آج تک جنگ عظیم نہیں بنی۔ جبکہ نسلی اور قومی لڑائیاں ہماری قریبی تاریخ میں دو دفعہ جنگ عظیم کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ کسی صحیح مذہب نے کوئی سکندر پیدا نہیں کیا' چنگیز خان اور ہلاکو جہالت کی پیداوار ہیں۔ مذہب نے ابوبکر و عمر اور خالد بن ولید پیدا کیے ہیں' جنہوں نے جنگ کو تہذیب سکھائی اور لوگوں کی گردنوں کی بجائے دل فتح کیے' ان کے دکھوں کا علاج کیا' جو اپنے مذہب پر بھی قائم رہے' ان کے مذہب سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ اور اگر کبھی سیاسی مجبوری سے ان کے علاقوں کو چھوڑنا پڑا تو شہر کے شہر روتے ہوئے باہر نکل آئے کہ آپ پھر ہمیں ہمارے ہم مذہب درندوں کے سپرد کر کے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہاں قرآنِ کریم یہ آگاہی دے رہا ہے کہ جنگ ایک ناگوار چیز ہے لیکن تم اس بات کو نہیں جانتے کہ بعض ناگواریاں خوشیوں کا پیغام لاتی ہیں۔ اور بعض بظاہر بھلی باتیں کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اس لیے انسان کو اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے لیے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود طے کرے' کیونکہ اگر اسے یہ اختیار دیا جاتا تو وہ ایسی چیزوں کو اختیار کرتا جس میں اس کی خواہشاتِ نفس کی پیروی ہوتی' جس میں اس کے اپنے نفس کی دل پسند چیزیں ہوتیں' نفس پر شاق گذرنے والی ہر چیز کو وہ اپنے لیے مکروہ قرار دیتا۔ کسی بڑے آدمی نے ٹھیک کہا کہ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس پر عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے۔ اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے اس کی راہنمائی کی ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفع خود را از ضرر

اس آیت کریمہ میں قتال فرض کیا گیا ہے۔اس لیے اس سلسلے میں چند باتوں کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔قتال جہاد بالسیف کا دوسرا نام ہے۔اصل لفظ جہاد ہے جو اسلام کی ایک وسیع اصطلاح ہے۔جہاد کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کے کلمے کی سر بلندی' اس کے دین کی نشر و اشاعت' اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ' خلق خدا کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش' لوگوں کو جہالت سے نکالنے کی مساعی' غرضیکہ ہر خیر کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کرنے کو جہاد کہتے ہیں۔لیکن اگر مسلمانوں کے ملک پر حملہ ہو جائے تو مسلمان ملک کو اس لیے بچانا کہ مسلمانوں کی زندگیاں محفوظ رہ سکیں اور وہاں اللہ تعالیٰ کے دین کے غالب اور نافذ ہونے کے امکانات باقی رہیں' اسے قتال یا جہاد بالسیف کہا جاتا ہے۔اسی طرح اگر مسلمانوں کے کسی ملک پر حملہ ہو جائے اور وہ اپنے ملک کا دفاع کرنے پر پوری طرح قادر نہ ہوں تو ان کے ہمسایہ ملک پر بھی قتال فرض ہو جاتا ہے۔یعنی ان کے ہمسائے ملک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کو اتنا سپورٹ کرے جس سے وہ اپنے بیرونی حملہ آور کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں۔اور ان کا ملک ہر طرح سے خطرات سے محفوظ ہو جائے۔

یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ یہ قتال ہر شخص پر فرض نہیں ہوتا۔بلکہ عموماً یہ فرضِ کفایہ ہوتا ہے فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے تو باقی مسلمان اس ذمہ داری سے سبکدوش سمجھے جائیں گے۔ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترکِ فرض کے گنہگار ٹھہریں گے۔مسلمانوں کی اصل تقسیم یہ ہے کہ مسلمان یا مجاہد ہونا چاہئے یا مجاہدین کا سپورٹر ہونا چاہئے۔یعنی جو لوگ جہاد کے لیے جا رہے ہیں باقی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی ضروریات کا انتظام کریں اور پیچھے ان کے اہل و عیال کی ذمہ داریاں قبول کریں۔

جہاد کی دوسری قسم فرضِ عین ہے۔کہ اگر ایک ایسا وقت آ جائے کہ جب مسلمان وطن یا اسلام کو بچانے کے لیے ملک کے ہر صحت مند آدمی کی ضرورت محسوس کریں اور ملک کا امیر نفیر عام کر دے۔یعنی ہر ایک کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دے دے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے جنگ تبوک میں حکم دیا تھا۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "کہ نکلو اللہ کے راستے میں تم ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے" اور مزید فرمایا اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ "کہ اگر تم نہ نکلے جہاد کے لیے تو اللہ تمہیں عذاب الیم دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو بدل کے لے آئے گا۔" ایسی صورت میں ہر شخص پر جہاد میں شریک ہونا فرض عین ہو جاتا ہے۔جہاد جب فرضِ عین ہو جائے تو پھر اولاد کو ماں باپ کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں رہتی' لیکن اگر فرض کفایہ ہو اور لوگ اتنی تعداد میں جہاد میں شریک ہوں جس سے ضرورت پوری ہو رہی ہو تو ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں جانا گناہ ہے۔صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں۔آپؐ نے فرمایا پھر جاؤ ماں باپ کی خدمت کرو اور جہاد کا ثواب حاصل کرو۔

Marfat.com

يَسْـَٔلُوْنَكَ

عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ
مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ
يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ

Marfat.com

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

رکوع: ۲۷۔ (تم سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینہ میں لڑنا کیسا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے۔ اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے۔ یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ ایسا کرسکیں، اور پھر جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے (مرتد ہو جائے) اور پھر وہ حالت کفر میں ہی مر جائے تو ایسے لوگوں کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں دنیا اور آخرت میں یہی لوگ ہیں آگ والے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ بے شک جو لوگ ایمان پر جمے رہے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے ○ وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو دنیا و آخرت دونوں کے معاملے میں ○ اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کرلو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون اصلاح چاہنے والا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے ○ اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھی لگے۔ اور مشرکوں کو

Marfat.com

اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں اچھا لگے۔یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں) (۲۱۷ تا ۲۲۱)

یَسْـئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ کَبِیْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَکُفْرٌ ۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝

(تم سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینہ میں لڑنا کیسا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے۔اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے۔ یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ ایسا کر سکیں اور پھر جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے (مرتد ہو جائے) اور پھر وہ حالت کفر میں ہی مر جائے تو ایسے لوگوں کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں دنیا اور آخرت میں یہی لوگ ہیں آگ والے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (۲۱۷)

اشھرِ حرم سے متعلق سوال اور اس کا جواب

سلسلۂ کلام حج سے متعلق جاری ہے۔اسی کی نسبت سے جہاد اور انفاق کے مسائل کا ذکر آیا۔جہاد فرض کر دیا گیا اور انفاق کی ترغیب دی گئی۔ جہاد کے حوالے سے عربوں کے مسلمہ عقائد کی وجہ سے اشھر حرم کے بارے میں سوال پیدا ہوا۔مشرکینِ عرب اگرچہ ایک خود ساختہ شریعت پر عمل کر رہے تھے۔تاہم وہ ملت ابراہیمی کی پیروی کا دعویٰ ضرور کرتے تھے' لیکن ملت ابراہیمی کی روح اور اس کی حقیقت سے یکسر بیگانہ ہو چکے تھے۔حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفوں میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس محفوظ نہیں تھی۔البتہ کی حج کی فرضیت اور مناسکِ حج میں سے بیشتر کے بارے میں ان کا رویہ چاہے کیسا ہی ہو لیکن ان کا عمل اب تک صحیح تھا۔چار مہینوں کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں خاص احکام دیئے گئے تھے۔ان میں لڑنا بھڑنا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان کے احترام کی اس طرح ترغیب دی گئی تھی کہ عرب اپنی ساری گمراہیوں اور بد اعمالیوں کے باوجود ان مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دیتے تھے۔اور حتی الامکان ان کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیتے تھے۔قرآنِ کریم نے نہ صرف ان کے اس کے بنیادی عقیدے کی تصویب کی بلکہ اس میں

Marfat.com

یعنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شمس و ماہ کی تخلیق سے وقت وقت کو بارہ مہینوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ اور جن میں چار مہینوں کو خصوصی حرمت اور
تقدس بخشا گیا ان کا ذکر قرآن کریم میں ہے فرمایا گیا ہے اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۔۔۔ بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن اس نے زمین و آسمان کو
پیدا کیا ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں۔ جن میں جنگ و قتال کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اور یہ چار مہینے رجب' ذیقعد' ذی الحج اور محرم
ہیں۔ قرآن کریم کی اس تائید و تصویب کے بعد یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ ان چار مہینوں میں جہاد و قتال کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
البتہ سوال اٹھایا گیا کہ بیت اللہ چونکہ قریش مکہ کے قبضہ میں ہے مسلمان وہاں اگر عمرہ اور حج کے لیے جاتے ہیں اور قریشِ مکہ مزاحم ہوتے
ہیں تو اس وقت کیا ہو گا جب لڑتے لڑتے مسجد حرام کے قریب لڑائی چھڑ جائے۔ اور یہ بات تو جانی پہچانی ہے کہ حج کے مہینے بھی حرمت والے مہینوں
میں شامل ہیں اور عمرہ عام طور پر رجب میں کیا جاتا ہے جو چار حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔ عربوں کے عقیدے اور قرآن کریم کی
تصریح کے بعد اس میں جہاد کیا جائے گا؟ اگر یہ جہاد نہیں کیا جاتا تو کعبۃ اللہ کی آزادی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اور اگر جہاد کیا جاتا ہے تو اشہر حرم
کی حرمت کی پامالی کا اندیشہ ہے۔ اور حرم کے تقدس کے مجروح ہونے کا بھی امکان ہے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ تو وہ
سوال تھا جو خود مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اور گزشتہ بعض مواقع پر اسی سورہ میں اس کا جواب بھی دیا گیا۔ لیکن دو ہجری میں ایک
ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے یہ سوال ایک اعتراض کی شکل میں مشرکین کی جانب سے نہایت شدت سے اٹھایا گیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ دو ہجری
جمادی الثانی کی آخری تاریخوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحشؓ کی قیادت میں بارہ افراد پر مشتمل ایک مختصر سا دستہ حالات کی
تفتیش کے لیے روانہ فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ تم جا کر وادی نخلہ میں ٹھہرو جو مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان ہے۔ اور وہاں ٹھہر کر قریش کی نقل و
حرکات کا اندازہ لگاؤ۔ اور ہمیں اس سے باخبر رکھو۔ اچانک یہ ہوا کہ قریش کا ایک مختصر سا قافلۂ تجارت ان کے سامنے سے گذرا۔ مسلمان یہ سمجھے
کہ آج جمادی الثانی کی آخری تاریخ ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ رجب کا چاند طلوع ہو چکا تھا جو حرمت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے۔
لیکن مسلمانوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ مسلمانوں نے اسے جمادی الثانی کی آخری تاریخ سمجھ کر اس قافلۂ تجارت پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ یہ حملہ کرنا بھی
بجائے خود حدود سے تجاوز تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص غیر جانبداری سے ان
بارہ افراد (جو تمام کے تمام مہاجرین تھے) کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کے لیے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں
نے تیرہ سال تک کفار مکہ کے ظلم برداشت کیے اور ایک سے ایک بڑھ کر اذیت کا سامنا کیا۔ ان میں سے بیشتر اشراف قریش سے تعلق رکھنے
والے لوگ تھے۔ لیکن محض ایمان لانے کی پاداش میں ان کی تذلیل کی گئی' ان پر تشدد کیا گیا حتیٰ کہ ان کا گھر اور ان کا وطن ان سے چھین لیا گیا۔
اور اب ایک سال سے مدینہ طیبہ میں بھی انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا جا رہا۔ عقل یہ کہتی ہے کہ جیسے ہی ان کی نگاہ اس قافلۂ تجارت پر پڑی جن کا
تعلق قریش مکہ سے تھا۔ جن میں عبداللہ بن مغیرہ کے دو بیٹے عثمان اور نوفل اور عمرو بن حضرمی اور حکیم بن کیسان مولیٰ مغیرہ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی
مسلمانوں کے اپنے زخم سلگ اٹھے۔ اور برسوں کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ چنانچہ انہوں نے حملہ کیا عمرو بن حضرمی قتل اور عثمان اور حکیم کو گرفتار کر لیا
گیا۔ البتہ نوفل بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ دونوں قیدیوں اور سامانِ قافلہ کو لیے ہوئے مدینہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ بھی اس پر سخت ناراض

Marfat.com

ہوئے کہ تم نے لڑائی کی آگ بھڑکا دی ہے۔ جبکہ ابھی مسلمانوں کے حالات اس قابل نہ تھے کہ وہ قریش مکہ سے لڑائی چھیڑ سکتے۔ آپؐ نے قریشِ مکہ کو مقتول کی دیت ادا کرنے کی بھی پیش کش کی اور بعض روایات کے مطابق آپ نے دیت ادا بھی کر دی، دونوں قیدیوں کو آزاد کر دیا اور آپؐ نے اس قافلہ کے لوٹا ہوا مال بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود قریش مکہ اور ان کی حمایت میں مدینے کے یہود اور منافقین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر پراپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اور پورے عرب میں مسلمانوں کی کردار کشی شروع کر دی گئی کہ ان مسلمانوں کو دیکھو یہ اپنے آپ کو بڑا با اصول قرار دیتے ہیں، دوسروں پر کفر کا الزام رکھتے ہیں اور خود اللہ کے فرمانبردار بندے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بظاہر انہوں نے درویشی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور یہ اٹھتے بیٹھتے اخلاق کا درس دیتے رہتے ہیں، لیکن حال ان کا یہ ہے کہ وہ حرمت والے مہینے جن میں کبھی کوئی لڑنے کی جرأت نہیں کرتا یہ ان مہینوں میں بھی کسی کو قتل کرنے، کسی قافلے کا مال چھیننے اور کسی کو قیدی بنا لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ ان کا درویشی میں یہ حال ہے تو جب انہیں طاقت ملے گی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پھر یہ کتنے بڑے ظالم ثابت ہوں گے۔ پیش نظر آیتِ کریمہ میں ان کے انہی الزامات کا جواب دیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم اس جواب کی تفصیل عرض کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اشہر حرم کے بارے میں اسلام کا تصور کیا ہے؟

اشہرِ حرم سے متعلق اسلام کا موقف

ہمارے محترم مفسرین میں سے ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ اشہرِ حرم کے بارے میں جو حکم پہلی شریعتوں میں تھا وہی اب بھی باقی ہے۔ لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے۔ اب کسی مہینہ میں بھی قتال ممنوع نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ حکم منسوخ ہو چکا تو اس کا ناسخ کیا ہے؟ بعض اہلِ علم نے بعض آیتوں سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آیتیں اس معاملے میں صریح نہیں۔ بعض اہل علم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپؐ کے عمل سے استدلال کیا ہے اور اسے اس حکم کے لیے ناسخ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آپؐ نے طائف کا محاصرہ ذیقعد میں کیا تھا جو حرمت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے۔ اور حضرت عامر اشعریؓ کو اشہر حرم ہی میں اوطاس کے جہاد کے لیے بھیجا تھا۔ بعض اہلِ علم تو اس پر امت کا اجماع نقل کرتے ہیں۔ لیکن تفسیر مظہری کے مصنف اشہر حرم کے حکم کی تصریح آیت السیف سے ثابت کرتے ہیں جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس حکم کا ذکر فرما چکے ہیں۔ جبکہ آپ کا یہ خطبہ آپ کی وفات حسرت آیات سے صرف اسی روز پہلے کا ہے۔ رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرۂ طائف تو وہ ذیقعدہ میں نہیں شوال میں ہوا۔ اس لیے اسے ناسخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تفسیر مظہری کے مصنف کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت کا حکم اب تک علیٰ حالہ قائم ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق ان دونوں باتوں کے درمیان ہے کہ نہ تو یہ حکم بالکل منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی اسی طرح قائم ہے کہ کسی طرح کا جہاد بھی بالکل ممنوع ہو۔ پیش نظر آیتِ کریمہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان مہینوں میں قتال کرنا واقعی بہت بڑی برائی ہے۔ لیکن اگر قتال شرعی ضرورت بن جائے یا دشمن مسلمانوں پر حملہ کر دے اور مسلمانوں کو اپنی مدافعت کرنی پڑے تو پھر نہ صرف جائز ہے بلکہ ان مہینوں کی حرمت کی بقا اور ظالم کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے جہاد و قتال کرنا ان کی حرمت کی پاسداری سے کہیں بڑی نیکی ہے۔ رہے کفار مکہ اور یہود و منافقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات تو قرآنِ کریم نے ایک ایک کا

Marfat.com

جواب دیا ہے۔سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تم ایک سرحدی جھڑپ کا بہانہ بنا کر لوگوں کو یہ تاثر دیتے پھر رہے ہو کہ مسلمانوں نے ایک حرمت والے مہینے میں ایک شخص کا خون بہایا ہے اور اس طرح انہوں نے اللہ کے اس حکم کی نافرمانی کی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک حکم خداوندی سمجھا جاتا رہا ہے۔اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ واقعی اشہر حرم کی حرمت کی پامالی اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے' ہم بھی اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم جس طرح جور وجبر سے اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف آنے سے روکتے ہو' اس کی بندگی کا قلادہ گلے میں ڈالنے کی بجائے تم نے جس طرح خود بھی شیطان کی بندگی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے اور دوسروں کو بھی زبردستی یہ طوق پہنانے کی کوشش کرتے ہو' کیا یہ اللہ کی نافرمانی نہیں؟ یعنی ایک حکم کا ٹوٹنا تو اللہ کی نافرمانی ہے لیکن اس کے پورے دین کا انکار کرنا اور لوگوں کو اس طرف آنے سے روکنا اور خود کفر کے پشتیبان بن کر کھڑے ہو جانا' حتیٰ کہ وہ مسجد حرام جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی بندگی اور اس کی توحید کا مرکز بنایا تھا اور جہاں ہر آدمی کو آنے کی اجازت تھی اور گزشتہ دو ہزار سال میں وہاں کبھی کسی نے کسی کو روکنے کی جرأت نہیں کی' حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی مسجد حرام میں دیکھ لیتا تو وہ یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو کوئی نقصان پہنچائے یا اسے مسجد حرام سے نکال دے۔لیکن تم نے برسوں سے مسلمانوں کا داخلہ وہاں بند کر رکھا ہے۔جس پیغمبر کے آنے کی دعائیں اسی گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھیں اور جس امت کو اٹھائے جانے کی استدعا کی تھی تم نے اس گھر کو اسی پیغمبر اور اسی امت کے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے۔اور خود تم نے اس پر اس طرح غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے کہ تمہاری مرضی کے بغیر وہاں کوئی قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔تمہارے ظلم اور سنگدلی کا عالم یہ ہے کہ جو لوگ فی الحقیقت اس گھر کے مجاور' اس کے عبادت گزار اس کے آباد کرنے والے تھے' تم نے نہ صرف اس گھر میں ان کا آنا بند کیا بلکہ تم نے اس شہر سے انہیں نکال باہر کیا۔حالانکہ یہ شہر انہیں کے لیے آباد کیا گیا تھا۔وہی اس کان کا اصل نمک تھے' وہی اس قافلے کا ہراول تھے جنہوں نے یہاں سے ہدایت کا پیغام لے کر دنیائے انسانیت تک پھیلنا تھا۔یہ جرائم وہ ہیں شب و روز جن کا تم ارتکاب کر رہے ہو ان میں سے ایک ایک جرم اشہر حرم میں لڑنے سے کہیں بدتر ہے اور اللہ کے نزدیک اپنی شناعت اور اپنی بدانجامی کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے۔لیکن تمہارے جرائم کی انتہا یہیں تک نہیں ہوتی تم نے ظلم اور تعدی کی ایک ایسی داستان رقم کی ہے جس نے بڑھتے بڑھتے فتنہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

فتنہ کی حقیقت

فتنے سے مراد یہ ہے کہ جو آدمی بھی اللہ کے دین کی طرف آنا چاہتا اور اسلام قبول کر کے اپنی زندگی اور آخرت سنوارنا چاہتا ہے تم سنگدلانہ اذیتوں اور تکلیفوں کے ذریعے اسے اسلام قبول کرنے سے روکتے ہو' بلکہ تمہاری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کر چکا ہے تو اسے اس حد تک تکلیفیں پہنچائی جائیں' دہکتے انگاروں پر لٹایا جائے' تپتی ریت پر گھسیٹا جائے' پیاسا رکھ کر اسے دھونکنی دی جائے اور جب اس کی حالت غیر ہونے لگے تو اس کے سامنے ایک ہی مطالبہ رکھا جائے کہ اسلام سے تعلق توڑ لو اور اللہ اور اس کے رسول کا نام لینے سے بھی انکار کر دو۔

یہ وہ فتنہ اور آزمائش ہے جس میں تم نہ جانے کتنے نوجوانوں کو مبتلا کر چکے ہو اور یہ وہ بھٹی ہے نہ جانے کتنی جوانیاں اور کتنے بڑھاپے اس میں قربان ہو چکے ہیں یا کندن بن کر نکلے ہیں۔یہ وہ فتنہ ہے جو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔اور تم اس فتنے کا ارتکاب عین بلد امین اور بلد حرام میں کر

Marfat.com

رہے ہو۔ تمہیں نہ سرزمینِ حرام کا احترام اس سے روکتا ہے نہ اشہر حرم کی حرمت تمہارے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ تو وہ آخر کونسی حرمتیں ہیں جن کی پامالی کا تم شور مچا رہے ہو؟ تم تو سب سے بڑے حرمتوں کے پامال کرنے والے اور اللہ کی بندگی کے ایک ایک رشتے کو ادھیڑنے والے ہو۔ یوں تو ظلم کا یہ کاروبار اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مکے کے کس کس گھر میں ہو رہا تھا لیکن حالات کی ایک کروٹ نے کم از کم ایسے ستر نوجوانوں کو قریش کے ان جرائم کا گواہ بنا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھ ہجری میں عمرے کے ارادے سے عازم مکہ ہوئے۔ حدودِ حرم کے کنارے پر حدیبیہ کے مقام پر آپؐ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ لیکن قریش مکہ نے آپؐ کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اور دھمکی دی کہ اگر آپؐ نے آگے قدم بڑھایا تو ہم حدودِ حرم میں برہنہ تلواروں سے آپؐ کا استقبال کریں گے۔ چنانچہ جانبین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جو بالآخر ایک معاہدے پر منتج ہوئے۔ جو معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے معروف ہے۔ اس میں ایک شق یہ طے پائی جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور جو کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکہ بھاگ آئے تو مکے والے اسے واپس نہیں کریں گے۔ یہ بالکل یکطرفہ شرط تھی لیکن ازراہِ مصلحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی قبول فرما لیا۔ زبانی طور پر یہ شرائط طے ہو گئیں لیکن ابھی ضبطِ تحریر میں نہیں آئی تھیں کہ قریش کا وہ سفیر جو اس وقت قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کر رہا تھا، یعنی سہیل ابن عمرو اسی کے بیٹے جن کا نام ابوجندل تھا اپنی بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مسلمانوں میں آپہنچے۔ وہ زیریں مکہ سے نکل کر آئے تھے، انہوں نے یہاں پہنچ کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان ڈال دیا۔ سہیل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا کہ میں صلح کا معاملہ کرنے سے پہلے دیکھنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہمارے درمیان جو ایک شق طے پائی ہے آپ اس پر عمل کرتے ہوئے اس لڑکے کو واپس کرتے ہیں یا نہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی تو ہم نے نوشتہ مکمل نہیں کیا۔ سہیل نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر میں کسی بات پر آپ سے صلح کا معاملہ ہی نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چلو تم معاہدے کو چھوڑو تم میری خاطر اس لڑکے کو ہمارے ساتھ جانے دو۔ آپؐ کے بار بار کہنے کے باوجود بھی اس نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنے بیٹے کے چہرے پر چانٹا رسید کیا اور مشرکین کی طرف واپس کرنے کے لیے اس کے کرتے کا گلہ پکڑ کر گھسیٹا۔ ابوجندل نے مسلمانوں کو اپنے زخم دکھائے اور چیختے ہوئے کہا کہ کیا میں اب بھی مشرکین کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ مجھے میرے دین کے متعلق فتنے میں ڈالیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ابوجندل! صبر کرو اور اسے باعث ثواب سمجھو۔ اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ جو دوسرے کمزور مسلمان ہیں ان سب کے لیے کشادگی اور پناہ کی جگہ بنائے گا۔ ہم نے قریش سے صلح کر لی ہے اور ہم نے ان کو اور انہوں نے ہم کو اس پر اللہ کا عہد دے رکھا ہے اس لیے ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔'' اس ایک واقعے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں جس فتنہ کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کیسی سنگدلانہ اذیت تھی۔ نہ جانے کتنے گھروں میں کتنے افراد اس کا شکار تھے۔ ممکن ہے آپ اسے محض ایک انفرادی واقعہ سمجھیں، لیکن یہ ایک انفرادی واقعہ نہیں تھا۔ ایسے مظلوموں کی ایک بڑی تعداد مکے کے گلی کوچوں میں ظلم کی چکی میں پیسی جا رہی تھی۔ انہیں میں سے ایک شخص ابوبصیر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی دوسری مرتبہ واپس کرنا چاہا تو وہ مدینہ سے نکل کر ساحل سمندر پر آبیٹھا۔ ابوجندل کو پتہ چلا وہ بھی کسی طرح ابوبصیر سے آملے۔ اب ان مظلوموں میں سے جس کو بھی موقع ملتا وہ ان کے پاس آجاتا جہاں نہ کوئی رہنے کی جگہ تھی اور نہ زندگی کی ضروریات میسر تھیں۔ البتہ ایمان کی دولت تھی، اللہ کی بندگی کا عشق تھا جس میں وہ شب و روز بسر کر رہے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ستر آدمیوں کی ایک جماعت اکٹھی ہو گئی۔ فاقے آخر کب تک برداشت ہوتے۔ انہوں

Marfat.com

نے تنگ آ کر ملک شام آنے جانے والے قریشی قافلوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ اپنی ضرورت کے مطابق ان سے مال چھین لیتے۔ قریش نے تنگ آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا اور قرابت کا واسطہ دے کر یہ پیغام دیا کہ آپ انہیں اپنے پاس بلالیں۔ ہم اس شق کو واپس لیتے ہیں۔ اب جو بھی آپ کے پاس آنا چاہے ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ اس طرح سے یہ لوگ مدینہ آنے کا راستہ پاسکے اور اللہ نے اس فتنے سے ان کو نجات دی، جس فتنے کا یہاں ذکر فرمایا گیا۔

مشرکین کے آئندہ کے عزائم

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط یہاں فتنہ کی سنگینی اور اس کی وسعت کو بیان کیا جارہا ہے۔ کہ اب تک تو مشرکین مکہ نے ہر اس آدمی کو مشقِ ستم بنایا جس نے بھی ایمان لانے کی کوشش کی۔ اور مسلسل اس پر مشقِ ستم جاری رکھی اور پوری کوشش کی کہ اسے ہجرت کا موقع نہ دیا جائے۔ اب ان کا ارادہ یہ ہے کہ کسی طرح مدینہ میں مسلمانوں کے لیے جینا ناممکن بنادیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے لیے انہوں نے یہود کے ایک قبیلے کے سردار کعب بن اشرف سے روابط قائم کئے، عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین سے مراسلت جاری رکھی اور اسے دھمکی دی کہ وہ مسلمانوں کو مدینے سے نکال باہر کرے تاکہ ہم انہیں دوبارہ مظالم کا نشانہ بناسکیں اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو ہم مدینے پر حملہ کریں گے، مسلمانوں کے ساتھ جو کریں گے سو کریں گے، لیکن تمہارا بھی قتل عام کریں گے، تمہارے بچوں کو غلام بنائیں گے اور تمہارے عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔ اور پھر یہ معاملہ صرف دھمکیوں تک محدود نہ رہا بلکہ ان کے فوجی دستوں نے مدینے کے قرب وجوار میں حملے بھی شروع کردیئے۔ کرز بن جابر فہری باقاعدہ دوسو سپاہی لے کر مدینے کے اطراف میں حملہ آور ہوا۔ اس چراگاہ پر شبخون مارا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے جانور چرتے تھے۔ چرواہوں کو قتل کیا اور جتنے جانور ہاتھ آئے انہیں ہانک کرلے گیا۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ انہوں نے جو کچھ اب تک کیا اور جو کچھ وہ مکے کے مظلوموں کے ساتھ کررہے ہیں اسے کسی وقتی جوش کا نتیجہ مت سمجھیے یہ ان کے ان عزائم کا حصہ ہے جنہیں آگے بڑھانے میں وہ شب وروز مصروف ہیں۔ ان کا اصل ہدف یہ ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیردیں۔ اللہ نے تمہیں اسلام کی جس دولت سے نوازا ہے وہ دوبارہ ہر ممکن کوشش سے تمہیں اس سے محروم کرنے کی فکر میں ہیں۔ کفار کے ان عزائم کو جاننے اور ان کی ناقابل برداشت جسارتوں کو دیکھ لینے کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے شدید فتنے کے استیصال کے لیے اشہر حرم میں لڑنا گناہ ہے۔

مسلمانوں کو مناسب تنبیہ

وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ج ارتداد کا ذکر آنے کی وجہ سے مناسب سمجھا گیا کہ مسلمانوں کو تنبیہ کردی جائے کہ تم اگر ان کے مظالم سے مرعوب ہوکر خدانخواستہ کسی کمزوری کا شکار ہو گئے یا اپنی جان بچانے کی خاطر اللہ کے دین ہی کو چھوڑ بیٹھے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ایسے مشکل حالات میں دین کے تقاضے پورا کرنا میرے بس میں نہیں مجھے اپنے اور اپنے بچوں کے بارے میں سوچنا چاہیے تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے نتائج انتہائی ہولناک ہوں گے۔ دنیا بھی برباد ہوگی اور آخرت بھی برباد ہوگی۔

Marfat.com

مرتد کے اعمال ضائع ہو جانے کا مفہوم

مرتد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آخرت میں ضائع ہونا تو ایک واضح سی بات ہے کیوں کہ کسی عمل کا اجر اور صلہ نہیں ملے گا اور اسلام کے لیے ان کی کیسی بھی خدمات ہوں سب رائیگاں جائیں گی۔ کیوں کہ وہ اپنے تمام ذخیرۂ حسنات کو خود آگ لگا چکے ہیں۔ اسلام سے نکل جانا اور کفر اختیار کر لینا یہ گویا اسلامی خدمات کو کفر کی دیا سلائی دکھانے کے مترادف ہے۔ البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کس طرح ضائع ہو جائیں گے۔

انسانی اعمال دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا تحفظ خود اس کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور یا معاشرہ ان کی پاسداری کرتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے معاشرے اور اہلِ خانہ کے تعاون سے اپنی عائلی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ ارتداد اختیار کرنے سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی عائلی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جاتی ہے' یہ اولاد کا وارث نہیں رہتا اور بطور باپ احترام کے علاوہ اولاد سے کسی طرح کے حق کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا شخص مرجاتا ہے جس کی وراثت میں شرعی طور پر اس کا بھی حصہ ہے تو یہ اپنے حصے سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے جتنے ذاتی اعمال ہیں مثلاً نماز' روزہ وغیرہ وہ سب کالعدم قرار پاتے ہیں۔ عائلی زندگی کے ٹوٹنے کے بعد معاشرے سے اس کا تعلق خوف بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے جنازے میں شریک ہونا اور اس کی تکفین و تدفین' ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اس شخص کے مرجانے سے یہ ذمہ داریاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ نہ اس کی تکفین و تدفین میں کوئی شریک ہوتا ہے اور نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اس نے خود مسلمان امت سے اپنے آپ کو کاٹ لیا ہے۔

دوسرے حقوق وہ ہیں جن کا تعلق اسلامی ریاست سے ہے۔ اسلام چونکہ ریاستِ اسلامی کا دستور ہوتا ہے جب ایک آدمی اسلام سے بغاوت کرتا ہے تو وہ حقیقت میں اسلامی ریاست کے دستور سے بغاوت کرتا ہے۔ اور دنیا کے متمدن ممالک کا یہ طریقہ ہے کہ دستور اور آئین کا باغی ملک کا باغی سمجھا جاتا ہے اور اسے ہر طرح کے حقوقِ شہریت سے محروم کر کے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اسلام نے بھی مرتد کو یہی سزا دی ہے۔ اس سے اس کے حقوقِ شہریت سلب کر لیے جاتے ہیں۔ البتہ اتمام حجت کے لیے اسے جیل میں رکھ کر اس کے اشتباہات دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے تو پھر اسے اس کے انجام کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن یہ ان لوگوں میں سے ہو گا جو ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ
اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

بے شک جو لوگ ایمان پر جمے رہے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (۲۱۸)

Marfat.com

ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت اور جہاد ضروری ہیں

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ کفار کے ظلم وستم سے گھبرا کر ارتداد کا راستہ اختیار کرنا کم ہمتی، بزدلی اور حقائق سے فرار کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ایمان واقعی قابلِ قدر چیز ہے اور یہ زندگی کی وہ حقیقت ہے جس سے محروم ہونے کے بعد زندگی بے حقیقت ہوجاتی ہے اور انسان دنیا وآخرت میں برباد ہوجاتا ہے۔ تو پھر ایمان کے تحفظ کے لیے حالات کا مقابلہ کیے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ ایمان پر استقامت اور اس پر جمے رہنا اور ہر طرح کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا وہ راستہ ہے جس سے کامیابیوں کی روشنی پھوٹتی اور جس سے اللہ کی خوشنودی کی سحر طلوع ہوتی ہے۔ لیکن ایمان پر استقامت محض خواہش کرنے سے نصیب نہیں ہوتی۔ استقامت کے لیے دو چیزیں درکار ہیں۔ پہلی چیز ہے ہجرت۔ اللہ کے رسول پر آپ کی بعثت کے بعد ہر اس شخص پر ایمان لانا فرض ہوگیا تھا جس شخص تک آپ کی دعوت پہنچی۔ لیکن آپ کی مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد ہر ایمان لانے والے پر ہجرت فرض ہوگئی۔ کیونکہ ایک ایسا ماحول اور ایک ایسا وطن جس میں اسلامی تصورات اور اسلامی اعمال کو برداشت نہ کیا جائے اور وہاں کا ایک ایک ذرہ کاٹ کھانے کو دوڑے اور وہاں کا ایک ایک فرد موقع کی تلاش میں ہو کہ کب میں اس مومن کو ایمان لانے کی بڑی سے بڑی سزا دے ڈالوں تو ایسے ناموافق ماحول میں ایمان کو باقی رکھنا ایک فرد کے لیے ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جس ماحول میں مسموم ہوائیں چلتی ہوں اور آئے دن وبائیں پھوٹتی ہوں وہاں بڑے سے بڑے صحت مند آدمی کا بھی صحت مند رہنا خوب وخیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ایسے ماحول کو یکسر بدل دینا ایک یا چند آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں فکر اپنی صحت کی ہونی چاہیے۔ اور وہ اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ اس ماحول اور اس جگہ کو چھوڑ دیا جائے۔ ایمان کے حوالے سے بھی ہجرت کا یہی مفہوم ہے کہ جو ماحول آپ کو اور آپ کے ایمان کو برداشت نہیں کرتا اسے چھوڑ کر اس جگہ چلے جائیے جہاں ایمان کا سرچشمہ یعنی اللہ کا نبی موجود ہو۔ اس لیے ہر جگہ ایمان لانے والوں کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اور دوسری چیز جو ایمانی قوت اور صاحب ایمان لوگوں کی اجتماعیت کو باقی رکھنے کی ضمانت بن سکتی ہے وہ جہاد ہے۔ جہاد کا معنی ہے جدوجہد اور سعی وکوشش کرنا۔ یعنی ہر ایمان لانے والا اپنے دماغ، اپنی زبان، اپنے قلم، اپنی صلاحیت، اپنے اعضاء وجوارح، اپنا مال ودولت، اپنے اثر ورسوخ کو دین کی نشر واشاعت، دین کے غلبہ اور سربلندی، دینی قوتوں کے استحکام کی خاطر اس طرح بروئے کار لانے کی جدوجہد کرے اور اس طرح اپنی امکانی مساعی کو بروئے کار لائے کہ اس کے سامنے اس ہدف کے سوا کوئی اور ہدف نہ ہو۔ وہ اسی کے لیے مرے اور اسی کے لیے جیئے، اس کی دعائیں اسی کے لیے ہوں اور اگر اس کے لیے جان وتن کی بازی بھی کھیلنی پڑے تو وہ اس کو اپنے لیے عین سعادت سمجھے۔ ہجرت اور جہاد یہ وہ دو عمل ہیں جو مسلمان افراد اور مسلم امہ کا سب سے بڑا اثاثہ ہیں۔ اسی سے اجتماعی شیرازہ وجود میں آتا ہے اور اسی سے ایمان کی حفاظت میں مدد ملتی ہے اور اسی سے وہ قوت وجود میں آتی ہے کہ جس کے دائرہ اثر کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ وہ روشنی ہے جس کو بادل دیر تک روک نہیں سکتے۔ یہ وہ بارش ہے جسے جھلسی ہوئی زمین بھی دیر تک بے اثر نہیں کرسکتی۔ چنانچہ جب ان اعمال سے مرصع افراد تیار ہوجاتے ہیں اور اس اسلحہ سے مسلح قوت ایمان کے نور کو لے کر آگے بڑھتی ہے تو جہاں زمین کی مسافتیں ان کے سامنے سمٹنے لگتی ہیں وہیں اللہ کی رحمتیں بھی ان پر نثار ہونے لگتی ہیں۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں'' انہیں حق ہے کہ وہ اللہ سے رحمت کی امید رکھیں۔ البتہ یہ غلطی کبھی نہ کریں کہ اللہ کی رحمت کی طلب کے لیے اپنے اعمال پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں۔ اعمال کی توفیق بھی اللہ کی رحمت سے ہوتی ہے۔ اور اعمال کی قبولیت بھی اسی کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اعمال میں پوری کوشش بجالانا، لیکن ساتھ ساتھ اللہ سے مغفرت اور رحمت کی دعائیں کرنا یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اسی لیے فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

Marfat.com

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِکَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

(وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو دنیا و آخرت دونوں کے معاملے میں) (۲۱۹)

خمر اور قمار سے متعلق سوال کا مفہوم اور منشأ سوال

اس آیتِ کریمہ میں دو سوال اور ان کے جواب ہیں۔ اور اس کے علاوہ بعض حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ہم نہایت اختصار سے مقدور بھر اس پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سلسلۂ بیان حج سے متعلق ہے اور اسی سلسلے میں جہاد اور انفاق کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ بیان کی ثقاہت اور ملی اہمیت کو دیکھتے ہوئے خمر اور قمار کے بارے میں سوال عجیب بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب تدبر کی نگاہ سے ہم اسے دیکھتے ہیں تو پھر اپنی نارسائی فکر پر افسوس ہونے لگتا ہے۔ ہماری نارسائی فکر کا سبب یہ ہے کہ ہم قرآنِ پاک کے الفاظ کو اس کے اصل تناظر میں دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اور نہ ہی یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت ان الفاظ کا استعمال کس مفہوم میں ہوتا تھا۔ ہمارے سامنے جب شراب اور جوئے کا ذکر ہوتا ہے تو ہمارے ذہن میں شراب کے حوالے سے عیاشی کا تصور ابھرتا ہے' کبابوں کی بو مہکنے لگتی ہے' اوباشوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے' ہر طرف یاوہ گوئی اور لپاڈگی کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ اسی طرح جب قمار یعنی جوئے کا ذکر ہوتا ہے تو ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جو بے ہمت' بدمحنت' نکما' نکھٹو اور کم ظرف آدمی ہے۔ لیکن قسمت آزمائی کے ذریعے راتوں رات امیر بننے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ آئے دن مختلف سکیموں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور چھپ چھپ کر قسمت آزمائی کے لیے اوباشوں کے گروہ میں جوا کھیلنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں گھر کی رہی سہی بربادی ہو جاتی ہے اور برسوں کی عزت کو آگ لگ جاتی ہے۔ ہم ان تصورات کے ساتھ جب قرآنِ کریم میں خمر اور میسر کے متعلق سوال پڑھتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں یہ سوال شاید اسی نوعیت کا ہے۔ لیکن اگر عرب کی مخصوص سوسائٹی کے تناظر میں ان دونوں چیزوں کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو تب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوال اس سیاقِ کلام سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ جس طرح قرآنِ کریم بار بار انفاق پر زور دے رہا تھا اس سے اس سوال کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ سوال کے پیدا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ غریبوں کا اس حد تک خیال رکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ بیت اللہ کی آزادی کے لیے آپ کو ایک بڑا معرکہ درپیش ہے اور ممکن ہے کہ قریبی زمانے میں قریشِ مکہ کے ساتھ بیت اللہ کی آزادی کے لیے ایک بڑی جنگ لڑنی پڑے۔ اس میں جہاں ایک مضبوط افرادی قوت کی ضرورت ہے وہیں مصارف کے لیے بڑے سرمائے کی بھی تو ضرورت ہے۔ آپ کے پاس نہ اسلحہ ہے نہ سواریاں' نہ رسد و کمک کا انتظام۔ اس بے سروسامانی کے باوجود جب آپ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ ہم کتنا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ تو

Marfat.com

آپ جہاد کی اس ساری اہمیت اور ضرورت کے باوجود آپ انہیں سب سے پہلے والدین' اقرباء' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کی کفالت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کہ جہاد کی ضرورت اپنی جگہ لیکن اس کی ضرورت و اہمیت تم پر اس طرح حاوی نہیں ہونی چاہیے کہ ضرورت مندوں کی ضرورتوں سے تم تغافل برتنے لگو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کسی صورت اور کسی طرح کے حالات میں بھی غریبوں کو نظر انداز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تو پھر ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عرب سوسائٹی میں شراب اور جوا صرف عیاشی اور قسمت آزمائی کا ذریعہ تو نہیں۔ اس کا اصل سبب تو یہ ہے کہ جب شمال سے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور پورے ملک پر ایک مردنی طاری ہو جاتی ہے' چراگاہوں میں دھول اڑنے لگتی ہے' درخت پتوں تک سے محروم ہو جاتے ہیں' بارشیں نہ ہونے کے باعث تالاب خشک ہو جاتے ہیں' چشمے پانی دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی قحط سالی کی فضا طاری ہوتی ہے کہ لوگ ایک ایک لقمے کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناگوار وقت میں چند حوصلہ مند امراء شراب اور قمار کی مجلسیں جماتے ہیں۔ لوگوں کو خبر ہوتی ہے تو غریبوں کا ہجوم ہو جاتا ہے' امیر لوگ شراب کے نشے میں مخمور ہو کر جس کی اونٹنی سامنے آتی ہے ذبح کر ڈالتے ہیں' پھر اس کے گوشت کے پارچوں پر جوا کھیلتے ہیں' جتنا حصہ گوشت کا جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں کو دیتے جاتے ہیں۔ اس طرح سینکڑوں غریبوں کی روزی کا سامان ہو جاتا ہے۔ اور یہ جوا کھیلنے والے خود اس گوشت کو اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ ایسی مجلسوں کو صرف غریب پروری کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو مجلسیں اور جو مشاغل غریب پروری کا ذریعہ بنیں اور غریبوں کی اس سے ضروریات پوری ہوں اور سخت قحط سالی کے زمانے میں لوگ موت کے منہ سے نکل آئیں۔ اسلام کو ایسے مشاغل کی تو حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ یہ سوال درحقیقت اسی سوچ کا نتیجہ تھا جو انفاق کے تذکرے کے سیاق میں پیدا ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ شراب اور قمار کی ان مجالس سے یقیناً لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی چیز سے صرف فائدہ پہنچنا اگر اس کے جواز کی دلیل ہے تو پھر دنیا میں کوئی بری سے بری چیز بھی ناجائز نہیں ہو سکتی۔ آخر ایسی اور کونسی بری چیز ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ چوری کے بھی فوائد ہیں' مغرب سے پوچھ لیجئے زنا کے حق میں پورا فلسفہ تیار کر دیا گیا ہے' سود تو آج انسانی عقل کے لیے فائدے ہی کے حوالے سے سب سے بڑی آزمائش بن گیا ہے اور خنزیر بہت ساری ضرورتیں پوری کرنے کے کام آتا ہے تو اگر چند فوائد کا حوالہ کافی ہے تو پھر ان میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی حلت و حرمت یا جائز و ناجائز کی بنیاد طبی و مادی فوائد سے متعلق نہیں ہے۔ اسلام تو اخلاقی پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اس لیے اسی حوالے سے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کے فوائد ہیں لیکن ان کے اخلاقی مفاسد ان کے مادی یا طبی فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ منافع کے مقابلے میں نقصان کا لفظ نہیں آیا بلکہ اثم کا لفظ آیا ہے۔ اثم کا معنی گناہ ہے اور گناہ کا تعلق طبی نقصانات سے نہیں بلکہ اخلاقی نقصانات سے ہے۔ جس قوم میں یہ دونوں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اس میں اخلاقیات کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو بھی اسی دنیا میں رہنا ہے اور انہیں بھی اشیاء کے نفع و ضرر سے واسطہ پڑنا ہے۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ مادی نقصانات کو برداشت کر لیا جائے لیکن اخلاقی نقصانات کو کبھی برداشت نہ کیا جائے۔ کیونکہ قومیں پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی دنیا کے تخت و تاج الٹتی رہی ہیں اور مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ تو پوری طرح اس پر شاہد ہے لیکن جب نظریات میں کمزوری اور اخلاق میں فساد پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا کی سب سے بڑی طاقتور قوم کو بھی سقوطِ بغداد اور سقوطِ اندلس سے نہیں بچایا جا سکتا۔ اس لیے اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ نیک ارادوں سے بھی کوئی کام ایسا کیا جائے جو بظاہر نیک ہو لیکن حقیقت میں اس کے اندر اخلاقی مفاسد پائے جاتے ہوں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی جگہ مسجد یا ہسپتال بنانے کے لیے لاٹری ڈا[لے]

Marfat.com

تاکہ اس کی بازیافت سے یہ دونوں کام سرانجام دیے جائیں تو اسلام ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کو ممنوع قرار دیتا ہے اور ایسے ہسپتال کو محض ایک ہسپتال سمجھتا ہے جسے اللہ کی تائید ونصرت حاصل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کہیں کوئی ارضی یا سماوی آفت کی وجہ سے لوگ امداد کے مستحق ہوں تو وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ فلمسٹاروں یا بدکار مردوں اور عورتوں کو کوئی تفریحی پروگرام منعقد کر کے اس کی آمدنی سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے۔ کیونکہ مدد کے لیے اسباب کی فراہمی اگر نیک بندے کوشش کریں تو اللہ کی تائید ونصرت سے ہوتی ہے۔ لیکن ایسے اوباش لوگوں کے امدادی شو سے جو فضا پیدا ہوگی اس کے نتیجے میں نہ جانے کتنے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اخلاقی مفاسد کا شکار ہوں گی۔ اس لیے اسلام کسی بھی ایسے نیکی یا خدمت خلق کے کام کو ہرگز روا نہیں رکھتا جس میں نیکی کے پردے میں بدی پرورش پاتی ہو۔

یہاں اگرچہ خمر اور قمار کی حرمت کا اعلان نہیں فرمایا لیکن دونوں کو اثم قرار دے کر یہ حقیقت ضرور واضح کر دی کہ مسلمانوں کو اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کے اندر گناہ کا جو پہلو ہے اس سے بچنا بہرحال تقویٰ کے لیے ضروری ہے۔ اصل سوال اور جواب کی وضاحت تو اسی حد تک کافی ہے لیکن یہاں چونکہ شراب کا ذکر آیا ہے تو ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی حرمت اور تاریخ حرمت کی کچھ تفصیل عرض کر دیں۔

حرمتِ خمر کی تاریخ اور تدریج

پیش نظر آیت شراب اور قمار سے متعلق سب سے پہلی آیت ہے۔ جس میں اس کی خرابیوں اور مفاسد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کی حرمت کا اعلان نہیں کیا گیا ہے اس لیے مسلمانوں کی اکثریت اس کے بعد بھی شراب نوشی میں مبتلا رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے صحابہ کرام میں سے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد حسب دستور شراب پی گئی۔ نمازِ مغرب کا وقت آ گیا۔ سب نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ امام صاحب نے نشہ کی حالت میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ تلاوت کرتے ہوئے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کی بجائے اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ گئے۔ اس پر قرآنِ کریم میں دوسرا حکم نازل ہوا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی ”اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس آیت کریمہ میں صرف نماز کے اوقات میں شراب کو حرام کر دیا گیا اور باقی اوقات میں اس کی اجازت رہی۔ بعض صحابہؓ تو اس آیت کے بعد شراب سے بالکل تائب ہو گئے لیکن اکثریت ابھی تک اوقاتِ نماز کے علاوہ شراب نوشی سے شوق کرتی رہی۔ کیونکہ جب تک اللہ کی جانب سے ممانعت نہیں آ جاتی اس سے یکسر رک جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر ایک واقعہ پیش آیا کہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے چند صحابہ کرام کی دعوت کی۔ جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا دور چلا۔ نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر وشاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصارِ مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح وثناء تھی۔ اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا اور اس نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعدؓ کے سر پر دے ماری۔ حضرت سعدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس انصاری نوجوان کی شکایت کی۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شَافِیًا ”یا اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح ہدایت عطا فرما“۔ اس پر شراب کے متعلق سورۃ مائدہ کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

Marfat.com

الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ (اے ایمان والو! بیشک شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو اس سے پرہیز کروتا کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کردے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو روک دے۔ سو کیا اب بھی باز آؤ گے؟) اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کرنے میں ایک تدریج سے کام لیا ہے۔ کیونکہ پروردگار خوب جانتے تھے کہ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اور ان کی ایسی عادتِ مستمرہ بن چکی ہے جسے چھڑانا آسان نہیں۔ عادت کوئی بھی آسانی سے نہیں چھوٹتی لیکن وہ عادت جو زندگی بھر کی عادت ہو اور جس کا اثر رگ و ریشہ میں اتر چکا ہو اسے چھوڑنا تو سب سے مشکل کام ہے۔ لیکن اسلام نے سب سے پہلے ذہنی تربیت کے لیے لوگوں کو اس قابل بنایا کہ اللہ کا جو بھی حکم آئے اور اللہ کے رسول جو بھی حکم دیں انہیں دل و جان سے قبول کرنا اور اس کی کامل اطاعت کرنا ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ اس لیے جیسے ہی یہ آخری آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ ''شراب حرام کردی گئی ہے'' تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا گیا۔ جس کے پاس کوئی سبو یا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لا کر توڑ دیا۔ اگر کسی کے ہاتھ میں جام لبوں تک پہنچ چکا تھا تو اسے دہن تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ مدینہ میں اس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کا پانی بہتا ہے۔ مدینہ کی گلیوں میں عرصہ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رنگ مٹی میں نکھر آتا۔ امتثالِ امر اور اطاعتِ کاملہ کے ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اس زمانے میں اپنا سارا سرمایہ لے کر ملک شام سے شراب لینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان کو اعلانِ حرمت کی خبر مل گئی۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ ان کا سارا سرمایہ اس کام میں لگ چکا ہے اور کیسی کیسی نفع کی امیدیں لے کر وہ سفر سے لوٹے ہیں' اعلانِ حرمت سن کر سارا سامان ایک پہاڑی پر رکھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے پوچھا اس مال سے متعلق آپؐ مجھے کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا شراب حرام ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس جانثار صحابی نے آپ کا حکم سن کر مشکیزے پھاڑ دیئے اور اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا۔ اس ایک حکم نے مسلمانوں کی ساری آبادی میں ایسی تطہیر پیدا کی کہ برسوں کے شراب نوش ہمیشہ کے لیے تائب ہو کر رہ گئے اور ایک آدمی بھی مدینہ میں ایسا نہ رہا جس نے شراب پینے کی جرأت کی ہو اور ایک گھر ایسا نہ بچا جس میں شراب کا ایک مٹکا بھی باقی ہو۔ لیکن اس کے مقابل میں مہذب دنیا اس بات سے واقف ہے کہ امریکہ نے بھی اپنے شہریوں کی صحت کی خاطر شراب پر پابندی لگانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی پارلیمنٹ نے بالاتفاق امتناعِ شراب کا قانون پاس کیا۔ پھر پوری قوت سے اسے نافذ کیا گیا اور تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے شراب نوشی کے خلاف ذہن تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن چند سالوں کی کوششوں کے بعد نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعت کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت اس حد تک زیادہ شراب استعمال کی کہ امریکہ اپنا قانون واپس لینے پر مجبور ہو گیا۔ صرف اس ایک مثال میں عقل مندوں کے لیے ہزاروں عبرتیں مضمر ہیں۔

Marfat.com

قمار کی تعریف اور تفصیل

سورۂ مائدہ کی جس آیتِ کریمہ میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے اسی میں جوئے کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ جوئے کو قرآن کریم میں میسر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو قمار بھی کہتے ہیں۔ (میسر مصدر ہے اور اصل لغت میں اس کا معنی تقسیم کرنے کے ہیں۔ یاسر تقسیم کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تقسیم کی مناسبت سے ہی قمار کو میسر کہا جاتا ہے۔ تمام صحابہ و تابعین اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل ہیں اور سب حرام ہیں۔ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاویہ بن صالحؒ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا: المیسر القمار حتیٰ لعب الصبیان بالکعاب والجوز ''یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔''

اور ابن عباسؓ نے فرمایا المخاطرة من القمار یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔'' (جصاص)

ابن سیرین نے فرمایا ''جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔'' (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جاوے جو نفع وضرر کے درمیان دائر ہو۔ یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے۔ جیسے آج کل کی لاٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں۔ اس لیے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں اور اسی بنا پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں (شامی ص ۳۵۵ جلد ۵ کتاب الحظر والاباحۃ) مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑ جائے اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے۔ اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، وہ سب ''میسر'' اور ''قمار'' اور ''جوا'' کہلائے گا۔ معمے حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں۔ ہاں اگر صرف ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا۔ اس میں مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے۔ کیونکہ اس میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لیے احادیث صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جن میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے۔ تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شطرنج میسر ہے اور جوئے میں داخل ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بری ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

Marfat.com

قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات

''قمار یعنی جوئے کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے۔ کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں، مگر نفع سے اس کا نقصان وضرر بڑھا ہوا ہے۔ اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ جیت جائے تو بیٹھے بٹھائے ایک فقیر، بدحال آدمی ایک ہی دن میں مالدار وسرمایہ دار بن جاتا ہے۔ مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے۔ جیتنے والے کا نفع ہی نفع، ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے۔ اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے کہ جس انسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہیے وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں راحت، اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے۔ اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے۔ بخلاف تجارت اور بیع وشراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے۔ اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصلی کمائی اور کسب سے عادۃً محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت نہ مشقت۔ بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے۔ جوئے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نااندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں۔ جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے۔ سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے اجتماعی طریقے بنکنگ کے نام سے ایجاد کر لیے گئے ہیں۔ اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے اور جو نقصان ہوتا ہے وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں۔ لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے۔ اس لیے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں۔ اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دوررس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں۔ کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی۔ جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں

Marfat.com

روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے۔ قرآنِ کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ یعنی مالِ فے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار یعنی جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کا سبب ہوتا ہے۔ ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ تمدن اور معاشرت کے لیے سخت مہلک چیز ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ ''شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض ونفرت پیدا کردے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔''

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قمار اور شراب کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے برے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے۔ مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں کہ وہ آپس کی عداوت وبغض کا سبب بنتی ہیں اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔''

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریق ہے کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے' اسی کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ''لوگوں کے مال باطل طریقہ پر مت کھاؤ۔''

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعتہً بہت سے گھر برباد ہو جاتے ہیں' لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے' جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا' جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے' بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملات کیے ہوئے ہیں یا قرض دیے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر وہمی منافع پر لگ جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھاتا رہے اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جمائے۔

یہ مختصر فہرست ہے قمار کے مفاسد کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے سب متعلقین' اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے فرمایا وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ''یعنی شراب وقمار کے مفاسد ان کے نفع سے زیادہ ہیں۔'' (ماخوذ از معارف القرآن)

Marfat.com

سوال میں تکرار کی وجہ

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا سوال خرچ کرنے کے بارے میں ہے۔ یہ سوال دوسری مرتبہ پوچھا گیا ہے۔ یہ بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں تکرار نہیں ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ بیت اللہ کی آزادی کے لیے جہاد اگرچہ سب سے بڑی نیکی ہے اور اس راستے میں انفاق یقیناً اللہ کو بہت محبوب ہے لیکن یہی انفاق تمہاری ساری توجہ کا حاصل نہیں بن جانا چاہئے۔ تمہارے اپنے گھر' خاندان اور معاشرے میں جو ضرورتمند لوگ تمہاری اعانت کے محتاج ہیں انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں ہونا چاہئے۔ اس لیے سب سے پہلی توجہ ان کی اعانت کی طرف کرو' اس کے ساتھ ساتھ جو بھی تم جہاد کے سلسلے میں خرچ کرو گے اللہ یقیناً اسے جانتا ہے۔ لیکن صحابہؓ میں اللہ کے راستے میں ہر طرح کے ایثار کرنے کا جو بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس کے پیش نظر یہ سوال دوبارہ زبانوں پر آ گیا کہ ہمیں بتایا جائے کہ اللہ کے راستے میں ہمارے خرچ کی آخر وہ انتہا کیا ہے جس سے ہمارا مالک ہم پر خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال اسی جذبہ سے کیا گیا ہے اور اسی جذبہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس پس منظر کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ یہ سوال معمول کی زندگی سے متعلق نہیں ہے۔ عام حالات میں آدمی کو جس قدر ایثار کرنا چاہئے اس کے لیے تو پہلا سوال اور اس کا جواب ہی کافی ہے لیکن بیت اللہ کی آزادی کے حوالے سے مسلمان غیر معمولی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک بہت بڑا معرکہ ہے جس کے لیے بے پناہ مصارف درکار ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اس معرکے کو ملتوی کرنا گویا اپنے آپ کو مرکزِ اسلام سے محروم کرنا ہے۔ بیت اللہ کی حیثیت امتِ اسلامیہ کے جسم میں دل کی مانند ہے۔ جو ان کی شریانوں سے خون کھینچتا ہے' نورِ توحید اور جذبۂ حبِ الٰہی سے معمور کر کے واپس کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک صالح اسلامی زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اس کا کافروں کے قبضے میں ہونا مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے ہنگامی حالات میں شریعت کے وہ احکام جو معمول کی زندگی سے متعلق ہیں' ان سے زائد ایک بات پوچھی جا رہی ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہاری ناگزیر ضرورتوں سے جو باقی بچ جائے اسے تم اس جہاد میں قربان کر دو۔ معاملہ چونکہ اسلامی غیرت کا ہے اس لیے غیرت مند قوم کی طرح سب کچھ قربان کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ جہاد میں جب جان قربان کی جا سکتی ہے تو مال بچا کے رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ جہاد کے تقاضے مسلمانوں سے اس طرح کی قربانی کا تقاضہ کر رہے ہوں۔

عفو کا مفہوم

بعض لوگوں نے عفو کے لفظ سے اشتراکی نظریات کے حق میں دلیل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اگر یہ پورا پس منظر سامنے رہے جو میں نے عرض کیا ہے تو اس طرح کے تصورات کو کھینچ کے بلا وجہ اسلامی تعلیمات میں داخل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہنگامی اور ایمرجنسی حالات میں اسلام اپنے ماننے والوں کو بڑی سے بڑی قربانی پر اکساتا ہے لیکن ان پر کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ حالانکہ اگر ایسے حالات میں کوئی لازمی پابندی بھی لگا دی جائے تو امت اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ جنگ تبوک جس کی فوج کو جیش العسرۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید ضرورت کے باعث بار بار لوگوں کو انفاق کا حکم دیا اور لوگوں نے بھی دل کھول کر اپنی ہمت سے بڑھ کر ایثار کا ثبوت دیا۔ لیکن آپؐ نے کوئی جبری ٹیکس یا کوئی پابندی لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور

Marfat.com

جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے اسے دیکھتے ہوئے تو اشتراکی نظریات کی پرچھائیں تک بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔ اگر انفرادی آزادی کی بجائے پارٹی یا حکومت کو ضرورت سے زائد زبردستی اپنے قبضے میں لینے کا اختیار ہوتا تو مسلمانوں کو بار بار انفاق کا حکم نہ دیا جاتا' مسلمانوں پر زکوٰۃ نہ فرض کی جاتی' اس کے علاوہ صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ قرآنِ پاک میں تفصیل سے احکامِ میراث آئے ہیں اور علم الفرائض کے نام سے مستقل ایک علم علومِ اسلامیہ کا حصہ ہے۔ اگر آدمی کے لیے اپنے پیچھے کچھ چھوڑ کر جانا ممنوع ہوتا تو میراث کے احکام کی کیا ضرورت تھی؟ آخر میں ارشاد فرمایا کہ یہ جو مختلف سوالات کی وضاحت کی جا رہی ہے یہ اس لیے ہے تاکہ تمہارے اندر تفکر اور تدبر کی صلاحیت پیدا ہو۔ لیکن اس صلاحیت کو یک رخا نہیں ہونا چاہئے۔ کہ جس نے اس صلاحیت کو دنیا کے فوائد و مصالح کے ساتھ وابستہ کر کے رکھ دیا تو وہ دنیا ہی کا ہو گیا اور جہاد جیسے بنیادی احکام کو بھی غیر ضروری سمجھنے لگا۔ اور جس نے آخرت ہی کو اپنا موضوع بنایا اور دنیا اس کے غور و فکر سے خارج ہو گئی تو اس نے دین کو رہبانیت بنا کر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں تفکر اور تدبیر کی صلاحیت سے بہرہ ور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم اپنے اندر وہ توازن پیدا کرو کہ دین مقصود بن جائے' آخرت منزل قرار پائے اور دنیا اس کی تیاری کا ذریعہ ہو۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

(اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون اصلاح چاہنے والا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے) (۲۲۰)

یتیموں سے متعلق سوال کی نوعیت

اس آیتِ کریمہ میں بھی ایک سوال اور اس کا جواب ہے۔ مسلمان چونکہ جہاد و قتال کے مراحل سے گزر رہے تھے جہاں جان وتن کی آزمائشوں کا پیش آنا روزمرہ کی بات بن جاتی ہے۔ کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ اس راستے میں کون کب کام آ جائے؟ شہادتوں کے اس سفر میں بچوں کا یتیم ہونا اور بیویوں کا بیوہ ہونا ایک فطری عمل ہے۔ چنانچہ اسی سیاق و سباق میں یہ سوال پیدا ہوا کہ شہیدوں یا طبعی موت سے اللہ کو پیارے ہونے والوں کے جو یتیم بچے رہ جائیں ان کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ یتیموں کی دیکھ بھال کے بارے میں احکام تو اور بھی کئی جگہ گزر چکے ہیں لیکن جب سورۂ نساء میں اس سلسلے میں نہایت تاکیدی اور شدید احکام آئے جس میں لوگوں کو تنبیہ کی گئی کہ اگر یتیم اپنے پاس کوئی مالِ وراثت رکھتے ہیں تو دیکھنا کسی طریقے سے نہ اسے بدلنے کی کوشش کرنا کہ ان میں سے قیمتی چیزیں نکال لو اور ردی چیزیں شامل کر کے گنتی پوری کر دو۔ اور نہ کسی اور طریقے سے ان کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کرنا اور پھر شدید وعید کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ''بلاشبہ وہ اپنے پیٹوں میں انگارے بھرتے ہیں۔'' اس طرح کی وعیدوں کے نازل ہونے کے بعد مسلمان جو ہمیشہ سے اللہ سے ڈرنے والے تھے بہت زیادہ خوفزدہ اور محتاط ہو گئے۔ اس لیے انہوں نے یتیموں کے بارے میں پوچھا کہ جو یتیم صاحبِ مال ہیں ان کے بارے میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ کیا ان کے مال کی دیکھ بھال کے لیے ہم الگ سے وقت

Marfat.com

نکالیں؟ اور اگر اسے کاروبار میں لگانا ضروری ہو تو کیا اس کے لیے الگ سے کاروبار کیا جائے؟ تو پھر سوال یہ ہے کہ اتنا وقت کون نکال سکتا ہے؟ یا اس بات کی اجازت ہے کہ ہم ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ شامل کر لیں اور اپنے کاروبار میں لگا لیں؟ تاکہ دیکھ بھال میں بھی آسانی ہو اور مال میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔

سوال کا جواب

اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں شعلہ و شبنم کا امتزاج نظر آتا ہے۔ نہایت ملائمت بھی ہے' احسان کا اظہار بھی ہے اور ساتھ ہی احتیاط کی تاکید بھی ہے اور نیت کے خلوص کے لیے تنبیہ بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ تم جو کچھ بھی ان کی دیکھ بھال اور ان کے مال میں اضافے کے لیے کرنا چاہو اس میں پیشِ نظر ہر صورت میں ان کی بھلائی رہنی چاہئے۔ تمہیں ہر وقت فکر ہو تو ان کی بہبود کی اور ان کی بہتری کی۔ اور اگر مناسب سمجھو تو ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ شامل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں آخر وہ تمہارے بھائی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔ اگر انتظامی سہولت اسی میں ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ ایسا کرنے میں تمہاری نیت کیا ہے؟ اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ وہ مصلح کو بھی جانتا ہے اور مفسد کو بھی۔ دنیا کی آنکھوں میں تو دھول جھونکی جا سکتی ہے لیکن اللہ سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ اس لیے جو کچھ بھی ان کے معاملے میں کرو یہ سمجھ کے کرو کہ تم ایک ایسے نگران کی نگرانی میں ہو جو تمہارے دلوں کے ارادوں سے بھی واقف ہے۔ اگر تم بھلائی کرو گے تو اس کا ضرور اجر پاؤ گے' لیکن اگر تم یہ سب کچھ مال ہڑپ کرنے کے لیے کر رہے ہو تو پھر یاد رکھو وہ غالب ہے' طاقتور ہے' وہ پکڑنے پہ آئے تو اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ لیکن چونکہ حکمت والا ہے اس لیے وہ ڈھیل بھی دیتا ہے تاکہ تم اگر اصلاح کرنا چاہو تو اصلاح کر سکو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اعنات مشقت میں ڈالنے کو کہتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا ذکر فرمایا۔ یہ اس کی عنایت اور مہربانی ہے کہ اس نے تمہاری سہولت کے پیشِ نظر تمہیں یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کاروبار کرنے کی اجازت دے دی۔ ورنہ وہ اگر چاہتا تو تمہیں الگ سے یتیموں کے تمام معاملات کی نگرانی کا حکم دے سکتا تھا۔ لیکن وہ چونکہ ہمیشہ بندوں کے حال پر مہربان رہتا ہے اس لیے ہمیشہ نرمی کا معاملہ کرتا ہے اور اپنے بندوں کو سختی سے بچانے کی راہیں کھولتا ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو پوری شریعتِ اسلامی کا مزاج یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر اپنے بندوں کو سہولتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اپنی ناشکری کے باعث ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○

Marfat.com

(اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھی لگے۔ اور مشرکوں کو اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں) (۲۲۱)

مشرکات سے نکاح کی ممانعت

یتیموں کے ہی حوالے سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ مرنے والا جس طرح اپنے پیچھے یتیم بچے چھوڑ جاتا ہے اسی طرح بیوہ بھی تو چھوڑ جاتا ہے۔ اگر کسی یتیم کا ولی یتیم کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ سوچتا ہے کہ میرے گھر میں میری بیوی اور بچے ہیں' میری بیوی مسلمان ہونے کے ناطے یقیناً میری طرح ہمارے زیرِ تحویل یتیم کی نگہداشت کی کوشش کرے گی۔ لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ دوسروں کے بچوں کو عورتیں کبھی بھی اپنے بچوں کے برابر قرار نہیں دے سکتیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ اپنے بچوں کی وجہ سے بدسلوکی کا ارتکاب بھی کرتی ہیں۔ یتیم کی مناسب دیکھ بھال اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ اس کی بیوہ ماں اس گھر میں اس حیثیت میں آ جائے کہ وہ اس کی دیکھ بھال اور ضرورتوں کو پورا کرنے میں پوری طرح بااختیار ہو۔ یہ سوچ کر اگر یتیم کا ولی اس کی ماں سے نکاح کرنا چاہے تو کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم یتیموں کی ماؤں سے بصد شوق نکاح کر سکتے ہو' لیکن شرط یہ ہے وہ صاحبِ ایمان ہوں۔ یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ اس وقت تک صورتحال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں۔ اس بنیادی ہدایت کے سلسلے میں بعض اصولی مسائل بھی چھڑ گئے۔ جن کے بارے میں اس بحث کی مناسبت سے تسلی بخش جواب دے دیا گیا۔

یہاں مشرکات اور مشرکین سے مراد کون ہیں؟

سب سے پہلی بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں مشرکات سے مراد کون ہیں؟ کیونکہ اہلِ کتاب کی عورتیں اگرچہ شرک کا ارتکاب کرتی تھیں لیکن قرآنِ کریم نے ان سے تو نکاح کی اجازت دی ہے۔ اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ یہاں مشرکات اور مشرکین کے لفظ بطور لقب یا علم کے استعمال ہوئے ہیں۔ دنیا کی بیشتر قوموں نے قسم قسم کے شرک سے اپنے آپ کو آلودہ کیا' لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو مشرک کہلانا پسند نہیں کیا۔ یہ صرف جزیرۂ عرب یا مکے کے مشرک تھے جو بطور علم یا لقب کے اپنے آپ کو مشرک کہلانا پسند کرتے تھے۔ اس لیے یہاں وہی مراد ہیں۔ یہاں واضح طور پر فرما دیا کہ عرب کی مشرک عورتوں سے کسی صورت بھی نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ کوئی مشرک عورت اپنے حسن و جمال' اپنے مال کی فراوانی اور اپنی خاندانی شرافت کے وجہ سے تمہیں کتنی بھی اچھی لگے اور چاہے تم ان کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ لیکن یاد رکھو ایک مومن لونڈی ایسی مشرکہ عورت سے بہتر ہے۔ اللہ کے یہاں قابلِ قدر چیز ایمان ہے۔ حسن و جمال' مال دولت یا خاندانی شرافتیں نہیں۔ اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح مشرکہ عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں اسی طرح اپنی لڑکیوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں دینا بھی جائز نہیں۔ چاہے وہ مشرک مرد اپنی وجاہت و نجابت کی وجہ سے کتنا بھی دلپسند کیوں نہ ہو' لیکن ایمان نہ ہونے

Marfat.com

کے باعث اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ البتہ وہ غلام جو ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہے وہ ایسے مشرک سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ایمان و عمل کو تمام انتسابات اور تمام دل پسند حوالوں سے برتر قرار دینا اسلام کا وہ امتیازی پہلو ہے جس نے اسے ایک آفاقی دین بنا دیا ہے۔ اور تمام چھوٹی موٹی نسبتیں اس کے بے پایاں سمندر میں غرق ہو کر رہ گئی ہیں۔

شادی بیاہ کے اثرات

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اسلام نے یہ جو پابندیاں لگائی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی بیاہ کے تعلقات سے مذہب، روایات اور تہذیب و تمدن میں بے پناہ تبدیلیاں آنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتے بھی ہیں اور متاثر ہوتے بھی ہیں۔ اور پھر اگر دونوں اپنے خیالات اور مذہب میں مستحکم اور مخلص ہیں تو دونوں میں سے ہر ایک یہ چاہے گا کہ میری اولاد میرے مذہب اور میرے طریقے پر چلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاد اس کھچاؤ میں دونوں سے بیگانہ ہو جائے گی۔ اس گھر میں نہ والدین کا احترام باقی رہے گا نہ مذہب سے وابستگی باقی رہے گی۔ اگر قوموں کی تاریخ کے حوالے سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو اس کے اثرات اس قدر خوفناک معلوم ہوتے ہیں جنہیں محسوس کرتے ہوئے آدمی اللہ کا شکر ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ اس نے یہ ہدایات دے کر مسلمانوں کو بہت بڑی تباہی سے بچایا ہے۔ بنی اسرائیل دینی بربادی اور قومی ہلاکت کے جس حادثے سے دوچار ہوئے اس کا سب سے بڑا سبب ان کا ان بت پرست قوموں میں شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنا تھا جو کسی طرح بھی ان کے توحیدی اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ اللہ کے اس حکم سے بغاوت یا لاپرواہی کے نتیجے میں بری طرح داغ داغ ہے۔ اور کتنے بڑے حوادث سے اسی گمراہی کے باعث امت مسلمہ دوچار ہو چکی ہے۔ اندلس کے سقوط کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب حکمرانوں اور امراء کے گھروں میں عیسائی عورتوں کا آ جانا تھا۔ مغلیہ سلاطین نے ہندو راجاؤں کے ہاں سیاسی مصالح کے تحت جو شادیاں کیں اس کے نتیجے میں ہندوانہ عقائد، اوہام، رسوم اور عبادت کے طریقے بھی ان کے گھروں میں داخل ہو گئے۔ مغربی قوموں نے ہمیشہ اسے ایک بہت بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اسی بربادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ یہ کافر لوگ تمہیں جہنم کی طرف جانے کی دعوت دے رہے ہیں اور اسلام کی دعوت مغفرت اور جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ ایک گھر میں جنت اور دوزخ کے مسافر اکٹھے کیسے رہ سکتے ہیں؟

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ
فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى
يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ

Marfat.com

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ
حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾
وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَ
تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ
اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ
قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ
تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ
يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ
مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ
دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع

رکوع: ۲۸۔ (وہ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے وہ ناپاکی (اور بیماری) ہے، پس الگ رہا کرو عورتیں سے حیض کی حالت میں، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جیسے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو

Marfat.com

پسند کرتا ہے ○ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں، تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لیے آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا ہے، اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو ○ اللہ کو اپنی قسموں کی رکاوٹ نہ بناؤ کہ تم احسان نہیں کرو گے یا حدودِ الٰہی کا احترام نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے ○ اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں پکڑے گا تمہاری لایعنی قسموں پر، لیکن تمہیں پکڑے گا ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے، اللہ بہت بخشنے والا بردبار ہے ○ جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ○ اور اگر طلاق کا فیصلہ کرلیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے ○ اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں، اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں، اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے) (۲۲۲ تا ۲۲۸)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○

(وہ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے وہ ناپاکی (اور بیماری) ہے، پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، پھر جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جیسے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) (۲۲۲)

سوال کا پس منظر

قرآنِ کریم انسانی زندگی کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے۔ جس میں زندگی کی تمام ضروریات اور تمام احساسات کے حوالے سے رہنمائی مہیا کی گئی ہے۔ انسانی زندگی کا اسلوب یہ ہے کہ ایک ضرورت سے دوسری ضرورت پھوٹتی ہے۔ اور ہر ضرورت کے پیدا ہونے کے وقت اس کی رہنمائی کی طلب ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم اپنی مخصوص حیثیت کی وجہ سے اسی ترتیب اور اسلوب کے ساتھ ہدایات دیتا ہے۔ اس سورت کے مضامین کو دیکھ لیجیے کہ اس کے مضامین درجہ بدرجہ حج کے مضمون تک پہنچے۔ بیت اللہ چونکہ قریشِ مکہ کے قبضے میں تھا۔ اس لیے حج

Marfat.com

ضرورت سے بیت اللہ کی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو جہاد فرض کیا گیا۔ جہاد کی نسبت سے انفاق کی ضرورت پیدا ہوئی تو اس کے احکام دیئے گئے۔ عرب میں چونکہ خمار اور میسر کی مجالس قحط سالی کے زمانے میں انفاق کا بہت بڑا ذریعہ تھیں اس لیے اس کے جواز اور عدمِ جواز کا سوال پیدا ہوا۔ جہاد اور انفاق ہی کے حوالے سے یتیموں کی دیکھ بھال اور ہمدردی کے مسائل پیدا ہوئے اور پھر ان کی ماؤں سے نکاح کرنے کے حوالے سے نکاح اور طلاق کے مسائل کی ضرورت نے جنم لیا اور نکاح اور طلاق اور عدت اور وراثت کے مسائل کا چونکہ بہت حد تک انحصار ایامِ ماہواری میں میاں بیوی کے تعلق اور اس کی حدود پر ہے۔ اس لیے اس سوال کو خود بخود اہمیت مل گئی۔ چنانچہ اس نے ایک سوال کی شکل اختیار کر لی اور اس رکوع میں سب سے پہلے اسی سوال کا جواب دیا گیا۔ لیکن سب سے پہلے اس سوال کی نوعیت کو سمجھ لیا جائے تاکہ اس کے جواب کی اہمیت، افادیت اور وسعت اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے۔ سوال کا پس منظر یہ ہے کہ عورتوں کے ایامِ مخصوص میں تمام مذاہب میں یہ تصور تو پایا جاتا تھا کہ ان دنوں میں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے قربت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس میں بہت حد تک افراط و تفریط بھی پائی جاتی تھی اور بہت دفعہ حدود سے تجاوز بھی کیا جاتا تھا۔ یہود اور ہمارے قریبی ہمسائے ہندوؤں نے مذہبی طور پر یہ یقین کر رکھا تھا کہ عورت ان ایام میں اس حد تک ناپاک ہوتی ہے کہ نہ صرف اس سے قربت نہیں ہونی چاہیے بلکہ عائلی زندگی کا کوئی تعلق بھی اس کے ساتھ باقی نہیں رہنا چاہیے۔ نہ اس کو اپنے قریب بیٹھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، نہ اس کے جسم کو چھوا جا سکتا ہے، نہ وہ کھانے پینے کے برتنوں کو ہاتھ لگا سکتی ہے، نہ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو کھانا پکا کر دے سکتی ہے۔ عورت عام طور پر اس حالت میں تین دن سے لے کر دس دن تک مبتلا رہتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مہینے کا تہائی حصہ بالکل عضوِ معطل بنی رہے۔ دینی معاملات تو ایک طرف رہے۔ اسے دنیوی معاملات بھی انجام دینے کا کوئی حق نہیں۔ گھر میں کسی جانور سے بھی یہ سلوک نہیں کیا جاتا جس کا شکار ان مذاہب میں عورت کو بنا دیا گیا تھا۔ اور عیسائیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان ایام میں بھی کسی طرح کی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان میں بری طرح اباحیت پائی جاتی تھی۔ نہ انہیں گندگی کا احساس تھا، نہ خاتون کی ناموافق طبیعت کا۔ حالانکہ عیسائیت شرعی اعتبار سے تورات کی شریعت کی متبع ہے۔ لیکن سینٹ پال نے ان کو اس بری طرح سے پٹڑی سے اتارا کہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ شریعت کی پابندیوں سے آزادی کا مطلب خواہشات کی علی الاطلاق پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مشرکینِ عرب بھی بہت حد تک اس افراط و تفریط کا شکار تھے۔ وہ اگرچہ اپنے رویے کا انحصار ملت ابراہیم پر رکھتے تھے لیکن حقیقت میں وہ صرف خواہشات کے پرستار تھے۔ اسلام نے ان غیر معتدل رویوں کے درمیان ایک نہایت معتدل اور حکیمانہ اسلوبِ زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ جس سے بہتر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

سوال کا جواب

اب ہم اس آیتِ کریمہ کے ایک ایک ارشاد پر غور کرتے ہیں۔ سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ حیض ایک اذی ہے۔ اذی کا معنی گندگی بھی ہوتا ہے اور بیماری بھی۔ گندگی تو ظاہر ہے خون سے بڑھ کر گندگی کیا ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے عورت ان دنوں میں انتہائی گندہ حالت میں ہوتی ہے اور کوئی سلیم الطبع انسان اس حال میں عورت سے قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن دوسری قابلِ

Marfat.com

ذکر بات یہ ہے کہ وہ ان دنوں میں اس کیفیت میں ہوتی ہے جسے صحت سے زیادہ بیماری کے قریب سمجھنا چاہئے۔ اس کی طبیعت میں اعتدال نہیں رہتا' چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے' جذبات شدت اختیار کر جاتے ہیں' معمولی باتوں پر بھی برہم ہو جاتی ہے' وہ باتیں جو عام دنوں میں آسانی سے گوارا ہو جاتی ہیں' ان دنوں میں انہیں برداشت کرنا عورت کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے جہاں شوہر کو اس کے قریب نہ جانے کی علت سے آگاہ کیا گیا ہے وہیں اسے یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ان دنوں میں اپنی بیوی سے نہایت سازگاری رکھنے کی کوشش کرو۔ اس کی طرف سے اگر کوئی ناموافق بات بھی سامنے آئے تو برداشت کرنے کی کوشش کرو۔ اس کو نارمل سمجھ کر اس سے معتدل اور ہموار ردِ عمل کی توقع مت کرو۔ اگر وہ کسی وقت ناگوار رویے کا اظہار کرے تو اسے اس کی حالت کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز کر دو۔ اس کے گندہ ہونے کے حوالے سے فرمایا گیا کہ اس کی قربت اختیار نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائے۔ اور قربت اختیار نہ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اگلے جملے سے اس کی وضاحت فرما دی گئی۔ یعنی قربت اختیار نہ کرنے کا مطلب میاں بیوی کا رشتہ قائم نہ کرنا ہے' جسے رشتۂ زوجیت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رہے انسانی رشتے ان میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تم صرف اس سے انتہائی جسمانی قربت سے پرہیز کرو۔ لیکن باقی ہر طرح کی قربت اور ہر طرح کے معاملات میں شرکت اور ساتھ اٹھنا بیٹھنا' گھر کا کام کاج کرنا' کھانا پکا کے دینا' بچوں اور شوہر کی خدمت کرنا' اس طرح کی کسی بات پر کوئی پابندی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کے لیے مناسب رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ازواج مطہرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے جو کچھ امت کے حوالے کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں عورتیں نماز' روزے اور قرآن خوانی سے دور رہیں۔ لیکن زندگی کے باقی معاملات میں ان کی شرکت سے کوئی مانع نہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اٹھ بیٹھ سکتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کی حالت میں مسجد میں کھڑے ہو کر اپنے گھر سے کوئی چیز مانگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ کو وہ چیز پکڑانے میں تأمل ہوا کیونکہ وہ ایامِ مخصوص گزار رہی تھیں' تو آپؐ نے فرمایا کہ ''اس ناپاکی کا اثر تمہارے ہاتھوں میں تو نہیں ہے۔'' اسی حالت میں آپؐ نے اپنا سر باہر نکالا آپ کی زوجہ محترمہ نے اس کو دھو دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں مخصوص دنوں میں چونکہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھی اس لیے میں تہجد کے وقت سو رہی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد ادا فرما رہے تھے۔ کمرہ تنگ ہونے کے باعث ایک طرف لیٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ میری احتیاط کے باوجود بھی میرے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ آپؐ کے سامنے آ جاتا۔ چنانچہ جب آپؐ سجدے میں جاتے تو میں اپنے آپ کو سمیٹ لیتی' اور جب آپؐ قیام فرماتے تو میں پاؤں پسار لیتی۔ اس احتیاط کے باوجود بھی سجدہ کرتے ہوئے بعض دفعہ آپ کا ہاتھ مجھ سے چھو جاتا۔ اندازہ فرمائیے کہ نماز کی حالت میں مجھ سے چھو جانے کے باوجود نہ آپؐ کی نماز ٹوٹتی' نہ آپؐ کا وضو ٹوٹتا۔ حضرت عائشہؓ نے ان باتوں کو صرف اس لیے بیان فرمایا تا کہ امت کو ان مسائل کا علم ہو جائے کہ حائضہ عورت ناپاک ہونے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکتی' روزہ نہیں رکھ سکتی' قرآنِ پاک کو چھو نہیں سکتی اور اپنے شوہر سے جسمانی قربت کا تعلق قائم نہیں کر سکتی۔ لیکن زندگی کے باقی معاملات میں معمول کے مطابق دخیل رہتی ہے۔ خاتونِ خانہ کو یہ وقار اور یہ عزت اور انسانیت کے لیے یہ سہولت اسلام نے عطا فرمائی ہے دوسرے مذاہب نے اسے بالکل چھین رکھا ہے۔ شوہر سے یہ دوری اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک بیوی اپنے ایام مخصوص سے فارغ نہیں ہو جاتی اور فارغ ہونے کی علامت یہ ہے کہ آنے والا خون رک جائے۔ یہ خون ہی چونکہ گندگی کا باعث ہے اور اسی وجہ سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسی کو حَتّٰی یَطْهُرْنَ (حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ البتہ فقہاء اس میں احتیاط کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ خون کے بند ہونے پر ایک نماز کا وقت گزر جانا چاہئے تا کہ اطمینان ہو جائے کہ واقعی خون رک گیا ہے۔

Marfat.com

اور اگر ایامِ حیض کی آخری مدت دس دن پورے ہونے کے بعد خون رکے تو مدت کی تکمیل بجائے خود سب سے بڑی احتیاط ہے۔اب میاں بیوی کو ایک دوسرے کے قریب ہونے کی اجازت ہے۔لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ طہارت کا یہ عمل مکمل ہو جائے۔اور طہارت کا عمل ظاہر ہے غسل کرنے کے بعد مکمل ہوگا۔اسے تَطَهَّرْنَ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یَطْهُرْنَ اور تَطَهَّرْنَ کا مفہوم

یَطْهُرْنَ اور تَطَهَّرْنَ معنوی اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔یعنی دونوں کا معنی ہے ''کہ وہ عورتیں پاک ہو جائیں'' لیکن عربی زبان کا ایک اصول ہے کہ کَثْرَۃُ الْاَلْفَاظِ تَدُلُّ عَلٰی کَثْرَۃِ الْمَعْنٰی ''الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔'' تَطَهَّرْنَ میں چونکہ الفاظ زیادہ ہیں اس لیے اس کی طہارت اور صفائی میں بھی یقیناً زیادتی ہوگی۔اور وہ زیادتی یہ ہے کہ خون بند ہو جانے کے بعد وہ عورتیں غسل بھی کر لیں۔اگرچہ خون بند ہو جانے کے بعد میاں بیوی کو قربت کی اجازت ہے لیکن صحیح اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ نہانے دھونے کے بعد میاں بیوی کو ایک دوسرے کی قربت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔اور اس قربت کے بارے میں ایک عجیب بات ارشاد فرمائی۔

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ کی وضاحت

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ط اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ اپنی بیویوں کے پاس آؤ جیسے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔اور دوسری معنی یہ ہے کہ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔''حیث'' جہاں اور جیسے دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں (۱) ''حیث'' سے کیا مراد ہے؟ (۲) حکم دینے سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ان پرائیویٹ معاملات کے حوالے سے کوئی حکم نہیں دیا۔قرآنِ کریم اس کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔اور ان چیزوں کا تعلق چونکہ شرم و حیا سے ہے اس لیے قرآنِ کریم بات کو اس طرح ملفوف انداز میں کہتا ہے جس سے بات سمجھی بھی جا سکتی ہے لیکن اس سے جبینِ حیا پر شکن نہیں آتی۔یہود نے معلوم ہوتا ہے میاں بیوی کی قربت کے لیے بھی کوئی خاص طریقے مقرر کر رکھے تھے۔اسلام نے اس کے تعین کے بجائے میاں بیوی کے فطری ذوق پر اسے چھوڑا ہے۔اور جہاں تک حکم دینے کا تعلق ہے اس سے مراد یہی فطری رہنمائی ہے۔جب ہم کسی چیز کو کے بارے میں کہتے ہیں یہ تو ایک بدیہی بات ہے جسے سمجھانے کی کیا ضرورت ہے تو اصل میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ نے اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں فطری رہنمائی مہیا فرمائی ہے۔اللہ کا یہ فطری الہام درحقیقت اللہ کا حکم ہے جو ایسے تمام معاملات میں انسان اور حیوان کی رہنمائی کرتا ہے۔اور ایسے فطری الہامات کی مخالفت درحقیقت اللہ کے احکام کی مخالفت ہے۔ہم میں سے ہر شخص جب بھی کھانا کھاتا ہے تو منہ کے ذریعے کھاتا ہے حالانکہ قرآن و سنت میں کہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا۔لیکن یہ ایک ایسا حکم ہے جس کی تعمیل پوری نوعِ انسانی کر رہی ہے۔اور یہ حکم انسان کو اس کی فطرت نے دیا ہے۔
جنسی معاملات میں بھی ایسی تمام طبیعتیں جنہیں باہر کے غیر معمولی اثرات نے بگاڑا نہ ہو ان کی فطرت ان کو ٹھیک رہنمائی دیتی ہے کہ میاں بیوی کے انتہائی نازک تعلقات کس اسلوب سے انجام پانے چاہئیں۔اور اگلی آیت کریمہ میں اس آیت کو مزید کھول دیا گیا ہے۔

Marfat.com

مومن کے ظاہر و باطن کی پاکیزگی مطلوب ہے

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کی کوشش کا نام ہے اور تطہر اپنے جسم، اپنے لباس اور اپنے ماحول کو ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ایک مومن کا ظاہر بھی پاک ہو اور اس کا باطن بھی پاک ہو۔ ظاہر پاک ہوگا اور ظاہر کو پاک رکھنے کا احساس اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو جائے گا تو وہ کبھی بھی گندگی کے دنوں میں اپنی بیوی سے قربت انہیں کرے گا۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ طہارت کے ظاہری احساس سے بھی محروم ہے۔ اور جو شخص باطن کی پاکیزگی سے مالا مال ہے اس سے یہ کبھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ قضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کی حدود سے تجاوز کرے۔ اور یہی دونوں باتیں اس آیتِ کریمہ کا حاصل ہیں۔ اور آیت کے آخر میں ان دونوں کو لپیٹ کر کس خوبصورتی سے توجہ دلائی گئی ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ O

(تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں، تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لیے آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا ہے، اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو) (۲۲۳)

زوجین کے تعلق کی حقیقت اور اس کے تقاضے

شوہر کے لیے اس کی بیوی کی حیثیت کیا ہے اور اسے شوہر ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس آیتِ کریمہ میں نہایت جامعیت کے ساتھ اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ بیویاں تمہارے لیے کھیتی کی مانند ہیں۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں بہت ساری باتیں سمیٹ کر کہہ دی گئیں ہیں۔ حرث کا معنی عربی زبان میں کھیتی کے ہیں۔ اور کھیت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کھیتی چاہے اپنے اندر کتنا بھی تنوع رکھتی ہو وہ بہر حال حرث ہے۔ اس لیے ہر طرح کی فصل کو بھی حرث کہا جاتا ہے اور باغ کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی کھیت کی پیداوار ہے۔ بیوی کو کھیتی قرار دے کر شوہر کو اس کی حیثیت بتلائی گئی ہے کہ تم اپنی ازدواجی زندگی کا حاصل یہ مت سمجھنا کہ میرے پیشِ نظر صرف عیش کی زندگی گزارنا ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے ہر وقت اور ہر طرح کی وہ خوشیاں حاصل کرنی ہیں جن کا تعلق انسان کے سفلی جذبات اور جنسی خواہشات سے ہے۔ کیونکہ کوئی بھی کھیتی کا مالک اپنی کھیتی کے بارے میں صرف یہی تصور نہیں رکھتا کہ مجھے باغ کا گھنا سایہ چاہیے' لہلہاتی ہوئی فصلوں کا آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا حسن چاہیے۔ کھیتوں میں اڑتے اور چہچہاتے پرندوں کی مسحور کر دینے والی موسیقی چاہیے۔ یقیناً یہ تمام چیزیں کھیتی کے مالک کا حق ہیں' لیکن کھیتی کے مالک کے پیشِ نظر ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ان ذمہ داریوں کا شدید احساس بھی ہوتا ہے جو اس کھیتی کے حوالے سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اگر کھیتی کا مالک اپنی کھیتی کی ضرورتوں کا خیال نہیں

Marfat.com

کرتا، وہاں مناسب وقت پر ہل نہیں چلاتا، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی نہیں دیتا اور موسمی آفات سے بچانے کی تمام تدبیریں بروئے کار نہیں لاتا، اور کھیتی کو نقصان پہنچانے والے تمام چرند پرند اور کھیتی کے دشمنوں سے اس کی حفاظت نہیں کرتا تو کھیتی کے مالک کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ یہ کھیتی میری ہے۔ یہ تو اس کے مالک ہونے کی حیثیت سے لازمی تقاضے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا بہرصورت ضروری ہیں۔ شوہر کو بھی یہی بتایا جارہا ہے کہ تم اپنی بیوی سے ہر طرح کی خوشیاں تو حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن اس سلسلے کی جو ذمہ داریاں ہیں تمہیں اگر ان کا احساس نہیں تو تم میاں بیوی کے حقیقی تعلق سے بے بہرہ ہو۔

مزید فرمایا کہ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (کہ تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) اس جملے پر غور کیجئے۔ اس میں نہایت خوبصورتی سے متذکرہ بالا دونوں باتوں کی طرف دوسرے پہلو سے اشارہ فرمایا گیا۔ اَنّٰى شِئْتُمْ سے ازدواجی زندگی کی آزادی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ تم اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے میں ہر طرح آزاد ہو۔ تمہاری خلوت اور تنہائی پر فطرت کی چند پابندیوں کے سوا کوئی پابندی نہیں۔ تم جب اپنی بیوی کے ساتھ تنہا ہوتے ہو تو ہر طرح کی اخلاقی پابندیاں اپنا دامن سمیٹ لیتی ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لباس کی شکل اختیار کر جاتے ہو۔ تمہارے دونوں وجود ایک وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ تم عیش و سرور کے اس نشیمن میں ایک ایسی آزادی سے ہمکنار ہوتے ہو جس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ یہ آزادیاں تمہیں اس لیے دی گئی ہیں تاکہ تمہارے عیش و نشاط اور سکون میں کوئی چیز حائل نہ ہونے پائے۔ لیکن تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ تم جس باغ سے عیش و نشاط سمیٹنا چاہتے ہو وہ بہرصورت باغ ہے کوئی جنگل نہیں۔ وہ ایک کھیتی ہے کوئی ویرانہ نہیں۔ تم اس کھیتی کے کسان اور کاشتکار ہو۔ تم اس کے اجاڑنے اور پامال کرنے والے نہیں ہو۔ جب تک یہ احساس تمہیں دامن گیر رہے گا کہ تم اپنی کھیتی میں ہو، جنگل یا ویرانے میں نہیں تو تم یقیناً ان تصورات سے بیگانہ نہیں ہو سکتے کہ ہر فصل کا ایک موسم ہوتا ہے اور تخم ریزی کا ایک وقت ہوتا ہے۔ نہ بے موسم فصلیں اگتی ہیں اور نہ بے وقت تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ تخم ریزی جب بھی ہوتی ہے وہ کھیتی میں ہوتی ہے، کھیتی سے باہر نہیں۔ اور تخم ریزی سے مقصود تخم کا ضیاع نہیں ہوتا، بلکہ اس سے پیداوار حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

بیویوں کے حرث ہونے نے خاندانی منصوبہ بندی کی جڑ کاٹ دی ہے

مختصر یہ کہ اس ایک جملے نے انسان کی ازدواجی زندگی کے احساسات اور اہداف کو ایک ایسی نہج دے دی ہے اور اسلامی ازدواج کا پورا فلسفہ اس طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ اس سے زیادہ فصاحت و بلاغت اور حسن بیان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صاف صاف بتا دیا کہ تمہاری بیوی کی حیثیت چونکہ حرث اور کھیتی کی ہے اس لیے اس سے نکاح کا مقصد صرف لذت طلبی نہیں، بلکہ حصولِ اولاد ہے۔ اس تصور نے خاندانی منصوبہ بندی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔ کسی بھی کسان سے اس کی کھیتی کے بارے میں اگر تبادلۂ خیال کریں تو کسان آپ سے ایسے تمام پہلوؤں پر بات کرے گا جس سے بہتر سے بہتر فصل حاصل کرنے میں مدد ملے۔ اور اگر کوئی شخص اسے یہ مشورہ دینا چاہے کہ میں تمہیں ایک ایسی تجویز بتاتا ہوں جس کے بعد تمہاری زمین یا تو کم سے کم فصل دے گی یا بالکل بنجر ہو جائے گی۔ تو کسان ایسے شخص سے بات کرنے سے انکار کر دے گا۔ لیکن ہمارے یہاں اس بات کو علم و دانش کی معراج سمجھ لیا گیا ہے کہ عورت جسے بیوی ہونے کی حیثیت سے اللہ نے حرث اور کھیتی قرار دیا ہے ہم اس سے لطف و لذت تو چاہتے ہیں لیکن ہم اسے زیادہ بارآور اور زیادہ مثمر نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہ صحیح ہے کہ حالات کا دباؤ بعض

Marfat.com

دفعہ کسی شخص کو بچوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔لیکن ہمارے علم ودانش کا یہی تو المیہ ہے کہ ہم انفرادی ضرورتوں اور قوم کے اجتماعی تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔اور نہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ کسی ایک شخص کے حالات کو دیکھ کر جو اسے رعائت دی جا سکتی ہے وہی رعائت قومی حیثیت میں اور قانون کی شکل میں تجویز نہیں کی جا سکتی۔اور جو شخص ان دونوں باتوں میں فرق نہیں سمجھتا اسے اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنی چاہیے۔ چنانچہ شریعت نے افراد کو خاص حالات میں بعض سہولتیں دی ہیں اور بعض پابندیوں کی اجازت عطا فرمائی ہے۔اس کے لیے اہلِ علم سے راہنمائی لی جا سکتی ہے۔لیکن کسی قوم کو خاندانی منصوبہ بندی پر لگا دینا اور اسلام کے ازدواجی فلسفے کو تباہ کر کے رکھ دینا اور عقیدۂ توحید اور عقیدۂ توکل کو مفلوج کر دینا اور ہمسایہ قوموں کے حوالے سے اپنی افرادی ضرورت کا صحیح اندازہ نہ کر سکنا' یہ دل ودماغ کا وہ کوڑھ ہے جس کا علاج کرنا ازبس ضروری ہے۔

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کے ارشاد سے اسی بات کو آگے بڑھایا گیا ہے کہ ازدواجی تعلق کے صحیح احساسات کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تم نسلِ انسانی کے قافلے کو آگے بڑھنے میں مدد دو۔تم اپنے آباؤ اجداد کی انسانی میراث ہو۔یہی میراث آگے چلنی چاہیے تاکہ انسانی قافلہ کہیں رکنے نہ پائے۔لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم جو نسل مستقبل کے حوالے کرو اسے تربیت یافتہ اور اخلاق سے مرصع ہونا چاہیے تاکہ تمہارے بعد تمہاری اولاد صرف تمہاری جسمانی وارث نہ ہو بلکہ تمہاری اخلاقی خصوصیات کو بھی آگے منتقل کرے۔اور یہی حقیقت میں وہ جوہر ہے جو نسل در نسل انسانی اخلاقی خصوصیات کو باقی رکھتا ہے اور اسی سے قومیں توانا ہوتی ہیں اور شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ اور اللہ سے ڈرو اپنی اولاد کی تربیت میں کسی طرح کی کمزوری نہ دکھاؤ۔ اور خوب جان لو کہ تمہیں اپنے رب سے ملنا ہے اس کے حضور حاضری دینی ہے۔وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں اور اولاد سے متعلق بھی تم سے جواب طلبی کرے گا۔ اگر تم نے اپنا فرض ٹھیک ٹھیک انجام نہیں دیا تو اس وقت جواب دہی بہت مشکل ہو جائے گی۔اور آخر میں فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ایمان اور یقین لانے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات پر پوری طرح یقین رکھتے ہیں اور اسے اپنا عمل بناتے ہیں وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں سرخرو فرمائے گا۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

(اللہ کو اپنی قسموں کی رکاوٹ نہ بناؤ کہ تم احسان نہیں کرو گے یا حدودِ الٰہی کا احترام نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں پکڑے گا تمہاری لایعنی قسموں پر۔لیکن تمہیں پکڑے گا ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے۔اللہ بہت بخشنے والا بردبار ہے) (۲۲۴ تا ۲۲۵)

Marfat.com

معاشرے میں قَسم کی اہمیت

انسانی معاشرے میں معاشرتی ' سماجی اور سیاسی معاملات میں قَسم کی ہمیشہ ضرورت پڑتی ہے۔ ہر معاشرے میں جس نام کی قسم کھائی جاتی ہے اس کا خاص احترام ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں رہنے والے لوگ حتیٰ الامکان غلط بات کے لیے اس نام کو استعمال کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جب بھی کسی معاملے میں اعتماد پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے یا کسی شبہے کے ازالے کا موقعہ ہوتا ہے یا کسی معاہدے کو استحکام دینا مقصود ہوتا ہے تو عموماً قَسم سے اس ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔ یہاں جن مسائل کا ذکر ہو رہا ہے ان میں بھی بسا اوقات کبھی بیوی کو قسم دینے کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی شوہر کو۔ خاص طور پر آگے جو احکام ذکر کیے جا رہے ہیں جن میں بہت اہم ایلاء کا معاملہ ہے۔ ان میں چونکہ دارومدار ہی قَسم پر ہے اس لیے ان مسائل کا ذکر کرنے سے پہلے پروردگار نے یہ مناسب سمجھا کہ قَسم کی اہمیت کو واضح کر دیا جائے۔

عُـرْضَةً کا معنی ہے حاجز' یعنی رکاوٹ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ ایسے لوگ تھے اور ہر معاشرے میں ہمیشہ ایسے لوگ رہے ہیں' جو کسی وجہ سے کسی نیک کام کو چھوڑ دینے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس پر اللہ کے نام کی قَسم کھاتے ہیں کہ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا مثلاً ماں باپ سے بگڑ گئے تو کہا آئندہ ان کی خدمت نہیں کروں گا۔ بھائی سے ناراض ہو گئے تو اس سے قطع تعلق کرنے کی قَسم کھالی یا کسی ادارے کی مدد کر رہے تھے کسی واقعے سے مشتعل ہو کر اس ادارے کی مدد نہ کرنے پر قَسم کھالی۔ اور پھر جب کوئی انہیں کہتا کہ تم نے ایک نیک کام سے ہاتھ کھینچ کر بہت غلط فیصلہ کیا تو وہ جواب میں یہ عذر کرتے کہ فیصلہ غلط ہی سہی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اب تو میں قَسم کھا چکا ہوں۔ ایسے لوگوں پر دو حوالوں سے تنقید فرمائی گئی ہے۔

قَسم پر دو حوالوں سے تنقید

ایک تو یہ کہ تم بھلائی کے کام نہ کرنے پر اللہ کی قَسم کھا کر گویا اللہ کے نام کو اپنے اور بھلائی کے درمیان ایک رکاوٹ کے طور پر پیش کرتے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس اللہ نے بھلائی کو وجود بخشا اور انسانوں کو بھلائی کرنے کا پابند ٹھہرایا تم اسی کے نام کو بھلائی نہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہو اس سے زیادہ اللہ کے نام کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اللہ کی ذات یا اس کے نام کی توہین اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسے مجرم کو نہ اللہ کبھی معاف کرے گا اور نہ اللہ کے ماننے والے کبھی معاف کرتے ہیں۔ تنقید کا دوسرا حوالہ یہ ہے کہ اللہ نے بھلائی اور نیکی کے تین راستے کھولے ہیں۔ ایک کو ''بِر'' کہا گیا ہے' دوسرے کو ''تقویٰ'' اور تیسرے کو ''اصلاح بین الناس''۔ یہی تینوں باتیں پورے دین سے عبارت ہیں۔ ''بِر'' کا لفظ ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین' رشتہ داروں' مسکینوں' یتیموں اور دوسرے مستحقین کے حقوق سے ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ تمام حقوق العباد ''بِر'' کے مفہوم میں شامل ہیں اور ''تقویٰ'' ان نیکیوں پر بولا جاتا ہے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ اس لحاظ سے تمام عبادات' تمام نذر و نیاز اور منتوں کے معاملات' تمام قربانیاں اور ایک پہلو سے تمام معاہدات اس میں شامل ہیں۔ اور ''اصلاح بین الناس'' سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو انسانوں کو انسانوں سے جوڑنے' انسانوں کے کام آنے' انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے اور انسانوں کا بھلا چاہنے سے متعلق ہیں۔ اب آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر لوگ ان تمام نیکیوں میں سے کسی ایک نیکی یا ان تمام نیکیوں کو نہ کرنے کی قَسم کھا لیتے ہیں تو پھر انسانیت کے دامن میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قَسم کھانے والوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ کی ذات نہ سنتی ہے نہ جانتی

Marfat.com

ہے۔ وہ اگر اللہ کو اتنا بے خبر نہ جانتے یا اگر ان کا ایمان اتنا کمزور نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسی نیکیوں سے رکنے کا تصور نہ کرتے اور اللہ کے نام کو درمیان میں لانے کی تو کبھی جسارت بھی نہ کرتے۔ ایسی قسموں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذا حلفت علی یمین فرأیت غیرھا خیرا منھا فات الذی ھو خیر و کفرعن یمینک ''اگر تم کسی بات کی قسم کھا لو اور پھر اس کے بعد دیکھو کہ اس سے دوسرا کام نیک معلوم ہوتا ہے تو وہ نیک کام کر لو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو'' یعنی دین کا اصل مقصد اگر بھلائیوں کو اختیار کرنا اور انہیں فروغ دینا ہے تو پھر قسم کو ان کے لیے رکاوٹ نہ بناؤ۔ اگر تم غلطی سے ایسا کر چکے ہو تو قسم توڑ ڈالو اور قسم کا کفارہ دے دو اور قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اوسط درجے کا کھانا یا دس مسکینوں کو کپڑے بنا کے دو اور اگر اس کے متحمل نہیں ہو سکتے ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھو۔

قسم کی اقسام

دوسری آیتِ کریمہ میں قسم کی اقسام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کون سی قسم ہے جس پر اللہ مواخذہ نہیں فرماتے اور وہ کونسی قسم ہے جس پر مواخذہ کیا جائے گا۔

ا۔ یمینِ لغو

جس قسم پر مواخذہ نہیں ہو گا اسے ''یمین لغو'' کا نام دیا گیا ہے۔ یمین قسم کو کہتے ہیں۔ اس کا معنی ہو گا لغو قسم۔ مراد اس سے یہ ہے کہ بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ تکیہ کلام کے طور پر بات بات پر قسم کھاتے رہتے ہیں' لیکن ان کا ارادہ قسم کھانے کا نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ میں قسم کے الفاظ ادا کر رہا ہوں۔ ایسی قسم چونکہ دل کے ارادے کے بغیر کھائی جاتی ہے' اس لیے اسے لغو قسم کہا جاتا ہے۔ مزید برآں ایسی قسم کو بھی لغو کہا جاتا ہے کہ قسم تو اس نے اپنے ارادے سے کھائی' لیکن اس کا گمان یہ ہے کہ میں جس واقعے کے بارے میں خبر دے رہا ہوں وہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ حالانکہ وہ واقعہ صحیح نہیں ہوتا۔ تو چونکہ اس نے قصداً جھوٹ نہیں بولا۔ مثلاً وہ اپنے گمان میں یہ سمجھتا ہے کہ زید آ گیا ہے اور وہ حلفاً اس کے آنے کی خبر دے دیتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ زید نہیں آیا۔ اس لیے ایسی قسم کو بھی لغو قسم کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے منہ سے ایک ایسی قسم نکل گئی جس کا وہ ارادہ نہیں رکھتا تھا' کہنا کچھ اور چاہتا تھا اور منہ سے کچھ اور نکل گیا اس کا شمار بھی لغو قسم میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قسم پر مواخذہ نہیں فرماتے۔ لیکن یمین لغو کا لفظ ہمیں ایک اور اہم اور نازک بات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے' لیکن اللہ تعالیٰ کا اس قسم کو لغو قرار دینا یقیناً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پروردگار اس فعل اور رویے کو پسند نہیں فرماتے۔ کیونکہ کوئی سا لغو کام بھی اللہ کو پسند نہیں۔ اور ایک مومن کی جو صفات گنوائی گئی ہیں' اس میں بھی بطورِ خاص اس بات کا ذکر فرمایا ہے والذین ھم عن اللغو معرضون ''کہ فلاح پانے والے مومن وہ ہیں جو لغو سے اعراض کرنے والے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اس کی زبان سے لغویات کا صدور ہو۔ چاہے اس کا تعلق زبان کی بے احتیاطی سے ہو اور چاہے اس کا تعلق معاملات میں لاپرواہی سے ہو۔ ہر لایعنی بات کو لغو کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر ایسی بات جس کا تعلق نہ دنیا کے بھلے کاموں سے ہو نہ آخرت کے کاموں سے۔ ایسے لایعنی کاموں کو کرنا ایک مومن کو اس لیے زیب نہیں دیتا کیونکہ اس سے اسلام کا حسن دھندلا کر رہ جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ ''ایک آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر لایعنی بات کو چھوڑ دے'' لغو قسم بھی چونکہ ایسے ہی لایعنی کاموں میں سے ہے' اس لیے ایک مومن کو اس کے ارتکاب سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

Marfat.com

۲۔ یمینِ غموس

قَسم کی دوسری قسم ''یمین غموس'' کہلاتی ہے۔اس سے مراد وہ قَسم ہے جسے قَسم کھانے والا خود جھوٹا سمجھتا ہو لیکن پھر بھی قَسم کھاتا ہو۔ یا ماضی کے کسی واقعے کے بارے میں قَسم کھا کر کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا' حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا ہوا تھا۔ایسی قَسم پر کفارہ تو نہیں ہوتا' لیکن اس پر گناہ ہوتا ہے۔گناہ ہونے کے لحاظ سے یقیناً آخرت میں اس پر مواخذہ ہوگا۔

۳۔ یمینِ منعقدہ

قَسم کی تیسری قسم ''یمین منعقدہ'' ہے۔یہ وہ قَسم ہے جسے عام طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔آدمی کسی سے حلفاً وعدہ کرتا ہے میں تمہیں یہ چیز دوں گا اور پھر نہیں دیتا۔اس صورت میں یہ قَسم ٹوٹ جائے گی یا مثلاً وہ جانتا ہے کہ فلاں شخص جھوٹا دعویٰ پیش کر رہا ہے لیکن وہ پھر بھی حلفاً اس کی تائید کرتا ہے۔مختصر یہ کہ ہر وہ قَسم جس میں دل کے ارادے سے جھوٹ بولا جائے یا قَسم کھاتے ہوئے تو سچی بات کہی جائے لیکن بعد میں اسے پورا نہ کیا جائے۔ایسی قَسم پر کفارہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ بھی فرمائے گا۔اور کفارے کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قَسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے' اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے) (۲۲۶ تا ۲۲۷)

ایلاء کی وضاحت

قَسم کی وضاحت کے بعد اب ایک ایسے شرعی مسئلے کو بیان کیا جا رہا ہے جس کا زیادہ تر تعلق قَسم سے ہے۔اسے جاہلیت کے زمانے میں بھی ایلاء کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اسلامی شریعت نے بھی اسی نام کو باقی رکھا ہے۔عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان میں کبھی میاں بیوی میں بگاڑ پیدا ہوتا اور شوہر اپنی بیوی کو چھوڑنا بھی نہ چاہتا تو وہ عموماً اس سے ترکِ تعلق کا اعلان کر دیتا' اپنی تنہائی سے اسے خارج کر دیتا' گھر کے کام کاج اس سے لیے جاتے' لیکن اس کی بیوی کی حیثیت اس طرح ختم کر دی جاتی کہ وہ گھر میں صرف ایک نوکرانی بن کر رہ جاتی۔ایک خاتونِ خانہ جو کل تک گھر کی ملکہ تھی اب یک لخت گھر کی نوکرانی بن کر رہ جائے' شوہر اسے قریب نہ آنے دے اور وہ ہر طرح اپنی توجہ سے اسے محروم کر دے تو یہ ایک ایسی سزا ہے جو شائد طلاق سے بھی بڑھ کر ہے۔عربوں کا عام طور پر طریقہ یہ تھا کہ وہ قَسم کھا لیتے تھے کہ میں چار مہینے تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جاؤں گا اور کبھی وہ مدت معین کیے بغیر بیوی کو حقوقِ زوجیت سے محروم کر دیتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت مقرر کر دیتے۔ان تمام صورتوں کو ایلاء کے نام سے ہی یاد کیا جاتا تھا۔اور اس میں ہمیشہ قَسم کھا کر ترکِ تعلق کو پختہ کر دیا جاتا تھا۔اور قرآنِ کریم نے بھی اس آیتِ کریمہ میں ''قَسم کھا لینے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس لیے فقہاءِ حنفیہ اور شافعیہ نے اس آیت کا منشاء یہ سمجھا ہے

Marfat.com

کہ جہاں شوہر بیوی سے میاں بیوی کے تعلقات ختم کرنے کی قسم کھائے صرف اسی کو ایلاء کا نام دیا جائے گا اور اس پر ایلاء کا اطلاق ہوگا۔ لیکن اگر وہ قسم کھائے بغیر بیوی سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے تو پھر چاہے اس پر کتنی طویل مدت گزر جائے اس پر ایلاء کے حکم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ مگر فقہاءِ مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدت ہے۔ امام احمد بھی اسی کی تائید میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قسم سے اس ترکِ تعلق کو ایک پختگی مل جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک ترکِ تعلق سے خاتونِ خانہ کو اذیت پہنچنے کی بات ہے اس کا تو قسم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیتِ کریمہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت کے لیے چار مہینے سے زیادہ شوہر کے بغیر رہنا شاید آسان نہیں۔ اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ایک خاتونِ خانہ کو رات کی تنہائی میں آہیں کھینچتے ہوئے سنا تھا تو آپؓ نے تحقیق سے معلوم کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ شادی کے جلدی بعد اس خاتون کا شوہر جہاد پر چلا گیا' کئی مہینے گزر گئے ہیں وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ رات کو آپؓ حضرتِ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو آپؓ کی صاحبزادی بھی ہیں اور ام المؤمنین بھی' ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے پوچھا کہ شریعت میں ہر بات پوچھی جا سکتی ہے اس لیے آپ مجھے بتایئے کہ ایک نوجوان لڑکی اپنے شوہر سے کتنا عرصہ جدا رہ سکتی ہے؟ انہوں نے کہا زیادہ سے زیادہ چار مہینے۔ یعنی وہی مدت جو قرآنِ کریم نے ایلاء کے سلسلے میں ٹھہرائی ہے۔ اس لیے کوئی آدمی اگر قسم نہیں کھاتا لیکن اتنی طویل مدت تک اپنی بیوی کو علیحدگی کے عذاب میں مبتلا رکھتا ہے تو فقہی تقاضے سر آنکھوں پر اور احناف اور شوافع کا مسلک بھی بہت مضبوط سہی لیکن اس مشکل کا حل نکالنا بھی اسلامی شریعت کی ذمہ داری ہے۔ اور آج کے ذمہ داروں کو اس صورتِ حال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہزاروں لوگ مختلف دنیوی حوالوں سے بیرونِ ملک جاتے ہیں اور مہینوں نہیں' سالوں تک لوٹ کر نہیں آتے اور پیچھے ان کی جوان بیویاں انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ دولت کی محبت اپنی جگہ لیکن نسوانی جذبات کی یہ پامالی اور بعض دفعہ اس کے نتیجے میں نکلنے والے تلخ نتائج' آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تمام باتوں پر غور کرتے ہوئے حکم جاری فرمایا کہ ہر شادی شدہ فوجی کو چار مہینے گزرنے سے پہلے گھر آنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں ناگزیر حالات کے علاوہ اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کھانے والا شوہر اگر تو چار مہینے کی مدت گذرنے سے پہلے اپنی قسم توڑ دے اور اپنی بیوی سے تعلقات زَن وشَو قائم کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کرنے والے اور مہربان ہیں۔ بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ایسے شخص پر کفارہ نہیں ہوگا۔ لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے مہربان ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو کفارہ بھی معاف ہو جائے گا بلکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ترکِ تعلق کے دوران خاتونِ خانہ سے جو زیادتی ہوئی ہے اور اگر اس کے ناگوار رویے سے شوہر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا تو شوہر سے جو زیادتی ہوئی ہے دونوں کو اللہ معاف فرما دے گا۔ لیکن اگر شوہر چار مہینے کے اندر رجوع نہیں کرتا اور وہ اپنے ترکِ تعلق کے فیصلے پر قائم رہتا ہے تو احناف کے نزدیک اس عورت کو قطعی طلاق واقع ہو جائے گی۔ یعنی یہ طلاق' طلاقِ بائنہ ہوگی۔ اور اب شوہر نکاح کیے بغیر اپنی بیوی سے رجوع نہیں کر سکتا۔ ہاں اس بات کی اجازت باقی رہتی ہے کہ اگر دونوں میاں بیوی دوبارہ مل بیٹھنے کا فیصلہ کر لیں تو وہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں حلالہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدت گزرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا۔ اور حاکم عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت سے رجوع کرے اور یا اسے طلاق دے۔

Marfat.com

آخر آیت میں فرمایا فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ''بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے'' میاں بیوی آپس میں جو کچھ کہتے رہے اللہ برابر سنتا رہا۔اور جو کچھ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے باندھتے رہے وہ ان سے بھی باخبر رہا۔اور اگر دونوں میں سے کسی ایک نے ناروا باتیں کہی ہیں تو اللہ کی سماعت میں ہیں۔اور اگر ظلماً زیادتیاں کی ہیں تو وہ بھی اللہ کے علم سے دور نہیں۔اس لیے یکجائی کے بعد بھی دونوں کو توبہ کرنی چاہئے اور اپنی اپنی غلطیوں کی اللہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۠

(اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں۔اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں۔اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے) (۲۲۸)

مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے

اگر ایلاء کے نتیجے میں یا کسی اور سبب سے شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو یہود کی طرح اسلام نے عورت کو اسی وقت یا چند دنوں بعد نکاحِ ثانی کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ حکم دیا کہ ایسی خاتون یا ایسی خواتین کو تین قروء تک انتظار کرنا چاہئے اور ان پر پابندی ہے کہ وہ اس مدت میں دوسرے نکاح سے رکی رہیں۔ قُرُوْءٌ ، قَرْءٌ کی جمع ہے۔اہلِ لغت نے اس کے معنی کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔اسی لیے فقہاء میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔بعض نے اس کے معنی حیض کے لیے ہیں اور بعض نے طہر کے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے مادہ اور مشتقات کو دیکھتے ہوئے حیض ہی کے معنیٰ کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔اور سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے بھی اسی معنیٰ کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔کیونکہ مطلقہ عورتوں کو دوسرے نکاح سے توقف کرنے کا حکم دینے کی بڑی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ تو نہیں؟ اس لحاظ سے اس کا معنی حیض ہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ حیض ہی سے ہوتا ہے۔

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ

اسلام میں میاں بیوی کے تعلقات میں بگاڑ کی صورت میں طلاق کی اجازت تو دی گئی ہے' لیکن ساتھ ہی اسے اللہ کے یہاں مبغوض ترین فعل قرار دیا گیا ہے۔کیونکہ میاں بیوی کے تعلق سے ہی ایک گھر وجود میں آتا ہے' نئی نسل جنم لیتی ہے' ایک گھر کی مضبوطی سے خاندان کو قوت ملتی ہے اور ایک صالح اور مضبوط خاندان اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد بنتا ہے۔میاں بیوی کے تعلق کی خرابی وہ پہلی اینٹ ہے جس کے

Marfat.com

ہل جانے سے اسلام کے سیاسی نظام کو ضعف پہنچتا ہے۔ اور وہ معاشرہ جو مختلف النوع انسانوں سے وجود میں آتا ہے اس کی بقا اور استواری کا دارومدار معاشرے کے اجزاء کے باہمی مضبوط تعلق پر ہے۔ جب ایک گھر میں اس تعلق میں دراڑیں پڑنا شروع ہوتی ہیں تو اس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ میاں بیوی میں بگاڑ میاں اور بیوی کے خاندانوں کو متاثر کرتا ہے۔ دو خاندانوں کی تلخیاں آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ کتنے خاندانوں کو متاثر کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اس کی بنیاد چونکہ طلاق سے وجود میں آتی ہے اس لیے اسلام نہایت ناگواری سے اسے برداشت کرتا ہے' لیکن تاحدِ آخر اس کی کوشش یہ ہے کہ اس تعلق کو بگاڑ سے محفوظ رکھا جائے۔ اور اگر بگاڑ پیدا ہو ہی جائے تو اسے کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جب کسی طرح بھی اصلاح ممکن نہ ہو تو پھر طلاق کی اجازت دے کر دونوں کے لیے نئے مواقع کھول دیے جائیں۔

عدت گزرنے سے پہلے عقد ثانی کی ممانعت کی حکمت

اس تعلق کو ٹوٹنے سے بچانے اور اس میں آئی ہوئی دراڑوں کو درست کرنے کے لیے تین حیضوں تک بیوی کو دوسرے نکاح سے روکا گیا ہے۔ اس مدت کو ''عدت'' کہتے ہیں۔ عدت کا یہ وقت جو تقریباً تین مہینوں تک پھیل جاتا ہے دونوں کو الگ الگ رہ کر سوچنے کا موقع دے گا کہ کیا ہم اس علیحدگی کو روک نہیں سکتے؟ اگر ان میں ذرا بھی بھلائی ہوئی یا ان کے خاندانوں نے اپنا کردار ادا کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں مل بیٹھنے کے لیے تیار نہ ہوں۔

اگر فرض کیجئے اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو عدت کے اختتام تک یہ بات تو یقیناً معلوم ہو جائے گی کہ مطلقہ خاتون حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر وہ حاملہ ہے اور خاموشی سے دوسرے سے نکاح کر لیتی ہے اور دوسرے شوہر کو بچے کی پیدائش کے بعد پتہ چلے کہ یہ بچہ میرا تو نہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد میاں بیوی کے تعلق کی نوعیت کیا ہوگی اور بچے کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس لیے اسلام اس بات پر انتہائی زور دیتا ہے کہ عدت کے دوران عقدِ ثانی کی نوبت کسی صورت نہیں آنی چاہئے۔ یہ سراسر حرام ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا کہ جن عورتوں کو طلاق ہو جائے اگر وہ حاملہ ہوں تو وہ اسے ہرگز نہ چھپائیں۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو انہیں خوب معلوم ہے کہ آخرت کے دن اللہ کے سامنے حاضری ہوگی۔ وہ جب یہ سوال کرے گا کہ تم نے پہلے شوہر کے بچے کو دوسرے شوہر کے سر کیوں منڈھ دیا۔ تو سوچ لو اس وقت تمہارا کیا جواب ہوگا؟ اور اس کے بعد تمہارا جو انجام ہوگا اس سے کیسے بچ سکو گی؟

طلاق دینے کا صحیح طریقہ

یہاں ایک بات یاد رکھئے کہ طلاق کی اجازت ضرور دی گئی ہے' لیکن ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا ہے کہ طلاق اگر دینا ناگزیر ہی ہو جائے تو پھر صحیح طریقہ سے طلاق دو۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ''طہر'' (پاکیزگی) کی حالت میں ایک طلاقِ رجعی دی جائے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اسی پر اکتفا کیا جائے۔ کیونکہ عدت گزرنے کے بعد بیوی ایک طلاق سے بھی شوہر کے نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اور اگر ایک طلاق دینے سے اشتعال ختم ہونے میں نہ آئے تو پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق دی جائے۔ اور اس کے بعد تیسری طلاق کا بالکل ارادہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ دو طلاقوں تک بیوی سے رجوع کرنے کی بھی اجازت ہے اور عدت گزرنے کے بعد نکاح کرنے کی بھی۔ لیکن اگر تیسرے طہر میں تیسری طلاق بھی دے دی تو اب دوبارہ یکجائی کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ اسی طرح اگر تینوں طلاقیں اکٹھی دے دیں تو یاد رکھئے کہ تین طلاقیں اکٹھی دینا سخت گناہ کی

Marfat.com

بات ہے۔حضرت عمر فاروق ایسے شخص کو درے لگواتے تھے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ تینوں طلاقیں اکٹھی بھی واقع ہو جاتی ہیں۔امت میں بجز اہلحدیث حضرات کے اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کرتا۔ ہماری فقہ کے چاروں امام اس بارے میں متفق ہیں۔اس لیے ہمارے یہاں جو ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دینے کا رواج ہو گیا ہے اس بارے میں اللہ سے ڈرنا چاہئے اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس کے بعد گھر برباد ہو جائے گا۔ کیونکہ میاں بیوی دوبارہ نکاح نہیں کر سکیں گے اور دوسرے نکاح کے لیے حلالہ کی جو تجویز ہے اور جس طرح آج کل اس پر عمل ہو رہا ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے ایک نکاح ہوتا ہے اور پھر خاموشی سے طلاق لے کر دوسرا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر زناکاری ہے۔اور اللہ کے رسولؐ نے اس پر لعنت فرمائی ہے۔ (اگلے رکوع میں کسی حد تک یہ بحث آئے گی ان شاءاللہ)

شوہر کو عدت کے دوران رجوع کا حق

عدت کے دوران سوچ بچار کے بعد شوہر اگر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں نے طلاق دے کر غلطی کی ہے، مجھے بہرصورت اس تعلق کو باقی رکھنا چاہئے اور اسی میں میری اور خاندان کی بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شوہر کو عدت کے دوران رجوع کرنے کا حق ہے۔ جب تک اس کی بیوی تیسرے حیض سے فارغ ہو کر غسل نہیں کر لیتی اس وقت تک شوہر کا یہ حق باقی رہتا ہے۔ حضرت ابوبکر، عمر، علی، ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری، ابن مسعود اور بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہی رائے ہے۔ اور فقہاء حنفیہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ لیکن بعض صحابہ جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ تیسرا حیض آتے ہی شوہر کا حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ فقہاءِ مالکیہ وشافعیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ پہلی رائے زیادہ مستحکم معلوم ہوتی ہے لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تیسری بار حیض آنے سے پہلے پہلے شوہر کو رجوع کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔

زوجین کے تعلقات میں لگاؤ کا اصلی سبب

میاں بیوی کے تعلقات میں خرابی اس وقت شروع ہوتی ہے جب دونوں اپنی اپنی حدود سے نکل جاتے ہیں۔ بیوی نشوز کا راستہ اختیار کرتی ہے اور شوہر ظلم کا۔ نتیجہ اس کا گھر کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وہ خرابی ہے جو شوہر کو طلاق پر آمادہ کرتی ہے اور وہ بیوی سے جان چھڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بیوی شوہر سے بیزار ہو جاتی ہے۔ اس لیے آیتِ کریمہ کے آخر میں اسی بنیادی خرابی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ شوہروں کو ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حقوق صرف انہیں کے ہیں اور بیویاں تو گھر میں صرف ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لیے آتی ہیں اس لیے فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''اور ان عورتوں کے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں'' یعنی عورتیں صرف ذمہ داریوں سے ہی گراں بار نہیں ہیں، بلکہ اللہ نے شوہروں پر ان کے حقوق بھی رکھے ہیں۔ جس طرح شوہروں کے حقوق بیویوں کے ذمے دستور کا حصہ ہیں اسی طرح بیویوں کے حقوق شوہروں کے ذمے بھی دستور کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی پامالی نہیں کی جا سکتی اور کسی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیویوں کا تعلق چونکہ صنفِ نازک سے ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار ان کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید فرمائی ہے۔ اور یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم ان کے حقوق کو پامال کر کے ان پر ظلم کرو گے

Marfat.com

تو قیامت کے دن میں خود تمہارے خلاف استغاثہ دائر کروں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے اللہ کے نام پر بیویوں کو اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ تو جب تم ان پر ظلم کرتے ہو تو اللہ کی ضمانت کو چیلنج کرتے ہو۔ چنانچہ اگر شوہر بیویوں کے حقوق کا احساس کریں اور اس بات سے ڈریں کہ بیویوں پر ظلم قیامت کے دن انہیں بڑا مہنگا پڑے گا۔ تو گھر میں کم از کم شوہروں کی جانب سے کسی ابتری کا اندیشہ نہیں رہتا۔ لیکن جس طرح شوہر کے ظلم سے گھر برباد ہوتا ہے اور بیوی ظلم کی تصویر بن کے رہ جاتی ہے اسی طرح بیوی کا اپنی حدود سے نکل جانا اور شوہر کے شوہر ہونے کے حق کو چیلنج کرنا شروع کر دینا اور اپنے آپ کو حقوق اور احترام میں شوہر کے برابر سمجھنا اور شوہر کے حقِ فضیلت سے انکار کر دینا یہ بھی وہ زہر ہے جس سے گھر کی فضا مسموم ہو جاتی ہے۔ اس کے اثرات اولاد پر بھی پڑتے ہیں اور شوہر بھی اس سے متاثر ہو کر علیحدگی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اس لیے جس طرح شوہر کو بیوی کے حقوق کے حوالے سے ظلم کرنے سے روکا اسی طرح وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ''اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح کا ہے'' فرما کر بیویوں کے تصورات کی اصلاح فرمائی اور ان کے ذہن سے یہ بات نکالی کہ تم ہمسری اور برابری کے فریب سے نکلو اگر تم گھر کو بچانا چاہتی ہو تو گھر اس مہلک تصور کی موجودگی میں تباہی سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ دنیا کا کوئی چھوٹا بڑا ادارہ ایسا نہیں ہے جس میں تمام کام کرنے والوں کو یکساں حیثیت حاصل ہو۔ سکول میں تمام اساتذہ ہیڈ ماسٹر نہیں ہوتے' کالج میں تمام پروفیسر پرنسپل نہیں ہوتے' دفاتر میں تمام کام کرنے والے دفتر کے سربراہ نہیں ہوتے' ملک کو چلانے والی کابینہ کے تمام شرکاء وزیراعظم نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ادارے کو بھی چلانے کے لیے چاہے وہ چھوٹا ہے یا بڑا' اس کا ایک انتظامی سربراہ بنانا پڑتا ہے۔ پھر اس کی اطاعت بھی کرنا پڑتی ہے۔ اس کا احترام بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ دوسروں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں' یہ ان کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔ یہی حال ایک گھر کا بھی ہے۔ میاں بیوی دونوں کے حقوق ہیں لیکن دونوں برابر نہیں ہیں۔ (تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ سورۃ النساء میں آئے گی) یہاں یہ بات تو واضح ہو گئی ہے کہ یہ جو آج میاں بیوی کے درمیان مساوات اور برابری کا نظریہ فروغ پا رہا ہے اور ہم نے مغرب سے اسے درآمد کر کے اپنے گھروں کی تباہی کا سامان کر لیا ہے' کم از کم قرآنِ کریم میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم تو واضح طور پر شوہر کو ایک درجہ فضیلت اور ترجیح دے رہا ہے اور اسے گھر کا سربراہ بنا کر سربراہی کے حقوق اور احترام دے رہا ہے۔ مغرب نے اسے جس طرح منفی جذبات کو ابھارنے کا ذریعہ بنایا ہے اس میں کوئی دانش نہیں۔ کیونکہ اگر گھر کے تمام افراد برابری کے تصور سے ہی خوشیاں حاصل کر سکتے ہیں تو پھر والدین اور اولاد میں بھی برابری تسلیم کرنا پڑے گی۔ اولاد والدین کو جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے لیکن شریعت نے اولاد کو والدین کی اطاعت اور احترام کا حکم دیا ہے اور والدین کو ان پر شفقت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ گھر کی سربراہی اگرچہ باپ کے پاس ہے لیکن اولاد کے لیے ماں کا تین گنا حق زیادہ رکھا ہے۔ یہ اللہ کے دین کی وہ حکمتیں ہیں جن کو نظر انداز کر کے ہم بے دانشی کا راستہ اختیار کر چکے ہیں اور اللہ کی ذات کی عظمت سے بغاوت کر کے ہم بربادی کے راستے پر چل نکلے ہیں۔ اس لیے آخر میں فرمایا کہ تمہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ عزیز بھی ہے' حکیم بھی ہے۔ یعنی وہ غالب بھی ہے اور وہ حکمت والا بھی ہے۔ اس کے دین کی اطاعت کرو' کیونکہ وہ غالب کا بھیجا ہوا دین ہے اور دل و دماغ کو اس کی اطاعت سے آسودہ کرو کیونکہ وہ ایک حکیم کی حکمت کا شاہکار ہے۔

Marfat.com

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ
اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ
شَيۡـًٔـا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا
حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ
حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى
تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ
اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا
لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ
ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا
تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ
عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا
اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع

رکوع: ۲۹۔ (طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو روک لینا ہے معروف طریقے سے اور یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم کچھ بھی لو اس سے جو تم نے بیویوں کو دیا ہے۔ بجز اس کے کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو تو پھر ان پر کوئی حرج

Marfat.com

نہیں کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں سو ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو شخص اللہ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں O پس اگر وہ اس کو (تیسری) طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں جب تک وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پھر اگر وہ (دوسرا شوہر) اس کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ رجوع کر لیں (آپس میں نکاح کر لیں) اگر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' وہ ان کو واضح کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہتے ہیں O اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو دستور کے مطابق روک دو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو۔ اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے) (۲۲۹ تا ۲۳۱)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ ؕ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ O

(طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو روک لینا ہے معروف طریقے سے اور یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم کچھ بھی لو اس سے جو تم نے بیویوں کو دیا ہے۔ بجز اس کے کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو تو پھر ان پر کوئی حرج نہیں کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں سو ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو شخص اللہ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں) (۲۲۹)

اس آیتِ کریمہ کی وضاحت سے پہلے چند ابتدائی باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

اسلام میں نکاح کی حیثیت

تمام دنیا کے نزدیک نکاح کی حیثیت باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے۔ جسے آج کل کی زبان میں ''کنٹریکٹ'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ یہ تصور اس حد تک ذہنوں پر غالب آ گیا ہے کہ مغرب میں پہلے یہ تصور ذہنوں میں پلتا رہا پھر قرطاس کی زینت بنا' اخبارات نے اس میں وسعت پیدا کی' آہستہ آہستہ یہ اس مرحلے تک پہنچ گیا ہے کہ عنقریب شاید قانون کی شکل اختیار کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی بجائے نکاح کے تکلف میں پڑنے کے آپس میں ایک کنٹریکٹ سائن کریں گے' جس میں اپنی اپنی پسند کی شرائط طے کر لی جائیں گی' مدت کا تعین ہو

Marfat.com

جائے گا' اولاد کے مستقبل کا بھی فیصلہ کرلیا جائے گا جو عموماً ریاستی اداروں کے حوالے کر دی جاتی ہے' لیکن درمیان میں نکاح کا کوئی ذکر نہیں ہو گا۔ دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں گے' اولاد بھی پیدا ہوگی لیکن محض ایک معاہدے کے تحت' جس میں نکاح کے مذہبی بکھیڑے سے نجات حاصل کرلی جائے گی۔ ہمارے یہاں بھی آہستہ آہستہ بالائی کلاس میں جو مغربی تہذیب کی پروردہ اور اسی تہذیب کی نمائندہ ہے۔ جو اپنے ملک میں بھی غیروں کی طرح رہتے اور اپنے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن حکومتی اداروں اور بڑے بڑے انتظامی شعبوں میں حتیٰ کہ تعلیمی اداروں تک پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ اپنی قوم سے بالکل بیگانہ ہیں' لیکن اسی قوم کو اپنے طریقے سے لیڈ بھی کر رہے ہیں اور فیڈ بھی کر رہے ہیں۔ ان میں بھی آہستہ آہستہ یہ کنٹریکٹ کا تصور مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے ابھی تک نکاح سے جان تو نہیں چھڑائی' لیکن آپ ان کے نکاح کی تقریبات میں شامل ہو کر دیکھ لیجئے' تقریب کے سب سے اہم حصے یعنی نکاح کو محض ایک فارمیلٹی کی طرح وجود میں لایا جاتا ہے' لیکن باقی رنگا رنگ تقریبات اس تقریب کا اصل حاصل ہوتی ہیں۔ ایسے ایسے واقعات بھی ان لوگوں میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں کہ کئی دنوں تک شادی بیاہ کے نام سے ایک ہنگامہ ہوتا رہا اور جب ہنگامہ فرو ہوا اور مہمان واپس چلے گئے تو میاں بیوی کو ایک گھر میں بھیج دیا گیا۔ لیکن یہ راز ایک مدت کے بعد کھلا کہ ان دونوں میں نکاح کا تکلف تو کیا ہی نہیں گیا۔ یعنی ان غیر ضروری رسومات میں بالکل اہلِ خانہ بھول گئے کہ نکاح کی بھی کوئی رسم ہے جسے ادا کرنا تھا۔ عوام ابھی اس حد کو تو نہیں پہنچے لیکن ان میں بھی آہستہ آہستہ جو تبدیلیاں آ رہی ہیں' ان میں ایک تبدیلی تو اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اسے کوئی برائی نہیں سمجھا جاتا' وہ یہ ہے کہ مہندی کی رسم کو اتنا ضروری اور اتنا اہم سمجھ لیا گیا ہے کہ شادی کے بیشتر اخراجات اسی روز صرف ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے بھنگڑا ڈالتے اور ہلڑ بازی میں شریک ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط اس طرح کی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ کوئی باہر سے آنے والا شخص دیکھ کر اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ مسلمانوں کی کوئی تقریب ہے۔ اس ساری ابتری اور فساد کا سبب صرف یہ ہے کہ نکاح کا حقیقی تصور ذہنوں سے نکل گیا ہے۔ اب اس کو محض ایک معاہدہ یا کنٹریکٹ سمجھ کر سراسر ایک جشن اور میلے کی صورت دے دی گئی ہے۔ اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نکاح ایک لڑکے اور لڑکی کی جنسی ضرورت پورا کرنے اور تقریب کے شرکاء کو رنگا رنگ تفریح مہیا کرنے کا نام ہے۔

اس میں اگر نکاح کے نام سے کوئی مذہب کا حوالہ ہے بھی تو محض برائے وزنِ بیت اور اگر چند بڑی عمر کے لوگ اخلاق اور شرم و حیاء کی باتیں کرتے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو وقت سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس بگڑے ہوئے تصور کو جب تک حقیقی تصور سے تبدیل نہیں کیا جائے گا اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں جب تک یہ بات راسخ نہیں کی جائے کہ اسلام میں نکاح محض کنٹریکٹ اور معاہدہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک عبادت اور سنت رسولؐ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے مشروع نہیں فرمایا' بلکہ وہ ذاتِ رسالت مآبؐ جسے اللہ نے معصوم پیدا فرمایا اور جس پر کبھی بھی خواہشاتِ نفس کا غلبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی ذات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "نکاح میری سنت ہے۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ جس کام کی نسبت اللہ کے رسول کی ذات سے ہو جائے وہ کام صرف ایک مرد و عورت کے درمیان نفسانی ضرورتیں پوری کرنے کا ایک معاہدہ ہی نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کے کچھ اور بھی مقاصد ہیں جس نے اسے سنت رسولؐ بنا دیا ہے۔ اور سنت کی پیروی کرتے ہوئے جو کام بھی کیا جائے اسے چونکہ اللہ کی رضا نصیب ہو جاتی ہے اس لیے وہ عبادت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ بنابریں نکاح کو علماء نے عبادت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک شخص مغرب کی نماز کے بعد صلوٰۃ الاوابین پڑھنے کا عادی ہے اور اسی وقت میں اسے ایک نکاح کی تقریب میں شامل ہونے کی دعوت ملتی ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ اگر میں نکاح کی تقریب میں جاتا ہوں تو میرے نوافل کی عبادت رہ جائے گی۔ اور اگر نہیں جاتا تو دعوت دینے والوں کی دل شکنی ہوگی۔ تو علماء کہتے ہیں کہ اسے نکاح کی تقریب میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک اجتماعی عبادت ہے اور اس میں شمولیت نوافل پڑھنے سے زیادہ اجر و

Marfat.com

ثواب کی حامل ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ خوشی کے جس موقعے کو اللہ نے ہمارے لیے عبادت بنا دیا تھا ہم نے اس میں پے در پے نافرمانی کے امکانات پیدا کر کے اسے معصیت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس تقریب کا اہم ترین حصہ لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول خطبۂ نکاح اور پھر اس کے بعد دعا ہے۔ لیکن ہم ان میں سے کسی ایک بات کو خالص عبادت نہیں رہنے دیتے۔ فوٹو گرافروں کا ہجوم ان کے کیمروں سے نکلنے والی تیز روشنیاں اور مرد و زن کا آزادانہ اختلاط اور پھر اس پر بے ہنگم آوازیں ایک ایسی فضا پیدا کرتی ہیں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ دولہا میاں بغیر تصویر کھنچوائے دستخط نہیں کر سکتے۔ دلہن کو بھی مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ تصویروں کے ہجوم میں نکاح کے فارم پر دستخط کرے۔ ہماری اس طرح کی خوش فعلیوں نے نکاح کے حقیقی تصور کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم جب تک اپنے اس رویے اور ذہنی ساخت کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس وقت تک نکاح کو حقیقی مفہوم ملنا مشکل ہے۔ لیکن اگر ہم واقعتاً اسے عبادت اور سنت کا مقام دینے کے لیے تیار ہو جائیں اور ہم اس بات کو باور کر لیں کہ ہم نے اللہ کے نام کو ضمانت کے طور پر بیچ میں لا کر اور اسے عبادت کا درجہ دے کر ایک معاہدہ کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک فریضہ انجام دیا ہے تو پھر جہاں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے انعقاد پذیر ہونے کے آداب و شرائط کیا ہیں؟ وہیں ہمیں یہ بھی باور کرنا ہے کہ اسلام میں اس معاہدے کو نفسانیت یا خواہشات سے مغلوب ہو کر توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی گئی۔ یہ زندگی بھر کے نباہ کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اور اگر شوہر نے بیوی پر ظلم کیا یا بیوی نے نشوز کا راستہ اختیار کیا تو دونوں جس طرح دنیا میں مختلف قسموں کی عائلی اور خاندانی مشکلات کا شکار ہوں گے اسی طرح قیامت کے دن انہیں اللہ کے یہاں سخت باز پرس سے گزرنا پڑے گا۔ کیونکہ اسلام نے سب سے زیادہ زور اس تعلق کو زندگی بھر نبھانے پر دیا ہے۔ اس نے اگرچہ ختم کرنے کے لیے بعض ناگزیر صورتوں میں طلاق کی اجازت بھی دی لیکن ساتھ ہی اسے حلال چیزوں میں اللہ کے نزدیک مبغوض ترین قرار دیا۔ یعنی جن چیزوں پر اللہ کی ناراضگی بڑھتی اور وہ غضبناک ہوتا ہے ان میں یہ طلاق بھی ہے۔ اور پھر اس کے وجود پذیر ہونے پر ایسی پابندیاں لگائیں جس سے طلاق دینے کے بعد بھی قدم قدم پر میاں بیوی کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ اب بھی رک کے سوچو کہ تم جو اس تعلق کو ختم کرنے کا ارادہ کر چکے ہو ہو سکتا ہے اس کے تمہارے لیے نتائج اچھے نہ ہوں۔ اس لیے اگر ایک طرف عورتوں پر پابندی لگائی گئی کہ اگر شوہر نے تمہیں طلاق دے ہی دی ہے تو تم یکلخت نکاح کے فوراً بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرو، تین ایامِ مخصوص کا زمانہ گزارو۔ اس میں جہاں اور مصلحتیں ہیں وہیں یہ بھی ایک مصلحت ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شوہر اپنی غلطی کا احساس کر لے یا ادھر ادھر سے لوگ اس پر دباؤ ڈالیں اور خاتون کو بھی گزرے ہوئے دن یاد آنے لگیں تو پھر مل بیٹھنے کا موقع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شوہر کو بھی اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ تم نے اگر طلاق دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے لیکن طلاق دینے سے پہلے تم چونکہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے وقتاً فوقتاً تمہاری شکایات میں اضافہ ہوتا رہا ہو اور تمہیں سوچنے کی کبھی مہلت نہ ملی ہو تو اب تمہیں یہ مہلت طلاق کے بعد مل سکتی ہے وہ اس طرح کہ تم اپنی بیوی کو ایک طلاق دو، لیکن اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ ناپاکی کی حالت میں مت دو۔ اگر تم نے ناپاکی کی حالت میں طلاق دی طلاق واقع تو ہو جائے گی لیکن تم غیر شعوری طور پر اپنی بیوی کی اذیت میں اضافے کا سبب بنو گے۔ وہ اس طرح کہ جس حیض میں تم طلاق دو گے وہ عدت میں شمار نہیں ہو گا۔ اس کے بعد طہر اور پاکیزگی کا زمانہ آئے گا تو وہ بھی عدت میں شمار نہیں ہو گا بلکہ اس کے بعد حیض کا وقت آنے سے عدت شروع ہو گی۔ عدت چونکہ تین حیض ہیں اور تم نے حیض کے دنوں میں طلاق دے کر اس عدت میں ایک طہر اور ایک حیض کا کچھ حصہ شامل کر دیا ہے۔ تو یہ عدت کی مدت میں اضافہ کرنے کا باعث ہو گا۔ اور اگر تم بیوی کو فارغ کر دینا چاہتے ہو یا وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو عدت میں یہ اضافہ یقیناً اس کے لیے اذیت کا باعث ہو گا۔ دوسری پابندی یہ لگائی کہ تم اس طہر میں طلاق دو جس میں تم نے اپنی بیوی سے ہمبستری نہ کی ہو۔ کیونکہ ممکن ہے بیوی سے تمہارے ملاپ کے بعد تمہاری بیوی حاملہ ہو

Marfat.com

جائے۔اور حاملہ کو اگر طلاق دے دی جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے جو ظاہر ہے کہ نو مہینے کے قریب ہوگی۔اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ آپ نے اپنی بیوی کو کس اذیت میں مبتلا کردیا ہے پھر مزید یہ ہدایت دی کہ بہتر یہ ہے کہ تم ایک ہی طلاق کو کافی سمجھو اور وقت گزرنے دو۔یہی ایام تمہارے سوچنے کے ہیں۔ان دنوں میں چونکہ تم اپنی بیوی سے الگ رہو گے اور بیوی تم سے الگ رہے گی تو گزرے ہوئے وقتوں کی اچھی یادیں ممکن ہے تمہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیں۔اور اگر ایسا ہو جائے تو تم کسی وقت بھی رجوع کرسکتے ہو۔لیکن اگر تم علیحدگی ہی کا فیصلہ کرلو تب بھی عدت گذر جانے کے بعد ایک طلاق بھی علیحدگی کے لیے کافی ہے۔لیکن اگر تم دوسری طلاق ضرور ہی دینا چاہتے ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے دو۔دوسری طلاق دینے کے بعد بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' اب بھی تم رجوع بھی کرسکتے ہو اور عدت گزرنے کے بعد نکاح بھی کرسکتے ہو۔لیکن تیسری طلاق کا ہرگز ارادہ نہ کیا جائے۔کیونکہ تیسری طلاق کے بعد رجوع یا دوسرے نکاح جیسی تمام رعایتیں ختم ہو جاتی ہیں۔صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔اس پوری تفصیل سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلام نے میاں بیوی کے تعلق کو آخر حد تک بچانے کی کوشش کی ہے۔اختلافات کی صورت میں شوہر کو بیوی کی اصلاح کے لیے سورہ النساء میں کچھ تدابیر بتائی گئی ہیں۔اور اگر ان تدابیر کو بروئے کار لاکر بھی اصلاح کی کوئی شکل پیدا نہ ہو تو پھر دونوں خاندانوں سے دو منصف بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔یہ ساری تدبیریں بھی اس تعلق کو بچانے ہی کی کوششیں ہیں۔لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ تمام انسانوں کے مزاج یکساں نہیں ہوتے۔بعض دفعہ مزاجوں میں اتنا تفاوت اور اختلاف ہوتا ہے کہ موافقت اور ہم آہنگی کی ہر تدبیر ناکام ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں اگر یہ حکم دے دیا جائے کہ تمہاری علیحدگی کی کوئی صورت ممکن نہیں' تمہیں بہر صورت اکٹھے رہنا ہے تو یہ انسانی مزاج' انسانی فطرت اور انسانی حقوق پر ایسا ظلم ہوگا جس کے نتیجے میں ساری زندگی کڑھنے اور رنجھ رنجھ کے مرنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔زوجین کے اختلاف کے نتیجے میں اولاد الگ نافرمان ہو جائے گی۔اور پورا گھر جہنم بن کر رہ جائے گا۔اس لیے اللہ نے طلاق کی اجازت دی' لیکن ساتھ ہی متذکرہ بالا احتیاطوں کا بھی حکم دیا۔

عربوں کی عادتِ بد اور آیت کا شانِ نزول

عربوں میں ایک بری عادت تھی کہ جب وہ اپنی بیوی سے ناراض ہوتے اور یہ سمجھتے کہ ہمارا آپس میں نباہ نہیں ہوسکتا تو اسے طلاق دے دیتے۔لیکن طلاق دینے کے بعد اسے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتے تھے' بلکہ اسے ایک ایسی اذیت میں مبتلا کردیتے کہ جس سے اس پر بیوی ہونے کی تہمت بھی رہتی' لیکن وہ بیوی ہونے کی حیثیت سے یکسر محروم ہوتی۔ان کے ظلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب عدت ختم ہونے کے قریب آتی تو بیوی سے رجوع کرلیتے اور پھر اسے طلاق دے دیتے۔پھر جب عدت ختم ہونے پر آتی تو پھر رجوع کرلیتے اور پھر اسے طلاق دے دیتے۔ان کے ہاں طلاقوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔اس طرح بیچاری عورت کبھی بھی اس ظلم کے شکنجے سے نکل نہیں پاتی تھی۔حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے جو اگرچہ مسلمان ہو چکے تھے لیکن ابھی تک پرانے اثرات کی گرفت میں تھے۔اپنی بیوی سے کہا لا اقربک ولا تحلین منی ''نہ تو میں تمہارے نزدیک جاؤں گا اور نہ تو مجھ سے آزاد ہو سکے گی'' بیوی نے پوچھا ''یہ کیسے؟'' تو انصاری نے کہا ''میں طلاق دیا کروں گا اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کرلیا کروں گا''۔وہ خاتون نہایت دل گرفتہ ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مظلومیت کی شکایت کی۔اس پر قرآنِ کریم میں پیشِ نظر آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس نے عورت کے متذکرہ بالا ظلم کا خاتمہ کردیا۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ تم جوان گنت طلاقیں دیتے ہو' تمہیں قدرت نے اتنی طلاقیں دینے کا حق نہیں دیا۔ طلاق صرف دو مرتبہ ہے۔ کہ تم ایک دفعہ طلاق دے کر رجوع کر سکتے ہو۔ پھر دوسری دفعہ طلاق دے کر بھی اگر چاہو تو رجوع کر سکتے ہو۔ اور اگر عدت گزر جائے تو دوبارہ نکاح بھی کر سکتے ہو۔ لیکن تیسری طلاق کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد مکمل انقطاع ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہیں صرف دو مرتبہ طلاق دینے کا حق ہے۔ دو مرتبہ طلاق دینے سے نکاح بالکل ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اس میں تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو تم معروف طریقے سے رجوع کر لو۔

معروف کا مفہوم

معروف کا مطلب یہ ہے کہ رجوع کرنے کے بعد تم بیوی کے حقوق ادا کرو۔ اس کے ساتھ اپنا رویہ درست کرو۔ تم اس کے ساتھ اس طرح رہو۔ جس طرح ایک شریف' مہذب اور خدا ترس آدمی رہتا ہے۔ گزشتہ آیت میں بھی فرمایا گیا ہے کہ شوہروں کو اپنی بیویوں سے رجوع کرنے کا حق ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ رجوع اس وقت کریں جب وہ اصلاح کا ارادہ کر چکے ہوں۔ اصلاح کا مطلب واضح ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کریں۔ ان کے رویے میں اگر پہلے لاپرواہی' بے نیازی یا دل دکھانے کے عناصر شامل تھے تو اب نہیں ہونے چاہئیں۔ تم بیوی کو اس طرح رکھو جیسے بیوی کا حق ہے۔ اس کی دل جوئی اور دل دہی میں کوئی کمی نہ کرو۔ وہ محسوس کرے کہ میں ایک مضبوط پناہ میں ہوں۔ میرا شوہر' میرا رفیقِ حیات' میری تنہائیوں کا امین' میرے ہر دکھ درد میں شریک ہے۔ یہ وہ معروف ہے جس کی پابندی ہمیشہ بھلے لوگوں نے کی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس کی تاکید ہی نہیں فرمائی' بلکہ خود اپنی بیویوں کے ساتھ عملی مثال بھی مہیا فرمائی ہے۔ آپ کی نو بیویاں تھیں اور ہر بیوی یہ سمجھتی تھی کہ حضورؐ مجھے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آپؐ نے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا۔ کبھی کسی بیوی کو آزردہ ہونے کا موقع نہ دیا۔ کسی کی دو بیویاں بھی ہوں تو ہر وقت شکایتوں کا انبار لگا رہتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویوں میں سے کبھی کسی نے شکایت کا نام تک نہ لیا۔

تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَان کا مفہوم

اور اگر رجوع کرنے کا فیصلہ نہ ہو تو پھر تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَان اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پھر نہایت شرافت کے ساتھ عدت کو پورا ہونے دیا جائے۔ بغیر کسی تلخی کے عدت کو اپنے انجام کو پہنچنا چاہئے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اب اگرچہ میاں بیوی میں علیحدگی ہو رہی ہے اور بیوی کا اب شوہر پر کوئی حق باقی نہیں رہا لیکن شوہر کی مردانگی اور فتوت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ طلاق دے کر اپنی بیوی کو دھکے دے کر گھر سے نہ نکالے بلکہ احسان کے ساتھ اس کو گھر سے روانہ کرے۔ یہ بات ہمارے معاشرے میں بالکل اجنبی معلوم ہو گی۔ کیونکہ ہمارے یہاں علیحدگی کا مطلب دشمنی سے کم نہیں ہوتا۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے انتہائی بیزار ہوتے ہیں اور دونوں خاندان ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تیار ہوتے ہیں۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں پروردگار یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ بعض دفعہ مزاجوں کے تفاوت یا کسی اور ناگزیر سبب کے باعث بات اگر علیحدگی تک پہنچ ہی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان تلخ اور تکلیف دینے والے لمحوں کو سلیقے سے نہ گزارا جا سکے۔ خاص طور پر پڑھے لکھے گھرانوں میں اولا

Marfat.com

تو میاں بیوی کو مل بیٹھ کر کوئی سمجھوتہ کر لینا چاہیئے اور اگر وہ بری طرح جذبات کی گرفت میں ہیں تو پھر دونوں خاندانوں کے بڑے لوگوں کو بیٹھ کر خوش اسلوبی سے یہ معاملہ طے کر لینا چاہیئے۔ اور ایک دوسرے کو یہ بات سمجھانی چاہیئے کہ دونوں نوجوان ہیں' بردباری نہیں دکھا سکے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں سمجھداری کا ثبوت نہیں دے سکے۔ اب جب کہ وہ ایک دوسرے سے اتنا دور چلے گئے ہیں تو ہمیں ان تلخیوں کو بڑھانے کے بجائے ان کی علیحدگی کا فیصلہ اس طرح کرنا چاہیئے کہ علیحدگی بھی ہو جائے' لیکن خاندانوں میں دشمنی کی بنیاد نہ پڑے۔ صحابہ کی مثالیں اس پر شاہدو عادل ہیں۔ قرآنِ کریم تو اس بات پر زور دیتا ہے کہ بیوی کو علیحدہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے' جاتے ہوئے معذرت کی جائے اور ساتھ ہی کچھ تحائف بھی دیئے جائیں' زیادہ نہیں تو کپڑوں کے ایک دو جوڑے ہی دے دیئے جائیں۔

شوہر بیوی سے عطیات وتحائف واپس نہیں لے سکتا

وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡئًا سے ایک اور اہم بات ارشاد فرمائی گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو یہ بات یقیناً اجنبی معلوم ہو گی کیونکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب کہیں طلاق تک نوبت پہنچتی ہے تو فریقین اپنا اپنا حساب کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لڑکی والے جہیز کی ایک ایک چیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انہیں یقیناً اس مطالبے کا حق ہے۔ اور شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کی تمام چیزیں واپس کرے۔ البتہ شوہر نے اپنی بیوی کو جو کچھ دیا اس میں سے ایک تو وہ ہے جس کا تعلق نان' نفقہ اور کسوہ وغیرہ یعنی بیوی کے حقوق سے ہے۔ ان کا تو شوہر کسی طرح مطالبہ نہیں کر سکتا' کیونکہ یہ تو اس کے ذمے واجبات تھے۔ رہے وہ تحائف جو مختلف وقتوں میں شوہر اپنی چاہت سے اپنی بیوی کو دیتا ہے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ تم اپنی بیویوں کو محبت اور شوق سے دے چکے ہو وہ چونکہ ان کی ملکیت بن چکے ہیں اس لیے ان میں سے کچھ بھی واپس لینا تمہارے لیے جائز نہیں۔ سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا گیا کہ تم اپنی بیویوں سے اپنے دیئے ہوئے تحائف کیسے واپس لیتے ہو جب کہ تم ان سے انتہائی قریبی تعلق قائم کر چکے ہو۔ اور ان بیویوں نے محبت کے ان لمحوں میں تم سے کیسے کیسے پختہ وعدے بھی لیے تو کیا اب یہ سب کچھ بھول بھال کر تم ایک ایک چیز کا مطالبہ کرو گے۔ شوہر کی حیثیت ایک برتر حیثیت ہے۔ اس کے اندر قدرت نے مردانگی اور فتوت رکھی ہے۔ اسے ہرگز یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بیوی کے سامنے حساب کھول کر بیٹھ جائے۔ ہاں اگر اس نے اپنی بیوی کو زیور پہننے کے لیے دیا' لیکن اس کی ملکیت میں نہیں دیا۔ یا اسی طرح کوئی اور قیمتی چیز جو صرف وقتی فائدہ اٹھانے کے لیے دی لیکن وہ ہے شوہر کی ملکیت تو ایسی چیز کو یقیناً واپس لینے کا حق ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ شوہر کو حتیٰ الامکان عظمت کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ہاں اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے۔

صورتِ مستثنیٰ، خلع کا بیان

اِلَّآ اَنۡ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ آیتِ کریمہ کے اس جملہ میں صورتِ مستثنیٰ کو بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں میاں بیوی اس بات کا اندیشہ کریں کہ وہ میاں بیوی کی حیثیت میں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے یعنی حدود اللہ کو بروئے کار لانا دونوں کے نزدیک مشکل ہو جائے' شوہر اپنی ہٹ پر قائم ہو' وہ بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کے لیے تیار نہیں' وہ ہر قیمت پر بیوی کو لونڈی بنا کر رکھنا چاہتا ہے' اسے مارتا پیٹتا ہے' حقوق ادا کرنے کے بجائے اس پر سختی کرتا ہے' اسے طلاق دے کر الگ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں اور شرفاء کی

Marfat.com

طرح بیوی بنا کر رکھنا بھی منظور نہیں' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیوی کے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اب اسے ایک بیوی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی' وہ اسے شوہر محسوس نہیں ہوتا' بلکہ ایک ایسا اجنبی محسوس ہوتا ہے جس کے شکنجے میں پھنس کر رہ گئی ہے اور یا یہ ہے کہ شوہر ایسی کوئی زیادتی تو نہیں کرتا لیکن بیوی آزادانہ زندگی کی عادی ہے۔ وہ شرم وحیا کی پابندیوں کو اپنے لیے ظلم سمجھتی ہے۔ وہ اسے کسی بات سے روکتا ہے تو وہ اس کے روکنے کے حق کو چیلنج کرتی ہے' وہ گھر میں ایک متوازی گھر بنا کر رہنا چاہتی ہے جس میں اس کے آنے جانے' ملنے جلنے اور طور اطوار پر کوئی پابندی نہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ بیوی شوہر کی زیادتیوں کی وجہ سے بیزار ہو یا اپنی نامناسب سوچ اور غیر شرعی تصورات کے باعث' دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ہو' یقیناً گھر میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور جب یہ بگاڑ لاینحل صورت اختیار کرلے اور بیوی ہر قیمت پر فیصلہ کرلے کہ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا اور شوہر اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے خاندان میں سے حَکَم تجویز کریں اور بیوی ان کے ذریعے سے علیحدگی کی کوشش کرے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عدالت میں اپنے حق کے حصول کے لیے مرافعہ کرے۔ یعنی وہ عدالت کے ذریعے علیحدگی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ''خلع'' کہا جاتا ہے۔ دونوں خاندان اپنے گھر ہی میں اس مسئلے کو نمٹا سکیں تو سب سے اچھی بات ہے اور اگر گھر میں یہ بات طے نہ ہو سکے تو عدالت کا فرض ہے کہ پہلے تو وہ فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے اور کامیابی نہ ہو تو عدالت بیوی کو حکم دے کہ اس نے اپنے شوہر سے مہر میں جو کچھ لیا تھا اسے واپس کردے۔ اور اس کے بعد عدالت ان کے درمیان تفریق کردے۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ اس کا حکم طلاق بائن کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوعہ عورت عدت اتنی گزارے گی جتنی مطلقہ عورتیں گزارتی ہیں۔ لیکن اس عدت کے دوران شوہر اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر عدت گزرنے کے بعد میاں بیوی دونوں دوبارہ نکاح کا ارادہ کریں تو نکاح کرسکتے ہیں۔

فقہاءِ احناف کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ زوجین کے درمیان حالات کی خرابی کی ذمہ داری اگر تو شوہر پر ہے تو پھر اسے خلع کی صورت میں بیوی سے کچھ بھی لینا مناسب نہیں۔ لیکن اگر زیادتی بیوی کی ہے تو جتنا اس نے بیوی کو دیا تھا اتنا اس سے لینا مباح ہے۔ البتہ زیادہ لینے کے بارے میں علماء اختلاف کرتے ہیں۔ بعض اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور بعض اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک نہایت توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ خلع اگرچہ ظالم شوہر سے بیوی کیلئے نجات حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس لحاظ سے اسے اللہ کی رحمت کہنا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا معمولی معمولی باتوں اور مزاج میں ایسے اختلاف کی بنیاد پر جس کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہو اور جس کی موجودگی میں زندگی گزاری جاسکتی ہو؟ اگر عورت خلع طلب کرے تو کیا عدالت کو اسے اجازت دے دینی چاہئے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ اور اس میں عدالت کی مومنانہ بصیرت اور تفقہ کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ بات تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے طے شدہ ہے کہ ایسے ذوقی اور سطحی نوعیت کے اختلافات جو عموماً مزاجوں میں پائے جاتے ہیں اور شریف عورتیں جن کی موجودگی میں بھی بڑی کامیاب زندگی گزارتی ہیں ایسی صورت میں عورت کو خلع یا فسخ نکاح کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر عورت کو یہ حق استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اس سے خاندانی نظام کی بقا دشوار ہو جائے گی۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیداً ارشاد فرمایا کہ خلع کے معاملے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خلع کا مطالبہ کرنے والی خاتون کیا محض کندھا بدلنے اور ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے مطالبہ نہیں کررہی۔ اگر ایسا ہے تو یہ ہزار دفعہ مسترد کر دینے کے لائق ہے۔ لیکن اگر خاتونِ خانہ کے مطالبہ میں واقعی حقیقت موجود ہے تو پھر اسے رد کرنا اور اس حق سے محروم رکھنا بھی ظلم کے مترادف ہے۔ ایک عورت اگر اپنے شوہر کے مظالم اور اس کے برے رویے سے اس حد تک نالاں ہے

Marfat.com

اس کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے تو اس بات کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں، اگرچہ اتنا آسان بھی نہیں۔ اس لیے خلفائے راشدین اس بارہ بھی نہایت احتیاط کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک خاتون خانہ نے خلع کا مقدمہ دائر کیا۔ آپؓ نے اسے بلا کر سمجھایا۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ آپؓ نے یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ اس کے دعوے میں کہاں تک صداقت ہے آپؓ نے حکم دیا کہ سے بکریوں کے باڑے میں رکھا جائے۔ چنانچہ اس نے دو راتیں وہاں گزاریں۔ ظاہر ہے بکریوں کا باڑہ کوئی رہنے کی جگہ تو نہیں۔ ہر وقت کی جانوروں کی دھما چوکڑی، پھر چاروں طرف بدبو کے ڈھیر ...... کون ایسی جگہ میں رات آرام سے گزار سکتا ہے۔ دو راتوں کے بعد جب اسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بلایا اور پوچھا کہ تمہاری یہ دو راتیں کیسی گزریں؟ خاتون نے کہا کہ شادی کے بعد ان راتوں میں جی بھر کے سوئی ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے غم کی حقیقت کو سمجھ گئے اور آپ نے ان کے درمیان جدائی کا حکم دے دیا۔ لیکن اگر معاملہ اس طرح کا ہو کہ بیوی انتہائی خوبصورت ہے اور شوہر انتہائی بدصورت، بیوی کو شادی سے پہلے شوہر کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ماں باپ نے اس عظیم تفاوت کی طرف توجہ نہیں دی۔ بیوی کی پہلی نظر جب شوہر پر پڑی تو اس کے دل میں بیزاری اور نفرت کا ایک بگولا اٹھا جس نے اسے پوری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اب اگر ایسی خاتون شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کرتی ہے تو عدالت کے لیے فیصلہ کرنا یقیناً مشکل ہو گا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مزاج کا فرق برداشت ہو جاتا ہے لیکن حسِ جمال، حسن و قبح اور خوبصورتی اور بدصورتی کا فرق بعض دفعہ فیصلہ کن حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ نے جب اپنے شوہر ثابت بن قیسؓ کو دیکھا کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت مفلس ہے۔ اور جمیلہ واقعی اسم با مسمّیٰ تھیں۔ تو باوجود مومنہ، صالحہ اور صحابیہ ہونے کے وہ بدصورتی پر سمجھوتہ نہ کر سکیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی لا انا ولا ثابت لا یجمع رأسی و رأسہ شیٔ ”میں اور ثابت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، میرا سر اور اس کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت نے اختلاف کی اس گہرائی کو پوری طرح سمجھا اور فرمایا ”کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو جو ثابت نے تم کو مہر میں دیا تھا؟“ جمیلہ نے کہا ”وہ بھی واپس کرنے کو تیار ہوں اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی دینے کو تیار ہوں۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ حضرت ثابتؓ کو واپس کر دیا اور ان دونوں میں تفریق کر دی۔ مختصر یہ کہ فسخ نکاح یا خلع کا حق عورت کے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس کو لعنت اور زحمت بننے سے بچانے کے لیے لڑکیوں کی اسلامی تربیت ضروری ہے۔ اور عدالت کے منصب پر فائز منصف جس طرح بصیرت کا حامل ہونا چاہیے اسی طرح اسلامی شریعت اور اسلامی حکمت میں ڈھلا ہوا بھی ہونا چاہیے۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ یعنی ان احکام کی پابندی کرنا اور کبھی خواہشات نفس کو ان احکام پر غالب نہ آنے دینا۔ میاں بیوی کے جو حقوق مقرر کر دیئے گئے ہیں اور جانبین کے ایک دوسرے پر جو فرائض عائد کر دیئے گئے ہیں اور دونوں کو زندگی گزارنے کے لیے جو آداب سکھائے گئے ہیں اور اگر کہیں تلخی ہو جائے تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو ہدایات دی گئی ہیں اور اگر علیحدگی کی نوبت آجائے تو علیحدگی کا جو طریقہ سکھایا گیا ہے اور قدم قدم پر جس حکمت سے آشنا کیا گیا ہے یہ سب اللہ کی حدود ہیں ان کی پابندی مسلمان کی دنیا اور آخرت میں کامیاب زندگی کی ضمانت ہے اور ان حدود کی پامالی دنیا اور آخرت میں تباہی اور ناکامی کا سبب ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جو شخص بھی اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ درحقیقت ظلم کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنی قسمت پھوڑتا ہے، اپنی زندگی برباد کرتا اور اپنی آخرت تباہ کر لیتا ہے۔

Marfat.com

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ O

(پس اگر وہ اس کو (تیسری) طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں جب تک وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ (دوسرا شوہر) اس کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ رجوع کرلیں (آپس میں نکاح کرلیں) اگر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم رہ سکتے ہیں، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو واضح کررہا ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہتے ہیں) (۲۳۰)

تیسری طلاق کے احکام

گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ طلاق دو مرتبہ ہے۔ یعنی تمہیں اگر طلاق ضرور ہی دینا ہے تو دو مرتبہ سے زیادہ طلاق مت دو۔ کیونکہ دو مرتبہ طلاق کی صورت میں تم عدت کے دوران رجوع بھی کرسکتے ہو۔ اور عدت کے بعد دوبارہ نکاح بھی کرسکتے ہو۔ اور مکمل علیحدگی مطلوب ہے تو عدت گزرنے سے علیحدگی بھی ہوجائے گی۔ پھر تیسری طلاق کے تکلف کے کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اپنے ہاتھ پاؤں توڑ دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ حالات میں تبدیلی انسانی فطرت ہے۔ مزاج میں بھی تبدیلی عادات کا حصہ ہے۔ اگر علیحدگی کے بعد بھی دوبارہ یکجائی کی ضرورت کا احساس ہوجائے تو دو طلاقوں کی موجودگی میں ہی اس کا امکان ہوسکتا ہے۔ اس لیے تیسری طلاق کو پسند نہیں فرمایا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے۔ کہ اگر تم نے نفع وضرر کے پیمانے توڑ کر اور مزاج شریعت کو نظر انداز کرتے ہوئے تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب تمہیں آگاہ رہنا چاہئے کہ اب تمہاری بیوی تمہاری بیوی نہیں رہی۔ نہ تم اس سے رجوع کرسکتے ہو اور نہ دوبارہ نکاح کرسکتے ہو۔ یکجائی کی تمام صورتیں ختم ہوگئیں۔ اب اگر کبھی تمہیں حالات کے دباؤ میں آکر یا کسی اور وجہ سے دوبارہ نکاح کی ضرورت کا احساس ہوجائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تمہاری مطلقہ بیوی عدت گزرنے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ اور نکاح کے لفظ میں چونکہ زندگی بھر کے نباہ کا تصور گندھا ہوا ہے اس لیے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی بھر کے نباہ کے ارادے سے نکاح کرے۔ لیکن زندگی کے اس نئے سفر میں کہیں اختلافات ایسی شدت اختیار کرجائیں کہ علیحدگی تک نوبت پہنچ جائے اور وہ بیوی کو طلاق دے دے تو پھر خاتون عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کرسکتی ہے۔ یہ سارا پراسس بالکل اسی طریقے پر فطری انداز میں ہونا چاہئے جیسے عام نکاح میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بروئے کار لایا جائے کہ ایک شخص کو ڈھونڈھا جائے، اسے اعتماد میں لے کر یہ کہا جائے کہ آپ اس خاتون سے نکاح کرلیں، اور نکاح کے فوراً بعد اسے طلاق دے دیں۔ یعنی محض ایک کاغذی کارروائی سے حرام کو حلال بنالیا جائے اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ نکاح کے تصور میں میاں بیوی کی تنہائی، خلوت اور انتہائی قربت کا تصور شامل ہے۔ کسی بھی شخص سے پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ تم ایک ایسی خاتون سے نکاح کرنا پسند کروگے جس کے قریب جانے کی تمہیں اجازت نہیں۔ وہ حیران ہوکر پوچھے گا کہ پھر نکاح کس لیے کرنا ہے؟ تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ نکاح کے معنی میں یہ بات شامل ہے اور مزید یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی وضاحت فرمائی۔ جب ایک ایسے شخص کے

Marfat.com

متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ پھر اس عورت نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ اور اس دوسرے شوہر نے بھی مباشرت سے پہلے طلاق دے دی۔ کہ کیا یہ عورت اپنے شوہر کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاقها الاول ''نہیں جب تک دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔'' اور دوسری بات یہ کہ اگر اس دوسرے شوہر نے نکاح اور مباشرت کے بعد منصوبے کے مطابق طلاق دے دی تو تب بھی پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ کسی مرد اور عورت کا وقت مقرر کے لیے ایک منصوبے کے تحت نکاح کرنا اسے نکاح نہیں کہتے بلکہ متعہ کہتے ہیں یا نکاحِ موقت کہتے ہیں اور یہ دونوں اسلام میں حرام ہیں۔ نکاح زندگی بھر کے سنجوگ کا نام ہے۔ اگر اسے ایک محدود مدت کے لیے منعقد کیا جائے اور مدت گزرنے کے بعد طلاق دے دی جائے تو اسے نکاح نہیں کہتے۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے ہمارے معاشرہ میں حلالہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور ایسے کرنے والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''تَیسٌ مستعارٌ'' (کرائے کا سانڈ) قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ ہیں جو نہایت پردہ داری سے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ انہیں شاید اندازہ نہیں کہ وہ شاید اسے نیکی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اللہ کے رسول کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

پہلے شوہر سے نکاح کے حلال ہونے کے لیے یہ جو اتنی بڑی شرط لگائی ہے اس میں اگر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ اتنا بڑا پہاڑ جو راستے میں حائل کر دیا گیا ہے یہ اس لیے ہے تاکہ لوگ نکاح کی اہمیت اور طلاق کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور وہ طلاق دیتے ہوئے اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ طلاق کا فیصلہ کرنا ایک ایسا خطرناک اقدام ہے کہ اگر اس میں ذرا سی بے احتیاطی ہوگئی تو گھر کے اجڑنے میں دیر نہیں لگے گی۔

ایک ساتھ تین طلاق دینا سخت گناہ ہے

متذکرہ بالا تفصیلات سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے۔ اس طرح تیسری طلاق تیسرے طہر میں ہوگی۔ جس کے بعد یکجائی کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ہر طہر میں ایک طلاق دینے کی پابندی نہیں کرتا بلکہ وہ یک لخت تین طلاقیں دے دیتا ہے تو اس سلسلے میں دو باتیں پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ ایک تو یہ بات کہ تین طلاقوں کا بیک وقت دینا اللہ کے رسولؐ کے نزدیک انتہائی سخت برہمی کا باعث ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے امام نسائی نے محمود بن لبید کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ وعلیہ وسلم کو ایک آدمی کے بارے میں خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپؐ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ ''کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں'' آپؐ کی اس حالت غضب کو دیکھتے ہوئے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں؟'' اس حدیث سے آپ اندازہ کیجئے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا کتنا بڑا گناہ ہے، جس سے رحمۃ اللعالمین سرتاپا حلم، بردبار اور رحمت ہونے کے باوجود سراپا غضب بن جاتے ہیں۔

Marfat.com

ایک ساتھ تین طلاقیں بھی تین ہی واقع ہوتی ہیں

دوسری بات جس کا یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برہمی کا ذکر تو آپ سن چکے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس برہمی کے باوجود ان تین طلاقوں کو مسترد نہیں فرمایا اور طلاق دینے والے کو یہ کہہ کر اس کی بیوی سپرد نہیں فرمائی کہ یہ طلاقیں چونکہ واقع نہیں ہوئیں یا ایک واقع ہوئی ہے اور تم اس سے رجوع کر لو' بلکہ آپؐ نے ان تین طلاقوں کو واقع فرمایا۔ کیونکہ قاضی ابوبکر ابن عربی نے متذکرہ بالا محمود بن لبید کی حدیث کے متعلق یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''فلم یرده النبی صلی الله علیه و سلم بل امضاه کما فی حدیث عویمر العجلانی فی اللعان حیث امضی طلاقه الثلاث و لم یرده'' (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رد نہیں کیا بلکہ اسے نافذ فرمادیا جیسا کہ عویمر العجلانی کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ان کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا اور رد نہیں کیا تھا) (تہذیب سنن ابی داؤد طبع مصر صفحہ ۱۲۹ ج ۲)

حضرت عویمر العجلانی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تھا' جب لعان کی کارروائی مکمل ہوگئی اور جانبین نے قسمیں کھالیں تو حضرت عویمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کذبت علیها یارسول الله ان امسکتها فطلقها ثلاثا قبل ان یأمره النبی صلی الله علیه و سلم ''اے اللہ کے رسول اب اگر میں اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھوں تو پھر اس میں قسم کھانے میں جھوٹا ہوں گا یہ کہہ کر حضرت عویمر نے اسے تین طلاقیں دے دیں اس سے پہلے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے'' اور احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا اور میاں بیوی میں علیحدگی کر دی۔ ایسی ہی بعض دوسری روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے اگر کسی شخص نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیں اور وہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپؐ نے ناخوشی کا اظہار فرمانے کے ساتھ ساتھ تین طلاقوں کو واقع بھی فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین طلاقوں کو تین قرار دینا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے اور اسی وجہ سے بجز اہلِ حدیث حضرات کے امت میں کسی قابلِ ذکر امام' مجتہد' فقیہ یا عالم نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ مسائل میں فقہاء میں اختلاف ایک معمول کی بات ہے لیکن تین طلاقوں کا تین ہی واقع ہونا ایسا مسئلہ ہے جس میں امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ سب یکساں رائے رکھتے ہیں اور سب کے نزدیک ایک ساتھ تین طلاقوں سے عورت حرام ہو جاتی ہے جس سے دوسرے نکاح کے لیے بجز اس کے کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ کسی اور جگہ نکاح کرے اور پھر اتفاق سے طلاق ہو جائے۔ اس لیے حافظ حدیث امام ابن عبدالبر مالکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جسے بعض لوگوں نے دلیل بنالیا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں عن ابن عباس رضی الله عنه قال کان الطلاق علی عهد رسول اللّٰه صلی الله علیه و سلم و ابی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فیه اناة فلو امضینا علیهم فامضاه علیهم (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

Marfat.com

زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لیے مہلت تھی تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو آپؓ نے ان پر نافذ کر دیا)۔

اس روایت کو پیش نظر رکھیں اور پھر چند نکات پر غور فرمائیں:

۱۔ فاروقِ اعظم مسلمانوں کے خلیفہ ثانی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے مطابق آپؓ فاروق ہیں اور حق اللہ نے آپؓ کی زبان پر کھول دیا تھا۔ ایک عام مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے انحراف کا تصور نہیں کر سکتا چہ جائے کہ خلیفہ ثانی کے بارے میں ایسا گمان کیا جائے۔

۲۔ آپؓ نے یہ فیصلہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے کسی سرکلر کی شکل میں نہیں کیا' بلکہ آپؓ نے صحابہ اور تابعین کے مجمع عام میں خطبہ جمعہ میں اس کا اعلان فرمایا جس میں بڑے بڑے فقہاء صحابہ موجود تھے۔ لیکن کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسلامی احکام کے بارے میں خلافتِ راشدہ میں جو آزادی حاصل تھی اس کا اس ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا کہ لوگ مہر میں بڑی بڑی رقمیں باندھنے لگے ہیں اس سے غرباء کے لیے مشکل پیدا ہو رہی ہے۔ اگر بڑی بڑی رقمیں مہر میں دینا کوئی عزت کی بات ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کو زیادہ سے زیادہ مہر دیتے۔ اس لیے میں لوگوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ زیادہ مہر باندھنا بند کر دیں۔ یہ سن کر نمازیوں کی صفوں میں سے پچھلی صف سے ایک خاتون اٹھیں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اتق اللہ یا عمر ''اے عمر اللہ سے ڈر'' قرآن کریم کہتا ہے وَ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا ''تم اپنی بیویوں اگر خزانہ بھی دے چکے ہو تو علیحدگی کے بعد ان سے واپس نہ لینا'' خزانے کی واپسی سے روکا جا رہا ہے۔ اگر خزانہ دینے کی ممانعت ہوتی تو واپسی سے کیوں روکا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر میں بیوی کو خزانہ بھی دیا جا سکتا ہے تو عمرؓ آپ پابندی لگانے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی ہیبت اور جلال ایک مشہور بات ہے لیکن اس خاتون نے جس جرأت سے بات کی وہ اسلام کی عطا کردہ ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے جس بردباری سے سنا وہ بھی اسلام کا حکم ہے۔ آپؓ نے خاتون کی بات سنتے ہی سر جھکا لیا اور فرمایا ''اصابت امراۃ و اخطأ عمر'' (خاتون نے ٹھیک کہا اور عمر نے غلطی کی) غور فرمائیے جہاں آزادیٔ رائے کا یہ حال ہو وہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس خطبے کو سن کر تمام فقہاءِ صحابہ کا خاموش رہنا بلکہ اسے قبول کر لینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے ''پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا۔ تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہ کیا اور کسی رد کرنے والے نے اس کو رد نہیں کیا)۔ ان نکات پر غور کرنے سے ایک ساتھ تین طلاقوں کے بارے میں تو حکم بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اسی لیے صحابہ اور تابعین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب ہے مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور بغیر کسی دوسرے شخص کے طلاق و نکاح کے اس کے لیے حلال نہ ہو گی۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ہم معارف القرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی تفصیل یہاں نقل کرتے ہیں:

Marfat.com

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے پیدا ہونے والے دوسوال اور ان کا جواب

اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے۔اس کو رجعت یا نکاحِ جدید کی اجازت نہیں دی۔ پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا کہ عہدِ رسالت میں اور عہدِ صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا' لیکن فاروقِ اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اس طرح تسلیم کرلیا جائے کہ عہد رسالت' عہد صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہوگئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کرلیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء ومحدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے کہ فاروق اعظمؓ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے' وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں۔دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لیے مکرر کہا ہو' تین طلاق کی نیت نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے ہوسکتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی' اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی' بلکہ محض تاکید کے لیے یہ الفاظ مکرر بولے تھے تو آپؐ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرما دیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے۔جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتۃ کے ساتھ طلاق دیدی تھی۔ یہ لفظ عرب کے عرفِ عام میں تین طلاق کے لیے بولا جاتا تھا' مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا اور حضرت رکانہ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی' بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی' انہوں نے اس پر حلف کرلیا' تو آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' دارمی' میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں۔مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتۃ سے طلاق دی تھی۔ یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لیے بولا جاتا تھا' اس لیے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کردیا ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ بات بالاتفاق ثابت ہے کہ حضرت رکانہؓ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اس وقت قرار دیا جب کہ انہوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی۔اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا' نہ ان سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

Marfat.com

اس واقعہ نے یہ بات واضح کردی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے ان میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا' کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا۔ اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا۔ پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے اور آئندہ حدیث کی پیشنگوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا' دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہوگئی کہ تین مرتبہ الفاظِ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان سے نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں اور بیوی کو واپس لینے کے لیے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی۔ فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو سبھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا۔ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے۔ اس لیے قانون یہ بنا دیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائینگی۔ اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ الصدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں' انہوں نے فرمایا ''ان الناس قد اسعتجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضینا علیم۔'' (لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لیے مہلت تھی' تو مناسب رہے گا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کردیں۔''

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرام کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے اور اس سے ان دونوں سوالوں کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالتؐ میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں۔ ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے' جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو' بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کرلیا۔ کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے۔ معاذ اللہ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠
وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا
اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

Marfat.com

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو دستور کے مطابق روک دو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو۔ اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے) (۲۳۱)

معروف کی مزید وضاحت

گزشتہ آیات میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ ایک مطلقہ عورت کو کتنا عرصہ عدت گزارنی ہے؟ اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کتنی طلاقوں کے بعد تم بیوی سے رجوع کر سکتے ہو اور یہ بات بھی پوری طرح واضح کر دی گئی ہے کہ جب رجوع کا فیصلہ کرو تو معروف کے مطابق کرو اور جب علیحدگی کا فیصلہ کرو تو وہ بھی معروف کے مطابق کرو۔ اور معروف سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت ہم متذکرہ بالا گزارشات میں کر چکے ہیں۔ اب اسی حکم کو دہراتے ہوئے اس بات پر مزید زور دیا جا رہا ہے جو معروف کے مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن لوگ ہمیشہ اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں عرب اس عادتِ بد میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے لیکن اسلام آنے کے بعد جن لوگوں کو ابھی پوری اسلامی تربیت نہ مل سکی یا اللہ کے علم میں تھا کہ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوتے رہیں گے ان کے لیے موکد انداز میں یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ تم اگر اپنی بیویوں سے رجوع کا فیصلہ کر چکے ہو تو بہت اچھی بات ہے لیکن یہ رجوع کا فیصلہ اپنے گھر کے حالات' اپنے تعلقات کی بہتری اور حدود اللہ کی بجا آوری کے لیے ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ ارادہ نہ ہو بلکہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ شیطانی خیال موجود ہو کہ دورِ جاہلیت کی طرح اب میں بار بار بیوی سے رجوع تو نہیں کر سکتا البتہ دو امکان تو میرے پاس اب بھی موجود ہیں جس کے ذریعے تقریباً چھ ماہ تک تو بیوی کو اذیت میں مبتلا کیا جا سکتا ہے کہ ایک طلاق دے کر عدت گزرنے کا انتظار کرو اور جب عدت گزرنے کے قریب آئے تو رجوع کر لو۔ پھر دوبارہ طلاق دو اور پھر عدت کا وقت ختم ہونے کے قریب آئے تو رجوع کر لو۔ اور یہ سب کچھ اس طرح کرو کہ نہ تو اپنی بیوی سے میاں بیوی جیسے تعلقات قائم کرو' نہ اسے بیوی کے حقوق دو' بلکہ اسے معلق حالت میں رکھو کہ نہ وہ اپنے آپ کو بیوی سمجھ سکے اور نہ اس کی جان چھوٹے کہ کہیں اور اپنے لیے قسمت آزمائی کرے۔ اس طرح اگر تم اسے ذہنی ٹارچر دینا چاہتے ہو اور تمہیں اس کی محرومی کے آنسو خوشی دینے کے باعث بنتے ہیں تو یہ وہ "ضرار" ہے جسے ایک عام مسلمان کے لیے بھی حرام کر دیا گیا ہے۔ چہ جائیکہ بیوی کے لیے اسے روا رکھا جائے جس کی حیثیت شوہر کے لباس کی ہے۔ اور جو غیر حاضری میں شوہر کی عزت اور غیرت کی محافظ اور اس کے مال اور گھر کی امین ہے۔ اور اس کے گھر میں پلنے والی نسلِ انسانی نے اسی کے بطن سے جنم لیا ہے اور اسی کی تربیت سے فیض یاب ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ تو ایسا معاملہ کرتے ہوئے شرافت کو ویسے ہی پسینہ آنے لگتا ہے لیکن جو شخص بظاہر اسلام کی دی ہوئی ایک رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رجوع کرتا ہے لیکن بباطن وہ ایک گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ وہ حد سے تجاوز ہے جس سے یہاں روکا گیا ہے اس سلسلے میں مزید دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ یہ ظالمانہ حرکت کرتا ہے وہ اصلاً اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ جس نے اپنی بیوی کو مشقِ ستم بنایا مسلمان معاشرے میں اسے دوبارہ بھی عزت والا گھر نہیں مل سکتا۔ اور ایسی کوئی خاتون اس کے عقد میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ جو اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہش

Marfat.com

مند ہو۔اس طرح سے اس کا گھر اس بری طرح سے اجڑتا ہے جو دوبارہ بسنے کا نام نہیں لیتا۔اور اگر اس کی اولاد بھی ہے تو ایک وقت آتا ہے جب اولاد اپنی ماں کی محرومیوں کا انتقام اپنے باپ سے لیتی ہے۔اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تم اگر اس رجوع کو بیوی کو تکلیف پہنچانے اور تنگ کرنے کا ذریعہ بناتے ہو تو تم درحقیقت اللہ کے احکام کا مذاق اڑاتے ہو۔کہ تم ایک یا دو طلاق دینے کے بعد بیوی سے اس لیے رجوع کرتے ہو کہ اللہ نے تمہیں یہ حق دیا ہے گویا کہ تم رجوع کرتے ہوئے حکم خداوندی پر عمل کرتے ہو۔لیکن جب اسی رجوع کو بیوی کی اذیت رسانی کا ذریعہ بناتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بیوی کو اذیت پہنچانے سے منع فرماتا ہے اور تم اسی کے دیے ہوئے حکم کو ذریعہ بنا کر اس ظلم کا راستہ کھولتے ہو۔تو اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم اللہ کے حکم کو اللہ کے حکم سے ٹکراتے ہو۔جس بات کی اجازت ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہو اور جس سے روکا گیا ہے حالانکہ وہ بھی اللہ کا حکم ہے اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔یہ وہ مذاق ہے جو اللہ کے احکام سے کیا جاتا ہے۔اور ہر معمولی عقل کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی یقیناً ایک بہت بڑا جرم ہے لیکن اس کے احکام کا مذاق اڑانا یہ نافرمانی سے بدرجہا بڑا جرم ہے۔اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید فرمایا کہ تمہیں تو اللہ کے احکام کی نافرمانی یا ان کا مذاق اڑانا اس لیے بھی زیب نہیں دیتا کہ تمہیں تو اللہ نے اپنی نعمت یعنی اپنے دین اور اپنی کتاب کا امین بنایا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت سے نوازا ہے۔قیامت تک کے لیے تم حاملِ دعوت امت بنائے گئے ہو۔تم دنیا میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہو جس کی روشنی میں دنیا کو ہدایت کے رستے پر چلنا ہے۔تم کتنی بڑی ذمہ داریوں سے گراں بار ہو اس قدر عظمت اور ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوئے بھی اگر اللہ کے احکام کے ساتھ تمہارا یہ رویہ ہے تو ذرا غور کرو۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

تمہاری اصل حیثیت کا احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی تنبیہ بھی فرما رہے ہیں کہ اللہ سے ڈرو، بیویوں سے معاملہ کرتے ہوئے یہ مت بھولو کہ تمہاری جلوتوں کی طرح تمہارے خلوتیں بھی اللہ کے علم میں ہیں۔وہ اپنے علم کے مطابق تم سے ایک ایک بات کی باز پرس کرے گا۔وہاں تمہاری نہ دروغ گوئی کام دے گی اور نہ سخن سازی کام آئے گی۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ
اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا
بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ

Marfat.com

كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ
رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ
لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى
الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَ
تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا
أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ
وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِينَ
يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ
أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا
فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ
أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ
لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا
عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

Marfat.com

رکوع: ۳۰۔ (اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو انہیں منع نہ کرو کہ وہ نکاح کر لیں اپنے (نئے) شوہروں سے۔ جب کہ وہ رضا مند ہو جائیں آپس میں دستور کے مطابق۔ یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لیے اور بہت صاف ستھرا۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ○ اور مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو سال' اس کے لیے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی مدت کو۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا اور ان کا لباس دستور کے مطابق۔ کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ کسی ماں کو ضرر پہنچایا جائے اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو ضرر پہنچایا جائے اس کے لڑکے کے باعث۔ اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر وہ دونوں دودھ چھڑانے کا ارادہ کر لیں اپنی مرضی اور مشورہ سے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں' جب کہ تم ادا کر دو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا مناسب طریقے سے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو دیکھنے والا ہے ○ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور وہ پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔ پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ اپنے بارہ میں دستور کے مطابق کریں اس کا ان پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے ○ اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم ان عورتوں کو اشارہ و کنایہ سے پیغامِ نکاح دو یا تم اپنے دلوں میں چھپائے رہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے۔ لیکن چپکے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول و قرار نہ کر بیٹھو مگر یہ کہ کہو ان سے دستور کے مطابق کوئی بات۔ اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے۔ اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ سو اس سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بردبار ہے) (۲۳۲ تا ۲۳۵)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو انہیں منع نہ کرو کہ وہ نکاح کر لیں اپنے (نئے) شوہروں سے۔ جب کہ وہ رضا مند ہو جائیں آپس میں دستور کے مطابق۔ یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لیے اور بہت صاف ستھرا۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) (۲۳۲)

Marfat.com

اس آیت کی وضاحت سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ''عـضـل'' کا معنی تو روکنا اور منع کرنا ہوتا ہے لیکن یہ وہ روکنا ہے جسے ہم محاورے میں ''اڑنگے ڈالنا'' کہتے ہیں۔ یعنی مختلف طریقوں سے رکاوٹیں کھڑی کرنا۔ اور دوسری یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ یہاں ''ازواجھـن'' سے مراد ان کے وہ شوہر بھی ہو سکتے ہیں جو انہیں طلاق دے چکے ہیں۔ اور وہ بھی ہو سکتے ہیں جن سے اب نئے سرے سے رشتہ قائم ہو جائے۔

طلاق ہو جانے کے بعد جتنی ممکن صورتیں ہو سکتی ہیں ان کا تعلق خواہ شوہر سے ہو خواہ بیوی سے۔ قرآنِ کریم ایک ایک کے بارے میں اصلاحی احکام دے رہا ہے۔ اگر ان کا تعلق شوہر سے ہے تو شوہر سے خطاب کیا جا رہا ہے اور اگر بیوی سے ہے تو بیوی سے خطاب ہو رہا ہے۔ اور جہاں کہیں دونوں میں سے کوئی بھی حدود سے تجاوز کر رہا ہے تو اسے حدود سے تجاوز کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں شوہروں سے خطاب ہو رہا ہے' کیونکہ اس میں جس بات سے روکا گیا ہے اس کا تعلق شوہروں سے ہے۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مطلق آیا ہے' جس میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ تم نے جو طلاق دی ہے وہ طلاق رجعی ہے' بائن ہے یا طلاقِ مغلظہ ہے' لیکن اس کے بعد جو حکم دیا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طلاقِ رجعی کا ذکر ہے یا زیادہ سے زیادہ طلاقِ بائن کا۔ مغلظہ کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ پروردگار طہر میں صرف ایک طلاق دینے کو ناگزیر حالات میں پسند فرماتے ہیں اور دو طلاقوں کی اجازت دیتے ہیں۔ یکلخت طلاقِ بائن دے دینا سخت ناپسندیدہ ہے۔ اور تین طلاقوں کی صورت میں طلاقِ مغلظہ تو ناقابلِ برداشت حد تک مکروہ قرار دی گئی ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف طلاقِ رجعی مراد ہے جس پر عدت گزر جانے کے بعد نکاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

طلاق کے بعد بیوہ یا مطلقہ پر ممکنہ مظالم کو روکنے کے لیے ہدایات اور احکام

اس کے بعد جو حکم دیا جا رہا ہے اس سے ایک بہت بڑی قباحت اور ایک بہت بڑے ظلم کا راستہ روکنا مقصود ہے۔ عربوں میں یہ ظلم عام تھا اور ہمارے دور میں بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوئی کہ جب کسی خاتون کو طلاق ہو جاتی تھی تو عموماً اس کے اولیاء اور اس کے اہلِ خانہ اس بات کو انتہائی ناپسند کرتے تھے کہ اب وہ دوبارہ نکاح کرے۔ نکاحِ بیوگان اکثر قوموں میں ہمیشہ مسئلہ بنا رہا ہے۔ عربوں میں اگرچہ یہ مسئلہ اس طرح کی شکل تو اختیار نہیں کر سکا تھا جیسی ہم ہندوؤں میں دیکھتے ہیں کہ ان میں اگر کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کی بیوی کو اس کے ساتھ ہی ''ستی'' کر دیا جاتا تھا۔ ''ستی'' کا مطلب یہ ہے کہ جب مرنے والے کی چتا کو آگ لگائی جاتی تو اس بیچاری بیوہ کو بھی اس آگ میں کود جانے پر مجبور کیا جاتا۔ وہ اپنے خاندان کو آگ سے بچانے اور خود گنہگار ہونے سے بچنے کے لیے آگ میں کود کر جان دے دیتی اور اس کی اس حماقت پر اس کا خاندان ہمیشہ فخر کا اظہار کرتا۔ اور اگر کسی خاتون کو اس کا شوہر طلاق دے دیتا تو اب اس کے لیے دوسرا نکاح کرنا ایک بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ اس کے والدین اور اس کے بھائی اسے اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہی حال ہمارے ملک میں بھی ہے۔ ہمارے کتنے تعلیم یافتہ گھرانے ہیں جن میں دوسرے نکاح کو ایک عیب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی مکروہ تصورات کے تحت خود مطلقہ خاتون نکاح کرنے کا کبھی حوصلہ نہیں کرتی۔ وہ جوانی میں اگر مطلقہ ہو گئی تو پوری عمر تنہائی اور بے بسی میں گزارنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ معاشرے کے بعض احساسات جو

Marfat.com

زبانوں سے نہیں نگاہوں سے پڑھے جاتے ہیں، اتنے شدید اور ظالم ہوتے ہیں کہ آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے جال میں پھنسے رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ اور ہمارے ایسے بھی پسماندہ علاقے ہیں جن میں اگر کسی بیوہ یا مطلقہ کو دوبارہ نکاح کی اجازت دی جاتی ہے تو اس شرط پر کہ اسے وہاں نکاح کرنا ہوگا جہاں اس کے والدین چاہیں گے۔ وہ کسی بوڑھے رنڈوے سے ایک بڑی رقم لے کر اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دیتے ہیں اور یہ بیچاری لڑکی بے کسی سے یہ سارے مظالم برداشت کرتی ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان مظالم کے پیچھے ایک اور تصور بھی کار فرما ہے، جس کا ذمہ دار پورا معاشرہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب کسی لڑکی کو طلاق ہو جاتی ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس لڑکی کو ایک ایسا داغ لگ گیا ہے جس کی موجودگی میں کسی بھی معزز گھرانے کا کوئی تعلیم یافتہ نوجوان اس کی طرف رجوع کرنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ جس نے اسے طلاق دی ہے اسے معاشرہ نہیں پوچھتا کہ تم نے ظلم کیوں کیا؟ لیکن جو لڑکی اس ظلم کا شکار ہوئی ہے اسے زندگی بھر کے دکھ سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عربوں میں بھی کم وبیش اس طرح کے تصورات پائے جاتے تھے۔ اس لیے عموماً وہ لڑکیوں کو اپنی مرضی اور اپنی چاہت سے دوسرا نکاح کرنے کی مشکل سے ہی اجازت دیتے تھے۔

اولیاء اور اہلِ خانہ کے علاوہ ایک ظلم اس پر سابقہ شوہر کی جانب سے ہوتا تھا جو اپنی بیوی کو چھوڑ چکا اور اب وہ نہیں چاہتا کہ اس خاتون کا کہیں اور نکاح ہو سکے۔ اس لیے جہاں بھی بات چلتی وہ غلط فہمیوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیتا اور نئے ہونے والے تعلق کو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بنا دیتا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ اگر طلاق کے بعد عدت کے دوران یا عدت سے فارغ ہو کر میاں بیوی دونوں محسوس کرتے کہ ہم نے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر غلطی کی ہے یا شوہر یہ سمجھتا کہ میں نے طلاق دے کر ظلم کیا ہے تو شوہر اپنی مطلقہ سے بالواسطہ رابطہ پیدا کرتا اور اسے قائل کر لیتا کہ ہمیں دوبارہ نکاح کر لینا چاہیے تو لڑکی کے والدین یا اس کے بھائی اڑ جاتے کہ جس شخص نے تمہیں طلاق دے کر تمہاری اور ہماری توہین کی ہے اور تمام لوگوں میں ہماری رسوائی کا سامان کیا ہے اب دوبارہ ہم ایسے شخص کے ساتھ کسی قیمت پر بھی تمہاری شادی کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ اس آیتِ کریمہ میں مظالم کی ان تمام صورتوں سے روکا ہے۔ کہ جب ایک خاتون کو طلاق ہو جاتی ہے اور ابھی وہ اس عمر میں ہے کہ اسے دوسرا نکاح کر کے اپنا گھر بسا لینا چاہیے، چاہے وہ پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے یا نئی جگہ قسمت آزمانا چاہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ معروف طریقے سے اسلامی احکام کے مطابق خاندان کی عزت وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کر رہی ہے تو تمہیں ہرگز اس کے راستے میں اڑنگے نہیں ڈالنے چاہئیں۔ چنانچہ اس آیت کا شانِ نزول بھی ایسے ہی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کر دی تھی۔ میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہوئی اور شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی۔ اس کے بعد یہ شخص اپنے اس فیصلے پر نادم ہوا اور اس نے دوبارہ اپنی مطلقہ سے نکاح کرنے کا فیصلہ کیا۔ کسی رابطے سے مطلقہ بیوی کو راضی کر لیا۔ بیوی کی آمادگی کے بعد اس کے بھائی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے پاس گیا کہ میں نے طلاق دے کر غلطی کی اب میں اس پر نادم ہوں اور میں دوبارہ آپ کی بہن سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت معقل کو چونکہ اس کے طلاق دینے سے رنج ہوا تھا اس لیے انہوں نے نہایت برہمی کے ساتھ جواب دیا کہ میں نے تمہارا اعزاز کیا کہ اپنی بہن تمہارے نکاح میں دی اور تم نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کو طلاق دے دی۔ اب تم دوبارہ میرے پاس آئے ہو اللہ کی قسم اب میری بہن تمہارے نکاح میں نہیں لوٹے گی۔

Marfat.com

آیت کا شانِ نزول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چچا زاد بہن کا بھی پیش آیا۔ ان کے شوہر نے بھی دوبارہ نکاح کا ارادہ کیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس نکاح میں حائل ہوگئے۔ چنانچہ یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس میں ان حضرات کو توجہ دلائی گئی کہ طلاق واقعی ایک بڑی زیادتی ہے' لیکن غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں' اب دوبارہ اگر میاں بیوی مل بیٹھنا چاہتے ہیں تو تمہیں ان کی اس نیکی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سچے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت رکھنے والے تھے اس لیے جیسے ہی اس آیتِ کریمہ کا نزول ہوا حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا سارا غصہ جاتا رہا اور خود جا کر دوبارہ اسی طلاق دینے والے شخص سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا اور قسم کا کفارہ ادا کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے طرزِ عمل کو یکسر بدل ڈالا۔

اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کا مفہوم

اس حکم کے الفاظ پر غور کیجیے لڑکیوں کے اولیاء یا ان کے سابقہ شوہروں کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم کسی طرح بھی دوبارہ نکاح کے راستے میں اڑنگے مت ڈالو۔ لیکن ساتھ ہی شرط لگائی اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (جب وہ دونوں مرد و عورت معروف طریقے سے اس نئے تعلق پر رضامندی کا اظہار کریں) تو پھر انہیں نکاح سے روکنے کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن اگر ان کا نکاح کرنا معروف کے مطابق نہ ہو یا سرے سے اس میں رضامندی شامل نہ ہو' بلکہ لڑکی کے گھر والے زبردستی اسے کسی کے سپرد کر رہے ہوں اور وہ وہاں نکاح کے لیے تیار نہ ہو تو پھر جو کوئی بھی لڑکی کو اس ظلم سے بچا سکتا ہے اسے اس نکاح کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یا وہ لڑکی کسی کے ساتھ بغیر نکاح کے ایسے تعلقات پیدا کر لے اور اس کے گھر میں بیوی بن کر بیٹھ جائے یا ایامِ عدت ہی میں کسی کے ساتھ نکاح کے لیے تیار ہو جائے' یہ تمام صورتیں چونکہ شرعی احکام کے خلاف ہیں اس لیے روکنے والوں کو حق ہے کہ وہ اس رشتے کو روک سکتے ہوں تو روک دیں۔

ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ لڑکی احکام شریعت کی مخالفت تو نہ کرے' شرعی احکام کے مطابق ہی نکاح کیا جائے لیکن وہ اپنے اولیاء کے اجازت کے بغیر کسی ایسی جگہ نکاح کے لیے آمادہ ہو جائے جو اس کے خاندان کا ''کفو'' نہ ہو۔ یا وہ مہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جس سے اس کی خاندانی وجاہت پر حرف آتا ہو تو یہ بھی اسلامی شریعت کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اس صورت میں اولیاء کو شریعت نے حق دیا ہے کہ وہ لڑکی کو نکاح کرنے سے روک دیں۔ لیکن اس آیتِ کریمہ کی اصل روح جس پر زور محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے نکاح کے لیے احکامِ شریعت کی پابندی بھی ہونی چاہیے' خاندانی عزت و وقار کے لیے کوئی مسئلہ بھی پیدا نہیں ہونا چاہیے' معاشرے کے ایسے کسی رسم و رواج کی مخالفت بھی نہیں ہونی چاہیے جسے اسلام برداشت کرتا ہے۔ لیکن یہ ظلم بھی کسی طور وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے کہ لڑکی کی رضامندی اور اس کی مرضی اور اختیار کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ اس کے جذبات کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہ کی جائے' اپنے مفادات اور خواہشات پر اس کے احساسات کو قربان کر دیا جائے۔ یہ ظلم چونکہ جاہل معاشروں میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے' عربوں میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہو رہا ہے اس لیے زیادہ زور اس ظلم کے روکنے پر دیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

ان معاشرتی ہدایات پر عمل کے لیے ایمان باللہ وایمان بالآخرت ضروری ہے

اسی کی تاکید کے لیے آگے فرمایا کہ جس بات کی تمہیں نصیحت کی جارہی ہے یہ نصیحت درحقیقت اس آدمی کے لیے مفید ہے جس کے دل میں اللہ پر ایمان اور آخرت کا یقین موجود ہو۔ کیونکہ صدیوں کے جمے ہوئے رسم ورواج کو توڑنا اور معاشرے کی روایات کا خاتمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ صرف وہی شخص کرسکتا ہے جسے اس بات کا یقین ہو کہ میرا ایک پروردگار ہے' جو درحقیقت حاکمِ حقیقی ہے۔ اس کے حکم کے مقابلے میں کسی اور کا حکم نہیں چل سکتا' جب اس نے عورت کو ایک خاص دائرے میں آزادی عطا فرمائی ہے اور اسے دوسرے نکاح کا حق بخشا ہے اور اس کی مرضی اور اختیار کے بغیر کوئی نکاح اس پر مسلط نہیں کیا جاسکتا تو پھر میرے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ممکن نہیں کہ میں اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردوں اور ایک محکوم کی طرح اس حاکم حقیقی کے سامنے جھک جاؤں۔ کیونکہ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ آج اگر میں اس حکم کی تعمیل نہیں کرتا اور اپنے نام نہاد تصورات اور روایات کی پوجا کرتا رہتا ہوں تو ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میرے اس رویے کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہوگی۔ اور باز پرس کرنے والی وہ ذات ہوگی جو اس کائنات کی خالق و مالک ہے۔ جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوگی۔ جہاں ایمان وعمل کے سوا کوئی سکہ کام نہیں دے گا۔ اللہ پر ایمان اور آخرت پر یقین یہی دو چیزیں ہیں جو اللہ کے احکام کی تعمیل کی ضمانت دیتی ہیں۔

یہ ہدایات معاشرے کو اخلاقی فساد سے محفوظ رکھنے کا سب سے مؤثر نسخہ ہیں

دوسری بات یہ فرمائی کہ اس حکم کی تعمیل تمہارے لیے اَزْکٰی بھی ہے اور اَطْھَرُ بھی۔ یعنی اسی پر عمل کرنے کے نتیجے میں تمہیں پاکیزگی کا وہ راستہ ملے گا جس سے بہتر کوئی راستہ نہیں اور تطہیر افکار اور تطہیر اخلاق کی وہ روشنی میسر آئے گی جس میں تم اجتماعی زندگی کے سفر کو نہایت کامیابی سے طے کرسکو گے۔ اور اگر تم نے صنفِ نازک پر یہ پابندیاں جاری رکھیں اور تم نے بات بات پر اسے غیرت اور ناک کا مسئلہ بنایا تو پھر یاد رکھو انسان کے اندر ایک نفس امارہ ہے' جو اسے ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے اور ایک شیطان ہے جو اسے ہمیشہ برائی پر اکساتا ہے۔ انسان کے اندر اللہ نے خواہشاتِ نفس بھی رکھی ہیں اور جنسی جذبات بھی۔ جب انہیں بروئے کار آنے کے لیے صحیح راستہ نہیں ملتا تو پھر نفس امارہ اور شیطان ان کے لیے غلط راستے تجویز کرتے ہیں۔ تم اپنی جوان خواتین کو ان کے فطری جذبات کے اظہار کی اگر جائز صورتوں سے محروم کردو گے تو تم خود ان کے لیے خطرات کے راستے کھولو گے' شیطان کو اپنا کام کرنے کا موقع دو گے۔ ان کی تنہائیاں ان کے نفس امارہ کے حوالے ہوجائیں گی اور معاشرے کے وہ بگڑے ہوئے عناصر جو ہمیشہ شیطان کے ایجنٹوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ان کو ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے۔ وہ ایسی خواتین سے راہ ورسم پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔ جیسے ہی کوئی رخنہ پیدا ہوا کسی کواڑ کا پٹ سرکا' کسی شگاف میں آنکھیں جھانکنے لگیں تو سمجھ لو تمہارے گھر میں برائی نے راستہ پیدا کرلیا ہے۔ شروع میں نامہ وپیام ہوگا' پھر اکساہٹیں ہوں گی' پھر اغوا تک نوبت پہنچے گی اور اگر اغوا کا بھید کھل گیا تو پھر قتل ہوں گے' خاندانوں میں خون بہے گا۔ اس وقت شاید آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس الاؤ کو چنگاری میں نے خود مہیا کی تھی۔ میں نے فطری راستے کو جب ظلم سے بند کیا تو اس نے غلط راستہ کھول کر میرے گھر کو آگ لگادی۔ اس لیے فرمایا کہ ہم تمہیں جس بات کا حکم دے رہے ہیں' یہ تمہارے گھر اور تمہارے معاشرے کو پاکیزہ وصاف ستھرا رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور اسے چھوڑنے کے جو نتائج ہوسکتے ہیں' جن کی طرف ہم نے اشارے کیے انہیں اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ اس لیے اللہ کے علم سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کے احکام کی دل کی آمادگی سے تعمیل کرو۔

Marfat.com

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

(اور مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو سال' اس کے لیے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی مدت کو۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا اور ان کا لباس دستور کے مطابق۔ کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ کسی ماں کو ضرر پہنچایا جائے اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو ضرر پہنچایا جائے اس کے لڑکے کے باعث، اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر وہ دونوں دودھ چھڑانے کا ارادہ کرلیں اپنی مرضی اور مشورہ سے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں' جب کہ تم ادا کردو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا مناسب طریقے سے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو دیکھنے والا ہے) (۲۳۳)

رضاعت کے مسائل

بچوں کو دودھ پلانے اور ان کی تربیت کے مسائل ہمیشہ ہی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ ابھی بچہ دودھ پی رہا ہے اور باپ نے بچے کی ماں کو طلاق دے دی یا باپ مر گیا اور ماں بیوہ ہوگئی۔ ایسی ناخوشگوار صورتحال میں بچے کو دودھ پلانے کے مسائل اور بھی سنگین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں رضاعت کے اور بچے کی تربیت کے حوالے سے جو مسائل بیان کیے جا رہے ہیں ان کا تعلق معمول کی زندگی سے بھی ہے اور ایسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بھی۔ اس آیت سے پہلے اور بعد بھی چونکہ طلاق کا ذکر ہے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن زیادہ تر ان عورتوں کی طرف ہے جنہیں طلاق ہو چکی ہو اور بچے ان کے ابھی دودھ پی رہے ہوں۔ اس سلسلے میں جو احکام دیے گئے ہیں ہم انہیں ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں:

ا۔ بچوں کو دودھ پلانا ماؤں کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر انہیں کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو تو دیانتاً ان پر دودھ پلانا واجب ہے۔ وہ بلا کسی عذر کے دودھ پلانے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتیں۔ ماں کے لیے بچے کو دودھ پلانا صرف بچے کو غذا مہیا کرنا نہیں (اگرچہ غذا کے نقطۂ نگاہ سے بھی کوئی اور دودھ ماں کے دودھ کی برابری نہیں کرسکتا۔ طبی نقطۂ نگاہ سے نہ صرف بچے کے لیے یہ دودھ سب سے محفوظ اور مفید غذا ہے۔ بلکہ ماں کے لیے بھی سینے کے امراض سے تحفظ کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ جو مائیں اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں وہ عموماً سینے یا اور کسی جسمانی عارضے کا شکار ہو جاتی ہیں) بلکہ بچے کی اصلاح اور تربیت کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔ ماں اگر اپنے اندر کوئی روحانی خصوصیات رکھتی ہے اور اس کے اندر اخلاقی اقدار کا گہرا احساس پایا جاتا ہے اور وہ نظریاتی طور پر مضبوط عقائد کی حامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے

Marfat.com

خاندان کی صالح خصوصیات کی حامل بھی ہے تو یہ تمام قیمتی سرمایہ دودھ کے ساتھ بچے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے ڈاکٹر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ موروثی امراض ماں باپ سے بچے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اسی طرح ماں کی خاندانی خصوصیات اور اس کی متذکرہ بالا صفات کا بھی معتدبہ حصہ بچے کے تحت الشعور میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بچہ جب تھوڑا سا بڑا ہو کر تربیت کو قبول کرنے کے قابل ہوتا ہے تو تحت الشعور میں مخفی یہ صفات آہستہ آہستہ تربیت کا حصہ بننے لگتی ہیں۔ اور ماں باپ کی تمام روحانی' اخلاقی اور روایتی خصوصیات آہستہ آہستہ اس کے نظریات' اخلاق اور اعمال میں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ اور جو بچے اس نعمت سے محروم رہتے ہیں اگرچہ گھر کا ماحول بھی ان میں بہت ساری خصوصیات کو پیدا کر دیتا ہے لیکن جو خصوصیات دودھ کے ساتھ منتقل ہوتی ہیں وہ بچہ یقیناً اس سے محروم رہتا ہے اور ماں باپ کے طور اطوار کا قابلِ ذکر حصہ اسے نہیں ملتا۔ ہم ہمیشہ اخلاقی بگاڑ کے اسباب تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کاش ہم کبھی ان فطری عوامل پر بھی توجہ دے سکیں۔ اور کاش کبھی ماں باپ کو ماں باپ بننے سے پہلے ان باتوں کا احساس بھی دلایا جاسکے تاکہ وہ غیر شعوری طور پر بچوں کو اس دولت سے محروم نہ رکھیں۔ اور وہ دل کی گہرائیوں سے اس بات کو تسلیم کرلیں کہ ماں کے سینے سے صرف دودھ ہی نہیں پھوٹتا' بلکہ شعور کا ایک نور بھی طلوع ہوتا ہے جو بچے کے سینے کو روشن کر دیتا ہے اور ماں باپ کے پاکیزہ اطوار بچے کے طور اطوار کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور ماں باپ کی باتوں باتوں اور اپنے عمل کی صورت میں دی ہوئی تعلیم اور پھر اسلامی طریقے سے ان کا طریقِ تربیت ان کے اندر وہ نتائج پیدا کرتا ہے جس سے اسلامی فکر اور اسلامی عمل وجود میں آتا ہے۔ اکبر مرحوم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

بو آئے کیا بچے میں ماں باپ کے اطوار کی
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

۲۔ معمول کی زندگی میں تو میاں بیوی خوش اسلوبی سے جو مشورہ کرلیں اس پر عمل کریں۔ لیکن طلاق کے بعد شوہر اگر اپنی مطلقہ سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ بچے کو پورے دو سال دودھ پلائے تو پھر بچے کی ماں کے لئے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانا ضروری ہے۔ بچے کو دو سال دودھ پلانا بچے کا حق ہے بچے کو اس قدرتی اور فطری غذا سے بلاوجہ محروم نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں اگر ماں طبی نقطۂ نگاہ سے دودھ پلانے سے معذور ہو جائے یا اس کے لیے کوئی مشکل پیدا ہو جائے تو پھر وہ عذر بھی کرسکتی ہے۔ ورنہ عام حالت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سابقہ خاوند کے کہنے پر پوری مدت بچے کو دودھ پلائے۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ میاں بیوی اپنے مشورے سے کسی مجبوری کے باعث اسے کم تو کرسکتے ہیں' اس میں اضافہ نہیں کرسکتے۔ دو سال گزرنے کے بعد ماں کے لیے بچے کو اپنا دودھ پلانا بالکل حرام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے جو اختلاف ذکر کیا جاتا ہے اس کا تعلق غالباً مدتِ رضاعت سے نہیں۔ بلکہ اس بات سے ہے کہ اگر کسی خاتون نے کسی غیر بچے کو دو سال کی عمر کے بعد بھی دودھ پلایا اگرچہ دودھ کی مدت گزر چکی ہے پھر بھی رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ دودھ پلانے والی خاتون بچے کی رضاعی ماں کہلائے گی۔ اور ان کے درمیان ماں بیٹے کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔

۳۔ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ماں بچے کو جب تک دودھ پلاتی ہے اس وقت تک اس کے کھانے پینے' رہنے سہنے اور کپڑے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے اور باپ یہ ذمہ داری دستور کے مطابق ادا کرے۔ دستور سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے کے ماں باپ دونوں امیر ہوں تو عورت کو امیرانہ ضروریات مہیا کی جائیں' اس کا کھانا پینا پرتکلف ہو اور لباس بھی اس کی شان کی لائق ہو۔ لیکن

Marfat.com

اگر دونوں کے مالی حالات میں واضح تفاوت پایا جائے تو پھر جمہور کی رائے یہ ہے کہ مرد کے حالات کا لحاظ کیا جائے گا۔ اگر وہ غریب آدمی ہے تو اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا اور اگر وہ امیر آدمی ہے تو پھر اسے اپنی حیثیت کے مطابق بچے کی ماں کو ضروریات مہیا کرنی چاہئیں۔

اس آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا کہ ماؤں کے لیے تو ''وَالِـدٰتُ'' کا لفظ استعمال ہوا جو والدہ کی جمع ہے لیکن باپ کے لیے بجائے والد کا لفظ استعمال کرنے کے ''اَلْمَوْلُوْدُ لَهٗ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (وہ شخص جس کا بچہ ہے) حالانکہ قرآنِ کریم میں باپ کے لیے ''والد'' کا لفظ ایک سے زیادہ جگہ پر آیا ہے۔ لیکن یہاں ''والد'' کے بجائے مذکورہ لفظ استعمال کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بچے کی رضاعت اور باقی تمام معاملات کے مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر بچے کو دودھ پلانے کے لیے اگر اس کی ماں کو طلاق ہو چکی ہے اور وہ دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو اجرت کی ذمہ داری بھی باپ ہی کے سر پر ہے۔ باپ یہ کہہ سکتا ہے کہ بچہ جس طرح میری ذمہ داری ہے اسی طرح ماں کی بھی ذمہ داری ہے۔ آخر یہ تمام اخراجات کا بار مجھ پر ہی کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ اس کے اس احساس میں کمی پیدا کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی کہ حقیقت میں بیٹا تمہاری طرف ہی منسوب ہوگا۔ وہ کہیں بھی رہے جب بھی اپنا نسب بتائے گا تو باپ کا نام لیے بغیر چارۂ کار نہیں۔ کیونکہ نسب باپ ہی سے چلتا ہے۔ ماں یقیناً حقوق اور احترام میں باپ کے ساتھ شریک ہے۔ لیکن انتساب میں باپ منفرد ہے۔ اس لیے ذمہ داریوں کا بار بھی باپ پر ہی ڈالا گیا ہے اور یہی ہر طرح سے مناسب بھی ہے۔

۴۔ فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ ماں اگر بچے کو دودھ پلانے سے کسی مجبوری کے باعث انکار کر دے تو باپ کے لیے اسے مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم چونکہ ماں ہو اس لیے چاہے کچھ بھی ہو تمہیں بہر صورت دودھ پلانا پڑے گا۔ اسی طرح اگر ماں اس بات پر اصرار کرے کہ چونکہ اب بچہ طلاق کے بعد تمہاری ذمہ داری بن چکا ہے تو میں تو صرف اس صورت میں دودھ پلاؤں گی کہ تم مجھے ایک بڑی رقم کی صورت میں اجرت ادا کرو اور باپ اپنی مالی پریشانیوں کے باعث اس کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ تو باپ پر یہ سارا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا بلکہ ماں کو کسی مناسب اجرت پر راضی ہونا پڑے گا۔ اسی طرح اگر بچہ کسی دوسری عورت کا دودھ قبول نہیں کرتا' نہ کسی جانور کا دودھ پینے کے لیے تیار ہے اور اگر پیتا ہے تو اسے ہضم نہیں ہوتا تو پھر باپ سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے تم جہاں چاہے جھک مارو یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ بلکہ ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ جیسے بھی ہو وہ بچے کو دودھ پلائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ بچے کے بارے میں نہ ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔ دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا مکلّف ہے۔

۵۔ اگر سوئے اتفاق سے باپ چل بسے اور بچہ یتیم رہ جائے تو اب سوال یہ ہے کہ بچے کی رضاعت' تربیت' اور غور و پرداخت کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے ''وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِکَ'' (جو ذمہ داریاں بچے کے حوالہ سے باپ پر تھیں وہی ذمہ داریاں بچے کے وارث پر بھی ہیں) یعنی اگر بچہ مر جائے تو جو اس کے ترکہ کے وارث ہوں گے وہی اب اس کی رضاعت اور تربیت کے ذمہ دار بھی ہیں۔ اور اگر اس کے وارث ایک سے زیادہ ہوں تو ہر ایک پر بقدرِ میراث اس کے نفقہ کی ذمہ داری ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ذمہ داری صرف دودھ پلوانے کی حد تک نہیں بلکہ جب تک بچہ بالغ نہیں ہو جاتا اس وقت تک بچے کی تمام ذمہ داریاں وارثوں کے سر ہیں۔ فرض کیجئے کہ بچے کے وارثوں میں اس کی ماں اور اس کے دادا زندہ ہیں۔ تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی۔ اس لیے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدرِ حصۂ میراث عائد ہوگا۔ یعنی ایک تہائی ماں کے ذمے اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا۔

Marfat.com

۶۔ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا سے ایک اور مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورے سے شیر خوارگی کی مدت میں کمی کرتے ہوئے دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانے کا فیصلہ کر لیں۔ اس فیصلے کا سبب ماں کی معذوری ہو یا بچے کی بیماری یا کوئی اور قابلِ لحاظ سبب' تو پروردگار فرماتے ہیں کہ اس میں ماں باپ کے لیے کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ کہ ہر صورت میں بچے کی مصلحت پیش نظر رہنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ میاں بیوی کے جھگڑے کا اثر بچے کی صحت اور زندگی پر پڑے۔ یہ آپس کے اختلافات میں الجھے رہیں اور بچہ اس کے نتیجے میں بیماری کی نذر ہو جائے۔

۷۔ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں ایک اور بات ارشاد فرمائی جا رہی ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس کے دو مفہوم مراد لیے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میاں بیوی باہمی مشورے سے کسی اور سے دودھ پلوانا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہے اور اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جس عورت سے دودھ پلوانے کا فیصلہ ہوا ہے اسے دینے دلانے کی جو قرارداد پاس ہو اس کے مطابق اسے ٹھیک ٹھیک ادا کیا جائے۔ اور اسی تناسب سے دیا جائے جتنا معاشرے میں رواج اور دستور بن چکا ہو اور شرفاء جس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ اور دوسرا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اگر بچے کا باپ یا باپ کے مرنے کی صورت میں بچے کے وارث بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانے کا فیصلہ کر لیں تو ایسا کر لینے میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن یہ بات ضروری ہے کہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کے سلسلے میں جو معاہدہ ہو چکا تھا اور جس کا وعدہ کیا جا چکا تھا اُس کی پابندی کی جائے۔ ماں کو اس طرح کا صدمہ نہیں پہنچانا چاہیئے جس سے وہ یہ سمجھے کہ مجھ سے میرا بچہ بھی چھین لیا گیا ہے اور مجھے بالکل بے کس اور بے بس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ رضاعت اور تربیت کے مسائل بہت نازک ہیں اور میاں بیوی کے اختلافات اور علیحدگی کی صورت میں اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جانبین منفی جذبات کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ بچے کے معاملات جن کے سپرد بھی ہوں وہ اللہ سے ڈریں۔ بلکہ براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ بچے کی دیکھ بھال کرنے والو! ہم نے تمہیں اس کے لیے ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ اور تمہاری ذمہ داریوں سے تمہیں پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن تم ان ذمہ داریوں سے صرف اس صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہو کہ اللہ سے ڈرو اور یہ یقین رکھو کہ تم حاضر و غائب جو کچھ کرو گے۔ اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ وہ تمہارے ایک ایک معاملے کو دیکھ رہا ہے اور اسی کے مطابق تمہاری جزاء و سزاء کا فیصلہ ہو گا۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ○

(اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور وہ پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔ پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ اپنے بارہ میں دستور کے مطابق کریں اس کا ان پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے) (۲۳۴)

Marfat.com

بیوہ کی عدت اور اس کی طوالت کی حکمت

طلاق کی صورت میں عدت کی مدت کیا اور کتنی ہے؟ اس کی تفصیل اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں ان عورتوں کی عدت بیان کی جا رہی ہے جن کے شوہر وفات پا جائیں۔ یہ عدت چار مہینے دس دن ہے۔ اور یہ عدت ہر اس عورت کو گزارنی لازم ہے جس کا شوہر نکاح کے بعد فوت ہو جائے۔ چاہے اس کے ساتھ عمر کا ایک حصہ گزرا ہو چاہے چند دن یا چند گھنٹے اور چاہے اس سے خلوتِ صحیحہ بھی نہ ہوئی ہو۔ لیکن نکاح سے وہ شوہر بن چکا اور جس لڑکی سے نکاح ہوا وہ بیوی بن گئی۔ اب شوہر کی وفات کی صورت میں ہر طرح کی بیوہ ایک جیسی عدتِ وفات گزارے گی۔

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں تو اس سے مراد صرف یہ نہیں کہ وہ نکاح نہ کریں' بلکہ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ اپنے آپ کو ہر طرح کی زینت اور زیب و آرائش سے روکے رکھیں۔ احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ زمانۂ عدت میں عورت کو رنگین کپڑے پہننے' مہندی اور سرمہ اور خوشبو اور خضاب لگانے اور بالوں کی آرائش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اور زمانۂ عدت عورت کو اسی گھر میں گزارنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہو۔ البتہ دن کے وقت کسی شدید ضرورت کے باعث وہ باہر بھی جا سکتی ہے' لیکن رات دوسرے کسی گھر میں نہیں گزار سکتی۔

ایسی عورت کی عدت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا کہ ''اگر چاندرات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انتیس کے ہوں چاند کے حساب سے پورے کیے جائیں۔ اور اگر چاندرات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کیے جائیں گے۔ پس کل ایک سو تیس دن پورے کیے جائیں گے۔ اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں۔ اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آئے گا تو عدت ختم ہو جائے گی۔'' (معارف القرآن)

آپ نے دیکھا کہ شوہر کے مرنے کی صورت میں بیوہ کی عدت کی مدت دوسری مطلقہ عورتوں سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی بیوہ دوہرے صدمے کا شکار ہوتی ہے' ایک تو شوہر سے الگ ہونے اور گھر چھوٹنے کا صدمہ۔ کیونکہ اگر شوہر اس کے لیے الگ گھر چھوڑ کر نہیں گیا اور ابھی اولاد اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اپنی والدہ کو الگ گھر لے کر عزت سے کفالت کر سکیں تو ایسی صورت میں بیوہ خاتون کو اپنے شوہر کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ مطلقہ عورت بھی شوہر کے گھر کو چھوڑنے کے صدمے سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اندر چونکہ منفی جذبات کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اشتعال میں ہر کام کر گزرتی ہے اور اس کا اسے شدید احساس نہیں ہوتا۔ لیکن بیوہ خاتون کے لیے گھر چھوڑنا زیادہ صدمے کا باعث ہوتا ہے کیونکہ اس گھر سے اس کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہاں اسے اپنے شوہر کے سانسوں کی خوشبو آتی ہے۔ وہ اسے چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس گھر کو چھوڑنا اس کے لیے بڑی اذیت کا باعث ہوتا ہے۔

اور دوسری یہ بات کہ بیوہ عورت صرف گھر چھوڑنے کے صدمے سے دوچار نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل غم شوہر کی ہمیشہ کی جدائی ہے۔ جو زندگی اس کے لیے چراغ بن کر جلتی رہی اب اس کے بجھ جانے سے اس کے چاروں طرف تاریکیاں چھا گئی ہیں۔ اس کے لیے کوئی نیا فیصلہ کرنا آسان نہیں اور اس سوگ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ایک مدت چاہیے۔ ہم جب ان دونوں باتوں پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پروردگار نے انسان کے نازک احساسات کا کس حد تک لحاظ فرمایا۔ دوسری مطلقہ عورتوں سے عدت طویل رکھی تاکہ بیوہ عورت اپنے آپ

Marfat.com

کوسنبھال سکے۔ بلکہ صدمے نے جس طرح اسے بکھیر کر رکھ دیا ہے اسے سمیٹ سکے۔ اور دوسری جگہ ایک آیت میں اسی صدمے کا شاید احساس کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ مرنے والے شوہر کو چاہیئے کہ وہ جاتا ہوا وصیت کر جائے کہ اس کی بیوی کو گھر سے ایک سال تک نہ نکالا جائے۔ اگر تو اس کے بچے بڑے ہوں تو نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بشرطیکہ مرنے والا وراثت میں گھر چھوڑ گیا ہو۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو پھر ہر صورت میں اسے گھر چھوڑنا ہوگا اس لیے وارثوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ مرنے والے کی وصیت کے مطابق ایک سال تک اس خاتون کو اس گھر میں رہنے دیں۔ تاکہ وہ آئندہ کے لیے فیصلے بھی کر سکے اور سوگ کی مدت اطمینان سے گزار سکے۔

مزید یہ کہ اس بیوہ کو آئندہ کیا کرنا ہے؟ نئی شادی کرنی ہے یا نہیں؟ کرنی ہے تو کہاں کرنی ہے؟ اسی طرح کے اور سوالات جن سے وہ خاتون دوچار ہوگی۔ وہ تنہا یا کسی کے مشورے سے فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ یہاں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ خاتون اپنے بارے میں معروف کے مطابق فیصلے کرے (معروف کی وضاحت اس سے پہلے ہو چکی ہے) تو شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیاء کو اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ہاں اگر وہ معروف اور دستور سے تجاوز کرے یا وہ ''کفو'' کی پابندی نہ کرے جس سے خاندان کی عزت پر حرف آ سکتا ہو تو بے شک اس کے اولیاء اور شوہر کے وارثوں کو بھی رکاوٹ بننے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو پھر اس بیوہ خاتون کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور آخر میں فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کرو گے اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔ اس لیے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضرور سوچنا کہ ہمارا اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہم اس کے علم کے حصار میں ہیں۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنتُمْ فِىٓ اَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىٓ اَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝

(اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم ان عورتوں کو اشارہ و کنایہ سے پیغامِ نکاح دو یا تم اپنے دلوں میں چھپائے رہو، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، لیکن چپکے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول و قرار نہ کر بیٹھو مگر یہ کہ کہو ان سے دستور کے مطابق کوئی بات، اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے، اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، سو اس سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بردبار ہے) (۲۳۵)

مرحوم شوہر اور بیوہ کے جذبات کا احترام لازم ہے

ایک بیوہ عورت شوہر کے مرجانے کے بعد ایک طویل مدت تک سوگ کی حالت میں بیٹھی ہے۔ قریب و بعید کے رشتہ دار اور دیگر جان پہچان والے خوب جانتے ہیں کہ یہ خاتون جوانی میں ایک بڑے حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔ اور اس نے جب تک اپنے شوہر کے ساتھ وقت گزارا ہے اس کی شرافت، محبت اور وفا سے بھی سب واقف ہیں۔ شکل و صورت بھی اللہ نے خوب عطا فرمائی ہے۔ ایسے حالات میں ممکن نہیں کہ

Marfat.com

جولوگ خودشادی کی عمر میں ہیں اور جنہیں اچھے رشتے کی تلاش ہے وہ ادھر متوجہ نہ ہوں۔ اور یہ بات بھی معروف ہے کہ شرفاء میں اگر کوئی اچھا رشتہ پہل کر جاتا ہے تو بعد کا آنے والا رشتہ چاہے کتنا بھی اچھا ہو اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اس سے خاندانی وجاہت پر حرف آ جاتا ہے۔ انسانی جذبات اور فطرت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اس بات کا امکان ہے کہ تعزیت کے لیے آنے والے یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ قرآنِ کریم جو نہایت نازک جذبات کی ترجمان کتاب ہے اور جس میں ہر طرح کی صورتحال کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں کیونکہ خالقِ فطرت سے بڑھ کر فطرت کے تقاضوں اور طبیعت کے رجحانات سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ایسی ہی نازک صورتِ حال کے بارے میں رہنمائی دی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے حقِ قرابت کے باعث اس بیوہ خاتون اور اس کے اولیاء کے پاس جب تعزیت کے لیے جاؤ یا ایک وقت گزرنے کے بعد کسی اور کام سے جاؤ تو وہاں پیغامِ نکاح کے حوالے سے کوئی بات کہنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ خاتون اور اس کا خاندان ایک موت کے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔ مرنے والا جس طرح ان کا عزیز تھا اسی طرح تمہارا بھی تو دینی بھائی تھا۔ ہو سکتا ہے تم سے قرابت بھی رکھتا ہو۔ تو اس تعلق کے باعث اس کی موت کا صدمہ تمہیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ابھی اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم شادی کی باتیں شروع کر دو۔ اور مزید برآں یہ کہ جس خاتون سے تم نکاح کے خواہاں ہو اس غم نے اس کے آبگینے کو کس قدر ٹھیس پہنچائی ہے۔ اور اس کا احساس کس قدر کرچی کرچی ہوا ہے۔ وہ ابھی ان کرچیوں کو سمیٹ رہی ہے تم اگر اس سے کوئی ایسی بات کہو تو یقیناً اس کے صدمے میں اضافہ ہوگا۔ وہ بجائے تم سے اچھا تاثر لینے کے برا تاثر بھی لے سکتی ہے۔ اس لیے تم کسی مناسب موقع کا انتظار کرو۔

پیغامِ نکاح میں بعض نزاکتوں کی پاسداری

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوگ اپنی جگہ اور تمہارے احساسات اپنی جگہ۔ تم یقیناً اس کی کوشش کرو گے کہ جیسے ہی کوئی موقع ہاتھ آئے تو اپنے مطلب کی بات کہو۔ بلکہ ہو سکے تو خاموشی سے کوئی عہد و پیمان بھی ہو جائے۔ لیکن یہ باتیں کسی طرح بھی اس صورتِ حال کے لیے مناسب نہیں۔ تمہارے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے صرف اس بات کی اجازت ہے کہ تم صاف صاف بات کہنے کی بجائے اشاروں کنایوں میں پیغامِ نکاح کے حوالے سے کوئی بات کہہ دو۔ جس سے لڑکی اور اس کے اولیاء کو یہ اندازہ ہو جائے کہ تم اِدھر رجحان رکھتے ہو۔ اللہ کو تمہاری کمزوریوں کا علم ہے تم ضرور موقع ملنے پر اس خاتون سے بات کرنے کی کوشش کرو گے۔ تو اولاً تو بات اشاروں میں ہونی چاہیئے اور جذبات صرف دل میں پوشیدہ رہنے چاہئیں۔ لیکن اگر ایسی ہی بے چینی ہے تو پھر مناسب تذکرے سے بات آگے نہیں بڑھنی چاہیئے۔ نہ اس لڑکی سے عہد و پیمان لینے کی کوشش کرو نہ خود اس سے کوئی وعدہ کرو اور نہ عدت گزرنے سے پہلے نکاح کرنے کا عزم کرو۔ اس طرح کی باتیں اور ارادے اس شرم و حیا کے بھی خلاف ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کو عطا فرمایا ہے اور ان احساسات کے بھی خلاف ہیں جو سوگ کے حوالے سے ہونے چاہئیں۔ البتہ جب عدت کی مدت ختم ہو جائے تو پھر تم پیغامِ نکاح دے سکتے ہو اور نکاح کے لیے جو بھی مناسب طریقہ سمجھو اختیار کر سکتے ہو۔ لیکن ہر کام کرنے سے پہلے یہ بات ذہن سے کبھی نہ نکلنے دینا کہ اللہ صرف تمہارے اعمال کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ تمہارے قلبی ارادوں تک سے واقف ہے۔ تمہارے دماغ میں خیال کی کوئی لہر اٹھتی ہے تو اللہ اسے بھی

Marfat.com

جانتا ہے۔ ایسے علیم اور خبیر پر یقین رکھتے ہوئے کوئی کام بھی معصیت کے ارادوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے احکام کی مخالفت سے ہر وقت بچو۔ اور اگر کبھی کوئی معصیت ہو جائے اور اس پر کوئی گرفت نہ آئے تو یہ نہ سمجھنا کہ پروردگار تمہارے اعمال سے بے خبر ہے۔ بلکہ اس حقیقت پر یقین رکھنا کہ اس کے علم و خبر میں کوئی نقص نہیں۔ البتہ وہ بردبار اور حلیم ہے جلدی پکڑتا نہیں۔ اور جو شخص اس کی بردباری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے معافی کا طلبگار رہتا ہے تو وہ اس کے لیے نہایت مہربان' بخشنے والا اور غفور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ
وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾
وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ
لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ
الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَ
لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾
حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿٢٣٨﴾
فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا
عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ
يَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ
فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا

Marfat.com

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

رکوع: ۳۱۔ (تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم طلاق دو عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لیے کچھ مہر۔ اور ان کو کچھ خرچ دو۔ مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق۔ جو خرچ کے قاعدے کے موافق ہے۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ○ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لیے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا جو تم مقرر کر چکے تھے۔ مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند۔ اور تم مرد درگزر کرو جو قریب ہے پرہیزگاری سے۔ اور اپنے درمیان ترجیح کو مت بھولو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے ○ نمازوں کی محافظت کرو خاص طور پر بیچ کی نماز کی۔ اور نمازوں میں کھڑے رہو اللہ کے حضور فرمانبردارانہ اور خاموشی کے ساتھ ○ پس اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صوت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے ○ اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک کے نان نفقے کے گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے ○ اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے۔ یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے ○ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تا کہ تم سمجھو) (۲۳۶ تا ۲۴۲)

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۗ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۗ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

(تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم طلاق دو عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لیے کچھ مہر۔ اور ان کو کچھ خرچ دو۔ مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق۔ جو خرچ کے قاعدے کے موافق ہے۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ○ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لیے مہر تو

Marfat.com

لازم ہوا آدھا اس کا جو تم مقرر کر چکے تھے۔ مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند۔ اور تم مرد درگزر کرو جو قریب ہے پرہیز گاری سے۔ اور اپنے درمیان ترجیح کو مت بھولو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے) (۲۳۶ تا ۲۳۷)

ان دونوں آیاتِ کریمہ میں مزید چند احکام بیان فرمائے گئے ہیں اور ان احکام کا تعلق ایسی صورتوں سے ہے جو کم وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے شریعت سے دوری ہوتی جا رہی ہے اور خواہشاتِ نفس بگٹٹ ہوتی جا رہی ہیں اور حالات کے دباؤ سے مزاج ناموافقت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں ویسے ویسے اس طرح کے واقعات کے وقوع میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کے اسباب

غور کرنے کی بات ہے کہ نکاح کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ آج کل تو ایک شادی کے مصارف سے کمر ٹوٹ جاتی ہے اور مزید یہ کہ اگر نکاح واقعی حسن نیت سے وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ یقیناً اپنے اندر یہ تصور رکھتا ہے کہ یہ زندگی بھر کا نباہ ہے' دو خاندانوں کی قربت کا ذریعہ ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی سے نہ جانے کہاں کہاں اثرات پیدا ہوں گے۔ اس لیے لڑکا اور لڑکی دونوں ہی اس بارے میں نہایت سنجیدہ ہوتے ہیں اور دونوں کے خاندان اس نئے رشتے کی استواری اور پائیداری کے لیے دعا گو ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود اگر پہلی ہی رات میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے سے پہلے یا دیکھتے ہی نباہ کے تمام ارادوں کی صف لپیٹ دیں تو سوچنے والے ذہنوں کو سوچنا چاہئے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اتنا بڑا واقعہ بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔ پروردگار کے تو علم میں تھا کہ اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوں گے اس لیے اس نے اپنی کتابِ شریعت میں ان سے متعلق احکام نازل فرما دیئے۔ لیکن ان واقعات کا واقع ہونا کسی بھی معاشرے کی شہرت کو داغدار کر دیتا ہے۔ اس لیے سوچنے والے ذہنوں کو ان اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جن کی وجہ سے اس طرح کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

ایسے خاندان جنہیں نئی نئی دولت میسر آتی ہے اور جو بڑی خاندانی روایات کے امین نہیں ہوتے' ان کے یہاں تو اس طرح کے واقعات دولت سے پھوٹنے والی قباحتوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کے نوجوان شادی بیاہ کو بھی دولت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے اسے کھیل بنا لینے میں انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ البتہ جن خاندانوں کی درخشاں روایات ہیں یا وہ عام لوگ جو ہمیشہ اچھی باتوں کی پیروی کی کوشش کرتے ہیں اور شرفاء کے پیچھے چلنا انہیں محبوب ہوتا ہے' ان کے یہاں بھی اس قسم کے واقعات پیش آنے لگے ہیں۔ اس کے اسباب تو بہت سے ہیں لیکن ایک ایسا سبب جس کی عمر شاید بہت طویل نہیں۔ شادی کرانے والے کاروباری ادارے ہیں۔ جن کے پیش نظر کسی طرح بھی لڑکے لڑکی کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر کے اپنی بڑی فیس ہتھیانا ہوتا ہے۔ وہ عموماً جانبین کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرح کا جھوٹ بول کر دونوں کو پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ لڑکی کوئی دکھائی جاتی ہے اور نکاح کسی کا کرایا جاتا ہے۔ اور جب کبھی اس مکر وفریب پر احتجاج ہوتا ہے تو ملبہ سارا گھر والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سبب سے نہ جانے کتنے رشتے ناکام ہوئے اور کتنے گھر برباد ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ہمارے بیوٹی پارلروں نے بھی ایسے واقعات پیدا کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔ وہ مصنوعی میک اپ سے اصلی شکل چھپا کر ایک مصنوعی شکل سے دوسروں کو شکار کرتے ہیں اور جب اصلی شکل دیکھنے کو ملتی ہے تو لڑکا مشتعل ہو کر طلاق دے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشتوں کے انعقاد کا خاندانی نظام شکست و ریخت کا شکار ہو گیا ہے۔ ہر جگہ مختلف طریقوں سے اس کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ بزرگوں کے واسطے سے جو رشتے طے ہوتے تھے وہ فریب دہی سے محفوظ بھی ہوتے تھے اور پھر ان کے انتخاب میں زندگی بھر کا تجربہ بھی شامل ہوتا تھا۔ بے علمی کے باعث کہیں کہیں وہاں بھی غلطیاں ہوتی تھیں لیکن اہل علم اور اہل صلاح کے مشورے ان کی اصلاح کر دیتے تھے۔ لیکن اب جو صورت حال تبدیل ہوئی ہے اس میں رشتے ان ہاتھوں میں چلے گئے ہیں جو ان رشتوں کی نزاکت کو سمجھتے ہیں نہ ان کے تقدس کو۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ واقعات پیش آنے لگے ہیں' جن کا ذکر ان آیات کریمہ میں کیا گیا ہے۔

طلاق قبل الدخول اور مہر مقرر نہ ہونے کی صورت میں مہر کے احکام

پہلی آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا کہ اگر کسی شخص نے نکاح کرتے ہوئے مہر مقرر نہیں کیا اور کوئی ایسا حادثہ ہو گیا کہ اس نے ابھی بیوی کو چھوا تک نہیں تھا' یعنی اس سے خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی تھی' تنہائی میسر نہیں آئی تھی' ایک دوسرے کی قربت بھی نہیں ملی تھی کہ اس نے طلاق دے کر اس تعلق کو توڑ ڈالا۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے مہر ادا کرنا ہو گا یا نہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مہر مقرر نہ کرنے کا تو اسے کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ اگر مہر مقرر نہ کیا جائے' بھول جائے یا اور کوئی پیچ پڑ جائے' لیکن مہر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو نکاح ہو جاتا ہے اور بعد میں مہر مثل ادا کیا جاتا ہے۔ مہر مثل سے مراد یہ ہے کہ اس خاندان کی لڑکیوں کا عام طور پر جتنا مہر مقرر ہوتا ہے وہی مہر اسے اپنی بیوی کا ادا کرنا ہو گا۔ لیکن اب چونکہ اس نے بغیر تعلق قائم کیے طلاق دی ہے تو اگر اس نے طلاق ظلماً دی ہے تو یقیناً اللہ کے یہاں اس کی جواب دہی کرنا ہو گی اور اگر لڑکی والوں کی طرف سے کوئی ایسی حرکت ہوئی ہے جس نے اسے طلاق دینے پر مجبور کر دیا ہے تو پھر مواخذہ لڑکی والوں سے ہو گا۔ البتہ مہر کے بارے میں اب حکم یہ ہے کہ اس کے ذمے کوئی مہر نہیں۔ ہاں یہ بھی مناسب نہیں کہ لڑکی کو یوں ہی گھر سے روانہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے بھی یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ہمارے لیے یہ بات سمجھنا آسان نہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں طلاق کا کوئی واقعہ لڑائی جھگڑے کے بغیر پیش نہیں آتا۔ اس میں اس بات کا امکان کہاں ہوتا ہے کہ شوہر اپنی مطلقہ کو کچھ دے دلا کے رخصت کرے۔ وہاں ایک معرکہ برپا ہوتا ہے' اپنی جانیں بچا کر نکل جانا غنیمت سمجھا جاتا ہے' لیکن قرآنِ کریم بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ تمہیں شائستہ لوگوں کی طرح ہر کام کرنا چاہیے۔ اگر باہمی طبیعتوں کی ناموافقت کے باعث نباہ نہیں ہو سکا تو مل بیٹھ کر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور جانبین کے بزرگ یہ طے کر دیں کہ بجائے گھل گھل کے مرنے کے بہتر ہے کہ تم دونوں علیحدہ ہو جاؤ۔ ایسی صورت میں شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اخراجات دے۔ وہ کتنے ہونے چاہئیں؟ ان کی قیمت کیا ہو؟ اس کے بارے میں فرمایا کہ شوہر اگر دولت مند ہے تو اسے اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہیے اور اگر وہ تنگ دست ہے تو خالی ہاتھ پھر بھی نہ بھیجے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے اپنی مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا اور قاضی شریح جو عرصہ دراز تک منصبِ قضا پر فائز رہے ہیں۔ انہوں نے ایسے ہی کسی واقعہ پر پانچ سو درہم اپنی مطلقہ کو ادا کیے۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شوہر اپنی مطلقہ کو کپڑوں کا ایک جوڑا دے دے۔

Marfat.com

طلاق قبل الدخول اور مہر مقرر ہونے کی صورت میں مہر کے احکام

دوسری آیتِ کریمہ میں جو صورتِ مسئلہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر تو مقرر کیا گیا لیکن بیوی کے ساتھ مقاربت سے پہلے شوہر نے طلاق دے دی۔ ایسی صورت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم نے جو مہر مقرر کیا ہے، تم نے چونکہ اپنی بیوی سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا اس لیے اب تم پر مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا لازم ہے۔ لیکن ساتھ ہی نازک جذبات کو بھی چھیڑا گیا ہے، وہ یہ کہ جس خاتون کو طلاق دی گئی ہے وہ اگر ایسی حوصلہ منداور غیرت مند ہے کہ اس نے اس طلاق کو اپنے لیے ایک دھچکا محسوس کیا ہے تو ہوسکتا ہے وہ نصف مہر لینا پسند نہ کرے اور وہ بھی شوہر کو معاف کر دے۔ یہ گویا اس بات کا اظہار ہے کہ میں نے اپنی ذات اور اپنی عزت ان ٹکوں کے لیے تمہارے حوالے نہیں کی تھی، میرے پیش نظر تو زندگی کا فیصلہ تھا۔ اب جب کہ وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا تو یہ نصف مہر لینا میرے لیے ایک بھیانک خواب ہوگا۔ اس لیے میں اسے لینے سے انکار کرتی ہوں۔ اور دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ شوہر پورا مہر ادا کر دے۔ وہ یہ سوچے کہ میں تو اس خاتون کو بیوی بنا کے لایا تھا۔ اب اگر ایسا کوئی سبب پیدا ہو گیا ہے کہ ہم دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو میں نے جو مہر دینے کا فیصلہ کیا تھا میں اس میں کمی نہیں کرنا چاہتا۔ قرآنِ کریم میں اس کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اگر ایسا کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ تقویٰ بہت سے اوصاف کا مجموعہ ہے۔ جن میں ایک بہت اعلیٰ صفت ایثار و قربانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہاں تقویٰ سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ تمہیں ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے پورا مہر ادا کرنا چاہیے۔ ویسے بھی تمہاری مردانگی، فتوت اور شوہر ہونے کا بھی یہ تقاضا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ ایثار کرنے کی کوشش کرو۔

یعفون کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں دو لفظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ جس طرح بیویوں کے لیے "یعفون" کا لفظ استعمال ہوا جس کا مطلب یہ ہے "کہ ممکن ہے بیویوں کا جو نصف مہر اللہ نے مقرر کیا ہے وہ اسے لینے کی بجائے معاف کر دیں" چنانچہ بیویوں کے لیے اس لفظ کا استعمال تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن اس کے بعد شوہر کے لیے بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ شوہر نے تو نصف مہر ادا کرنا ہے۔ اس کی طرف سے معافی کا کیا سوال ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ عربوں میں معمول یہ تھا کہ وہ نکاح کے موقع پر ہی پورا مہر ادا کر دیا کرتے تھے۔ پیش نظر صورتحال میں چونکہ شوہر پورا مہر ادا کر چکا ہے اور مقاربت سے پہلے طلاق دے دینے کے باعث اب اس کے ذمے نصف مہر کی ادائیگی ہے جب کہ بیوی پورا مہر لے چکی ہے اب شوہر کو حق ہے کہ وہ بیوی سے نصف مہر واپس لے۔ اس حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ شوہر اپنا دیا ہوا نصف مہر جو لے سکتا ہے اسے بھی معاف کر دے تو یہ شوہر ہونے کی حیثیت اور فضیلت کے اعتبار سے اس کے لیے بہت بہتر ہے۔

دوسرا لفظ جو قابلِ توجہ ہے وہ ہے "بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ" یہ تعبیر شوہر کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ شوہر وہ شخصیت ہے، جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ یہ نکاح مرد کے قبول کرنے سے بندھتا ہے اور اس کے طلاق دے دینے سے کھل جاتا ہے۔ اس کا اصل سررشتہ مرد کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ "بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ" کی یہ تفسیر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے

Marfat.com

فرمایا: ''ولی عقدة النكاح الزوج'' (عقدۂ نکاح کا مالک شوہر ہے) یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ منقول ہے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (قرطبی) شوہر کے لیے یہ تعبیر ہمارے لیے لمحۂ فکر یہ مہیا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو شوہر کی حیثیت سے یہ اختیار دیا ہے کہ اسی کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ جب چاہے اسے کھول سکتا ہے اور یہ اختیار اللہ نے بیوی کو عطا نہیں کیا۔ انسانی فطرت کا خالق خوب جانتا ہے کہ عورت صنف نازک ہے جو حالات کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس میں جذبات کی فراوانی ہے۔ اس کی طبیعت میں تنوع ہے۔ ہر واقعہ سے شدید تاثر لینا اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ ہر وقت کی یکجائی کئی ناگواریاں بھی پیدا کرتی ہے۔ مرد کو جو حوصلہ اور تحمل دیا گیا ہے اس کی وجہ سے وہ بہت سی ناگوار باتوں کو برداشت کر جاتا ہے۔ لیکن عورت ان باتوں کو برداشت کرنے کی بجائے شدت تاثر کا شکار ہو کر جذبات میں ڈوب جاتی ہے۔ اگر عقدۂ نکاح اس کے ہاتھ میں دیا جاتا کہ وہ جب چاہتی طلاق دے سکتی تو یقین جانئے کسی بھی نکاح کی عمر چند دنوں سے زیادہ نہ ہوتی۔ ہر گھر میں علیحدگی کی کہانی دہرائی جاتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ عقدۂ نکاح ہم نے مرد کے ہاتھ میں دیا ہے عورت کو اس اختیار سے بہرہ ور نہیں کیا۔ مغربی دنیا میں مرد و عورت کے برابری کے فریبِ نظر نے طلاق کا حق بھی بیوی کو دلا دیا۔ جس کا نتیجہ وہاں کی عدالتوں کے ریکارڈ میں دیکھا جا سکتا ہے اور مغرب کے خاندانی نظام کی تباہی اس کا نوحہ پڑھتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ لیکن ہمارے نام نہاد دانشور انہی کے راستے پر چلتے ہوئے ہمارے یہاں بھی عورتوں کو یہ حق دلانا چاہتے ہیں۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ہمارے نکاح کے فارموں میں باقاعدہ یہ شق شامل کر دی گئی ہے کہ ''کیا تم بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرتے ہو یا نہیں؟'' اکثر لوگوں کو تفویض کا معنی نہیں آتا۔ اس لیے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہاں ہم سے کیا فیصلہ کروایا جا رہا ہے؟ اے کاش! ہم اپنا گھر اجاڑنے سے پہلے مغرب کے خاندانی نظام کی بربادی سے کچھ سیکھ سکیں اور محض مغرب کی نقالی میں اپنے گھر کو آگ لگانے سے باز آ جائیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ O

(نمازوں کی محافظت کرو خاص طور پر بیچ کی نماز کی، اور نمازوں میں کھڑے رہو اللہ کے حضور

فرمانبردارانہ اور خاموشی کے ساتھ) (۲۳۸)

اس آیتِ کریمہ سے پہلے کی آیات میں نکاح اور طلاق کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور اس کے بعد کی دو آیات بھی انہی مسائل سے متعلق ہیں، لیکن نکاح اور طلاق کے مسائل کے درمیان ایسی دو آیات کا لانا جن کا تعلق نماز سے ہے بظاہر بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نہایت مربوط کتاب ہے۔ لیکن اگر ہم سورۃ البقرۃ کے مضامین کی ترتیب کو دیکھیں اور سیاقِ کلام کو سمجھنے کی کوشش کریں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آیات بے جوڑ نہیں بلکہ مربوط کلام کا ایسا حصہ ہیں جنہوں نے ربط کلام کی تکمیل کی ہے۔

Marfat.com

سابقہ آیات سے ربط

حقیقت یہ ہے کہ آیت ۱۶۳ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ سے احکام وقوانین کا جو باب شروع ہوا تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے توحید کے ذکر سے آغاز فرمایا تھا۔ کیونکہ جس پروردگارِ عالم کے احکام وقوانین کے ذکر کا آغاز ہو رہا تھا اگر اس کی الوہیت‘ وحدانیت اور حاکمیت پر ایمان ویقین میں کمی ہو تو کوئی بھی شخص اس پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور اگر کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت ایمان لے بھی آئے تو اس ایمان میں اطاعت کے لیے آمادگی نہیں ہوگی اور نہ اس میں یقین کی وہ قوت ہوگی جو ایمان کے مخالف حالات میں انسان کو ثابت قدم رکھتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے توحید کا ذکر فرمایا‘ پھر توحید پر دلائل قائم کیے‘ اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ اس کی محبت کو لازم ٹھہرایا اور جو لوگ محض زبانی حد تک اللہ کو مانتے ہیں لیکن اس کی صفات کا انکار کرتے ہیں یا اس کی صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں ان پر تنقید فرمائی اور ان کے برے انجام سے انہیں آگاہ کیا۔ اس کے بعد مختلف احکام ذکر فرمائے لیکن آیت نمبر ۱۷۷ پر پہنچ کر پھر اس حقیقت کا اعادہ فرمایا کہ ایمان وعمل کی اصل قوت مشرق ومغرب کی طرف منہ کر لینا نہیں بلکہ ان تمام حقائق کو تسلیم کرنا ہے جنہیں ایمانیات یا ضروریاتِ دین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے جو مال ودولت عطا فرمایا ہے اسے تمام مستحق لوگوں پر صرف اس جذبے سے خرچ کرنا ہے کہ اس سے اللہ راضی ہوگا اور یہ اس کی محبت کا لازمی تقاضا ہے۔ اللہ کے ساتھ قلب ودماغ کا مضبوط رشتہ اور انسان کے پاس مال ودولت کو اللہ کی امانت سمجھ کر اس کے بندوں پر خرچ کرنا یہ دو بنیادی حقیقتیں ہیں جن کے ساتھ تمام ایمان واطاعت کے رشتے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں کمزوری جس طرح عقیدے کی کمزوری پر منتج ہوتی ہے اسی طرح عمل میں ویرانی کا باعث بنتی ہے۔ ان کی پختگی اور رسوخ فی القلب کے لیے اللہ نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔ چنانچہ اب احکام وقوانین کے باب کو سمیٹتے ہوئے ان آیات پر اسے ختم کیا جا رہا ہے جس میں پھر نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ پہلے صرف اقامت صلوٰۃ کا حکم تھا اس آیت میں محافظت صلوٰۃ کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالم کی نگاہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی جس یقین اور اطاعت کے جذبے پر کھڑی ہے اس کی نشوونما اور اس کی بقا کے لیے اگر کوئی تیر بہدف نسخہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف نماز ہے۔ اس لیے پورے قرآنِ کریم میں عقائد یا احکام وقوانین کے تذکرے کے بعد ہم عموماً دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نماز کا حکم دیتے ہیں اور یا اس کی یاددہانی کراتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ شہر پناہ ہے۔ جس نے دین کے پورے شہر کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جو ساری شریعت کے قیام وبقا کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک حصار کی حیثیت دی ہے جس کی موجودگی میں پوری شریعت محفوظ رہتی ہے اور انسان کے یقین وعمل کی قوتیں اپنے اپنے نہج پہ کام کرتی رہتی ہیں۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من اقامها فقد اقام الدين و من هدمها فقد هدم الدين (جس نے اسے قائم رکھا اس نے پورے دین کو قائم رکھا اور جس نے اسے ڈھا دیا اس نے پورے دین کو ڈھا دیا) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ ”اس جہاد میں کوئی خیر نہیں جس میں نماز نہیں۔“ کیونکہ نماز ہی انسان کی سوچ‘ احساس اور عمل کی قوتوں کو صحیح رخ دیتی ہے۔ یہی اس کے جذبات کی نگہداشت کرتی ہے۔ اشتغالِ دنیا کے ہجوم سے انسان کو نکال کر بار بار اللہ کے دروازے پر جھکاتی ہے اور اس کے قبلے کو درست رکھتی ہے۔ مزید یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ امن کے حالات میں اگرچہ نفسانی خواہشات کے مقابلے میں نماز قائم کرنا آسان نہیں لیکن غیر معمولی حالات کی نسبت مشکل بھی

Marfat.com

نہیں۔اس لیے عام حالات میں تو پروردگار اقامت صلوٰۃ کا حکم دیتے ہیں' لیکن جنگ کی ہولناکیوں میں جب کہ جان وتن کی سلامتی کی فکر ہوتی ہے اور پوری توجہ دشمن کی کاروائیوں کی طرف ہوتی ہے۔ایسے ہولناک حالات میں اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور ہر طرف سے کٹ کر اس سے لو لگا کے کھڑے ہو جانا آسان کام نہیں۔ایسے حالات میں اقامت صلوٰۃ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ محافظت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا۔کیونکہ جب آیت نمبر ۱۷۷ نازل ہوئی ہے تو ابھی مسلمانوں پر جہاد فرض نہیں ہوا تھا لیکن پیش نظر آیات اس وقت نازل ہوئی ہیں جبکہ جہاد فرض ہو چکا تھا اسی لیے دوسری آیتِ کریمہ میں جنگ کے دوران نماز پڑھنے کے طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیلی صورت متعین فرمائی۔ان دونوں آیات پر احکام وقوانین کے باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کی دو آیتوں کا تعلق ضمنی حالات سے ہے جو اس باب کے خاتمے کے بعد نازل ہوئیں اور انہیں اس باب کے ساتھ ملحق کر دیا گیا تا کہ احکام کی ترتیب سمجھنے میں آسانی پیدا ہو اور اس سے اہلِ علم قرآنی مضامین کا شعور پیدا کریں اور اس بات کا اشارہ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ .الخ سے بھی فرما دیا۔

آیات کا پس منظر اور ربط سمجھ لینے کے بعد اب ان آیات کی مختصر وضاحت پیشِ خدمت ہے۔پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ تو ایک مستقل اصطلاح ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر طرح کے حالات سے ہے۔ایک مومن کو نماز بہر صورت اس طرح پڑھنی چاہیے جس میں نماز کے تمام لوازم وشرائط اور اس کے آداب وارکان کا لحاظ رکھا گیا ہو۔اور سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات کی وضاحت میں ہم اس کا تذکرہ کر چکے ہیں۔البتہ محافظت صلوٰۃ کا لفظ اقامت صلوٰۃ سے زیادہ نگہداشت اور اہتمام پر دلالت کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ امن کی حالت میں تو یقیناً ایک مومن پورے آداب وارکان کی پابندی سے نماز ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جنگ کی ہولناکیوں میں ایسا کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ایک طرف دشمن چڑھا آ رہا ہے اور دوسری طرف نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ایک مومن جس کا قلبی رشتہ اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ ایسے حالات میں بھی کسی نہ کسی طرح نماز کی ادائیگی کی کوشش کرے گا۔اور اگر مسلم سپاہ کا جرنیل حقیقی مومن ہے تو وہ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح نماز کا اہتمام کرے گا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حالات میں صحابہ کو نماز پڑھائی اور احادیث میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔اور اگر حالات اس کی بالکل اجازت نہ دیتے ہوں تو پھر بھی ایک مومن ایک بے کلی اور بے چینی میں مبتلا ہو گا کہ "ہائے میری نماز نکلی جا رہی ہے میں کیا کروں؟" اس طرح کے اعمال اور احساسات محافظت صلوٰۃ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اَلصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی سے کیا مراد ہے؟

اَلصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی کا لغوی معنی تو بیچ کی نماز ہے۔لیکن نمازوں کی نگہداشت کا حکم دینے کے بعد بطورِ خاص صلوٰۃ الوسطی کی نگہداشت کا حکم دینا کیا مفہوم رکھتا ہے؟ اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ الصلوۃ الوسطی کا معنی جس طرح بیچ والی نماز ہوتا ہے اسی طرح نہایت قدر ومنزلت کی حامل نماز بھی ہے۔اس لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ نمازوں میں سے ہر نماز اللہ کے یہاں نہایت قدر ومنزلت کی حامل ہے۔لیکن اس نماز کی قدر ومنزلت کا کیا ٹھکانہ ہے جو تلواروں کی چھاؤں میں ادا کی جائے۔گھمسان کے رن میں بھی نماز سے غفلت نہ ہونا اور امکانی حد تک اس کی ادائیگی کی کوشش کرنا ایک مومن کا حقیقی جوہر ہے اور جو نماز بھی ایسی کیفیت اور ایسے حالات میں ادا کی جائے گی وہ یقیناً الصلوٰۃ الوسطی کہلائے گی۔اس لحاظ سے جو نماز بھی جنگ کے دوران پڑھی جائے اسے الصلوٰۃ الوسطی ہی کہ

Marfat.com

جائے گا۔لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔کیونکہ یہی وہ نماز ہے جس پر صحیح طور پر بیچ کی نماز کا اطلاق ہوتا ہے۔ایک طرف دن کی دو نمازیں ہیں فجر اور ظہر اور دوسری طرف رات کی دو نمازیں ہیں مغرب اور عشاء۔ان دونوں کے بیچ میں عصر کی نماز ہے۔اس کی بعض دیگر خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اس کی مزید اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ان خصوصیات میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نماز ایک ایسے وقت پڑھی جاتی ہے جو عام حالات میں نہایت مشغولیت اور مصروفیت کا وقت ہوتا ہے۔دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر اسی وقت رات آنے سے پہلے منزل پر پہنچنے کی فکر میں ہوتا ہے۔دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کوشش کرتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کمائی میں اضافہ کر لے اور دن بھر میں جو کاروبار کیا ہے اسے شام ہونے سے پہلے سمیٹ لے۔ہر ملازم اپنی مقررہ ڈیوٹی کو سرانجام دینے اور سمیٹنے میں مصروف ہوتا ہے۔جس طرح پرندے سرِشام اپنے گھونسلوں میں میں پہنچنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں اسی طرح ہر مصروف آدمی اپنی مصروفیت کو سمیٹ کر اپنے گھر کی راہ لینا چاہتا ہے۔آج اگرچہ بجلی کی روشنی نے حالات بدل دیے ہیں لیکن دنیا میں جس تیزی سے بدامنی پھیل رہی ہے اس کے پیشِ نظر شہر بھی شام ہی کو بند ہونے لگے ہیں اور دیہات تو پہلے ہی بجلی نہ ہونے کے باعث شام سے پہلے بچے کی آنکھ کی طرح بند ہو جاتے ہیں۔اور جہاں تک جنگ کا تعلق ہے اگر دو فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہو تو ہر فوج رات کی تاریکی چھا جانے سے پہلے پہلے آخری حملہ کرنے کی فکر میں ہوتی ہے۔زخموں سے چور چور سپاہی اپنی پوری قوت سمیٹ کر دشمن پر غالب آنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔ایسے وقت میں اس نماز کا وقت آتا ہے اور قرآنِ کریم اس وقت کی اہمیت اور نزاکت کے پیشِ نظر خاص طور پر اس کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔جنگ احزاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز قضا ہو گئی تھی تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے جنھوں نے ہماری صلوٰۃ الوسطیٰ قضا کی۔اگرچہ بعض اہلِ علم اس کی تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث صلوٰۃ الوسطیٰ کو عصر کی نماز قرار دینے کے لیے واضح دلیل ہے۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ، قَنَتَ کا معنی خضوع اور تذلل ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی اصل روح خشوع وخضوع، عاجزی اور خشیت ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے محافظت کی وضاحت کر دی گئی ہے۔کہ اگر تم واقعی نمازوں کی نگہداشت کرنا چاہتے ہو تو محض اس طرح سے نہیں ہوگی کہ آپ اذان سن کر مسجد میں پہنچ جائیں اور نماز کے مخصوص اعمال انجام دینے کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ میں نے نماز کی ادائیگی کا فرض انجام دے دیا ہے۔یقیناً یہ عمل نماز کی ظاہری حالت کی نگہداشت کے لیے ضروری ہے لیکن اس کی حقیقی نگہداشت اس وقت ہوگی جب دل میں خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہوگی۔دل کی یہ کیفیت آدمی کا رشتہ اللہ سے مضبوط کرتی ہے۔اسی سے اس کی نماز حقیقی نماز بنتی ہے۔اور یہی نماز ایک نمازی کا اصل سرمایہ ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○

(پس اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صورت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے) (۲۳۹)

Marfat.com

صلوٰۃ الخوف

اس آیتِ کریمہ میں صلوٰۃ الخوف پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل کی طرف کسی حد تک اشارے قرآنِ کریم نے سورۃ النساء میں کیے ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل نے اس کی پوری صورت آرائی فرمائی ہے۔ احادیث کی تمام بڑی کتابوں میں جنگ کی حالت میں آپؐ کے نماز پڑھنے کے طریقے کو ذکر کیا ہے جس میں ہمیں ایک سے زیادہ طریقے ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کی حالت کو دیکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زیادہ طریقوں سے نماز ادا فرمائی ہے۔ آج جب کہ جنگ کی نوعیت بالکل تبدیل ہوگئی ہے تو اس طریقے سے نماز پڑھنا تو شاید ممکن نہ ہو اور مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو مسلمان فوج کا ایک ایک سپاہی اس بات کی خواہش رکھتا تھا کہ میں آپؐ ہی کے پیچھے نماز ادا کروں لیکن اب ایسی صورتِ حال نہیں۔ اپنے اپنے مورچوں میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں یا فرداً فرداً نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ البتہ حتیٰ الامکان نماز کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ یہاں تو نہایت اجمال سے یہ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر پیدل ہو تو ایک جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہو تو پڑھو اور اگر تم سوار ہو تو سواری پر نماز ادا کرلو۔ ایسی صورت میں نماز کی باقی پابندیاں باقی نہیں رہتیں۔ اور ان مخصوص احکام کو فقہاء نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہاں اگر نماز کا کوئی طریقہ بھی جنگ کی ہولناکی کے باعث ممکن نہ رہے تو پھر نماز کو اسی طرح قضا کیا جاسکتا ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب میں نماز قضا فرمائی تھی۔ مزید فرمایا وَ اِذَا اَمِنْتُمْ .الخ کہ جب جنگ رک جائے اور امن کی فضا پیدا ہو جائے تو پھر تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح نماز پڑھنے کی تمہیں تعلیم دی گئی ہے۔

پیغمبر کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے

یہاں تعلیم دینے کی نسبت براہِ راست اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ کہ قرآنِ کریم میں پروردگار نے صرف اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا ہے اس کے پڑھنے کا طریقہ اور اس کے فرائض و واجبات اور اس کی رکعات کی تعداد حتیٰ کہ نمازوں کی تعداد اور ان کے اوقات کسی چیز کا تذکرہ بھی قرآنِ کریم میں نہیں کیا گیا۔ ان میں سے ایک ایک بات کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرمائی ہے اور یہاں آپ کی بیان کردہ تفصیل اور تعلیم کو پروردگار نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ کا نبی دنیا میں صرف قرآن کریم انسانوں کے حوالے کرنے نہیں آیا تھا بلکہ قرآن کریم کی تلاوت' اس کی تعلیم' اس کی حکمت اور اس کے مطابق تزکیہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ تعلیم کے حوالے سے آپؐ نے نماز اور دیگر تمام دینی احکام کی ایک ایک ضرورت کو پورا فرمایا۔ قرآنِ پاک کے اصولوں کو عملی شکل عطا فرمائی۔ اس کے مبہمات کی وضاحت کی' اجمالات کو تفصیل بخشی' اٹھنے والے سوالات کا جواب دیا' انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دینی احکام کو پوری طرح جاری و ساری کر کے دکھایا۔ اور یہ جو کچھ آپؐ نے کیا یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہوا۔ کیونکہ اللہ نے آپؐ کو اس کا مجاز ٹھہرایا تھا اور اس کی ذمہ داری قبول فرمائی تھی۔ اللہ کے رسول کے اس کام کو یہاں احسان کے طور پر ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانو تم حالتِ کفر میں جن باتوں کو بالکل نہیں جانتے تھے' جن میں نماز اور اس کی تفصیلات بھی شامل ہیں اللہ نے اپنے پیغمبر کی معرفت تمہیں اس کا علم دے کر تم پر احسان فرمایا ہے تاکہ تم اس کی قدر کرو۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا
اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ
فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک کے نان نفقے کے گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے) (۲۴۰)

بیوہ کے لیے وصیت کا عبوری حکم

عرب میں یہ طریقہ تھا کہ جب کسی بیوی کا شوہر مرجاتا تو وہ ایک سال تک اپنے شوہر کی عدت گزارتی۔ اس کے گھر میں رہتی اور مرنے والے کے وارث اس کے نان نفقے کے ذمہ دار ہوتے۔ قرآنِ کریم نے شوہر کے مرنے کی صورت میں عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ دس دن کر دی۔ اس سے بظاہر یہ احساس پیدا ہوا کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کو شوہر کے مرنے کے بعد ایک سال تک جو حقوق میسر تھے اسلام نے ان میں کمی کر دی ہے۔ حالانکہ اسلام تو گرے پڑے طبقات اٹھانے کے لیے آیا۔ عورت تو دورِ جاہلیت میں صدیوں سے ظلم کا نشانہ بنی رہی ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اسے کوئی رعایت ملتی بلکہ اس کے حقوق میں اضافہ ہوتا اور اس کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی۔ اسلام نے ایسی عورت کو جو شوہر سے محروم ہوگئی ہے مزید عدمِ تحفظ کا شکار کر دیا اور ایک سال تک جو اسے گھر کی چھت اور نان نفقہ میسر تھا اس سے محروم کر دیا۔ چنانچہ اس احساس کے ازالے کے لیے عارضی طور پر عورت کو یہ سہولت دی گئی جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے اس سے پہلے عدت کے بارے میں جو آیت نازل ہو چکی ہے اس کی وضاحت ہے اس میں شوہر کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کو یہ وصیت کر جائے کہ وہ اس کی بیوہ کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالیں اور اس کی وراثت سے اس کے لیے نان نفقہ مہیا کریں۔ لیکن یہ اسلام کا مستقل قانون نہیں تھا۔ یہ عارضی دور تھا اسلامی حکومت اپنی تشکیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسلامی معاشرہ استحکام کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ مدینے کی آبادی روز بروز اسلام کی آغوش میں آ رہی تھی، لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ وراثت کے مستقل احکام نازل کر دیئے جائیں۔ کیونکہ مخلوط معاشرے میں جہاں ابھی تک قرابت داریاں مسلم اور غیر مسلم میں باقی تھیں۔ وراثت کا قانون نافذ کرنا آسان نہ تھا۔ ہم اس سے پہلے بھی اسی سورۃ میں والدین اور اقرباء کے لیے وصیت کا عارضی قانون پڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی اسی طرح کا قانون تھا لیکن جب میراث کا قانون نازل ہوگیا اور سورۃ النساء میں اس کی مکمل تشکیل کر دی گئی تو یہ عارضی حکم منسوخ ہوگیا۔ کیونکہ وراثت کا قانون جاری ہونے کے بعد دوسرے وارثوں کے طرح بیوہ کا بھی حصہ معین ہوگیا۔ اب اس کے لیے وصیت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ کیونکہ اللہ کے متعین کردہ حق کے بعد کسی اور اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ورنہ یہ تاثر پیدا ہوگا کہ اللہ کا قانون ناقص تھا جسے بندوں نے مکمل کیا۔

Marfat.com

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس سے پہلے آیت نمبر۲۳۴ میں جب بیوہ کی عدت کا ذکر کیا گیا تو اسی کے ساتھ اس وصیت کا حکم کیوں نہ دے دیا گیا۔ بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے احکام میں ایک تدریج پائی جاتی ہے اور اس میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں۔ اس طرح کی توضیحی آیات قرآنِ پاک کے طالب علموں کے لیے تدریج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں اور انہیں اس تدریج کی حکمتوں کو جاننے اور اس پر غور وفکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات بیان فرمائی ہیں ''عَزِیزٌ حَکِیمٌ'' کہ وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی کا حق صرف اسی کو ہے۔ کیونکہ وہی ایک ذات ہے جس سے یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے یہ قانون کیوں دیا ہے۔ کیونکہ اس کی حاکمانہ حیثیت ہر طرح کے سوال سے بالا ہے۔ اور اس کی علمی وجاہت ہر طرح کے شبہ سے منزہ ہے اور اس کی مصلحت ہر طرح کے مفاد سے بیگانہ ہے۔ اور بندوں کے ساتھ اس کی شفقت اور رحمت ہر دلیل سے بے نیاز ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حکمت والا ہے۔ کہ وہ صرف قانون ساز ہی نہیں بلکہ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کے قانون میں صرف اقتدار نہیں جھلکتا بلکہ حکمت سے معمور بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایسے قانون کی خلاف ورزی سے پہلے اس کے نتائج پر غور کر لینا چاہیے۔

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ
لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

(اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے۔ یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو) (۲۴۱ تا ۲۴۲)

''مطلقات کو کچھ دینے کا حکم اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف یاددہانی کے لیے اعادہ مقصود ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ پہلا حکم ان عورتوں کے لیے تھا جنہیں خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی۔ ان میں سے ایک تو وہ مطلقہ ہے جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا اسے تو تحفہ وغیرہ کی صورت میں کچھ فائدہ پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا اور جس کا مہر باندھا گیا تھا اس کے لیے متاع سے مراد یہ تھا کہ اسے نصف مہر دے دیا جائے۔ لیکن اس آیت میں ان مطلقہ عورتوں کا ذکر ہے جن کو ان کے شوہروں نے ان سے مباشرت کے بعد طلاق دی۔ ان کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا مہر مقرر کیا گیا تھا ان کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دیا جائے۔ اور دوسری وہ عورتیں جن کا مہر مقرر نہیں کیا گیا' انہیں فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ انہیں مہر مثل دیا جائے۔ لیکن اگر متاع سے مطلق فائدہ پہنچانا مراد لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مطلقہ عورت جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا اور اسے خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اسے تو کوئی تحفہ یا کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہے اور باقی تمام مطلقہ عورتوں کو متاع یعنی کوئی تحفہ وغیرہ دینا مستحب ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا ''حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ'' کہ مطلقہ عورتوں کو کچھ نہ کچھ دینا اہل تقویٰ پر ایک حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ اہلِ تقویٰ ہیں اور وہ کبھی حالات سے مجبور ہو کر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں تو اگرچہ قانونی طور پر اپنی بیویوں کو کوئی تحفہ دے کر رخصت کرنا یا انہیں اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے کوئی مدد دینا ضروری نہیں۔ اسلامی حکومت بھی ایسا نہ کرنے والوں پر قانون شکنی کا الزام نہیں لگا سکتی۔ لیکن قرآنِ کریم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان

Marfat.com

باتوں کو متقین کے لیے حقوق وصفات کا درجہ دیا ہے۔اس لیے متقیوں کو یہ بات کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ اگر تقویٰ کی زندگی گزارنا چاہتے ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے معاملے میں اس طرزِ عمل کا اظہار نہ کریں۔ دنیا میں ممکن ہے اس طرزِ عمل کی کوئی اہمیت نہ سمجھی جائے لیکن آخرت میں یہی اعمال بہت بڑا سرمایہ ثابت ہوں گے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آیت کے اس ٹکڑے نے گزشتہ آیت کی نوعیت متعین کر دی۔اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ آیت توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔۲۴۲نمبر آیت میں بیان کردہ حکم کے بعد لوگوں کے اندر جو سوال اور جستجو پیدا ہوئی' اس کی وضاحت کے لیے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔اللہ کا یہ احسان ہے کہ وہ اس طرح کی توضیحی آیات سے ربط کی بہت ساری مشکلات کو آسان کر دیتا ہے۔ایک اہلِ علم کے کہنے کے مطابق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ (قرآنِ کریم نے اجمال کے بعد تفصیل' ایجاز کے بعد توضیح اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا جو یہ طریقہ اختیار کیا ہے اس میں تربیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ازاں جملہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غور وفکر اور اس کے فوائد ومصالح اور اس کے اسرار وحکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔اور پیش آنے والے حالات ومعاملات میں ان کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔اسی حقیقت کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از: تدبر قرآن)

أَلَمْ
تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ
لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ
إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ
هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا

Marfat.com

لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ
اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْہِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْہُمْ ؕ وَ
اللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَہُمْ نَبِیُّہُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ
لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ
بِالْمُلْکِ مِنْہُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰىہُ
عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ
مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَہُمْ نَبِیُّہُمْ اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖۤ
اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَبَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ
اٰلُ مُوْسٰی وَاٰلُ ہٰرُوْنَ تَحْمِلُہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ
اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع

رکوع: ۳۲۔ (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو بھاگ کھڑے ہوئے اپنے گھروں سے حالانکہ وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا مر جاؤ۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے O اور قتال کرو اللہ کے راستے میں اور خوب جان لو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے O تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔ اللہ ہی گھٹاتا ہے اور اللہ ہی بڑھاتا ہے۔ اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے O کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کے راستے میں لڑیں۔ نبی نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ کہنے لگے بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے بچوں سے۔ پس جب ان پر

Marfat.com

فرض کر دیا گیا جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے ان میں سے چند لوگوں کے سوا۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو O اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ اس امارت کے ہم حقدار ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا بے شک اللہ نے تمہاری سرداری کے لیے اسی کو چنا ہے اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا علم رکھنے والا ہے O اور ان کے نبی نے ان سے کہا اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامانِ تسکین اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو) (۲۴۳ تا ۲۴۸)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ O

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو بھاگ کھڑے ہوئے اپنے گھروں سے حالانکہ وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا مر جاؤ۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے) (۲۴۳)

ربطِ آیات

گزشتہ آیات کی تشریح میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ احکام و قوانین کا جو باب آیت نمبر ۱۶۳ سے شروع ہوا تھا وہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہاں سے نیا سلسلۂ کلام شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ باب میں اصل بیان تو بیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث کے حوالے سے یتیموں اور بیوگان کے مسائل کی طرف التفات ہو گیا اور اس کے بعد قرآنِ کریم نے اپنی عادت کے مطابق یتیموں کے حقوق بیان فرمائے اور پھر عورتوں کے مسائل کے حوالے سے تفصیل سے احکام دیے۔ اب پھر سلسلۂ کلام اصل موضوع کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔

پیشِ نظر آیت کریمہ میں سب سے پہلے ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جس کا تعلق اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ایک اہم تصور سے ہے۔ اور یہ وہ تصور ہے کہ جب تک مسلمانوں کے دل و دماغ میں پوری طرح پیوست نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ جہاد و انفاق کے حوالے سے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ وہ تصور یہ ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی اپنی بزدلی یا دنیا کی خواہش سے اپنی زندگی کو دراز نہیں کر سکتا۔ وہ ہزار کوشش بھی کرے موت کا معین وقت اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے زندگی کا بیشتر حصہ میدانِ جنگ میں گزارا ان میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ وہ اپنے بستر پر طبعی موت کا شکار ہوئے اور جو لوگ زندگی بھر خطرات سے بچنے کی کوشش کرتے رہے اور ایک سے ایک بڑھ کر محفوظ مقام میں رہنے کی کوشش کی۔ لیکن موت سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ موت سے کھیلنے والوں نے طویل عمر پائی اور موت سے بچنے والوں کو مختصر زندگی نصیب ہوئی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ ساری احتیاطوں کے باوجود ان کی موت کا سبب کوئی نہ کوئی

Marfat.com

حادثہ ٹھہرا۔ اس لیے مسلمانوں جیسی قوم جسے دنیا میں خیر و صلاح کا کام سونپا گیا ہے اور جنہیں قدم قدم پر مخالف قوتوں سے ٹکرانا پڑتا ہے ان کے اندر جب تک یہ عقیدہ راسخ نہ ہو جائے کہ موت و حیات سراسر اللہ کے قبضے میں ہے تم بے سبب اپنے آپ کو خطرات میں کبھی نہ جھونکنا۔ لیکن دینی اور ملی فرائض ادا کرتے ہوئے اگر خطرات میں جانا ناگزیر ہو جائے تو موت کے تصور سے کبھی پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ موت خطرات سے واقع نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے حکم سے واقع ہوتی ہے۔ اس وقت تک مسلمان کارزارِ حیات میں کوئی معرکہ سر نہیں کر سکتے۔ آئندہ چونکہ جہاد و انفاق کی بحث شروع ہو رہی ہے اس لیے اس بنیادی عقیدے کو رگ و ریشے میں اتارنے کے لیے ایک ایسا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جس کی شہرت کے باعث عرب کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ لیکن ایسے مشہور واقعات جو نسل در نسل سینہ بہ سینہ روایت ہوتے ہیں۔ اس میں صرف واقعہ کی اصل روح باقی رہ جاتی ہے واقعہ کی تفصیلات بالعموم غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ واقعہ بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ کا مفہوم

اس واقعے کا آغاز اَلَمْ تَرَ سے کیا گیا ہے۔ اس طرح کے الفاظ سے اُس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو یا تو مخاطب گروہ کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے یا واقعہ اس قدر مشہور ہوتا ہے کہ اسے ذکر کرنے سے پہلے اس کی نسبت یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ مخاطب یقیناً اس سے واقف ہوں گے۔ اور مزید یہ کہ یہاں یہ جو کہا گیا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا تو اس سلسلے میں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ دیکھنا ہمیشہ چشمِ بصارت سے نہیں ہوتا بلکہ وہم و تخیل، غور و فکر اور عقل کی راہ سے بھی مطالعہ و مشاہدہ مراد ہوتا ہے۔ امام راغب الاصفہانی نے تصریح فرمائی ہے کہ جب اس فعل کا صلہ الٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس سے مقصود دیکھنا نہیں بلکہ کوئی نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اندازِ بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ ایک معروف واقعہ تھا جسے عام طور پر لوگ جانتے تھے۔ لیکن یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ سننے والے اس سے عبرت حاصل کریں اور اس سے سبق سیکھیں۔

واقعہ کیا تھا؟ تین نقطہ ہائے نظر

اب سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا اور کس قوم کے ساتھ پیش آیا؟ علامہ قرطبی رحمتہ اللہ علیہ نے ابن عطیہ سے واضح طور پر نقل فرمایا کہ مفسرین نے اس سلسلے میں جتنے قصے بیان کیے ہیں وہ سب ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں صحیح سند کے ساتھ کوئی روایت منقول نہیں ہوئی اور دوسری یہ بات کہ یہ واقعہ مشہور ضرور تھا لیکن اس کی تفصیلات محفوظ نہیں تھیں اور لوگوں کو اس سے زیادہ غرض بھی نہیں ہوتی۔ اتنی بات سب کو معلوم تھی کہ ایسا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ لیکن وہ کہاں پیش آیا، کب پیش آیا اور کس قوم کے ساتھ پیش آیا؟ تاریخ کی یہ تمام کڑیاں گم ہو گئیں۔ لیکن مفسرین نے ان کڑیوں کو ڈھونڈنے کے لیے جو کاوشیں کی ہیں ان میں تین باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن انہیں بھی حتمی تحقیق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے قدیم مفسرین جو کچھ فرماتے ہیں اس کا ماخذ تفسیر ابن کثیر ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اگرچہ اسے بعض صحابہ اور تابعین کے حوالے سے نقل کیا ہے لیکن ان میں سے کوئی حوالہ بھی ایسا نہیں جسے یقین کے ساتھ قبول کیا جا سکے۔ لیکن ہمارے مفسرین چونکہ اکثر اسے نقل کرتے ہیں اس لیے ہم بھی سب سے پہلے اسے معارف القرآن سے نقل کر رہے ہیں۔

Marfat.com

ا۔ ”بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی۔ وہاں سخت وبا' طاعون وغیرہ پھیلا۔ یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع مقام میں جا کر مقیم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا۔ دو فرشتے بھیج دیئے' جو میدان کے دونوں سروں پر آ کھڑے ہوئے اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت مرے ہوئے رہ گئے' ایک بھی زندہ نہ رہا۔ آس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی' یہاں پہنچے۔ دس ہزار انسانوں کے کفن دفن کا انتظام آسان نہ تھا' اس لیے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنا دیا۔ ان کی لاشیں حسب دستور گل سڑ گئیں' ہڈیاں پڑی رہ گئیں۔ ایک زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حزقیل بتلایا گیا ہے' اس مقام سے گزرے۔ اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو پھر زندہ فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور انہیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں:

ایتها العظام البالیة ان اللہ یأمرک ان تجمعی

(یعنی اے ہڈیو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر جوڑ کی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے)

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی۔ جن کو دنیا بے عقل و بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و ادراک رکھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں۔ قرآن کریم نے آیت **اعطی کل شیء خلقه ثم هدی** میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی۔ مولانا رومی نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے ۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہرحال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں۔ پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو:

ایتها العظام ان اللہ یأمرک ان تکتسی لحماً و عصباً و جلداً

(اے ہڈیو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنا گوشت پہن لو اور پٹھے اور کھال درست کر لو)

یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہر ڈھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی۔ پھر حکم ہوا کہ اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے:

Marfat.com

ایتها الارواح ان الله یأمرک ان ترجع کل روح الی الجسد الذی کانت تعمرہ.

(اے ارواح! تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر وحیات ان سے وابستہ تھی)

یہ آواز دیتے ہی ان کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے چار طرف دیکھنے لگے۔ سب کی زبانوں پر تھا ''سبحانک لا الہ الا انت۔''

اس واقعہ میں عبرت کے کئی پہلو ہیں۔ اس بستی کے لوگ نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک اللہ کی طرف سے طاعون کا عذاب ان پر مسلط ہوا اور پھر وہ ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جان بچانے کے لیے گھروں سے بھاگے اور ایک محفوظ جگہ تلاش کر کے وہاں زندگی کا سامان کر کے بیٹھ گئے۔ لیکن موت نے انہیں وہاں بھی آ پکڑا۔ وہ سمجھتے تھے کہ موت کو ہم اپنی بستی میں چھوڑ آئے ہیں اب یہاں موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن بظاہر ان کی محفوظ جگہ میں وہ تمام کے تمام موت کا نشانہ ہو گئے۔ لیکن پھر جب پیغمبر کی دعا سے اللہ نے انہیں زندہ کرنا چاہا تو انہیں زندہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موت اللہ کی طرف سے آتی ہے زندگی بھی اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ جس طرح اس نے ان لوگوں کو زندہ کیا اسی طرح وہ قیامت میں تمام مخلوقات کو زندہ کرے گا۔ آخر آیت میں فرمایا کہ اللہ چونکہ اپنے بندوں پر بہت مہربان اور فضل والا ہے اس لیے وہ ایسے واقعات سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ لوگ اس کا شکر گزار بننے کے بجائے کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس واقعے میں چونکہ طاعون کا ذکر آیا ہے اس لیے مفسرین نے طاعون کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس تفصیلی بحث کا ذکر کرنا تو بہت مشکل ہے البتہ چند باتوں کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ طاعون کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ جس سرزمین میں طاعون پھیل جائے وہاں سے بھاگنے کی اجازت نہیں۔ اور جو لوگ طاعون زدہ بستی سے باہر ہوں انہیں اس کے اندر نہیں جانا چاہیے۔ اس پر بعض لوگوں کو عقلی اشکال پیدا ہوا کہ طاعون زدہ مقام میں داخل ہونا اور طاعون زدہ مقام سے نہ ہٹنا یہ دونوں عملاً متضاد ہدایتیں ہیں۔ اگر طاعون بچنے کی چیز ہے تو وہاں سے ہٹنے کا بھی حکم ملنا چاہیے۔ اور بچنے کی چیز نہیں تو اس شہر میں پہنچ جانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔ لیکن غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر وبا زدہ مقام سے ہر ایک کو نکلنے کی اجازت دے دی جائے تو سب لوگ بھاگنا شروع کر دیں گے اور شہر خالی ہو جائے گا۔ اس بے تحاشا بھگدڑ سے آبادی کو جن مالی' معاشی' تمدنی اور اخلاقی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا ان کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ مزید برآں اس سے عقیدہ و اخلاق کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ فرار ہمت' ثباتِ قلب' شجاعت اور باہمی ہمدردی کے بھی منافی ہے اور اسی سے توکل اور اعتماد علی اللہ کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور یہی چیزیں امت مسلمہ کا سرمایہ ہیں۔ اور رہی یہ بات کہ وہاں داخل نہیں ہونا چاہیے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جہاں وبا پھیلی ہوئی ہے اور موت کا بازار دھڑا دھڑ گرم ہے وہاں جا کر بلا وجہ موت کو دعوت دینا اسباب ظاہری کو بالکل نظر انداز کر دینا ہے' یہ بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے غلط بات ہے۔ اس لیے اسلام نے ان دو متضاد پہلوؤں کے درمیان اعتدال اور سلامتی کی راہ نکالی اور حکم دیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں جانے کی اجازت نہیں اور اس شہر کے رہنے والوں کو وہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ نکلنا جس طرح عقیدے کو نقصان دیتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنے ساتھ طاعون کے جراثیم لے کر جائیں اور جو لوگ اس بیماری میں مبتلا نہیں ہیں ان کو بھی مبتلا کر دیں۔

Marfat.com

۲۔ دوسرا نقطۂ نگاہ ہمارے جدید محققین کا ہے۔ وہ عہد عتیق سے بنی اسرائیل کے تاریخ کے آئینہ میں اس واقعے کو تلاش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس واقعے میں مذکورہ موت کو حقیقی موت نہیں بلکہ ایمانی' اخلاقی اور قومی موت تصور کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے چونکہ اخلاقی اور ایمانی بے حسی اور نیند اور بے ہوشی پر بھی موت کا اطلاق کیا ہے اس لیے وہ اسے بنیاد بنا کر یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں کہ ممکن ہے یہاں بھی انہیں معنوں میں موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں دو واقعات کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔ جن میں سے ہم ایک کا تذکرہ تدبر قرآن سے نقل کرتے ہیں اور ساتھ ہی صاحب تدبر قرآن کی تصریحات کا بھی ذکر کرتے ہیں:

اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفۂ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے' جیسا کہ سموئیل میں تصریح ہے۔ لیکن بدعات اور شرک کے غلبے کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطینیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انہوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین کر لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیے تھے۔ خوف و بزدلی کی یہ موت ان پر بیس برس طاری رہی۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا۔ ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سرنو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سرنو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطینیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں' جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

فلسطینیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت' ان کے ہاتھوں ان کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

''اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی۔ کیونکہ تیس ہزار اسرائیل پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔'' (سموئیل باب ۴' ۱۰-۱۱)

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

Marfat.com

''اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی.......... اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی۔ اس لیے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔'' (سموئیل باب ۴، ۱۷۔۲۲)

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مرونی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

''اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزر گئے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عتارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھوں سے تمہیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عتارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمہارے لیے خداوند سے دعا کروں گا۔'' (سموئیل باب ۷، ۲۔۶)

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے:

''اور سموئیل بنی اسرائیل کے لیے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انہوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے......سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا۔ اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑا لی۔'' (سموئیل باب ۷، ۱۰۔۱۴)

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جز ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انہوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر مُوْتُوْا سے فرمائی۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ کیا

Marfat.com

گیا ہے۔یعنی جب انہوں نے گمراہی پسند کی تو ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور انہوں نے از سرِ نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سرِ نو زندہ و متحرک کر دیا۔ اسی چیز کو یہاں ثُمَّ اَحْیَاهُمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کو امتحان کرتا ہے۔"

۳۔ تیسرا نقطۂ نگاہ یہ کہ ہے یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعہ خروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایماء سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کر لو تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہیں کنعانیوں پر غلبہ عطا فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملے کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی ان کی پہلی نسل کا اس بیابان کی چالیس سالہ سیاحت میں مرجانا' یہ ان کے لیے اللہ کا عذاب تھا۔ جس کا وہ شکار ہو گئے۔ اور پھر انہی کی نسل کو ایمان کی قوت سے بہرہ ور کرنا اور پیغمبر کے ہدایت کے مطابق جہاد کے ذریعے ان کا کنعانیوں پر غلبہ حاصل کرنا یہ وہ زندگی ہے جو اللہ نے دوبارہ ان کو عطا فرمائی۔

حاصل کلام یہ کہ اس آیت میں بیان کردہ واقعے سے کوئی واقعہ بھی مراد ہو وہ مقصود نہیں ہے۔ مقصود اصل میں وہ عبرت اور وہ سبق ہے جو یہ آیت مسلمانوں کو دے رہی ہے۔ کہ تم زندگی اور موت کو اللہ کے قبضے میں سمجھو اور موت سے ڈر کر کبھی بزدلی نہ دکھاؤ۔ نیز اس بات کا بھی یقین کر لو کہ اللہ کے کام کسی کے محتاج نہیں ہوتے اگر تم اپنی زندگی کی محبت میں اللہ کے راستے میں جہاد و قتال سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں مٹا کر تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو تمہاری طرح نہیں ہو گی بلکہ اللہ کے راستے میں وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گی۔ تمہیں اگر محرومیوں سے بچنا ہے اور حقیقی زندگی مطلوب ہے تو پھر تمہیں آگے بڑھ کر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے علم جہاد بلند کرنا چاہیے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

(اور قتال کرو اللہ کے راستے میں اور خوب جان لو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے، تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے، اللہ ہی گھٹاتا ہے اور اللہ ہی بڑھاتا ہے، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) (۲۴۴ تا ۲۴۵)

Marfat.com

قتال کا حکم

دوسروں کے واقعات سے مسلمانوں کے سامنے جہاد و انفاق کی اہمیت اور اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کا جذبہ ابھار کر اب اصل حکم ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں اللہ کے راستے میں قتال کرو تمہارے سامنے کفر کی طاقتیں پوری طرح مسلح ہو چکی ہیں اور وہ تمہیں ہر ممکن طریقے سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ ان کی بے دینی اور ان کا شرک انہیں تمہاری بیخ کنی پر ابھار رہا ہے اور تم لوگ جو اللہ کے سپاہی ہو اور جنہیں دنیا میں ایک صالح انقلاب برپا کرنا ہے تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تم سر دھڑ کی بازی لگا دو اور اللہ کے راستے میں ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور جہاد و قتال سے اپنے دشمنوں پر یہ ثابت کر دو کہ تم مخالفتوں اور مشکلات سے گھبرانے والے نہیں ہو۔ اور نہ دشمنوں کی کثرت تمہیں ہراساں کر سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات یاد رکھو کہ اللہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ تم اپنے اللہ سے جو مانگو گے وہ اسے سنے گا اور اس کے بارے میں جس طرح کا احساس رکھو گے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ دلوں میں چھپی ہوئی باتوں سے وہ آگاہ ہے۔ اس لیے اگر تم اس سے وابستگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو پھر اپنے دلوں کی دنیا کو اسی کی محبت' اسی کی یاد اور اسی کے لیے غیرت سے آباد کرو۔ وہ تمہاری ہر حالت سے واقف ہے اس لیے کبھی اپنے آپ کو بے بس اور بے کس نہ سمجھو۔

انفاق کا حکم

دوسری آیتِ کریمہ میں انفاق کا حکم دیا۔ کیونکہ جس طرح حق کی سربلندی کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے اسی طرح جہاد و قتال کی تیاری کے لیے انفاق بھی کرنا ضروری ہے۔ مومن کا بھروسہ اگرچہ اللہ پر ہوتا ہے لیکن اسے اسلحہ جنگ کی بہرصورت ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ کی نصرت و تائید اپنی جگہ لیکن فوج کے مصارف کے لیے پیسے کی ضرورت تو ناگزیر ہے۔ اس لیے یہاں قتال کے بعد انفاق کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اس کا ذکر ایسے دلنواز انداز میں کیا کہ اس سے جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو بلکہ فرمایا کہ جہاد و قتال کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے بتاؤ تم میں سے کون اللہ کو قرض دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے تم جو بھی اس راستے میں خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کی واپسی کی ضمانت دیتا ہے۔ کیونکہ قرض ایسی رقم یا ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جس کی واپسی قرض لینے والے پر ضروری ہوتی ہے۔ ایک مومن جب اللہ کے راستے میں انفاق کرتا ہے تو وہ حقیقت میں اللہ کو قرض دیتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ پابند ہے کہ وہ یہ قرض دوگنا چوگنا کر کے قرض دینے والے کو واپس کرے۔ اللہ کی عنایات اپنے بندوں پر بے پایاں ہیں جن ان کا شمار ممکن نہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ کسی شخص کے پاس بھی اگر کوئی مال و دولت ہے تو وہ اس کا اپنا نہیں بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ اس کی دین اور بخشش ہے۔ اگر اللہ ہی کے راستے میں اسے خرچ کیا جائے تو وہ تو امانت کی ادائیگی کی ایک صورت ہے۔ لیکن اس کا کرم ملاحظہ کیجیے کہ وہ اپنے دیے ہوئے مال کو اپنا نہیں بلکہ مال داروں کا ارشاد فرما رہا ہے۔ اور پھر ان سے انہیں پر خرچ کیا جانے والا اپنے ذمے قرض ٹھہرا رہا ہے کہ تم اطمینان سے اللہ کے راستے میں خرچ کرو میں ذمہ داری قبول کرتا ہوں کہ تمہاری ایک ایک پائی اس طرح واپس ہو گی کہ اس میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہو گا۔ حدیث میں اس کو مثال سے واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "جب کوئی بندہ میرے راستے میں میرے نام پر دیتا ہے تو میں اسے دائیں ہاتھ سے قبول کر

Marfat.com

ہوں اور پھر اسے اس طرح بڑھاتا ہوں جیسے تم اپنے گھوڑوں کے بچوں کو پالتے ہو۔ اور وہ میرے ہاتھ میں بڑھتے بڑھتے اتنا عظیم ہوجاتا ہے کہ احد پہاڑ بھی اس کے مقابلے میں پست ہوجاتا ہے۔'' مزید اس بات پر توجہ فرمایئے کہ یہاں قرض کو قرضِ حسن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والا دل کی آمادگی اور خلوصِ نیت سے قرض دے۔ وہ محض چھدہ نہ اتارے بلکہ وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرکے خوشی محسوس کرے۔ اور قرض بھی ایسے مال میں سے دے جو حلال اور طیب ہو۔ اور اللہ کے راستے میں وہ چیز دے جو اسے انتہائی پسند ہو۔ قرآن وسنت کی یہی وہ ترغیبات ہیں جس کے نتیجے میں صحابہ کرام اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں لٹا دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایک صحابی ہیں جن کا نام ابوالدحداح ؓ ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ؐ سے پوچھا اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ ؐ پر قربان ہوں کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا ہاں! اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے تم کو جنت میں داخل کردیں۔ ابوالدحداح ؓ نے یہ سن کر کہا اللہ کے رسول ہاتھ بڑھائیں آپ ؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ابوالدحداح ؓ نے یہ کہنا شروع کیا میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں۔ اس کے علاوہ میری ملک میں کچھ نہیں۔ میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔ آپ ؐ نے ان سے فرمایا ایک اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کردو اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی معاشی ضرورت کے لیے باقی رکھو۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے کہا آپ گواہ رہیے ان دونوں میں سے بہترین باغ جس میں کھجور کے ۶۰۰ درخت ہیں اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔ آپ ؐ نے اس پر نہایت مسرور ہوکر فرمایا: کم من عذقِ رداحٍ و دار فیاحٍ لاب الدحداح (کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ محلات کس قدر ابوالدحداح کے لیے تیار ہیں) ابوالدحداح ؓ گھر تشریف لائے، آپ ؓ کا گھر چونکہ باغ کے اندر تھا اس لیے باغ کے کنارے کھڑے ہوکر آواز دی ''یا ام الدحداح! اے دحداح کی ماں! بچوں کو لے کر باہر آجاؤ میں یہ باغ اللہ کو قرض دے چکا ہوں۔'' بیوی یہ سن کر نہایت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں ''اے دحداح کے ابا! آپ نے بہت اچھا سودا کیا۔''

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ○

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کردیجئے تاکہ ہم اللہ کے راستے میں لڑیں۔ نبی نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کردیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ کہنے لگے بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے بچوں سے۔ پس جب ان پر فرض کردیا گیا جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے ان میں سے چند لوگوں کے سوا۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو (۲۴۶)

Marfat.com

بنی اسرائیل کا مطالبہ

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا کی وضاحت کرتے ہوئے ہم عرض کر چکے ہیں کہ بعض اہلِ تفسیر کا یہ خیال ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف حضرت سموئیل علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ یہ قوم اپنے بگاڑ میں اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے اپنی موت مر چکے تھے۔ حضرت سموئیل علیہ السلام نے برسوں ان میں کام کیا تو ان کی اصلاحی کوششوں سے ان کے اندر زندگی کی رو دوڑی۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اب ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ہم نے خواہشاتِ نفس کی تعمیل میں جواب تک زندگی گزاری ہے وہ انسانیت کی موت سے کم نہ تھی۔ اب اللہ نے حضرت سموئیل علیہ السلام کی کوششوں کے نتیجے میں ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے ہم اب تک اپنی عیاشیوں اور بے عملیوں کے باعث ملک کے بہت سے حصے دشمنوں کے قبضے میں دے چکے ہیں' انہیں دوبارہ چھڑانے کی کوشش کرنی چاہیے اور زندہ قوموں کی طرح آزادی کی زندگی گزارنے کی سعی کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان اہلِ تفسیر کے خیال میں یہ اسی قوم کے اشراف ہیں جنہیں ''اَلْمَلَاءِ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ملاء سے مراد قوم کے روساء و شرفاء ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسی جماعت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کسی ایک نظریہ پر اتفاق کر چکی ہو۔ دونوں معنوں میں سے کوئی معنی بھی مراد لیا جائے۔ بات ایک ہی ہے کہ اس قوم کے اشراف اور بڑے بڑے لوگ اپنے وقت کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام کے پاس گئے۔ اور اگر دوسرے اہلِ تفسیر کی وضاحتوں کو دیکھا جائے تو متذکرہ بالا آیت کے بارے میں ان کی رائے اگرچہ دوسری ہے لیکن اس آیت کی وضاحت میں وہ بھی قومِ سموئیل ہی مراد لیتے ہیں۔

ان کے ملک کے کئی شہروں پر فلستیوں اور عمالقہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ ان میں بیداری پیدا ہونے کے بعد اگرچہ انہوں نے کئی شہروں کو واگزار کروایا لیکن اب تک بھی کئی شہر ان کے قبضے میں تھے۔ اور فلستیوں کے علاوہ موآب' بنی عمون' دوم اور ضوباہ کے بادشاہوں سے بھی انہیں ہر وقت اندیشہ رہتا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً ان کی سرحدوں پر حملے کرتے رہتے تھے اور کسی نہ کسی سرحدی علاقے پر قبضہ کر لیتے تھے۔ بنی اسرائیل کی اس جماعت نے جب یہ دیکھا کہ ہم اتنے بڑے بڑے دشمنوں میں گھر گئے ہیں اور ہمارے قائد اللہ کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام اب اس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں کہ وہ جنگ میں ہماری قیادت نہیں کر سکتے اور ان کے بیٹے اپنے باپ کے طریقے پر نہیں ہیں اس لیے ان سے بھی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ایک ہی حل دیکھا اور حضرت سموئیل علیہ السلام سے ایک ''مَلِکْ'' مقرر کرنے کی درخواست کی جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تین صدیوں بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کا ہے۔

مَلِکْ کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں چونکہ مَلِکْ کا لفظ آیا ہے اس لیے بعض لوگوں کو اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام شاید ملوکیت اور بادشاہت کا حامی ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر انہوں نے اسلامی نظام کو شاہی نظام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ہمارے اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات واضح کی ہے کہ ملک سے مراد کوئی مطلق العنان بادشاہ نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ حضرت سموئیل علیہ السلام کو نبی کے ساتھ ساتھ اپنا حکمران بھی مانتے تھے۔ اس لیے انہی سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر یعنی سپہ سالار مقرر ک

Marfat.com

دیں جس کی قیادت میں ہم دشمنوں سے جہاد کریں اور اپنے شہروں کو واگزار کرائیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ان کے علاقے ہی فلستیوں یا عمالقہ کے قبضے میں نہیں تھے بلکہ وہ ان کا صندوق بھی چھین کر لے گئے تھے جسے تابوتِ سکینہ کہا جاتا تھا۔ اس میں تورات کا حجری نسخہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے کچھ تبرکات' عصائے موسیٰ اور صحرائی زندگی کی کچھ علامات تھیں۔ اس صندوق کی حیثیت بنی اسرائیل میں کعبۃ اللہ کی تھی۔ وہ نمازوں کے وقت خیمہ عبادت میں اسے اپنے سامنے رکھتے تھے۔ جنگوں میں بھی اللہ سے مدد طلب کرنے کے لیے اس تابوت کو فوجوں کے سامنے رکھا جاتا۔ اس تابوت کے چھن جانے سے یوں سمجھے کہ ان کے کعبے پر قبضہ کرلیا گیا تھا اس لیے بنی اسرائیل میں جیسے ہی دینی حس بیدار ہوئی انہیں اپنے شہروں سے بھی زیادہ اس بات کا صدمہ ہوا کہ تابوتِ سکینہ ہم سے چھن چکا ہے ہمیں بہرصورت اسے واپس لینا چاہیے اس لیے انہوں نے اپنے لیے ایک سپہ سالار مقرر کرنے کی درخواست کی۔ اور اس درخواست میں یہ بھی وضاحت موجود تھی کہ آپ ہی اسے مقرر فرمائیں اور آپ ہی کی ہدایت و رہنمائی کے مطابق وہ ملک کا نظام چلائے' ان کی شیرازہ بندی کرے اور چھنے ہوئے علاقوں کو واپس لے۔ ان باتوں پر غور کرنے سے ایک ہی بات واضح ہوتی ہے کہ ملک کے اصل حکمران حضرت سموئیل علیہ السلام تھے' یہ نیا تجویز کردہ شخص ملک کا حکمران نہیں بلکہ ماتحت تھا۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد اسلام پر ملوکیت کے الزام کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابلِ ستائش ہے' اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اور اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کی باغی ہے تو وہ قابل مذمت ہے' عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہے یا جمہوریت۔

بنی اسرائیل کے اشراف کی درخواست کے جواب میں حضرت سموئیل علیہ السلام نے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر ایک امیر مقرر کر دیا جائے اور جہاد فرض کر دیا جائے' لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو۔ کیونکہ حضرت سموئیل علیہ السلام اپنے تجربات اور فراست سے اس بات سے آگاہ تھے کہ بنی اسرائیل کی اصل کمزوری یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی اچھا سپہ سالار نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں ان کی قیادت کر سکے بلکہ ان کی اصل کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے امیر مقرر کرنے سے پہلے صاف صاف ان کے سامنے اپنے اندیشے کا اظہار کر دیا۔ لیکن انہوں نے جواب میں بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا۔ کہ آپ نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں جہاد کا حکم دیا جائے اور ہم اس سے انکار کر دیں۔ جبکہ ہمارے بچے تک دشمن کے قبضے میں ہیں۔ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے' ہمارے کتنے شہروں پر ان کا قبضہ ہے' ہم تو غیرت سے گھول رہے ہیں کہ کب ہمیں موقع ملے اور ہم دل کے ارمان نکالیں۔ لیکن جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو حضرت سموئیل علیہ السلام کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے کہ ان میں سے بیشتر لوگوں نے ہمت ہار دی اور قسم قسم کے بہانے بنا کر جنگ سے فرار کا راستہ نکالا۔ ایک قلیل تعداد ان لوگوں کی رہ گئی جو اس میدان میں ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے اور جہاد کا حق ادا کرنے پر آمادہ ہوئی۔ اگلی آیاتِ کریمہ میں ان کے اسی رویے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان آیات سے مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی قوم کی تاریخ کا آئینہ رکھا جا رہا ہے جس میں انسانی خوبیاں اور انسانی کمزوریاں پہچانی جا سکتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو پیغمبر کی کاوشیں ان کو اٹھا تو دیتی ہیں لیکن جب تک ان میں تربیت کا عمل مکمل نہیں ہوتا ان کی طبعی اور اخلاقی کمزوریوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ مسلمانوں کو چونکہ جہاد و قتال کا حکم دیا جا رہا ہے اور انہیں بنی اسرائیل سے بھی بڑھ کر معرکے درپیش ہیں۔ بنی اسرائیل کے سامنے تابوتِ سکینہ کی واگذاری کا مسئلہ تھا اور مسلمانوں کو

Marfat.com

بھی اللہ کا گھر واپس لینا ہے۔ یہ بھی اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن اور گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اس لیے اس قوم کی تاریخ جو انہی کی طرح حاملِ دعوت امت تھی بیان کی جا رہی ہے کہ امت مسلمہ کو قیامت تک فکر مند رہنا چاہئے کہ ان کے اندر اس طرح کی دینی بے حسی اور اخلاقی کمزوری نہ پیدا ہونے پائے۔ جس سے وہ عملی زندگی میں اپنا کردار پوری طرح ادا نہ کر سکیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوسٰى وَاٰلُ هٰرُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ○

(اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ اس امارت کے ہم حقدار ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا بے شک اللہ نے تمہاری سرداری کے لیے اسی کو چنا ہے اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامانِ تسکین اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو) (۲۴۷ تا ۲۴۸)

طالوت کا تقرر اور بنی اسرائیل کے اعتراضات

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے مطالبے کے مطابق ان پر امیر مقرر کرنے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کی ان کمزوریوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر دور میں اللہ کے غضب کا شکار ہوتے رہے۔ اور دوسری قوموں کے ہاتھوں بالعموم ذلیل ہوتے رہے۔ گزشتہ آیت میں ان کا مطالبہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت سموئیل سے کہا اب آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہم چہار اطراف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایک ایسا امیر چاہئے جو جنگ میں ہماری قیادت کر سکے۔ جس سے ہم اپنی کھوئی ہوئی عزت اور وقار بحال کر سکیں۔ چنانچہ ان کے مطالبے کے مطابق حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان پر طالوت کو امیر مقرر فرمایا۔ بعض محققین کی تحقیق کے مطابق طالوت اصل میں طولوت ہے۔ جس کا معنی ہوتا ہے "لمبا تڑنگا" طالوت کے بارے میں تورات کا بیان ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سب سے قد آور اور سب سے لمبا تھا۔ یہ لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہوتا تو سب سے لمبا دکھائی دیتا۔ قامت کی اس طوالت کے باعث لوگوں میں وہ طالوت

Marfat.com

کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس لحاظ سے معلوم ہوتا ہے طالوت اس کا لقب تھا اور اس کا نام تورات کی روایت کے مطابق ساؤل تھا۔ قرآن کریم نے اس کے لقب کا ذکر کیا ہے اور تورات نے اس کے نام کا۔ آیت کریمہ میں طالوت کے تقرر کے لیے بَعَثَ کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ طالوت کا تقرر حضرت سموئیل نے اللہ کے حکم کے مطابق کیا تھا۔ کیونکہ بائبل نے اس کی تصریح کی ہے کہ ''طالوت اپنے باپ کے گمشدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی امارت کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اس کو اپنے گھر لائے' تیل کی کپی لے کر اس کے سر پر انڈیلی اور اسے چوما اور کہا کہ خداوند نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔'' (سموئیل: باب ۹۔۱۰) اس اعلان کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بنی اسرائیل خوشی سے طالوت کے تقرر کو قبول کرتے اور اپنے پیغمبر کا شکریہ ادا کرتے لیکن انہوں نے اپنی قومی عادت کے مطابق اعتراضات کرنا شروع کیے۔ پہلا اعتراض یہ کیا کہ طالوت ہمارا امیر کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم ہر لحاظ سے اس سے زیادہ امارت کے مستحق ہیں۔ اس اعتراض سے مراد ان کی یہ تھی کہ بنی اسرائیل کی روایت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ نبی ہمیشہ بنی لاوہ کے خاندان سے ہوتا اور امیر یا بادشاہ ہمیشہ بنی یہودا میں سے ہوتا۔ اور طالوت ان دونوں خاندانوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ بنی یامین کے خاندان کی سب سے چھوٹی شاخ کے فرد تھے اور بنی اسرائیل میں چونکہ خاندانی نسبتیں ہندوؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں اس لیے وہ اس کی مخالفت کو کم ہی برداشت کرتے تھے۔ جس طرح ہندوؤں میں یہ تقسیم ہے کہ ان کا مذہبی راہنما برہمن ہونا چاہیے اور ان کے دنیوی حکمران کا تعلق کھشتری خاندان سے ضروری ہے۔ اگر وہ کسی اور خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اس کی حکومت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بنی اسرائیل نے اسی حوالے سے اعتراض کیا کہ طالوت تو کسی طرح ہمارے حکمران نہیں ہو سکتے۔ اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنی اس کمزوری کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ تورات کی روایت کے مطابق انہوں نے حضرت سموئیل کے سامنے نہایت خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے:

> ''ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیامینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے خاندان سے نہیں ہوں؟ اور کیا میرا گھرانہ بنیامین کے سب گھرانوں سے چھوٹا نہیں ہے؟''

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سمجھتے تھے کہ بنی یہوداہ کے خاندان سے باہر کے آدمی کو بنی اسرائیل قبول نہیں کریں گے۔

دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ چلیے اگر یہ شخص کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تو پھر اسے بڑا مالدار ہونا چاہیے۔ کیونکہ ان کی نگاہ میں عزت و وجاہت کے دو ہی حوالے تھے بڑا خاندان یا دولت و امارت۔ اور حضرت طالوت بڑائی کے ان دونوں حوالوں سے خالی تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ وہ تو ایک غریب آدمی ہیں یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے خاندانی لوگوں اور بڑے بڑے امراء کو چھوڑ کر آپ انہیں ہم پر بادشاہ بنا رہے ہیں۔ قریش بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراض کرتے تھے یا آپ کی نبوت کو جن اسباب کے تحت رد کرتے تھے ان میں سب سے بڑا حوالہ یہی ہوتا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کسی کو نبی بنانا ہی ہوتا تو وہ طائف کے رئیسوں میں سے کسی کو بناتا یا قریش کے کسی رئیس کو بنا دیتا۔ آپ جیسا نادار اور قلاش آدمی کیا نبوت کے لیے منتخب کیا جا سکتا ہے؟ نسب اور دولت یہ ایسے دو بت ہیں جنہیں ہر دور میں پوجا گیا۔ اور ہر دور کے انبیاء کرام نے انہی دونوں کے خلاف جہاد کیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی تعلیم و تربیت سے صحابہ کرام میں ان دونوں باتوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کی اور ایمان و عمل کو ایک مومن کے لیے اصل سرمایہ ٹھہرایا ہے' لیکن عجیب بات یہ

Marfat.com

ہے کہ جب بھی پیغمبروں کی تعلیم وتربیت کوزوال پیش آتا ہے تو یہی دونوں بت پھر پجنا شروع ہوجاتے ہیں۔حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان کے اعتراضات کے جواب میں دو باتیں فرمائیں۔ایک یہ کہ طالوت کا انتخاب امارت کے لیے میں نے نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔اس کے انتخاب کے بعد حیل وحجت اور قیل وقال ختم ہوجانی چاہیئے میں تو اس کا پیغمبر ہوں اس لیے اسی کے احکام کی تعمیل کروں گا' تم اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لا چکے ہو اس لیے اس دلیل کے بعد تمہارے لیے طالوت کی امارت کو تسلیم کرنا فرض ہوجاتا ہے۔اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ حکومت کا نظام چلانے یا فوجوں کی کمان سنبھالنے کے لیے نہ تو کسی بڑے خاندان میں سے ہونا ضروری ہے اور نہ اس میں دولت کام آتی ہے۔اس کے لیے تو دو باتوں کی ضرورت ہے علم اور شجاعت۔کہ ایسا آدمی امیر ہونا چاہیئے جس کے اندر ملکی انتظام چلانے' قوم کی شیرازہ بندی کرنے اور دشمن کی سازشوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت موجود ہو اور دوسری یہ بات کہ وہ مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کرسکتا ہو۔بڑی سے بڑی جنگ میں ثابت قدمی کا ثبوت دے سکتا ہو۔وہ ہمت وشجاعت کا پیکر ہو جس سے پوری قوم کو حوصلہ ملے اللہ کا شکر ہے کہ یہ دونوں باتیں طالوت میں موجود ہیں۔اللہ نے اسے علم میں تم سب پر فوقیت دی ہے اور جہاں تک اس کی جسمانی وجاہت کا تعلق ہے تم خوب جانتے ہو کہ پوری بنی اسرائیل کی قوم میں نہ اس جیسا کوئی خوبصورت آدمی ہے اور نہ اس سے زیادہ تنومند اور بہادر یہ دوسری دلیل پہلی دلیل ہی کی طرح بڑا وزن رکھتی ہے۔لیکن صاحب ایمان امت کے لیے اصل دلیل جس کے سامنے اس کی گردن جھک جانی چاہیئے وہ پہلی دلیل ہے۔اس لیے آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔اب اگر اللہ نے یہ چاہا ہے کہ وہ طالوت کو حکومت عطا کریں تو تم اس کے اختیار کو چیلنج نہیں کرسکتے۔اس کا فیصلہ حرف آخر ہے تمہیں بہرصورت اس کی اطاعت کرنی ہے۔لیکن بنی اسرائیل کا فساد اور بگاڑ اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ پیغمبر کی موجودگی اور پیغمبر کے دلائل ان کے لیے موثر ثابت نہیں ہورہے تھے۔اس لیے اللہ کے پیغمبر نے اللہ کے حکم سے انہیں کہا کہ تم اگر طالوت کی امارت پر یکسو نہیں ہورہے ہو تو تمہارے سامنے اللہ کی جانب سے ایک ایسا نشان ظاہر کیا جائے گا جس کا مطلب یہ ہوگا کہ طالوت کی امارت واقعی اللہ کی جانب سے ہے۔اور وہ نشان یہ ہے کہ وہ تابوت جس میں تمہارے لیے اطمینان اور سکون' حوصلہ اور فتح مندی کا سامان ہے اور جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے تبرکات ہیں اسے فرشتے اٹھائے ہوئے تمہارے ملک میں پہنچادیں گے جب کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم قوت سے دشمن سے اسے چھین لو۔

تابوتِ سکینہ کی حقیقت

میں اس سے پہلے عرض کرچکا ہوں کہ تابوت سکینہ ایک صندوق تھا جس میں اس آیت کی شہادت کے مطابق آل ہارون اور آل موسیٰ کے تبرکات تھے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں تو اس میں صرف وہ پتھر کی تختیاں تھیں جو اللہ نے لوح محفوظ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی تھیں اور تورات کا وہ مکمل نسخہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھوا کر بنی اسرائیل کے سپرد کیا تھا۔اور صحرائی زندگی کی وہ نعمتیں جو من و سلویٰ کی صورت میں نازل ہوئیں ان میں من کو ایک بوتل میں بند کرکے اس میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں اللہ کے انعامات کو یاد رکھیں۔لیکن بعد کے لوگوں نے اس میں عصائے موسیٰ' حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پارچات بھی اس صندوق میں رکھ دیے۔بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل تھی۔وہ اس کو خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا وعبادت میں

Marfat.com

اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے اسی کو مرجع بناتے، مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت رہی۔ سکینۃ کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جنگ کی ہولناکیوں میں جب حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں جو استقلال اور ثبات کی کیفیت پیدا فرماتے ہیں قرآنِ کریم میں اسی کو سکینہ قرار دیا ہے۔ اس تابوت کے چھن جانے سے بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے اور ہمارے قومی وقار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ پیغمبر کے اس وعدے پر کہ تابوتِ سکینہ طالوت کی امارت کی علامت کے طور پر تمہیں واپس مل جائے گا، بنی اسرائیل بے حد خوش ہوئے۔ اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ اگر یہ نشانی واقعی ظاہر کر دی گئی تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ طالوت کو اللہ ہی نے ہم پر امیر مقرر کیا ہے اور انہی کے امارت کے تحت ہم جہاد کر کے اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق اس کے بعد تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ تابوت سکینہ کیسے واپس آیا۔ البتہ سیاق کلام خود بول رہا ہے کہ تابوتِ سکینہ واپس آ گیا اور اسی کے بعد جناب طالوت نے اپنے دشمنوں کے خلاف چڑھائی کی۔ تورات نے تابوتِ سکینہ کی واپسی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں اگرچہ فرشتوں کا ذکر نہیں بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دو گائیاں اس چھکڑے کو جس پر تابوتِ سکینہ رکھا ہوا تھا بغیر کسی رہنما کے کھینچتی ہوئی سرحد پار کر گئیں اور بنی اسرائیل کے علاقے میں پہنچ گئیں۔ معمولی غور و فکر سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یقیناً ان گائیوں کو راستہ دکھانے اور ہانکنے والے اور چھکڑے کی نگرانی کرنے والے فرشتے ہی ہوں گے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔

تورات کا بیان یہ ہے:

> ''اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں، جن کے جوا نہ لگا ہو لو اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کرو گے، ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا......... سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق .... اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کو سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور داہنے یا بائیں نہ مڑیں اور فلستی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔'' (سموئیل باب ۶، ۷۔۱۲)

تورات کے اس بیان کو غور سے دیکھئے کہ تابوتِ سکینہ کو ایک چھکڑے پر رکھا گیا اور اسے کھینچنے کے لیے دو سدھائی ہوئی گائیاں نہیں، بلکہ دودھ دینے والی گائیاں جنہیں چھکڑا کھینچنے کی کوئی تربیت نہیں دی گئی اور مزید یہ کہ ان کے بچے بھی ان سے الگ کر کے گھر میں بند کر دیے گئے۔ جانوروں کی عادات سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ مادہ گائے جب کہ اس کا بچہ دودھ پیتا ہو اسے کبھی اپنے سے الگ نہیں کر سکتی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بغیر کسی راہنما اور ہانکنے والے کے گائیوں نے سیدھا بیت شمس کا راستہ اختیار کیا، نہ انہوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں، ڈکارتی ہوئی سیدھی بڑھتی چلی گئیں اور بنی اسرائیل کے علاقے میں داخل ہو گئیں۔ کیا ان میں سے ایک ایک لفظ یہ بتانے کے لیے کافی نہیں کہ یقیناً ان گائیوں کی رہنمائی اللہ کی جانب سے کی جا رہی تھی، فرشتے ان کے یقیناً دائیں بائیں تھے جو ان کو راستہ دکھا رہے تھے اور یہی وہ بات ہے جو کہ قرآن کریم نے بتائی۔

Marfat.com

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ ظاہری اسباب کے بالکل برعکس تابوتِ سکینہ کا بنی اسرائیل کے علاقے میں پہنچ جانا یہ ایسی کھلی نشانی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔لیکن انسان کا عجیب حال ہے۔وہ پتھروں کے سامنے جھکتا ہے اور اپنے خالق و مالک کا انکار کرتا ہے۔اس لیے کہ بڑی سے بڑی حقیقت اور کھلی سے کھلی نشانی کو تسلیم کرنے کے لیے ایمان ضروری ہے۔اس لیے فرمایا کہ اس سارے واقعے میں تمہارے لیے نشانی موجود ہے بشرطیکہ تم صاحب ایمان ہو۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ
فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا
مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا
الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو
اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ
الصَّابِرِينَ (۲۴۹) وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۲۵۰) فَهَزَمُوهُمْ
بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ
عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ
لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۱)
تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲۵۲)
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ
كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ

Marfat.com

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

رکوع: ۳۳۔ (پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے (اپنی فوجوں سے کہا) بے شک اللہ تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر کے ذریعے۔ جو اس نہر سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو وہ یقیناً میرا ساتھی ہے۔ الا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو سب نے اس میں سے پی لیا مگر تھوڑے سے لوگ ان میں سے بچے۔ پھر جب دریا پار کر گئے طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ثابت قدم رہے تو انہوں نے کہا کہ ہم میں آج جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ تو ان لوگوں نے کہا جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں۔ کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئی ہیں۔ اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے ○ اور جب سامنا ہوا جالوت اور اس کی فوجوں سے تو انہوں نے دعا کی اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافر قوم کے خلاف ہماری مدد فرما ○ تو بنی اسرائیل نے انہیں اللہ کے حکم سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت عطا کی۔ اور اسے اس علم میں سے سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے ○ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم پر پڑھ کے سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو ○ یہ سب رسول ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کے درجے بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی مدد فرمائی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔ لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے)۔ (۲۴۹ تا ۲۵۳)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا

Marfat.com

جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے (اپنی فوجوں سے کہا) بے شک اللہ تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر کے ذریعے۔ جو اس نہر سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو وہ یقیناً میرا ساتھی ہے۔ الا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو سب نے اس میں سے پی لیا مگر تھوڑے سے لوگ ان میں سے بچے۔ پھر جب دریا پار کر گئے طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ثابت قدم رہے تو انہوں نے کہا کہ ہم میں آج جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ تو ان لوگوں نے کہا جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں۔ کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئی ہیں۔ اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے) (۲۴۹)

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سموئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طالوت کو بنی اسرائیل کا امیر مقرر کیا۔ انہوں نے اس کی امارت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں اعتراضات کیے' لیت و لعل سے کام لیا' لیکن حضرت سموئل علیہ السلام کے سمجھانے اور تابوتِ سکینہ کے معجزانہ طریقے سے واپس مل جانے کے بعد وہ حضرت طالوت کی امارت پر یکسو ہو گئے۔ حضرت سموئل تو عرصۂ دراز سے ان کی اصلاح کا کام کر رہے تھے۔ اب حضرت طالوت کے امیر بن جانے کے بعد طالوت نے بھی ان کے کام میں معاونت شروع کی۔ اصلاحی پروگرام کو آگے بڑھایا لیکن وہ اصل کام جس کے لیے انہیں امیر بنایا گیا تھا اس کے لیے اگرچہ عقیدہ و عمل کی اصلاح خشتِ اول کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بے حد ضروری تھی کہ اس قوم میں شیرازہ بندی کی جائے' ان میں ڈسپلن پیدا ہو' ان کے عزائم میں توانائی آئے اور ان میں حربی صلاحیت اور جہادی روح پیدا کر کے دشمنوں سے اپنے علاقے واگزار کرائے جائیں اور وہ قومی افتخار جو قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے اس کی بحالی کا اہتمام کیا جائے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ طالوت کو اس کام میں کتنا عرصہ لگا لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب قوم کی اجتماعی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے تو وہ اپنی فوجوں کو فلسطینیوں کے مقابلے میں لے کر نکلے جن کا سردار جاتی جولیت تھا جسے قرآن کریم نے جالوت کے نام سے یاد کیا ہے۔ جاتی جولیت معلوم ہوتا ہے عبرانی لفظ ہے جو معرب ہو کر جالوت ہو گیا۔ حضرت سموئیل اور حضرت طالوت کی اصلاحی کوششوں اور انتظامی اقدامات سے اگرچہ بنی اسرائیل میں بہت کچھ بہتری کے آثار پیدا ہو گئے تھے لیکن ابھی تک حضرت سموئل اور حضرت طالوت دشمن کے سامنے ان کی ثابت قدمی کے حوالے سے پوری طرح مطمئن نہ تھے اس لیے حضرت سموئیل نے حضرت طالوت کو اللہ کا یہ حکم پہنچایا کہ میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ساتھ جانے والے فوجیوں کا امتحان لے لینا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ وہ میدانِ جنگ میں جا کر بزدلی دکھائیں اور اس کے نتیجے میں کوئی بڑا حادثہ پیش آئے۔ چنانچہ حضرت طالوت نے ان کے ڈسپلن اور اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتے ہیں کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد و قتال کے جذبے میں کہاں تک مخلص ہو۔ چونکہ یہ حکم اللہ ہی نے دیا تھا اس لیے اس کی نسبت بھی طالوت نے اپنی طرف کرنے کے بجائے اللہ کی طرف کی۔

Marfat.com

فوج کی ثابت قدمی کا امتحان

اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَهَرٍ (اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے) نہر عربی زبان میں دریا کو بھی کہتے ہیں اور ندی نالے کو بھی۔ تعین سے یہ بات کہنا مشکل ہے کہ وہ دریائے اردن تھا یا راستے کا کوئی ندی نالہ۔ دریائے اردن بھی کوئی بہت بڑا دریا نہیں اس کی براہِ راست لمبائی کل پینسٹھ میل ہے۔ البتہ اس کے خم و پیچ کو ملا کر اس کا طول دوسو میل ہو جاتا ہے۔ علاقہ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے اور یہ ملک کی قدرتی سرحد کا کام بھی دیتا ہے۔ اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے اور بحر جلیل اور بحر طبریہ سے ہوتا ہوا بحر مردار میں جا گرتا ہے۔ اس کا پانی شروع میں تو صاف' شفاف' شیریں ہے لیکن آگے جا کر گدلا' بدبودار اور مضر ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ لشکر دریائے اردن پار کر کے فلسطیوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے والا تھا۔ جالوت اپنا لشکر لے کر وہیں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یا ممکن ہے کوئی اور ندی نالہ مراد ہو اصل مقصود تو صرف یہ بتلانا ہے کہ طالوت نے اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت و وفاداری کو دیکھنے اور ان کی ثابت قدمی کو جانچنے کے لیے اعلان کیا کہ آگے جو دریا یا ندی نالہ آ رہا ہے تمہیں اس کے پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گرمی اور سفر کی وجہ سے تمہیں پیاس تنگ کر رہی ہے' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں کہاں تک تکالیف برداشت کر سکتے ہو۔ اس لیے تمہارے لیے حکم یہ ہے کہ تم اس کے پانی کو چکھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن پھر اس حکم میں تخفیف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہاں تم میں سے اگر کسی نے ہاتھ سے ایک چلو بھر کے پانی پی لیا تو وہ معاف ہے' لیکن جس نے اس سے زیادہ پانی پیا تو اس کا تعلق میری فوج سے نہیں ہوگا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان میں سے ایک محدود تعداد کے سوا پوری فوج نے اس حکم کو توڑ ڈالا اور انہوں نے جی بھر کے پانی پیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ انہیں پانی پینے کی سزا یہ دی گئی کہ وہ ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ ان میں اٹھنے کی ہمت نہ رہی لیکن جن لوگوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے امیر کا ساتھ دیا اور ثابت قدمی دکھائی وہ تروتازہ اور شاداب چہروں کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے اور پانی نہ پینے کے باوجود ان کی پیاس ختم کر دی گئی۔ یہ تو ان پر اللہ کا انعام ہوا لیکن اصل بات جو دیکھنے کی تھی وہ صرف یہ تھی کہ جو لوگ چند گھنٹوں کے لیے پانی پینے پر صبر نہیں کر سکتے وہ میدانِ جنگ میں کیا پامردی دکھائیں گے اور ایسے بے صبر اور کم ظرف لوگوں سے کس معرکے کی توقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس معمولی سے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے انہیں اس لشکر سے الگ کر دیا گیا۔ اب آگے وہ لوگ بڑھے جو واقعتاً زندگی کی تلخیوں پر صبر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ جو مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکتے تھے۔ جن کے پیش نظر اپنی ضروریات کا حصول اور اپنے راحت و آرام کا خیال نہ تھا۔ بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ کے راستے میں ایک فیصلہ کن معرکہ سرانجام دینے کے لیے نکلے ہیں۔ یہ لوگ حضرت طالوت کے ساتھ آگے بڑھ کر جب میدانِ جنگ میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ جالوت ایک لشکر جرار کے ساتھ میدان میں موجود ہے اور خود جالوت کی جسمانی وجاہت کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنے قد و قامت اور اپنی بہادری میں کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اور اس کے ساتھ اتنی بڑی افرادی قوت ہے کہ بنی اسرائیل کی فوج اس کے مقابلے میں نہایت قلیل اور کمزور ہے۔ نہ اس کی تعداد سے ان کی تعداد کا مقابلہ ہو سکتا ہے نہ اس کے اسلحہ جنگ کے مقابلہ میں ان کے پاس اسلحہ جنگ موجود ہے۔ بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ یہ جنگ بالکل ایسی ہی تھی جیسے جنگ بدر۔ جس میں ایک طرف قریش کا ایک عظیم لشکر تھا جو اسلحہ جنگ کے اعتبار سے پوری طرح مسلح تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کا لشکر جن کی تعداد ان سے ایک تہائی بھی نہیں تھی۔ اور اسلحہ جنگ بھی واجبی سا تھا۔ دیکھنے والی نگاہیں دونوں لشکروں میں مقابلے کا کوئی امکان نہیں دیکھتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ مسلمان موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح کی کیفیت طالوت اور جالوت کی فوجوں کے درمیان بھی تھی۔ چنانچہ طالوت کی فوج کے کچھ لوگوں نے جالوت اور اس کی فوجوں کو دیکھتے ہی کہا:

Marfat.com

یہ قول کس کا ہے؟

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ (آج جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں) اس میں بظاہر کمزوری اور بزدلی کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اس کی تاویل میں مفسرین کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ یہ قول ان لوگوں کا ہے جو دریا پر پانی پی کر ڈھیر ہو گئے تھے اور وہ آگے بڑھنے والے ساتھیوں کے حوصلوں کو توڑنے یا اپنے تئیں حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو خودکشی نہ کرو آج جتنی طاقت جالوت اور اس کی فوجوں کے پاس ہے اسے دیکھتے ہوئے ان سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہم اس کے مقابلے میں جانے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ تمہیں اگر مذہبی جنون نے پاگل کر دیا ہے تو تم جا کر جان دو۔ مفسرین کے دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ قول طالوت کے ساتھ آگے بڑھنے والوں میں سے ایک گروہ کا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی جالوت اور اس کی فوجوں کی تعداد اور اسلحہ کی فراوانی کو دیکھا تو بیساختہ پکار اٹھے کہ اتنی عظیم فوج اور ایسے گرانڈیل جوان جرنیل کے ساتھ کون لڑ سکتا ہے۔ لیکن اس میں بزدلی یا کم ہمتی کا اظہار نہیں تھا بلکہ ایک امر واقعی کا اعتراف تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے جنگ یرموک میں مسلمانوں کے ایک محدود لشکر کے مقابلے میں رومیوں کی لاتعداد فوج کو دیکھ کر ایک سپاہی نے بے ساختہ حضرت خالد بن ولید سے کہا کہ کوئی حد ہے رومیوں کی فوج کی تعداد کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فوجیں زمین سے اُمڈتی چلی آ رہی ہیں۔ تو حضرت خالد بن ولید نے اسے تھپڑ مارا اور کہا اگر میرے گھوڑے کے سم نہ گھس گئے ہوتے تو میں انہیں کہتا کہ اتنی ہی فوج اور لے آؤ۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جنگیں فوجوں کی کثرت سے نہیں لڑی جاتیں بلکہ جذبۂ بے پناہ اور اللہ کی تائید و نصرت سے لڑی جاتی ہیں۔ لیکن کہنے والے کے پیش نظر بھی کسی کمزوری کا اظہار نہ تھا بلکہ فوجوں کی کثرت پر حیرانی کا اظہار تھا۔ یہاں بھی بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے ان کی کثرتِ تعداد اور اسلحہ کی فراوانی پر حیرت کا اظہار کیا تھا مقصود یہ تھا کہ ہمیں اس پہلو پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ یہ لوگ کامل الایمان تھے۔ ان کے ایمان میں کوئی کمزوری نہیں تھی۔ البتہ اسباب پر اللہ کی نصرت کو غالب کر دینے کی ابھی مشق نہیں ہوئی تھی۔ وہ اللہ سے مدد مانگتے تھے لیکن ساتھ ہی معروضی حقیقتوں کو بھی سامنے رکھتے تھے۔ لیکن ان کے وہ ساتھی جو اکمل الایمان ہونے کا درجہ رکھتے تھے انہوں نے انہیں ٹوکا اور وہ نعرہ لگایا جس کے سامنے اسباب بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

فتح و شکست کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (کتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں اور لشکروں پر غالب آئی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یہ ایک ایسا انقلابی اور سرفروشانہ نعرہ ہے جو صرف ان لوگوں کی زبان پر آ سکتا ہے جنہیں دو باتوں کا یقین ہو ایک تو یہ بات کہ اصل طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ انسانوں کی طاقت یا دنیوی طاقت کے اسباب دوسرے اسباب کے مقابلے میں تو کام آتے ہیں لیکن اللہ کی طاقت کے مقابلے میں کبھی کام نہیں آتے۔ جس طرح تلوار چاہے کیسی ہی کاٹ کیوں نہ رکھتی ہو اس کی اصل طاقت وہ ہاتھ ہے جو اسے استعمال کرتا ہے۔ وہ تلوار جو بزدل کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن وہی تلوار خالد بن ولید کے ہاتھ میں آ جائے تو صفیں الٹ دیتی ہے۔ کیونکہ اصل طاقت اس ہاتھ

Marfat.com

میں ہے جس میں تلوار چمکتی ہے۔ اسی طرح وہ بندۂ خدا یا بندگانِ خدا کا گروہ جو اللہ کے فوجدار بن کر صرف اس کی رضا کے حصول کے لیے میدانِ جنگ میں یہ سمجھ کے آتے ہیں کہ ہماری زندگیاں اللہ کی ہیں۔ یہ اسی کی دین ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اسی کی رضا کے لیے اور اسی کے راستے میں قربان کی جائیں۔ مقابلے میں کوئی چھوٹی طاقت ہو یا بڑی جس آدمی کی نظروں میں صرف اللہ کے حکم کو سر بلند کرنا اور اس کے لیے جان دینا مقصدِ زندگی ٹھہرے اس کے لیے یہ چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ جان لینے کے لیے تو شاید بڑی طاقت درکار ہو لیکن جان دینے اور تعمیلِ حکم کے لیے تو کسی بڑی طاقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایسے لوگ عقل سے نہیں ایمان سے سوچتے ہیں۔ وہ جب اس بات میں یکسو ہو جاتے ہیں کہ اللہ کا راستہ یہی ہے اور آج اس راستے کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اس کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے اپنی جان نذر کر دوں تو پھر طاقت اور قوت کے فلسفے ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ وہ بڑی سے بڑی طاقت سے دیوانہ وار ٹکرا جاتے ہیں انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہماری پشت پر اللہ کی طاقت ہے۔ اور اللہ کی طاقت پر کوئی دوسری طاقت غالب نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ ایک بدو برہنہ شمشیر لے کر آپؐ کے سر پر آ پہنچا اور کہنے لگا کہ بتاؤ تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ تو آپؐ نے نہایت اطمینان سے فرمایا "اللہ" اس بے ساختہ جواب پر اس کے ہاتھ میں کپکپی طاری ہوئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ غارِ ثور میں جب دشمن غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔ صدیق اکبر پریشان ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تمہاری ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا رائے ہے جن کا تیسرا خدا ہے؟ مطلب واضح ہے کہ ہم دو ہیں ہمارے ساتھ تیسرا خدا ہے جو ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ ہمیں کسی دشمن سے کیا ڈر ہو سکتا ہے اور ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

اور دوسری یہ بات کہ جس آدمی کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ جسم و جان میرے نہیں اللہ کے ہیں۔ یہ اس کی امانت ہیں۔ جب بھی اس کی طرف سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ انہیں حوالہ کیے بغیر غلبۂ دین کا کام مکمل نہ ہوتا ہو تو پھر ضروری ہے کہ میں انہیں اس کے راستے میں قربان کر دوں اور اس بات کا یقین رکھوں کہ یہ قربانی کوئی گھاٹے کا سودا نہیں۔ بلکہ یہ ایسا سودا ہے جس کا نفع بے انتہا اور یقینی ہے میری جان نکلتے ہی جنت کے پٹ میرے لیے کھل جائیں گے، جنت کی حوریں میرے لیے چشم براہ ہوں گی، اللہ کی رحمت جھوم کر مجھ پر نثار ہو گی۔ یہ یقین ایک ایسی قوت ہے جس کے سامنے کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی۔ اس کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات سامانِ سفر بن جاتی ہیں۔ اس یقین سے سرشار لوگوں کے لیے مرنا آسان اور زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سر کو کندھے کا بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی روح اس وقت سرشار ہو جاتی ہے جب یہ بوجھ اتر جاتا ہے۔ ایک صحابی جنہوں نے جنگِ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور شاید وہ اسی روز مسلمان ہوئے تھے کہ حضور اب مجھے کیا کرنا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ وہ کھجوریں کھا رہے تھے، کھجوریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کیں اور کہا کھجوروں کو ختم کرنا لمبی زندگی ہے، کون اتنا انتظار کرے۔ دیوانہ وار آگے بڑھے اور لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خود قبر میں اتارا اور فرمایا عمل قلیلا و اجر کثیرا (اس شخص نے کام تھوڑا کیا لیکن اجر بہت پا گیا) اس کی روح جنت میں سیر کر رہی ہے۔

Marfat.com

انسانوں کا جو گروہ اس انقلابی سوچ سے سرشار ہو کر اٹھتا ہے وہ ایک ایسا طوفانِ بے پناہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ چنانچہ ایسی ہی سوچ سے سرشار لوگوں نے یہ بات کہی کہ کتنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑے بڑے لشکروں پر غالب آ گئیں۔ ہم اگر تھوڑے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے' ہم اگر کمزور ہیں تو اللہ تو کمزور نہیں' نہ اس کی طاقت چھوٹی ہے' ہمیں اسی پر اعتماد اور توکل کرتے ہوئے آگے بڑھنا اور دشمن سے ٹکرانا ہے۔ شرط صرف ایک ہے کہ ہمارے قدموں میں تزلزل نہ آنے پائے۔ ہم صبر کی چٹان بن کر ان کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو وہ ہماری کمزوری کو بھی طاقت میں بدل دے گا اور اگر اس کو منظور نہ ہوا تو ہم اس کے نام پر قربان ہو کر حقیقی زندگی سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔ ایک ایسی زندگی جسے کبھی زوال نہیں۔

راہِ حق میں نکلنے والوں کی دعا

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ O

(اور جب سامنا ہوا جالوت اور اس کی فوجوں سے تو انہوں نے دعا کی اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے' ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافر قوم کے خلاف ہماری مدد فرما) (۲۵۰)

ایک محدود تعداد اسلحۂ جنگ کی کمی اور دشمن کے مقابلے میں بے سروسامانی کو محسوس کرتے ہوئے ان سرفروشوں نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے کہ الٰہی دشمن بہت طاقتور ہے اور ہم نہایت کمزور ہیں۔ اس کی طاقت کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ البتہ تیری ذات پر بے پناہ اعتماد رکھتے ہیں۔ تیری قدرت وقوت کی کوئی انتہا نہیں۔ تو ہی بے کسوں کا سہارا اور بے بسوں کی طاقت ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس منہ زور طاقت سے ٹکرا جائیں۔ لیکن کمزور دلوں کو حوصلہ دینا اور استقلال اور استقامت کی دولت عطا کرنا تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو ہی جانتا ہے کہ طاقت ور دشمن کے مقابلے میں ہم پر کیا گزرے گی۔ ہر طرح کی صورتِ حال میں تو ہمیں ثباتِ قدم کی دولت عطا فرما۔ ہمیں مصائب کے مقابلے میں دل جمعی اور استقلال کے ساتھ کھڑا رہنے کا حوصلہ عطا فرما۔ ہماری کمزوری کو قوت میں تبدیل فرما دے اور دشمن کے مقابلے میں ان قوتوں سے ہماری مدد فرما جن سے تو ہمیشہ اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ کافر لوگ اپنی قوت کے بل بوتے پر غرور اور تکبر کا اظہار کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں آئے ہیں تو ان کے خلاف ہماری مدد فرما اور ہمیں ان پر غلبہ عطا فرما۔ جس طرح ایمان' یقین اور صبر مومن کے ہتھیار ہیں اسی طرح اللہ کی تائید ونصرت اس کا اصل سرمایہ ہیں۔ جب یہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اللہ کے بندوں پر غالب نہیں آ سکتی۔ لیکن جب ان میں کمزوری پیدا ہوتی ہے' بجائے صبر کی تصویر بننے کے حالات کی طغیانی اور قہرمانی کو دیکھتے ہوئے حالات اور طاقت کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہیں۔ بجائے اللہ سے حوصلہ طلب کرنے کے حوصلہ ہار جاتے ہیں اور اللہ سے لو لگانے کی بجائے ان قوتوں پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں جو اللہ اور اس پر ایمان لانیوالوں کی دشمن ہیں تو پھر اللہ کی نظر التفات ایسے لوگوں کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ پھر انہیں انہی لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں۔ مومن اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ کافروں کا ترنوالہ بن جاتے ہیں۔ ان پر ذلت کی پھٹکار

Marfat.com

پڑتی ہے اور وہ تاریخ میں عبرت کے طور پر یادر کھے جاتے ہیں۔قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے اس واقعے کو بھی بیان کیا ہے کہ جب اسے ارض مقدسہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے ارض مقدسہ پر قابض قوتوں کی طاقت کو دیکھتے ہوئے نہ صرف لڑنے سے انکار کیا بلکہ بزدلی کی انتہا کردی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ نے چالیس سال تک انہیں صحرائے تیہ کے حوالے کردیا۔ارض مقدسہ ان کے لیے حرام کردی گئی۔بزدلوں کی پوری نسل اس صحرا کی نذر ہو کر رہ گئی۔دوسری نسل صحرا میں پل کر جوان ہوئی تو تب ان کو عزت کی زندگی کا راستہ ملا۔اور اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے اس گروہ کا ذکر ہو رہا ہے جنہوں نے کمزور اور بے مایہ ہوتے ہوئے بھی ایک بڑی قوت سے ٹکرانے کا حوصلہ کیا۔کسی کمزوری کا شکار ہونے کے بجائے اللہ کی تائید و نصرت پر اعتماد کیا۔تو اللہ نے معجزانہ طریقے سے ان کی مدد فرمائی۔جس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں آ رہا ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(تو بنی اسرائیل نے انہیں اللہ کے حکم سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کردیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت عطا کی۔اور اسے اس علم میں سے سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے) (۲۵۱)

اس آیتِ کریمہ میں مختلف باتیں ارشاد فرمائی گئیں ہیں۔لیکن وہ تمام کی تمام سیاقِ کلام سے مربوط اور موضوع سے مطابق ہیں۔

اصل قوت اللہ پر بھروسہ ہے

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ معروضی حقائق پر نگاہ رکھنے والے اپنی فوج کی قلت اور دشمن کی فوج کی کثرت کو دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ اس بے جوڑ مقابلے کا انجام کیا ہوگا۔لیکن جن لوگوں کو اللہ کی ذات اور اس کی قدرتوں پر بے پناہ توکل تھا وہ پکار اٹھے کہ فتح وشکست کا تعلق قلت و کثرت سے نہیں بلکہ اللہ کی تائید و نصرت اور عدم نصرت پر ہے۔ہم چونکہ اس کے راستے میں اس کے سپاہی بن کر اسی کے دین کی سربلندی کے لیے پوری آمادگی اور وفاداری کے ساتھ نکلے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم نے دشمن کے مقابلے میں صبر کے تقاضوں کو پورا کیا تو وہ ضرور ہمیں فتح عطا فرمائے گا۔چنانچہ اس آیتِ کریمہ کے آغاز ہی میں فرمایا کہ جنہیں دنیا قلیل اور کمزور سمجھ رہی تھی انہوں نے طاقتوروں کو شکست دے دی۔یعنی طالوت کی فوج نے جالوت اور اس کے عظیم لشکر کو ایسی شکست فاش دی کہ وہ لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یقین و ایمان سے سرشار لوگوں نے جو بات کہی تھی وہ سچ ثابت ہوئی۔اور عمل کی دنیا میں یہ بات تاریخ کا حصہ بن گئی کہ یہ محض مفروضے نہیں ہیں کہ اصل قوت اللہ پر توکل اور مشکلاتِ راہ پر صبر کرنا ہے‘یعنی حوصلہ‘سیرت و کردار اور یقین و ایمان وہ اسلحۂ جنگ ہے جس کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی فوج اور جدید ترین اسلحہ بھی شکست کھا جاتا ہے۔

Marfat.com

حضرت داؤدؑ کا حیرت انگیز کارنامہ اور آپ کی پُرافتخار زندگی کا آغاز

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ کہی گئی کہ اس معرکۂ حق و باطل میں صرف یہی ایک حیران کن حقیقت معرضِ وجود میں نہیں آئی کہ قلت نے کثرت کو شکست دے دی' بلکہ اس سے بھی حیران کن بات یہ ہوئی کہ داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا۔ جالوت ایک گرانڈیل جوان' تجربہ کار جنگجو' اپنے وقت کا ناقابل تسخیر جرنیل اور جنگی حکمتوں سے بہ تمام و کمال آشنا اور اس کے مقابلے میں داؤد ایک نوخیز' الھڑ اور ناتجربہ کار نوجوان جسے صرف بھیڑیں چرانے کا تجربہ ہے۔ اس نے اس سے پہلے شاید کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اس جنگ کے وقت بھی وہ کسی چراگاہ میں اپنے مویشی چرا رہا تھا اور اس کی کم عمری کے باعث اسے جنگ میں بھیجا نہیں گیا تھا بلکہ اس کے باپ نے اس کو حکم دیا کہ تم اپنے بڑے بھائیوں کو جو طالوت کی فوج میں شریک ہیں کھانے کی کوئی چیزیں دے آؤ۔ داؤد وہ کھانے کی چیزیں لے کر میدانِ جنگ میں پہنچا تو جالوت مبارزت طلب کر رہا تھا اور بار بار طالوت اور اس کی فوج کو اپنے مقابلے کی دعوت دے رہا تھا۔ لیکن اس کی بہادری اور اس کے تن و توش کو دیکھ کر کوئی اس کے مقابلے میں جانے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ جب داؤد نے یہ منظر دیکھا تو اس کی غیرت جوش میں آئی۔ بے ساختہ طالوت کے پاس پہنچا اور کہا اس نامختون فلسطینی کی یہ مجال کہ وہ زندہ خدا کی فوجوں کو رسوا کرے۔ آپ مجھے اجازت دیجئے میں اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ طالوت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ ایک نوخیز' خوش رو اور خوش قامت نوجوان ہے۔ اس کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث اسے کس طرح ایک ایسے جنگجو کے مقابلے میں بھیجا جا سکتا ہے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن حضرت داؤد کے جوش و جذبہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اجازت دے دی۔ داؤد اپنے اسی چرواہے کے لباس میں فلاخن اٹھائے اس کے مقابلے میں جا پہنچے۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوعمر چرواہا میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے تو اس نے اس کا مذاق اڑایا۔ حضرت داؤد نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ باتوں میں زچ ہو کر جالوت نے غضب ناک ہو کر کہا کہ دیکھ ابھی میں تیرا گوشت چیلوں اور کووں کو کھلاتا ہوں۔ غصے میں لال بگوکا ہو کر دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔ لیکن حضرت داؤد نے اپنے فلاخن میں پتھر رکھ کر اس زور سے نشانہ باندھ کے مارا کہ وہ پتھر اس کے سر سے چپک کر رہ گیا۔ پتھر کی چوٹ اور اس کی تیزی کی قوت نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیے اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اس غیر معمولی اور حیرت انگیز طریقے سے ایک مشہور و معروف جنگی پہلوان اور جرنیل کا مارا جانا ایسا واقعہ نہیں تھا کہ فوج اس سے اثر قبول نہ کرتی۔ فوج نے جیسے ہی دیکھا کہ ایک نوخیز لڑکے نے ہمارے جرنیل کو قتل کر دیا ہے تو وہ سراسیمہ ہو کر بھاگے اور میدان خالی ہو گیا۔ بنی اسرائیل کا جالوت اور اس کی فوجوں کو شکست دینے کا اصل سبب حضرت داؤد کی معجزانہ جسارت اور شجاعت تھی۔ داؤد اور بنی اسرائیل کی فتح کے نتیجے میں جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ نے ایک نئی کروٹ لی اور جغرافیہ تبدیل ہونا شروع ہوا وہیں حضرت داؤد کی زندگی میں بھی ایک حیرت انگیز انقلاب آیا۔ اب تک آپ عام چرواہوں کی طرح ایک چرواہا تھے۔ لیکن اس واقعے نے ان کی شہرت اور ان کی عظمت میں چار چاند لگا دیے۔ تورات کی روایت کے مطابق عورتوں نے یہ گیت گایا کہ (ساؤل نے ہزاروں کو مارا پر داؤد نے لاکھوں کو مارا) یہی واقعہ ان کی حقیقی شناخت کا سبب بنا۔ اسی حیرت انگیز کارنامے نے انہیں طالوت کی نظروں کا تارا بنا دیا۔ پہلے طالوت نے انہیں اپنا مقرب بنایا اور فوج میں اہم ذمہ داریاں تفویض کیں' اس کے بعد انہیں اپنا داماد بنایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتیں نکھرتی گئیں۔ حضرت طالوت کے انتقال کے بعد اللہ نے انہیں ملک کی حکومت دے دی۔ یہ دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک چرواہا چند ہی سالوں میں ملک کے تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ خود حضرت داؤد کا اپنے بارے میں یہ قول مشہور ہے کہ "خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔"

Marfat.com

حکمت ودانش

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے بعد اللہ نے اس سے بڑھ کر انعام واکرام سے نوازا کہ آپ کو نبوت عطا فرمائی' آپ کو حکمت کا خزانہ بخشا جس کا مظہر زبور ہے۔ اور پھر آپ کو وہ کچھ سکھایا جو ہمیشہ وہ اپنے بندوں کو سکھاتا ہے۔ یہ زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں' سیرت و کردار کی وہ عظمتیں ہیں' علم ودانش کے وہ بلند آفاق ہیں جن کے پیچھے صرف پیغمبر جھانک سکتا ہے۔ دنیا سے بے نیازیاں اور آخرت سے آشنائیاں ہیں جس کے نتیجے میں تخت پر فائز حکمران ساری عظمتوں کے باوجود اپنے آپ کو ایک فقیر سے زیادہ نہیں سمجھتے اور دل ودماغ اور سیرت وکردار کی یہ وہ عظمت ہے جس کے حامل دنیا میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اللہ نے پیغمبر بھیجے اور اس سے دنیا کی اصلاح فرمائی' بادشاہ پیدا کیے جس سے دنیا کا انتظام وانصرام کیا' لیکن وہ علم ودانش جو پیغمبر لیکر آتے ہیں اور وہ اقتدار جو بادشاہوں سے وابستہ ہوتا ہے ان دونوں کی یکجائی کی صورت کم کم رہی ہے۔ دوسری قومیں چونکہ اس سے بہت کم آشنا ہوئی ہیں اس لیے انہوں نے دنیا کو مذہب سے بیگانہ کردیا۔ ان میں اگر اس یکجائی کی مثالیں ہیں تو وہ حضرت طالوت' داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام ہیں۔ لیکن وہ صحرا نشین پیغمبر جو دنیا کے سب سے پسماندہ علاقے سے اٹھا اس نے حیرت انگیز طریقے سے اللہ کی راہنمائی میں ان دونوں قوتوں کو اس طرح یکجا کیا کہ جس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں ابوبکر وعمر' عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور عمر بن عبدالعزیز کے راستے پر چلنے والے بہت سے حکمران دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فقر وسلطنت کو اس طرح جمع کیا کہ وہ اللہ کی رحمت کا ذریعہ بن گئے۔ اقبال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے کو دوسروں پر تعریض کرتے ہوئے بڑی حقیقت بیانی سے واضح کیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ۔۔۔ سماتی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا ۔۔۔ چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا ۔۔۔ فقیری ہے آئینہ دارِ نذیری

فلسفۂ جہاد اور اس کی ضرورت

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ آیت کریمہ کے اس حصے میں جہاد کی ضرورت اور اس کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں پر غلبہ' بڑائی اور حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ افراد بھی آپس میں اپنی بڑائی اور عظمت منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور انسانوں کے گروہ بھی اپنے علاقوں میں دوسرے گروہوں پر غلبہ حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں اور مختلف حکومتیں دوسری حکومتوں سے اپنی عظمت کو منوانے یا ان پر قبضہ کرنے کی تدابیر بروئے کار لاتی رہتی ہیں۔ اس کشمکش میں یقیناً کوئی نہ کوئی گروہ دوسرے گروہوں پر غالب آجاتا ہے۔ اگر تو غالب آنے والا گروہ مصلح' حق پسند' عادل اور اللہ سے ڈرنے والا ہے تو دنیا خیر اور بھلائی کا گہوارا بن جاتی ہے اور اس میں رہنے والے آرام کی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن اگر کسی خطے میں حکومت پر براجمان لوگ مفسد' خواہش نفس کے پجاری' ہوس زر اور ہوس اقتدار کے پرستار ہوتے ہیں تو وہ ملک بدی اور برائی کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کے رہنے والے آئے دن نئے نئے مظالم کا شکار ہوتے ہیں۔ دنیا دکھوں سے بھر جاتی ہے۔

Marfat.com

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں اللہ سے ڈرنے والے اور دوسروں کا بھلا چاہنے والے کم ہوتے ہیں۔ حکومت کی ذمہ داری تو ایسی خطرناک ذمہ داری ہے کہ اس پر فائز ہونے والے لوگ اقتدار سے پہلے اگر نیک ہوتے ہیں تو اقتدار میں آکر یکسر بدل جاتے ہیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں عموماً ایسی حکومتیں یا ایسے لوگ برسرِ اقتدار رہتے ہیں جو دنیا میں اصلاح کے عمل کو بروئے کار لانے کے بجائے فساد کو پھیلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دولت و حکومت کی کسی حد پر بھی ان کو اطمینان نہیں ہوتا۔ ان کی ہوس ہمیشہ انہیں آگے بڑھنے پر اکساتی ہے۔ وہ اپنی خود غرض طبیعت کے باعث ایثار و قربانی سے یکسر بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ خیر سے آگاہی انسانیت سے محبت اور اللہ کا خوف پیدا کرنے کے لیے دنیا میں عموماً پیغمبر بھیجتا رہتا ہے۔ پیغمبروں پر ایمان لانے والے دعوت و نصیحت سے خیر کو پھیلانے اور شر کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر شر کی قوتیں اتنی توانا ہو جاتی ہیں کہ خیر کا کوئی داعی اور بھلائی کا کوئی مرکز ان کی دسترس سے محفوظ نہیں رہتا اور ان کی سرکشی تمام حدود سے گزر جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی دوسری سنت حرکت میں آتی ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کی کمزوریوں کے باوجود ان کو جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے اور شر کی قوتوں کو سرنگوں کرنے کے لیے ان کی تائید و نصرت فرماتا ہے۔ کسی بھی خطۂ زمین پر اگر کوئی بھی حق کا گروہ صبر و استقامت کی تصویر بن کر اللہ پر توکل کرتے ہوئے شر کی قوتوں کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد کرتے ہیں اور اسے فتح و نصرت سے نوازتے ہیں۔ وہ تھوڑے بھی ہوتے ہیں تو بڑے بڑے گروہوں پر غالب آجاتے ہیں۔ لیکن اگر حق کی کوئی قوت بھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتی اور وہ شر سے دب کر خاموش رہتی یا اس سے سمجھوتا کر لیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے اور سب کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ حضرت سموئیل پر ایمان لانے والے طالوت کی قیادت میں چونکہ خیر کی قوت بن کر شر کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ اور ان کو فتح سے ہمکنار کیا اور پھر اپنی سنت کو واضح فرمایا کہ طالوت اور اس کی فوج کو کامیابی عطا کرنا کوئی خصوصی واقعہ نہیں بلکہ یہ ہماری ایک مستقل سنت اور قانون ہے۔ جب بھی ہمارے راستے میں کوئی بھی خیر کی قوت ہم سے مدد مانگے گی تو ہم کبھی اسے مایوس نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر ہم خیر کی قوتوں کی مدد نہ کریں اور شر کی قوتوں کو منہ زور ہونے دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری زمین فساد سے بھر جائے گی۔ ہم مفسد قوتوں کو ایک خاص حد تک ہی بڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جب وہ تمام حدود سے تجاوز کرنے لگتے ہیں تو پھر ہم پسے ہوئے اور کمزور لوگوں کو اٹھاتے ہیں اور یا ہم عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو قرآنِ کریم میں ارشاد کے مطابق ''کوئی عبادت خانہ اور کوئی خیر کا مرکز مسمار ہونے سے محفوظ نہ رہے اور کہیں بھی اللہ کا ذکر نہ کیا جا سکے'' لیکن یہ چیز چونکہ ہماری سنت کے خلاف ہے اس لیے ہم اس کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتے اور اس صورت حال کو بدلنے کے لیے ہم جہاد و قتال کا حکم دیتے ہیں۔ بظاہر جہاد میں گردنیں اترتی ہیں' بازو کٹتے ہیں' خون بہتا ہے' لیکن حقیقت میں یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ جو اس راستے میں کام آتے ہیں وہ شہادت کے خلعتِ فاخرہ سے نوازے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی قربانیوں کے نتیجے میں دنیا تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اللہ کا یہ قانون ایک تشریعی قانون ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے تکوینی قانون کا عکس ہے۔ کیونکہ جس سرزمین میں جھاڑ جھنکاڑ بڑھ جاتا ہے اسے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ پھول کے ساتھ بھی کانٹا ہوتا ہے لیکن کانٹوں کا بڑھ جانا فطرت کبھی گوارا نہیں کرتی۔ یہی انسانی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ سچ کہا سالک نے۔

چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخلِ تاک کی　　کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

Marfat.com

تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ○

(یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم پر پڑھ کے سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو) (۲۵۲)

نبی کریم ﷺ کی طرف التفات اور آپؐ کی رسالت کا اثبات

اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی یہ بات کہ یہ قرآنِ کریم کی شکل میں ہم جو کچھ بھی تم پر نازل کر رہے ہیں اور ہمارا فرشتہ تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے یہ اللہ کی آیات ہیں۔ اس لیے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ و سلم نے اسے خود لکھ لیا ہے۔ وہ تو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں بلکہ انہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز ہے وہ بھی قرآنِ پاک کی ایک سورت جیسی سورت بنا کر نہیں لا سکتے اور مزید یہ بات کہ چونکہ یہ اللہ کا کلام ہے تو اللہ کے کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں جو کچھ تحریف اور ترمیم کا کاروبار ہوتا رہا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کتابیں من جانب اللہ ہوتے ہوئے بھی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہیں، ضروری ہے کہ جب ان کے بیان کردہ کسی واقعے کو بھی قرآنِ کریم میں بیان کیا جائے تو ضروری حد تک ان غلطیوں کی اصلاح کر دی جائے جو پورے واقعے کو متاثر کرتی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں متذکرہ بالا واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس تقاضے کو پورا کیا گیا ہے۔ اس لیے جو جو باتیں اس میں کہی گئی ہیں اور جس طرح کہی گئی ہیں وہی ان کی اصل حقیقت ہیں۔ اس سے مختلف جو کچھ دوسری آسمانی کتابوں میں کہا گیا ہے وہ یکسر غلط ہے۔ قرآن اور تورات کے بیان کردہ واقعات میں اختلافات تو بہت ہیں لیکن متذکرہ بالا واقعات کے حوالے سے ہم صرف چند ایک کا ذکر کرتے ہیں تا کہ اس آیت کریمہ کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

تورات کے تضادات کی اصلاح

ا۔ حضرت سموئیل علیہ السلام نے جس شخص کو اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کا حکمران یا امیر لشکر بنایا تورات میں اس کا نام ساؤل روایت کیا گیا ہے' لیکن قرآنِ کریم نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا نام طالوت تھا۔ یا وہ اسی نام سے پکارے جاتے تھے اور کسی مشہور واقعے کو بیان کرتے ہوئے تاریخ کا اصول بھی یہ ہے کہ جب کسی کردار کا ذکر کیا جائے تو اس کا وہ نام لیا جائے جس سے وہ پکارا جاتا ہو۔ طالوت اصل میں طولوت ہے جس کا معنی ہے لمبا تڑنگا۔ وہ اپنے قد کی طوالت کے باعث یقیناً اسی نام سے پکارے جاتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے قد کی طوالت کا ذکر تو تورات نے اس طرح کیا ہے کہ ''جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔'' چنانچہ قرآنِ کریم نے اصلاح کرتے ہوئے اس کے معروف نام سے اسے پکارا ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم اور تورات دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جب زوال آیا اور وہ اللہ کی تائید و نصرت سے محروم ہو گئے تو ان کی ہمسایہ ریاستوں نے وقتاً فوقتاً ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر یلغار کرنا شروع کی۔ کبھی ان کا کوئی علاقہ چھین لیا جاتا اور کبھی کسی شہر پر قبضہ کر لیا جاتا۔ لیکن وہ پھر بھی اپنی غفلت سے بیدار نہ ہوئے۔ ان کی کمزوری' ناتوانی اور غفلت یہاں تک بڑھی کہ فلسطینیوں نے ان سے تابوتِ سکینہ بھی چھین لیا۔ تابوتِ سکینہ کا چھن جانا کعبہ کے چھن جانے کے مترادف تھا۔ یہی وہ تابوت تھا جسے وہ اپنی

Marfat.com

نمازوں میں سامنے رکھتے تھے اور جنگوں میں اسی سے حوصلہ پاتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کی بقا اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس کے چھن جانے کے باعث اجتماعی طور پر ان پر مردنی چھا گئی۔ لیکن اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان میں اصلاح اور بیداری کا کام کیا۔ آہستہ آہستہ ان میں احساس جاگا' حتیٰ کہ انہوں نے خود اپنے پیغمبر سے خواہش کی کہ آپ ہم پر کسی نوجوان اور توانا آدمی کو امیر مقرر کریں۔ تاکہ ہم اپنے دشمن سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ چنانچہ حضرت طالوت کو ان کا امیر مقرر کیا گیا۔ طالوت نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر حضرت سموئیل علیہ السلام کی رہنمائی میں ان کی شیرازہ بندی کی اور قوم کے حوصلوں کو مزید جلا دینے اور ان کے دل و دماغ میں یہ بات پختہ کرنے کے لیے کہ طالوت کا تقرر اللہ کی جانب سے ہے' تابوتِ سکینہ کو غیر معمولی طریقے سے ان کے ملک میں پہنچا دیا۔ اور یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ تابوتِ سکینہ فلسطینیوں نے خود ان کی طرف بھیجا ہو۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ قوم بڑی تیزی سے منظم ہو رہی ہے اور اگر ہم نے تابوتِ سکینہ کو انہیں واپس نہ دیا تو یہ ہم پر چڑھائی کر دیں گے اور یقیناً اس میں اس بات کا بھی دخل تھا کہ اللہ نے غیر مرئی طریقے سے بنی اسرائیل کی طرف سے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ہو۔ یہ وہ بات ہے جسے قرآنِ کریم تابوتِ سکینہ کی واپسی کے لیے بیان کرتا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل تورات کا بیان یہ ہے کہ تابوتِ سکینہ سات مہینے کے بعد ہی بنی اسرائیل کو واپس مل گیا تھا۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ فلسطینی اسے چھین کر تو لے گئے لیکن وہ جس شہر میں بھی اسے رکھتے وہاں وبائیں پھوٹ پڑتیں جس سے ہزاروں آدمی مر جاتے۔ انہوں نے اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے اسے واپس بھیج دیا۔ اندازہ فرمایئے کیا قوموں کے فیصلے جن کے ساتھ قومی عظمت بھی وابستہ ہو ان معمولی باتوں کے حوالے سے ہوا کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ تورات ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ سات مہینے کے بعد انہوں نے تابوتِ سکینہ واپس کر دیا لیکن دوسری جگہ اس کا کہنا یہ ہے "اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے مدت ہوگئی۔ یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانہ خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔" (سموئیل باب ۷ ا)

غور فرمایئے کہ ایک طرف تو بنی اسرائیل تابوتِ سکینہ کے چھن جانے کے باعث بیس سال تک نوحہ کرتے رہے اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ سات مہینہ کے بعد یہ تابوت واپس آ گیا۔

قرآن کہتا ہے کہ اسے فرشتے لے کے آئے۔ تورات کہتی ہے کہ ایک چھکڑے پر جسے دو بچوں والی گائیاں جنہیں اس سے پہلے کبھی کسی سواری میں جوتا نہیں گیا ہو اس حال میں کھینچ کر لائیں کہ بچے ان سے چھین کر گھروں میں بند کر دیے گئے' لیکن وہ اس کے باوجود ڈکارتی ہوئیں سیدھی بیت شمس جا پہنچیں۔ اندازہ فرمائیں کہ اگر ان گائیوں کو کوئی غیر مرئی طاقت ہانک نہیں رہی تھی اور انہیں سیدھا چلنے پر مجبور نہیں کر رہی تھی تو کیا عقل اس بات کو باور کرتی ہے کہ جن گائیوں کے بچے بھی چھین لیے جائیں اور انہوں نے کبھی چھکڑا نہ کھینچا ہو اور راستے سے بھی بے خبر ہوں' وہ ڈکارتی ہوئی یعنی خوشی خوشی پورا راستہ طے کر جائیں' یہ سراسر ایک افسانہ نویسی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا وہ عقل کے مطابق اور روحانیت کی روح ہے۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم کس طرح ایک ایک بات کی اصلاح کر رہا ہے۔

۳۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے میں ایک بڑا معرکہ درپیش تھا۔ اور ایسا معرکہ کوئی ایسی فوج سر نہیں کر سکتی جن میں حوصلے' ثابت قدمی اور اولوالعزمی کی کمی ہو۔ اس کے لیے اگر ایسے لوگوں کی بھیڑ جمع کر لی جائے جو سرفروشی اور ایثار کے جذبات سے تہی دامن ہو تو وہ پسپائی کا سامان تو کر سکتی ہے' معرکہ آرائی کا نہیں۔ اس لیے اللہ کے حکم سے پیغمبر کی راہنمائی میں حضرت

Marfat.com

طالوت نے میدانِ جنگ تک پہنچنے سے پہلے راستے میں ان کی آزمائش کی۔ جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوئے انہیں راستے میں چھوڑ دیا گیا اور جو کامیاب ٹھہرے وہی مردِ میدان ثابت ہوئے۔ چنانچہ انہی کے ایمان و یقین کی قوت کی وجہ سے اللہ نے انہیں فتح عطا فرمائی۔ لیکن اس کے برعکس تورات کا کہنا یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش ضرور کی گئی' لیکن معرکۂ جنگ سے پہلے نہیں' بلکہ بعد میں۔ طالوت نے حکم دیا کہ جب تک میں اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لوں تمہارا لیے کچھ کھانا حرام ہے۔ جنگ ہو چکی' قتل عام باقی ہے' اب آزمائش کی کیا ضرورت ہے؟ اور مزید یہ کہ اس میں تضادات کی کمی نہیں۔ حضرت طالوت کے بڑے صاحبزادے کو ایک جگہ تو نہایت بلند کردار دکھایا گیا مثلاً تورات میں کہا گیا:

''سو یونتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم اوپر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں ممکن ہے کہ خدا ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں۔''

اس عبارت میں دیکھیے یونتن کو کتنا بڑا صبر و استقامت اور عزم و ہمت کا پیکر دکھایا گیا۔ اور دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ طالوت نے اپنی قوم کو کھانا کھانے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ جو کھائے گا وہ ملعون ہو گا۔ لیکن اس حکم کو سب سے پہلے اسی صاحبزادے نے توڑا اور کہا ''کہ دیکھو میرے باپ نے دکھ دیا ہے۔ دیکھو میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی۔ کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے'' .... سو وہ لوگ لوٹ پر گرے اور بھیڑوں' بکریوں' بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔''

۴۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج امتحان میں ناکام رہی۔ یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے۔ بلکہ انہی صاحبزادے نے پوری فوج کے لیے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی۔ اور اسی عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح عطا فرمائی۔

دوسری بات جس پر قرآنِ کریم زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ تورات نے جس طرح ان واقعات کو بیان کیا ہے وہ قصہ گوئی کی مشق کے سوا اور کچھ نہیں۔ جزوی واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے' لیکن یہ واقعات کیوں پیش آئے؟ بنی اسرائیل کی اصل کمزوریاں کیا تھیں؟ حضرت سموئیل نے ان میں جو اصلاحی کام کیا اس کا نتیجہ کیا رہا؟ طالوت نے کس طرح ان کے اندر ملی شعور پیدا کیا؟ اور ان کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے عظمت رفتہ کو واپس لے سکیں اور پھر طالوت اور جالوت کی جنگ سے پیدا ہونے والے عبرت آموز واقعات اور حقائق جن کی ہمیشہ اہلِ ایمان کو ضرورت رہے گی اور پھر بنی اسرائیل کی کامیابی' حضرت داؤد کا غیر معمولی ظہور اور آپ کی حکمت و دانش ...... ان میں سے کسی بات کو تورات نے نمایاں نہیں کیا اور قرآنِ کریم نے واقعات کے ان اجزاء کو بیان کیا جس سے مسلمانوں کو وہ حکمتیں سمجھائی جا سکتی تھیں جو ان کی قومی اور ملی زندگی کے لیے ضروری تھیں۔ اور قرآنِ کریم جب بھی کسی تاریخی واقعے کو بیان کرتا ہے تو اس کے پیش نظر صرف یہی ایک مقصد ہوتا ہے کہ ان واقعات کی مدد سے غلطیوں پر تنبیہ کی جائے اور قابل تقلید باتوں کو نمایاں کیا جائے تاکہ ہر دور کا انسان اس کتاب سے ہدایت حاصل کر سکے کیونکہ یہ کتاب کتابِ ہدایت ہے تاریخ کی کتاب نہیں۔ اور یہاں بالحق سے یہی مراد ہے۔

تیسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح اور ٹھیک واقعات کا بیان اور ان واقعات سے پیدا ہونے والے عبرت و نصیحت کے جواہر جو قرآن کی صورت میں آپ کی زبان سے پیش کیے جا رہے ہیں' یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ کیونکہ تاریخ نے ان واقعات کے بارے میں جو کچھ کہا۔ آپؐ چونکہ امی محض ہیں اس لیے آپؐ کے پاس

Marfat.com

ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن نہ جانتے ہوئے بھی آپؐ ان واقعات کو بیان کر رہے ہیں اور مزید یہ کہ صرف واقعات بیان ہی نہیں کر رہے بلکہ ان کی اصلاح بھی کر رہے ہیں‘ غلطیوں کی نشاندہی کر رہے ہیں اور صحیح بات کو نمایاں کر رہے ہیں۔ جبکہ آج دنیا میں ان کی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ کیونکہ ان واقعات کو صرف تورات نے یا اس کے شارحین نے بیان کیا ہے۔ وہاں سے ان واقعات کو نقل تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی غلطیوں کی اصلاح کسی کے بس کی بات نہیں۔ تورات کے علماء بھی ان غلطیوں سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ ایسے حقائق جن سے آگاہی کا ذریعہ اللہ کے سوا اور کوئی نہ ہو اس سے اگر کوئی ذات باخبر کرے اور وہ نہایت اعتماد کے ساتھ ایک ایک بات پر متنبہ کرے تو ایسی ہی ذات کو اللہ کا رسول کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ان واقعات کا بیان اور اس میں مستور حکمتوں اور مصلحتوں کی نشاندہی اور اس کے نتائج و فوائد کی طرف راہنمائی اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اہلِ کتاب کو بالخصوص اور اہلِ دنیا کو بالعموم ان دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے آپؐ کی رسالت کا یقین کر لینا چاہئے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر بے ساختہ دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اب اگر اہلِ کتاب اتنی واضح دلیل کے بعد بھی آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تو اس کا سبب ان کا وہ گروہی تعصب ہے جس میں مبتلا ہو کر وہ سب کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ آپؐ کے معجزات اور آپؐ کی صداقت کے منہ بولتے دلائل کو دیکھ کر بھی صرف ان تعصّبات کی وجہ سے ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کوئی اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو ان جیسی خصوصیات کا حامل نہیں ہو سکتا۔ تو ان کی موجودگی میں ہم کسی دوسرے کو رسول کیوں تسلیم کریں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

(یہ سب رسول ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کے درجے بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی مدد فرمائی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔ لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے) (۲۵۳)

اہلِ کتاب پر تنقید

اس آیتِ کریمہ میں جس طرح ہم نے اشارہ کیا تھا اہلِ کتاب کے تعصبات کو ختم کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ تم نے جس طرح اپنے رسول کے بارے میں یہ یقین کر لیا ہے کہ ان کے سوا کوئی دوسرا رسول نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی بفرضِ محال ہو بھی تو ان جیسے فضائل کا حامل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہود کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو نہیں بھیجا‘ بلکہ دنیا کے

Marfat.com

ہر مقام پر اور ہر قوم کی طرف کسی نہ کسی پیغمبر اور رسول کو بھیجا ہے تاکہ وہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچائیں اور ان کی ہدایت کا سامان کریں۔ اور مزید یہ بات کہ جتنے رسول بھی آئے ہیں تمام کو اللہ نے فضیلتیں اور مراتب بخشے۔ کسی کو کوئی جزوی فضیلت عطا فرمائی اور کسی کو کوئی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ صرف دو ہی رسول دنیا میں آئے ہوں یا انہی کو سارے فضائل دے دیے گئے ہیں' بلکہ نبی اور رسول بہت بڑی تعداد میں آئے اور دنیا کی ہدایت کی ضرورت کے مطابق آئے اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے نوازا۔ اس لیے یہودیوں کے تعصب کا کوئی جواز نہیں اور نہ عیسائیوں کے لیے کوئی عذر ہے کہ وہ اللہ کے یہاں اس کے ذریعے معذور ٹھہریں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو باقی رسولوں کی طرح اپنی ذمہ داری کا شدید احساس تھا اور لوگوں کے ایمان نہ لانے پر آپ سخت دل گرفتہ ہوتے تھے لیکن اس اطلاع کے بعد کہ اللہ نے آپ کو خاتم النبیین بنایا ہے اور آپ کی ہدایت آخری ہدایت ہے اور آپ پر اترنے والی کتاب آخری کتاب ہے اور آپ کی امت آخری امت ہے۔ آپ کی ذمہ داری کے احساس میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ آپ یہ محسوس فرماتے تھے کہ میرے بعد چونکہ کوئی ہادی اور کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور اگر ان لوگوں نے میری دعوت کو قبول نہ کیا اور یہ اپنے کفر پر قائم رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب آ کر طوفانِ نوح کی طرح تمام دنیا کا کام تمام کر دے۔ اسی لیے آپ دن بھر تبلیغ و دعوت کی جانگسل کشمکش میں مصروف رہتے اور رات کو آرام کرنے کی بجائے لوگوں کے ایمان کے لیے دعائیں مانگتے۔ چنانچہ گزشتہ رکوع میں آپ کی رسالت پر تاریخی دلائل قائم کرنے کے بعد آپ سے فرمایا گیا کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور صرف آپ ہی رسول نہیں' آپ سے پہلے بھی بڑے بڑے رسول گزر چکے ہیں۔ ان میں سے ایسے بھی تھے جن سے اللہ نے براہِ راست بغیر فرشتے کے واسطے کے کلام فرمایا اور انہوں نے ایک اوٹ سے اللہ کا کلام سنا۔ اور ایسے بھی ہیں جن کے ہم نے درجات بلند کیے اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے معجزات عطا کیے اور پھر قدم قدم پر روح القدس سے اس کی تائید کی۔ روئے سخن چونکہ براہِ راست یہود و نصاریٰ کی طرف ہے اس لیے کلام کے حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نصاریٰ کے حوالے سے نام لے کر تذکرہ فرمایا۔ اور ان کے نام لینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اپنوں اور بیگانوں کی افراط و تفریط کا نشانہ بنے۔ نصاریٰ نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اور یہود بدبخت نے ان کے نسب پر نکیر کیا اور آپ کے بارے میں وہ وہ نازیبا باتیں کہیں اور الزام تراشیاں کیں جو کسی شریف آدمی کے بارے میں بھی نہیں کی جاسکتیں۔ چنانچہ یہود کا رد کرنے کے لیے آپ کی والدہ کے نام کا ذکر کیا اور روح القدس فرما کر ان تمام الزام تراشیوں کی جڑ کاٹ دی جو یہود کی طرف سے کی جارہی تھیں۔ اور درمیان میں یہ فرما کر کہ بعض کے ہم نے درجات بلند کیے اس میں تمام بڑے بڑے رسولوں کو بغیر نام لیے ذکر کر دیا۔ کیونکہ ایک ایک رسول اپنی ذات میں فضائل کا مرقع اور مراتب کا منبع ہے۔ بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے کمالات کے جامع ہیں۔ آپ کو نہ صرف وہ اعلیٰ ترین کمالات عطا کیے گئے جو باقی انبیاء کو عطا کیے گئے تھے' بلکہ ان کے علاوہ ایسے بے شمار مراتب اور ان گنت معجزات آپ کو بخشے گئے جن میں کوئی نبی اور کوئی رسول آپ کا شریک و سہیم نہیں' آپ کو تمام نوعِ انسانی کا نبی بنایا گیا' آپ کسی محدود وقت کے لیے نہیں بلکہ ابد تک کے لیے پیغمبر بن کر آئے۔ قرآن جیسی کتاب آپ پر نازل کی گئی' آپ کو رحمۃ للعلمین کے خطاب سے نوازا گیا' ختم نبوت و رسالت کا تاج آپ کے سر پر رکھا گیا' ان تمام درجات و مراتب کے باوجود آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے کسی پیغمبر پر فضیلت نہ دو تاکہ دوسرے پیغمبروں کے احترام میں کمی نہ آئے۔ لیکن بیانِ

Marfat.com

حقیقت کے لیے آپؐ نے کبھی کبھی اپنے فضائل بیان فرمائے اور یہاں تک فرمایا کہ ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' (میں اولادِ آدم کا سردار ہوں لیکن فخر نہیں کرتا) مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے متعدد رسول آئے۔ جنہیں اللہ نے فضائل وکمالات سے نوازا' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی پیغمبر کو بھی ایسی کامیابی نہیں ملی کہ تمام لوگ اس کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں۔ آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہا جارہا ہے کہ جب دنیا میں کبھی بھی کسی پیغمبر کی دعوت پر تمام ایمان نہیں لائے تو پھر آپؐ کو اس پر دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے جن کی قسمت میں ایمان ہے وہ لائیں گے اور جن کی لیے محرومی لکھی گئی ہے وہ محروم رہیں گے۔

ایک اشتباہ کا ازالہ

بعض لوگوں کو اس آیتِ کریمہ کی وجہ سے ایک اشتباہ پیش آیا ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا: لاتخیرونی علی موسیٰ (مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو) اور ایک دفعہ فرمایا: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو) ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: لا اقول ان احدا افضل من یونس بن متی (میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے) ان ارشادات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کو کسی دوسرے پیغمبر پر فضیلت نہیں دی جاسکتی۔ نیز یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی پیغمبر پر فضیلت نہیں دینی چاہئے۔ اس کا جواب نہایت سادہ ہے کہ جب تک یہ آیتِ کریمہ نہیں اتری تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پیغمبر کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ اور خود آپؐ کو بھی جب تک یہ نہیں بتادیا گیا کہ آپؐ کو اللہ نے سید المرسلین بنایا ہے اور آپؐ سید الاولین والآخرین ہیں اس وقت تک آپؐ نے اپنے آپ کو بھی کسی سے افضل سمجھنا مناسب نہیں سمجھا اور کسی دوسرے کو اس کی اجازت نہیں دی۔ لیکن جب اس کا علم دے دیا گیا تو آپؐ نے مختلف وقتوں میں اس کا اظہار فرمایا۔ اور دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جو تواضع تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپؐ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ افضل ہونے کے باوجود آپؐ کو دوسروں پر فضیلت دی جائے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس بات کی تو شریعت بہرحال اجازت نہیں دیتی کہ پیغمبروں کے مراتب میں تقابل کیا جائے۔ اور جب پیغمبروں کو ایک دوسرے سے افضل ٹھہرایا جائے گا تو پھر تقابل کی بھی نوبت آئے گی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان باتوں سے منع فرمایا۔

ہدایت وضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا قْتَتَلَ الَّذِيْنَ۔ الخ سے پروردگار نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور ان حقائق کو سمجھنے کے لیے انسان کو عقل وشعور سے بہرور فرمایا۔ ہدایت کا یہ سامان کرنے کے بعد انسان کو آزادی دے دی کہ تم چاہو تو پیغمبر کی دعوت قبول کرکے راہِ راست اختیار کرلو اور چاہے پیغمبر کی دعوت کو رد کرکے گمراہ ہوجاؤ۔ دنیا میں ہم تمہیں دونوں طرزِ عمل اختیار کرنے اور دونوں طرح کے راستوں پر چلنے کی آزادی دیتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہم تم سے پوچھیں گے کہ عقل وشعور کی موجودگی میں اور پیغمبروں کی تبلیغی مساعی کے باوجود تم نے حق کو قبول کیوں نہ کیا۔ لیکن دنیا میں نہ ہم کسی کو ہدایت قبول کرنے پر مجبور کریں گے نہ کسی کو بالجبر گمراہ کریں گے۔ جب کوئی نیکی کے راستے کی طرف بڑھے گا تو ہم اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں گے اور جب کوئی برائی کی طرف جانے کی کوشش کرے گا تو ہم اس کے لیے بھی راستے کھول دیں گے اور امکانات پیدا کردیں گے۔ اس قانون کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال

Marfat.com

خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ انسانی ہدایت کے لیے پیغمبر آتے رہے اور انسانوں کی مخالفت کا ہدف بنتے رہے اور جس نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ مسلمان ٹھہرا اور جس نے انکار کیا کافر ہو گیا۔ پھر یہ دونوں گروہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اللہ ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ ہدایت کا جو فطری اور اللہ کا پسندیدہ طریقہ تھا یعنی رسول بھیجنا اور کتابیں بھیجنا' ہم نے اسے برابر جاری رکھا۔ لیکن ہم نے اسے کبھی پسند نہیں کیا کہ ہم زبردستی لوگوں کو ہدایت اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ اگر ہم ایسا کرتے تو یقیناً کوئی نہ گمراہ ہوتا اور نہ کافر۔ اور حق و باطل میں تصادم بھی کبھی نہ ہوتا۔ لیکن اس کے بعد جزا و سزا کا کیا جواز باقی رہ جاتا۔ جزا اس عمل پر دی جاتی ہے جو آدمی اپنے اختیار سے انجام دے۔ اور سزا اس گناہ پر ہوتی ہے جس کا ارتکاب آدمی اپنے اختیار سے کرے۔ اور جب اختیار ختم ہو گیا اور اللہ نے زبردستی لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دیا تو پھر سزا اور جزا کیسی۔ البتہ یہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے یہ آزمائش کیوں رکھی؟ اور ان کو امتحان میں کیوں ڈالا؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ "یہ کیوں" ہر ایک سے کہا جا سکتا ہے لیکن اللہ کی ذات سے نہیں کہا جا سکتا۔ وہ مختارِ کل اور شہنشاہِ مطلق ہے وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ
لَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ڬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ
مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ
عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَ
لَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي
الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ
وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ
لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙيُخْرِجُهُمْ

Marfat.com

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٥٧ۧ

رکوع: ۳۴۔ (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خرچ کرو اس سے جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا ہے اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہی اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے ہیں ○ اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کرے اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ حاوی ہے اس کا اقتدار آسمانوں پر اور زمین پر۔ اور نہیں تھکاتی ہے اسے ان دونوں کی حفاظت۔ اور وہ بلند ہے اور عظیم ہے ○ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔ جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط رسی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ○ اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اولیا طاغوت ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں آگ والے۔ اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (۲۵۴ تا ۲۵۷)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خرچ کرو اس سے جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا ہے اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہی اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے ہیں) (۲۵۴)

Marfat.com

گزشتہ دورکوع سے مختلف اسالیب بدل بدل کر جہاداور انفاق کا مضمون بیان کیا جار ہا تھا کہ درمیان میں دو آیتیں جملہ معترضہ کے طور پر آ گئیں۔اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک خاص دور کی تاریخ کو تورات نے جس طرح ایک کہانی بنا کے رکھ دیا تھا اور واقعات کی ترتیب اور تفصیل میں رنگ آمیزی کی خاطر جو غلطیاں کی گئی تھیں قرآنِ کریم نے اس طرح ان کی اصلاح کی اور ان کے اصل مقاصد کو اس طرح نمایاں کیا جس سے یہ بات خود بخود ثابت ہو گئی کہ ایسی تصحیح اور تصویب اللہ ہی کی جانب سے ہو سکتی ہے کیونکہ دنیا کی کسی لائبریری اور کسی ذریعۂ علم کے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں جن سے وہ ایسی تاریخی غلطیوں کی اصلاح کر سکے جس کا دنیا میں جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔اللہ تعالیٰ چونکہ ماضی' حال اور مستقبل کو یکساں جانتے ہیں اس لیے تاریخ کا وہ زمانہ جو مردہ ہو چکا ہے زندہ شکل میں لوگوں کے سامنے لا سکتے ہیں۔اور جس انسانِ عظیم کے واسطے سے پروردگار انسانوں پر ایسا کرم فرماتا ہے اسے اللہ کا رسول کہا جاتا ہے۔چنانچہ ان تاریخی واقعات کو ٹھیک ٹھیک ذکر کرنے کے بعد اس طرف توجہ دلانا ضروری ہو گیا کہ دیکھو جو شخص نہایت اعتماد کے ساتھ تمہاری کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح کر رہا ہے اور حکمت و نصیحت کے ان جواہر کو تمہارے سپرد کر رہا ہے جس کے جاننے کا دنیا میں کوئی ذریعہ نہیں وہ یقیناً اللہ کا رسول ہے۔اور اس کی رسالت کے اثبات کی یہ ایسی حتمی اور قطعی دلیل ہے جس کے بعد کسی کو بھی انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔لیکن پھر انسان جب اہلِ کتاب اور دوسرے لوگوں کے اختلافات کو دیکھتا ہے تو وہ سر پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے کہ اگر یہ حقیقت اتنی واضح ہے تو یہ لوگ آخری رسول پر ایمان لا کر اپنے سارے اختلافات کو ختم کیوں نہیں کر لیتے۔چنانچہ دوسری آیت میں اس کا جواب دینا بھی ضروری ہو گیا۔تو یہ دو آیتیں جملۂ معترضہ کے طور پر اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے لائی گئیں جس کا ہم نے ذکر کیا۔اور اب پھر سلسلۂ کلام اسی موضوع سے جوڑا جا رہا ہے جو زیر بحث تھا۔

آیت نمبر ۲۴۵ میں انفاق کی دعوت دی گئی تھی اسی کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اس آیتِ کریمہ میں ایک خاص اسلوب کے ساتھ انفاق کے حکم کو دہرایا جا رہا ہے۔اور یہ حکم اس خوبی اور اس بلاغت کے ساتھ دیا گیا ہے جس سے انفاق میں آسانی بھی پیدا ہوتی ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسانوں کے عقائد میں دراڑیں پیدا ہوئی ہیں اور وہ اللہ کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔

جہاں تک آسانی پیدا کرنے کا تعلق ہے اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تم اللہ کے راستے میں اس مال و دولت اور ان نعمتوں میں سے خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں۔یہ انفاق کی دلیل بھی ہے اور اس کی تسہیل بھی۔دلیل اس طرح سے ہے کہ تمہاری پاس جو کچھ مال و دولت ہے اور جن ذرائع سے تم نے کمایا ہے ان دونوں میں سے کونسی چیز ایسی ہے جس کو تم نے وجود دیا ہے' جس کے تم خالق ہو اور جسکو تم واقعی اپنا کہہ سکتے ہو؟ کیونکہ جن ذرائع کو استعمال کر کے تم نے دولت کمائی ہے ان میں سے ایک ایک ذریعہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔تم نے ذہانت لڑائی' صلاحیت صرف کی' پسینہ بہایا' دوڑ بھاگ کی' سلیقے سے لوگوں سے معاملہ کیا اس کے نتیجے میں تمہیں دولت ملی۔ذرا غیر جانبداری سے بتایئے کہ ان میں سے کون سی چیز تمہاری ہے؟ ان میں سے تو ہر چیز خود بول رہی ہے کہ میں اللہ کی مخلوق ہوں۔اور تم پر جو اللہ نے احسانات کیے ہیں میں ان احسانات کی شکل و صورت ہوں۔اسی طرح جن نعمتوں کو تم نے حاصل کیا ہے وہ اگر جنس کی شکل میں ہیں تو تب بھی اللہ کی مخلوق ہیں' وہ علم کی شکل میں ہیں تو وہ بھی اللہ کی مخلوق اور اس کا نور ہیں اور اگر وہ جاہ و منصب کی صورت میں ہیں تو وہ بھی اللہ کی دین ہیں۔

مختصر یہ کہ جب خود مال و دولت اور اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اللہ ہی کی ملکیت' اللہ ہی کی بخشش اور اللہ ہی کی مخلوق ہیں تو پھر اللہ کو بجا طور پر اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان نعمتوں کے خرچ کرنے کا حکم دے۔کیونکہ دنیا کا ہر قانون' دنیا کا اخلاق اور دنیا کی عقل باور کرتی ہے

Marfat.com

کہ مالک اپنے مملوک کو اور آقا اپنے غلام کو ہر طرح کا حکم دینے کا حق رکھتا ہے۔ رہی بات تسہیل کی تو وہ اس طرح ہوتی ہے کہ جب ایک آدمی سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو تو خرچ کرنا اسے گراں گزرتا ہے لیکن جب اس کے ذہن میں یہ بات پیوست ہو جائے کہ خرچ مجھے اس مال میں سے کرنا ہے جسے اللہ ہی نے عطا کیا ہے تو پھر وہ بڑی آسانی سے خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دینے والا اگر اپنی دی ہوئی نعمتوں میں سے چند نعمتیں مانگ لے تو اسے دینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کا حق تو یہ ہے کہ وہ سارا بھی لے سکتا ہے کیونکہ اس کا مالک وہی ہے۔ لیکن جب وہ یہ کہے کہ اس میں سے اڑھائی فیصد میرے راستے میں خرچ کر دو یا ہنگامی حالات میں جائز ضرورتوں سے جو کچھ بچے وہ میرے راستے میں دے دو۔ آدمی خوش ہو کر خرچ کرتا ہے کہ اسے تو سارا مال لینے کا حق تھا لیکن وہ تھوڑا سا اپنے لیے مانگتا ہے باقی وہ میرے پاس چھوڑتا ہے۔ اور اس پر بھی مزید اس کا کرم یہ ہے کہ جب وہ مانگتا ہے تو اس لیے نہیں مانگتا کہ تمہیں یہ کبھی واپس نہیں ملے گا حالانکہ مانگنے کا منطقی تقاضا تو یہی ہے جب ہم کسی کے مانگنے پر کسی کو کوئی چیز دے دیتے ہیں تو پھر اس کی واپسی کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو خرچ کرنے کے لیے کہتے ہیں تو ساتھ ہی یہ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارا میرے ذمے قرض ہے اور قرض وہ ہوتا ہے جس کی واپسی لازم ہوتی ہے اور دینے والا اپنے مقروض سے بجا طور پر اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اس پر بھی مزید اللہ کی عنایت یہ ہے کہ وہ اپنے دینے والے بندے کو جب واپس کرے گا تو صرف اتنا ہی واپس نہیں کرے گا جتنا اس نے خرچ کیا ہے بلکہ اس کے خلوص کے مطابق نہ جانے کتنے گنا بڑھا چڑھا کر اسے واپس دیا جائے گا کبھی ایک کے بدلے میں دس' کبھی سات سو اور کبھی بے شمار یعنی جیسے جیسے دینے والے کا اخلاص اور فدائیت کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی طرف سے بڑھانے چڑھانے کا عمل بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے بعد حکمت و دانش کی بات فرمائی۔ وہ یہ کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم میں سے ہر آدمی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے کسی کو اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہنا۔ طبعی عمر گزارنے کے بعد ہر ایک کو موت کا شکار ہونا ہے۔ کیونکہ اگر کسی کے لیے دوام ہوتا تو وہ اللہ کے نبی یا خاتم النبیین ہوتے۔ کیونکہ وہی اپنے مرتبہ و مقام کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ انہیں کبھی موت نہ آتی۔ لیکن اللہ کا قانون ایسا اٹل ہے کہ جسے بھی اللہ نے زندگی عطا کی ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور موت کا شکار ہوگا۔ سچ کہا امیر مینائی نے ؎

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری زندگی کے خاتمے کے ساتھ یہ مال و دولت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اگر تم اسے ایک لازوال خزانے میں تبدیل کرنا چاہتے ہو تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اللہ کے راستے میں اسے خرچ کر دو۔ وہ فرماتا ہے کہ "میرے راستے میں اگر ایک دانہ بھی خرچ کیا جاتا ہے تو میں اسے اس طرح پالتا ہوں جس طرح تم نہایت چاہت سے گھوڑے کے بچے کو پالتے ہو۔ میں اسے بڑھاتا رہتا ہوں حتیٰ کہ وہ دانہ احد پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا اور وہ ساری زندگی اسے سینچ سینچ کر اور جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور خود ایک چوکیدار کی طرح پہرہ دیتا ہوا زندگی گزار دیتا ہے۔ تو اگر اولاد کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو وہ اس پیسے کو اس طرح دریغ لٹاتے ہیں کہ اس کی زندگی بھر کی کمائی دنوں میں اڑا دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں ترغیب اور ترہیب کا ایک امتزاج پیدا کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں انسان اپنی دولت سے مختلف فوائد اٹھاتا ہے۔ کبھی اسے کاروبار میں

Marfat.com

کرروز بروز ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے' کبھی اسی کمائی ہوئی دولت کے بل بوتے پر بڑے بڑے لوگوں سے دوستی کے رشتے قائم کرتا ہے' لوگوں کو دعوتیں کھلاتا ہے' مختلف طریقوں سے اپنے تعلقات میں اضافہ کرتا ہے' پھر ان تعلقات کو اپنے فوائد کے لیے استعمال کرتا ہے اور کبھی دوسرے کے کام آنے کے لیے سفارش کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی دولت کو جس طرح اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے اسی طرح اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنے اثر و رسوخ میں اضافے کے لیے بھی بروئے کار لاتا ہے۔ یہاں ترغیب اس طرح دی جا رہی ہے کہ تم اپنی دولت کو اگر اللہ کے راستے میں صرف کرو تو جس دولت کو تم دنیا کی افزائش اور اثر و رسوخ پیدا کرنے کے کام میں لا رہے ہو وہی دولت تمہیں اللہ کے قریب کرسکتی ہے' اسی سے تم جنت خرید سکتے ہو۔ اسی کے خرچ کرنے سے تمہاری نیکیوں میں اضافہ ہوسکتا ہے اور تم اپنی آخرت کو سنوار سکتے ہو اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو پھر ترہیب سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ اس بات کو یاد رکھو کہ تمہیں ایک دن موت آئے گی' اس کے بعد تمہاری دنیوی زندگی ختم ہوجائے گی' تم برزخی زندگی گزارنے کے بعد اخروی زندگی میں داخل ہوجاؤ گے اور یہ اخروی زندگی وہ ہوگی جس میں نہ تو تم اپنی دولت سے کوئی چیز خرید سکو گے اور نہ تم کوئی چیز بیچ سکو گے۔ نہ وہاں کسی کی دوستی تمہارے کام آئے گی' نہ کسی کی سفارش تمہیں نفع پہنچا سکے گی۔ وہاں تو زندگی میں کی ہوئی نیکیاں اور اللہ کے راستے میں ایثار اور انفاق کا سرمایہ تمہارے کام آئے گا۔ تو آج اس کا موقع ہے کہ تم موت آنے سے پہلے پہلے اپنی دولت کو اللہ کی راستے میں صرف کرکے اس دن اپنی سرخروئی کا سامان کرلو جس دن سوائے ایمان و عمل کے کوئی چیز کام آنے والی نہیں۔

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یہاں کافرون سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان و عمل اور ایثار و انفاق کی بجائے چند غلط عقائد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ انہوں نے چند عقیدے وضع کرلیے ہیں جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ جس طرح دنیا میں ہم نے اپنی دولت سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے لیے خرید لیا اور جسے چاہا بیچ دیا' اسی سے ہم نے بڑے بڑے لوگوں سے دوستیاں پیدا کیں' قیامت کے دن بھی یہی دولت ہمارے کام آئے گی۔ اور جن کے نام پر ہم چڑھاوے چڑھاتے رہے ہیں اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ کل کو ہماری سفارش کریں گے جس طرح مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کے بارے میں یقین رکھتے تھے کہ وہ اپنے باپ سے سفارش کرکے ہمیں عذاب سے بچالیں گی۔ جس طرح اہلِ کتاب نے بھی مختلف تصورات بنا رکھے تھے اور انہی تصورات میں سے بالخصوص شفاعت کے غلط تصور نے انہیں ایمان و عمل سے بالکل محروم کردیا تھا۔ انہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ حقیقت میں ظالم ہیں کہ اللہ نے ان کو جسمانی صلاحیتیں' دماغی رعنائیاں اور قلب کا سوز و گداز اس لیے عطا فرمایا تھا کہ وہ اپنے لیے آخرت کو آسان کریں اور ایمان و عمل کا سرمایہ بہم پہنچا کر اللہ کی رضا حاصل کریں۔ لیکن انہوں نے ہر چیز پر ظلم کیا۔ ظلم کا معنی ہوتا ہے وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ (کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کی اصل جگہ نہیں) سر اللہ کے سامنے جھکنا چاہیے اسے غیر اللہ کے سامنے جھکانا' جسم و جان کی صلاحیتیں اللہ کے دین کی سربلندی اور خلق خدا کی خدمت پر صرف ہونی چاہئیں انہیں اپنی ذات کی سربلندی اور غیر خدا کی عبادت اور مقاصدِ شر کو پھیلانے کے لیے استعمال کرنا۔ یعنی ہر حقیقت کی ماہیت کو بدل دینا۔ یہی وہ ظلم ہے جسے انہوں نے اپنی پوری زندگی کے ساتھ روا رکھا۔ اسی ظلم نے انہیں غیر اللہ کے سامنے جھکایا۔ دنیا کی محبت میں غرق کیا' ایمان و عمل پر بھروسہ کرنے کی بجائے شفاعت کے غلط تصور پر بھروسہ کرکے بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کی پوری زندگی محرومیوں کی تصویر بن گئی۔ انہی تصورات سے تقریب پیدا ہوئی کہ ایسے لوگوں کے سامنے نہایت خوبصورت اور موثر الفاظ میں اللہ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق کا ایک ایسا جامع تصور آنا چاہیے جو ان

Marfat.com

کی پوری زندگی میں تبدیلی کا باعث بنے' چنانچہ اسی تقریب سے آیۃ الکرسی جیسی خوبصورت آیت وجود میں آئی۔ جس کی بلاغتوں کی کوئی انتہا نہیں اور جس کے الفاظ و مفاہیم کو سمجھنے سے بڑے بڑے دانشور عاجز ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اعظم آیة فی القرآن ایة الکرسی (قرآن کی سب سے عظیم الشان آیت آیۃ الکرسی ہے)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـــوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

(اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے، حاوی ہے اس کا اقتدار آسمانوں پر اور زمین پر، اور نہیں تھکاتی ہے اسے ان دونوں کی حفاظت، اور وہ بلند ہے اور عظیم ہے) (۲۵۵)

سب سے پہلی بات جو اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ اللہ کا تعارف اور اس کی اصل حیثیت کی وضاحت ہے۔ مشرکین عرب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود اللہ کو تسلیم کرتے تھے اور اہل کتاب تو اللہ اور اس کے رسولوں پر بھی ایمان رکھتے تھے اس لیے اللہ کا اقرار اور اس کا ایمان دنیا کی ایک مسلمہ بات تھی۔ البتہ گمراہی کی ابتدا اس بات سے ہوتی تھی کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ ہے یا نہیں؟ یہود نے اللہ کو اِلٰہ قرار دینے کے باوجود شرک کی مختلف صورتیں پیدا کر رکھی تھیں اور نصاریٰ نے تو اس قدر غلو سے کام لیا کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو اللہ بنا ڈالا۔ یہ اگرچہ تمام نصاریٰ کا عقیدہ نہ تھا البتہ ان میں ایک قابل ذکر تعداد لوگوں کی ایسی موجود تھی جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (تحقیق ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا مسیح ابن مریم اللہ ہے) لیکن مشرکین عرب اللہ کو ایک ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی الوہیت میں نہ جانے کس کس کو شریک بناتے تھے۔ قرآن کریم نے مختلف جگہوں میں الوہیت کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ اور سورہ الفاتحہ کی پہلی آیت کی وضاحت کے سلسلے میں ہم اس پر معروضات پیش کر چکے ہیں۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اِلٰہ' معبود کو بھی کہتے ہیں اور حاکم حقیقی کو بھی۔ اور وہ ذات بھی اِلٰہ ہے جس کی محبت عبودیت کا عنوان بن جائے۔ اور وہ بھی اِلٰہ ہے جسے حضور و غیاب میں پکارا جائے اور استمداد کی جائے۔ لیکن قرآن کریم نے ان تمام حوالوں سے صرف اللہ ہی کو اِلٰہ قرار دیا کہ ''وہی تمہارا معبود ہے' وہی تمہارا حاکم حقیقی ہے' وہی ہے جس کی محبت سے دل آباد رہنا چاہیے' وہی ہے جس کا خوف اور جس کی ناراضگی کا اندیشہ زندگی میں سب سے موثر عامل ہونا چاہیے' وہی ہے جس کے سامنے دست سوال پھیلانا چاہیے اور وہی ہے جس سے تنہائیوں میں عجز و نیاز کی مناجات ہونا چاہیے۔ مولانا حالی نے بڑی خوبصورتی سے بعض احادیث کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے۔

Marfat.com

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

بنائے نزاع یہ بنیادی حقیقت ہے کہ دنیا میں تمام عظمتوں کا حقیقی مالک کون ہے؟ کون ہے جس کے سامنے سر بھی جھکنے چاہئیں اور اسی کی غیر مشروط اطاعت بھی ہونی چاہئے؟ اسی کو غیر مشروط طور پر آئین اور قانون دینے کا حق ہے؟ وہی ہے جس کی عظمت تمام عظمتوں کا آستانہ ہے۔ اسی پر دنیا ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتی رہی۔ جو لوگ یہ تمام حقوق اللہ کے لیے سمجھتے ہیں ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ کسی بادشاہ' کسی آمر مطلق کے سامنے سر جھکا دیں۔ وہ کسی پارلیمنٹ کے بارہ میں بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا دیا ہوا آئین و قانون اس صورت میں بھی واجب الاطاعت ہے جبکہ وہ اللہ کے آئین کے توڑ پر تیار کیا گیا ہو۔ اللہ ہی کی الوہیت کا یہ لازمی نقطہ ہے کہ حکم صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔ اسی کی بات حرف آخر ہوتی ہے' وہی ہے جس کی کسی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہر اس حاکم کی حکومت قابلِ تسلیم ہو گی اور اس پارلیمنٹ کے فیصلے احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت کو اولین حیثیت دی گئی ہو' جن کی تمام تر قانون سازی صرف اس دائرے میں ہو جہاں اللہ کی شریعت خاموش ہو اور جن کی سوچ کے تمام دھارے اسلامی شریعت کی سوچ سے ہم آہنگ ہوں۔ جب کوئی شخص' کوئی پارلیمنٹ اللہ کی عظمت کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت منوانے لگتی ہے یا اس کے آئین کو بائی پاس کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہیں سے اللہ کے ماننے والوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں یا کم از کم اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

Marfat.com

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

اس کے بعد اس آیتِ کریمہ میں اللہ کی چند بنیادی صفات کو ذکر فرمایا گیا ہے جن میں اللہ کا تعارف بھی ہے اور اس بات کی دلیل بھی کہ اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلی صفت جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ وہ ہے جو اَلْحَیُّ ہے یعنی وہ ازل سے ابد تک زندہ ہے۔ جسے کبھی موت نہیں آسکتی۔ کیونکہ موت کا خالق بھی وہی ہے۔ موت آنا مخلوق کی صفت ہے۔ اللہ مخلوق نہیں خالق ہے۔ اور دوسری صفت بیان فرمائی کہ وہ قیوم ہے قیوم اس ذات کو کہتے ہیں جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ و ذریعہ ہو اسے اپنے قیام کے لیے کسی کی احتیاج نہ ہو اور دوسری کائنات کی ہر شے اپنی زندگی اور بقا کے لیے اس کی محتاج ہو۔ جسے وہ وجود دے وہ وجود پائے، جسے وہ ختم کر دے وہ ختم ہو جائے۔ جس کے وجود پانے کے بعد اگر اس کے زندہ رہنے کے امکانات وہ مہیا نہ کرے تو وہ موت کی شکار ہو جائے۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آسکتی ہو اور پھر وجود میں آنے کے بعد اللہ کے دیے ہوئے امکانات کو نظر انداز کر کے باقی اور قائم رہ سکتی ہو۔ یہ دو بنیادی صفات اللہ کی الوہیت کے لیے دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ایک طرح کا چیلنج بھی ہیں کہ دنیا بھر کے مشرکوں نے جن قوتوں کو اللہ کی الوہیت میں شریک کر رکھا ہے وہ بتائیں کہ ان میں کون ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور کون ایسا ہے جس کی زندگی اپنے بل پر قائم ہے۔ اور ایسا کون ہے کہ پوری کائنات اس کی وجہ سے وجود میں آئی ہو اور اس کی وجہ سے قائم اور باقی ہو۔ دنیا بھر کے مشرکین اس چیلنج کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اور جب یہ اعتراف موجود ہے کہ واقعی ایسی کوئی اور ذات نہیں تو پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اللہ کی الوہیت میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے۔

سِنَۃٌ ...... نَوْمٌ

ان دو مثبت صفات کے بعد کچھ ایسی سلبی صفات یا نقائص بیان کئے جا رہے ہیں جن سے اللہ پاک اور منزہ ہے۔ جو متذکرہ بالا صفات کے بالکل برعکس ہیں۔ ان میں سے دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک کو سِنَۃ کہا گیا ہے اور دوسری کو نوم کا نام دیا گیا ہے۔ سِنَۃ اونگھ کو کہتے ہیں اور نوم کے معنی نیند کے ہیں۔ نیند کا آغاز اونگھ سے ہوتا ہے اور اس کی انتہاء نوم کہلاتی ہے۔ یہ دونوں غفلت کی دو صورتیں ہیں۔ ان دونوں کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے منزہ ہے۔ وہ چونکہ اپنی ذات میں حی اور قیوم ہے تو جو ذات حی اور قیوم ہو اور جس کی وجہ سے تمام دنیا زندہ اور قائم ہو اسے اونگھ یا نیند کیسے آسکتی ہے۔ وہ کسی طرح کی غفلت کا کیسے شکار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اونگھ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کی زندگی جس سے وابستہ ہے وہ سرچشمہ خاموش ہو گیا۔ اور اس کے سو جانے کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا اپنی حفاظت سے محروم ہو گئی۔ دنیا میں حشرات الارض سے لے کر بڑے سے بڑے سیارے تک اور معمولی مخلوق سے لے کر حضرت جبریل امین تک اپنی زندگی اور بقا کی بھیک اللہ سے مانگنے پر مجبور ہیں۔ اور ان کی زندگی اس وقت تک باقی ہے جب تک اللہ کی حفاظت میسر ہے۔ تو اگر اسے اونگھ آجائے یا وہ سو جائے تو اندازہ لگایئے کہ کائنات کی ایک ایک مخلوق کی زندگی کی حفاظت کون کرے گا؟ ہوائی جہاز کا اڑانے والا پائلٹ اور ٹرین یا گاڑی چلانے والا ڈرائیور اگر اونگھ جائے تو سینکڑوں انسانوں کی جان خطرے میں آجاتی ہے۔ کیونکہ جہاز اور گاڑی کے مسافر اس ڈرائیور کی حفاظت میں ہیں تو یہ کائنات کی گاڑی صرف اللہ کی حفاظت میں محفوظ اور اللہ کے حکم سے رواں دواں ہے۔ اسی

Marfat.com

گاڑی کی حفاظت کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف ایک ہی کے قبضے میں اور ایک ہی کی دسترس میں ہے۔ اسے اگر اونگھ آجائے یا نیند آ جائے تو اس کائنات کی تباہی اور بربادی میں کوئی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کائنات نہ جانے کب سے اپنے سفر پر رواں ہے۔ اس کا ایک ایک کرہ اپنے محور میں محو گردش ہے۔ ہر کرہ کی حرکت' اس کی رفتار' اس کی منزلیں' اس کا راستہ اربوں سال گزرنے پر بھی کسی تغیر کا شکار نہیں ہوا' آسمان کی وسعتوں میں بے شمار سیارے ثوابت اور ستارے ہر طرح کے خلل سے محفوظ ہیں۔ ان کی حفاظت اور ان کا ہر خلل سے محفوظ رہنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا الٰہ ایک ہے' وہ حی و قیوم ہے اور اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) وہ ذات کبریا اور خالق ارض و سما' جس کا حکم ساری کائنات پر جاری و ساری ہے اور جس کی حفاظت اور نگرانی کی وجہ سے تمام کائنات زندگی کے مزے لوٹ رہی ہے اور بے دریغ اپنے معمولات انجام دے رہی ہے' اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے اور اس صورتِ حال کا منطقی تقاضا بھی ہے کہ کائنات کی ایک ایک مخلوق اسی کی مملوک ہو۔ وہی سب کا مالک' سب کا آقا' سب کا حکمران' سب کا ملجا و ماویٰ' سب کا محبوب' سب کا مطلوب اور مرجع و منزل ٹھہرے اور اس عظیم و جلیل ذات کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہو۔ اس کا فیصلہ قطعی و آخری اور اس کا حکم اٹل اور حرف آخر ہو۔ ان حقائق کو تسلیم کرنے سے بالبداہت دو اور دو چار کی طرح ایک اور حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس ذات عظیم کی شان اور مرتبہ یہ ہے کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے اس کا فیصلہ تبدیل کرانے کی جسارت کرے۔ اور لوگ اپنی حماقت سے اس بات کی امید رکھیں کہ جنہیں ہم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے وہ اگر چاہیں گے تو اللہ سے اپنی بات منوا کر ہمارے حق میں فیصلہ کروا دیں گے۔ اس لیے فرمایا

شفاعت کی وضاحت

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے) کیونکہ کائنات کی ایک ایک مخلوق اس کی مملوک و محکوم ہے۔ اور اس کے ہر حکم کو ماننے کی پابند ہے۔ وہ سب کا مطاع مطلق ہے۔ ایسی صورت میں کسی کی کیا مجال ہو سکتی ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لیے زبان کھولنے کی جرأت کرے۔ اس سے منطقی انداز میں یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلے میں کسی کی مرضی نہیں چل سکتی۔ اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اگر وہ حوصلہ نہ دے تو کسی کی یہ مجال بھی نہیں کہ اس کا سامنا کر سکے۔ لیکن یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اس اصول سے استثناء کرتے ہوئے الا باذنہ فرمایا۔ یعنی اس کی عظمت اور کبریائی کو دیکھتے ہوئے تو کسی کے لیے شفاعت کی کوئی گنجائش نہیں' لیکن اگر وہ خود چاہے تو کسی کو اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ شفاعت کے جس تصور نے قوموں کو تباہ کیا ہے وہ یہی من مرضی کا تصور ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے اور آج بھی کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ زندگی عطا فرمایا ہے اگر کوئی شخص یا کوئی قوم اس کی مخالفت میں زندگی گزارتی ہے' اسے ماننے سے انکار کرتی ہے یا مانتی ہے لیکن عمل کے لیے تیار نہیں اور اپنی خواہشات کے اتباع میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر پر مصر ہے۔ جب انہیں ان کی اس معصیت اور نافرمانی پر توجہ دلائی جاتی ہے تو ان کے نزدیک شفاعت کا غلط تصور ایک سہارا بن جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقابلے میں جن شریکوں کو پوجتے' ان کے نام کی دہائی دیتے' ان کیلئے چڑھاوے چڑھاتے اور ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ مظاہر قدرت

Marfat.com

ہوں یا مظاہرِ فطرت' اجرامِ فلکی ہوں یا اجسامِ ارضی' پتھر کے تراشیدہ ہوئے بت ہوں یا نام نہاد احبار و رہبان' ان کے بھروسے پر وہ ہر برائی کر گزرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس خطرناک تصور نے انہیں حسن عمل سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی ایسی ہی شفاعت کے غلط تصور پر اعتماد کر کے زندگی گزار رہی ہے۔ جو آدمی کسی کا دامن گرفتہ ہے وہ اسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی شفیع سمجھ رکھا ہے کہ وہ اللہ کے بڑے سے بڑے نافرمان کو بھی اصرار کر کے چھڑا لیں گے۔ ایسے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ جس ایمان و عمل کی دعوت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی کھپائی اور زندگی کا ہر دکھ اٹھایا اور جس طرزِ زندگی اور ضابطۂ حیات کو اپنانے پر ہمیشہ زور دیا اور اسی پر آخرت کی نجات کا دارومدار رکھا' کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کی کاوشوں کو درخورِ اعتنا سمجھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اللہ کے ایک ایک حکم کو توڑتا رہا' جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لامتناہی قربانیاں دی تھیں اور آپ کی ایک ایک سنت کو پامال کرتا رہا اور پھر آپ ہی سے امید رکھتا ہے کہ آپ میری شفاعت فرمائیں گے۔ آپؐ نے ایک موقعہ پر اپنے اعزہ و اقرباء کو سمجھاتے ہوئے اپنی پھوپھی محترمہ اور اپنی لختِ جگر کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ ''تم ایمان و عمل کا سرمایہ لے کر ساتھ جانا اور اگر تم نے نافرمانی کی زندگی گزاری تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' لیکن اس غلط تصور کے مقابل قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح تصور بھی عطا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض مقرب بندوں کو شفاعت کی عزت بخشیں گے' جن میں انبیاءِ کرام بھی ہوں گے اور اولیاء کرام بھی اور صالحین عظام بھی۔ لیکن یہ صرف اس شخص کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت عطا فرمائے گا۔ کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مشرکین عرب جیسے پہلے عرض کیا جا چکا کہ وہ فرشتوں سے شفاعت کی امید رکھتے تھے اور انہیں اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے' پروردگار نے اس حوالے سے فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کی اولاد ہے اللہ ان چیزوں سے پاک اور برتر ہے فرشتے خدا کی اولاد نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں وہ اس کے آگے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں) مزید اس کی وضاحت فرماتے ہوئے قرآنِ کریم کہتا ہے یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا (اور اس دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو شفاعت کی اجازت تو دے گا لیکن وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے وہی بات زبان سے نکالیں گے جو بالکل حق ہو گی۔ اور اسی کے لیے شفاعت فرمائیں گے جس کے لیے اللہ اجازت عطا فرمائیں گے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی ایمان و عمل سے بے نیاز ہو کر چند بزرگ شخصیتوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل چیز تو اللہ کی رضا ہے جو ایمان و عمل سے نصیب ہو گی جس آدمی نے اپنے اعمال صالحہ اور اپنی دعاؤں سے اپنے رب کو راضی کر لیا اس کے اعمال میں بخشش کے لیے اگر کوئی کمی ہو گی تو پروردگار اپنے کسی برگزیدہ بندے کو اجازت عطا فرمائے گا کہ میرے اس بندے کے لیے سفارش کرو۔ اس سے مقصود اپنے برگزیدہ بندوں کی عزت افزائی ہو گی اور اپنے گناہ گار بندے کی بخشش کا سامان ہو گا۔ شفاعت کے اس تصور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت بھی صرف اللہ کی مرضی اور اس کے حکم سے میسر آئے گی۔ اس لیے ایک مومن کو اپنی بخشش کے لیے اللہ کی رضا کا سامان کرنا چاہیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل اور آپؐ پر کثرت سے درود پڑھنا چاہیے تاکہ آپؐ اللہ کی اجازت سے اپنے گناہ گار امتیوں کی سفارش فرمائیں۔

Marfat.com

شفاعتِ کبریٰ

شفاعت کے حوالے سے سب سے بڑا مقام شفاعتِ کبریٰ ہے۔ محشر میں جب تمام لوگ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کے اعتبار سے پسینے میں ڈوبا ہوا ہو گا' انتہائی ہولناک وقت' سراسیمگی اور بے چینی کی کیفیت اپنے عروج پر ہو گی اور ایک نفسانفسی کا عالم ہو گا' لوگ اپنے انجام کو جاننے کے لیے بے قرار ہوں گے' لیکن حساب کتاب شروع ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ہوں گے' لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اولوالعزم رسولوں کے پاس جائیں گے کہ آپ اللہ سے دعا کریں تاکہ حساب کتاب شروع ہو اور ہم اس ناقابلِ برداشت انتظار کی اذیت سے نکل سکیں۔ لیکن کوئی بڑے سے بڑا رسول بھی اس کے لیے تیار نہ ہو گا۔ سب اللہ کے جلال سے پناہ مانگتے ہوں گے' آخر میں لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں گے۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں لوگوں کی درخواست مان کر سر سجدے میں رکھ دوں گا اور اللہ کو ان صفات اور کلمات سے پکاروں گا جو اس وقت مجھے عطا کیے جائیں گے۔ میں نہیں جانتا کب تک میں سجدہ ریز رہوں گا' پھر اللہ کی طرف سے آواز آئے گی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنا سر سجدے سے اٹھا لو جو مانگو گے دیا جائے گا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام امتوں کا حساب کتاب کرنے کے لیے اللہ سے درخواست کریں گے۔ اس طرح سے لوگوں کا حساب شروع ہو گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے لوگ انتظار کی اذیت سے نجات پائیں گے۔ غور فرمائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لیے پہلے پروردگار سے شفاعت کی اجازت مانگیں گے۔ اجازت ملے گی تو پھر آپؐ شفاعت فرمائیں گے۔ ایک امتی کو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ ور ہونے کے لیے دعائیں مانگنی چاہئیں لیکن اعمال حسنہ سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔

مشرکین نے جس طرح شفاعت کا ایک تصور بنا رکھا تھا اس کے ابطال کے لیے ایک ایسی دلیل دی جا رہی ہے جو نہایت سادہ ہے لیکن براہِ راست عقل کو اپیل کرتی اور دل میں جا اترتی ہے۔ وہ آیت کا اگلا جملہ ہے۔

شفاعت کا غلط تصور اور اس کی تردید

يَعْلَمُ مَابَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے) اسے سمجھنے کے لیے نہایت سادہ انداز میں لوگوں کے ذہنوں میں شفاعت اور سفارش کا جو تصور ہے وہ سمجھ لیجیے۔ کوئی آدمی یا کوئی ملازم کسی خلاف قانون حرکت پہ پکڑا جاتا ہے یا اس کے خلاف کسی رپورٹ پر اس کی گرفت ہوتی ہے تو وہ سفارشی تلاش کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ سفارشی ایسا ہونا چاہیے کہ جس افسر کے پاس میرا کیس ہے اس پر وہ اثر رکھتا ہو۔ اولاً تو سفارشی کی حیثیت اس افسر سے بڑی ہوتا کہ وہ اس کی سفارش کو رد نہ کر سکے اور یا پھر اس سے ایسی دوستی ہو کہ وہ اسے ناراض نہ کر سکتا ہو اور یا پھر سفارشی کی ایسی حیثیت ہو کہ افسر کو بھی اس سے کام پڑ سکتے ہوں تو وہ اس کی بات مان لینے پر اس لیے مجبور ہو گا کہ آج میں نے اگر اس کا کام نہ کیا تو کل کو یہ میرا کام بھی نہیں کرے گا۔ اور آخری بات یہ کہ سفارشی اس افسر کے پاس جا کر یہ یقین دلائے کہ جس شخص کو سزا دی جا رہی ہے اسے آپ نہیں جانتے اور میں اسے پوری طرح جانتا ہوں۔ آپ کے علم میں جو باتیں لائی گئی ہیں وہ غلط ہیں اور میں آپ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں کیونکہ آپ کے پاس براہِ راست جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جہاں تک پہلی باتوں کا تعلق ہے

Marfat.com

وہ تو بالبداہت غلط ہیں۔ کوئی شخص بھی اللہ کی ذات سے بڑھ کر نہیں۔ کسی کی اس سے ایسی دوستی نہیں کہ وہ اس کی ناراضگی سے ڈر جائے' اسے کسی سے کوئی کام نہیں پڑتا تمام مخلوق اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور جہاں تک آخری بات کا تعلق ہے اس کے بارے میں اس جملے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ سفارش کرنے والا اللہ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر آدمی کے مالہ وما علیہ سے واقف ہے۔ جو کچھ سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو پیچھے ہے وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ یعنی اس کے لیے زمانے کی کوئی تقسیم نہیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ظاہر و باطن کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے کوئی سفارش کرنے والا اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اس کیس کو پوری طرح نہیں جانتے میں جانتا ہوں اس لیے میں اس کی وضاحت کرنے آیا ہوں۔ ہر شخص کا علم ناقص اور محدود ہے۔ وہ ظاہر کو جانتا ہے باطن سے بے خبر ہے۔ وہ جس کی سفارش کر رہا ہے وہ اگر کوئی بات اس سے چھپالے یا اسے غلط بتائے تو اس کے پاس صحیح جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں' لیکن اللہ کا علم کامل' حدود سے ماوراء' ہر طرح کی غلطی اور نقص سے پاک۔ تو پھر کس بنیاد پر آخر اس سے سفارش کی جائے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو اس کی اجازت دیں گے۔ اور ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہمارے لیے بہت بڑے حوصلے کا سامان ہے۔ اور وہ شفاعت برحق ہے۔ لیکن وہ سراسر اللہ کی دین' اس کا عطیہ' اس کی عزت افزائی اور اس کا کرم ہے۔ اس لیے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کے لیے بھی اسی سے دعائیں کرنی ہے' اسی پر ہمیشہ بھروسہ رکھنا ہے' کسی دوسرے بھروسے پر ایمان و عمل سے غفلت سے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مزید ارشاد فرمایا:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ (اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے۔ اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں)

کرسی کا مفہوم

''الکرسی'' اس کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔ علامہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول ترجیح کے لائق سمجھا ہے کہ ''کرسی'' سے مراد اس کا علم ہے۔ اور ابن جریر نے یہ بھی فرمایا کہ اسی سے کراسة ماخوذ ہے جس کے معنی اس دفتر کے ہیں جس میں علم منضبط کیا جاتا ہے اور عربی میں علماء کو ''کراسی'' بھی کہا جاتا ہے۔

لغت میں ''کرس'' کسی چیز کی جمی جمائی تہہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا۔ اس لیے کرسی بیٹھنے کی جگہ یا تخت وغیرہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور جب یہ بیٹھنے کی جگہ صاحب اقتدار کے لیے خاص ہو تو وہ اس کے اقتدار کا مرکز ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اہل علم نے کرسی کا لفظ اقتدار کی تعبیر کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس جملے میں بھی یہی معنی ہوگا کہ اللہ کی کرسی سے مراد اس کا اقتدار ہے۔ البتہ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ یہاں تو یقیناً کرسی کا معنی اس کا اقتدار ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کی جلیل القدر مخلوقات میں سے کرسی بھی اس کی مخلوق ہے۔ جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یا ابا ذر ما السموات السبع مع الکرسی الا کحلقة ملقاة فی ارض فلاة (کرسی کی وسعت و فراخی کے سامنے سات آسمان یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے ایک صحرا میں ایک مندری پڑی ہے) جس پروردگارِ عالم نے زمین و آسمان پیدا کیے ہیں اس کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ اتنی بڑی کرسی کو پیدا کردے۔

Marfat.com

البتہ یہ بات یادرہے کہ پروردگار اس کرسی پر فروکش نہیں ہوتا کیونکہ کوئی مقام بھی اللہ کی ذات کو اپنے اندر سما نہیں سکتا۔ مزید یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جسم سے پاک ہے اس لیے اسے کسی کرسی' کسی تخت یا کسی مکان کی احتیاج نہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ کرسی کیوں بنائی گئی تو اللہ کی صفات کی طرح اس کی بعض مخلوقات کی حقیقت کو بھی ہم نہیں جانتے۔ ہم تو آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ سر کے بال کہاں سے آتے ہیں؟ ناخن کیسے لمبے ہوتے ہیں؟ بیلیں کیسے پھیلتی ہیں؟ مختلف توجیہات کی جاتی ہیں لیکن حقیقت ہم سے کوسوں دور ہے۔ فرشتے غیر مرئی مخلوق ہیں' ہم اللہ کے نبیوں کے بتانے کی وجہ سے ان پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ کیسے ہیں؟ ہم ان کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ اسی طرح کرسی بھی ان مخلوقات میں سے ہے جس کا علم ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا ہے لیکن اس کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں اور اس کی حقیقت جاننے کے درپے ہونا بجائے خود ایک گمراہی ہے جس سے روکا گیا ہے۔

اقتدارِ الٰہی کی ہمہ گیری

مشرکینِ عرب کا یہ گمان تھا کہ کائنات کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنے ملک کے دور دراز گوشوں کا انتظام خود نہیں کر سکتا' اس کے لیے وہ مختلف عہدیدار مقرر کرتا ہے تاکہ ان دور دراز گوشوں کا انتظام درست رکھا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تنہا اتنی بڑی کائنات کا انتظام چلا سکے۔ وہ یقیناً اس کا انتظام چلانے میں ایسی قوتوں کا محتاج ہے جنہیں وہ اپنا شریک بنا سکے تاکہ اس کائنات کے نظام چلانے میں وہ اس کے ممد و معاون ہوں۔ ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے۔ اور وہ زمین و آسمان کے نظام کو چلانے میں اور اس کی نگرانی میں کوئی گرانی اور تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ یہود کی طرح یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں کائنات پیدا کی اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا' وما مسنا من لغوب (ہمیں تھکاوٹ نہیں ہوتی) اور یہاں فرمایا کہ ہمیں اس کائنات کی نگرانی گراں نہیں گزرتی۔ ہمارے لیے اس کا انتظام و انصرام چلانا بوجھ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیں کسی معاون کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ ہمارا علم غیر محدود' ہماری قدرت بے انتہا اور ہماری قوتِ تصرف تصور و خیال سے بالا ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (وہ بلند ہے اور عظیم ہے) اس کی قدرتوں کی وسعتوں اور اس کے علم کی لامحدودیت کو اپنے محدود علم اور عقل کے پیمانوں سے نہ ناپو۔ وہ تمہاری قوت احساس سے بھی بلند ہے اور تمہارے تصورِ ادراک سے بھی عظیم ہے۔ جب تک اس کی عظمتوں کا صحیح تصور اپنے اندر پیدا نہیں کرو گے اس وقت تک شرک کے کانٹے پھوٹتے رہیں گے۔ جب تک اس کی ذات کو ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بلند نہیں سمجھو گے اس وقت تک کوئی نہ کوئی شیطان تمہیں وسوسوں کی گمراہی میں مبتلا کرتا رہے گا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔ جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط رسی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے) (۲۵۶)

Marfat.com

دین کا مفہوم

یہاں دین سے مراد اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ عقیدہ ہے جو آیت الکرسی میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس عقیدہ کی بنیاد پر بننے والا وہ نظامِ زندگی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آیت الکرسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ سورہ فاتحہ کے درس میں ہم الٰہ کا مفہوم واضح کر چکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ الٰہ معبود کو کہتے ہیں' حاکم حقیقی کو کہتے ہیں' اس ذات کو کہتے ہیں جس کے ساتھ انسان اپنی تنہائی میں امیدیں باندھتا ہے اور ہر وقت جس کی ناراضگی سے لرزاں و ترساں رہتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ محبت کا مستحق ہے اور وہی نفرت کا حوالہ ہے۔ وہی ذات ہے جو غیر مشروط طور پر مطاعِ مطلق ہے' جس کے حکم پر نہ سوال کیا جا سکتا ہے نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے' کوئی اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرتا' اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ انسان کا ایک ایک لمحہ باقی کائنات کی طرح اس کے علم اور اس کی نگاہوں میں ہے۔ تمام مخلوقات کی حفاظت صرف وہی کرتا ہے' اس کی حفاظت اٹھ جائے تو کسی کے لیے کوئی جائے امان نہیں۔ یہ ان تصورات کا خاکہ ہے جو آیت الکرسی میں دیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح کائنات کی ایک ایک مخلوق اس کے تکوینی نظام اور تکوینی قانون کی پابند ہے' اسی طرح انسان چونکہ عقل و شعور اور فی الجملہ آزادی سے نوازا گیا ہے۔ وہ قانون تکوینی کے ساتھ ساتھ قانون تشریعی کا بھی پابند ہے۔ اللہ کو بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی زمین پر بسنے والے اور اس کی ربوبیت کے فیض سے پلنے والے اور اس کی عطا و بخشش کے سہارے جینے والے انسانوں کو قانون دے اور اپنی مرضی سے آگاہ کرے۔ ان پر اپنے احکام و قوانین پر مشتمل کتابیں اتارے اور اس کی تفہیم و وضاحت اور عملی طور پر اسے برپا کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ اور پھر انسانوں کو حکم دے کہ تمہیں اس راہنمائی کے مطابق زندگی گزارنی ہے' اسی پر تمہاری دنیوی اور اخروی فلاح کا دارومدار ہے۔ یہ وہ دین ہے جس کا نام اسلام ہے۔ جس کے بارے میں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی جبر' کوئی زور اور زبردستی نہیں۔

اِکْرَاہ فِی الدِّیْن کا مفہوم

مقصود اس سے یہ ہے کہ ہم نے انسان کو عقل' شعور اور تمیز دے کر ایک آزادی سے نوازا ہے کہ وہ چاہے تو اس دین کو اختیار کرے اور چاہے تو اسے اختیار کرنے سے انکار کر دے۔ ہم فطری طور پر انسان پر جبر نہیں کرتے یعنی انسان کو اس طرح ہم نے پیدا نہیں کیا کہ اس کے اندر یہ جبر رکھا جاتا کہ وہ ہمیشہ اسلام ہی پر چلنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پائے۔ جب بھی وہ سوچے اسلام کے مطابق سوچے اور جب بھی کوئی قدم اٹھائے تو اللہ کی اطاعت میں اٹھائے۔ فرشتوں کی طرح اس سے مختلف سوچ اور اس سے مختلف عمل پر قدرت ہی نہ رکھے۔ یہ وہ جبر فطری ہے جس سے اللہ نے انسان کی ہدایت و ضلالت میں کام نہیں لیا۔ اس میں ایک حقیقت کا اظہار بھی ہے اور ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی۔ حقیقت تو وہی ہے جسے ہم نے عرض کر دیا۔ یعنی انسان دین کی قبولیت اور عدم قبولیت میں آزاد چھوڑا گیا ہے۔ کسی طرح کا اس پر جبر نہیں کیا گیا۔ اور غلط فہمی یہ ہے کہ کبھی لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نبی اور اس کی کتابیں دنیا میں اس لیے نازل کی جاتی رہی ہیں تاکہ انسانوں میں اختلافات ختم ہو جائیں' ان کے سامنے ایک راہِ راست واضح کر دی جائے اور لوگ اس راہِ راست کو اختیار کر لیں' تمام غلط راستے اور الٹی سیدھی پگڈنڈیاں خود بخود ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انبیاء آتے رہے' کتابیں نازل ہوتی رہیں' لیکن انسانوں میں خیر و

Marfat.com

شر کا اختلاف کبھی ختم نہ ہوا تو پھر انبیاء کے آنے اور کتابوں کے نازل ہونے کا فائدہ کیا ہوا؟ اور کبھی کافر اسی غلط فہمی کو ایک بہانے کے طور پر بھی پیش کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم جو شرک کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے ہم تحریم و تحلیل کے فیصلے کرتے ہیں تم کہتے ہو یہ باتیں کفر اور شرک ہیں اور اللہ کو یہ باتیں پسند نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر اللہ ایسی باتوں سے زبردستی روک کیوں نہیں دیتا؟ ہم بھی یہی کر رہے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد بھی یہی کرتے تھے۔ لیکن اللہ نے نہ انہیں روکا نہ ہمیں روکا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس پر راضی ہے اور تم نے بلا وجہ ایک اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بات کو مختلف جگہ بیان کیا ہے ہم صرف ایک مقام کا حوالہ دیتے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآءُ نَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

(اور مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے' نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے۔ ایسا ہی سوال اٹھایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری بھی ہے؟ ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اٹھایا اس دعوت کے ساتھ کہ لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔ تو ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کچھ ایسے ہوئے جو گمراہی کے سزاوار ٹھہرے تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ اگر تم ان لوگوں کی ہدایت کے حریص ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دینے والا نہیں ہے جن کو گمراہی کا سزاوار ٹھہرا چکا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں) (النحل ۳۵ تا ۳۷)

ان آیاتِ کریمہ میں دیکھئے اللہ نے مشرکین کی طرف سے اس غلط فہمی یا بہانے کا ذکر فرمایا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ تھا کہ تمہاری ہدایت کے لیے رسول بھیجتے' چنانچہ ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی نبی یا رسول بھیجا اور انہوں نے آ کر پوری تندہی اور جانفشانی سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ بندگی کے لائق صرف اللہ ہے اس کے علاوہ تمام وہ قوتیں جو اپنی بندگی کرانے کی کوشش کرتی ہیں وہ سب غلط ہیں اس لیے صرف اللہ کی بندگی کرو اور باقی تمام آستانوں سے انکار کر دو۔ اس کے بعد ذمہ داری ان لوگوں کی شروع ہو جاتی ہے جن کی طرف یہ ہدایت بھیجی گئی۔ اب اسے قبول کرنا یا رد کر دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ اور اسی ذمہ داری کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ ان سے سلوک فرماتے ہیں۔ اس کے بعد پھر سوال اٹھایا ہے کہ تم ہی یہ بتاؤ کہ کیا اللہ کے رسولوں پر صاف صاف پہنچا دینے کے علاوہ بھی کوئی ذمہ داری ہے انہوں نے اپنا کام ہمت سے بڑھ کر کیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ نے ان پر جبر نہیں فرمایا کیونکہ یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہیں نیز اگر وہ جبراً لوگوں کو مسلمان بناتا یا جبراً لوگوں کو کافر بناتا تو پھر جزاء و سزا کا تصور عقل اور اخلاق کے اعتبار سے بگڑ جاتا نیکی کرنے

Marfat.com

والوں کے بارے میں کہا جاتا کہ انہوں نے مجبوراً نیکی کی ہے تو انہیں جزاء کس بات کی دی جا رہی ہے اور کس بات پر انہیں نوازا جا رہا ہے۔ اور برائی کرنے والوں کے بارے میں کہا جاتا کہ انہوں نے مجبوراً برائی کی ہے انہیں سزا کس بات کی دی جا رہی ہے اس لیے اس غلط فہمی یا بہانے کا کوئی جواز نہیں۔ یہی وہ بات ہے جو اس آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں' ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے اور پوری طرح اسے واضح کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ اب لوگوں کا یہ کام ہے کہ وہ اسے قبول کریں یا اسے رد کر دیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ قبول کرنے کی صورت میں وہ ایسی مضبوط رسی اور مضبوط زنجیر کو تھام لیں گے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔ یہی رشتہ انہیں دنیا میں ہر کجی اور گمراہی سے بچائے گا اور آخرت میں وہ اسی رسی کو تھامے ہوئے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس لوگوں نے زندگی گزارنے کے لیے جو سہارے بنا رکھے ہیں' جو رسیاں پکڑ رکھی ہیں وہ تو دنیا میں بھی کام دینے والی نہیں چہ جائیکہ آخرت میں کام دے سکیں۔ وہ تمام رسیاں راستے میں ٹوٹ جائیں گی اور تمام سہارے راستے ہی میں جواب دے جائیں گے۔

طاغوت کا مفہوم

ہر غلط سہارے اور اللہ کے سوا ہر آستانے اور ہر مرکزِ اطاعت سے انکار کرنے کا یہاں حکم دیا گیا ہے اور اسے طاغوت کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لیے فرمایا کہ جس نے طاغوت سے کفر کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک مضبوط رسی کو تھام لیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ طاغوت کیا ہے؟ طاغوت ملکوت اور جبروت کے وزن پر طغیٰ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے حد سے گزر جانا' حد سے آگے بڑھ جانا' اپنی حدود سے نکل جانا اور کناروں سے اچھل جانا۔ عربی میں "طغی الماء" کا معنی ہوتا ہے "پانی حد سے آگے بڑھ گیا" یعنی پانی میں طغیانی آ گئی' سیلاب آ گیا۔ اور یہ طغیانی اور سیلاب اس وقت آتا ہے جب پانی دریا کے کناروں سے نکل کر دور دور بہنے لگتا ہے۔ اس لیے طاغوت لغوی اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ لیکن اصطلاحی طور پر طاغوت سے مراد وہ شخص ہے جو بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے خود آقا اور خدا بن کے بیٹھ جائے۔ اور اللہ کے بندوں سے اپنی بندگی کرانے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور سرکشی کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ سمجھے اور اس بات پر ایمان رکھے کہ بندگی صرف اللہ کا حق ہے۔ لیکن عملی طور پر اللہ کے احکام کی نافرمانی کرے' کبھی اس کے حکم کو ماننے اور کبھی اس کے مطابق عمل کرنے سے گریز کرے۔ بلکہ اس کے برعکس عمل کرے۔ ایسے شخص کو فاسق کہا جاتا ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ سرے سے اس بات سے ہی منحرف ہو جائے کہ بندگی کرانا صرف اللہ کا حق ہے اور مجھے صرف اللہ کی بندگی کرنی چاہیے۔ بلکہ وہ خود مختار ہو جائے اور جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ اور اللہ کے قانون کو ماننے سے انکار کر دے اور یا اللہ کے مقابلے میں کسی اور کی بندگی کرنا شروع کر دے۔ اس رویے کو کفر کرتے ہیں اور ایسا کرنے والا کافر کہلاتا ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے احکام سے بغاوت ہی نہ کرے' بلکہ اس کے مقابلے میں خود خدا بن کر یا بندوں کا مالک بن کر بیٹھ جائے اور اللہ کے بندوں پر حکم چلانے لگے۔ یہ سرکشی اور گمراہی کا آخری درجہ اور مرتبہ ہے جو شخص اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے اسے طاغوت کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے سرکشی کے مختلف سرچشمے اور مراکز ہیں جن پر طاغوت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً ہر وہ شخص جو اپنی اطاعت کو اللہ کی طرح دوسرے پر لازم قرار دیتا ہے۔ وہ پارلیمنٹ جو اللہ کے قانون کے مقابلے میں قانون سازی کرتی ہے' وہ آمرِ مطلق یا وہ بادشاہ جو اللہ کے قانون کے توڑ پر اپنی خواہشات پر مبنی قانون کی پیروی کو لوگوں پر لازم قرار دیتا ہے' ہر وہ شیخ اور مرشد جو اپنی مرضی کو دین قرار دے کر لوگوں سے اس کی اطاعت کرواتا ہے اور اپنے سامنے لوگوں کو اس طرح

Marfat.com

جھکاتا ہے جیسے بندہ اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ ہر وہ برادری جو غیر شرعی فیصلے اپنے لوگوں پہ نافذ کرتی ہے اور جبراً لوگوں کو اس پر چلاتی ہے۔ اسی طرح آدمی کا وہ نفس جو سرکش ہو کر ایک مستقل مطاع بن جاتا ہے اور بندے کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک طاغوت ہے۔ اس طرح کے ہر طاغوت کا انکار اور ان کے طریقوں کو ماننے سے انکار ایمان کا لازمی جزو ہے جس طرح اللہ پر ایمان لانا اور اس پر یقین لانے کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے اسی طرح دنیا کے ہر آستانے سے سر اٹھالینا' ہر تخت و تاج کو ٹھکرا دینا اور ہر جابر اور ظالم کی بات کو ماننے سے انکار کر دینا بھی ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور طاغوت سے انکار کرتا ہے۔ اسے اللہ کی وہ رسی تھامنے کو ملتی ہے جس سے آدمی کی دنیا اور آخرت محفوظ ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمان سے زمین تک ایک رسی تنی ہوئی ہے جو آدمی اسے تھام لیتا ہے وہ دنیا میں بھی تباہی سے بچ جاتا ہے اور آخرت میں بھی سرخرو ہوگا اور جو اسے چھوڑ دے گا اس کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گی۔

ہماری متذکرہ بالا گذارشات سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ یہاں اکراہ سے مراد فطری جبر ہے جو اللہ تعالیٰ کسی پر نہیں فرماتے۔ نہ وہ کسی کو جبراً ایمان دیتے ہیں نہ وہ جبراً کسی کو گمراہ کرتے ہیں۔ اللہ کے نبیوں اور ان پر ایمان لانے والوں نے بھی اسی بنیادی اصول پر تبلیغ و دعوت کا کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اس بات پر صرف کر ڈالیں کہ کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے جس تک اللہ کے دین کی دعوت نہ پہنچے۔ بلکہ حتیٰ الامکان دعوت اس تکرار اور اہتمام سے پیش کی جائے اور اس کی تفہیم اور دل و دماغ میں اتارنے کے لیے عقلی دلائل سے کام لیا جائے' فطری دلائل واضح کیے جائیں اور وقتاً فوقتاً ایسے معجزات کا بھی ظہور ہو جس سے اس بات کا یقین آسان ہو جائے کہ واقعی اس دین کا داعی اللہ کا نبی اور رسول ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ اللہ کی طرف سے کہتا ہے اسی وجہ سے اس کے ہاتھ سے بعض دفعہ ایسے اعمال کا صدور ہوتا ہے جو انسانی استطاعت سے باہر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت اس کے ساتھ ہے۔ اور مزید یہ کہ اس کے سیرت و کردار کی پاکیزگی و بلندی کا حال یہ ہے کہ دشمن اپنی تمام تر دشمنی کے باوجود اس کے کردار میں کوئی کمزوری نہیں دکھا سکتے۔ بلکہ عموماً اس اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ پیغمبر کہتا ہے ہم اگرچہ اسے قبول نہیں کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو وہ اللہ پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔ اس طرح سے اللہ کے نبی لوگوں پر اپنی دعوت اور ہدایت کے اعتبار سے اتمام حجت کر دیتے ہیں اور ان کے ماننے والے بھی اسی راستے پر چلتے ہوئے دلائل و براہین اور اپنے حسن کردار کو دلیل بناتے ہیں جبر اور زبردستی کو نہیں۔ اللہ اگر انہیں اقتدار دیتا ہے تو وہ اقتدار کو اللہ کے احکام کی بالادستی اور مخلوق خدا کی خدمت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ لیکن اس اقتدار کے ذریعہ وہ کسی غیر مسلم کو مسلمان ہونے کے لیے مجبور نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے ''لا اکراہ فی الدین'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ یعنی ہم کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کریں گے۔ جو آدمی ایمان لائے گا سو اپنی مرضی سے لائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی حکومتیں قائم کیں اور بہت سارے ممالک فتح کیے انہوں نے غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دی۔ اور ان کی پوری طرح سے نہ صرف جان و مال کی حفاظت کی بلکہ ان کے مذہبی حقوق کو بھی نقصان نہ پہنچنے دیا اور ان کی عبادت گاہوں کو پورے احترام سے باقی رکھا۔ اگر وہ جبراً مسلمان بناتے تو اندلس میں کوئی عیسائی باقی نہ رہتا۔ اور ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں نہ ہوتے۔ اسی وجہ سے کبھی کسی اسلامی حکومت کے حوالے سے یہ شکایت پیدا نہ ہوئی کہ وہ غیر مسلموں کو جبراً مسلمان بنا رہے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک تکلیفیں اٹھا کر اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دی۔ اور مدینہ

Marfat.com

طیبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے سے پیشتر ہی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے مدینے کے دو بڑے قبیلوں کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی۔ اس لیے بعض برخود غلط قسم کے لوگوں کی جانب سے اسلام پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اس کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ

حیرت ہوتی ہے کہ علم و ہنر کی اس ترقی کے زمانے میں بعض کم سواد یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ لا اکراہ فی الدین کا مطلب یہ ہے کہ دین میں کوئی قانونی جبر نہیں۔ کیونکہ جبر سے مراد قانونی جبر ہے۔ یعنی جو شخص مسلمان ہو جاتا ہے اسے یہ آزادی ہے کہ وہ زندگی چاہے اسلام کے مطابق گزارے اور چاہے اسلام کے تقاضوں کے برعکس۔ اسے اسلامی حکومت جبراً اسلامی احکام کی پابندی کا حکم نہیں دے سکتی۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کو اسلام لانے کے بعد یہ آزادی میسر رہتی ہے تو پھر اس کے اسلام لانے کا فائدہ کیا ہوا؟ درحقیقت یہ لوگ مغرب کے اس تصور سے متاثر ہیں کہ مذہب انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔ یعنی اس کا تعلق ہر آدمی کی نجی زندگی سے ہے۔ جہاں تک اس کی پبلک لائف اور تہذیبی و تمدنی زندگی کا سوال ہے اس میں وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے زندگی گزارے۔ یہ جو اسلام میں سزاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے یہ سراسر مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی شخص نماز پڑھے نہ پڑھے' زکوۃ دے یا نہ دے' روزہ رکھے یا نہ رکھے' شرم و حیا کی زندگی گزارے یا بے حیا بن کر رہے' حقوق العباد ادا کرے یا حق تلفیاں کرتا پھرے' اسلامی حکومت کو ہرگز اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ ایسے شخص کو کسی بات پر مجبور کرے یا اس کے کسی جرم کی سزا دے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ باتیں بعض دفعہ بڑے بڑے دانشوروں کی جانب سے کہی جاتی ہیں۔ اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کو بھی مانتے ہیں۔ الجھن کی بات یہ ہے کہ اگر مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے تو پھر قرآن و سنت نے اسلام کا جو ایک نظام پیش کیا ہے اس کی کیا تعبیر کی جائے گی۔ اسلام میں حدود و تعزیرات کا ایک پورا نظام ہے۔ اس کے فرائض و واجبات ہیں جن کی ادائیگی مسلمانوں پر واجب کی گئی ہے۔ اسلام کا ایک عدالتی سسٹم ہے جس میں عدالت کو کچھ اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسلام میں ارتداد کی سزا رکھی گئی ہے' اسلام نے اہل ایمان پر جہاد بھی واجب کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے جس طرح حدود کا ذکر کیا ہے اسی طرح محاربہ پر بدترین سزاؤں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب باتیں مذہب کے پرائیویٹ معاملہ ہونے کی دلیل ہیں؟ ایک خاتون چوری کے جرم میں ماخوذ ہوتی ہے۔ آپؐ سے سفارش کی جاتی ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ آپؐ برہم ہو کر فرماتے ہیں کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی جیسے اس عورت نے کی ہے تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین تھے۔ باایں ہمہ شادی شدہ زانیوں کو سنگسار کروایا اور دیگر حدود بھی جاری فرمائیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کو پرائیویٹ معاملہ قرار دیتے ہیں اور سیکولرازم کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں انہیں اس بات پر کبھی غور کرنا چاہیئے کہ دنیا بھر کی حکومتیں تو اپنے قانون کی نافرمانی پر سزائیں دیتی ہیں حتیٰ کہ بعض جگہ پھانسی تک دی جاتی ہے لیکن آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اصلاً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لادینی حکومت کے قوانین کی جہاں نافرمانی ہوتی ہے اس کی تو سزا ملنی چاہیئے' البتہ اللہ سے بغاوت اور اس کے قوانین کی بے حرمتی اور نافرمانی پر کوئی سزا نہیں ہونی چاہیئے۔ یعنی آپ کے نزدیک بندوں کی عزت و حرمت اور ان کے قوانین کی بالادستی کی اہمیت تو ہے لیکن اللہ کے ذات اور اس کے قوانین کی حرمت کا آپ کو کوئی پاس نہیں۔ یہ تصور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اسلامی تصور نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۠

(اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اولیا طاغوت ہیں' وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں آگ والے۔ اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (۲۵۷)

ولی کا مفہوم

گزشتہ آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو آدمی طاغوت کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لیتا ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے انہی دونوں باتوں کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ ولی کا معنی ہے مددگار' کارساز' دوست' ساتھی اور حمایتی۔ جو شخص ایمان لاتا ہے اس کے تمام رشتے اللہ کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ وہ جب اپنی کسی ذہنی' نفسیاتی یا عملی مشکل پر اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ اسے سنتا ہے۔ اور وہ جیسے جیسے قدم قدم آگے بڑھتا ہے اللہ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک احساس کو جانتا ہے۔ وہ جہاں الجھنے لگتا ہے' وہ اس کی الجھنیں دور کرتا ہے۔ جہاں وہ ٹھٹھکنے لگتا ہے اللہ اسے حوصلہ دیتا ہے۔ جہاں وہ مخالفتوں کے ہجوم میں گھبرانے لگتا ہے' اللہ اسے سہارا دیتا ہے۔ جب وہ اپنی پریشانیوں میں اللہ کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو اللہ اسے مدد دیتا ہے۔ اس طرح کوئی ذہنی تاریکی' کوئی عقل کا اندھیرا' کسی مخالفت کے گہرے سائے اور حالات کا کوئی جبر اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی تمام تاریکیوں سے اسے نور کی طرف نکال کے لے آتا ہے۔ ظلمات ظلمت کی جمع ہے کیونکہ انسان کو بہکانے صحیح راستہ سے ہٹانے یا حق کے معاملے میں غیر مطمئن کرنے کے سو ذرائع ہیں اور بے شمار قوتیں ہیں جو اس کام پہ لگی ہوئی ہیں اور شیطان کی شیطنت کا ایک وسیع دائرہ ہے جو انسان کے دل و دماغ سے لے کر اس کے معاملات اور تعلقات تک الجھنیں پیدا کرتا اور تاریکیاں بکھیرتا ہے اس لیے اس کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔ لیکن نور کا لفظ واحد کی صورت میں لایا گیا ہے حالانکہ نور کی جمع انوار ہماری زبان میں بھی مروج ہے اور عربی میں شائع و ذائع ہے۔ ہم میں کئی لوگوں کے نام انوار ہوتے ہیں لیکن اس کے واحد لانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نور اللہ کی طرف سے عطا کی جانے والی ہدایت کا نام ہے۔ اور اللہ کی طرف سے اترنے والی اس روشنی کا نام ہے جو دل و دماغ کو جگمگا دیتی ہے۔ اس کا سرچشمہ چونکہ ایک ہے وہ اللہ کی ذات ہے اور اس کی نازل کردہ ہدایت بھی ایک ہے جو مختلف کتابوں کی شکل میں ہے لیکن اپنی معنویت اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک وحدت ہے۔ اس لیے پروردگار نے نور کا واحد لفظ استعمال فرمایا۔

ایک شخص کے سامنے جب اللہ کی ہدایت آتی ہے تو اسے آزادی میسر ہے چاہے وہ اسے قبول کرے اور چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر وہ اسے قبول کر کے ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہے۔ اب وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے اللہ اس کے راستے کھولتا جاتا ہے اور ہدایت کے امکانات پیدا کرتا جاتا ہے۔ وہ ہدایت اختیار کرتا ہے' اللہ اس کی ہدایت میں اضافہ

Marfat.com

فرماتا ہے۔اور اگر وہ مشکلات کی شدت کو محسوس کرتا ہے تو اللہ اس کے دل کو حوصلہ دیتا ہے۔جس طرح اصحاب کہف کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ چند لڑکے بالے تھے جن کی تعداد نو یا نو سے کم تھی۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے فِتْيَةٌ جمع قلت کا وزن استعمال کیا ہے جو نو یا اس سے کم کم پر بولا جاتا ہے۔ یہ چند لڑکے جب اپنے ملک کے مشرکانہ رویے کے خلاف توحید کے علمبردار بن کے اٹھے تو قانون' احتسابی ادارے' حکومتی سزائیں' معاشرتی جبر' سب انہیں اپنی گرفت میں لینے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ایسی صورتِ حال میں ان بچوں کا پریشان ہونا فطری بات تھی۔ اللہ فرماتا ہے کہ ''ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور ان کے دلوں کو ہم نے باندھ دیا'' یعنی حوصلہ دیا اور مضبوط کر دیا۔یہی مطلب ہے اللہ کے ولی ہونے کا کہ وہ ہر مرحلے پر اپنے بندے کی حمایت اور کارسازی فرماتا ہے۔

لیکن اگر ایک شخص کفر کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے لیے کفر کے راستے کھول دیتا ہے۔ وہ جیسے جیسے اس میں بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے شیطانی قوتیں اسے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتی ہیں۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ شیطان اور شیطانی ایجنٹ اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ شیطان کا اصل کام ہر شخص کو بہکانا اور گمراہ کرنا ہے۔جو شخص ایمان لا کر اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا ہے تو وہ ایک ایسے حصار میں آ جاتا ہے جس میں شیطان کی دخل اندازی ممکن نہیں ہوتی اور اللہ کی مدد شیطان کے حملوں سے اس کو محفوظ رکھتی ہے۔لیکن جب ایک شخص اللہ کو ماننے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے تو اب شیطانی قوتوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔وہ اس کو بہکاتے بہکاتے وہاں تک لے جاتی ہیں جہاں پلٹنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔وہ بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ یہ اوباشوں کا گروہ جنہیں وہ اپنے احباب سمجھتا ہے میرا مددگار ہے' یہ میرے ہمدرد اور حمایتی ہیں۔یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں قرآنِ کریم نے فرمایا: وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں وہ ہر وقت اس کا ساتھی بنا رہتا ہے۔'' چنانچہ یہی شیطانی تسلط اس وقت تک اس کے ساتھ رہتا ہے جب تک وہ کسی دلدل میں گر کر تباہ و برباد نہیں ہو جاتا۔ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ''یہ لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

یاد رہے کہ پیش نظر آیتِ کریمہ میں جو طاغوت کا لفظ آیا ہے یہ طواغیت کے معنی میں ہے یعنی جو لوگ کفر کرتے ہیں ان کے اولیاء اور ان کے حمایتی ایک طاغوت نہیں بہت سارے طاغوت ہوتے ہیں۔سب سے بڑا طاغوت تو شیطان ہوتا ہے جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے اور دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے کہ جو اللہ کا راستہ چھوڑ کر کفر کا راستہ اختیار کرنے کے بعد خود ایک مستقل طاغوت بن جاتا ہے اور پھر وہ صاحبِ نفس کو اپنے اشاروں پر چلاتا ہے' اسے ہر وقت نفس امارہ بن کر برائی کا حکم دیتا ہے اور ایسے نفس کا حال اس حد تک کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی ہر خواہش اور ہر حکم کی غلامی کرتا ہے۔اس کے علاوہ وہ تمام محبت کے رشتے جن کی محبت کی زنجیریں آدمی کو جکڑ لیتی ہیں اور یہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے وہ بھی اسے اپنے اشاروں پہ چلاتے اور طاغوت ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔مثلاً بیوی اپنی فرمائشوں سے' اپنے شوہر کو غلط کام کرنے پر مجبور کرتی ہے' بچوں کی محبت اسے رشوت لینے پر اکساتی ہے' اسی طرح اعزہ' اقربا' برادری' خاندان' دوست' سوسائٹی اور قوم' پیشوا اور رہنما' حکومت اور حکام سب ایسے کمزور آدمی کے لیے طاغوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک اس سے اپنے اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کرے۔

Marfat.com

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ
آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ
قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ
مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ
وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ
قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ
فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ
وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا
ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ
قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ
مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

Marfat.com

رکوع: ۳۵۔ (کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا اس کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی ہے۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا تو رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے جواب دیا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ بیشک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال لا۔ تو وہ کافر یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا ○ یا (کیا تو نے غور نہیں کیا) اس شخص کے حال پر جو گزرا ایک بستی پر دراں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ وہ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد سو اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر اسے زندہ کیا۔ فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا اس نے کہا میں ٹھہرا ہوں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو سال۔ پس اب دیکھ اپنے کھانے کی طرف اور اپنے پینے کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لیے کہ ہم تجھے بنائیں گے نشانی لوگوں کے لیے اور دیکھ ان ہڈیوں کی طرف کہ ہم انہیں کیسے جوڑتے ہیں، پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے کہا میں جان گیا ہوں بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ○ اور یاد کرو جب کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟ بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پہ ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے) (۲۵۸ تا ۲۶۰)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ○

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا اس کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی ہے۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا تو رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے جواب دیا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ بیشک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال لا۔ تو وہ کافر یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا (۲۵۸)

سابقہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا تھا کہ مومن کا ولی اور مددگار اللہ ہوتا ہے۔ وہ اسے تاریکیوں سے روشنی میں نکال کے لاتا ہے۔ کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں جو اسے روشنی سے تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ اب اس رکوع میں اسی بات کی تین مثالیں دی گئی ہیں ان میں سے پہلی مثال اس شخص کی ہے جس کے سامنے مضبوط دلائل کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت واضح فرمائی اور حق اس

Marfat.com

سامنے بالکل واضح ہو کر آ گیا اور وہ اس پر لاجواب بھی ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنا رشتہ چونکہ اللہ سے توڑ کر شیطان سے جوڑ رکھا تھا اور اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی اس لیے حق واضح ہو جانے کے باوجود وہ حق قبول کر کے روشنی کی طرف نہیں آیا۔ بلکہ وہ برابر تاریکیوں میں ہی بھٹکتا رہا حتیٰ کہ وہ اپنے انجام بد کو پہنچ گیا۔

الذی سے کیا مراد ہے؟

یہاں جس شخص کا ذکر کیا جا رہا ہے مفسرین کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد نمرود ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم وطن اور آپ کے وطن عراق کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ نمرود وہی شخص ہے تاریخ جسے حمورابی کے نام سے یاد کرتی ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے اپنے رعایا کو ایک تحریری آئین دیا۔ عراق کے بعض علاقوں کی کھدائی میں بعض ایسے کتبے ملے ہیں جن پر اس کا آئین کندہ ہے۔ وہ آئین تو جیسا بھی تھا البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ نمرود یا حمورابی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی مملکت کو آئین کے مطابق چلانا چاہتا تھا۔ یہاں جس واقعے کا ذکر کیا جا رہا ہے بائبل میں تو اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا' البتہ تالمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے اوفادار' سب سے بڑے عہدیدار کا منصب رکھتا تھا۔ میرا گمان یہ ہے کہ نمرود کے زمانے میں عراق میں جہاں مظاہر قدرت کی پوجا ہوتی تھی وہیں بت پرستی کا چلن بھی عام تھا اور بڑے بڑے بت خانے ملک میں پائے جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد سب سے بڑے بت خانے کا متولی یا نگران تھا اور جس طرح ہندوستان میں سب سے بڑے پروہت کو بادشاہ کے بعد دوسرے درجے کا آدمی سمجھا جاتا ہے اور راجے مہاراجے اسے سلام کرتے ہیں۔ یہی حال عراق میں بھی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کھلم کھلا شرک کی مخالفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گھس کر بتوں کو توڑ ڈالا اور کلہاڑا سب سے بڑے بت کے کندھے پر رکھ کے چلے آئے۔ تو ان کے باپ نے خود ان کا مقدمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا۔ اس طرح بادشاہ کے سامنے وہ ایک ملزم کی حیثیت میں پیش ہوئے۔ اور وہاں بادشاہ اور آپؑ کے درمیان جو گفتگو ہوئی' اس کو نہایت اختصار کے ساتھ یہاں بیان کیا گیا ہے۔

مابہ النزاع چیز کیا تھی؟

اس گفتگو کو ذکر کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان مابہ النزاع چیز کیا تھی؟ اس میں ایک رائے مولانا مودودی علیہ الرحمہ کی ہے اسے ہم تفہیم القرآن سے نقل کرتے ہیں:

"یعنی اس جھگڑے میں جو چیز مابہ النزاع تھی' وہ یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور یہ نزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اس جھگڑنے والے شخص' یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ ان دو فقروں میں جھگڑے کی نوعیت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے۔

ا۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدائیگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں مگر صرف اسی کو رب اور تنہا اسی کو خدا اور معبود نہیں مانتے۔

Marfat.com

۲۔ خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (Supernatural) خدائی جو سلسلۂ اسباب پر حکمراں ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں' ان سے دعائیں مانگتے ہیں' ان کے سامنے مراسم پرستش بجالاتے ہیں اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانین حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعت امر کی مستحق ہو اور جسے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے' یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوئے ہیں اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں۔

۳۔ نمرود کا دعوئے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں' میری زبان قانون ہے' میرے اوپر کوئی بالا اقتدار نہیں ہے' جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے' بلکہ یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زد پڑتی تھی' اسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جرم بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔ (ماخوذ از: تفہیم القرآن)

دیگر مفسرین بالعموم یہ بات لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے قریب قریب زمانوں میں عام طور پر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔ یعنی ان کی قوم کے لوگ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سب سے بڑے دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ نمرود بھی اپنے آپ کو سورج کا اوتار سمجھتا تھا۔ روایاتِ یہود میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی پرستش خدا ہی کی طرح کراتا تھا اور اپنے لیے اس نے ایک عرش الٰہی تیار کروایا تھا جس پر اجلاس کیا کرتا تھا بعض مفسرین کا خیال ہے کہ نمرود فرعون کی طرح اپنے آپ کو خدائے اعظم کا مظہر یا بروز یا اوتار سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ خدائے واحد سے بھی جلنے لگا' جوزیفس یہود کا مورخ قدیم اپنی تاریخ آثارِ یہود میں لکھتا ہے کہ نمرود لوگوں کی خوشحالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکتا تھا گویا وہ خود قادر علی الاطلاق ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اب خدا نے طوفانِ نوح کی طرح دنیا کو ڈبویا تو میں اس سے انتقام لوں گا۔ اپنے بارے میں اس کے یہی مزعومات یا توہمات تھے جس کی وجہ سے اس نے حضرت

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام کو اپنے دربار میں طلب کیا اور آپ سے سوال کیا کہ اس سرزمین کا رب تو میں ہوں تو کس رب کی لوگوں کو دعوت دیتا ہے؟ اپنے رب کا تعارف کرواؤ تاکہ میں بھی جانوں کہ وہ کون ہے؟ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ''میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت پر قادر ہے۔'' یعنی موت وحیات کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی سارے نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے۔ کسی بندہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے نظام حیات و ممات کو بدل دے۔ نمرود اس بات کی حقیقت کو یا تو سمجھا نہیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا ''زندگی اور موت پر تو میں بھی قادر ہوں' میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔'' سامانِ معیشت سب میرے ہاتھ میں ہیں میں جسے چاہوں روزی دوں اور جسے چاہوں بھوکا مار ڈالوں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے جن کی اسنادی حیثیت بہت کمزور ہے کہ نمرود نے ایک بے گناہ کو قتل کروا دیا اور ایک ایسا شخص جسے پھانسی ہونے والی تھی اسے رہا کر دیا اور کہا دیکھو میں جسے چاہوں زندگی دے دوں اور جسے چاہوں موت سے ہمکنار کر دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بجائے اس کے کہ اس دلیل پر اصرار کرتے اور اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش فرماتے۔ آپ نے اندازہ کر لیا یہ شخص بات کو الجھانا چاہتا ہے تو آپؑ نے اس دلیل پر اصرار کرنے کے بجائے دوسری دلیل دی۔ اللہ کے نبی چونکہ مناظر نہیں ہوتے بلکہ داعی ہوتے ہیں اس لیے ان کے سامنے ہمیشہ دعوت کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ نمرود چونکہ سورج دیوتا کا اوتار تھا اور سورج ہی کلدانیوں کے عقیدہ میں معبود اعظم تھا چنانچہ آپ نے بات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ان کے معبود اعظم کے حوالے سے فرمایا کہ تم سورج کے قادر و متصرف ہونے کے تو قائل ہو زیادہ نہیں تو یہی کر دکھاؤ کہ سورج اپنے ارادہ سے عام سنت الٰہی کے خلاف ذرا اپنا رخ ہی بدل دے۔ دوسروں پر اس کے ارادہ و تصرف کی بات تو الگ رہی وہ خود اپنے اوپر ہی تصرف کر کے دکھائے' کسی خدا کی بے بسی کا منظر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ جیسے ہی آپ نے فرمایا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں ڈبوتا ہے تم اتنا کرو کہ اسے مغرب سے نکال کر دکھا دو۔ یعنی تم اپنے معبود اعظم سے کہو کہ معاملہ چونکہ حق و باطل کے معرکے کا ہے کہ ایک نوجوان تمہارے بنیادی عقیدے کو چیلنج کر رہا ہے۔ ایسے میں خاموشی تو بڑی خطرناک بات ہے اس لیے ذرا اپنا رخ بدل کر اپنے معبود اعظم ہونے کو ثابت کرو۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ کافر یہ سن کر مبہوت اور ششدر رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہے۔ آخر میں فرمایا

ظالم کا مفہوم

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (اللہ ظالم قوم کو راستہ نہیں دکھاتا) نمرود چونکہ ظالم تھا اور اس لیے اسے بحث میں خفت اٹھانی پڑی اور وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں۔ اللہ انہیں جو انعامات دیتا ہے' انہیں اللہ کا فضل قرار دینے کی بجائے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ خدائے منعم کا شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نمرود کو اللہ نے حکومت اور مملکت عطا کی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھے کہ وہ اس نعمت پر اللہ کا شکر گزار بندہ بنتا لیکن اس نے اقتدار کو اپنا استحقاق سمجھ لیا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ اللہ نے اقتدار دے کر اس کا امتحان لیا ہے۔ وہ استکبار کا شکار ہو کر خود رب بن بیٹھا اور خدائی کا تخت بچھا کر اللہ کے مقابلے میں احکام دینے لگا۔ ایسا ظالم شخص اللہ کی ہدایت سے کس طرح فیضیاب ہو سکتا تھا۔

Marfat.com

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

(یا (کیا تو نے غور نہیں کیا) اس شخص کے حال پر جو گزرا ایک بستی پر درآں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ وہ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد سو اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر اسے زندہ کیا۔ فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا اس نے کہا میں ٹھہرا ہوں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو سال۔ پس اب دیکھ اپنے کھانے کی طرف اور اپنے پینے کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لیے کہ ہم تجھے بنائیں گے نشانی لوگوں کے لیے اور دیکھ ان ہڈیوں کی طرف کہ ہم انہیں کیسے جوڑتے ہیں۔ پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے کہا میں جان گیا ہوں بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) (۲۵۹)

الذی سے کون مراد ہے؟

نمرود کا واقعہ اس شخص کی مثال تھی جس نے اپنا آپ اللہ کے ہاتھ میں دینے کی بجائے طاغوت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس نے اللہ کی بجائے طاغوت کو اپنا ولی بنایا۔ اب یہ مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا اور اپنی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی۔ اس آیت کے فہم میں سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جس شخص کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کون ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض لوگ اس سے حضرت یرمیاہ نبی مراد لیتے ہیں۔ یہ بھی اسرائیلی سلسلہ کے پیغمبر ہیں۔ یہ ساتویں صدی قبل مسیح میں ہوئے۔ تاریخ یہود کے مطابق انہیں ۶۲۶ میں نبوت ملی۔ تاریخی اعتبار سے یہ قول سب سے ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے حضرت حزقیل علیہ السلام کو اس واقعہ کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ یہ حضرت یرمیاہ نبی کے ہم عصر اور چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ بائبل نے ان کا قصہ بیان کیا ہے لیکن کشف یا رؤیا کے طور پر ہے بصورتِ واقعہ نہیں اور قرآنِ کریم جس طرح بیان کر رہا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے جو اس شخص کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مفسرین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ یہاں جس شخص کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد حضرت عزیر نبی ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر گزرے ہیں۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ بائبل میں ان کا نام عزرا کاتب یعنی کاتب تورات کی حیثیت سے آتا ہے۔ ایک صحیفہ بھی ان کے نام کی طرف منسوب ہے۔ اس شخص سے حضرت عزیر کو مراد لینے والوں میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباس وغیرہ جیسی عظیم شخصیتیں بھی ہیں۔ اسی لیے بالعموم اسی قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ اس سلسلہ میں کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب اندازے ہیں یا بنی اسرائیل کی روایات ہیں۔ کسی بات کو یقینی کہنا مشکل ہے۔

Marfat.com

قریہ سے کیا مراد ہے؟

دوسرا سوال اس ضمن میں یہ ہے کہ یہاں قریہ سے کون سی بستی مراد ہے؟ اس سلسلے میں مختلف شہروں کے نام لیے جاتے ہیں۔ لیکن اکثریت یروشلم یا بیت المقدس کی طرف گئی ہے۔ یہ شہر بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ۵۸۶ قبل مسیح میں بہت بری طرح تاخت و تاراج کر ڈالا تھا۔ حضرت عزیر علیہ السلام جب اس شہر کے قریب سے گزرے تو وہ اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا سکے تو بے ساختہ پکار اٹھے اس مہیب تباہی کے بعد اس بستی کے زندہ ہونے کے کیا امکانات ہیں؟

سوال کی نوعیت

حضرت عزیر چونکہ اللہ کے نبی مشہور ہیں اگر واقعہ انہی کا ہے تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے اس سوال کی نوعیت کیا تھی؟ کیونکہ ایک پیغمبر اگر موت کے بعد زندگی پر یقین نہیں رکھتا اور وہ مطمئن نہیں ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ ہر طرح کی موت کے بعد زندگی دینے پر قادر ہے تو پھر اور کون ہوگا جسے بعث بعد الموت پر یقین آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کا یہ سوال انکار کی نوعیت کا نہ تھا اور معمولی بصیرت رکھنے والا آدمی بھی کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ کوئی مسلمان انکار پر مبنی سوال کر سکتا ہے چہ جائیکہ کسی پیغمبر کے بارے میں ایسا گمان کیا جائے۔ یہ سوال درحقیقت اس طرح کا تھا جس طرح کے سوالات جستجوئے حقیقت کے جوش سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ایک آدمی جو کسی بات کو عقل و بصیرت سے سمجھتا ہے۔ عقل کی مانی ہوئی باتوں میں وہ ثبات اور اطمینان نہیں ہوتا جو ایمان کے لیے ضروری ہے تو وہ اس سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے وجدان کی منازل اور ایقان کے مدارج طے کرتے ہوئے کئی دفعہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ میں یہاں تک تو پہنچ گیا ہوں اس سے اگلی منزل کیا ہوگی؟ پھر اس کے جواب کے لیے وہ جستجو کے مزید سفر پہ نکل کھڑا ہوتا ہے تو یہ سفر مسلسل یقین و ایمان کا سفر ہے جس میں کہیں شک و ارتیاب کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتیں چہ جائیکہ وہاں انکار کا سایہ پڑ سکے۔ اور یہ تو ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یقین کے بھی مراتب ہیں۔ پہلا مرتبہ علم الیقین ہے، دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین ہے۔ ہر صاحب ایمان علم الیقین کے حصول کا مکلف ہے۔ لیکن اللہ کے نبی اس حد تک مطمئن نہیں ہوتے کیونکہ ان کے سامنے صرف اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جنہیں یقین کی دولت سے بہرہ ور کرنا ہوتا ہے اس لیے ان کے اندر یقین کی وہ قوت ناگزیر ہے جو شکوک و شبہات اور ناموافق حالات کے کسی حملے سے بھی متاثر نہ ہو اور ان کا یقین جس طرح ان کی اپنی ذات کو منور رکھے اسی طرح باقی سب تک بھی اس کی شعائیں پہنچتی رہیں۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ انہیں عین الیقین سے نوازتا ہے۔ انہیں ملکوت السموات والارض دکھائے جاتے ہیں اور عالم غیب اور کائنات کے ان گوشوں کی انہیں سیر کرائی جاتی ہے جہاں دوسروں کی رسائی ممکن نہیں۔ اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ لیکون من الموقنین تاکہ وہ یقین لانے والوں میں سے ہو جائیں'، یعنی انہیں عین الیقین حاصل ہو جائے۔ لیکن اللہ کے نبی چونکہ اللہ کی ذات و صفات سے غایت درجہ تعلق اور رابطہ رکھتے ہیں اس لیے ان کا سفر حق الیقین کی طرف جاری رہتا ہے۔ اور وہ اسی سلسلہ میں اپنے اللہ سے سوال بھی کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ ان کا ولی ہے تو ان کا اصل سہارا اسی کی ذات ہے۔ وہی چونکہ ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اس لیے وہ اسی سے نورِ ایمان اور نورِ یقین کے طلبگار ہوتے

Marfat.com

ہیں۔حضرت عزیر علیہ السلام کا سوال بھی ایسی ہی نوعیت کا ہے۔وہ یہ خوب جانتے تھے کہ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے وہ ہر طرح کی تباہی اور ہلاکت کے بعد زندگی عطا کرنے پر قادر ہے۔لیکن ان کے پیش نظر یقین کی آخری منزل تک پہنچنا تھا۔اس لیے جب انہوں نے اس کے لیے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے دستگیری فرمائی اور انہیں ایک ایسے تجربے سے گزارا جس کی بعد حق الیقین کا حاصل ہونا ایک بدیہی بات تھی۔

اللہ نے ان کے سوال کے جواب میں انہیں موت دے دی اور پھر سو سال تک انہیں مردہ حالت میں سلائے رکھا۔پوری ایک صدی گزرنے کے بعد انہیں اٹھایا اور پوچھا کہ تم نے یہاں کتنا زمانہ گزارا ہے؟ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے دن بھر سویا رہا ہوں یا شاید دن کا کچھ حصہ سویا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم پر تو ایک صدی بیت چکی ہے زمانہ ایک صدی آگے بڑھ چکا ہے ایک نسل گزر گئی دوسری جوان ہو چکی ہے لیکن اندازہ فرمائیے کہ انہیں ایک صدی گزرنے کا بالکل احساس نہیں ہوا۔فوری طور پر اس سے انسان کی ذہنی نارسائی کا احساس ہوتا ہے کہ وہ انسان جو موت وحیات کا بھید جاننا چاہتا ہے وہ یہ تک نہیں جان سکتا کہ موت کے بعد صدیاں گزرتی ہیں اور اسے احساس نہیں ہوتا اور اگر اسے اٹھایا جائے تو وہ یہ بھی بھول چکا ہوتا ہے کہ میں کبھی موت کی سختی چکھ چکا ہوں۔وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نیند کے مزے لیتا رہا ہوں عالم برزخ میں گزرنے ہوئے وقت کا انسان کو بالکل احساس نہیں ہوتا۔ نفخۂ ثانیہ کے بعد جب انسان اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ہر قبر سے اٹھنے والا حیران ہو کر پوچھے گا مَنْ م بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (ہمیں ہماری نیند سے کس نے اٹھادیا) آج اگر کسی سے قیامت کی بات کی جائے تو وہ کہتا ہے کہ ''جناب وہ تو بہت دور کی بات ہے آپ ابھی سے اسے کیوں لے بیٹھے ہیں؟'' لیکن ہمیں اندازہ نہیں کہ برزخ میں گزرا ہوا وقت قیامت میں ہمیں ایسا لگے گا جیسے ہم چند گھنٹے سو کے اٹھے ہیں۔حضرت عزیر کو بھی ایک صدی ایسے ہی محسوس ہوئی۔لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ آپ پر تو ایک صدی گزر چکی ہے تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان کے احساسات کی کیفیت کیا ہوگی؟ پھر ان سے فرمایا گیا کہ اب ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو جو تم سفر میں ساتھ لے کے چلے تھے۔جب وہ دیکھی گئیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک صدی گزر جانے کے باوجود وہ باسی تک نہیں ہوئیں۔ان میں سڑاند تو کیا پیدا ہوتی وہ بالکل تروتازہ تھیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے سو سال تک اللہ نے تغیر کے عمل کو ان کی حد تک روک دیا تھا کہ خبردار ان پر اثر نہ کرنا۔ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں تاثیر اور تاثر کا قانون ناقابل تغیر ہے۔موسم کے اثرات کو کوئی نہیں روک سکتا۔سردی گرمی کو تاثیر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔چیزوں کے اثرات اور خواص ایک حقیقت ہیں جن میں تخلف نہیں ہوسکتا۔ہر چیز وقت گزرنے کے ساتھ بگڑتی اور مرتی ہے۔جو بچہ ہے وہ جوان ہوتا ہے جو جوان ہے وہ بوڑھا ہوتا ہے اور جو بوڑھا ہے وہ موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔یعنی یہ وہ سلسلہ تاثیر وتاثر ہے جسے ہم حد درجہ لازمی سمجھتے ہیں۔اور کوئی اگر یہ کہے کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ رک جائے تو ہم کبھی اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتے لیکن قرآنِ کریم بتا رہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں جو چند گھنٹوں میں گل سڑ جاتی ہیں وہ ایک صدی تک ہر طرح کے تغیر سے محفوظ رہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ہم جن قوانین کو عمل کرتا ہوا دیکھتے ہیں وہ اپنی مرضی کے مختار نہیں۔بلکہ کوئی ذات ہے جس کا حکم موثر حقیقی ہے۔یہاں کے قوانین بھی اسی کے احکام کے پابند ہیں۔وہ جب تک چاہتا ہے کسی قانون کو عمل کرنے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے روک دیتا ہے۔آگ ہمیشہ جلاتی ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی بجائے گلزار بن گئی۔چھری ہمیشہ کاٹتی ہے لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام کا گلا نہ کاٹ سکی دریاؤں اور سمندروں کا پانی ہمیشہ جولانیاں دکھاتا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے پایاب ہوگیا۔یہی حقیقت اس واقعے میں بھی دہرائی جا رہی ہے۔

Marfat.com

پروردگار نے حضرت عزیر علیہ السلام سے فرمایا اب اپنے اس گدھے کو دیکھو جس پر تم سوار ہو کر آئے تھے۔ جو یقیناً کھانے پینے کی چیزوں کی عمر سے لمبی عمر رکھتا تھا۔ اسے دیکھا تو اس کی ہڈی ہڈی الگ ہو چکی تھی' ماس کا نام ونشان نہ تھا' فرمایا دیکھو ہم اس کی ہڈیوں کو کیسے جمع کرتے اور پھر ترتیب دیتے ہیں اور پھر دیکھو ہم کیسے اس پر گوشت چڑھاتے ہیں اور پھر کیسے زندہ کر کے اسے کھڑا کر دیتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود اپنی ذات پر ایک صدی گزر گئی تو تب وہ حق الیقین حاصل ہوا جو ان کی اصل خواہش اور طلب تھی اور اللہ کی رحمت سے سرشار ہو کر فرمایا کہ اب میں پوری طرح جان گیا ہوں۔ میرے اس جاننے میں یقین کی پوری روح کارفرما ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مارنے پر بھی قادر ہے اور زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰیؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

(اور یاد کرو جب کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟ بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پہ ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے) (۲۶۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کی نوعیت

حضرت عزیر علیہ السلام کے سلسلے میں ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ اللہ کے نبی تو نبوت سے پہلے بھی ایمان کی کیفیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور نبوت کے بعد تو ایمان کی تفصیل سے انہیں آشنا کیا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح کلی کے پھول بننے کا ایک سفر ہے اور ہلال کے بدر بننے کا ایک وقت ہے اور نوخیز جوانی کے مکمل ہونے کا ایک عمل ہے اسی طرح سلوکِ باطن کے مدارج ہیں اور ان کے درمیان میں بھی ایک سفر ہے۔ انبیاءِ کرام کا سفر جہالت سے ایمان کی طرف نہیں ہوتا' بلکہ ایمان سے مکمل ایمان کی طرف ہوتا ہے۔ یقین سے مکمل یقین کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق یہ منزلیں ان سے طے کرواتے ہیں۔ لیکن پیغمبر اللہ تعالیٰ سے غایت درجہ محبت رکھنے کی وجہ سے ہر اگلی منزل کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی آئندہ آنے والی کیفیتوں کا سوال بھی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال بھی اسی نوعیت کا تھا۔ انہیں اس بارے میں ہرگز کوئی تردد نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ ان کا سوال زندگی کی کیفیت کے بارے میں تھا۔ "کیف" سے اس چیز کی حالت دریافت کرنے کا سوال کیا جاتا ہے جس کے موجود ہونے کا یقین ہو۔ اسی لیے جب پروردگار نے فرمایا کہ کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی یقین تو ہے قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔ اطمینان کسی چیز کے اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک ٹک جانے کو کہتے ہیں۔ جس میں جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ چراغ کی لو اگر بالکل سیدھی ہو کہ ہوا کے سبب اس کا کسی طرف جھکاؤ نہ ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ چراغ کی لو میں اطمینان آ گیا۔ ایک مومن کا دل جب اللہ کی صفات کے بارے میں اس طرح یکسو ہو

Marfat.com

جائے کہ حالات کے تغیر کے باعث اس کی دل جمعی میں کوئی فرق نہ آئے تو ایسے ہی دل کو مطمئن دل یا نفس مطمئنہ کہتے ہیں اور یہ وہ دولت ہے جو عقل وخرد کی کاوشوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی طلب ایک مومن کی حقیقی روح ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ اللہ کے عطا کرنے سے عطا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو اللہ ہی سے مانگا جا سکتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی کیفیت کو اللہ سے مانگا اور پروردگار نے ایک تجربے کی صورت میں انہیں یہ دولت عطا فرمائی جس سے وہ حق الیقین کے درجے پر فائز ہو گئے۔

فرمایا کہ تم چار پرندے لو اور ان کو پہلے اپنے آپ سے اچھی طرح ہلا لو یعنی انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو کہ وہ تمہارے ساتھ ایسے گھل مل جائیں جیسے گھروں کے سدھائے ہوئے جانور گھر والوں سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں ذبح کر کے ان کا ایک ایک ٹکڑا یعنی ایک ایک بوٹی اور ایک ایک پر آپس میں خلط ملط کر دو کہ چاروں پرندوں کے مختلف اجزاء ایک دوسرے میں مل جائیں۔ پھر ان ملے جلے اجزاء کے چار حصے کرو اور ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑی پر رکھ دو۔ پھر ان پرندوں کو اپنی طرف بلاؤ۔ تم دیکھو گے کہ وہ پرندے دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور پھر آپ نے دیکھا کہ جیسے ہی آپ نے ان کو بلایا وہ گوشت کی بوٹیاں اور منتشر پر آپس میں ملے اور پرندوں کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑتے ہوئے یا دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آ گئے۔

آپ کو جو ہلا لینے کی ہدایت کی گئی تھی اس سے مقصود آپ کو اپنے پرندوں کی اچھی طرح پہچان کرانا تھا تاکہ جب وہ پرندے آپ کے پاس آئیں تو آپ کو ان کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہ آئے اور آپ کو یقین آ جائے کہ یہ وہی پرندے ہیں جنہیں میں نے سدھایا تھا۔

ایک غلطی کی تردید

بعض لوگوں نے عجیب بات لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لیں، انہیں اچھی طرح سدھا لیں اور پھر ایک ایک پرندہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیں اور پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر آپ انہیں بلائیں تو وہ آپ کے پاس اڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ غور فرمایئے کہ اس میں جو سوال کیا گیا ہے کیا اس کا جواب مل گیا ہے۔ کیونکہ سوال تو یہ ہے کہ آپ مردوں کو زندہ کیسے کرتے ہیں اور اور اگر چار زندہ پرندے مختلف اطراف سے آپ کے بلانے پر آ جائیں تو اس میں زندگی اور موت کا مسئلہ کیسے حل ہو گیا۔ ایسے واقعات تو ہر روز آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کبوتر پالتے ہیں یا تیتر یا بٹیر سدھا لیتے ہیں تو وہ انہیں جب چھوڑتے ہیں تو وہ گھوم پھر کر خود بخود واپس چلے آتے ہیں اور اگر سدھانے والا انہیں بلائے تو اس کی آواز پر اڑتے چلے آتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تجربہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کرایا گیا ہے تو یہ تو روز گھروں کی چھتوں پر ہم دیکھتے ہیں، اس میں غیر معمولی بات کیا ہے اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی الجھن کا جواب کہاں ملتا ہے۔ آپ کی الجھن کا جواب تو اسی شکل میں ہو سکتا تھا کہ ایک شے کے اجزاء فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر حیاتِ تازہ حاصل کریں اور یہ تجربہ اسی طرح کا تھا۔ اور ''جُزْءًا'' کا لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انہیں اپنی بات کا پورا جواب مل گیا تو پروردگار نے فرمایا کہ اب اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ عزیز بھی حکیم بھی ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے، زندگی اور موت بھی اسی کے قبضے میں ہے، وہ جسے چاہے زندہ کرے اور جسے چاہے موت سے ہمکنار کرے۔ البتہ زندگی اور موت کا راز کیا ہے اس راز کا افشاء دنیا میں کرنا اس کی حکمت کا تقاضا نہیں، قیامت کے دن تم ہر غیب کی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔

Marfat.com

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا
مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ

Marfat.com

نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ
اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا
الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا
فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ
الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ
وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ
وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ
نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ
تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

Marfat.com

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ
وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٢﴾
لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾

(٣٦۔٣٧ رکوع اکٹھے ہیں) (٢٦١ تا ٢٧٤)

رکوع: ٣٦۔ (مثال ان لوگوں کے انفاق کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں اس دانے کی مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں۔ اور اللہ افزونی عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجائش والا ہے اور علم والا ہے ○ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں نہ دل آزاری کرتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ○ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے ○ اے ایمان والو! اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کے لیے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل اس طرح ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے تو وہ اسے چھوڑ جائے سپاٹ پتھر۔ وہ قادر نہیں ہوں گے کسی چیز پر اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا ○ اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے۔

Marfat.com

ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو بلندی پر واقع ہو اس پر زور کا مینہ برسے تو وہ دو چند پھل لائے۔ پس اگر اس پر بارش نہ برسی تو پھوار بھی کافی ہو گئی۔ اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے O کیا پسند کرے گا تم میں سے کوئی کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس کے لیے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں۔ اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے بھی ابھی کمزور ہوں۔ پس پھر جائے اس باغ پر سموم کا بگولا اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں تا کہ تم غور و فکر کرو O

رکوع: ۳۷۔ اے ایمان والو! خرچ کرو اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال سے اور ان چیزوں سے جنہیں ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ارادہ بھی نہ کرو اپنی کمائی میں سے ردی چیز کا کہ تم اسے خرچ کرو اور تم خود اس چیز کو لینے والے نہیں ہو بجز اس کے کہ تم آنکھیں میچ لو اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی اور ستودہ صفات ہے O شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے۔ اور جسے حکمت عطا کی گئی یقیناً اسے خیر کثیر دے دی گئی۔ اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر عقل والے O اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یا جو کچھ تم منت مانتے ہو یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے O اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم انہیں چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے O آپ کے ذمہ ان کی ہدایت نہیں بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو مال میں سے تو اس میں تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا دیا جائے گا۔ اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی O (انفاق) ان فقراء کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ زمین میں کاروبار کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ گمان کرتا ہے انہیں بے خبر آدمی غنی۔ ان کی خودداری کے سبب سے۔ تم ان کو ان کی علامتوں سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O

مثال ان لوگوں کے انفاق کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں اس دانے کی مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں۔ اور اللہ افزونی عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجائش والا ہے اور علم والا ہے) (۲۶۱)

Marfat.com

ربط کلام

اصل سلسلہ بیان جہاد اور انفاق سے متعلق تھا۔ پھر درمیان میں ''لا اکراہ فی الدین'' سے ایک ضمنی بحث پیدا ہوگئی، پروردگار نے اس کے بارے میں ضروری رہنمائی عطا فرمائی اور اس کی تسہیل کے لیے تین مثالیں بیان فرمائیں۔ آیت الکرسی سے پہلے انفاق کا حکم دیا گیا تھا جو سلسلۂ کلام کی دوسری کڑی ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو لیا جا رہا ہے تاکہ سلسلۂ کلام مربوط رہے۔

انفاق پر زور دینے کا سبب

قرآنِ کریم میں اللہ کے دین کی نشر و اشاعت، اللہ کی زمین پر اسے غالب کرنے اور اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے بار بار جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جہاد کے حکم کے ساتھ بالعموم انفاق کا حکم بھی موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کے حکم کے مطابق بار بار لوگوں کو جہاد کی ترغیب کے ساتھ ساتھ انفاق کی ترغیب بھی دی ہے۔ لیکن جو لوگ اس کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھتے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے اور آج کے دور میں بھی یہی دونوں حرکتیں کی جا رہی ہیں۔ قرآنِ کریم کے پیشِ نظر واضح طور پر دو حقیقتیں ہیں۔ ایک یہ کہ قرآنِ کریم کا نزول اور اللہ کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت محض اس لیے نہیں تھی کہ لوگوں تک کلمۂ نصیحت پہنچ جائے یا زیادہ سے زیادہ ان پر اتمامِ حجت ہو جائے، بلکہ رسول کی بعثت کا مقصد در حقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر بقدرِ امکان اور بقدرِ ہمت غالب اور نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جب بھی اللہ کا نبی اللہ کے دین کو نافذ کرے گا تو وہ ہوا یا خلا میں تو نہیں کرے گا، اس کے لیے قطعۂ زمین درکار ہوگا اور اس قطعۂ زمین پر ایک قوم آباد ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین پر ایمان لانے والی اور اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے میں اللہ کے رسول کا دست و بازو ہوگی۔ یہ لوگ ایک بیس اور مرکز بنانے کے بعد اس دعوت الی اللہ کو عام کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ ان کاوشوں میں قدم قدم پر شیطانی لشکر اور لادینی گروہ راستہ روکنے کی کوشش کریں گے، تصادم ہوگا، لڑائی تک نوبت پہنچے گی، اس طرح جہاد و قتال کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور مزید یہ کہ جو لوگ ان انقلابی کوششوں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیں گے وہ اپنے بیوی بچوں سمیت اسی اسلامی ریاست کے مکین بھی ہوں گے۔ ان کے پیشِ نظر تو رات دن اسلامی جہاد و قتال کی مصروفیت ہوگی۔ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو کاروبار کے لیے فرصت نکال سکیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ایک طرف جنگی مصارف کی ضرورت بڑھتی جائے گی اور دوسری طرف ملک کے مکینوں کی مالی حالت روز بروز پتلی ہوتی جائے گی۔ مجبوراً اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ اس تحریک کے اعوان و انصار اور ارکان اپنا پیٹ کاٹ کر اس قافلے کو آگے بڑھنے کی ضرورتیں مہیا کریں اور اس ملک کے رہنے والوں کی غذا کا انتظام کریں۔ یہ وہ ضرورت ہے جو ہر رسول کو اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی ضرورت سے دوچار تھے۔ اور مزید برآں یہ بات بھی کہ ایک نوزائیدہ مملکت کا اپنا کوئی خزانہ نہیں ہوتا۔ مدینے کی ریاست ایک نظریے اور اس نظریے پر ایمان لانے والے چند ہزار لوگوں پر مشتمل تھی، جن میں تاجر بھی تھے اور کاشت کار بھی، مزدور بھی تھے اور ہنرمند بھی۔ اس محدود ذریعۂ آمدنی کے علاوہ اسلامی ریاست کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ ان کا بنک مسلمانوں کی جیبیں اور انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا۔ اس لیے قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انفاق کی ترغیب دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے

Marfat.com

بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مخالف یا منافق قوتوں کا سارا زور بھی اس بات پر صرف ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملنے جلنے والوں کو مالی تعاون سے روکیں یا ان کے جذبے کو سرد کریں۔ چنانچہ یہود کے طعنے اور تمسخر اور عبداللہ بن ابی کی اپنے قبیلے کے لوگوں میں انفاق کی کوششوں کو روکنے کا ذکر قرآنِ کریم کے ریکارڈ پر ہے۔ کیونکہ مخالفین جانتے تھے کہ پوری اسلامی ریاست اور اس کے مقاصد کی بجا آوری کا دارومدار مسلمانوں کے جذبۂ انفاق پر ہے۔ اگر اسے سرد کر دیا جائے تو اسلامی تحریک کو بے حد پریشانیوں کا سامنا ہو سکتا تھا۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان مملکتوں میں وسائل کی فراوانی کے باوجود دینی علوم کی بقا کی ذمہ داری اور دینی ضرورتوں کے احیاء کا دارومدار دینی مدارس اور اسلامی جماعتوں پر ہے۔ ان کے پاس کوئی مستقل وسائل نہیں۔ وہ ہمیشہ اسی ایک ذریعے کو کام میں لانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کام لیتے تھے۔ غیر مسلم' لادین قوتوں اور ان کے ایجنٹوں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے کہ محض اس جذبۂ انفاق کے بل بوتے پر ملک میں ہزاروں ادارے کام کر رہے ہیں اور لاکھوں طلبہ کے قیام و طعام اور درس و تدریس کی ذمہ داریاں ان اداروں نے اٹھا رکھی ہیں۔ اگر لوگوں کو ان کی طرف سے بدگمان کر دیا جائے یا ان کی امداد کرنے پر پابندی لگا دی جائے تو علم کے یہ سرچشمے اور دین کی یہ پناہ گاہیں خود بخود اجڑ جائیں گی۔

قرآن اور صاحب قرآن کی ترغیب کے پیچھے ایک اور اہم حقیقت بھی کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ انسان جس طرح اپنی ذات' اپنی اولاد' اپنے والدین' اپنے احباب اور اپنی محبوب چیزوں سے پیار کرتا ہے اس سے بڑھ کر وہ اپنے مال و دولت سے پیار کرتا ہے۔ بسا اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ انسان مال و دولت کو بچانے کے لیے جان دے دیتا ہے۔ اور اس طرح کے مقولے تو ہمارا روزمرہ بن چکے ہیں کہ کسی آدمی نے اپنے دوست سے کہا "مجھے پیسوں کی ضرورت ہے آپ براہِ کرم میرے ساتھ تعاون کریں۔" اس کے دوست نے جواب دیا "گر جان می طلبی حاضر است" کہ اگر تم جان مانگتے ہو تو وہ تو حاضر ہے۔ لیکن "گر زر می طلبی سخن دریں جاست" اگر زر یا پیسے مانگتے ہو تو اس میں سوچنا ہو گا۔ یعنی جان دینے کو آدمی بے ساختہ تیار ہو جاتا ہے لیکن زر دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ انسان جن بتوں کی پوجا کرتا اور جو بت اس نے اپنے دل میں بٹھا رکھے ہیں' ان میں سب سے بڑا بت دولت ہے۔ ایک جھونپڑے میں رہنے والا بھی اسی کے لیے آہیں کھینچتا ہے اور ایک محل میں رہنے والا بھی اسی کے لیے ایمان بیچتا ہے۔ اقبال نے بھی اس کو بت قرار دیا اور یہ بتایا کہ لا الہ نے جو بت توڑے ہیں ان میں یہ بت بھی شامل ہے۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتۂ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

اسلام نے اپنی دعوت کی بنیاد توحید کو بنایا ہے۔ وہ کسی ایسے بت یا ایسے آستانے کو باقی نہیں چھوڑتا جس سے توحید کو نقصان پہنچے۔ اللہ کی جس طرح نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح اس سے محبت کرنا بھی ضروری ہے۔ سر بھی اسی کے سامنے جھکنا چاہئے اور دل بھی اسی کی محبت سے لبریز ہونا چاہئے۔ انفاق کا بار بار حکم دینے سے مقصود یہ ہے کہ تم جس اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس نے تمہیں ایک دین عطا کیا ہے اس کے مطابق زندگی گزارنا' اسی کو نافذ اور غالب کرنا یہ تمہارا اولین مقصد ہے۔ باقی ہر چیز اس مقصد پر قربان ہونی چاہئے۔ آدمی ہمیشہ سے اپنی ذات پر' اپنے خاندان پر اور بعض دفعہ قومی تعصب میں مبتلا ہو کر اپنی قومی ضرورتوں پر خرچ کرتا آیا ہے۔ لیکن ان سب سے بلند ہو کر کلمۂ حق کے راستے میں خرچ کرنا اور اس نظریے کی سربلندی کے لیے خرچ کرنا جس پر ایک مسلمان ایمان لاتا ہے یہ وہ تصور ہے جس کو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک معاشی نقطۂ نظر بالکل تبدیل نہ ہو جائے۔ جس طرح مادہ پرست لوگ پیسہ کمانے کے لیے جیتے اور

Marfat.com

پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں اور انکی نگاہ ہر وقت نفع و نقصان کی میزان پر جمی رہتی ہے۔ ایک مسلمان کو اس سے بڑھ کر اپنا ایمان اور اپنا دین عزیز ہونا چاہیے۔ وہ اسی کے لیے جیئے اسی کے لیے مرے اور اسی کے نفع و نقصان کی میزان کو ہمیشہ سامنے رکھے۔ اسے اپنی ذات' اپنے بیوی بچوں اور اپنے خاندان پر بجا طور پر اپنی دولت خرچ کرنے کا حق ہے۔ لیکن جب اللہ کے دین اور دین کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک کو اس کی دولت کی ضرورت پڑے' جہادی مصارف اس سے دولت کا تقاضا کریں' ملک کی بقا اور ملک کا دفاع اس کی دولت کی اپیل کریں تو اب اس کو اپنی دولت کا بیشتر حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے بیقرار ہو جانا چاہیے۔ جس طرح صحابہ کرام بار بار پوچھتے تھے کہ ہم کس قدر خرچ کریں؟ مقصد یہ تھا کہ اجازت ہو تو سب کچھ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لٹا دیں۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی جذبے کو اپنی سنت بنایا۔ یہ وہ معاشی نقطۂ نظر ہے جس سے قوموں کی سوچ کا دھارا پلٹتا ہے' ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں' وہ ایک ہی دائرے میں اپنی زندگی گزارنے میں فخر محسوس کرتے ہیں' انہیں یکسوئی اور آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ یہ وہ تصور ہے جسے پیدا کرنے کے لیے یہاں قرآنِ کریم نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر تین رکوعوں میں روشنی ڈالی ہے۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے اور اس کو مثال سے واضح فرمایا ہے۔ اس فضیلت کو ذکر کرنے سے پہلے فی سبیل اللہ کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ جس انفاق کی فضیلت بیان ہو رہی ہے اس میں یہ لازمی شرط ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہو۔ فی سبیل اللہ سے مراد ہر وہ خرچ ہے جو اللہ کے قانون یعنی شریعت کے مطابق اور خالص اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ چاہے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو' بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ہو' اپنے اعزہ و اقرباء کی خبر گیری کے لیے ہو' محتاجوں کی اعانت کے لیے ہو' رفاہِ عام کے کاموں میں ہو' یا اشاعت دین و جہاد کے مقاصد میں ہو' یہ تمام کام فی سبیل اللہ میں شامل ہیں۔ جب تک ان میں سے ہر کام کو کرنے سے پہلے اللہ کی رضا کے حصول کو مقصد بنایا جائے اور شریعت کے کسی حکم کو توڑنے کی جرأت نہ کی جائے' بلکہ ایک ایک حکم کی پابندی کی جائے تو وہ یقیناً فی سبیل اللہ کی تعریف میں شامل ہے۔ یہاں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں' اگر وہ واقعی شریعت کے احکام کے مطابق اور اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اجر و ثواب کے اعتبار سے ان میں اس طرح ترقی دیتا ہے' جس طرح کاشت کار ایک دانہ گندم بوتا ہے۔ اس دانے سے ایک سوئی پھوٹتی ہے پھر وہ ایک تنا بنتی ہے' اس میں پھر سات بالیاں نکلتی ہیں اور ایک ایک بالی میں سو سو دانے ہوتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ایک دانے میں سو دانوں کی برکت پیدا فرماتا ہے۔ ایک مومن کے انفاق کا بھی یہی حال ہے۔ اگر وہ ان تمام شرائط کے مطابق خرچ کریں جو شریعت نے عائد کی ہیں تو یقیناً اللہ کے راستے میں دیا ہوا ایک ایک دانہ سات سو دانے کی صورت اختیار کرے گا۔

اللہ کا عام قانون یہ ہے کہ وہ ایک نیکی پر دس گنا اجر عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم ایک عمل کا اجر سات سو گنا تک بھی بڑھا دیتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ عمل اپنے اندر وہ صفات رکھتا ہو جو اللہ کے یہاں بڑھنے کے لیے مقدر ہیں۔ اس آیت میں غور کرنے سے تین شرطیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک کاشت کار ایک دانہ گندم سے اس وقت سات سو دانہ حاصل کرنے کی امید رکھ سکتا ہے جب وہ دانہ پوری طرح صحت مند ہو۔ اور اگر اس دانے کو گھن کھا چکا ہو تو اس سے سات سو دانے تو کیا پیدا ہوں گے وہ تو سرے سے پھوٹنے کے لائق ہی

Marfat.com

نہیں۔ وہ زمین کے پیٹ میں گل سڑ کر ختم ہو جائے گا۔ یہی حال اعمال کا بھی ہے اگر ایک ایک عمل اپنے اندر پوری شرعی صحت رکھتا ہے یعنی وہ بالکل اسی طرح وجود میں لایا گیا ہے جیسے شریعت حکم دیتی ہے اور اس کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما ہے جو عبادت کی جان ہے تو پھر تو اس میں پھوٹنے کی صلاحیت موجود ہے اور امید کی جانی چاہیے کہ اللہ اس کو برگ و بار عطا فرمائے گا۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ دانہ ڈالنے والا کاشت کار بھی کاشتکاری کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو۔ یعنی اسے معلوم ہو کہ دانہ کس طرح بویا جاتا ہے' کس موسم میں بویا جاتا ہے' اس کی ایک ایک بات سے وہ واقف ہو۔ اور تیسری بات یہ کہ جس زمین میں وہ دانہ بویا جائے وہ زمین عمدہ ہو۔ قوت روئیدگی سے بھرپور ہو' اس کو وہ عوارض لاحق نہ ہوں جن کی وجہ سے زمین قوت روئیدگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ان تینوں شرطوں میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو دانہ سات سو گنا تک کیا بڑھے گا اس کے اگنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی حال انسانی عمل اور انفاق کا بھی ہے۔ ایک شخص جو مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اسے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ مال اللہ کے راستے میں دینے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ کسی حرام ذریعے سے کمایا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ حرام مال کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح دوسری شرط یہ ہے کہ خرچ کرنے والے کی نیت نیک اور صالح ہو۔ اگر وہ کسی بدنیتی یا نام و نمود کے لیے خرچ کرتا ہے تو وہ اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کسی ایسی جگہ ڈال دے جہاں سے وہ اُگ نہ سکتا ہو۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ مال خرچ کرنے والا اپنا مال اس جگہ خرچ کرے جو خرچ کی واقعی جگہ ہو۔ اور اگر وہ کسی ایسی جگہ خرچ کر دے جہاں خرچ کرنا سرے سے جائز ہی نہ ہو تو چاہے وہ کتنے اخلاص سے کرے تو یہ خرچ کرنا بیکار جائے گا۔

وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ کا مفہوم

اس کے بعد فرمایا وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ (اللہ بڑھا دیتا ہے اور برکت دے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے) اس کا ایک مطلب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سات سو گنا تک اجر و ثواب میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن یہ اس کے لیے کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ اور اس کا چاہنا اور اس کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ اسی کے لیے چاہتا ہے جس میں اس کی اہلیت ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اہل کو اس کی مشیت محروم کر دے اور نا اہل کو نواز دے۔ البتہ اہلیت پیدا ہونے کے لیے تین شرائط کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ وہ کم سے کم شرائط ہیں جو انفاق کو یا کسی بھی نیک عمل کو قبولیت کے قابل بناتی ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان شرائط کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ سات سو گنا اضافہ فرماتا ہے' لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کے لیے وہ چاہتا ہے اس کے اجر و ثواب میں اس سے بھی کہیں زیادہ اضافہ فرما دیتا ہے۔ کیونکہ بعض احادیث سے اتنا اضافہ بھی ثابت ہے جو ہمارے پیمانوں میں نہیں آ سکتا۔ اور جہاں تک انفاق کا تعلق ہے اس میں بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین شرائط کے علاوہ اور بھی کچھ صفات ایسی ہیں جو اجر و ثواب میں اضافے کا باعث بن سکتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں ایسی ہی چند باتوں کو جمع کر دیا ہے جس سے اجر و ثواب میں اضافہ کی امید کی جا سکتی ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ ''سب سے افضل صدقہ کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا ''سب سے افضل صدقہ اس بے مایہ کا ہے جو اپنی ضرورتیں روک کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر اپنا مال اس رشتہ دار پر خرچ کرے جو رشتہ دار اس کا نام لینے کا روادار نہ ہو۔ بلکہ جب بھی یاد کرے تو برے لفظوں سے یاد کرے۔'' اس میں دیکھئے تین باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دینے والا

Marfat.com

خودنادار اور انتہائی ضرورت مند ہو۔ اب وہ اگر کسی دوسرے پر خرچ کرتا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ وہ کسی عام آدمی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ اپنے رشتہ دار پر خرچ کرتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کی نسبت اپنے اعزہ واقربا پر خرچ کرنے کو زیادہ لائقِ فضیلت ٹھہرایا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ ایسے عزیز پر خرچ کر رہا ہے جو کبھی اس کے لیے کلمۂ خیر کہنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ ہمیشہ اس کو برے لفظوں سے یاد کرتا ہے۔ یہ شخص جانتے ہوئے بھی اگر اس پر خرچ کرتا ہے تو یقیناً اس لیے کرتا ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ تو اس میں کس قدر اخلاص اور کس قدر للّٰہیت ہے۔ اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جو اجر و ثواب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

وَاسِعٌ عَلِيمٌ کا مفہوم

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے) ان دوصفات کو لانے کی ضرورت شاید اس لیے پیدا ہوئی کہ آدمی جب ان فضائل اور ترغیبات کو دیکھتا ہے کہ ان میں اجر و ثواب کی اس قدر بہتات ہے تو کبھی شبہ میں مبتلا ہونے لگتا ہے کہ اربوں کھربوں لوگ اللہ کے راستے میں انفاق کرتے ہیں۔ اگر ایک ایک شخص کو اللہ نے اسی تناسب سے نوازا تو معاملہ کہاں تک پہنچے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ترغیب کی باتیں ہیں، اس کا حقیقت نفس الامری سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید اسی شبہے کے ازالے کے لیے فرمایا کہ تم اللہ کے خزانے کی وسعتوں کو جان نہیں سکتے۔ تمہیں کیا معلوم اس کے خزانوں کی وسعتوں کا عالم کیا ہے۔ اور تم اللہ کے جود و کرم کو بھی شاید اپنے حوصلوں پر قیاس کرتے ہو اس لیے تمہیں تعجب ہوتا ہے کہ اس وسعت کے ساتھ ایک ایک شخص کو کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اور کچھ نہیں تو ذرا غور و فکر کر کے دیکھو کہ خشکی اور تری میں اللہ کی بے شمار مخلوقات ہیں جنہیں اللہ رزق دیتا ہے۔ سمندر میں اتنی بڑی بڑی مچھلیاں ہیں کہ جن کی خوراک کا اندازہ کرنا خشکی پہ رہنے والوں کے لیے ناممکن ہے اور خود جنگلوں میں کتنے بڑے بڑے جانور پائے جاتے ہیں جن کی خوراک کا بظاہر کوئی انتظام نہیں لیکن وہ خوراک کھا رہے ہیں۔ جو ذات ان سب کی خوراک کی کفالت کرتی ہے اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اس وسعت کے ساتھ نوازے۔ اور جہاں تک اس کے جود و کرم کا تعلق ہے آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس کی زمین پہ بسنے والے انسانوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اس کے نام لینے کی روادار نہیں۔ کیمونسٹوں نے سرے سے کائنات میں خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ اسی طرح کتنے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے احکام کی پروا نہیں کرتے۔ کتنے لوگ ہیں جو اس کے ساتھ نہ جانے کس کس کو شریک بنائے بیٹھے ہیں اور کتنے ایسے حکمران ہیں جنہوں نے اللہ کے تخت کے مقابلے میں اپنا تخت سلطنت بچھا رکھا ہے۔ لیکن اللہ سب کو روزی دے رہا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے انکار کرنے والوں کو زیادہ روزی دیتا اور زیادہ وسائل فراہم کرتا ہے تاکہ ان کی فائل اچھی طرح موٹی ہو جائے۔ اگر وہ اپنے جود و کرم میں انسانوں جیسے ظرف کا مالک ہوتا تو کبھی کافر یا مشرک کو کھانا نہ ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قیمت بھی ہوتی تو وہ کافر کو کبھی پانی کا گھونٹ بھی نہ دیتا۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہم بعض دفعہ اللہ کے ظرف کو اپنے ظرف پر قیاس کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اللہ کے انعام و اکرام کے وعدے خالی باتیں ہیں، جن پر کبھی عمل کا موقع نہیں آئے گا۔ اللہ تو خیر خالق ارض و سما اور تمام مخلوقات کا رازق ہے۔ ہم تو انسانوں میں دیکھتے ہیں کہ بعض انسان ایسے حوصلہ مند

Marfat.com

ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی حوصلہ مندی کو سمجھنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ نواب عبدالرحیم خانخاناں جہانگیر کے مصاحبوں میں سے تھے۔ اپنی حوصلہ مندی اور سخاوت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ان کے بعض واقعات نہایت حیران کن ہیں۔ وہ دہلی سے آگرہ جانے کے لیے نکلے' آگرہ دہلی سے پندرہ منزل پر ہے اور ایک منزل کا فاصلہ پندرہ میل ہوتا ہے۔ جب انہوں نے پہلی منزل پر پڑاؤ ڈالا' خیمے لگ گئے' دربار آراستہ ہو گیا تو نواب عصر کے بعد دربار میں اپنی کرسی پر بیٹھا تو سامنے دروازے پر ایک درویش آ کر کھڑا ہوا اور اس نے ایک شعر پڑھا:

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم ویسے تو امیر اور مخیّر آدمی کو کہتے ہیں' لیکن اس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ بادشاہ کی طرف سے نواب خانخاناں کو منعم خان کا خطاب مل چکا تھا۔ اس لیے اس لفظ کی لذت دوگونہ ہو گئی تھی۔ شعر کا معنی یہ ہے کہ ''امیر آدمی پہاڑوں' جنگلوں اور بیابانوں میں بھی اجنبی نہیں ہوتا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے خیمہ لگاتا ہے اور دربار آراستہ کرتا ہے۔'' نواب خانخاناں یہ شعر سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کو ایک لاکھ روپیہ دے دیا جائے۔ درویش کو ایک لاکھ روپیہ ملا تو اس کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اگلی منزل پر نواب نے پڑاؤ ڈالا تو وہ درویش پھر آیا اور اس نے پھر وہی شعر پڑھا۔ نواب نے پھر ایک لاکھ روپیہ دینے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ پانچ چھ دفعہ آیا اور ہر دفعہ اس کو ایک ایک لاکھ روپیہ ملتا رہا۔ آخر اس نے سوچا کہ اتنا بڑا انعام آج تک نہ کسی نے دیا نہ کسی نے لیا۔ ایسا نہ ہو نواب ناراض ہو کر سارا چھین لے۔ بہتر یہ ہے کہ اب نہ جاؤں۔ چنانچہ نواب اپنے معمول کے مطابق دربار میں آ کر بیٹھا اور دیر تک اس درویش کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نہ آیا تو کہنے لگا کہ ''کم ظرف نکلا' نہ جانے کیا گمان کر بیٹھا۔ حالانکہ ہم نے پہلے ہی دن خزانچی کو حکم دے دیا تھا کہ پندرہ لاکھ روپیہ الگ کر کے اس درویش کے لیے رکھ دیا جائے۔'' اندازہ فرمایئے اگر ایک نواب کی حوصلہ مندی کا عالم یہ ہے تو اللہ کے بارے میں یہ سوچنا کہ اتنا بڑا اجر و ثواب وہ کیونکر دے گا؟ یہ بڑی کم ظرفی کی بات ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ''اللہ تو بہت وسعت والا ہے بڑی کشادگی والا ہے۔'' اور مزید فرمایا کہ ''وہ علم والا بھی ہے۔'' یعنی یہ مت سمجھو کہ اسے ان کے اعمال کی خبر نہیں ہو گی۔ یا وہ عمل کرنے والے کے احساسات سے باخبر نہیں۔ فرمایا وہ وسعت والا بھی ہے اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایک شخص کے بارے میں ہر بات سے آگاہ ہے۔ اس کی آگاہی میں کوئی کمی نہیں۔ جب اس کے خزانے بھی بے پناہ ہیں اور اس کا علم بھی لامحدود ہے تو پھر ایک بندہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے انفاق میں کیوں کمی کرے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں نہ دل آزاری کرتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے) (۲۶۲)

Marfat.com

انفاق کرنے والوں کے لیے نمونہ

اس آیتِ کریمہ میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والوں کے لیے ایک نمونہ پیش فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اللہ کے راستے میں اس طرح خرچ کریں کہ ہمیں اس کا زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب ملے تو وہ ان لوگوں کا نمونہ سامنے رکھیں جن کی اللہ نے تعریف فرمائی ہے اور جن کے لیے ایسے اجر و ثواب کی امید دلائی گئی ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں ممکن نہیں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مال اللہ کی ملکیت ہے جو ہمارے پاس امانت ہے۔ مال کا مالک قیامت کے دن ہم سے باز پرس کرے گا کہ تم نے اس مال کو کہاں کہاں خرچ کیا تھا۔ اگر تو ہم نے ایسی جگہ خرچ کیا جہاں اس نے اجازت دی ہے (اور وہ جگہ صرف فی سبیل اللہ ہے) تو امید ہے کہ اللہ کرم فرمائے گا۔ اور اگر ایسی جگہ خرچ کیا جہاں اس نے اجازت نہیں دی مثلاً ہم نے اس کو بے ضرورت یا کسی گناہ کے کام میں یا اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے خرچ کیا یا ایسے لوگوں کو دیا جو لوگوں میں بے حیائی پھیلاتے یا اللہ کے دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ وہ خرچ ہے جو فی سبیل اللہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ ایسا خرچ کرنے سے پروردگار نے منع فرمایا ہے۔ اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ نمونے کے لوگ وہ ہیں کہ وہ جب صحیح مال‘ صحیح جذبے سے صحیح جگہ خرچ کرتے ہیں تو پھر اس کے پیچھے دو حرکتیں نہیں کرتے۔ وہ دو حرکتیں یہ ہیں کہ جس پر وہ خرچ کرتے ہیں کبھی اس پر احسان نہیں جتلاتے‘ کبھی بھول کر بھی اس کے سامنے اپنی نیکی کا ذکر نہیں کرتے‘ برسوں بعد بھی اس کا تذکرہ گناہ سمجھتے ہیں اور نہ وہ یہ حرکت کرتے ہیں کہ اگر وہ اس شخص کے بارے میں محسوس کریں کہ اب چونکہ اس کے مالی حالات اچھے ہو گئے ہیں اس لیے ہمارے پاس آنا جانا اس نے کم کر دیا ہے تو جب بھی اس سے سامنا ہو تو اپنی نیکی کا تذکرہ کرنے کے بعد اس کی عزت نفس مجروح کریں اور لوگوں کے سامنے اسے طعنہ دیں کہ تم وہی ہو نا جو ہمارے پاس فلاں فلاں ضرورت کے لیے آتے تھے‘ اگر ہم تمہاری مدد نہ کرتے تو تم جانتے ہو تمہارا کیا انجام ہوتا۔ کمینے لوگوں کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی پر احسان کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ وہ شخص اب ان کا بندۂ بے دام بن کر رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ وہ جب اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں تو اللہ ہی سے اس کا اجر و ثواب چاہتے ہیں۔ تو اللہ بھی ان کے ساتھ ایسا فیاضانہ معاملہ کرتا ہے اور ان کو ایسے انعامات سے نوازتا ہے جن کا تصور کرنا بھی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے بارے میں پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی کہ جب وہ صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں تو ان کا اجر بھی ان کے رب کے پاس محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس اجر و ثواب کے لیے وہ اسی کے دروازے پر جائیں گے جس کے لیے انہوں نے خرچ کیا ہے‘ کسی اور دروازے پر جانے کی ذلت انہیں نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اور دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ ان کو جو اجر دیا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ انہیں خوف و حزن سے بے نیاز کر دیا جائے گا کہ ”نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“ یعنی نہ انہیں مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ ایسی جگہ جس میں آدمی خوف و حزن سے محفوظ ہو جائے کہ نہ ماضی کے کاموں پر کبھی اسے پچھتانا پڑے اور نہ مستقبل کے اندیشے اور واہمے اسے پریشان کریں‘ ایسی جگہ سوائے جنت کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دنیا میں ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھ کر بھی ان دونوں باتوں کا شکار رہتا ہے اور ایک فقیر جھونپڑے میں رہ کر بھی انہی دونوں احساسات کی گرفت میں رہتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ انہیں جنت عطا فرمائے گا۔ لیکن جنت کی یہ تعبیر ان کے اجر و ثواب کے حوالے سے شاید اس لیے اختیار فرمائی گئی ہے کہ جب انہوں نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا تو ان دونوں احساسات سے بلند ہو کر کیا۔ انہوں نے یہ بالکل پروا نہیں کی کہ میری بھی اولاد ہے‘ میری اپنی بھی ضرورتیں ہیں‘ بچوں کی ضرورتیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھیں گی اور میں جو خرچ کر کے

Marfat.com

اپنی پونجی کے بہت سے حصے سے محروم ہوگیا ہوں اب میرا کیا بنے گا؟ اور نہ ان کو یہ خیال آیا کہ آئندہ چل کر اللہ بہتر جانتا ہے کیسے حالات پیدا ہوں تو بگڑے ہوئے حالات میں میں کس طرح اپنی ضرورتیں پوری کرسکوں گا اور یہی وہ باتیں ہیں جو شیطان خرچ کرنے والے کے دل میں ڈالتا ہے تو اس کا ہاتھ خرچ کرنے سے رک جاتا ہے۔ انہوں نے چونکہ ان دونوں باتوں سے بلند ہو کر اللہ کے راستے میں خرچ کیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اجر و ثواب بھی وہ دیا جس میں انہیں نہ خوف لاحق ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○

(دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے) (۲۶۳)

قرآنِ کریم چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لیے اس میں صرف حسن عمل کی ترغیب اور اس کے طریقے ہی نہیں بتائے گئے بلکہ کسی عمل میں حسن جس نزاکتِ احساس سے پیدا ہوتا ہے اس کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اور ویسے بھی اسلام کا اصل موضوع انسان کی اصلاح ہے اور انسان کی اصلاح اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے دل کی اصلاح نہ ہو۔ اس کے احساسات اور تصورات اس راستے پر نہ چلنے لگیں جن پر اسلام انہیں چلانا چاہتا ہے۔

احساسات کی اصلاح

انسان کی بعض فطری مجبوریاں ہیں جس کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام اصلاحی احکام دیتا ہے۔ ایک مالدار آدمی کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اس کے اندر ایک تفوق کا احساس اور برتری کا پندار ہوتا ہے۔ جب کوئی ضرورتمند سائل بن کر اس کے دروازے پر پہنچتا ہے تو اس کے احساس کو غذا ملتی ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ توانا ہو جاتا ہے۔ اگر تو سائل اس کے احساس کا لحاظ کرتے ہوئے عجز و نیاز کے پورے آداب بجالاتا ہے تو اس کے برتری کے جذبے کو تسکین ملتی ہے تو وہ خوش ہو کر سخاوت کرتا ہے' لیکن اگر لینے والے میں کسی حد تک خودداری کا احساس بھی پایا جاتا ہے کہ وہ سوال کرتا ہے تو خودداری کے ساتھ اور لیتا ہے تو بے نیازی کے ساتھ۔ یہ ادائیں برتری کے احساس کو زخمی کرتی ہیں جس کے نتیجے میں یا تو لینے والے ہاتھ کو جھٹک دیا جاتا ہے یا دیا جاتا ہے تو ناگواری کے ساتھ۔ اور بعض دفعہ چند سخت کلمات بھی زبان سے پھسل جاتے ہیں۔ ان احساسات کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو جب کوئی ضرورتمند آدمی تمہارے دروازے پر سائل بن کر آجائے تو تمہاری زبان سے نکلا ہوا دلداری کا ایک کلمہ اس کے زخموں پر مرہم بن سکتا ہے۔ اس لیے جب اس کی مدد کرو تو نہایت نرمی اور ملائمت سے کرو۔ اور ساتھ اس کو تسلی دو کہ اللہ بڑا کریم ہے وہ ان شاء اللہ تمہارے دن پھیر دے گا۔ اور اگر تم اسے دینا نہیں چاہتے یا دینے کی پوزیشن میں نہیں ہو تو پھر بھی کسی محبت کے کلمہ کے ساتھ اس سے معذرت کرو۔ اس کو قولِ معروف فرمایا گیا۔ اور اگر تم محسوس کرو کہ لینے والے کا رویہ درست نہیں تو تمہیں اس پر برہم ہونے کی بجائے اس سے درگزر کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کئی دروازوں سے وہ ناکام لوٹا ہو اس وجہ سے اس کے اندر تلخی پیدا ہوگئی ہو۔ بعض دفعہ تلخیاں تلخیوں کو جنم دیتی ہیں۔ بھوک آدمی میں بعض دفعہ ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔ اگر ایسی کوئی بات تم محسوس کرو تو درگزر اور مغفرت سے کام لو۔ ایک اچھا بول اور درگزر کا رویہ اس مدد اور صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد دینے والا لینے والے کی دل

Marfat.com

آزاری کرے۔اس سے پہلی آیت میں مَــنّ اور اذٰی یعنی احسان جتلانا اور تکلیف دینا دو باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اب صرف تکلیف دینے کا ذکر فرمایا ہے۔اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ تکلیف دینے سے تو تکلیف ہی ہوتی ہے یعنی کوئی بھی سخت بول اور ناروا بات آدمی کے دل کو چھلنی کر دیتی ہے لیکن جب کوئی آدمی کسی پر احسان جتلاتا ہے تو وہ بھی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔چونکہ دونوں باتوں کا نتیجہ تکلیف ہی ہے اس لیے تکلیف کا ذکر فرمایا اور مَنّ کا ذکر خود بخود اس کے اندر آ گیا۔اس کے بعد پروردگار نے اپنی دو صفتیں بیان فرمائیں کہ اللہ غنی ہے اور حلیم ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ سب سے زیادہ مالدار ہے اور سب سے زیادہ بے نیاز ہے' کائنات میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اس کی تمام مخلوقات اسی کی نیاز مند ہیں۔لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مخلوقات سے کس قدر فیاضانہ سلوک فرماتا ہے۔اسی طرح وہ حلیم بھی ہے کہ بے شمار لوگ اس کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں' اس کے پیغمبروں کی بے ادبیاں کرتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کبھی اس پر انہیں فوری سزا نہیں دیتا۔وہ سب کے ساتھ حلم اور بردباری کا سلوک فرماتا ہے۔تمہیں اگر اللہ نے دولت کا کچھ حصہ عطا فرمایا ہے اور تم معمولی غنی ہو گئے ہو تو دیکھو اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔جس طرح وہ غنی ہو کر بھی حلیم ہے اور کسی کی بھی سرکشی اور گستاخی کا نوٹس نہیں لیتا' ہر ایک کو روزی دے رہا ہے اور سب کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے' اور اس کے خزانے سب کے لیے لٹائے جا رہے ہیں' اس کا سورج سب کو روشنی اور حرارت دیتا ہے' اس کا چاند سب پر اپنی حلاوت کے خزانے بانٹتا ہے' اس کی زمین سب کے لیے غلہ اگاتی اور سب کے قدموں میں بچھی ہوئی ہے' اس کی بارش سب کے صحنوں میں برابر برستی ہے' جس طرح اس کے ماننے والوں کے آنگن میں پھول کھلتے ہیں اسی طرح اس کے انکار کرنے والوں کے باغیچوں میں بھی کھلتے ہیں۔یہ صرف اس لیے ہے کہ وہ ان باتوں سے بے نیاز اور نہایت ہی بردبار ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

(اے ایمان والو! اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کے لیے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ایسے شخص کی تمثیل اس طرح ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو' پھر اس پر زور کا مینہ برسے تو وہ اسے چھوڑ جائے سپاٹ پتھر۔وہ قادر نہیں ہوں گے کسی چیز پر اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا) (۲۶۴)

صَفْوَانٍ ۔ صَلْدًا کا معنی و مفہوم

آیتِ کریمہ میں صَفْوَانٍ اور صَلْدًا کے الفاظ آئے ہیں۔صفوان کے معنی چکنے پتھر یا چکنی چٹان کے ہیں اور صلد کے معنی سخت اور چکنی چیز کے ہیں۔جس زمین میں کچھ نہ اگتا ہو اسے ارضٌ صَلدٌ کہتے ہیں۔اسی طرح جس سر پر بال نہ اگتے ہوں اسے راسٌ صَلدٌ کہتے ہیں۔اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر ضائع مت کرو۔یہ دہرا نقصان

Marfat.com

ہے۔ایک تو یہ ہے کہ آدمی سرے سے اللہ کے راستے میں خیرات نہ کرے۔اسے خیرات نہ کرنے کا گناہ تو ہوگا لیکن اس کا مال تو اس کے پاس محفوظ رہا۔لیکن جو آدمی مال اللہ کے راستے میں دے دیتا اور خیرات کر دیتا ہے لیکن اس کے بعد مَنّ یا اذٰی کے ارتکاب کی وجہ سے مال خرچ کرنے پر اسے کوئی صلہ نہیں ملتا۔ بلکہ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا نام ان لوگوں میں سے خارج کردو جنہوں نے اللہ کے راستے میں صدقات دیے ہیں۔یعنی وہ اپنا مال خرچ کر کے بھی ان لوگوں میں شامل ہوتا ہے جنہوں نے سرے سے خرچ ہی نہیں کیا تو اس سے بڑی اور محرومی کیا ہوگی۔یہ تو وہی بات ہوئی جیسے محاورے میں کہا جاتا ہے ''گھر بھی گنوایا اور بھڑوا بھی کہلایا'' اور پھر اسی پر بس نہیں تمثیل سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے صدقہ کیا ہی نہیں' بلکہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس شخص نے یہ حرکت کر کے نہ صرف صدقہ نہیں کیا بلکہ اس نے ایک جرم کیا ہے۔اس لیے اس کی سزا دوگونہ ہوگی۔ایک صدقہ نہ دینے کی سزا اور ایک اس جرم کی سزا کہ اس نے صدقہ دیکر احسان کیوں جتلایا اور صدقہ لینے والے کی عزت نفس کو مجروح کیوں کیا۔اور یہ جرم اتنا بڑا ہے جیسے اس آدمی کا جرم جو بظاہر اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے' لیکن حقیقت میں وہ اللہ کے لیے نہیں' لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ''شرکِ اصغر'' قرار دیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہ حرکت کر کے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔اور شرک کا گناہ ایسا ہے جسے اللہ کبھی نہیں بخشتا۔مزید فرمایا کہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا گناہ شرک سے بھی بڑا ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت کہ صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلاتا ہے اور تکلیف پہنچاتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ وہ آخرت کے دن کو مانتا ہے۔کیونکہ اگر وہ اللہ پر ایمان رکھتا تو اسے یقین ہوتا کہ میں کسی کی مدد کر کے جب احسان جتلاتا ہوں تو میرا اللہ دیکھتا ہے۔اور وہ آخرت میں یقیناً اس کی باز پرس کرے گا کہ تم نے اگر اللہ کے لیے اور اللہ کے راستے میں خرچ کیا تھا تو پھر تم نے لینے والے پر احسان کیوں جتلایا اور اس کی عزت نفس پر حملے کیوں کیے۔کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ میں سن نہیں رہا یا تمہارا یقین یہ تھا کہ قیامت نہیں آئے گی اور وہاں تمہیں اپنے اعمال کا حساب نہیں دینا پڑے گا۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اندازہ فرمائیے یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ایک تو یہ محرومی کہ اس نے مال خرچ بھی کیا لیکن وہ کالعدم قرار پایا اور پھر اسے ریاکاری قرار دیا گیا اور آخر میں اللہ اور آخرت پر ایمان کو بھی غیر معتبر قرار دیا گیا۔یہ تو ایسے جرائم ہیں جو کسی مومن سے نہیں بلکہ کافر سے سرزد ہوتے ہیں۔اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔اس سے بڑھ کر اور نامرادی کیا ہوگی؟ اب اس تمثیل پر غور فرمائیے جو یہاں ذکر کی گئی ہے۔

تمثیل کی وضاحت

آپ نے اگر پہاڑی علاقے دیکھے ہیں تو اس میں دیکھا ہوگا کہ بعض دفعہ کسی چٹان پر مسلسل مٹی پڑنے سے ایک تہ سی بن جاتی ہے۔دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ شاید زمین کا حصہ ہے۔چنانچہ وہاں رہنے والے اسی غلط فہمی کی بنیاد پر بعض دفعہ اس پر مکان بنا لیتے ہیں یا اس پر کاشت کاری شروع کر دیتے ہیں۔لیکن اس کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب پہاڑوں پر تیز بارش ہو اور پھر وہ ایک سیل کی شکل میں نیچے اترے تو اس کا بہاؤ اتنا شدید اور تیز ہوتا ہے کہ راستے میں آنے والے درخت اکھڑ جاتے ہیں' زمینیں ادھڑ جاتی ہیں اور جب وہ ایسی زمین سے گزرتا ہے تو چٹان پر جمی ہوئی ساری مٹی کو بہا کر لے جاتا ہے۔اگر اس پر کوئی فصل کاشت کی گئی ہے تو وہ بھی ساتھ بہہ جاتی ہے اور اگر اس پر آبادی ہے تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ایسے واقعات اکثر پہاڑی علاقوں میں ہوتے ہیں اور اخبارات میں اس کی اطلاعات بھی چھپتی رہتی ہیں۔اس کو لینڈ سلائیڈ (Land Slide) کہتے ہیں۔اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک کسان ایک ایسی زمین پر فصل اگاتا ہے جس کے

Marfat.com

نیچے سخت اور چکنی چٹان ہے' جب بارش کا ایک زور کا ڈونگڑا اس پر پڑتا ہے تو چٹان کے اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہہ جاتی ہے اور نیچے گنجے سر کی مانند چٹان نکل آتی ہے اور اس طرح اس محروم وبدقسمت کسان کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ یہی حال اس خیرات کرنے والے کی خیرات کا بھی ہے کہ اس نے خیرات کرنے کے بعد احسان جتایا اور دل آزاری کی تو اس نے بھی اپنی خیرات کی فصل ایک ایسی چٹان پر اٹھائی جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جب احسان جتانے اور دل آزاری کرنے کے عمل نے اس پر حملہ کیا تو ساری خیرات جاتی رہی اور یہ محروم دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ناشکروں کو کبھی منزل مراد تک نہیں پہنچاتا۔ یہاں ناشکرے سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ اور اللہ نے جو دولت ان کو عطا کر رکھی ہے اسے یا تو خرچ نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو ''مَنّ واَذٰی'' جیسی حرکتیں انہیں محروم کر دیتی ہیں اور وہ اپنی منزل مراد سے دور ہو جاتے ہیں۔

(ایک اہلِ علم نے اس تمثیل کا مفہوم اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اس نیت اور اس جذبے کی خرابی ہے' جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشوونما پائے' لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپر ہی اوپر ہو اور اس اوپری تہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو تو بارش مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے' مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے اور کچھ نہیں) (تفہیم القرآن)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ ۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

(اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے۔ ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو بلندی پر واقع ہو' اس پر زور کا مینہ برسے تو وہ دو چند پھل لائے۔ پس اگر اس پر بارش نہ برسی تو پھوار بھی کافی ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے) (۲۶۵)

انفاق.....تربیت اور تشکیل کردار کا ذریعہ بھی ہے

گزشتہ مثال ان لوگوں کی تھی جو اللہ کے راستے میں خرچ تو کرتے ہیں لیکن اس کے بعد احسان جتلا کر یا دوسرے طریقوں سے ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی مثال تھی جو اپنے نیک اعمال یا اپنی خیرات اللہ کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھلاوے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیکیوں اور ان کے صدقات کے نتیجے میں اجر وثواب میں سے کوئی چیز ان کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ وہ مال خرچ کر کے بھی اور نیکیوں کی تکلیف اٹھا کر بھی محروم رہتے ہیں۔ اب مثال ان لوگوں کی دی جا رہی ہے جو اللہ کی خوشنودی حاصل

Marfat.com

کرنے اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے اور استحکام لانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ صدقہ اللہ کے یہاں قبولیت کا مقام پائے گا جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بھی عمل کی حقیقی معراج یہ ہے کہ اسے صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر ایک مومن کے سامنے نہ کوئی ہدف ہوسکتا ہے اور نہ اس سے بڑی کوئی خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی گی ہے کہ صدقات اور ہر نیک عمل کا ہدف تو یہی ہونا چاہئے کہ اسے اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے کیونکہ اسی کے نتیجے میں جنت نصیب ہوگی اور آخرت میں ایک مومن سرخرو ہوگا۔ لیکن خود ایک مومن کی تربیت اور اس کے تشکیل کردار کے لیے جس طرح نماز اور روزہ نہایت موثر عامل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ نماز ایک مومن میں اللہ کی وفاداری کے جذبے کو پختہ کرتی۔ اسے بندگی کی حقیقی لذت سے آشنا کرتی اور اس کی زندگی میں ایک نظم وضبط پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اور بہت سے فوائد اور مقاصد ہیں جو نماز سے پورے ہوتے ہیں۔ اسی طرح روزہ مومن کی تربیت کے لیے سب سے زیادہ اثر رکھنے والی عبادت ہے۔ ہر عبادت کی ادائیگی کے وقت ریا اور ظاہر داری کے امکانات باقی رہ جاتے ہیں لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں براہِ راست ظاہری زندگی کے ساتھ ساتھ آدمی کی تنہائیاں بھی عبادت میں شریک ہوتی ہیں۔ آدمی کے باطن کا قدم قدم پر امتحان ہوتا ہے۔ اس عبادت کا اصل ہدف ایک مومن کے باطن کو پاکیزہ بنانا ہے۔ تو جس طرح یہ عبادات تربیت اور تشکیل کردار کے لیے بہت اہم حیثیت رکھتی ہیں اسی طرح سخاوت' فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ بھی جس طرح اللہ کی رضا جوئی کا ذریعہ ہے اسی طرح مومن کی تربیت اور تشکیل کردار کا بھی ذریعہ ہے۔ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انسان کی جو محبوب چیزیں ہیں جنہیں وہ حتیٰ الامکان چھوڑنا نہیں چاہتا ان میں مال و دولت بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ایک مومن جذبے کا اسیر ہو کر اللہ کے راستے میں بڑی سے بڑی خیرات کر دیتا ہے' لیکن پھر مال و دولت کی محبت اس کے دل کو کچوکے لگانے لگتی ہے کہ تم نے یہ کیا غلطی کی۔ جب تمہیں خود ضرورتیں پیش آئیں گی تو کہاں سے پوری کرو گے؟ بعض دفعہ خرچ کرنے والا زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن دل میں وہ اس طرح پریشان ہوتا ہے جیسے کوئی محبوب چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔ دل سے کسی محبوب کی یاد کو کم کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی محبوب کی محبت کو اختیار کیا جائے جسے عقل اور ایمان دونوں تسلیم کریں کہ اصل محبت کے لائق تو یہ ہے' پہلے محبوب سے محبت کر کے ہم نے غلطی کی ہے۔ اور پھر جب اس محبوب کو اس حقیقی محبوب کے لیے بار بار چھوڑا جائے گا تو دل میں حقیقی محبوب کی محبت بڑھتی جائے گی اور پہلے اور مصنوعی محبوب کی محبت کم ہوتی جائے گی۔ مال و دولت کی محبت کو کم کرنے اور دل کو اس کی محبت کے مقابلے میں مضبوط کرنے اور جمانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اسے بار بار اللہ' اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی محبت کی خاطر خرچ کیا جائے۔ جیسے جیسے یہ عمل دہرایا جائے گا ویسے ویسے دل میں توانائی آتی جائے گی۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ جب دولت کو روک کر افسوس ہوگا اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے لطف ولذت اور سکون کا احساس ہوگا۔ اللہ کی خوشنودی کے حصول اور دل کی مضبوطی اور استحکام کے لیے یوں تو کسی وقت بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا مفید اور موثر ہے لیکن اگر یہ خرچ ایسی حالت میں کیا جائے جب کہ قحط کا زمانہ ہو' دینے والا خود ضرورتمند ہو اور ایسے مال میں سے دیا جائے جو نہایت عزیز اور محبوب ہو اور ان عزیزوں کو دیا جائے جن سے تعلقات ناگواری کی حد تک بگڑے ہوئے ہوں تو یہ وہ صدقہ اور انفاق ہے جس سے اللہ کی خوشنودی کے حاصل ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور خرچ کرنے والے کے دل کی مضبوطی اور استحکام کی بھی زیادہ امید کی جاسکتی ہے۔

Marfat.com

تمثیل کی وضاحت

جولوگ ان احساسات کے ساتھ اپنا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک بلند اور ہموار جگہ پر ایک باغ ہو اور پھر اس پر موسلا دھار بارش برسے۔ چونکہ یہ باغ بلند جگہ پر ہے تو اسے بارش کی تیزی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ تیزی سے پانی آئے گا اور اس کے دائیں بائیں بہتا ہوا نکل جائے گا۔ البتہ تیز بارش اس کے ایک ایک پھل دار پودے کی جڑوں تک سرایت کر جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پہلے سے دوگنا پھل لائے گا۔ اور اگر اس پر زور کی بارش نہیں ہوتی صرف ہلکی پھوار پڑتی ہے (''طلّ'' پھوار کو بھی کہتے ہیں اور شبنم کو بھی۔ بات ایک ہی ہے) تو معمولی سی تراوت بھی اس کی شادابی کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ نشیبی جگہوں میں باغات تیز بارش اور پہاڑوں سے اترنے والے سیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نتیجتاً باغ کے اکثر پودے جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور باغ ویران ہو جاتا ہے۔ اور اگر زور کی بارش نہ آئے معمولی پھوار برسے تو اس کا اثر نشیب یا عام کھلی زمین کے باغوں پر اتنا نہیں پہنچتا کہ وہ پھل لانے کے قابل ہو سکیں۔ اس لیے اس مثال میں ''ربوہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بلند اور ہموار جگہ کو کہتے ہیں۔ جولوگ اللہ کے راستے میں محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صدقہ دیتے ہیں وہ ایک ایسا باغ لگاتے ہیں جو ایک ہموار اور بلند جگہ پر ہو۔ یعنی جس طرح بلند جگہ کا باغ ہر حال میں پھل لاتا ہے اسی طرح ان کے صدقات اور خیرات بھی ہر حال میں اللہ کی رضا کا ذریعہ بنیں گے اور اللہ انہیں برگ و بار دے گا۔

آخر میں تسکین اور تسلی کے لیے فرمایا وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے) یعنی اللہ کے نیک بندے اللہ کی رضا کے حصول اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے جس طرح صدقات دیتے اور خیرات کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ اس سے بے خبر ہے' وہ صدقے کے ایک ایک دانے سے باخبر ہے اور دلوں کے احساسات کو بھی خوب جانتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے نیک بندوں کو ان کے جذبۂ خیر پر زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب سے نوازے گا اور ان کی محنت اور ایثار کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ ۙ لَہٗ فِیْہَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَہَآ اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۝

کیا پسند کرے گا تم میں سے کوئی کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس کے لیے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں۔ اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے بھی ابھی کمزور ہوں۔ پس پھر جائے اس باغ پر سموم کا بگولا اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو (۲۶۶)

گزشتہ سے پیوستہ آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی تمثیل فرمائی گئی ہے جو ریاکاری' احسان داری اور ایذاءرسانی جیسی آفتوں سے اپنے انفاق کو برباد کر دیتے ہیں۔ یہ تمثیل اس کی مزید وضاحت بھی ہے اور نصیحت کو مزید موثر کرنے کا ایک ذریعہ بھی۔ پہلی مثال میں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چند آفات ہیں جن کے نتیجے میں تمہارے اعمال باطل ہو سکتے ہیں۔ اور اسی کو مزید موثر بنانے کے لیے ایک ایسی مثال دی جا

Marfat.com

رہی ہے جس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمہیں اپنے اعمال کے باطل ہونے اور اپنا گھر اجڑ جانے کا اس وقت پتہ چلے گا جب کہ تمہارے پاس کسی نئے عمل کو کرنے کا وقت نہیں ہوگا اور از سر نو گھر کی آبادی کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔ اس مثال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اس مثال میں استعمال ہونے والے چند الفاظ کو سمجھ لیا جائے۔

اس مثال میں باغ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور یہ وہ نقشہ ہے جو عرب کے تصور کے مطابق کسی بھی بہترین باغ کی تصویر ہو سکتی ہے۔ اس کی نسبتاً زیادہ وضاحت قرآنِ کریم نے دوسری جگہ فرمائی ہے۔ اسے اگر ساتھ ملا لیا جائے تو عرب کے پسندیدہ باغ کی پوری تصویر نظروں میں آ جاتی ہے۔ ارشاد ہے **جعلنا لاحدهما جنتين من اعناب وحففناهما بنخل وجعلنا بينهما زرعاً ○ كلتا الجنتين اتت اكلها ولم تظلم منه شيئا وفجرنا خلالهما نهرا ○** (۳۲۔۳۳ کہف) (ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے اور ان کو گھیر لیا کھجوروں سے اور ان کے درمیان کھیتی بھی رکھی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے ذرا کمی نہ کی اور ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا پسندیدہ باغ وہ ہوتا تھا کہ اس کے کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں۔ بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں۔ مناسب فاصلے پر مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں' باغ بلندی پر ہو' اس کے نیچے نہر بہہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔ اس طرح کے باغ کو عرب میں سب سے پسندیدہ باغ اس لیے سمجھا جاتا تھا کہ باغ کے کناروں پر کھجوروں کے درخت گرمی' لو' تیز ہوا اور آفتاب کی تمازت کو بھی روکتے تھے اور پھل بھی دیتے تھے۔ اور باغ کی رونق اور خوبصورتی میں اضافہ بھی کرتے تھے۔ بیچ میں انگور اور دوسرے پھلدار درخت لگائے جاتے تھے جو پھل بھی دیتے تھے اور گھنا سایہ بھی مہیا کرتے تھے۔ اور مناسب فاصلے پر مختلف فصلیں لگائی جاتی تھیں تاکہ ان سے غلہ اور سبزیاں حاصل کی جائیں' کیونکہ ثمرات سے مراد صرف پھل ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی پیداوار کو اور غلہ جات پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اعصار کا مفہوم

اعصارؔ کا معنی ہے بگولہ۔ ''فیہ نار'' کا لفظی معنی تو ہے (اس میں آگ) یعنی ایک ایسا بگولہ جس میں آگ ہو' لیکن مراد اس سے یہ نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا بگولہ جس میں سموم ہو اور تپش ہو۔ پہلے تو یہ عرب کے صحراؤں کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا لیکن اب تو ایسے بگولے جن میں سموم اور بعض میں بجلیاں تک ہوتی ہیں ہر ملک میں متعارف ہیں۔ جب کہیں بدقسمتی سے کسی آبادی' باغ یا لہلہاتے کھیتوں پر یہ بگولہ گزر جاتا ہے تو ہر چیز کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔

تمثیل کی وضاحت

الفاظ کو سمجھنے کے بعد اب اس تمثیل کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔ یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جس نے انگوروں' کھجوروں اور ہر طرح کے پھلدار پودوں کا ایک خوبصورت باغ لگایا۔ اس کے پھلوں کے رسیلے پن اور باغ کی خوبصورتی اور اس کی سایوں کے گھنے ہونے کے تذکرے لوگوں کی زبانوں پر رہتے تھے۔ اس کے اندر مختلف اجناس کی فصلیں بھی تھیں' بیچ میں ایک نہر جاری تھی جو پورے باغ کی سیرابی اور اس کے موسم کو خوشگوار رکھنے کی ضمانت تھی۔ مالک اس کا بوڑھا ہو چکا تھا اور بچے اس کے چھوٹے چھوٹے تھے جو ابھی کام کرنے کے قابل نہیں

Marfat.com

تھے۔لیکن مالک اپنے باغ کی آمدنی پر نازاں وفرحاں تھا۔ بچوں کے بارے میں بھی اسے کوئی تردد نہ تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اب میرا بڑھاپا آسودگی سے گزرے گا اور اس کی آمدنی میرے بعد میرے بچوں کی گزر بسر کے لیے کافی ہوگی۔ اچانک ایک دن سموم کا ایک بگولہ اس باغ پر گزرا اور وہ سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔ اب اس بوڑھے مالک کی پریشانی اور محرومی کا اندازہ کیجئے۔ وہ خود اس قابل نہیں کہ از سر نو محنت کرے اور باغ لگا دے۔ اس کی ہڈیوں میں گودہ تک باقی نہیں رہا اور بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ محنت کر سکتے ہیں اور نہ پریشانیوں کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ اس بوڑھے کی پریشانی اور محرومی کا اب کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس حادثے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ یہ بوڑھا دنیا کا سب سے ناکام اور پریشان حال آدمی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس بات کا کسی نہ کسی حد تک امکان ضرور ہے کہ اس کی برادری کے لوگ اس کے کام آئیں یا کسی غیر میں انسانی ہمدردی جاگ اٹھے اور وہ اس کی پریشانیوں میں اس کا ہاتھ بٹائے' لیکن اس شخص کی پریشانی کا کون مداوا کر سکتا ہے جس نے زندگی بھر اپنے تئیں نیکیوں کا باغ لگایا' اس میں قسم قسم کے اعمال کے پودے لگائے' لیکن قیامت کے دن جب اس کا نامہ عمل سامنے آیا تو اس نے دیکھا کہ میں عجیب بدنصیب تھا کہ ایک طرف تو میں صدقات اور اعمالِ خیر کا باغ لگا تا رہا اور دوسری طرف آتشِ خرمن سوز کو دعوت دیتا رہا۔ یعنی ریاکاری' احسان داری اور ایذاءرسانی جیسی آفتوں سے اپنی نیکیوں کے باغ کی کبھی حفاظت نہ کی۔ بلکہ یہ آفتیں بھی میں خود اپنے ہاتھوں سے پالتا رہا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ بجلیاں میری آستینوں میں چھپی رہیں۔ بالآخر انہوں نے اپنا کام کر دکھایا اور میرا تمام باغ جلا کر راکھ کر دیا۔ زندگی کا وقت گزر گیا' مہلت عمل ختم ہوگئی' آج یہاں کوئی کسی کا مددگار نہیں' ہر ایک اپنی فکر میں ہے' ایسے حال میں میرا باغ جل چکا ہے جبکہ میرے پاس اس کی تلافی کی کوئی شکل نہیں۔ اندازہ فرمائیے اس کی پریشانیوں کا عالم کیا ہوگا؟ یہ وہ بات ہے جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر تم اس حادثہ فاجعہ سے قیامت کے دن دوچار نہیں ہوتا تو آج اپنے انفاق کو برباد کرنے والی ان آفتوں سے بچانے کی تدبیر کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۗ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ○

(اے ایمان والو! خرچ کرو اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال سے اور ان چیزوں سے جنہیں ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ارادہ بھی نہ کرو اپنی کمائی میں سے ردی چیز کا کہ تم اسے خرچ کرو اور تم خود اس چیز کو لینے والے نہیں ہو بجز اس کے کہ تم آنکھیں میچ لو اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی اور ستودہ صفات ہے) (۲۶۷)

ربطِ کلام

گزشتہ رکوع میں اللہ کے راستے میں انفاق کی ترغیب دی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ جو مال اللہ کے راستے میں خرچ کیا جاتا ہے اللہ اس میں کس قدر اضافہ فرماتا ہے۔ اسے مثالوں سے واضح کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ انفاق سے ان لوگوں کو تو فائدہ پہنچتا ہی ہے جن پر وہ مال خرچ کیا جاتا ہے اور اس مقصد کو بھی فروغ ملتا ہے جس مقصد کے لیے یہ مال صرف کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دلوں کی اصلاح اور مال و

Marfat.com

دولت کی محبت کے مقابلے میں ان کے استحکام اور مضبوطی کے حوالے سے جو کردار جنم لیتا ہے وہ بجائے خود مسلمانوں کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اور پھر اس انفاق کے جذبے کو سرد کرنے اور عمل انفاق کو باطل اور ضائع کرنے میں جو آفات اپنا کام دکھاتی ہیں پھر ان کا ذکر فرمایا گیا تاکہ مسلمان اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہوئے ایسی تمام بداعمالیوں سے بچیں جن کی وجہ سے ان کا سارا کیا دھرا تباہ ہو کر رہ جائے گا اور پھر اسے مثالوں سے واضح فرمایا۔ پیش نظر رکوع میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے قابل کون سی چیزیں ہیں' ہر چیز اس کے راستے میں خرچ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اگر ایسی چیز خرچ کی جائے جو خرچ کے لائق نہیں تو نہ تو اسے انفاق فی سبیل اللہ کہا جائے گا کہ جس پر اللہ کی جانب سے اجر و ثواب ملتا ہے اور نہ وہ نفس کے جمانے اور اس کے استحکام میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر خرچ کے کچھ آداب بھی سکھائے گئے ہیں۔ اور یہ بات بھی انگلی رکھ کر بتا دی گئی ہے کہ خرچ کرنے کی جگہیں کون سی ہیں۔

طیبات کا مفہوم

پیش نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اگر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چاہتے ہو تو وہ کیا چیزیں ہیں جنہیں تمہیں خرچ کرنا چاہئے اور وہ اللہ کے یہاں قبولیت کا مقام بھی پا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ مسلمانو تم نے اپنی محنت سے جو کمائی کی ہے اور جسے تم نے پسینہ بہا کر وقت صرف کر کے اور مشقت اٹھا کر کمایا ہے سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ کمانے کے طریقے تم نے کیا اختیار کیے ہیں؟ کیونکہ صرف کمانے کی محنت اور مشقت کسی چیز کو حلال نہیں بنا دیتی۔ بلکہ کسی چیز کے حلال ہونے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو چیز آپ نے محنت سے حاصل کی ہے اسے آپ نے حلال ذریعہ سے حاصل کیا ہے یا حرام ذریعہ سے۔ اور پھر وہ چیز بجائے خود حلال بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ کسی بھی چیز کا محنت سے حاصل کرنا اس کے حلال ہونے کے لیے ضمانت نہیں ہے۔ ڈاکہ ڈالنے والا اور سمگلنگ کرنے والا محنت اور مشقت بھی کرتا ہے' تکلیف بھی اٹھاتا ہے اور خطرات سے بھی کھیلتا ہے اور بعض دفعہ اس راستے میں جان بھی چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ ساری تگ و دو، محنت اور مشقت اس کی حاصل کردہ چیز کو حلال نہیں بناتی۔ اللہ نے جن جن طریقوں سے مال کمانے سے منع فرمایا ہے ان ممنوع ذرائع اور طریقوں سے جو مال بھی کمایا جائے گا وہ حرام ہوگا۔ رشوت' غبن' سود' قمار' سٹہ' ذخیرہ اندوزی اور کالا دھن یہ سب حرام ذرائع ہیں۔ ایسے ذریعوں سے حاصل ہونے والی کمائی یقیناً حرام ہے۔ اس کمائی میں سے کچھ بھی اللہ کے راستے میں دینا نہ صرف یہ کہ قابل قبول نہیں بلکہ انتہائی گناہ کی بات ہے۔ کیونکہ جو شخص حرام ذریعے سے ایک چیز حاصل کرتا ہے اور پھر وہی چیز اللہ کے راستے میں دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ اللہ نے جن ذریعوں کو حرام کیا ہے میں نے انہی سے یہ مال کمایا اور پھر اسی مال کو حرام کرنے والے کے راستے میں دے کر میں اس کا منہ چڑا رہا ہوں کہ دیکھ تیرے احکام کی میری نزدیک ذرہ برابر قدر و قیمت نہیں۔ تو نے روکا' میں نے رکنے سے انکار کر دیا۔ تو نے کہا میرے راستے میں حلال خرچ کرو میں نے وہی حرام تمہارے راستے میں دے مارا۔ یہ ایک طرح کا چیلنج ہے کہ بتا تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے اور ایک طرح سے توہین کرنا ہے کہ مجھے تیری کسی ہدایت کی پرواہ نہیں۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ اپنی کمائی میں سے طیبات یعنی پاکیزہ چیزیں اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ یعنی وہ چیزیں جنہیں تم نے حلال اور پاکیزہ طریقوں سے کمایا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تم نے اگر کوئی چیز حلال ذریعے سے کمائی ہے لیکن وہ چیز بجائے خود حرام ہے تو حلال ذریعے سے کمانا اسے طیب نہیں بنا دیتا۔ تجارت ایک حلال ذریعہ

Marfat.com

ہے۔ لیکن کوئی شخص کتوں اور خنزیروں کی تجارت کرتا ہے اور پھر کتے اللہ کے راستے میں دینا چاہتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اسلامی اصولوں کے مطابق تجارت کی اور اس کے نتیجے میں یہ جانور حاصل کیے ہیں۔ حقیقت یہ کہ یہ جانور چونکہ بجائے خود حرام ہیں انہیں کسی طرح بھی حاصل کرنا' ان کی خرید وفروخت اور اللہ کے راستے میں دینا سبھی حرام۔ اسی پر آپ باقی مثالوں کو قیاس کر لیجیے۔

طیبات کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ طیب جس طرح پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں اسی طرح پسندیدہ چیز کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں طیبات کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ کے راستے میں جو مال یا جو چیز بھی دو اسے بجائے خود عمدہ اور اچھا اور پسندیدہ ہونا چاہیے۔ اگر ایک چیز اس قدر بے وقعت' گھٹیا اور نکمی ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تو وہ طیبات میں شامل نہیں۔ ایسی چیز کو اللہ کے راستے میں دینا بھی گناہ ہے۔ اس کی مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی طرح کی چیز اگر تمہیں دی جائے تو تم اسے لینا کبھی پسند نہ کرو۔ اور اگر تمہیں لینے پر مجبور کیا جائے اور یا تمہاری ضرورت اس قدر شدید ہو کہ اسے قبول کیے بغیر چارہ نہ ہو تو تب بھی تم اسے آمادگی سے قبول نہیں کرو گے بلکہ تمہارا حال یہ ہو گا کہ ہاتھ اسے لینے کے لیے بڑھے گا لیکن آنکھیں اسے دیکھنا گوارا نہیں کریں گی۔ جب تمہارا اپنا رویہ کسی چیز کے بارے میں ایسا ہو تو ذرا سوچو کہ جس اللہ نے تمہیں سب کچھ عطا کیا ہے اور جو تم اس کے راستے میں دیتے ہو وہ بھی اسی کا عطا کردہ ہے' تو کیا اس کریم اور غنی ذات کو ایسی گندی اور خبیث چیز دینا چاہتے ہو' فرمایا اسے دینا تو دور کی بات ہے اسے دینے کا خیال تک نہ کرو۔ ایسا خیال اور ایسا ارادہ بھی بجائے خود گناہ ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی ہر معاشرے میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ عمدہ چیزیں ضرورت مندوں کی ضرورت کے لیے کفائت نہیں کرتیں۔ مثلاً سیلاب آ گیا ہے' مکان بہہ گئے' سامان پانی کی نذر ہو گیا' لوگ بڑی مشکل سے جانیں بچا کر خشک اور بلند جگہ پر پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ اب ان کی ضروریات ہر طرح کی ہیں۔ انہیں اشیائے خورد ونوش بھی چاہئیں' لباس بھی چاہیے' گھروں کی دوبارہ بحالی کا سامان بھی چاہیے' بسا اوقات حکومت اور گردو نواح کے لوگ ان کی ضرورتیں پوری کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ایسی کسی مصیبت کے وقت ہر طرح کی چیزوں کا دینا چاہے وہ ردی ہی سمجھی جائیں قابل قبول ہو سکتا ہے۔ جو لوگ باہر سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں انہیں جیسا بھی لحاف مل جائے ان کے لیے قابل قبول ہے۔ جو تن سے ننگے ہیں انہیں جیسے بھی کپڑے میسر آ جائیں چاہے وہ پرانے' پھٹے ہوئے بھی کیوں نہ ہوں ان کے لیے غنیمت ہیں۔ اس لیے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا فیصلہ حالات اور مواقع کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اضافی امر ہے جس کے بارے میں ایک متعین بات کہنا مشکل ہے۔

طیبات کو اس آیتِ کریمہ میں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ طیبات یعنی پاکیزہ مال و دولت اور نعمتیں ہیں جنہیں آدمی تجارت' صنعت' اور مزدوری سے کماتا ہے اور دوسری وہ ہیں جو زراعت کے نتیجے میں زمین سے اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں۔ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرمایا۔ اس لیے کہ زکوۃ دینے کی صورت میں دونوں کے احکام جدا جدا ہیں۔ مال و دولت کا اپنا نصاب ہے اور زرعی پیداوار کا اپنا نصاب۔ پھر مال و دولت کے نصاب پر سال گزرنے کے بعد زکوۃ فرض ہوتی ہے' لیکن زرعی پیداوار پر فصل کٹتے ہی زکوۃ یعنی عشر فرض ہو جاتا ہے۔ اور مزید یہ کہ ہر طرح کے مال تجارت اور مال و دولت پر زکوۃ فرض ہے۔ لیکن زمین کی ہر طرح کی پیداوار پر زکوۃ فرض نہیں ہوتی۔ اسی طرح صدقات نافلہ میں بھی دونوں کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ اس اختلاف کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پروردگار نے دونوں کو الگ الگ ذکر

Marfat.com

فرمایا۔ اور ہدایت دونوں کے بارے میں ایک ہی ارشاد فرمائی کہ جو بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو اسے طیب ہونا چاہئے۔ خبیث چیز کا دینا خواہ اس کا تعلق کسی بھی کمائی سے ہو یہ ایک ایسی جسارت ہے جو بجائے خود گناہ بھی ہے اور گناہ کا باعث بھی۔

غَنِیٌّ حَمِیْدٌ کا مفہوم

آیت کے آخر میں فرمایا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اللہ تعالیٰ غنی بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ تمہیں انفاق کا حکم دیتا ہے یا تم سے قرض مانگتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمہارا محتاج ہے' اس کی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں تو دست سوال تمہاری طرف بڑھاتا ہے۔ وہ تو غنی ہے' مالدار ہے' بے نیاز ہے' اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور ساتھ ہی وہ حمید بھی ہے ہر طرح کی حمد و تعریف کا سزاوار اور ہر خیر اور جود کا سرچشمہ اور ہر بھلائی کا منبع' ساری دنیا اس سے زندگی اور رزق کا فیض پا رہی ہے۔ ہر مخلوق کی بقا اس کی عنایت اور مہربانی سے ہے۔ وہ تمہیں خرچ کرنے کا حکم اس لیے دیتا ہے تا کہ اس سے خود تمہارے اندر ایک مستحکم کردار پیدا ہو۔ تمہارے اندر استغنا اور بے نیازی کی صفات جنم لیں۔ تمہیں اتنا سیر چشم اور بندۂ مولیٰ صفات بنا دیا جائے کہ مال و دولت کی محبت تم میں کوئی کمزوری پیدا نہ کر سکے۔ اور دنیا کا بڑے سے بڑا لالچ تمہاری استقامت میں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔ اور دوسری یہ بات کہ تمہارے خوشحال لوگوں کے انفاق سے فقراء کی ضرورتیں پوری ہوں اور اعلائے کلمۃ الحق کی یہ تحریک اپنی مالی ضرورتیں پوری کر سکے۔ اور ان تمام باتوں کا فائدہ بالآخر تمہیں پہنچے گا' جو فقیر لوگ ہیں وہ بھی تمہاری برادری کے اور تمہارے بھائی بند ہیں۔ اور جس فکری قافلے کے تم فرد ہو اس کی کامیابیاں بالآخر تمہاری کامیابیاں ہیں۔ اس لحاظ سے انفاق فی سبیل اللہ کی ضرورت تمہیں ہے۔ اس لیے تمہیں اس کا حکم دیا جا رہا ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے۔ اور جسے حکمت عطا کی گئی یقیناً اسے خیر کثیر دے دی گئی۔ اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر عقل والے) (۲۶۸ تا ۲۶۹)

انفاق کے موانع

اس آیتِ کریمہ میں ان موانع اور رکاوٹوں کا ذکر ہے جن کے ذریعے شیطان انفاق فی سبیل اللہ سے روکتا ہے۔ اس میں نہایت بصیرت افروز باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

Marfat.com

فقر کا خوف اور بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہونا

پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جب کوئی شخص اعلائے کلمتہ الحق جہاد فی سبیل اللہ‘ دینی مراکز کی مدد اور اعانت‘ بھلائی اور خیر کے فروغ‘ خلق خدا کی خدمت اور ضرورت مندوں کی اعانت کے لیے خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان وسوسوں کے ذریعے اسے اس مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ ابھی تو تمہاری اولاد چھوٹی ہے‘ تمہارے مصارف کم ہیں‘ بچے جب بڑے ہوں گے تو ان کے اخراجات بھی بڑھیں گے‘ اسکول کے بعد کالج‘ کالج کے بعد یونیورسٹی پھر ہو سکے تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا پڑے گا۔ آج اگر تم نے ہاتھ روک کے نہ رکھا اور جو ذاتی ضروریات سے بچا اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر ڈالا تو پھر یہ اخراجات جو سامنے نظر آرہے ہیں انہیں کہاں سے پورا کرو گے۔ مکان تمہارا سرکاری ہے یا تم کرائے کے مکان میں رہتے ہو‘ جب تک نوکری یا کاروبار ہے تو شاید تمہیں محسوس نہ ہو لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد کرائے کے مکان میں کیسے رہ سکو گے۔ تمہیں اپنی چھت کی ضرورت ہے۔ اگر تم نے ابھی سے اس کی فکر نہ کی تو مکان بنانا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں۔ اس کے لیے زرِ کثیر چاہیے۔ تمہارا خرچ کرنے کا یہی جذبہ تمہارے پاس کچھ نہیں چھوڑے گا۔ بتاؤ بڑھاپے میں کیا کرو گے؟ اس طرح کے وسوسے اور اندیشے آدمی کا ہاتھ روک لیتے ہیں اور وہ تصور ہی میں پریشان ہونے لگتا ہے کہ واقعی آج اگر میں نے کچھ بچا کے نہ رکھا تو پھر کیا بنے گا؟ شیطان کا یہ وہ حربہ ہے جو بڑی آسانی سے ہر ایک پر آزماتا ہے اور ہمیشہ انسان کو آنے والے دنوں میں فکر اور تنگدستی کے اندیشے سے پریشان رکھتا ہے۔ اور جو شخص ان اندیشوں میں ڈوب جاتا ہے وہ ساری عمر اس گائے کی طرح زندگی گزارتا ہے جو روزانہ چراگاہ میں گھاس چرنے کے لیے جاتی‘ سبز سبز گھاس چرتی جاتی اور ساتھ ساتھ یہ سوچ کے پریشان بھی ہوتی جاتی کہ آج تو مجھے یہ سرسبز گھاس کھانے کو مل گئی کل کو کیا ہوگا؟ یہ کل کا اندیشہ اسے ساری عمر پریشان رکھتا ہے۔ وہ ایک دن بھی خالی پیٹ چراگاہ سے واپس نہیں آئی‘ لیکن ایک دن کے لیے بھی پریشانیوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہر شخص کو شیطان ایسی گائے بنا کے رکھتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پھر وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ چلیے یہ شخص اگر اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا اور میں اسے خرچ کرنے نہیں دیتا تو پھر اس کا مال محفوظ رہے‘ اس کے بچوں کے کام آئے‘ اس کے بڑھاپے میں اس کے لیے سہارا بنے اور یہ شخص ایک آسودہ زندگی گزارے جس میں مستقبل کا کوئی خوف اسے پریشان نہ کرے۔ لیکن شیطان کو یہ بھی گوارا نہیں۔ وہ تو انسان بلکہ مسلمان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔ انسانوں کے جد امجد کو سجدہ نہ کرنے کے باعث جب اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا تو اس نے اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی‘ مہلت ملنے پر اس نے نہایت بے باکی سے چیلنج دیا کہ میں اولادِ آدم کو ایمان و عمل کی زندگی نہیں گزارنے دوں گا۔ ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہوں گا اور پروردگار سے کہا کہ میں تیرے بندوں کی اکثریت کو تیرا شکر گزار نہیں رہنے دوں گا۔ اس طرح اس نے اپنی دشمنی پہلے دن ہی ظاہر کر دی اور پھر اس نے اسے کبھی چھپا کے نہیں رکھا۔ اس لیے جب وہ کسی شخص کے دل میں مستقبل میں فقر کے وسوسے ڈالتا ہے تو مقصد اس شخص کے ساتھ بھلائی کرنا نہیں ہوتا بلکہ اسے ان سعادتوں سے محروم رکھنا ہے جو خرچ کرنے کے نتیجے میں نصیب ہوتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو اس استحکام سے عاری رکھنا ہے جو مسلمان معاشرے کے افراد کی سخاوت و فیاضی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے اور مسلمان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے روک دیتا ہے تو اب اس کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں اس شخص کو ایسے کاموں میں لگاؤں جس سے اس کے مال کے ضائع ہونے کے امکانات روز بروز بڑھتے چلے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مال

Marfat.com

برباد ہو جائے گا تو اب اللہ کے راستے میں اس مال کے خرچ ہونے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔اور دوسرا یہ کہ جب یہ شخص بری صحبتوں میں برے اعمال کے ارتکاب کا عادی ہو جائے گا تو پھر اس کی سوچ اور اس کا مزاج اسے کبھی یہ سوچنے کی مہلت بھی نہیں دے گا کہ فی سبیل اللہ بھی کوئی چیز ہے اور خرچ کرنا بھی کوئی سعادت ہے۔ چنانچہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے روک کر فوراً وہ اس شخص کو فحشاء کی طرف موڑ دیتا ہے۔ فحشاء کھلی ہوئی بے حیائیوں اور بدکاریوں کو کہتے ہیں۔قرآنِ کریم نے اس لفظ کو زنا' لواطت اور عریانی جیسے بڑے بڑے جرائم کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نیک آدمی کو شروع میں طریقے طریقے سے غلط صحبت کا عادی بناتا ہے' چار یاری اسے عزیز ہونے لگتی ہے گھر سے نفرت اور عیاش دوستوں کی صحبت پسندیدہ ہو جاتی ہے' پھر ان عیاش دوستوں کی صحبت آہستہ آہستہ شراب نوشی تک لے جاتی ہے۔شراب نوشی ایسی ام الامراض ہے جس سے تمام بے حیائیاں پھوٹتی ہیں۔جب کسی مجلس میں اس کا چلن ہو جاتا ہے پھر وہاں بدکاری کا آ جانا ایک لازمی سے بات ہے۔شراب اور عورت جڑواں بیماریاں سمجھی جاتی ہیں پھر قحبہ خانوں میں آنا جانا اس بازار کے پھیرے اور آئے دن نفس امارہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئی نئی صحبتوں اور نئے نئے مشاغل کی تلاش ایک محبوب عمل بن جاتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گنج قارون بھی ہو تو وہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔اس طرح کے مشاغل اور اس طرح کی عیاشیاں دنوں میں خوشحال آدمی کو قلاش بنا دیتی ہیں۔شیطان نے جس شخص کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے اس لیے روکا کہ کہیں وہ فقر کی نذر نہ ہو جائے اسے وہ دنوں میں غلط صحبتوں' غلط مشاغل اور غلط ذوق میں مبتلا کر کے واقعی فقیر کر کے رکھ دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے زندگی کی دونوں تصویریں سامنے رکھ دی ہیں۔ایک تصویر اس مردِ مومن کی ہے جو کماتا ہے تاکہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرے اور جو بچ جائے اسے ملک وملت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے صرف کرے اور اللہ پر بھروسہ رکھے کہ جس نے آج دیا ہے وہ کل بھی دے گا اور دوسری تصویر اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے راستے میں اس اندیشے کی وجہ سے خرچ کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نادار نہیں ہونا چاہتا' میری اپنی آنے والی ضرورتیں کیسے پوری ہوں گی' لیکن شیطان نے اسے ان مشاغل میں الجھا دیا اور فسق و فجور میں اس طرح مبتلا کیا کہ دنوں میں اس کی خوشحالی قصہ ماضی بن گئی۔شراب اور بدکاری کی عادتیں ایسی طبیعت ثانیہ بنیں کہ انہیں حاصل کیے بغیر چین کا ایک لمحہ بھی مشکل ہو گیا۔اور جب کمائی کے جائز ذرائع ختم ہوئے تو مجبوراً ناجائز ذرائع پر ہاتھ مارا۔کبھی قانون کی گرفت میں آیا' کبھی معاشرے میں گالی بن کر رہ گیا اور اگر احساس مرا نہیں تو خودکشی کی نذر ہو گیا۔زندگی کی یہ دو تصویریں فرضی نہیں' اپنے دائیں بائیں دیکھی جا سکتی ہیں۔اخباروں میں روز یہ کہانیاں چھپتی ہیں۔ہر خاندان میں یہ افسانے زندہ حقیقتوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں اور اگر اس پر ایک اور حقیقت کا اضافہ کر دیا جائے تو شاید اسے سمجھنا آسان ہو جائے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ واقعی اس کے رزق میں اضافہ کرتا ہے۔ہم نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے ہاتھ نہ روکا ہو اور اللہ نے اسے دینے سے میں ہاتھ روک لیا ہو۔وہ اسے یکسوئی اور غنا کی دولت عطا فرماتا ہے' اچھی شہرت دیتا ہے' عزت سے نوازتا ہے اور صالح اولاد کی صورت میں اسے بڑھاپے کی وہ سہولتیں عطا فرماتا ہے جو مال و دولت سے کبھی حاصل نہیں کی جا سکتیں۔لیکن جو شخص مال و دولت کو سینت سینت کے رکھتا ہے وہ بری صحبتوں میں نہ بھی پڑے تو اس کی ناخلف اولاد اس کی زندگی ہی میں دولت اڑا دیتی ہے۔اور ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ باپ یہ دیکھ کر کہ میرے بچے آوارہ ہیں ان میں دولت تقسیم نہیں کرتا تو بچے باپ کو مروا دیتے ہیں یا ذہنی مریض بنا کر پاگل خانے میں داخل کروا دیتے ہیں اور اس کے بعد آپس میں دولت تقسیم کر کے دنوں میں اڑا دیتے ہیں۔

Marfat.com

یأمرکم بالفحشاء کا مفہوم

یأمرکم بالفحشاء اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ شیطان تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان انہیں کیسے حکم دے سکتا ہے؟ وہ ہمیں نظر نہیں آتا' ہم اس کی آواز نہیں سنتے تو پھر حکم دینے کا کیا مطلب؟ اس سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ''یأمرکم'' کا معنی ہمیشہ حکم دینا ہی نہیں ہوتا' بلکہ جب ''ب'' کے ساتھ اس کا صلہ آتا ہے تو عموماً اس کا ترجمہ ہوتا ہے ''وہ تمہیں مشورہ دیتا ہے' وہ تمہیں سجھاتا ہے' وہ تمہارے دل میں یہ بات ڈالتا ہے'' اور دل میں بات ڈالنا جسے وسوسہ اندازی کہتے ہیں' یہ وہ چیز ہے جس کی اللہ نے شیطان کو صلاحیت دے رکھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''شیطان تمہارے خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔'' وہ دلوں میں وسوسہ اندازی کے ذریعے وہ سارے کام کرواتا ہے جنہیں بے حیائی کے کام کہا گیا ہے۔ شیطان عموماً اسی وسوسہ اندازی کے ذریعے انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں کہ ''شیطان تمہیں بے حیائی کی باتیں سجھاتا ہے'' یعنی تمہارے دل میں ڈالتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ترجمہ ''حکم دینا'' کیا جائے تو یہ بھی غلط نہیں۔ اس لیے کہ گمراہی کا ہر کام شیطان خود نہیں کرتا' وہ جنوں اور انسانوں میں سے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کرواتا ہے۔ جن انسانوں کو وسوسہ اندازی کے ذریعے وہ اس قدر گمراہ کر دیتا ہے کہ وہ شر کی ہر بات کے مبلغ اور مناد بن جاتے ہیں اور خیر کی ہر قوت سے لڑنا اور اسے روکنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اس راستے میں انہیں کوئی بھی نقصان اٹھانا پڑے تو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شیطان کی ایجنٹی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس لیے شیطان جب کسی فرد یا کسی قوم سے حکماً بے حیائی کے کام کروانا چاہتا ہے تو وہ شر کی ان قوتوں کو آگے بڑھا کر ان سے وہ کام لیتا ہے۔ کسی ریاست کا حکمران اگر مسلمانوں کے مفادات کے خلاف غیر مسلم مفادات کا امین بن کر مسلمانوں کو مارتا اور انہیں نقصان پہنچاتا ہے تو وہ حقیقت میں شیطان کا ایجنٹ بن کر یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اور وہ اپنی قوتِ نافذہ اور حکومت کے ذریعے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعے نہیں کر سکتا۔ وہ ایک شخص کو بہکا دیتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہے۔ اب اس شخص کی طاقت شیطان کی طاقت بن جاتی ہے۔ اور وہ اس طاقت کے بل بوتے پر جو چاہتا ہے اس کا حکم دیتا ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کے لیے ایک ایسا حوالہ دیتا ہوں جس کا آج کل اخبارات میں کسی حد تک ذکر ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اتاترک کے زمانے سے ترکی کوشش کر رہا ہے کہ وہ یورپ کو یقین دلا دے کہ اسلام سے اس کا تعلق نام کی حد تک واجبی سا ہے' ورنہ حقیقت میں وہ اسلام سے اپنا رشتہ کاٹ چکا ہے۔ وہ دن گزر گئے جب ترکی خلافت عثمانیہ کا مرکز تھا اور تمام مسلمان ممالک اس کی نگرانی میں تھے۔ لیکن اب ترکی مسلمان ملکوں سے نہیں بلکہ یورپی یونین سے اپنا تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ سالہا سال گزر گئے ابھی تک یورپ کو اس بات کا یقین نہیں آیا کہ ترکی واقعی ہمارا ہے۔ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ترک قوم اسلام سے اپنا رشتہ کاٹ چکی ہے۔ اس لیے وہ اسے اپنے اندر شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب ترکی کو کچھ امید پیدا ہوئی تھی کہ شاید یورپ ہمیں اپنے ساتھ شامل کر لے' لیکن عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ترک پارلیمنٹ میں ایک بل پیش ہوا کہ ترک پارلیمنٹ کو بدکاری پر پابندی لگانی چاہئے اور امکان پیدا ہوا کہ پارلیمنٹ اس کی منظوری دے دیگی۔ یورپ نے دھمکی دی کہ اگر تم نے بدکاری یعنی زنا پر پابندی لگائی تو ہم کبھی تمہیں یورپی یونین میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یورپ ان خباثتوں کو ''ہیومن ارج'' یعنی فطری تقاضوں کا نام دیتا ہے۔ اور ان باتوں پر پابندی لگانا انسان کی فطری امنگوں پر

Marfat.com

پابندی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں زنا بالجبر جرم ہے زنا بالرضا نہیں۔ یعنی جرم زنا اور بدکاری نہیں بلکہ زبردستی ہے۔ اگر باہمی رضا مندی سے یہ خباثت ہوتی رہے تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ تو اس سے آگے بڑھ کر باہم جنس پرستی کا قانون بھی پاس کر چکی ہے۔ اب یہ کوئی برائی نہیں' بلکہ ایک علم بن چکا ہے۔ آپ امریکہ کی لائبریریوں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا جس کا عنوان ہے "گے اسٹائل آف لائف"۔

برسوں سے امریکہ میں بہن سے نکاح کے مطالبے ہو رہے ہیں اور بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ پہلے استلذاذ بالاقارب کو طبی نقصانات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا' لیکن آج اسے "ہیومن ارج" قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کروانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ یورپ کی بہیمیت اور سفلی جذبات کی بالادستی کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس لیے ان کے یہاں تو بدکاری کسی برائی کا نام نہیں' بلکہ یہ انسان کی خواہش کی تکمیل ہے جس میں رکاوٹ ڈالنا برائی سمجھا جاتا ہے۔ ترکی ان سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے تو انہوں نے باقاعدہ دھمکی دی کہ اگر تم نے یہ بل پاس کر دیا تو پھر ہم سے تمہارا کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اب ترکی پارلیمنٹ نے اس معاملے کو موخر کر دیا ہے۔ اس مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بے حیائی کی باتوں کا حکم تو شیطان دیتا ہے' لیکن وہ ذریعہ بعض دفعہ افراد کو بناتا ہے اور بعض دفعہ بڑی بڑی حکومتیں اس کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر اس کا ترجمہ "حکم دینا" کیا جائے تو غلط نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اللہ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے" مغفرت فحشاء کے مقابلے میں ہے اور فضل فقر کے مقابلے میں۔ شیطان تو تمہیں فقر سے ڈراتا ہے کہ اگر تم نے اس کے راستے میں خرچ کیا تو تم فقیر اور نادار ہو جاؤ گے لیکن اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم اس کے راستے میں خرچ کر کے فقیر نہیں ہو سکتے بلکہ تم سے وہ فضل و کرم کا معاملہ فرمائے گا اور وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں عطا فرمائے گا۔ اور مسلمانوں کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ مسلمان جب مدینہ طیبہ میں آئے تو اکثریت نانِ شبینہ کی محتاج تھی۔ ایک چھوٹی سی بستی پر ہزاروں کھانے والوں کا بوجھ آ پڑا۔ لیکن چند ہی سالوں میں اللہ نے ان کے دن پھیر دیئے کہ وہ نانِ شبینہ کے محتاج جو پیٹ پر پتھر باندھ کر دن بھر کی مزدوری اللہ کے راستے میں دے دیتے تھے اللہ نے انہیں اتنی خوشحالی عطا فرمائی کہ وہ زکوۃ کا مال لے کر زکوۃ لینے والے کو ڈھونڈتے تھے لیکن ملتا نہیں تھا۔ جس کے پاس جاتے کہ گزشتہ سال میں نے تمہیں زکوۃ دی تھی اسی لیے اب میں لے کے آیا ہوں تو وہ معذرت کرتا ہوا کہتا کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خود زکوۃ دینے کے قابل بنا دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے پیچھے گیارہ بیٹے چھوڑے' جنہیں اپنے باپ کی وراثت سے پانچ پانچ درہم حصہ ملا۔ لیکن لوگوں نے چند سالوں کے بعد ان کے بڑے بیٹے عبدالعزیز کو دیکھا کہ انہوں نے ایک دن میں سو غلام خرید کے اللہ کے راستے میں آزاد کئے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی دولت میں کس قدر وسعت تھی۔

ہشام بن عبدالملک نے بھی اپنے پیچھے گیارہ بیٹے چھوڑے۔ ہشام کے مرنے پر ایک ایک بیٹے کو جو وراثت ملی وہ گیارہ گیارہ لاکھ درہم تھی۔ لیکن ایک وقت آیا لوگوں نے ہشام کے بیٹوں کو مانگتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں مثالوں میں جو چیز سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے سب کچھ اللہ کے راستے میں لٹا دیا تو اللہ نے ان کے بیٹوں کو اپنے فضل سے نوازا اور ہشام نے ظلم اور غبن کے ذریعے دولت اکٹھی کی' اللہ نے اس کی اولاد کو نانِ شبینہ تک کا محتاج بنا ڈالا۔

Marfat.com

اور دوسری بات ارشاد فرمائی کہ شیطان تمہیں بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے مغفرت اور بخشش کا وعدہ فرماتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں عیش و عشرت، مے نوشی، سینما بینی، غلط صحبتوں میں شرکت اور الللے تللوں میں دولت اڑانے پر اکساتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا خوگر بنا کر تمہاری تمام دولت بے حیائی کے کاموں میں صرف کروا دیتا ہے۔ لیکن اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم اپنی دولت اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو زندگی بھی آسودگی سے گزرے گی اور آخرت میں تمہاری یہ فیاضی، تمہارے لیے جنت میں جانے کا سبب بنے گی۔ اللہ اس کے بدلے میں تمہاری مغفرت اور بخشش فرمائے گا۔ دیکھ لو دونوں میں سے کون سا راستہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا ہے اور علم والا ہے۔ تم اس کے راستے میں دو گے، تو اس کے وسیع خزانے تم پر نچھاور ہو جائیں گے۔ اور وہ اپنے علم کی وجہ سے خوب جانتا ہے کہ کس نے کیا خرچ کیا اور کس جذبے سے خرچ کیا۔ اس لیے اس کے مطابق وہ قیامت کے دن اجر و ثواب سے نوازے گا۔

حکمت کا مفہوم

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص مال و دولت کو ظاہری پیمانوں سے نہیں ناپتا بلکہ وہ اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کرتا ہے وہ سینت سینت کے رکھنے کی بجائے اللہ کے راستے میں لٹاتا ہے اور اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے بدلے میں مجھے اللہ کا فضل و کرم ملے گا اور اللہ کے وعدوں پر اعتماد کو اپنا حقیقی جوہر سمجھتا ہے۔ اس سے جو اصل روحِ ایمان اور عمل کی پختگی نصیب ہوتی ہے اور آدمی جس گہری بصیرت سے نوازا جاتا ہے یہ وہ چیز ہے جس کو یہاں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کمی بیشی کے ظاہری پیمانوں سے ہر چیز کو ناپنا اور عقل کی ترازو میں ہر چیز کو تولنا ہر عقلمند آدمی کا شیوہ ہے۔ لیکن اس سے بلند ہو کر ان روحانی پیمانوں پر یقین کرنا جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور دنیا کی بجائے آخرت کو اپنا مقصد بنانا اور یہاں اللہ کے دین کے تقاضوں کے مطابق ہر چیز کو قربان کر کے آخرت کی نعمتوں کو اپنی مقصد بنا لینا اور ان پر ایسا گہرا یقین اور گہری بصیرت کا پیدا ہو جانا کہ اس سے ہٹ کر ایمانی طبیعت کسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو یہ وہ حکمت ہے جو اللہ تعالیٰ کسی کسی کو عطا فرماتے ہیں۔ اور جس کو یہ حکمت مل جاتی ہے وہ دنیا کے خزف ریزوں کو جمع کرنے کے بجائے اس حکمت کا طالب ہوتا ہے۔ اسے دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کی بجائے اپنا مال و دولت لٹانے، حتیٰ کہ سر کٹوانے میں مزہ آتا ہے۔ یہی وہ حکمت کا خزانہ ہے جس کا مقام و مرتبہ جوہر عقل سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے بھی عقل ہی کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن یہ عقل وہ ہے جو ایمان کی تابع ہے۔ جو ایمان کے ساتھ رہ کر اتنی مجلیٰ اور مصفیٰ ہو چکی ہے کہ محسوسات اور معقولات کے پیمانے اسے ناپنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ وہ فیصلہ کرتی ہے تو ابراہیمی عقل سے کرتی ہے، وہ بحرِ قلزم کے کنارے کھڑے ہو کر موسیٰ کی زبان سے بولتی ہے، وہ میدانِ بدر میں کثرت و قلت کی پروا کیے بغیر امت کو فتح و کامیابی کا یقین دلاتی ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جو سارے خزانوں سے بڑا خزانہ ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہر دم رواں، پیہم جواں، ہر دم دواں ہے زندگی

Marfat.com

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

(اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یا جو کچھ تم منت مانتے ہو یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے) (۲۷۰)

نذر کی تعریف

امام تفسیر قرطبی نے نذر کی تعریف یہ کی ہے **هوما اوجبه المكلف على نفسه من عبادات لولم يوجبه لم يلزمه** (نذر ایسی عبادت کو اپنے اوپر لازم کر لینے کو کہتے ہیں کہ اگر وہ عبادت (نذر ماننے والا) اپنے اوپر واجب نہ کرے تو وہ عبادت اس پر لازم نہیں ہوتی) دوسرے اہل علم بھی اس سے ملتی جلتی بات کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا ایسی عبادت یا ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کر لے جو اس کے ذمے فرض نہیں تو ایسی نذر کا ماننا اور پورا کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر ماننے کو پسند نہیں کیا گیا۔ یہ ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کو پابند کرنے والی بات ہے جو پسندیدہ نہیں ہے۔ لیکن اگر نذر مان لی جائے تو پھر اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ اس نذر میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ یعنی کسی ناجائز کام کے لیے نذر نہ مانی جائے یا کسی جائز کام کے لیے ایسی نذر نہ مانی جائے جس کا ماننا شریعت کی رو سے جائز نہیں۔ اگر ایسی شرعی قباحتوں سے وہ نذر محفوظ ہے تو پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ نذر میں بھی عام طور پر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہوتا ہے' اس لیے اس کا ذکر بھی انفاق فی سبیل اللہ کے ذکر میں کیا گیا ہے۔ اور یہ فرمایا گیا ہے کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرو یا تم نذر مان کر اسے پورا کرتے ہوئے خرچ کرو اور چاہو تم ہزار پردوں میں چھپ کر خرچ کرو اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں' اسے جانتا ہے۔ جاننے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کا صلہ بھی دے گا۔ عموماً اللہ تعالیٰ جب اپنی صفات کا ذکر فرماتے ہیں تو اس سے مقصود ان کا لازم ہونا ہے۔ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ وہ جب تمہارے ہر خرچ اور ہر ایثار کو جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہیں اس کا صلہ عطا فرمائے گا۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ ''ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا'' ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ اللہ نے ان کو مال و دولت دیا تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ جس نے وہ دولت دی ہے اسی کے راستے میں خرچ کی جائے لیکن انہوں نے اس کے راستے میں خرچ کرنے کی بجائے اسے اللے تللوں میں اڑایا۔ اور اگر کسی پر خرچ کیا بھی تو دکھاوے کے لیے کیا یا خرچ کرنے کے بعد احسان جتلایا' دل آزاری کی اور یا دولت کو معبود بنا کر پوجتے رہے' بجائے خرچ کرنے کے اس کی حفاظت کو مقصود بنا لیا۔ بجائے اس کے کہ انفاق و ایثار اور اللہ کی رحمت کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے انہوں نے اپنے مال و دولت کو معبود بنا کر اس پر بھروسہ کیا اور اسی پر تکیہ کیے بیٹھے رہے۔ اور یہ سمجھتے رہے کہ دنیا میں بھی یہی مال و دولت کام آیا اور آخرت میں بھی یہی ہماری کامیابیوں کی ضمانت ہوگا۔ کہا ایسے اپنی جانوں کے دشمنوں کے لیے قیامت کے دن کوئی مددگار نہیں ہوگا جو اللہ کے عذاب سے انہیں بچا سکے۔

Marfat.com

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

(اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم انہیں چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے) (۲۷۱)

پوشیدہ اور علانیہ انفاق کے دو طریقے

اس آیت کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جن صدقات کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ وعشر وغیرہ نہیں بلکہ صدقاتِ نافلہ ہیں۔ کیوں کہ جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے اس میں تو بہتر یہ ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے ادا کیا جائے۔ اور کچھ نہیں تو جو شخص زکوٰۃ لے رہا ہے اسے بتایا جائے کہ میں تمہیں زکوٰۃ دے رہا ہوں تاکہ لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ یہ صاحب جو بڑے امیر آدمی ہیں زکوٰۃ تک ادا نہیں کرتے۔ زکوٰۃ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم نماز باجماعت پڑھتے ہیں۔ فرض نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے لیکن نفل نماز گھروں میں چھپا کر پڑھنے سے زیادہ اجر وثواب ملتا ہے۔ فرض نماز چونکہ شعائر اسلام میں سے ہے اس لیے سب لوگوں کو مل کر ایک دوسرے کے سامنے ادا کرنا چاہیے تاکہ اللہ کے سامنے وفاداری کا اظہار اجتماعی طور پر ہو۔ زکوٰۃ بھی اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ نے اگرچہ ہر مسلمان کا حقِ ملکیت تسلیم کیا ہے لیکن درحقیقت مال ودولت اور ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ انسانوں کے ہاتھ میں مال ودولت امانت ہے۔ اس لیے زکوٰۃ کی ادائیگی لوگوں کے سامنے اس بات کا اظہار ہے کہ ہم مال ودولت کو اپنی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی ملکیت جانتے ہیں' وہ ہمارا آقا ہے اور ہم اس کے بندے ہیں۔ لیکن جہاں تک صدقاتِ نافلہ کا تعلق ہے یعنی عام خیرات کرنے کا' اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر تم صدقاتِ نافلہ یعنی خیرات لوگوں کے سامنے کھلم کھلا دو تو کوئی حرج نہیں ایسا بھی کر سکتے ہو کیونکہ بعض مواقع پر لوگوں کو دکھا کر یا سنا کر دینا بھی مفید ہوتا ہے' مثلاً ایک بڑا اجتماع ہے مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے یا اعلائے کلمۃ الحق کی ضرورت کے لیے لوگوں سے دل کھول کر دینے کی اپیل کی جا رہی ہے ایسے موقع پر جو آدمی کھڑا ہو کر لوگوں کو سنا کر ایک بڑی رقم دیتا ہے اس سے لوگوں کے اندر ایک جذبہ ابھرتا ہے اور وہ بھی بڑھ چڑھ کر اللہ کے راستے میں بڑی سے بڑی رقم دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ تجربہ یہی ہے کہ اجتماعی کاموں اور اجتماعی مہمات میں لوگوں کے سامنے اعلان کر کے دینا چاہیے تاکہ لوگوں میں دینے کا شوق پیدا ہو لیکن عام معمول کی زندگی میں بہتر یہی ہے کہ چھپا کر دیا جائے۔ اس طرح چھپایا جائے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ لینے والے کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو کہ آپ نے ایک شخص کو کچھ دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک تو دینے والے میں دکھاوا پیدا نہیں ہوگا' وہ ریاکاری سے محفوظ رہے گا اور دوسرا یہ کہ لینے والے کی خودداری اور عزتِ نفس پر حرف نہیں آئے گا۔ بعض لوگ انتہائی ضرورتمند ہوتے ہیں' لیکن وہ اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتے کہ کسی کو پتہ چلے کہ ہمیں کسی نے خیرات دی ہے۔ وہ فاقے برداشت کر لیتے ہیں' بعض دفعہ فاقوں کے ہاتھوں مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن عزتِ نفس کو رسوا نہیں ہونے دیتے۔ ایسے لوگوں کی عزتِ نفس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ دینے والے چھپا کے دیں۔ اور حتی الامکان کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کریں۔ جب کوئی آدمی اس طرح غریبوں' ناداروں اور فقیروں کو انتہائی رازداری کے ساتھ محض اللہ کی رضا کے حصول کے لیے دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ اور اس سے یہ

Marfat.com

امید پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس کا اجر بھی بڑھا چڑھا کے عطا فرمائیں گے اور آخر میں فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اس سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو ہم نے دینے کے طریقے سکھائے ہیں کہ علانیہ دو یا پوشیدہ دو اس کا تعلق تمہاری تربیت سے ہے۔ تمہارے دل کو حکمت آشنا بنانا ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی تربیت کے حوالے سے لوگوں کے سامنے دینا مفید ہے تو سامنے دو اور چھپا کر دینے میں مصلحت سمجھو تو چھپا کر کر دو۔ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ یہ پوشیدہ اور اعلانیہ کا مسئلہ تمہارے لحاظ سے ہے خدا سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں۔ تم جو کچھ بھی، جہاں بھی اور جس جگہ بھی کرو گے اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ O

(آپ کے ذمہ ان کی ہدایت نہیں بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو مال میں سے تو اس میں تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا دیا جائے گا۔ اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی) (۲۷۲)

آیت کریمہ کے دو مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اہل علم نے اس کے دو مفہوم سمجھے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے حوالے سے جن باتوں کا اظہار ضروری تھا۔ اور اس معاملے میں جن ہدایات کی ضرورت تھی، آپؐ نے ایک ایک کر کے لوگوں کے سامنے واضح کر دی ہیں۔ اب ان باتوں کا قبول کرنا یا رد کر دینا، لوگوں کا کام ہے آپ تو بہر صورت اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو احکام اتریں یا کوئی ہدایت نازل ہو تو آپ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد لوگ اسے قبول کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اس کا خمیازہ لوگ خود بھگتیں گے اور قبول کرنے کی صورت میں اجر بھی پائیں گے لیکن آپ سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں، جن باتوں کا ابلاغ اور تبلیغ ضروری ہے اگر وہ آپ کامیابی سے کر لیتے ہیں تو آپ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔ رسولوں کے معاملے میں یہی اللہ کی سنت ہے جس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اس سے فائدہ کون اٹھاتا ہے اور کون نہیں اٹھاتا اور اللہ کس کو ہدایت دیتا ہے یا نہیں دیتا اس کے لیے ایک الگ اللہ کی ایک سنت ہے جس کا کئی جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ جو آدمی ہدایت کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اس کے لیے راستے آسان کر دیتا ہے، بلکہ اس کا ولی بن کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اس راہ کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے اس کی مدد فرماتا ہے، لیکن جو شخص اس طرف آنے سے ہی انکار کر دیتا ہے اور وہ پیغمبر کی ہر بات کی مخالفت کرنا اور پیغمبر سے دشمنی کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کردہ راستے کو اس کے لیے آسان کر دیتا ہے۔ بجائے اسے اپنی حفاظت میں لینے کے اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے اور شیطان آگے بڑھ کر اس کی لگام پکڑ لیتا ہے۔ اس شخص نے چونکہ اللہ کی حفاظت حاصل کرنا نہیں چاہی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اسے اپنی حفاظت میں نہیں لیا۔ اس نے شیطنت کا راستہ اختیار کیا اور وہ شیطانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب شیاطین اسے اپنے راستے پر کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ بالآخر انہیں کفر کی دلدل میں ڈبو کر تباہ کر دیں گے۔

Marfat.com

بعض اوراہل علم نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ انصار کے کئی عزیز ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ان کی ضرورتوں کو دیکھ کر انصار ان کی مدد کرنا چاہتے لیکن اس خیال سے مدد کرنے سے رک جاتے کہ وہ چونکہ ایمان نہیں لائے اس لیے اب ہمارا ان سے کوئی رشتہ نہیں رہا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ تم اپنے صدقات مسلمان فقراء ہی کو دیا کرو۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ کا کام ابلاغ ہے وہ آپ نے کر دیا۔ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ آپ اس معاملے کو بنیاد بنا کر لوگوں کی مدد کرنے سے ہاتھ نہ روکیں۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر ایک کافر تمہارے سامنے بھوکا مر رہا ہے یا سردی میں ٹھٹھر رہا ہے یا بیماری کے ہاتھوں لاچار ہے تو تم اس کی احتیاج دیکھ کر اس کی مدد کرنے کے پابند ہو۔ تم یہ نہیں سوچو گے کہ یہ کافر ہے یا مومن بلکہ صرف یہ دیکھو گے کہ یہ انسان ہے اور انسان کے کام آنا انسانیت کا تقاضا ہے۔ انسانیت تو بہت بڑی بات ہے اللہ اور اس کے رسول نے تو حیوانوں کے کام آنا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ جس عورت نے بلی کو باندھ رکھا اور وہ بھوکی مر گئی حضورؐ نے اس کے لیے جہنم کی خبر سنائی۔ اور جس آدمی نے پیاسے کتے کی جان بچائی حضورؐ نے اسے جنت کی بشارت دی۔

صدقاتِ نافلہ سے مدد کرنے کا حکم ہر انسان کے لیے ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ صحابہ کرام سے گھر کا ہر اچھا کھانا غیر مسلموں کو بھیجنے کی روایات موجود ہیں۔ حتیٰ کہ وہ قربانی کے جانور کا گوشت بھی غیر مسلم گھرانوں میں بھجواتے تھے۔ البتہ جہاں تک زکوٰۃ اور فطرانہ کا تعلق ہے وہ مسلمان کے سوا کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے مال میں سے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کا فائدہ تمہی کو پہنچے گا۔ سات سو گنا تک اور بعض دفعہ اس سے بھی زائد اس کے اجر سے نوازے جاؤ گے۔ اور یہ بات تمہیں معلوم ہے کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے صرف اللہ کی رضا کے لیے کرو گے۔ تو تمہاری اصل توجہ صرف اللہ کی رضا کے حاصل کرنے اور اس سے اجر و ثواب کی امید پر رہنی چاہیے۔ اور یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ تمہارا اللہ کے راستے میں خرچ کرنا کسی نقصان کا باعث نہیں ہوگا بلکہ اس راستے میں دیا ہوا ایک ایک دانہ پہاڑ بن کر تمہاری طرف لوٹے گا۔ اگر تم نے صحیح جذبے سے انفاق کیا ہے تو اس میں کبھی کمی نہیں کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۡ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

(انفاق) ان فقراء کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ زمین میں کاروبار کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ گمان کرتا ہے انہیں بے خبر آدمی غنی۔ ان کی خودداری کے سبب سے۔ تم ان کو ان کی علامتوں سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے) (۲۷۳ تا ۲۷۴)

Marfat.com

انفاق کا بہترین مصرف

ایک شخص جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے جذبے سے اٹھتا ہے تو جہاں وہ اس بات کی احتیاط کرتا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ کروں جس میں حرام' مکروہ یا مشکوک ہونے کا شبہ تک بھی نہ ہو' اور وہ چیز ایسی ہو جو مجھے محبوب بھی ہو' کیونکہ ان دو احتیاطوں کے بغیر اللہ تعالیٰ کسی مال کو قبول نہیں کرتے۔ وہیں دوسری فکر اسے اس بات کی ہوتی ہے کہ میں اپنا مال وہاں خرچ کروں جو اس کا صحیح مصرف ہو۔ صدقاتِ واجبہ کے لیے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ صدقاتِ نافلہ کے لیے اگرچہ ان مصارف کے لحاظ سے کچھ وسعت پائی جاتی ہے لیکن پروردگار نے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے یہ بات واضح فرما دی کہ صدقاتِ واجبہ ہوں یا صدقاتِ نافلہ' ان کا سب سے اہم اور پاکیزہ مصرف وہ فقراء ہیں جو اللہ کے دین' اعلائے کلمۃ الحق یا کسی اور دینی خدمت کے لیے اس طرح اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوں کہ کسی اور کام کی طرف توجہ دینا ان کے لیے ممکن نہ رہا ہو۔ اور یا ضرورت کی حد تک کسی اور کام کی طرف توجہ دیں بھی تو ترجیح صرف اللہ کے کاموں کو ہو۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں ان کی اس حالت کی وضاحت بھی فرما دی گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں تاریخ اہلِ صفہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ مستقل رضا کاروں کا ایک گروہ تھا جنہوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن دینی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نہ ان کی بیویاں تھیں' نہ ان کے بچے۔ اسلام لانے کے بعد یہ اپنے وطن سے نکلے اور آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت پر ڈیرہ جما لیا۔ زندگی صرف دین سیکھنے' دین سکھانے اور اس کی سربلندی کے لیے وقف کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے ساتھ ایک چبوترہ بنوا دیا تھا' جس پر چھپر کی طرح کی ایک چھت ڈال دی تھی۔ ان کی تعداد چار سو تک کہی جاتی ہے۔ مختلف وقتوں میں اس میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی۔ یہ ہمہ وقتی دین کے کارکن تھے۔ عقیدت مند جاسوسوں کی طرح ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کا کھوج لگاتے رہتے۔ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فارغ دیکھتے' آپؐ سے دین سیکھتے اور جب آپؐ دوسروں لوگوں کو دینی تعلیم دیتے تو ان کے ساتھ بھی شامل ہوتے۔ ان میں اکثریت قرآنِ کریم کے حفاظ اور احادیث کی حفاظت کرنے والی تھی۔ انہی میں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ ہزار سے زیادہ اقوال ہم تک پہنچائے ہیں۔ جہاد کے لیے فوری طور پر کوئی فوج بھیجنا پڑتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کو بھیجتے تھے۔ مدینے سے باہر کوئی کام درپیش ہوتا تو تب بھی انہی کو بھیجا جاتا۔ ورنہ ان کا اصل کام دین سیکھنا اور دین سکھانا تھا۔ چونکہ ذاتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت نہیں تھا' اس لیے ان کی تمام ضروریات کی کفالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ خانہ بھوکے رہتے تو اصحابِ صفہ بھی بھوکے رہتے' بعض دفعہ بھوک اتنی شدید ہوتی کہ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں بے ہوش پڑا ہوتا تو لوگ یہ سمجھ کر کہ مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے میری گردن پر اپنے پاؤں رکھتے تھے' حالانکہ مجھے مرگی نہیں بھوک نے بے ہوش کر رکھا تھا۔ اس قدر شدت احتیاج کے باوجود پروردگار فرماتے ہیں کہ وہ اس قدر خوددار لوگ ہیں کہ تم ان کے چہروں سے کمزوری بھانپ کر اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ بھوکے ہیں ورنہ ایک ناواقف اور بے خبر آدمی ان کی خودداری اور بے نیازی کو دیکھ کر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ انتہائی فارغ البال لوگ ہیں۔ ان لوگوں کا عجیب حال تھا کہ جب ان سے بھوک برداشت نہ ہوتی تو نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے' جب سلام پھیرتے تو ان کے چہروں سے بادشاہوں کی بے نیازی جھلکتی تھی۔

Marfat.com

الحاف کا مفہوم

مزید فرمایا کہ وہ کبھی لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ حالانکہ کہنا یہ مقصود ہے کہ وہ کبھی دست سوال دراز نہیں کرتے۔ بھوک سے بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن سوال کرنا انہیں گوارا نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ''الحافا'' کا لفظ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ الحاف کا معنی ہوتا ہے لپٹ کر سوال کرنا یعنی پیچھے پڑ جانا اور جب تک کچھ مل نہ جائے جان نہ چھوڑنا۔ جن لوگوں کے بارے میں قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ بے خبر آدمی انہیں ان کے رویے سے غنی اور مال دار خیال کرتا ہے ان کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لپٹ کر نہیں کرتے۔ اس میں دو باتیں کہنا مقصود ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ عربی زبان کا ایک اسلوب ہے کہ بعض دفعہ صورتِ واقعہ کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے بعض الفاظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، لیکن وہ اصل کلام کا حصہ نہیں ہوتے۔ مثلاً وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (اپنی اولاد کو تنگدستی کے اندیشے سے قتل نہ کرو) اس میں ممانعت در اصل قتل کی ہے۔ ''خشية املاق'' کی قید محض اس کے گھناؤنے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے۔ یہاں بھی کہنا صرف یہ مقصود ہے کہ وہ سوال کبھی نہیں کرتے ''الحاف'' کا لفظ عام حالت کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کے اظہار کے لیے ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہاں تک ان کی شدت احتیاج کا تعلق ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص ہر آنے والے سے لپٹ لپٹ کر مانگے۔ کیونکہ جب پیٹ میں بھوک کی آگ لگی ہو اور اس کی شدت نا قابل برداشت ہو چکی ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ مسجد میں آنے والے لوگ سارے ہمارے ہمدرد و غمگسار ہیں تو پھر کون ہے جو ضبط کے بندھن کو کھلنے سے بچا سکے؟ لیکن ان کا ضبط دیکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی لپٹ کر مانگنا تو دور کی بات ہے وہ مانگنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں فقراء کے حوالے سے جو کچھ فرمایا ہے یہ ایک نمونہ ہے خود دار اور غیرت مند حاجتمندوں کا۔ احتیاج تو کسی کو بھی پیش آ سکتی ہے، لیکن مسلمان ضرورتمند حتی الامکان دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ وہ اپنے جسم و جان پر تکلیف جھیلتا ہے، لیکن اپنی حرکات و سکنات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔ چہرہ چونکہ اندرونی جذبات کا عکاس ہے اس لیے بھوک کا کرب اگر چہرے سے بولنے لگے تو اسے چھپایا تو نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ ورنہ اور کسی طرح سے ایک بے خبر آدمی ان کی احتیاج سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ نمونہ ہے جو ہمارے ضرورت مندوں کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اور دوسرا نمونہ مالدار اور خوشحال لوگوں کے لیے ہے کہ تم اگر اپنا مال صحیح جگہ خرچ کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین مصرف یہ لوگ ہیں۔ البتہ یہ تمہارا فرض ہے کہ تم انہیں تلاش کرو۔ وہ تم سے سوال نہیں کریں گے، لیکن تم ان کی علامتوں سے انہیں پہچانو۔ جو دولت مند اس انتظار میں رہتا ہے کہ ضرورت مند خود میرے دروازے پر آئے، وہ کوتاہی کا ارتکاب کرتا ہے اور جو ضرورت مند لپٹ کر سوال کرتا ہے وہ اسلامی غیرت کھو دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ وہ لوگ سوال نہیں کریں گے تو تمہیں انہیں تلاش کر کے خاموشی سے دینا چاہیے۔ اس طرح سے لوگوں کو تو پتہ نہیں چلے گا کہ تم نے کیا خرچ کیا لیکن اللہ جانتا ہے کہ تم نے کیا خرچ کیا ہے؟ اور وہی اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

اگلی آیتِ کریمہ میں انفاق فی سبیل اللہ کے حوالے سے معجزانہ اختصار کے ساتھ وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس سلسلے میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ (۱) انفاق کا عمل ہر وقت جاری رہنا چاہیے۔ اسے چشمے کی طرح ہمیشہ ابلتے رہنا چاہیے۔ رات کا وقت ہو یا دن کا ضرورت کسی وقت بھی پیش آسکتی ہے اس لیے اہلِ خیر کو ہر وقت اس جذبے سے معمور رہنا چاہیے۔ (۲) بعض دفعہ عزتِ نفس کا لحاظ کرتے ہوئے دینے والے کو اس قدر احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے کہ لینے والا مطمئن ہو کہ مجھے کسی نے لیتے ہوئے نہیں دیکھا تاکہ اللہ کے سوا اس کے راز کی کسی کو خبر نہ ہو سکے اور وہ بھوکا ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ سر اٹھا کر چل سکے۔ لیکن بعض دفعہ اجتماعی ضرورتوں کے حوالے سے لوگوں کے جذبوں کو ابھارنے کے لیے اعلان کر کے اور سنا کر دینا بھی دینی ضرورت بن جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر علانیہ دینا پڑے تو دینا چاہیے۔ پہلے موقع کا تقاضا ہے کہ آپ ''سِر'' سے کام لیں اور دوسرا موقعہ یہ چاہتا ہے کہ آپ ''علانیہ'' دیں دونوں پر عمل ہونا چاہیے۔ اس طرح سے داد و دہش کا یہ عملِ خیر تمام اوقات میں ابلتا رہے گا اور ہر حالت میں بروئے کار آتا رہے گا۔ اس سے زیادہ جامعیت کے ساتھ کسی عمل کی منظر کشی نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہمہ گیر عمل کا اجر و ثواب اور صلہ بھی ایسا ہی بے نظیر ہونا چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ تم نے جس جوش و جذبے کے ساتھ اپنا مال و دولت اللہ کے لیے لٹایا ہے ہم اسی قدر دانی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان کا اجر کسی اور کے پاس نہیں ان کے رب کے پاس ہے جس کی ربوبیت کا فیض ہر وقت جوش میں رہتا ہے اور اس کا اظہار اس طرح ہو گا کہ ان کو ایک ایسا مقام ملے گا جس میں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور یہ تعبیر ہے جنت کی۔ ظاہر ہے کسی بھی عمل کی اس سے بڑی جزاء اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا

لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ
الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ
اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی
الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ

Marfat.com

أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن
كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ
وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ
وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا
تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ
هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

رکوع: ۳۸۔ (جولوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو پھر اس کا ارادہ کریں تو وہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ناشکروں اور حق تلفی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا O بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے' نماز کا اہتمام کیا اور زکوۃ ادا کی' ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا O اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے

Marfat.com

رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں۔ نہ تم کسی کا حق مارو' نہ تمہارا حق مارا جائے گاO اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو۔ اور جو صدقہ کر دو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھوO اور ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا) (۲۷۵ تا ۲۸۱)

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ O

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو پھر اس کا ارادہ کریں تو وہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (۲۷۵)

ربطِ کلام

اس سے پہلے دو رکوعوں میں انفاق کی ترغیب دی' فضیلت بیان کی' ضرورت کا احساس دلایا' جن قباحتوں سے انفاق کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے ان کا ذکر فرمایا' اللہ کے راستے میں جن چیزوں کا انفاق کرنا چاہیے ان کی پہچان بتائی اور پھر یہ بھی واضح فرمایا کہ انفاق جس طرح مسلمان معاشرے میں غربا اور ملک و ملت کی ضرورتوں کی طلب ہے اسی طرح انفاق مسلمانوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ جن محرکات سے انسان بگڑتا اور برائی پھیلتی ہے ان محرکات میں سے ایک اہم محرک ہوسِ زر اور حبِ زر بھی ہے۔ جب تک اس محبت کا امالہ نہ کیا جائے یعنی اس کا رخ خیر' مقاصد خیر اور اللہ کی طرف نہ موڑا جائے اس وقت تک اس کی برائی سے معاشرے کو بچانا ناممکن ہے۔ اور پھر اسی مضمون کی اختتامی آیت میں انفاق کے حوالے سے ان مسلمانوں کو اسوہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو جذبہ انفاق سے وجود میں آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے' انہی مسائل سے دوچار اور طبیعت کے انہی جذبات سے بہرہ ور جس سے معاشرے کے باقی افراد سروکار رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کو رات اور دن خفیہ اور علانیہ یعنی ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کی رضا کے حصول اور بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمان معاشرے کا سرمایہ اور اسلامی تربیت کا نمونہ ہیں۔ انہی سے معاشرے کی آب و تاب اور اسلامی جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کا پیدا کرنا اسلام کا مقصد ہے۔

Marfat.com

تُعْرَفُ الْاَشْيَآءُ بِاَضْدَادِهَا

انسانی فطرت یہ ہے کہ اسے کسی بات کا صحیح احساس اور مکمل شعور اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے سامنے اس چیز کی ضد اور مقابل کو لایا جاتا ہے۔ آدمی کو اس وقت تک حسن کا احساس مکمل نہیں ہوتا جب تک بدصورتی اس کے سامنے نہیں آتی۔ اندھیرے کا شعور روشنی سے اور روشنی کا احساس اندھیرے سے ہوتا ہے۔ راحت کی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک آدمی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوتا' ضدین کا وجود ایک دوسرے کے تعارف کے لیے مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کا اسلوب انسانی فطرت کا عکاس ہے۔ اس لیے وہ کسی کو سمجھانے کے لیے عموماً اس کی ضد کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ جنت کے ساتھ جہنم' خیر کے ساتھ شر' روشنی کے ساتھ تاریکی' نعمت کے ساتھ سختی یا اس کے برعکس ضدین کا ذکر اس کا خاص اسلوب ہے تاکہ مخاطب کو بات سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اسی اسلوب کے مطابق انفاق اور اس کے تمام لوازمات کو ذکر کرنے کے بعد اب اس کی سب سے بڑی ضد ربا یعنی سود کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

سود کھانے والوں کا انجام

سب سے پہلی بات جو ارشاد فرمائی گئی ہے وہ سودی کاروبار کرنے والوں کا انجام ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں یعنی سودی کاروبار کرتے ہیں یا سود سے کسی طرح بھی متعلق ہیں' ان میں سے کچھ تو وہ لوگ ہیں جو کسی سخت مجبوری کے باعث سود میں ملوث ہو گئے' لیکن ان کے دلوں میں سود کے بارے میں نفرت اور کراہت موجود ہے اور وہ اس کا یقین رکھتے ہیں کہ سود کو واقعی اللہ نے حرام کیا ہے۔ تو ایسے لوگ اگر سود سے بچنے کے لیے اللہ سے توفیق مانگیں گے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی اس سے نکلنے کا راستہ پیدا فرما دیں گے۔ اور اگر وہ اسے حرام سمجھتے ہوئے ساری عمر اس میں ملوث بھی رہے تو قیامت کے دن اس کی سزا پالینے کے بعد کبھی نہ کبھی جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے سود کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا' سودی کاروبار یا سودی ملازمت کو نہایت آسودگی کے ساتھ زندگی کا ہدف بنائے رکھا اور اسی پر خوش رہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سود کی محبت ان کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کی حرمت اور اس سے نفرت کا احساس دل سے مٹ جاتا ہے۔ دل و دماغ اسی کے تصورات سے معمور اور اعضاء و جوارح اسی کے حصول اور ترقی میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآنِ کریم برائی کے احاطہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ جو سرے سے اس کو حرام ہی نہیں سمجھتے ان کی عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ جس طرح تجارت میں اپنے مال سے نفع کمایا جاتا ہے اسی طرح سود بھی آدمی کے اپنے مال کا نفع ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نفع حلال ہو اور دوسرا حرام ہو۔ ان لوگوں نے چونکہ اپنے دل و دماغ میں سود کی افادیت اور محبت کو بسا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دونوں کا فرق بھی ان کے احساس سے اتر گیا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایک پاگل اور دیوانہ اپنی دیوانگی میں ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ جسے وہ اپنے تئیں ضروری اور مفید سمجھتا ہے لیکن انسانی معاشرے اور انسانیت کے لیے وہ تباہ کن اور اذیت کا باعث ہوتی ہیں' لیکن اسے اس کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ اس کا گھر اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو جائے' اس کے اپنے اندر سے اور اس کے اہلِ خانہ سے غیرت و حمیت نکل جائے' اپنے اعزہ و اقرباء سے تعلقات ختم ہو جائیں' اس کے احباب مایوس ہو کر اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں' لیکن اسے کسی بات کی بھی پرواہ ہوتی ہے نہ ہوش۔ اس کے سامنے دیوانوں کی طرح صرف ایک ہی ہدف ہوتا ہے کہ وہ مال و دولت کی دیوانگی میں جس طرح منہ اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے' بس اس کے

Marfat.com

اس راستے میں کسی چیز کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ ہر رشتۂ خیر کی محبت اس کے دل سے نکل جائے اسے پروا نہیں۔ کیونکہ اسے اب ایک ہی رشتہ عزیز ہے وہ ہے مال و دولت کا رشتہ' حب زر ہر چیز کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ دنیا میں اس دیوانگی کو اب اس لیے زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا کہ ایسے دیوانوں کی اکثریت ہو گئی ہے۔ بلکہ اب اس شخص کو محسوس کیا جاتا ہے' جس میں مال و دولت کی محبت کم ہو جاتی ہے اور اقدارِ انسانیت کی محبت بڑھ جاتی ہے۔ انہی احساسات کا نتیجہ اس کی زندگی کے اعمال اور مصروفیات پر بھی پڑتا ہے۔ اب اس کا وقت نیکی کے کاموں میں اور نیکی کے مراکز میں زیادہ صرف ہوتا ہے تو دنیا کے دیوانے اسے دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بالکل اس شخص کی طرح جو نک کٹوں کے ہجوم میں ایک ہی ناک والا ہو تو تمام ناک سے محروم اسے ناک والا ناک والا کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ اکثریت ہمیشہ اپنے آپ کو برحق سمجھتی ہے۔ آج چونکہ ایسے ہی دیوانوں کی اکثریت ہے تو انہیں کون بتائے کہ تمہاری ناک کٹ چکی ہے۔ لیکن جب بھی انسانیت اور انسانیت کی قدریں اور اللہ کی معرفت کا احساس ایک زندہ حقیقت تھی تو اس دیوانگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہی دیوانے جب قیامت کو اٹھیں گے تو ان کو اس ہیئت کذائی میں اٹھایا جائے گا جو ان کی اصلی حالت کا نمونہ ہو گی۔ یہاں اس آیتِ کریمہ میں ان کی اسی اصل حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جس طرح کسی شخص کو آسیب لاحق ہو جائے یعنی جن اسے چھو جائے تو وہ دیوانوں کی طرح حرکتیں کرتا ہے (آسیب زدہ آدمی کو دیوانوں کی طرح حرکتیں کرتے اکثر دیکھا گیا ہے) اللہ نے جن کے دلوں میں نورِ ایمان رکھا ہے اور جن کا نیکی سے رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ شریعت کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں کسی جن کی چھوت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بجز اس کے کہ وہ انہیں کسی بیماری یا تکلیف میں مبتلا کر دے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کی ابلیس اور اس کی ذریت کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دل پہلے ہی شیطان کے قبضے میں ہوں اور وہ شریعت کی مخالفت کی وجہ سے پہلے ہی اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر چکے ہوں تو شیطان کے لیے انہیں پاگل اور باؤلا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔
تو قیامت کے دن یہ اپنی اسی صحیح شکل و صورت میں اٹھیں گے اور دیکھنے والوں کو اس وقت احساس ہو گا کہ دنیا میں بھی ان کی دیوانگی کی یہی کیفیت تھی' لیکن اس وقت اس کا پوری طرح ادراک نہیں ہو سکا۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنے عقیدہ و عمل سے جس طرح زندگی گزارتا ہے اسی طرح کی زندگی اسے قیامت کے دن ملے گی۔ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا) لیکن میرا ناقص گمان یہ ہے کہ آخرت میں وہ آنکھوں سے بھی اندھا ہو گا تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ دنیا میں یہ دل سے اندھا تھا لیکن ہم اسے آنکھوں سے بینا ہونے کی وجہ سے پہچان نہ سکے لیکن آج اس کی پہچان مکمل ہو چکی ہے۔ کیونکہ اصل بینائی تو دل کی بینائی ہے' آنکھوں سے تو حیوانات بھی بینا ہیں' اسی لیے اقبال نے کہا ؎

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

انفاق سے دلوں کو زندگی ملتی ہے تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سے یہی مراد ہے اور سود خوری سے دلوں کی زندگی مر جاتی ہے اور انسان باؤلا ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن اسی کا اظہار ہو گا اور اس دن ان کا جرم بھی کھول کر بیان کر دیا جائے گا کہ یہ سزا ان کو اس بات کی ملی ہے کہ یہ کہتے تھے کہ تجارت تو سود کی مانند ہے۔ تو تجارت حلال ہے تو سود کیسے حرام ہو سکتا ہے؟ حالانکہ انہیں یہ خوب معلوم تھا کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ اور جس آدمی کی عقل موت کا شکار نہیں ہوئی اسے اور کچھ نہیں تو یہ بات سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ حلت و حرمت حق اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ وہ جس چیز کو چاہے حلال کر دے اور جسے چاہے حرام کر دے۔ اس کے حکم کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں یہ اس کا ذاتی

Marfat.com

اختیار ہے جس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ تو جب اس نے سود کو حرام کیا تو وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ اور جب اس نے تجارت کو حلال کیا تو وہ حرام نہیں ہو سکتی۔ قطع نظر دوسری بحثوں کے جو شخص اس بنیادی بات کو نہیں مانتا یقیناً اس کی عقل پر شیطان کا غلبہ ہو گیا ہے اور ویسے بھی دیکھا جائے تو تجارت اور سود میں آخر کیا مماثلت ہے؟ لیکن اس کی وضاحت سے پہلے ضروری ہے کہ سود کی تعریف کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔

سود اور ربا کا مفہوم

جامع صغیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد منقول ہے جسے ماہرین حدیث نے حسن قرار دیا ہے۔ کل قرضٍ جرَّ نفعاً فھو ربا (جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے) ابن عربی نے احکام القرآن میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا الربوٰ فی اللغة الرباوة والمراد به فی الاٰیة کل زیادة لا یقابلھا عوض (یعنی ربا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں۔ اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو) اور امام جصاص نے احکام القرآن میں ربا کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا ھو القرض المشروط فیه الاجل و زیادة مالٍ علی المستقرض (وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لیے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم دے گا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور ابن عربی اور امام جصاص کی وضاحت سے ربا کی تعریف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد وہ معین اضافہ ہے جو ایک قرض دینے والا مجرد مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام میں بھی یہ اصطلاح اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے اور آج بھی اسی کو سود کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی دو شکلیں رائج تھیں جنہیں اہل عرب ربا کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہو گی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ لیکن تمام صورتوں میں اصل حقیقت ایک ہی تھی کہ قرض دینے والا قرض دار سے معین شرح پر صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اور اس بات کو اس حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں تھا کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا تھا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے، یا تجارت، زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ قرض لینے والا امیر ہے یا غریب اور دینے والا کاروبار کے لیے دے رہا ہے یا ذاتی ضرورت کے لیے۔ جس قرض پر یہ ایک متعین اضافہ طے کیا گیا ہے اسے جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی ربا کہا گیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں نہ جانے آج تک یہ بحث کیوں جاری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جس سود کو حرام قرار دیا گیا تھا وہ دراصل مہاجنی سود تھا جو ایک ضرورتمند اپنی انتہائی ضرورت پورا کرنے کے لیے کسی ساہوکار سے قرض لیتا تھا اور کسی کی ضرورت

Marfat.com

سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ اصل زر سے زائد وصول کرنا اور اگر وہ وقت پر ادا نہ کرے تو شرح سود کو بڑھاتے جانا یہ یقیناً ایک ایسا ظلم ہے جسے کوئی معاشرہ بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن کاش سود کی وکالت کرنے والے اس کی طرف توجہ دے سکیں کہ تم بینکوں اور کاروباری سود کو حلال کرنے کے لیے جو اس طرح کی موشگافیاں کرتے ہو اس کے نتیجے میں سود کی حرمت کا تصور ہی دماغوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ جب اصل حرمت ہی باقی نہ رہی تو پھر کون اس بکھیڑے میں پڑے کہ کونسا سود ظلم ہے اور کونسا نہیں۔ چنانچہ آج بھی کاروباری سود کے ساتھ ساتھ مہاجنی سود بھی پوری طرح ان معاشروں میں جاری وساری ہے جن میں سود کی حرمت کا احساس مر چکا ہے۔

عہد نبوت کو سمجھنے میں کوتاہی

خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ کچھ دانشوروں نے عہد نبوت کو سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ زمانہ انتہائی پسماندگی کا زمانہ تھا۔ عرب صحرا نشین تھے انتہائی سادہ اور معمولی زندگی گزارتے تھے۔ گلہ بانی پر ان کا گزارہ تھا۔ اگر کہیں کوئی تجارت ہوتی بھی تھی تو گندم اور جو وغیرہ کی۔ یہ جنسیں ایک دوسرے کے تبادلے میں بکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں تجارت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ تو جب ان میں تجارت ہی سرے سے مفقود تھی تو کمرشل لون یا کمرشل انٹرسٹ کا اس زمانے میں کیا تصور ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے کے حالات سے جو شخص کسی حد تک بھی واقف ہے وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ نہر سویز کے وجود میں آنے سے پہلے تک اور بڑے بڑے بحری جہازوں کی ایجاد سے قبل مشرق ومغرب کی تجارت خشکی کے راستے سے ہوتی تھی اور اس وقت تجارتی کاروانوں کی راہ گزر جزیرہ نما عرب تھا۔ عرب کے لوگ عموماً اور اہل مکہ خصوصاً تجارت میں خوب حصہ لیتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے سردیوں میں یمن وفارس کی طرف اور گرمیوں میں شام وروم کی طرف باقاعدگی سے جاتے تھے اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جو قافلہ شام سے ابوسفیان کی قیادت میں مکہ واپس آ رہا تھا اور جو جنگ بدر کا سبب بنا اس میں تمام اہل مکہ کا سرمایہ تھا۔ مکہ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے اس میں اپنا حصہ نہ ڈالا ہو۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی تھا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے ''جائنٹ اسٹاک کمپنیاں جدید دور کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے ان کا تصور تک نہیں تھا'' یہ بالکل غلط ہے۔ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' تھا۔ بلکہ مختلف قبائل مل کر بھی ایک کمپنی کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ پورے مکے والوں نے جائنٹ اسٹاک کمپنی کی طرز پر ایک ایک دینار اکٹھا کر کے ایک تجارتی کارواں تیار کیا تھا۔ جسے ابوسفیان ملک شام لے کے گئے تھے۔ اور یہ اتنا بڑا کاروان تھا کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور مقصود صرف یہ تھا کہ اس سے حاصل ہونے والے نفع سے مسلمانوں کا استیصال کیا جائے۔ اس قافلے کے علاوہ بھی عرب کا ہر قبیلہ اسی طرز پر اپنا کاروبار کرتا تھا کہ قبیلہ کے تمام لوگ مقدور بھر اپنی پونجی لا کر ایک جگہ جمع کرتے اور پھر اس سے ایک قافلۂ تجارت وجود میں آتا تھا۔ اندازہ فرمایئے کہ جس شخص کو پورا قبیلہ اپنے قرض کا امین بنا کر تجارت کے لیے بھیجتا تھا کیا وہ ایک غریب آدمی کو قرض دیتے تھے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو مستقلاً تجارت پیشہ لوگوں کو تجارت کے لیے قرض دیتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب سود حرام کیا گیا تو بعض لوگوں کا سودی کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور یہ سارا تجارتی سود تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں آج کے دن جن جن لوگوں کا سود دوسرو

Marfat.com

کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔ اور روایات میں آتا ہے کہ حضرت عباسؓ کا سود جو دوسروں کے ذمے تھا وہ دس ہزار مثقال سونا تھا۔ اور ایک مثقال تقریباً چار ماشے کا ہوتا ہے۔ اور یہ دس ہزار مثقال اصل سرمایہ نہیں تھا بلکہ یہ وہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب الادا تھا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار مثقال سونے کا سود لگ گیا ہو کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضروریات کے لیے لیا گیا تھا؟ یقیناً وہ قرض تجارتی مقاصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

عہد صحابہؓ میں بینکاری کی مثال

عہد صحابہؓ میں تو ہمیں بینکاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا حواری فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے۔ لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لا کر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقم بطورِ قرض لیتا ہوں تاکہ اگر یہ ضائع ہو جائے تو میرے ذمے اس کی ادائیگی ضروری ہو۔ اور پھر آپؓ اس رقم کو تجارت میں لگاتے' چنانچہ جس وقت آپؓ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا حساب لگایا تو بائیس لاکھ دینار نکلے۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں تجارتی قرضوں کا لین دین تھا۔ اور قرآنِ کریم نے اسی پر زیادتی کو سود قرار دے کر حرام ٹھہرایا ہے۔ اس لیے سود کی حرمت سے راستہ نکالنے کے لیے اس طرح کے مفروضے قائم کرنا کہ اس زمانے میں کمرشل لون نہیں ہوتے تھے یہ سراسر ایک عذر لنگ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کمپاؤنڈ انٹرسٹ یعنی مرکب سود تھا۔ اور قرآنِ کریم نے اسی کو حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد یعنی سمپل انٹرسٹ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ حالانکہ آگے قرآنِ کریم میں آیت آ رہی ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ جو تمہارا سود باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اس میں کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اور اگر تم سود سے توبہ کر لو تو تمہارا جو راس المال ہے وہ تمہارا حق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی سی بھی زیادتی تمہارے لیے ناجائز ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر طرح کے سود کو حرام قرار دیا ہے چاہے وہ سود مفرد ہو یا مرکب' وہ ذاتی ضرورتوں کے لیے دیا جائے یا تجارتی اغراض کے لیے' سود کی حرمت پر ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بینکنگ انٹرسٹ بھی حرام ہے

جہاں تک بینکنگ انٹرسٹ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سالوں تک یہ بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ جس سود کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان میں بینکنگ انٹرسٹ بھی شامل ہے یا نہیں؟ لیکن اب ساری دنیا کے علماء اور ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے۔ اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے کسی قابل ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں' غالباً 1990ء یا کم و بیش جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں تقریباً پینتالیس مسلم ملکوں کے دو سو جلیل القدر علماء شریک ہوئے تھے۔ سب نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا تھا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے' اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔

Marfat.com

تجارت اور سود میں فرق

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کی عقلیں اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آخر ربا میں اس کے سوا کیا چیز ہے کہ اپنے پیسے کے ذریعے آدمی دوسرے سے پیسہ کماتا ہے؟ جس طرح ایک تاجر تجارت کے ذریعے پیسہ کماتا ہے اور اپنے مال کو تجارت میں صرف کر کے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح سود لینے والا بھی اپنا مال قرض دے کر اس کے بڑھانے کی تدبیر کرتا ہے۔ آج کل بھی سود کو جائز سمجھنے والے اسی دلیل کا سہارا لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سود کو بیع پر قیاس کرنے والوں کی نسل دنیا میں نئی ہے۔ یہ ایک دیوانگی ہے کیونکہ اگر ان پر حب دنیا دیوانگی کی شکل اختیار نہ کرے تو وہ بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک تاجر اور سود خور میں آخر کیا نسبت ہے؟ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسی چیز کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے صرف مال ہی کو حرکت میں نہیں لاتا بلکہ رات دن اس کے لیے محنت کرتا ہے' زحمت اٹھاتا ہے' دوڑ بھاگ کرتا ہے' وقت صرف کرتا اور نیندیں حرام کرتا ہے اور مسلسل محنت کے بعد لوگوں کو وہ اشیائے ضرورت فراہم کرتا ہے کہ لوگ اگر اس کو خود حاصل کرنا چاہتے تو کبھی حاصل نہ کر سکتے اور اگر حاصل کرتے تو کم از کم اس قیمت پر حاصل نہ کر سکتے جس قیمت پر ایک تاجر انہیں مہیا کرتا ہے۔ پھر اس محنت و ریاضت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سرمائے کو تجارت کے اتار چڑھاؤ کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ یقیناً اپنا مالِ تجارت بازار میں نفع کی نیت سے لاتا ہے' لیکن بازار کا اتار چڑھاؤ تو اس کے قبضہ میں نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سامان کی قیمتیں گر جائیں اور تاجر نقصان کا شکار ہو جائے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیمتیں مستقیم رہیں اور بازار ایک روش پر چلتا رہے تو تاجر اپنے مالِ تجارت سے نفع کما لے۔ لیکن اس کو ملنے والا نفع جن خطرات سے گزرتا ہے اور جس محنت کے سہارے آگے بڑھتا ہے اس کا یقیناً یہ صلہ ہونا چاہئے کہ تاجر کو یہ نفع ملے اور وہ بجا طور پر جائز سمجھا جائے۔ لیکن اس کے بالمقابل سود پر قرض دینے والا اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ اپنے مال کو حرکت میں لاتا ہے اور طے شدہ نفع پر مال کسی شخص یا کسی پارٹی کے حوالے کرتا ہے۔ اگر یہ مال کسی کی ذاتی ضرورت کے لیے دیا جاتا ہے تو پھر تو اس پر سود لینے کی شناعت اور کراہت میں کلام ہی نہیں کہ مریض اپنے علاج میں اس مال کو صرف کرتا ہے' بھوکا اپنے طعام میں' ننگا اپنے کپڑوں' بے مکان مکان بنانے میں' لیکن یہ شخص آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا صرف اصل زر نہیں بلکہ اس کا سود بھی وصول کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ ضرورت مند وقت پر مال ادا نہیں کر سکتا تو اس کا سود بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ قرض دار کا گھر در' اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ قرض لینے والے پر قیامت گزر جائے سود لینے والے کی ایک دمڑی کم نہیں ہوتی۔ اسے نہ بازار کے اتار چڑھاؤ سے واسطہ پڑتا ہے' نہ اسے کوئی زحمت اٹھانا پڑتی ہے' ہر صورت میں اس کا نفع مستحکم ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رفاہی کاموں' اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کے لیے حکومت امراء سے قرض لیتی ہے اور یہ قرض بھی سود پہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً ملک میں سیلاب آ گیا۔ اب سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے حکومت ضروری انتظامات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے حکومت کے خزانے میں گنجائش نہیں۔ تو ملک کے امراء سے قرض لیتی ہے۔ ابھی سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے بند بنائے جا رہے تھے' پلوں کی مرمت ہو رہی تھی' کنارے دریاؤں کے اونچے کیے جا رہے تھے اور ضروری انتظامات کا سلسلہ جاری تھا کہ بارشیں شروع ہو گئیں اور بارشوں کی شدت سے دریاؤں میں سیلاب آ گیا۔ جتنا کام ہوا تھا وہ سب سیلاب کی نذر ہو گیا لیکن جو اس کام کے لیے قرض لیا گیا تھا اس کی

Marfat.com

ادائیگی سود سمیت حکومت کے ذمے لازم ہے۔ اور یہ قرض دینے والے اسی ملک کے رہنے والے ہیں جس کی منصوبہ بندی پر یہ خرچ ہو رہا تھا' لیکن اس نقصان کی تلافی کا بوجھ پورے ملک کے امیروں اور غریبوں پر پڑے گا۔ لیکن یہ قرض دینے والے' قرض چھوڑنا تو دور کی بات ہے اپنی سود کی معین شرح میں کوئی کمی کرنا بھی گوارا نہیں کریں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا سود بڑھتا چلا جائے گا۔ اندازہ فرمایئے کہ ایسے سودی کاروبار کا تجارتی کاروبار سے کیا مقابلہ؟ اور ان کی آپس میں کیا مشابہت؟ دنیا میں ہر کاروبار محنت چاہتا ہے اور ہر سرمایہ نقصان کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے اور کسی بھی کاروبار میں حتمی منافع کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی' لیکن ایک قرض دینے والا ایسا کاروباری ہے کہ جس کے سرمائے کی حفاظت یقینی ہے اور جس کا متعین نفع کبھی نقصان سے دوچار نہیں ہوتا۔ اگر دنیا میں انصاف کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو انہیں خود سوچنا چاہیے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت' اپنی محنت' اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بارآور ہونا موقوف ہے' ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو' بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل انہی کے سر پر ہو' مگر جس نے صرف اپنا روپیہ انہیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے' آخر کس عقل' کس منطق' کس اصولِ انصاف اور کس اصولِ معاشیات کی رو سے درست ہے؟

تجارت اور سود کے درمیان اصولی فرق کی وجوہ

صاحب تفہیم القرآن نے تجارت اور سود کے اصولی فرق کے حوالے سے چار بنیادی باتیں کہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے استفادہ کیا جائے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے' کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اس محنت' ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے' جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے' جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے' لیکن اس کے مقابلے میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے' جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے' یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے' بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے' ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خوہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو' بہر طور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی' اس کے

Marfat.com

تمام وسائل معیشت، حتی کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرائے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صرف نہیں ہوتی، بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ مالکِ جائیداد کو واپس دے دی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملے میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسرے کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی ''شریک'' کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلالحاظ نفع و نقصان اور بلالحاظِ تناسبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔''

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و امداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوع انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔ (ماخوذ از: تفہیم القرآن)

سود کے نقصانات

بعض لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی جو صرف عقل سے سوچتے ہیں اور عقل ہی کے ترازو میں مذہب کو بھی تولتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ تجارت اور سود یکساں نہیں، ہر لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے، لیکن اگر ایک شخص کسی کو اپنا سرمایہ قرض پر دے کر اسے کارو... کرنے کی سہولت مہیا کرتا ہے اور وہ اس سے ڈھیروں کماتا ہے، اس میں سے سرمائے کا مالک اگر ایک متعین حصہ لے لیتا ہے تو اس میں آ... حرج ہی کیا ہے؟ گزارش یہ ہے کہ اس میں سب سے بڑا حرج تو یہ ہے کہ یہ اللہ کے احکام کی صریح نافرمانی ہے۔ حلت و حرمت کا اختیار اور ج... و ناجائز کی اتھارٹی سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا حکم آخری حکم ہے۔ جس میں اس کا رسول بھی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ سود کو چونکہ وہ حرام کر... ہے اور جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کرنے والے کو جہنم میں بھیجنے کی دھمکی دیتا ہے تو جو شخص اپنا سرمایہ کسی بھی سودی کاروبار میں لگاتا ہے وہ ا... کے حکم کو توڑتا ہے اور اس کا نقصان یہ ہے کہ ایسا شخص جہنم کا ایندھن بنے گا۔ لیکن محض سمجھانے کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام کا نقطۂ... بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ جب تم کسی شخص کو قرض دیتے ہو تو تمہاری نیت کیا ہے؟ تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر اس پر معاوضہ کیسا؟... کی صورت میں عوض اور معاوضہ بے معنی چیز ہے۔ اور اگر تم اسے قرض دے کر کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہو تو پھر تمہیں معقولیت اور سیدھے طریقے سے کاروبار میں شریک ہونا چاہیے۔ کاروبار میں شریک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ تمہارا ہو اور محنت دوسرے کی اور نفع میں تم د...

Marfat.com

طے شدہ تناسب سے شرکت کرو۔ یہ وہ معقول بات ہے جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ لیکن اسے وہ غور کے قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ایک شخص دوسرے کو کاروبار کے لیے سرمایہ دیتا ہے اور پھر اسے یہ کہتا ہے کہ میں اتنے فیصد تم سے نفع لوں گا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اسے کاروبار میں نفع ہوتا ہے یا نقصان۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دینے والا اپنا سرمایہ اور اس پر متعین نفع تو محفوظ رکھنا چاہتا ہے لیکن محنت کرنے والا اور جان مارنے والا جس کی روزی کا دارومدار ہی اس کاروبار پر ہے اس کے لیے کوئی ضمانت نہیں۔ اگر وہ گھاٹے کا شکار ہو جاتا ہے تو نقصان سارا اس کی گردن پر ہوگا۔ یہ وہ ظلم ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ آج کل جوائنٹ سٹ کا نظام رائج ہے اس میں آپ جانتے ہیں کہ ایک متعین شرح سود پر کاروبار کے لیے بینک قرض دیتا ہے۔ فرض کیجئے بینک نے اسے ایک کروڑ روپیہ قرض دیا۔ ذرا غور کیجئے یہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے آیا؟ یہ ایک کروڑ روپیہ بینک کا نہیں بلکہ ڈیپازیٹرس کا ہے۔ یعنی قوم کے ان افراد کا ہے جنہوں نے بینک میں اپنے اکاؤنٹس کھلوا رکھے ہیں۔ کاروبار کرنے والے کو سو فیصد نفع ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک کروڑ پر ایک کروڑ کمایا۔ اس نے بینک سے پندرہ فیصد شرح سود سے قرض لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پندرہ لاکھ بینک کو ادا کیا اور پچاسی لاکھ کا اسے فائدہ ہوا۔ بینک نے اس میں سے اپنے اخراجات نکال کر باقی سات فیصد یا دس فیصد ڈیپازیٹرس کو دیا۔ یعنی جن لوگوں کے سرمائے سے یہ کاروبار کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروبار کرنے والے نے تو سو فیصد فائدہ اٹھایا اور کھاتہ دار کے حصے میں دس فیصد آیا۔ لیکن وہ سو میں سے دس روپے لے کر بھی خوش ہے کہ مجھے دس روپے نفع ہوا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے پیسوں سے سو فیصد کمایا گیا اور اسے دس فیصد پر ٹرخا دیا گیا ہے۔ اس پر بھی مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض دفعہ یہ دس روپے جو نفع میں دیے گئے ہیں قرض لینے والا یہ بھی وصول کر لیتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قرض لینے والا ان دس روپوں کو پیداواری اخراجات یعنی کاسٹ آف پروڈکشن میں شامل کر لیتا ہے۔ فرض کیجئے اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر ایک فیکٹری لگائی یا کوئی چیز تیار کی۔ تو تیاری کے مصارف میں پندرہ فیصد بھی شامل کر دیے جو اس نے بینک کو ادا کیے تھے۔ تو اب جو چیز تیار ہوگی اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی لہٰذا ڈیپازیٹر جسے ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے جب وہ بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے پندرہ فیصد وصول کر لیا گیا۔ ڈیپازیٹر بیچارہ خوش ہے کہ مجھے سو کے ایک سو دس روپے مل گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کو سو روپے کے بدلے پچانوے روپے ملے۔ اس لیے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کاسٹ میں چلے گئے۔ اور دوسری طرف پچاسی فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلا گیا۔ اگر یہ سارا کاروبار شرکت کی بنیاد پر ہوتا اور یہ پہلے سے طے کر لیا جاتا کہ پچاس فیصد نفع سرمایہ لگانے والے کا ہوگا اور پچاس فیصد کام کرنیوالے کا تو اس صورت میں کھاتہ داروں کو پندرہ فیصد کی بجائے پچاس فیصد نفع ملتا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کھاتہ دار ہر صورت میں نقصان میں رہتا ہے۔ لیکن بظاہر اسے سود کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بینکنگ سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں بعض دفعہ تو یہ ظلم اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ فرض کیجئے کہ کسی نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر تجارت کی۔ اس تجارت میں اس کو نقصان ہو گیا۔ اور بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہو گیا۔ غور کیجئے بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں روپیہ کس کا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ڈیپازیٹرس یعنی عوام کا روپیہ تھا' نقصان ہونے کی صورت میں وہ سارا روپیہ ڈوب گیا۔ کس قدر اندھیر نگری ہے کہ اگر نفع ہے تو سارے کا سارا قرض لینے والے کا اور اگر نقصان ہے تو سارے کے سارا ڈیپازیٹرس یعنی عوام کا۔

Marfat.com

مشارکت

اس لیے اسلام بالکل سیدھی بات کہتا ہے کہ تم کاروبار کو کاروبار کے طریقے سے کرو۔ سود کے حامیوں نے یہ بھی سمجھ رکھا ہے کہ آج کے دور میں کاروبار شاید سود کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لیکن اسلام نے اس کے متبادل بھی تجویز کیے ہیں۔ یہ اگرچہ تفصیل طلب بحث ہے اور نہایت ٹیکنیکل بھی۔ اس لیے ہم صرف نام کی حد تک اس کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں کہ انٹرسٹ کا اصل متبادل جسے کاروبار کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے وہ مشارکت ہے۔ یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لیے قرض لے رہا ہے تو قرض دینے والا یہ کہے کہ میں تمہیں قرض حسنہ نہیں دے رہا اور نہ تمہیں سود پر قرض دوں گا۔ بلکہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں' اگر تمہیں نفع ہوگا تو میں اس نفع میں شریک ہوں گا اور اگر نقصان ہوگا تو میں نقصان میں بھی شامل ہوں گا۔ اس طرح کاروبار کے نفع اور نقصان میں شرکت پر مبنی کاروبار مشارکت کہلاتا ہے۔ یہی سب سے بہتر متبادل ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر آج دنیا میں سو سے زیادہ بینک اور سرمایہ داری کے ادارے قائم ہو چکے ہیں اور وہ نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اور بعض جگہ مذہبی نگران کمیٹیاں بن چکی ہیں جن میں اقتصادی ماہرین کے ساتھ ساتھ علماء بھی موجود ہیں جو باقاعدہ اس کاروبار کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس میں اگرچہ عملی دشواریاں ہیں لیکن اگر کوئی ملک پوری کمٹمنٹ کے ساتھ اس طریقے کو اپنالے تو بڑی آسانی سے ان دشواریوں پر قابو پا سکتا ہے۔

اجارہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اصل متبادل تو مشارکت ہی ہے لیکن وقتی طور پر اجارہ یعنی لیزنگ کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور طریقہ مرابحہ یعنی فائینانسنگ بھی ہے۔ اجارہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے بینک سے قرض مانگا ہے تو بینک نے اس سے پوچھا کہ آپ کی ضرورت کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں اپنے کارخانے کے لیے باہر سے مشینری منگوانا چاہتا ہوں۔ تو بینک اگر اسے پیسے دینے کی بجائے مشینری خرید کر اسے کرایہ پر دے دے تو اسے اجارہ یا لیزنگ کہتے ہیں۔

مرابحہ

اسی طرح کوئی شخص بینک سے اس لیے قرض لینا چاہتا ہے کہ وہ خام مال خریدنا چاہتا ہے تو بینک اس کو خام مال خریدنے کے لیے پیسے دینے کی بجائے خود خام مال خرید کر اسے نفع پر بیچ دے اسے مرابحہ کہتے ہیں اور شریعت نے اسے جائز رکھا ہے۔ کیونکہ شریعت کے قانون کے مطابق روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا اور اسی طرح روپیہ پر منافع بھی نہیں لیا جاسکتا' لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز مال تجارت آجائے اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کرے اس کو شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ مرابحہ کے اندر بھی درمیان میں مال آجاتا ہے۔ اس لیے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا جائز ہے۔

Marfat.com

امرہ الی اللہ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا کہ جس شخص کے پاس یہ نصیحت پہنچ گئی اور کلام کے تیور دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ موعظۃ کا لفظ تنبیہ یا وارننگ کے معنی میں ہے۔ تو اس نے اب تک جو سودی کاروبار کیا' جو سود لیا' جو سود کھایا اور جتنا اس سے فائدہ اٹھایا وہ اس کے لیے ہے' یعنی اس پر قانونی گرفت نہیں ہوگی۔ اسلامی حکومت اس سے نہیں پوچھے گی کہ تم اپنے پچھلے کھاتے ہمیں دکھاؤ اور جن جن لوگوں سے تم نے سود لیا ان کا حساب دو تا کہ ان کی لی ہوئی رقمیں انہیں واپس دلائی جاسکیں۔ اگر ایسا ہوتا تو لامتناہی مقدمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس لیے اسلام نے اس قانونی رعایت کا احترام کرتے ہوئے اس حکم کے بعد نئی کاروباری زندگی کے آغاز کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سود لینے والے کو اطمینان سے بیٹھ جانا چاہئے۔ اب اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت سے تم چھوٹ گئے لیکن اب تمہارا معاملہ جس کے ساتھ ہے وہ تمہارے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ اس لیے اس کے سامنے جوابدہی کی تیاری کرو۔ اس کے سامنے جوابدہی کے لیے کم سے کم تیاری یہ ہے کہ اپنا معاشی اور اخلاقی نقطۂ نظر پوری طرح اسلام کے مطابق ڈھال لو۔ اور اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا اس کے اثرات جہاں تک ختم کیے جاسکتے ہیں انہیں ختم کرنے کی کوشش کرو۔ یعنی حرام ذرائع کی آمدنی کو اپنی ذات اور اپنے بچوں پر خرچ کرنے سے گریز کرو۔ اور جن جن لوگوں سے یہ حرام سرمایہ حاصل کیا گیا تھا اگر وہ مل جائیں تو انہیں واپس کرو۔ اور اگر اس کے مستحقین نہ ملیں تو کسی اجتماعی فلاح و بہبود پر اسے صرف کرو۔ اس سے امید ہے کہ اللہ کے یہاں جواب دہی آسان ہو جائے گی۔

اس کے بعد آخری وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ سود کی حرمت کے نازل ہو جانے کے بعد اور اسلامی حکومت کی طرف سے پوری طرح اس کی تبلیغ و اشاعت کے بعد اب بھی اگر کسی نے اس حرام فعل کا اعادہ کیا اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث رہا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ اور یہ وہ وقتی سزا نہیں بلکہ اس جرم کے نتیجے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا پڑے گا۔ جس آدمی کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی باقی ہے اسے اس سزا کے سن لینے کے بعد کبھی جرم کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے۔

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ ○

(اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ناشکروں اور حق تلفی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) (۲۷۶)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ نے ایک ایسی بات ارشاد فرمائی ہے جو بظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں ربا کے مقابلے میں صدقات کا لفظ آیا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ صدقات صدقہ کی جمع ہے اور صدقہ اپنے مال میں سے ایک حصہ یا اپنی اشیاء میں سے کوئی چیز اللہ کے راستے میں دینے کا نام ہے۔ اور ربا اپنے مال پر نفع لینے کا نام ہے۔ اصل راس المال محفوظ رہے اور اس کے ساتھ منافع بھی وصول ہو تو صاف نظر آتا ہے کہ مال بڑھ رہا ہے۔ لیکن اگر اصل مال میں سے بھی کچھ حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے تو یقیناً اصل مال میں کمی آجائے گی۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں اس کے برعکس ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ تم جسے اضافہ کا باعث سمجھتے ہو وہ کمی کا باعث ہے۔ اور جسے تم کمی کا سبب جانتے ہو وہ برکت اور اضافے کا سبب ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے گہری نگاہ کی ضرورت ہے۔ ایک بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ پروردگار جب

Marfat.com

کسی مال کے بارے میں فرمار ہے ہیں کہ وہ بڑھتا ہے اور دوسرے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ گھٹتا ہے اور پھر ایسا بھی نہیں کہ مال خود بخود گھٹتا یا بڑھتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک مال کو بڑھاتے ہیں اور ایک مال کو گھٹاتے ہیں تو اسے دیکھتے ہوئے ایک مسلمان اس بات میں تو شبہ نہیں کر سکتا کہ پروردگار کا یہ ارشاد غلط بھی ہوسکتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمیں سمجھنے میں دشواری پیش آئے یا ہماری عقل نارسا ثابت ہو لیکن اس حقیقت کے صحیح ہونے میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا یہ ارشاد اپنے اندر کیا معنویت رکھتا ہے۔

صدقات کے بڑھنے اور سود کے گھٹنے کا مفہوم

بعض اہل علم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ گھٹنا اور بڑھنا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے' بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ دنیا کی زندگی ہی حقیقی اور مکمل زندگی نہیں بلکہ اس زندگی کی تکمیل قیامت کو ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ یہ زندگی تو چندروزہ اور فانی ہے اور دوسری زندگی حقیقی اور ابدی ہے۔ یہاں کسی فائدے کا مل جانا ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی کو چار دن کی چاندنی مل جائے اور اس کے بعد اسے لمبی رات سے واسطہ پڑے۔ لیکن اگر کسی شخص کو دوسری اور اخروی زندگی میں کوئی نعمت نصیب ہوتی ہے تو درحقیقت وہ نعمت ہے جو ہمیشہ رہے گی اور جو قابل ذکر بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیوی زندگی کا خاتمہ ایسا ہی ہے جیسے آدمی سو جاتا ہے اور اخروی زندگی کا طلوع ایسے ہی ہے جیسے آدمی نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ ایک سودی کاروبار کرنے والا جب اخروی زندگی کے ظہور کے بعد اپنی نیند سے بیدار ہوگا تو اس کے ذہن میں یقیناً یہ تصور موجود ہوگا کہ بنکوں میں میرا لاکھوں کا سرمایہ موجود ہے' لیکن جیسے ہی حقیقت اس کے سامنے ظاہر ہوگی تو وہ دیکھے گا کہ خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں۔ لیکن اس کے مقابل جب اللہ کے راستے میں انفاق کرنے والا اخروی زندگی میں اٹھے گا تو وہ دیکھے گا کہ اس نے جو اپنی بساط کے مطابق اللہ کے راستے میں ایک محدود مال خرچ کیا تھا اس کے بدلے میں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے انبار اس کے انتظار میں ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ اس کے خزف ریزے آخرت میں موتیوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سود لینے والے کا مال نہ صرف اللہ کم کرتا ہے بلکہ آخرت میں بالکل تباہ کر دیا جائے گا۔ البتہ اس کا اثر سودخور کے انجام پر یہ پڑے گا کہ وہ صدیوں تک اس کی سزا بھگتے گا۔ لیکن اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والا' اللہ کی طرف سے بیش بہا اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔ اسی لیے سورۂ روم کی آیت ۳۹ میں ارشاد فرمایا ہے وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو تا کہ وہ لوگوں کے مال میں پل کے بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور یہ جو تم زکوۃ دیتے ہو اس کی رضا طلبی میں تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ارشادِ گرامی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے اور پھر وہ اس کی تمہارے لیے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کی پرورش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تمہارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا۔''

Marfat.com

سود کے مضر اثرات مختلف پہلوؤں سے

جہاں تک آخرت میں اللہ کے بندوں کو دیا ہوا قرض اور اللہ کے راستے میں دیے گئے صدقات کا تعلق ہے اس کے بڑھنے میں تو کوئی شبہ نہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں سود سے کمایا ہوا مال و دولت اور سودی کاروبار اپنے حقیقی نتائج کے اعتبار سے بڑھتا نہیں بلکہ کم ہوتا ہے۔ البتہ ہمیں اسے سمجھنے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ مال و دولت کے اعتبار سے صرف اعداد و شمار پر رہتی ہے وہ تو یقیناً اسی نقطہ نگاہ سے قوم کی ترقی اور ملک کے وسائل کی افزائش کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کا معیار صرف یہ ہوتا ہے کہ ملک میں لگائے گئے ٹیکسوں سے کتنی آمدنی ہوئی' سی بی آر نے کتنا کسٹم اکٹھا کیا' ہمارے کھیتوں نے کتنا غلہ اگلا' ہمارا زر مبادلہ کس سطح تک پہنچ گیا ہے' ان کے لیے یہ بات سمجھنا تو واقعی مشکل ہے۔ البتہ جو لوگ دولت کو اخلاق اور تمدن سے الگ رکھ کر نہیں بلکہ اس کے خادم کے طور پر دیکھتے ہیں وہ سب سے پہلے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کمایا اس کے ملک و ملت پر کیا اثرات پڑے؟ ہماری قوم کے افراد میں کس طرح کی ذہنیت پیدا ہوئی؟ اس مال و دولت کی وجہ سے کس طرح کے اخلاق وجود میں آئے؟ کیونکہ مال افراد اور قوم کی ضرورت کے تحت وجود میں آیا ہے۔ بجائے خود اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ملک کا زر مبادلہ بڑھتا جائے لیکن ساتھ ساتھ غریب کے جھونپڑے میں چراغ کی لو مدھم پڑتی جائے تو اسے بڑھنا نہیں گھٹنا کہتے ہیں۔ مال و دولت میں وسعت آئے لیکن طبیعتوں میں بخل' سنگدلی' خودغرضی جیسی صفات پیدا ہو جائیں تو دولت کے ان خزف ریزوں کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اس لیے جو دولت اور جو کمائی اخلاق کے زوال تمدن میں انتشار اور باہمی تعلقات کے بگاڑ کا سبب بنے' اسے بڑھنا نہیں گھٹنا کہنا چاہیے۔ اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو آپ اتفاق کریں گے کہ صدقات انفاق فی سبیل اللہ اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ افراد میں فیاضی' ہمدردی' فراخدلی اور عالی ظرفی جیسی صفات پیدا کرتے ہیں۔ اور جیسے جیسے یہ بے غرض لین دین بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے افراد ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں اور قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس سود انسانوں میں بالکل دوسری طرح کی صفات پیدا کرتا ہے۔ سود کمانے والا شخص کبھی فیاض نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس کے دل میں کبھی رحم دلی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ اتنا تنگ دل اور سنگدل واقع ہوتا ہے کہ ملک و ملت کی بڑی سے بڑی ضرورت' اس کی تجوری کا دروازہ نہیں کھول سکتی۔ اسے انسانوں سے نہیں اپنی دولت سے واسطہ ہوتا ہے۔ ملک کدھر جا رہا ہے؟ ملک کے حالات کیسے ہیں؟ غربت کہاں تک پہنچ گئی ہے؟ خود اس کے ہمسائے کس حال میں ہیں؟ یہ باتیں اس کے لیے اجنبی ہوتی ہیں۔ وہ رات دن اپنی دولت کو نشوونما دینے کی سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ ایسے لوگ اگر سوسائٹی میں ایک بڑی تعداد میں پھیل جائیں اور معاشرہ انہی افراد کے زیر اثر پرورش پائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم کے تمدن کا کیا بنے گا۔ ایسی قوم میں طبقات میں اضافے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ مالدار طبقہ روز بروز مالدار ہوگا اور غریب طبقہ میں غربت بڑھتی چلی جائے گی۔ دونوں کے درمیان پہلے تعلقات ٹوٹیں گے' پھر اس کی جگہ نفرتیں لیں گی۔ افراد میں آپس کی محبت کی بجائے باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نشوونما پائے گی۔ اس معاشرے کے افراد کسی بھی وقت باہمی تصادم کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو خدانہ کرے کہ اس قوم پر باہر سے حملہ ہو جائے تو ملک کی اکثریت مالداروں کے ظلم میں پسنے اور ریاست کی بے تعلقی کے باعث ریاست سے بے تعلق ہو جائے گی اور وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ہاتھ ہلانا بھی گوارا نہ کرے گی۔ ملک کی سالمیت تباہ ہو جائے گی اور قوم انسانوں کی بھیڑ بن کے رہ جائے گی۔ اندازہ فرمائیے ایسی صورتِ حال میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سودی کاروبار میں اضافہ ہوا۔ اور وہ اضافہ ملک کے لیے خیر و برکت کا باعث بنا۔

Marfat.com

جس قوم کی کوئی اخلاقی اقدار نہ ہوں' روحانی تصورات نہ ہوں' اوراس کے پاس کوئی منزل من اللہ دین نہ ہو اس کی اخلاقیات اور اس کی اقدار کاروبار کے نشیب و فراز سے وجود میں آتی ہیں۔ اور وہ قوم از اول تا آخر ایک کاروباری قوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں سودی کاروبار ایک عرصے تک پھل پھول سکتا ہے' لیکن دیرپا کبھی نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی اپنے سارے وسائل کے باوجود غربت کا علاج کرنے سے قاصر رہتی ہیں اور مجموعی طور پر ایسی قومیں دوسری قوموں کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ آج دنیا کی بالا دست قومیں اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن جس قوم کا ایک روحانی نظام ہو' اس کے خاص تصورات ہوں' اس کی اخلاقی اقدار ہوں' وہ ایک منزل من اللہ دین رکھتی ہو' وہ کبھی اپنے احساسات' اپنے مقاصد' اپنی اقدار اور اپنے تصورات سے ہٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے یہاں کاروبار' ان تصورات سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کاروبار کا جو طریقہ ان تصورات کو نقصان پہنچاتا ہے وہ تصادم کو جنم دیتا اور قوم کی وحدت کو تباہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ربا اور سود قومی وحدت کو توڑنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کو اپنی وحدت عزیز ہے تو اسے اس طرح کی ہر اسکیم' ہر کاروبار اور ہر کوشش کو قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیے۔

معاشی نقطۂ نظر سے

معاشی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو سودی کاروبار ترقی اور اضافے کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ نقصان اور تنزل کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشیات کے نقطۂ نگاہ سے سودی قرض کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ قرض جو ضرورت مند اور حاجت مند لوگ اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ساہوکاروں سے لیتے ہیں۔ اور دوسرا وہ قرض جو تجارت' صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کے قرض کا تعلق ہے اس سے تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ یہ ایک تباہ کن قرض ہے جس میں قرض دینے والے ادارے پلتے' بڑھتے اور ترقی پاتے ہیں۔ لیکن قرض لینے والے غریب' مزدور' کاشتکار اور بے وسیلہ لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اصل قرض ادا کرنا ہی مقروض کے لیے آسان نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس پر سود کا بوجھ لاد دیا جائے۔ اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سود کی رقم میں اضافہ بھی ہوتا جائے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ مقروض اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کرتا ہے' اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر قرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی صحت روز بروز گرتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب وہ صحت کی توانائی کے ساتھ قرض ادا نہ کرسکا اور سود ادا کرتے کرتے اس کی کمر ٹوٹ گئی تو اب وہ کمزور صحت اور علاج کے اخراجات کے بوجھ سمیت کس طرح سودی قرض ادا کر سکے گا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ محنت سے روزی کمانے والوں کی ہر معاشرے میں اکثریت ہوتی ہے جب وہ اس طرح کی مصیبتوں میں ڈوب کر صحت کھو دیتے ہیں تو محنت کرنے والے ہاتھ روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی کمی کے باعث ملکی معیشت تنزل کا شکار ہو جاتی ہے۔ غیر جانبداری سے غور فرمایئے کہ ملکی معیشت کے تنزل کا سبب کون بنا؟ اگر اس معاشرے میں صدقات کا چلن ہوتا' ہمدردی اور خیر خواہی ہوتی' ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ ہوتا' بلا سود قرض ملنے کے امکانات ہوتے تو غریب لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کے امکانات سے مایوس نہ ہوتے۔ ان کے کام کی صلاحیت میں کمی نہ آتی۔ ان کی صحتیں ضرورت سے زیادہ محنت کے کام نہ آتیں۔ سرمایہ بہت سے ہاتھوں میں پھیل کر ملکی معیشت میں ترقی کا باعث ہوتا' لیکن جب اس کے بالکل برعکس ہم نے ان لوگوں کو سود کے حوالے کر دیا تو اس کا نتیجہ تنزل کی شکل میں نکلا۔ اور بعض دفعہ تو صورتِ حال اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی ایسے ملک میں کسی انقلاب کی فضا پیدا ہو جائے تو

Marfat.com

دولت مندوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگ اپنی محرومیوں کا حساب ان دولت مندوں سے لیتے ہیں۔ پھر کوئی محل کھڑا نہیں رہتا' کوئی تجوری سلامت نہیں رہتی' سڑکوں پہ خون بہتا ہے۔ یہ انجام ہوتا ہے غریب معاشرے میں سود اور سودی ذہنیت کے عام ہونے کا۔

جہاں تک دوسری قسم کے سود کا تعلق ہے جو تجارت' صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ پر دیا جاتا ہے' اس کی صورتِ حال بھی بہت دلچسپ ہے۔ سود دینے والے ادارے سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ سود پر قرض لینے والا ہمارا سرمایہ کس طرح کے منصوبے پر خرچ کرنا چاہتا ہے؟ اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس منصوبے کے لیے قرض مانگا جا رہا ہے وہ ملک وملت کے لیے چاہے جتنا بھی ضروری ہو لیکن منافع کے نقطۂ نگاہ سے اس میں افزائش کے امکانات بہت کم ہیں تو وہ ایسے کام کے لیے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ تو ایسے کاموں پر قرض دیتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ منافع لا سکتے ہیں' چاہے ان کی ملک کو ضرورت ہو یا نہ ہو؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے جو اجتماعی حیثیت سے انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یا کم از کم مفید نہیں ہوتے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ ایسے سودی قرض کے نتیجے میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ قرض دینے والوں کو فائدہ پہنچے اور قرض لینے والے بھی ذاتی طور پر کچھ کما لیں لیکن اگر ملکی معیشت چند افراد کا نہیں پوری ملک کی نسبت سے دیکھی جاتی ہے تو غیر ضروری کاموں پر خرچ ہونے والا سرمایہ نہ صرف کہ ملکی معیشت کو کوئی سنبھالا نہیں دیتا بلکہ ملک کو ترقی دینے والے کام اور اجتماعی ضرورتیں دیکھتی رہ جائیں گی اور سرمایہ کسی اور طرف نکل جائے گا۔ اس لیے جب ملکی حیثیت سے دیکھا جائے گا تو صاف معلوم ہوگا کہ سودی ذہنیت اور سودی قرض نے اس ملک کی معیشت کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔

اس کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ کہ سود پر قرض دینے والا شخص یا ادارہ کاروبار کے نفع نقصان سے زیادہ اپنے سود کی حفاظت کی فکر کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ قرض لینے والوں نے سرمایہ ایک ایسے کاروبار پر لگایا ہے جس میں کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے تو وہ صرف اس اندیشے سے ہی اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرنے لگتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی خود غرضی کے باعث تجارت کی دنیا پر واقعی کساد بازاری کا حملہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کہیں کسی دوسرے سبب سے کساد بازاری آ گئی ہے ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔ اندازہ فرمائیے کہ ایسی صورتِ حال میں معیشت میں اضافہ ہوگا یا دھچکا لگے گا اور سرمایہ بڑھے گا یا کم ہوگا۔

ان میں سب سے زیادہ سہل اور آسان بات یہ ہے کہ بعض دفعہ سودی سرمایہ خود بخود ہلاک ہو جاتا ہے اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے ڈوبتا ہے' جس طرح ربا اور سٹہ کے بازاروں میں ہمیشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر ہو گئے۔ بلا سود تجارت میں بھی اگرچہ نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ نقصان ہو بھی جاتا ہے لیکن ایسا نقصان کبھی نہیں ہوتا کہ کل کروڑ پتی تھا اور آج ایک ایک پیسہ کا محتاج ہو جائے۔ یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں میں ہوتا ہے۔ حضرت معمرؒ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر تباہی آ جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سود بظاہر ایک منافع کا نام ہے۔ سرمایہ دار اپنے سرمائے پر ایک متعین شرح سے سود لے کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے پیچھے ایک ذہنیت کارفرما ہے۔ جس ذہنیت کے پیدا ہو جانے کے بعد سرمایہ انسان کی ضرورت نہیں رہتا' بلکہ مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ اور مقصدِ زندگی بھی ایسا جس کی پوجا کی جاتی ہے' جس کے سامنے ایمان کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ تمام انسانی رشتے اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں' اخلاقی اقدار اس کے سامنے دم توڑ جاتی ہیں' ایک فرد فرد سے غیر متعلق ہو جاتا ہے اور قوم قوم سے رشتہ توڑ لیتی ہے' دو دوست آپس میں اس وقت تک دوست رہتے ہیں جب تک ان میں مالی ضرورت پیدا ہونے کے باعث قرض لینے یا دینے کی نوبت نہیں آتی۔

Marfat.com

قومیں اگر فضائل اخلاق سے زندہ رہتی ہیں اور مال ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور مقاصد کو جلا دیتا ہے اور معاشرتی رشتے اگر معاشرتی اخلاق سے وجود پذیر ہوتے اور باقی رہتے ہیں اور انسان انسانوں کے کام آنے کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے تو پھر جو قوم بھی ان بنیادی احساسات کی حامل ہے کہ وہ اپنا ایک مقصد زندگی رکھتی ہے اس کے یہاں حقوق وفرائض کا ایک سلسلہ ہے اور اسے زندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد آخرت میں اللہ کے حضور حاضر بھی ہونا ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ مال ودولت کا بڑھنا' اس میں برکت کا پیدا ہونا اور لوگوں کو اس مال ودولت سے حقیقی فائدہ پہنچنا اور مال ودولت کے حقیقی مقاصد سے بہرہ ور ہونا یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے تو دلوں کو غربت میں بھی سکون عطا فرما دیتا ہے اور نہ چاہے تو مال ودولت کی فراوانی بھی زندگی میں راحت کا سامان نہیں بن سکتی' ایسی قوم سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن وہ سودی ذہنیت کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اگر اس کے افراد اس میں ملوث ہوتے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ قوم تنزل کی راہ پر چل نکلی ہے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی جائے گی ویسے ویسے فضائل اخلاق سے دور ہوتی جائے گی اور ویسے ویسے اس کے قومی شعور کو گھن لگتا جائے گا۔ اور اس کے اجتماعی جسد میں دراڑیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ اس کی عظیم قومی عمارت تباہی کے خطرے سے دوچار ہونے کے قریب پہنچ جائے گی' یہ وہ خطرناک نتائج ہیں جس سے بچانے کے لیے پروردگار نے سود کی ہر صورت کو ناقابل برداشت قرار دیا۔ اور اس کے ارتکاب کو فوجداری جرم قرار دے دیا۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی حقیقت کے پیش نظر کلام کے تیور بھی تیکھے ہو گئے ہیں اور اللہ کا کلام اسلامی ریاست کی زبان بن کر پورے جلال کا اظہار کر رہا ہے۔

کفار اثیم کا مفہوم

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ''کفار اثیم'' کو پسند نہیں فرماتا۔ کفار کا ایک معنی ہے کفر کرنے والا۔ اور اثیم کا معنی ہے گناہگار۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا شخص جو سود کی حرمت سے انکار کرتا ہے اور سرے سے اس کو حرام ہی نہیں جانتا اور دوسرا وہ شخص ہے جو اس کو حرام تو جانتا ہے' لیکن اس کا ارتکاب بھی کرتا ہے تو ایسا شخص جو کسی حکم کو تسلیم کرے لیکن اس کا عمل اس کے خلاف ہو اسے کافر نہیں گناہگار یعنی فاسق کہا جاتا ہے۔ دونوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کے ناپسندیدہ لوگ ہیں۔

دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ ''کفار'' کا معنی ہے ناشکرا اور ''اثیم'' کہتے ہیں دوسروں کے حق تلف کرنے والے کو۔ تو اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ناشکرے اور اللہ کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والے کو پسند نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو اس کی ضرورت سے زائد مال دیتا ہے تو وہ اس پر احسان کرتا ہے اور یہ احسان اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ اس کا شکرگزار بندہ بنے اور وہ اپنے مال کو اللہ کی بندگی میں صرف کرے اور دوسرا یہ کہ وہ اللہ کے بندوں کے لیے سہارا بنے اور ان کی ضرورتوں کے لیے انہیں قرض دے یا صدقہ دے' لیکن جو شخص اللہ کے اس فضل کا شکرگزار بننے کی بجائے اسے سودی کاروبار میں لگاتا ہے تو اس سے زیادہ ناشکری اور کیا ہوگی کہ وہ اللہ کے ایک نہایت اہم حکم کو توڑ رہا ہے اور دوسرا اس کا جرم یہ ہے کہ جو مال اللہ کے بندوں کی ضرورت میں استعمال ہونا چاہئے تھا اسے وہ ان کے خون چوسنے اور حقوق تلف کرنے کا ذریعہ بناتا ہے تو ایسا سنگ دل اور ناشکرا شخص اس بات کا سزاوار ہے کہ اللہ کے یہاں اس کا مال اس کے لیے وبال کا باعث بنے۔ اور اسے اس سے اس طرح محروم کر دیا جائے کہ محرومی کے سوا اس کے نصیب میں کچھ نہ ہو۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

(بے شک جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے نماز کا اہتمام کیا اور زکوۃ ادا کی ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا) (۲۷۷)

قرآنِ کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق سود خوروں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کا انجام ذکر فرمایا ہے جو بالکل ان بدبختوں کے برعکس اللہ کے ایک ایک حکم پر یقین رکھتے ہیں، پنج وقتہ نماز میں اس سے وفاداری کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے مال سے زکوۃ دیتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ وہ مال ان کی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے اجر کا ذکر فرمایا ہے اور یہ وہ تعبیر ہے جس کی اس سے پہلے کئی دفعہ وضاحت ہو چکی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمہارا حق مارا جائے گا) (۲۷۸ تا ۲۷۹)

سود چھوڑنے کا قطعی اور آخری حکم

اس سے پہلے آیت نمبر 276 میں ارشاد فرمایا گیا تھا کہ جس شخص کو سود کے بارے میں یہ نصیحت یا تنبیہ پہنچ گئی کہ سود کھانے والے کا انجام قیامت کے دن بہت ہولناک ہوگا تو وہ اس تنبیہ سے اثر قبول کر کے سود لینے سے رک گیا تو اس کے لیے ہے جو اس سے پہلے ہو چکا۔ اس آیتِ کریمہ سے مسلمان یہ سمجھ گئے کہ سود خوری ایک بدترین فعل ہے جو اللہ کی نگاہوں میں سخت مبغوض ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا قیامت کے دن بہت خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوگا۔ چنانچہ مسلمان اس کے بعد سے سود خوری اور سودی کاروبار کرنے سے پرہیز کرنے لگے۔ جہاں تک سود کی ناپسندیدگی کا تعلق ہے اس کا اظہار تو قرآنِ کریم نے مکی زندگی میں ہی شروع کر دیا تھا۔ سود خوری کی مذمت کی گئی تھی اور صدقات کے فضائل بیان کیے گئے تھے اور سورۂ روم جو مکی صورت ہے اس کی ایک آیت میں صاف صاف بتایا گیا تھا کہ سود اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا البتہ اس کے یہاں زکوۃ اور صدقات بڑھتے ہیں۔ لیکن کھل کے اس کی حرمت کا اعلان نہیں فرمایا گیا تھا۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں حرمت کا حکم تو نہیں دیا گیا لیکن بہت حد تک اس کی وضاحت کر دی گئی۔ اس آیتِ کریمہ میں صاف صاف حکم دیا گیا ہے کہ نہ صرف اب تمہیں سودی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں بلکہ اب تک تمہارے مقروضوں کے ذمے جتنا سود باقی ہے اس سب کی وصولی سے تمہیں روکا جا رہا ہے۔ اللہ

Marfat.com

سے زیادہ جتنی اس کی حکام کی نافرمانی سے زیادہ سودی کاروبار سے بچنا تھا تو اب اس کا حکم ہے اس لیے دیکھنا اب اس کی نافرمانی نہ ہونے پائے۔ اور اب تک سود پر جو قرض دے چکے ہو تم اپنا اصل مال واپس لے سکتے ہو لیکن اس پر جتنا سود تمہارے قرض داروں کے ذمے باقی ہے اسے لینے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ غور فرمایئے ایک ایسے کاروبار سے روکا جا رہا ہے جو صدیوں سے جس کا رواج چلا آ رہا تھا مسلمان جاہلیت کے زمانے میں بھی اور مسلمان ہونے کے بعد بھی اس کاروبار میں شریک رہے۔ اور پھر یہ کوئی ایسا جرم نہیں جس کا سرا صرف ایک آدمی سے ہو جیسا کہ شراب تو ایک آدمی پیتا ہے شراب ترک کرنی ہوئی تو چھوڑ دی۔ شراب سے رک گیا۔ لیکن سود کا تعلق دو فریقوں سے ہے کہ ایک سود دیتا ہے دوسرا لیتا ہے۔ ایک یہ معاملہ جو فریقین کے درمیان دائر ہو جب اس سے روکا جائے تو معاشرتی مفاسد پیدا ہونے کا اندیشہ بھی یقینی ہوتا ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ قوموں کی تاریخ میں ایسی اصلاحی کوششیں بڑی مشکلات سے دوچار ہوتی رہی ہیں لیکن پروردگار اپنی حکمت تربیت سے سب سے پہلے ذہنوں کو تیار فرماتے ہیں اور اس کے بعد حکم جاری فرماتے ہیں۔ شراب کی حرمت میں بھی تدریج کی یہی حکمت تھی اور یہاں بھی حکم جب تک نہیں آیا پہلے نفرت پیدا کی گئی پھر خرابی انجام سے متنبہ کیا گیا اور پھر حکم دیا کہ اب کاروبار کو اسی مقام پر روک دو جہاں پہنچے ہو اس کا معاملہ ختم کر دیا ہے۔ سود کی بابت تجسس نہیں کرو گے اور جو بھی کسی کے ذمے ہے اس کا مطالبہ مت کرو۔ سود لینے والوں کو تو مطالبہ کرنے سے روک دیا اور دینے والوں کو ایک طرح سے اطمینان ہو گیا لیکن یہ بات ان پر واضح ہو گئی کہ اصل راس المال کو وہ نہیں روک سکیں گے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کسی فریق کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ قرض دار یہ نہ سمجھے کہ اب مجھ سے سود کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا تو راس المال میں بھی کمی ہونے کی کوشش کرے اور قرض خواہ یہ سمجھ کر کہ اب سود تو گیا میں کسی نہ کسی طریقے سے سود کا کچھ نہ کچھ حصہ اصل میں شامل کر لوں۔ اس طرح دونوں فائدے کی حرص میں مبتلا ہو کر دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس سے دونوں کو روک دیا کہ جانبین میں سے کسی کو بھی دوسرے کا حق مارنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

سود خوروں کو الٹی میٹم

بعض قبیلے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن مسلمان ریاست کے شہری ہونے کی وجہ سے وہ اسلامی قانون کی پابندی کو قبول کر چکے تھے ان کے ساتھ مسلمانوں کے سودی معاملات تھے انہیں بھی صاف صاف فرما دیا کہ اب یہ سودی کاروبار نہیں چلے گا۔ چنانچہ ایک ہی حکم سے پورے ملک میں اس اصلاحی حکم کو نافذ کر دیا گیا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جزوی طور پر کہیں نہ کہیں اس کی مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا تھا اس لیے پروردگار نے پوری جلالت سے فرمایا کہ اگر تم اس حکم کے بعد بھی سود کے لین دین سے نہیں رکتے ہو تو پھر یاد رکھو کہ اب یہ اسلامی ریاست کے آئین کا ایک حصہ ہے اور اس کی مخالفت ایک فوجداری جرم ہے۔ اس لیے جس قبیلے یا جس فرد نے بھی اس کا ارتکاب کیا قانون پوری قوت سے حرکت میں آئے گا۔ اور اگر کسی گروہ نے اس کے لیے طاقت استعمال کرنا چاہی تو یہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے مترادف ہو گا اس لیے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم خود اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے کہ سودی کاروبار سے بچنے کو ایمان کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سود کو حرام سمجھے کبھی اس کے قریب نہ جائے اور اگر وہ اس سے پہلے اس کاروبار میں ملوث رہ چکا ہے اور اس کا سود اس کے قرضداروں کے ذمے ہے تو لینے سے ہاتھ اٹھا لے۔ اور دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ سخت ہے وہ یہ کہ اگر وہ مسلمان کہلانے والا سودی کاروبار سے باز نہیں آتا تو حضرت ابن عباسؓ حضرت حسن

Marfat.com

بصریؒ اور حضرت ابن سیرینؒ وغیرہ بڑے بڑے فقہاء یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قتل تو نہ کیا جائے البتہ اس وقت تک اسے محبوس رکھا جائے جب تک وہ سودخوری چھوڑنے کا عہد نہ کرے۔ اور گرفتار کرنے والے اس کے عہد کو قابل اطمینان نہ سمجھیں۔ اور اگر کوئی گروہ یا کسی علاقے کے رہنے والے لوگ یا کوئی صوبائی حکومت سودی کاروبار میں ملوث ہو اس کے یہاں سودی سکیمیں چلتی ہوں، وہ ترقیاتی کاموں کے لیے سود پر قرض لینے یا دینے کو ایک مجبوری سمجھتی ہو تو مرکزی اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اس کے خلاف طاقت استعمال کرے۔ جس طرح پاکستانی تاریخ میں ایک سے زیادہ دفعہ بلوچستان پر بمباری کی گئی اور فوجی اقدام کیا گیا صرف اس الزام پر کہ وہاں وفاقی اقتدار کو بعض حوالوں سے چیلنج کیا گیا ہے۔ اللہ کا اقتدار انسانی حکومتوں کے اقتدار سے زیادہ عظیم اور زیادہ محترم ہے۔ اسلامی حکومت کو اس کی پاسداری اور نگرانی کا فرض سونپا گیا ہے۔ یوں تو اللہ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہے لیکن سود کو بطورِ خاص فوجداری جرم قرار دیا گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو جب ایک معاہدہ کے تحت اسلامی حکومت میں اندرونی خودمختاری دی تو معاہدے میں یہ تصریح کردی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ اے کاش مسلمان اس حکم کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھیں اور اس کے اندر جو خطرناکی چھپی ہوئی ہے اس کو محسوس کریں تو باقی تمام پالیسی امور چھوڑ کر سب سے پہلے اس کی طرف توجہ دیں۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جس ملک کو کسی دوسری ملک کے ساتھ جنگ درپیش ہو اس کی ساری توجہ جنگی کاروائیوں پر ہوتی ہے۔ تمام معمول کے کام رک جاتے ہیں۔ ترقیاتی کام ٹھپ ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک ہم جنگ سے عہدہ برآ نہ ہو لیں اس وقت تک کسی بڑے کام کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔ جنگ کی یہ اہمیت اس صورت میں ہے کہ جب کسی دوسرے ملک سے جنگ ہو۔ اور یہاں تو معاملہ اللہ اور رسول سے جنگ کا ہے۔ جس قوم کو اللہ اور رسول سے لڑنا پڑے میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہی سے بچا سکتی ہے۔ ہم مسلمان ہوتے ہوئے اور ایک ایسے ملک کے باسی ہوتے ہوئے جو ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا اللہ سے جنگ کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں رتی بھر خیال نہیں کہ اللہ سے لڑنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو۔ اور جو صدقہ کر دو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو) (۲۸۰)

گزشتہ آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے قرضداروں سے اس حکم کے بعد سود تو نہیں لے سکتے البتہ اصل رقم واپس لے سکتے ہو یہ تمہارا حق ہے اور کسی کو بھی اسے روکنے کا حق نہیں ہے۔ کاروباری زندگی میں اس طرح کے واقعات معمول کا حصہ سمجھے جاتے ہیں کہ ایک شخص نے کاروبار کے لیے قرض لیا، لیکن سوئے اتفاق سے کساد بازاری نے اس کے کاروبار پر اثر ڈالا اور وہ کاروبار میں اس قدر نقصان کا شکار ہوا کہ قرض کی ادائیگی اس کے لیے مشکل ہو گئی۔ اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ایسی صورتِ حال پیش آ جائے تو تمہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس کے دکھ درد میں شریک ہے۔ اس کے غم اس کے غم ہیں۔ اگر وہ کاروباری حادثے میں دیوالیہ ہو گیا ہے یا کاروبار میں نقصان کا شکار ہو گیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ قرض کی ادائیگی کے لیے اس پر دباؤ نہ ڈالے۔ بلکہ اسے مہلت دے اور اگر وہ محسوس کرے کہ مہلت کے بعد بھی شاید اس کے لیے ادائیگی آسان نہ ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ وہ قرض معاف کر دے۔ اور یہ قرض کی معافی اللہ کے

Marfat.com

یہاں بے حد اجر و ثواب کی حامل ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اور امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے۔ اور طبرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جب کہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لیے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مقروض کے ساتھ نرمی اور مساہلت کا معاملہ کرے یا اس کو معاف کر دے۔

عہد نبوت میں سودی کاروبار کے بارہ میں ایک غلط دعویٰ اور اس کا جواب

بعض کم سواد یہ سمجھتے ہیں کہ عہد نبوت میں جس قرض پر سود کو حرام کیا گیا ہے یہ قرض وہ تھا جو غریب کسی ساہوکار یا مہاجن سے اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے لیتے تھے۔ رہا یہ قرض جو کاروبار' صنعت و حرفت یا زراعت کے لیے لیا جاتا ہے اس کا اس زمانے میں کوئی تصور نہ تھا۔ اس لیے اسلام نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ مہاجنی سود ہے۔ لیکن پیش نظر آیت کریمہ صاف صاف بتا رہی ہے کہ یہاں ذکر غریب لوگوں کا نہیں بلکہ کاروباری لوگوں کا ہو رہا ہے کہ جو اپنے کاروبار کے لیے قرض لیتے تھے اور پھر کسی نقصان کا شکار ہونے کی وجہ سے بروقت ادا نہ کر پاتے تھے۔ احادیث میں ایک سے زیادہ واقعات ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی آئے اور انہوں نے بتایا کہ میرے کاروبار میں اس قدر نقصان ہو گیا ہے کہ میں وعدے کے مطابق قرض ادا نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کی مدد کرنے کی ترغیب دی۔ لوگوں نے ہر چند ہمت سے بڑھ کر ان کی مدد کی' لیکن ان کا قرض پھر بھی ادا نہ ہو سکا تو آپؐ نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ بس اس سے زیادہ ادا نہیں کیا جا سکتا تم اپنے بھائی کو قرض معاف کر دو۔ غور فرمائیے کیا یہ قرض کسی غریب کا قرض ہے؟ اور میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عباسؓ کا جو سود ختم کیا گیا اس کی مقدار دس ہزار مثقال سونا تھی۔ اس سے اصل رقم کی مقدار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس آیتِ کریمہ کے بعض الفاظ کی معنویت پر غور کیا جائے تو ہمارے نقطۂ نظر کی مزید تائید ہوتی ہے۔ آیت میں ''ان'' حرفِ شرط کا استعمال ہوا ہے اور ''اِن'' کا استعمال عام اور معمول کے معاملات میں نہیں ہوتا۔ بلکہ شاذ و نادر حالات کے لیے ہوتا ہے۔ عام معاملات کے لیے ''اذا'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر قرض لینے والے خوشحال یعنی ''ذو میسرۃ'' تھے۔ غریب لوگ بھی اپنی ضرورتوں کے لیے قرض لیتے تھے' لیکن ان کی تعداد اس قدر زیادہ نہ تھی۔ ایسے واقعات شاذ و نادر تھے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

(اور ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہو گا) (۲۸۱)

قرآن کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق سود کی بحث کو ختم کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس دن کی جوابدہی سے ڈرنے اور اس کی فکر کرنے کا حکم دیا ہے جس کی طرف پورا انسانی قافلہ اپنے اپنے وقت کے مطابق بڑھ رہا ہے۔ برزخی زندگی کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا جب اس دن کا اعلان ہو گا جسے قیامت کہتے ہیں۔ پھر نفخۂ ثانیہ کے بعد ہر مرنے والا زندہ ہو کر اس محشر کی طرف بڑھے گا جہاں اللہ کے انصاف کی عدالت قائم ہو گی' جہاں ایک ایک عمل کا حساب دینا پڑے گا۔ اس دن نہ نسب کا تفاخر کام آئے گا نہ حسب کے دعوے کام آ سکیں گے' نہ مال

Marfat.com

دولت سے کام لیا جا سکے گا' نہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بروئے کار آ سکے گی۔ وہاں ایک ہی سکہ چلے گا جس کا نام ایمان وعمل ہے۔ وہاں ہر زبان گنگ ہو کر رہ جائے گی صرف کردار کی زبان کام دے گی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کسی قانون کے پابند نہیں کیونکہ ہر قانون اللہ کا پابند ہے۔ لیکن انہوں نے محض اپنے فضل وکرم سے اس دن کی عدالت کا اصول یہ ٹھہرایا کہ جو شخص ایمان وعمل کی پونجی لے کر آیا اس کے اعمال کا پورا پورا صلہ دیا جائے گا۔ اور کسی شخص کے اجر وثواب اور صلے میں کمی نہیں کی جائے گی۔ جس طرح ایک سود خور اپنے سرمائے پر بے جا اضافہ کا خواہش مند رہتا ہے اور جس طرح خائن تاجر دوسرے کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے' ان سب کو اس عدالت میں جس انصاف سے واسطہ پڑے گا اس کی بنیاد ہی یہ ہوگی کہ تمہیں یہاں اسی انجام سے دوچار ہونا ہے جس کا تم نے استحقاق پیدا کیا۔ تمہیں جو ملے گا تمہارے عمل کے صلے کے طور پر ملے گا۔ لیکن یہ اطمینان رہنا چاہئے کہ تمہارے کسی عمل کے بدلے میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ترازو کے دونوں پلڑے ہمیشہ برابر رہیں گے۔ جن لوگوں نے زندگی میں ایمان کے چراغ روشن کیے اور عمل کی عمارت تعمیر کی انہیں یقیناً ایک ایک چیز کا صلہ ملے گا اور ان کے اجر وثواب میں کسی طرح کی کمی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح جن لوگوں نے کفر' شرک اور فساد فی الارض سے اپنا نامہ عمل تیار کیا' انہیں یہ جھوٹی آرزو نہیں پالنی چاہئے کہ ہم شاید اپنے برے انجام سے کسی طرح بچ نکلیں۔ عدل گستری اور انصاف پروری کا اولین تقاضا یہ ہے کہ نہ کوئی نیک اپنی نیکی کے صلے سے محروم رہے اور نہ کوئی ظالم ظلم کی سزا سے بچ سکے۔ جس عدالت کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا یہ عالم ہے اور جس کا آنا بھی یقینی ہے اور جس سے ہم سب کو دوچار ہونا ہے' اگر ہمیں اپنے ہولناک انجام کی کچھ بھی فکر ہے اور ہم اپنی بداعمالیوں سے کسی حد تک بھی واقف ہیں تو پھر ہمیں اس دن کی تیاری کو سب سے پہلی ترجیح بنانا چاہئے تاکہ ہم اپنی سرخروئی کا سامان کر سکیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠
وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔـا ۭ
فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ
اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا
شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ

Marfat.com

وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا
فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ
وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ
اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ
كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ
عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ
رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ
اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ قف

Marfat.com

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا
اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا
حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ
لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

رکوع: ۳۹۔ ۴۰۔ (اے ایمان والو جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل وانصاف سے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے پس وہ بھی لکھ دے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے۔ اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور اس میں کوئی کمی نہ کرے' پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو۔ پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ (دو عورتیں اس لیے کہ) اگر ان میں سے ایک عورت بھول جائے تو ان میں سے دوسری یاد دلا دے گی۔ اور جب گواہ بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتیں۔ تو یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل' گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس عمل کے زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو۔ (اس صورت میں) تم پر کوئی حرج نہیں اس بات میں کہ تم اسے نہ لکھو۔ اور تم کوئی معاملہ خرید وفروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور نہ نقصان پہنچایا جائے کاتب کو اور نہ

Marfat.com

گواہ کو۔اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری نافرمانی ہوگی۔اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے ○ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔پھر اگر اعتبار کرے تم میں سے ایک دوسرے پر تو چاہیے کہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت کو ادا کر دے اور ضروری ہے کہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے۔اور شہادت کو مت چھپاؤ اور جو شخص شہادت کو چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا ضمیر گنہگار ہے۔اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا جاننے والا ہے ○ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپاؤ خدا اس کا تم سے حساب لے گا۔جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○ مان لیا رسول نے جو کچھ اتارا گیا اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اور مسلمانوں نے۔یہ سب ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔(نیز کہتے ہیں) ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔اور کہتے ہیں ہم نے مانا اور اطاعت کی۔اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے ○ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔(ایمان لانے والو تم یوں دعا کیا کرو) اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرما۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔تو ہمارا مولا ہے پس کافروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد فرما) (۲۸۲ تا ۲۸۶)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰٮهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ

Marfat.com

فُسُوْقٌ بِکُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ O

(اے ایمان والو جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل وانصاف سے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے پس وہ بھی لکھ دے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے۔ اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور اس میں کوئی کمی نہ کرے' پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔ پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ (دو عورتیں اس لیے کہ) اگر ان میں سے ایک عورت بھول جائے تو ان میں سے دوسری یاد دلا دے گی۔ اور جب گواہ بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتیں۔ تو یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل' گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس عمل کے زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو۔ (اس صورت میں) تم پر کوئی حرج نہیں اس بات میں کہ تم اسے نہ لکھو۔ اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنالیا کرو۔ اور نہ نقصان پہنچایا جائے کاتب کو اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) (۲۸۲)

سابقہ آیاتِ کریمہ میں سودی قرضوں کا تذکرہ تھا۔ جنہیں یک قلم ختم کیا گیا۔ لیکن زندگی میں بیشتر افراد کو قرض کے معاملے سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ قرض سے متعلق معاملات میں جہاں جہاں الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں' ان کی طرف توجہ دلائی جاتی اور قرض کے لین دین کے صحیح طریقے سے آگاہ کیا جاتا۔ چنانچہ پروردگار نے کرم فرمایا کہ اس آیتِ کریمہ میں قرض کے معاملات کے سلسلے میں ضروری ہدایات عطا فرمائیں اور پھر اسی سلسلہ کے بعض ضمنی مسائل کے بارے میں بھی رہنمائی بخشی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نوشت وخواند کی سطح نہایت پست تھی۔ بڑی بڑی آبادیوں میں بھی کوئی لکھا پڑھا آدمی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا اور سفر میں تو اور بھی زیادہ اس کی کمیابی تھی۔ ایسی صورت میں لین دین کے معاملات میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے جو ضروری ہدایات ہو سکتی تھیں وہ بھی عطا فرمائی گئیں۔

انسان معاملات میں بے احتیاطی کرتا ہے

غیروں کے ساتھ لین دین کے معاملات میں انسانوں نے ہمیشہ احتیاط برتی ہے۔ لیکن جہاں تعلقات ہوں وہاں آج تک یہ کمزوری چلی آ رہی ہے کہ اعتماد کے جو مروج ذرائع ہیں ان سے کام نہیں لیا جاتا' بلکہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ دوستی کی موجودگی میں کسی تحریر یا کسی گواہی کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ اسے اجنبیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ ناخوشگوار ہوتا ہے۔ تعلقات بگڑتے بھی دیر نہیں لگتی اور اگر اچانک جانبین میں سے کوئی چل بسے تو ضروری نہیں کہ پسماندگان محض زبان پر اعتماد کر کے معاملے کا تصفیہ کر سکیں۔ اس وقت آدمی سوچتا

Marfat.com

ہے کہ کاش میں نے اس معاملے کو تحریری شکل دی ہوتی تو آج جو مشکل پیدا ہوگئی ہے وہ پیدا نہ ہوتی۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ایسی ہی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے ہیں۔ اور دوستی پر اعتماد کرتے ہوئے جو غلط رویہ اختیار کیا جاتا ہے اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کے پیش نظر بہت شدید انداز اختیار فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں' مگر ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے مال اس کے حوالے کردے۔ تیسرا وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

معاملات ومعاہدات میں نزاع سے تحفظ کے لیے ہدایات

اس آیتِ کریمہ میں معاملات یا معاہدات کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں انہیں ہم ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

۱۔ اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ (جب آپس میں کسی معین مدت کے لیے ادھار کا معاملہ کیا جائے تو اسے لکھ لینا چاہیے) یعنی اس کی ایک دستاویز تیار کی جائے اور اس کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو ہر دور میں مروج ہو۔

۲۔ جب قرض کا معاملہ کیا جائے' چاہے اس کا تعلق درہم و دینار سے ہو یا اشیاء کی خرید و فروخت سے' قرض کے لین دین کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی کہ اس کی میعاد مقرر کرو اور میعاد بھی ایسی مقرر ہونی چاہیے جس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ یعنی سال' مہینہ اور دن تک کا واضح طور پر تعین ہو۔ اس طرح نہ کیا جائے جیسے دیہاتی زندگی میں ہوتا ہے کہ فلاں کھیتی کے کٹنے کے وقت' فلاں پھل کے اترنے کے وقت یا فلاں فصل کی کاشت کے وقت ادائیگی ہوگی۔ میعاد مقرر نہ کرنے یا میعاد کو مبہم رکھنے سے اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے میعاد کو واضح طور پر مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ بِالْعَدْلِ نزول قرآن کے وقت چونکہ پڑھے لکھے لوگوں کی انتہائی کمی تھی اس لیے اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ کوئی لکھنے والا اپنی مرضی سے کمی بیشی کردے۔ کیونکہ جانبین کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح لکھا ہے یا اپنی طرف سے پیوندکاری کی ہے۔ اس لیے یہ فرمایا کہ لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ جو کچھ لکھے انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور مزید یہ فرمایا کہ جب اسے لکھنے کے لیے کہا جائے تو اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس دور میں یہ ممکن نہیں تھا کہ اگر ایک شخص لکھنے سے انکار کردے تو کسی دوسرے کی خدمات حاصل کرلی جائیں۔ تعلیم کی انتہائی کمی کی وجہ سے اس دور میں لکھنے کی صلاحیت اللہ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ لکھنے والے پر اللہ کا خاص انعام ہے کہ اس کو یہ صلاحیت بخشی گئی ہے۔

۴۔ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْہُ شَیْئًا دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہے۔ کیونکہ قرض لینے والا اپنی طرف سے جو کچھ لکھوائے گا وہ ایک طرح سے ایک اقرار اور اعتراف ہوگا۔ اس طرح سے اس کی لکھوائی ہوئی تحریر اقرار نامہ بن جائے گی اور کل کو اگر کوئی اختلاف ہوتا ہے تو یہ اقرار نامہ اس کے حق میں یا اس کے خلاف استعمال ہوسکے گا۔ تعلیم کی کمی کے باعث ہوسکتا ہے دوسرا فریق یہ نہ جان سکے کہ اس نے کیا لکھوایا ہے' اس لیے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ لکھوانے والے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اسے یقین ہونا چاہیے کہ اگر میں غلط بات لکھواؤں گا یا اپنے حق میں کمی بیشی کروں گا تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

میں ہے۔اس کے سامنے اس کی جوابدہی کیسے کرسکوں گا؟ یہ وہ تصور ہے جو اسے راہِ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔اس لیے اسے اللہ سے ڈر کر صاحب حق کے حق میں کسی طرح کی کمی کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۵۔ فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْحَقُّ . الخ (اگر قرض لینے والا کم عقل ضعیف یا دستاویز لکھوانے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا کاتب اس کی زبان نہیں سمجھتا اس لیے یہ اسے لکھوا نہیں سکتا ایسی صورت میں اس کے ولی کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستاویز لکھوائے۔اور اگر ولی نہ ہو تو پھر کسی کو پناوکیل بنالیا جائے جو اس کی بات کو سمجھتا ہو اور اس کی طرف سے وہ دستاویز لکھوائے۔مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ایک معمول کی بات ہے کیونکہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت انجام پاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اگر مجبوری کے باعث خود دستاویز نہ لکھوا سکیں تو وہ اپنے ولی کے ذریعے یہ کام کریں یا کسی کو اپنا وکیل بنالیں۔اور وہ انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

۶۔ دستاویز کی تحریر کو فیصلہ کن قرار نہیں دیا گیا' بلکہ اس پر گواہ بنانے کا بھی حکم دیا گیا۔اسی وجہ سے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ اصول طے کیا ہے کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں' جب تک اس پر شہادتِ شرعی موجود نہ ہو۔پھر اس آیتِ کریمہ میں گواہوں کی صفات بیان کی گئیں اور گواہوں کا نصاب متعین کیا گیا ہے۔جہاں تک نصاب کا تعلق ہے اس کے بارے میں فرمایا کہ گواہ دو مرد ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔دو عورتوں کی شرط اس لیے رکھی ہے کہ ایک خاتون بھول جائے یا گواہی میں لغزش کا شکار ہو تو دوسری خاتون اسے یاد دلا دے یا اسے تنبیہ کردے۔دو عورتوں کو جو ایک مرد کے برابر ٹھہرایا گیا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اسلام کی نگاہ میں عورت حقیر ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ عورتوں پر جو فرائض عائد کیے گئے ہیں اور ان کی زندگی جن حالات و مشاغل سے گزرتی ہے اس میں اس بات کا بہت کم امکان ہوتا ہے کہ کبھی انہیں عدالت میں جا کر گواہی دینا پڑے۔اور پھر یہ بات بھی ہے کہ عورت کی مزاجی خصوصیات کی کچھ نزاکتیں بھی ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ان پر یہ بار ڈالا نہیں جاسکتا۔لیکن اگر کبھی خاص حالات میں ایسی کوئی ذمہ داری ان پر آ ہی جائے تو اللہ نے انہیں غلطی سے بچانے اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے دو کو ایک مرد کے قائم مقام ٹھہرایا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد سے یہ فرض باحسن طریق انجام دے سکیں۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ انہیں ایک دوسری خاتون کے ساتھ ایک دفعہ گواہی کے لیے عدالت میں جانا پڑا۔قاضی صاحب نے دونوں خواتین کی گواہی الگ الگ لینا چاہی تو امام شافعی رحمہ اللہ کی والدہ نے الگ گواہی دینے سے انکار کردیا اور دلیل یہ دی کہ قرآنِ کریم نے ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی گواہی کا حکم دیتے ہوئے وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان دو میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔تو یاد دلانا اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں ایک ساتھ گواہی دیں۔اگر وہ الگ الگ گواہی دیتے ہوئے بھول جائیں تو پھر کس طرح ایک دوسرے کو یاد دلاسکتی ہیں۔

جہاں تک ان کی صفات کا تعلق ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک تو ہدایت یہ دی من رجالکم کہ وہ گواہ تمہارے اپنے مردوں میں سے ہوں۔جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں' ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں دوسرا یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین انہیں جانتے پہچانتے ہوں۔اور دوسرا فرمایا ممن ترضون (کہ وہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جن کے سیرت و کردار کو تم پسند کرتے ہو) یعنی وہ اخلاق و عمل کے اعتبار سے پسندیدہ' ثقہ' معتبر اور ایماندار ہوں۔

Marfat.com

۷۔ جن دو مردوں کو گواہی میں شامل کر لیا جائے اور وہ گواہ بننے پر رضامندگی کا اظہار کر دیں تو جب گواہی کے لیے انہیں بلایا جائے تو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ آنے سے انکار نہ کریں۔ کیونکہ صحیح بات کی گواہی ایک عظیم معاشرتی خدمت ہے۔ اور ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق بھی ہے۔ اور اس امت کے ایک ایک فرد کا یہ فریضۂ منصبی بھی ہے کہ جو حق اس کے پاس ہے اس کی وہ گواہی دے۔ کیونکہ اگر کسی معاملے یا معاہدے میں فریقین میں اختلاف ہو جاتا ہے مثلاً بائع کہے مجھے قیمت وصول نہیں ہوئی ہے' یا مشتری کہے کہ مبیع مجھ تک نہیں پہنچی تو ایسے جھگڑوں کا فیصلہ صرف گواہوں کے ذریعے ہو سکتا ہے' جھوٹے لوگ تو جھوٹے گواہ بھی بنا سکتے ہیں' سچے لوگوں کے سچے گواہ اگر گواہی دینے سے انکار کر دیں تو ظاہر ہے کہ حقدار کو اس کا حق نہیں ملے گا۔ اور جس شخص نے گواہ بننا قبول کیا تھا وہ انکار کر کے چونکہ حق دار کے حق کے تلف ہونے کا سبب بنا ہے تو قیامت کے دن اس سے سخت باز پرس ہو گی۔

۸۔ قرض لینے دینے کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے قید تحریر میں لانے سے گرانی محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن کے نتائج بڑے دور رس نکلتے ہیں۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ معاملات میں الجھنوں اور اڑچنوں سے بچنے کا اگر کوئی کامیاب ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہدایات ہیں اور ان پر عمل ہے۔ اس لیے جو معاشرہ اپنے اندر مفاسد پیدا نہیں کرنا چاہتا اس معاشرے کے افراد کو ان ہدایات کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

۹۔ اگر معاملہ دست بدست لین دین کا ہو جیسے ہم دکانوں سے روزمرہ کی چیزیں خریدتے ہیں' اگرچہ آج کی دنیا میں کیش میمو کی شکل میں تحریر کی ایک صورت پیدا کر لی ہے' لیکن اسے عموماً ضروری نہیں سمجھا جاتا کیونکہ دست بدست لین دین میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اس لیے پروردگار نے ایسے معاملات میں تحریر و کتابت کی پابندی نہیں لگائی۔ لیکن کیش میمو کی صورت میں جو سہولت پیدا ہو گئی ہے اس سے فائدہ اٹھانا یقیناً بہتر ہے۔

۱۰۔ اگر کوئی اہمیت رکھنے والا سودا یا لین دین ہو بے شک اس کا انعقاد دست بدست ہوا ہو تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیے۔ تاکہ نزاع کی صورت میں اس کا تصفیہ ہو سکے۔

۱۱۔ معاملات کے تصفیہ میں چونکہ گواہ اور کاتب کی بہت اہمیت ہے اس لیے حکم دیا کہ کاتب یا گواہ کو کسی صورت کوئی نقصان یا کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ تکلیف کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی فریق کسی کاتب یا گواہ کو اپنے حق میں لکھنے یا گواہی دینے پر مجبور کرے۔ ایسا کرنے والا بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کاتب سے معاملہ لکھوایا جائے لیکن اس کی اجرت ادا کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ اسی طرح گواہ کو گواہی پر آنے پر تو مجبور کیا جائے لیکن اس کے آنے جانے کے اخراجات ادا کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ ایک غریب آدمی جو مزدوری کرتا ہے یا کہیں ملازمت کرتا ہے اولاً تو اسے مزدوری یا ملازمت سے نکل کر آنا ہی آسان نہیں اور اگر وہ آ ہی جائے اس کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ وہ آنے جانے کا کرایہ بھی خود ادا کرے اور اس کے علاوہ کوئی مصارف ہوں تو اس کا بوجھ بھی اٹھائے۔ ایسی کوئی تکلیف بھی کاتب یا گواہ کو پہنچانا سخت گناہ کا باعث ہے۔ بعض دفعہ کسی اہم معاملے میں کوئی ایک فریق گواہی بدلنے کے طاقت استعمال کرنے پر اتر آتا ہے' وہ گواہ کو دھمکاتا ہے' بعض دفعہ جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسی طرح ہمارا فوجداری سسٹم کچھ ایسا بن گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی اگر کبھی کسی اہم معاملے میں گواہ بننا قبول کر لیتا ہے تو مقامی تھانیدار صاحب اسے جا و بیجا تھانے

Marfat.com

طلب کر کے پریشان کرتے ہیں۔اور بعض دفعہ عدالتوں میں اس طرح گواہوں سے سلوک کیا جاتا ہے کہ اصل مجرم یہی ہے۔ایسے تمام رویے جس سے کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچے یا ان پر دباؤ پڑے اس آیتِ کریمہ میں اسے سخت قسم کا فسق قرار دیا گیا ہے۔ہمارے انہی رویوں نے شرفاء کو حقوق کی ادائیگی سے دور رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بڑے بڑے واقعات اور حادثات ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا شخص بھی اس کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں نے اگر حق کی گواہی دی تو میرے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔یا کم از کم معمول کی زندگی گزارنا میرے لیے ممکن نہیں رہے گا۔اس لیے آخر میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ کی ان ہدایات کو حرزِ جان بنالو۔ان ہدایات کی صورت میں اللہ تمہیں بہتر زندگی گزارنے کا طریقہ سکھا رہا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان ہدایات پر عمل کیے بغیر معاملات کی بداطواریاں اور معاشرتی الجھنیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

(اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے تم میں سے ایک دوسرے پر تو چاہیے کہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت کو ادا کردے اور ضروری ہے کہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے۔اور شہادت کو مت چھپاؤ اور جو شخص شہادت کو چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا ضمیر گنہگار ہے۔اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا جاننے والا ہے) (۲۸۳)

رہن کی اجازت

گزشتہ آیت میں قرض کے معاملات پر لکھنے اور گواہی قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔اس آیتِ کریمہ میں اس ہدایت سے ایک استثنا کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ اگر تم سفر میں کسی لکھنے والے کو نہ پاؤ' ہر چند تلاش کرو لیکن کوئی ایسا شخص نہ ملے جو لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور تم ادھار پر کوئی لین دین کرنا چاہتے ہو تو اب سوال یہ ہے کہ ادھار دینے والا کس بھروسے پر اعتبار کرے۔گزشتہ آیت میں تو بھروسہ اور اعتماد کی دو چیزوں کا ذکر فرمایا گیا تھا یعنی ایک دستاویز تیار کرلو اور اس پر گواہ بھی بنالو۔اس طرح فریقین ہر طرح کے اختلاف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔لیکن جب یہ انتظام نہ ہوسکے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لیے اجازت دی گئی ہے کہ رِھَانٌ مَقْبُوضَةٌ سے کام لو۔رہان رہن کی جمع ہے۔یہ اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض دینے والے کو قرض کی ضمانت کے طور پر حوالے کی جاتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم کوئی چیز بھی قرض کے بدلے میں قرض دینے والے کے پاس رہن اور گروی رکھ دو۔اور یہ گروی صرف زبانی زبانی نہ ہو بلکہ اس چیز پر اسے قبضہ بھی دلا دو۔چھوٹے قرض میں کوئی چھوٹی چیز ہوگی اور بڑے قرض میں کوئی بڑی چیز اگر ضمانت کے طور پر قرض دینے والے کے قبضے میں دے دی جائے تو اس طرح اسے اعتماد پیدا ہو جائے گا کہ میرا قرض مرے گا نہیں' بلکہ اس کی ادئیگی اور واپسی لازمی ہے۔اور اگر مقروض میرا قرض ادا نہیں کرے گا تو میں اس کے رہن رکھی ہوئی چیز بیچ کر اپنا قرض پورا کرسکتا ہوں۔

Marfat.com

اس طرح کی صورتِ حال کا پیدا ہونا زیادہ تر سفر میں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ سفر میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ کاتب میسر نہ آسکے۔ اس لیے یہاں سفر کا ذکر فرمایا گیا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رہن کی صورت میں قرض کا لین دین سفر میں تو جائز ہے حضر میں نہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ حضر میں بھی ایسی صورت ممکن ہو سکتی ہے کہ قرض دینے والا گروی رکھے بغیر قرض دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ اور مزید یہ بات بھی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اپنے وطن اور گھر میں رہتے ہوئے یہودی سے جو قرض لیے اور آپ نے اس کے بدلے میں اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھی۔ اس لیے جو لوگ اس کو سفر کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں ان کی رائے صحیح نہیں۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہیں کاتب میسر نہ آئے تو پھر تم قرض کا معاملہ رہن کی صورت میں کر سکتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کاتب میسر آ جائے تو پھر رہن کی صورت میں قرض کا معاملہ کرنا جائز نہیں۔ ہم نے اس سے پہلے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل کا حوالہ دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کا میسر نہ آنا رہن رکھنے کے لیے شرط نہیں۔ کیونکہ مدینے میں تو کاتب میسر آ سکتا تھا اس کے باوجود آپؐ نے رہن رکھ کر یہودی سے جو قرض لیا اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے درمیان اسلامی اخوت کا رشتہ ہے۔ اخوت کا تقاضا ہے کہ اگر مستقبل میں معاملات میں اختلافات سے بچنا ہے تو کوئی نہ کوئی اعتماد کی صورت پیدا کرنا ناگزیر ہے اور وہ تحریر اور گواہی کی شکل میں جب میسر آ سکتی ہے تو پھر مزید کسی بات کا تقاضا کرنا اخوت کے سراسر خلاف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی اخوت کا یہی تقاضا ہے لیکن اللہ کریم سے بہتر کون جانتا ہے کہ مسلمانوں کے کردار و عمل کا حال یکساں نہیں رہے گا۔ ایسا وقت بھی آئے گا جب ان میں اخوت صرف نام کی رہ جائے گی۔ لیکن زندگی کا کاروبار پھر بھی رواں دواں رہے گا۔ تو ہر طرح کے حالات سے متعلق ہدایات دینا' ہر ایسے مذہب کا اقتضا ہے جو فطری مذہب کہا جاتا ہے تو اسلام نے اسی اقتضا کے پیشِ نظر رہن کی اجازت دی کہ اگر کسی دوسری صورت میں قرض نہ ملتا ہو اور قرض کی شدید ضرورت ہو تو کسی چیز کو رہن رکھ کر قرض لیا جا سکتا ہے۔

مرہونہ چیز سے مرتہن کو فائدہ اٹھانے کی اجازت

مقبوضہ کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ قرض دینے والا اپنے مقروض کی رہن رکھی ہوئی چیز کو اپنے قبضے میں تو رکھ سکتا ہے تاکہ اسے قرض کی ادائیگی کے لیے اطمینان رہے' لیکن اس سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مثلاً اگر اس نے قرضدار سے مکان رہن کے طور پر لیا ہے تو یہ نہ اس میں رہ سکتا ہے نہ اسے کرائے پر چڑھا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں رہن رکھی ہوئی چیز سے کوئی فائدہ اٹھانا سود کے حکم میں ہے۔ ایک آدمی قرض پر رقم دے کر اس پر سود لیتا ہے اور دوسرا شخص قرض کے بدلے میں رہن رکھ کر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو دونوں صورتوں میں آخر کیا بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں ہی سود کے حکم میں ہیں۔ ہاں اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ سواری یا بار برداری کا جانور ہے تو اس سے سواری یا بار برداری کی خدمت لی جا سکتی ہے کیونکہ یہ دراصل اس چارے کا معاوضہ ہے جو مرتہن اس جانور کو کھلاتا ہے۔

Marfat.com

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. الخ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہن رکھنے کی نوبت اس وقت آنی چاہئے جب قرض دینے والا قرض لینے والے پر اعتبار نہ رکھتا ہو۔ لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ دستاویز تیار ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ گواہ بھی کوئی میسر نہیں، لیکن قرض دینے والا قرض لینے والے کو قابل اعتبار سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی ضمانت کے اسے قرض دے دیتا ہے تو اب قرض لینے والے کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ قرض دینے والے نے چونکہ تم پر اعتبار کیا ہے تو اس اعتبار کو ٹھیس مت پہنچاؤ۔ اس کی امانت یعنی اس کا قرض پورا پورا اسے واپس کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ اگر تم نے اس کے اعتبار سے غلط فائدہ اٹھایا تو اللہ کے یہاں سخت باز پرس ہوگی۔

اس طویل آیت میں آپ نے دیکھا کہ جس قدر ہدایات ارشاد فرمائی گئی ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق گواہی کے محفوظ رہنے پر ہے۔ اگر گواہوں نے گواہی چھپائی یا غلط بیانی کی چونکہ معاملے کا دارومدار تو انہی پر ہے تو ثبوت کی کوئی اور صورت باقی نہیں رہے گی اور صاحب حق کا حق مارا جائے گا۔ اس لیے حکم دیا کہ شہادت یعنی گواہی مت چھپاؤ۔ اخفائے شہادت کی شناعت کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ جو شخص گواہی چھپاتا ہے اس کا ضمیر گنہگار ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسان کے ظاہری اعضاء تک محدود رہتا ہے۔ وہ اگرچہ سیرت و کردار کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن وہ نقصان اتنا گہرا نہیں ہوتا، لیکن وہ گناہ جو دل کی گہرائیوں سے ہوتے ہیں اور آدمی غور و فکر کے بعد اپنے دل میں ان گناہوں کا تصور جما لیتا ہے تو ایسے گناہوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کے قلب و دماغ اور اس کے ضمیر کو متاثر کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سیرت و کردار کا تمام سرمایہ مسموم ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ شہادت کا چھپانا اسی قسم کا گناہ ہے۔ اس لیے اس پر زور دیتے ہوئے تنبیہ فرمائی ہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے اس لیے تمہیں اس معاملے میں دلیر نہیں ہونا چاہیے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپاؤ اللہ اس کا تم سے حساب لے گا۔ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (۲۸۴)

خاتمۂ سورۃ کی آیات

یہ عظیم سورۃ گزشتہ آیت پر ختم ہوگئی۔ پیش نظر رکوع کی آیات اس سورت کا خاتمہ ہیں۔ یہ آیتِ کریمہ اپنے موقع و محل کے لحاظ سے سابقہ آیت سے مربوط بھی ہے اور بعد کی آیات کے لیے نہایت جامع اور موثر تمہید بھی۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا تھا کہ شہادت کو نہ چھپاؤ جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا ضمیر گنہگار ہو جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی مضمون کو موکد کرتے ہوئے فرمایا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ کی ملکیت اور اس کے اختیار و تصرف میں ہے۔ اور پھر ہر چیز کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور اس کے علم کا حال یہ ہے کہ کوئی چیز بھی اس کی نگاہوں سے محفوظ نہیں۔ وہ ظاہر و باطن ہر چیز کو جانتا ہے اس لیے جو شخص شہادت کو چھپاتا ہے قیامت کے دن اس کا چھپانا کام نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اخفا کو ظاہر کر دے گا۔ اور پھر اس سے باز پرس کرے گا۔ اور جہاں تک آئندہ آیات کے لیے تمہید کا

Marfat.com

تعلق ہے وہ اس طرح سے ہے کہ قرآنِ کریم کا عام طور پر انداز یہ ہے کہ سورت کا آغاز جن حقائق سے کرتا ہے اسی کو پوری سورت میں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح کٹھلی سے سوئی پھوٹتی ہے اور پھر پھیلتے پھیلتے ایک قدآور درخت بن جاتی ہے اسی طرح ہر سورت کے مضامین شاخ در شاخ پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن سورت کی جو آخری آیتیں خاتمہ سورت کی حیثیت سے آتی ہیں اس میں ان حقائق کو سمیٹ کر خلاصے کے طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت کو بھی چند بنیادی عقائد سے شروع کیا گیا۔ اور پھر جب اس کی دعوت کا آغاز ہوا تو توحید کو اس کی بنیاد بنایا گیا اور پھر احکام کی شکل میں اس کی شاخیں پھیلتی چلی گئیں، اب آخر میں آ کر اس کو سمع و اطاعت کا عنوان دے دیا گیا۔ اس ایمانی دعوت کو جیسے جیسے دگرگوں حالات سے واسطہ پڑتا گیا اور مخالفتوں اور اذیتوں میں افزونی آتی گئی اور حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ بارہ تیرہ سن نبوی تک اس طرح کی صورت حال پیدا ہوگئی کہ بظاہر نظر جسے مایوس کن کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت ان آیات کا نزول ہوا جس میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ایک تو یہ کہ تمہارا اصل سرمایہ ایمان و عمل اور استقامت ہے۔ تم بفضلہٖ تعالیٰ اس میں پورے اترے ہو لیکن بھول چوک اور غلطی کا ہو جانا انسانی فطرت ہے۔ اس لیے مسلسل اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کی معافی مانگتے رہو۔ اور اپنی کمزوریوں کے حوالے سے اللہ سے عنایات کے طلبگار رہو۔ اور مخالف حالات پر قابو پانے اور ان پہ غالب آنے کے لیے اللہ سے نصرت و تائید کی التجا کرتے رہو۔ اور ضمناً یہ بات بھی کہ وہ وقت دور نہیں جب یہ مخالفت کے بادل چھٹ جائیں گے اور اسلام پوری تابانی سے جزیرہ عرب کی حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غالب آ جائے گا۔ اس تناظر میں اس آیتِ کریمہ کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سابقہ آیات سے مربوط بھی ہے اور آنے والی آیات کی تمہید بھی۔

بنیادی عقیدہ

اسلام کا بنیادی عقیدہ جس پر توحید کی پوری عمارت ایستادہ ہے اور جس پر پختہ یقین عقیدہ کی بنیاد ہے اور یہی وہ بنیادی تصور ہے جس کے قبول کر لینے کے بعد ایمان کا چراغ جلتا اور کردار و عمل کی قوت جنم لیتی ہے۔ اور یہی وہ بے پناہ طاقت ہے جس سے نفع و نقصان کی پیمانے بدل جاتے ہیں اور انسانی ارادوں میں حیرت انگیز قوت آ جاتی ہے۔

انسان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سا آستانہ ہے جس پر اسے سر جھکانا چاہیے۔ اور وہ کون راہنما ہے جس کی راہنمائی پر اسے مکمل بھروسہ ہونا چاہیے اور وہ کونسی قوت ہے جس سے ہمیشہ استمداد اور استعانت کرنی چاہیے۔ اور وہ کون سی باخبر ذات ہے جس سے تنہائیاں آباد ہونی چاہئیں۔ ان سب باتوں کا اس آیت کے پہلے جملے میں جواب دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے۔ اس لحاظ سے انسان بھی اس کا مملوک اور اس کا غلام ہے۔ کائنات کی ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے۔ اسی طرح انسان کے احساسات اور صلاحیتیں بھی اسی کے اختیار و تصرف میں ہیں۔ وہی ہر چیز کا مرجع ہے۔ اس لحاظ سے انسان کو بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ان تصورات کو قبول کر لینے کے بعد شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ انسان کو ایک منزل مل جاتی ہے اور اس کی ایک سمت متعین ہو جاتی ہے وہ جان لیتا ہے کہ مجھے زندگی کس کی راہنمائی میں گزارنی ہے، کس کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہے، کس کے سامنے مناجاتیں کرنی ہیں اور کس سے اپنا دل لگانا ہے؟ یہ عقیدے کی وہ قوت ہے جو افراد اور اقوام کو بالکل ایک نئی زندگی دیتی ہے۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں مزید فرمایا کہ تم جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو وہ سب اللہ کے علم میں ہے۔اس لیے ان میں سے ہر بات کا محاسبہ ہوگا۔انسانی فکر میں جب تک مکمل اصابت پیدا نہیں ہوتی اور اس کی طبیعت یکسو ہو کر ایک منزل کی طرف رواں دواں نہیں ہو جاتی' اس وقت تک وہ جس نظریے کو قبول کرتا ہے اس کی ظاہری پابندیوں کو تو اپناتا ہے لیکن باطن میں خیانت اور اخفاء کا عمل جاری رہتا ہے' لیکن جب اسے اس بات پر یقین آ جائے کہ میں جس ذات کو اپنا ملجا و ماوی بنا چکا ہوں وہ صرف میرے ظاہر سے واقف نہیں' باطن سے بھی واقف ہے۔میرا کوئی عمل اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں اور مزید یہ بات کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس کے سامنے حاضری ہوگی اور وہ ہر بات کا جواب طلب کرے گا۔اس احساس کے پختہ ہو جانے کے بعد باطنی آلودگیاں اور خیانتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ آیت کے اس جملے نے پاکیزہ صفت صحابہ کو انتہائی خوفزدہ کر دیا۔وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بصد ادب عرض کیا کہ حضور دل میں تو ہر طرح کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں اور ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جنہیں روکنے پر آدمی قادر نہیں ہوتا۔اگر اللہ تعالیٰ دل کی ایسی تمام وارداتوں پر محاسبہ فرمائے گا تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟ ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم یہود کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو "سمعنا وعصینا" یعنی ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔تمہیں تو شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنا چاہیے۔کیونکہ تمہاری زندگیوں پر یہی لباس راست آتا ہے۔صحابہ یہ کہتے ہوئے جھک گئے "سمعنا واطعنا" لیکن اگلی آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خدشے کو دور فرما دیا۔

اللہ کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ایمان و عمل سے کچھ نہیں ہوگا' سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہوگا۔وہ جسے چاہے گا جنت عطا فرمائے گا اور جسے چاہے گا جہنم میں بھیج دے گا۔اگر اس مفہوم کو صحیح سمجھا جائے تو پھر انبیاء کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا' ایک بے معنیٰ کاوش معلوم ہوتی ہے۔انبیاءِ کرام اسی لیے آتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس زندگی کی تعلیم دیں جس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور ان اعمال سے بچائیں جن سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔اور وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب تم اللہ کے پسندیدہ اعمال کرو گے تو اللہ تمہیں جنت عطا فرمائے گا اور اس کی کتابیں بھی بالخصوص قرآنِ کریم انہی باتوں کی وضاحت کرتی ہیں۔اس آیت میں دراصل یہ بحث ہے ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں سے خوش ہو کر بخشے گا اور کن باتوں پر ناراض ہو کر سزا دے گا۔بلکہ اس میں شرک کی تردید فرمائی گئی ہے کہ مشرکین نے یہ جو سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے فلاں فلاں قوتوں کو جو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے وہ ہمیں اللہ کے غضب سے بچائیں گی اور ان کے دامن گرفتہ ہونے کی وجہ سے ہم جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔اللہ فرماتا ہے کہ مغفرت یا عذاب میں کسی کو دخل دینے کی مجال نہیں۔قیامت کے دن اللہ جسے بخشنا چاہے گا کوئی اسے روک نہیں سکے گا۔اور جسے سزا دینا چاہے گا کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکے گا۔کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔البتہ رہی یہ بات کہ جب سب کچھ اسکی مشیت سے ہوگا تو پھر ایمان و عمل کا کیا فائدہ؟ تو اس میں یہ بات یاد رہنی چاہیئے کہ اس کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ چلتی ہے۔اس کی مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لیے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔یہاں تو صرف یہ فرمانا مقصود ہے کہ کسی اور کے لیے اس میں کسی مداخلت کی کوئی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○

(مان لیا رسول نے جو کچھ اتارا گیا اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اور مسلمانوں نے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ (نیز کہتے ہیں) ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں ہم نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے) (۲۸۵)

آخری دو آیتوں کی فضیلت

سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں بڑی عظیم اور بہت فضائل کی حامل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اوتیت ھذہ الایات من اخر سورۃ البقرۃ من کنز تحت العرش لم یوتھن نبی قبلی (سورہ بقرہ کی آخری آیتیں مجھے عرش عظیم کے نیچے جو (رحمتوں اور برکتوں کا ربانی) خزانہ ہے اس سے عطا فرمائی گئیں اور یہ وہ انعام عظیم ہے جو کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لیے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ۔ اسی لیے حضرت فاروق اعظم اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی کو جس کو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۃ بقرۃ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو ایک ایسے اعزاز سے نوازا گیا ہے کہ جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اس اعزاز کا پہلا حصہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رکھا گیا۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا اعتراف فرمایا' پھر ان کی برکت سے صحابہ کرام یعنی مسلمانوں کے ایمان کا اعتراف کیا۔ کہاں تو یہ حال کہ وہ اپنے دلوں میں آنے والے خیالات کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہی سے لرزاں و ترساں تھے اور کہاں یہ مقام کہ عرش الٰہی سے ان کے ایمان کا اعتراف نازل فرمایا جا رہا ہے۔ ع ''یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے''

اسلامی عقائد

صحابہ کرام کے ایمان کی حکائت میں اسلامی عقائد کی تفصیل اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اور یہ وہی حقائق ہیں جنہیں سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں ذکر فرمایا گیا۔ اور پھر جہاں تحویلِ قبلہ کے بعد اللہ سے وفاداری کی حقیقت کو کھولا گیا ہے وہاں انہی باتوں کی تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔ اب انہی بنیادی حقائق کا خلاصہ بیان فرما کر اس سورت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں جو اسلامی عقائد

Marfat.com

بیان کئے جا رہے ہیں یعنی جن پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہیں اللہ پر ایمان' اس کے فرشتوں پر ایمان' اس کی کتابوں پر ایمان' اس کے تمام رسولوں پر ایمان اور اس امر پر ایمان کہ آخر کار ہمیں اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ یہ پانچ امور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ یوں تو ان کی تفصیل' اسی صورت کی آیت نمبر ۱۷۷ میں گزر گئی۔ البتہ یہاں رسولوں پر ایمان کے سلسلے میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مسلمان تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی رسول کو مانیں اور کسی نہ مانیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اس بات کو تسلیم کر لیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا مملوک اور اسی کے زیر تصرف ہے۔ تو زمین و آسمان کی ایک اہم مخلوق خود انسان ہے۔ بلکہ اسے باقی مخلوقات پر یہ شرف حاصل ہے کہ اسے قوت تمیز اور جوہر عقل دے کر خیر و شر کے معاملے میں ایک آزادی دی گئی ہے اور یہی اس کا امتحان ہے۔ تو جو لوگ اس آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے متذکرہ بالا امور پر ایمان لے آتے ہیں وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ وہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی الوہیت پر علی الاطلاق ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس بات کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا کہ وہ کس رسول کو مانیں اور کس کو نہ مانیں۔ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے معبود اور حاکم ٹھہرے تو وہ جب اور جس کو بھی اپنے احکام اور پیغام دے کر بھیجیں گے تو انہیں ماننا لازم ہوگا۔ اس لیے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء اور رسول آئے ہیں ہم سب پر ایمان لاتے ہیں۔ جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں' ہم ان سب کو سچا سمجھتے ہیں۔ البتہ ہم ان کی شریعتوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو یہ کہ وہ محفوظ نہیں رہیں' تحریف اور ترمیم کا شکار ہو گئیں۔ اور دوسری وجہ یہ کہ اللہ کے ہر رسول نے نبی آخر الزمان کے بارے میں اپنی اپنی امتوں کو بتلایا کہ سب سے آخر میں ایک رسول آئیں گے جو شریعت کو مکمل کریں گے۔ اللہ جن پر دین کی تکمیل فرمائے گا۔ پہلی شریعتیں اپنے اپنے وقتوں کے مطابق کافی تھیں۔ لیکن ایک ایسی شریعت کا آنا باقی تھا جو تمام زمانوں کے لیے کافی ہو۔ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری شریعت لے کر آئے۔ اب اس کی موجودگی میں کسی پہلی نا تمام اور محرف شریعت پر عمل کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

مسلمانوں کا طرزِ عمل

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ اس میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کو بیان کیا گیا ہے اور یہود پر ایک طرح سے تعریض بھی ہے۔ یہود کی تاریخ ان کے جس کردار کی منہ بولتی تصویر ہے اس کا عنوان ہی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر سے جو سنا اس کی نافرمانی کی۔ لیکن مسلمانوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ انہوں نے جو سنا اس کی اطاعت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں آیا کہ مسلمانوں نے سمع و اطاعت کا حق ادا نہ کیا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی زندگی کے ہر معاملے میں ان کا یہی رویہ رہا۔ اور ان کے اس رویے کے پیچھے ان کا یہ گہرا احساس کام کرتا تھا کہ ہمیں اللہ کی طرف لوٹ کے جانا ہے اگر ہم نے سمع و اطاعت میں کمی کی تو اس کے سامنے جوابدہی مشکل ہو جائے گی۔ اور آخرت میں ہمارا سرمایہ سوائے اللہ کی مغفرت کے اور کچھ نہیں۔ اور وہ مغفرت اللہ کے رسولؐ کے ہر حکم کو سننے اور ماننے پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمان زوال کا شکار نہیں ہوئے ان کی اجتماعی زندگی اسی طرزِ زندگی سے عبارت تھی۔

اس آیت کریمہ میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا مسلمانوں کے ایمان کا اعتراف فرمایا گیا ہے۔ اور یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس اعتراف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بعد ایمانیات کے حوالے سے مسلمانوں

Marfat.com

کا ذکر فرمایا گیا۔اس میں دو باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ایک تو یہ بات کہ اللہ کے یہاں مسلمانوں کے جس ایمان کا اعتراف اور مقام و مرتبہ ہے وہ وہ ایمان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے اور آپؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کرنے سے متعلق ہے۔اگر وہ ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے اور آپؐ کی کیفیات سے مختلف ہو تو اس کا اللہ کے یہاں کوئی اعتبار نہیں۔اور دوسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بنیادی عقائد پر ایمان لانے کی اللہ کے یہاں جو اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بالکل برابر سطح پر رکھا گیا ہے۔بلکہ ایمان لانے والوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تذکرہ پہلے ہے اور مسلمانوں کا بعد میں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں اللہ کے قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبر بھی اسی طرح پابند ہے جس طرح عام اہل ایمان پابند ہیں۔دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں۔لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اسے سب سے آگے بڑھ کر انا اول المؤمنین و انا اول المسلمین کہتے ہوئے اس قانون کی علمبرداری کرنا پڑتی ہے۔اسی سے پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت میسر آتی ہے جس کے بعد کسی ہٹ دھرمی کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔(ایمان لانے والو تم یوں دعا کیا کرو) اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرما۔اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔تو ہمارا مولا ہے پس کافروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد فرما) (۲۸۶)

جملہ معترضہ

آیت کے پہلے دو جملے دعا کے بیچ میں جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ گذشتہ سے پیوستہ آیتِ کریمہ کے نازل ہونے سے مسلمان شدید خوف زدگی میں مبتلا ہو گئے تھے۔انہوں نے اس سے یہ سمجھا تھا کہ دل میں جو خیالات آتے ہیں چاہے وہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری ان تمام کا اللہ تعالیٰ محاسبہ فرمائیں گے۔تو اس محاسبہ سے پھر کون بچ سکے گا؟ اس جملہ معترضہ میں پروردگار نے وضاحت فرما دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بھی اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں بناتا۔اس بات

Marfat.com

وضاحت ایک حدیث سے باحسن طریق ہوجاتی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے ان اللہ تجاوز عن امتی عما حدثت انفسھا ما لم یتکلموا او یعملوا بہ (اللہ تعالیٰ نے میری امت کو معاف کردیا ہے وہ خیال جو ان کے دل میں آئے جب تک اس کو زبان سے نہ کہیں یا عمل نہ کریں) حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں کچھ تو ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جو اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ اور ایک مومن برے خیالات اور وسوسوں کو ہمیشہ جھٹکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ایسے خیالات سے ایک ناگواری ہوتی ہے' وہ کوشش کرتا ہے کہ میں اپنے دل کو ایسے خیالات سے محفوظ رکھوں۔ یہ وہ خیالات ہیں جن کا اللہ کے یہاں محاسبہ نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ میرے دل میں ایسے ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ میں انہیں زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا ایسی صورت میں تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا میں اس طرح کے خیالات کو دل سے جھٹکنے اور نکالنے کی کوشش کرتا ہوں اور مجھے اس سے نہایت تکلیف ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہی کشمکش ایمان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک آدمی ایسے خیالات سے دل نہیں لگاتا بلکہ انہیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے وہ ایمان کی حالت میں ہے اور ممکن ہے کبھی نہ کبھی وہ انہیں نکالنے میں کامیاب ہوجائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی بعض برائی کے خیالات خود دل میں لاتا ہے' پھر انہیں پختہ کرتا رہتا ہے اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے منصوبے بناتا ہے' پھر کبھی انہیں عمل میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے اور ہمیشہ اس منصوبے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے لیکن زندگی بھر اسے اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ وہ وساوس اور خیالات ہیں' جن کی اللہ کے یہاں بازپرس ہوگی اور محاسبہ ہوگا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غیر اختیاری خیالات پر تو بازپرس نہیں ہوگی لیکن جہاں تک آدمی کی اعمال کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اعمال نیک ہوں یا برے اس کے نتائج بہرحال کرنے والے سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ وہ اگر اچھا کام کرتا ہے تو اس کا پھل بھی اسے ملے گا۔ اور اگر وہ برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے انجام سے بھی اسے دوچار ہونا پڑے گا۔ یعنی آدمی کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی چیز اس کے اپنے اعمال ہیں۔ وہ جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اور جو کرے گا وہی بھرے گا۔ دوسروں کی نیکیاں اس کا کچھ نہیں سنوار سکتیں اور دوسروں کی برائیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں وہ ناپ تول کے دیئے' وہ انسانی طاقت سے باہر نہیں۔ البتہ جہاں کہیں کسی خاص عارضے کے باعث کوئی شخص کمزوری محسوس کرتا ہے تو احکام ہی کے سلسلے میں مراعات بھی دی گئی ہیں' جس سے کمزور شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد اگلے جملے سے پھر دعا شروع ہوجاتی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (اے ہمارے رب ہم سے مواخذہ نہ فرما' اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہوجائے۔ اس میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی اللہ کے احکام کی اطاعت کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی سمع واطاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ آدمی اپنے تئیں ایک غلط کام صحیح کام سمجھ کر کر بیٹھے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو معاف کردی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہ اللہ کی بے نیازیوں پر رہتی ہے ان سے بھول کر بھی خطا ہوجائے تو وہ اللہ سے معافی مانگنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ اور ویسے بھی بندے کا اصل جوہر خشیت الٰہی ہے۔ معاف شدہ

Marfat.com

چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے۔ اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ بندے کی طرف سے جیسے جیسے بندگی اور خشیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ادھر سے ویسے ویسے رحمت وعنایت کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ معصوم اور مغفور اور کون ہوگا؟ اس کے باوجود آپؐ استغفار میں حد درجہ مشقت اٹھاتے تھے۔ بعض دفعہ رات کا بیشتر حصہ بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑاتے گزر جاتا' پاؤں متورم ہو جاتے تو آپؐ سے کہا گیا کہ آپؐ کے تو اللہ نے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے' پھر آپؐ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا افلا اکون عبداً شکورا (کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) یہ وہ دولت ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے یہاں دعا کی جارہی ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر ایسا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے) اس دعا میں پروردگار سے اس اصر اور اغلال کے نہ ڈالنے کی دعا کی گئی ہے جو یہود پہ ڈالے گئے۔ اصر سے مراد شریعت کے وہ سخت احکام ہیں جو یہود کی سرکشی کے باعث ان پر عائد کیے گئے تھے اور وہ پابندیاں ہیں جو انہوں نے اپنے غلو اور جہالت کی وجہ سے خود اپنے لیے پیدا کر لی تھیں۔ امت کو یہ دعا سکھائی گئی کہ یا اللہ ہمارے لیے ایسے مشکل احکام نازل نہ فرما اور مشکل احکام چونکہ سرکشی کا نتیجہ ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی ہمیں بندگی اور خشیت کی توفیق دینا تاکہ ہم تیری شریعت میں سرکشی کا رویہ اختیار نہ کریں۔ ہم اہل دنیا کے سامنے سرافراز ہوں' لیکن تیری ذات اور تیرے احکام کے سامنے ہمیشہ ہمارا سر جھکا رہے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (اور ہمارے پروردگا! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو) اللہ کا کوئی رسول جب بھی اللہ کے دین کی دعوت لے کر اٹھا ہے تو اسے اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہمیشہ مخالفین کی مخالفت اور معاندین کے عناد سے واسطہ پڑا۔ کتنے پیغمبر ایسے گزرے ہیں جو اس راستے میں جام شہادت نوش کر گئے اور کتنے رسول ہیں جنہیں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور ان پر ایمان لانے والوں کو ناقابل بیان اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ اس دعا میں یہ کہا جارہا ہے کہ یا اللہ حق و باطل کی اس کشمکش میں ہمیں ایسی سخت آزمائشوں سے محفوظ رکھنا جن کی برداشت ہماری قوتِ برداشت کے لیے امتحان بن جائے۔ ایسی آزمائشیں اگرچہ لازمۂ ایمان ہیں' اور اسی سے کھرے کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صلاحیتوں کو اسی سے جلا دیتا ہے' لیکن الٰہی ہمیں اس سفر میں ایسی کسی بڑی آزمائش سے دوچار نہ کرنا جس کا تحمل ہمارے لیے مشکل ہو جائے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والوں کی ہمیشہ مدد فرماتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں اس طرح کی دعاؤں کی تلقین بھی فرماتا ہے کہ راہِ حق میں استقلال اور استقامت دکھاتے ہوئے ان کے اندر اپنی نیکی کا غرور پیدا نہ ہو۔ اپنی استقامت ان کے لیے عُجب کا باعث نہ بن جائے۔ ایسی آزمائشوں میں صبر کرنا' لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی کمزوری اور ناتوانی کا اعتراف کرنا یہ وہ صحیح رویہ ہے جو ایک مومن کو زیب دیتا ہے۔

اس کے بعد مزید تین دعاؤں کا ذکر ہے جو ایک مومن کا حقیقی سرمایہ ہیں اور اسے ہر حال میں یہی تین باتیں اپنے رب سے مانگتے رہنا چاہیے۔ وہ تین دعائیں یہ ہیں وَاعْفُ عَنَّا (ہمارے ساتھ نرمی فرما' چشم پوشی فرما' معاف فرمادے) وَاغْفِرْ لَنَا (ہم سے درگزر فرما اور ہماری مغفرت فرمادے) وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرما) یہی تین سہارے ہیں جن کے سائے میں ایک مومن کی زندگی گزرتی ہے۔ اور یہی تین ذریعے ہیں جو ہمیشہ اللہ کی رحمت کو آواز دیتے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد فرمایا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ مولا کا معنی آقا اور مرجع کے ہیں۔ جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جاتا ہے۔ الٰہی تو ہی ہمارا مرجع ہے۔ زندگی کے نازک مراحل میں تیرے سوا ہم کسی اور کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ تیری ذات اور تیری پناہ ہمارے لیے کافی ہے۔ جو عظیم ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی ہے ہم اس کے لیے بھی تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ دنیا بھر میں کافروں کے جتھے ہمیں ختم کرنے دینے پر تل گئے ہیں ایسے تمام کافروں کے خلاف تو ہماری مدد فرما۔ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے نازل ہوئیں۔ اور یہ زمانہ وہ ہے جب کہ کفر اور اسلام کے درمیان کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہر وقت خطرہ تھا۔ بیشتر مسلمان وطن چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ جو چند مسلمان مکے میں باقی تھے وہ کافروں کی اذیتوں کی زد پر تھے۔ اسی حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر فرمایا اور وہاں جو روح فرسا واقعات پیش آئے اور جس اندوہناک صورتحال سے دوچار ہونا پڑا طائف کے پتھر آج بھی اس پر گواہ ہیں۔ ایسی نازک صورت حال میں جب کہ سرزمین عرب میں کوئی جگہ ایسی نظر نہ آتی تھی جہاں کسی بندہ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی سرزمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ اس سے ایک طرف تو مسلمانوں کو ایک تسکین ملی، حوصلہ ملا، ڈھارس بندھی اور ساتھ ہی روشنی کی کرن دکھائی دی کہ جب پروردگار خود ہمیں یہ دعائیں مانگنے کی تلقین فرما رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دعاؤں کی قبولیت یقینی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اسلام کے عمومی غلبے کا سورج طلوع ہوگا اور وہ زمانہ بہت دور کی بات نہیں جب یہ مصائب کا دور ختم ہوگا اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسی پناہ گاہ عطا فرمائیں گے جہاں اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کی حاکمیت ہوگی۔ چنانچہ اس کے جلدی بعد ہجرت کا حکم ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے اور پھر آٹھ سال کا عرصہ (جو قوموں کی زندگی میں نہایت قلیل ہوتا ہے) گزرنے نہیں پایا کہ مکہ جو پورے جزیرۂ عرب کا مرکز اعصاب تھا اور جن کی قیادت میں پورا جزیرۂ عرب مسلمانوں کے لیے جہنم بن چکا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم بلال اللہ کے گھر کی چھت پر کھڑا ہو کر اللہ کی کبریائی کا اعلان کر رہا تھا۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

تعارف ---------- 292
سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ ---------- 295
اللہ کی الوہیت پر حیات وقیومیت کی صفات سے استدلال ---------- 297
حیات وقیومت کا اقتضاء ---------- 298
قرآن کے مصدق ہونے کا مفہوم ---------- 299
تورات اور انجیل سے کیا مراد ہے؟ ---------- 300
ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 303
آیات محکمات کا مفہوم ---------- 305
ام الکتاب کا مفہوم ---------- 305
آیات متشابہات سے مراد کیا ہے؟ ---------- 306
ایک مثال ---------- 307
راسخین فی العلم کی دعا ---------- 309
قبولیت حق میں اصل رکاوٹ ---------- 312
شَدِیْدُ الْعِقَابِ کا مفہوم ---------- 314
یہود کو وارننگ ---------- 315
گزشتہ آیت میں دعویٰ کی دلیل ---------- 316
تائید ونصرت کی ایک مثال ---------- 318
آیت نمبر۱۰ کی مزید تشریح ---------- 319
تزئین کا مفہوم ---------- 320
دنیا کی غلامی سے نکالنے کی ایک کوشش ---------- 321
صبر ---------- 325
صدق ---------- 327
قنوت ---------- 327

Marfat.com

انفاق ---------- 328

استغفار ---------- 328

اللہ کی گواہی دلائلِ آفاق کی روشنی میں ---------- 331

دلیلِ توافق ---------- 335

خلاصہ بحث اور نتیجہ ---------- 338

اللہ کی گواہی دلائل انفس کے نتیجے میں ---------- 339

اہلِ علم کی گواہی ---------- 340

ملائکہ کی گواہی ---------- 340

قائم بالقسط ہونے کی گواہی ---------- 340

دین کا مفہوم ---------- 342

اسلام کا مفہوم ---------- 343

مخالفین کو دھمکی اور دعوت ---------- 344

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور یہود کی تاریخی حقیقت کا اظہار ---------- 348

یہود پر تنقید کا سبب ---------- 349

نَصِیباً مِّنَ الْکِتٰبِ کا مفہوم ---------- 350

لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ کا مفہوم ---------- 351

اہلِ کتاب کے ایمان نہ لانے کا سبب ---------- 352

امتِ مسلمہ کا حال ---------- 353

شانِ نزول ---------- 355

بِیَدِکَ الْخَیْرُ کا مفہوم ---------- 357

بِغَیْرِ حِسَابٍ کا مفہوم ---------- 359

پس منظر ---------- 360

وقتی اور مستقل ہدایت ---------- 360

۱...... موالاۃ ---------- 361

۲...... مواساۃ ---------- 361

۳...... مدارات ---------- 362

Marfat.com

۴...... معاملات ---------- 362
کفر اور اسلام باہمی متضاد ہیں ---------- 363
غیر حربی کافروں سے تعلقات کی شرط ---------- 363
اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً کا مفہوم ---------- 365
هُنَالِکَ کا مفہوم ---------- 377
توجہ طلب باتیں ---------- 377
حضرت یحیٰی علیہ السلام کی صفات اور فرائض ---------- 379
حضرت زکریا علیہ السلام کی درخواست کا مفہوم ---------- 380
لفظ مَکۡر کا اصلی مفہوم ---------- 399
حضراتِ انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ---------- 400
سیدنا مسیح علیہ السلام کے خلاف یہود کی سازشیں ---------- 400
دعوت کا حکیمانہ انداز ---------- 421
عقیدۂ توحید کا لازمی نتیجہ رب کی وحدت ہے ---------- 422
منصب شہادت کے دو تقاضے ---------- 424
دلائل میں پسپائی کے بعد جذبات کا سہارا ---------- 425
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ---------- 426
اہلِ کتاب کا اصل مرض ---------- 428
پس منظر ---------- 432
حسد کی بیماری ---------- 435
ایک سازش ---------- 435
سلسلۂ کلام کی توجیہ میں دو آراء ---------- 436
نیشنلزم (Nationalism)، دودھاری تلوار ---------- 439
اشتراء کا مفہوم ---------- 444
ثَمَنًا قَلِیۡلًا کا مفہوم ---------- 444
قوموں کے اخلاقی زوال کا اصل سبب ---------- 444
اَیۡمَانِهِمۡ کا مفہوم ---------- 447

Marfat.com

عہداللہ سے کیا مراد ہے؟ ---------- 448
یَلْوٗنَ کا مفہوم ---------- 449
عقلِ سلیم سے خطاب ---------- 451
رَبَّانِیٖ کی تحقیق ---------- 452
کلمۂ جامعہ ---------- 462
مکہ اور بکہ کی تشریح ---------- 474
سب سے پہلا اللہ کا گھر ---------- 475
ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 476
بیت اللہ کی برکات ---------- 477
بیت اللہ میں واضح نشانیاں ---------- 477
آیتِ کریمہ میں بیان کردہ تین نشانیاں ---------- 478
مزید شرم دلائی گئی ہے ---------- 481
مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے بچنے کی تاکید ---------- 481
مسلمان خود آگاہی سے کام لیں ---------- 483
اعتصام باللہ کی حقیقت ---------- 485
دو ہدایات (۱) اعتصام باللہ، (۲) اتفاق واتحاد ---------- 488
انسان کی فکری استقامت کیلئے مستقل نگہداشت ضروری ہے ---------- 490
مسلمانوں کو آگاہی ---------- 495
تفرقہ اور اختلاف ---------- 496
ایک اہم ترین سوال کا جواب ---------- 498
کائنات میں فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کو ہے ---------- 498
بنی اسرائیل کی منصبِ امامت سے معزولی اور امتِ مسلمہ کا تقرر ---------- 501
امتِ مسلمہ کی صفات ---------- 502
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا مفہوم ---------- 503
یہود کی اجتماعی اور عسکری قوت سے متعلق چند پیشگوئیاں ---------- 506
قومِ یہود عبرت کا نمونہ ---------- 510

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ -- 510
یہود پر ذلت ومسکنت کے اسباب -- 512
بِغَيْرِ حَقٍّ کا مفہوم -- 512
اہلِ کتاب سب یکساں نہیں -- 514
یہود کا قومی تجزیہ -- 515
انفاق سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ -- 516
انصار اور یہود کے تعلقات کا پس منظر -- 517
اہلِ کتاب کو ہمراز نہ بناؤ -- 518
مسلمانوں کی سادگی اور یہود کی عیاری -- 519
یہود سے ہوشیار رہنے کی ہدایت -- 520
صبر کا مفہوم -- 521
١. صَبْرٌ عَلَى الطَّاعَاتِ -- 521
٢. صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَاتِ -- 522
٣. صَبْرٌ عَلَى الْمَصَائِبِ -- 522
تقویٰ کا مفہوم -- 523
غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ -- 525
آیت میں دو گروہوں کا تذکرہ -- 527
غزوۂ بدر سے استدلال -- 528
فرشتوں کا اترنا صرف بشارت ہے، مدد اللہ کی جانب سے ہے -- 530
سُنتِ الٰہی -- 533
جنگ احد کی شکست کے مضمر اسباب -- 536
اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا مفہوم -- 537
سود انفاق کا متضاد ہے -- 538
اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت -- 538
ایک مومن کا اصل ہدف -- 539
متقی کی پہلی صفت انفاق ہے -- 541

Marfat.com

متقی کی مزید دوسری، تیسری اور چوتھی صفت ---------- 542
انفاق میں جذبۂ انفاق دیکھا جاتا ہے ---------- 543
انفاق کی راہ کی ایک اور مزاحمت ---------- 544
ایک پرلطف بات ---------- 546
مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح اور حوصلہ افزائی ---------- 548
وھن سے مراد ---------- 549
اَلْاَیَّامُ کا مفہوم ---------- 550
احد کے حادثہ میں مضمر حکمتیں ---------- 550
ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 552
آزمائش کا دوگونہ فائدہ ---------- 552
آیت کا پس منظر ---------- 554
آیت کا پس منظر ---------- 556
جذبۂ محبت کی کارفرمائی ---------- 558
بعض حقائق اعتراف کے باوجود استحضار سے محروم رہتے ہیں ---------- 559
ایک اور کوتاہی ---------- 560
بعض اوہام کی اصلاح ---------- 561
منافقین کا پروپیگنڈا اور اس کا ازالہ ---------- 565
شرک کی کوئی بنیاد نہیں ---------- 566
مسلمانوں کی شکست فتح کے بعد اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے ---------- 567
عقیدہ کا ضعف کفر تک پہنچا دیتا ہے ---------- 579
ایک نوید جانفزا ---------- 581
آنحضرت ﷺ کے کریمانہ اخلاق اللہ کی رحمت ہیں ---------- 582
آنحضرت ﷺ سے عفو و درگزر کی سفارش ---------- 583
مشاورت کی ہدایت ---------- 584
فیصلے کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو ---------- 585
غلول کا مفہوم اور یہاں اس سے مراد؟ ---------- 587

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، کیوں؟ ---------- 589
ایک سوال اور اس کا جواب ---------- 590
حق و باطل کا معرکہ من جانب اللہ ایک کسوٹی ہے ---------- 591
شہداء کو مردہ مت کہو، وہ زندہ اور رزق دیے جاتے ہیں ---------- 593
ان آیات کے مضمون کا پس منظر ---------- 596
صحابہ کا بے مثال کردار ---------- 598
حکم خدا اور حکمِ رسول میں واجب الاطاعت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ---------- 599
حُسنِ عمل اور تقویٰ اجرِ عظیم کی ضمانت ہے ---------- 599
صحابہ کی پامردی و استقلال ---------- 600
مومن صرف اللہ سے ڈرتا ہے ---------- 601
حالات کی دگرگونی کے باوجود آنحضرت ﷺ کو تسلی ---------- 602
کفار کو وارننگ ---------- 603
احد کے حادثے کی حکمتِ الٰہی ---------- 605
بخل بھی نفاق کی طرح اسلامی قافلہ کیلئے نقصان دہ ہے ---------- 607
حق و باطل کی کشمکش میں جذبۂ انفاق بھی ضروری ہے ---------- 610
منافقین اللہ کی عظمت سے بے بہرہ ہیں ---------- 611
یہود کا خود ساختہ بہانہ ---------- 612
نبی کریم ﷺ کی طرف التفات اور تسلی ---------- 614
ایک دلیل اور اس کا جواب ---------- 615
مزید آزمائشوں کی خبر ---------- 616
اہلِ کتاب کو آخری تنبیہ ---------- 617
ارباب دانش کا طرزِ عمل ---------- 621
شانِ نزول ---------- 622
اربابِ دانش کے اوصاف ---------- 622
تفکر کا ایک پہلو ---------- 625
مقدمات کی ترتیب ---------- 626

Marfat.com

ظلم کا مفہوم ---------- 627
اربابِ دانش کی دعائیں ---------- 628
ابرار کا مفہوم ---------- 629
قبولیتِ دعا ---------- 630
اعمال کی میزان میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں ---------- 630
''ثواب''، عمل کا ردِ عمل ---------- 631
ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 632
اہلِ کتاب میں صاحب ایمان لوگوں کی تحسین ---------- 633
پہلی ہدایت ---------- 634
دوسری ہدایت ---------- 635
تیسری ہدایت ---------- 636
چوتھی ہدایت ---------- 637

☆☆☆☆

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۂ مبارکہ کا نام آلِ عمران ہے۔ آلِ عمران ایک خاندان کا نام ہے' جس میں حضرت یحیٰؑ اور عیسیٰ علیہما السلام پیدا ہوئے۔ اس سورت کو یہ نام دینے کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں اس خاندان کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے بلکہ جیسے سورۃ البقرۃ کے تعارف میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ سورتوں کے نام صرف شناخت کے لیے ہیں' عنوان کے طور پر نہیں۔ کسی سورت میں کوئی اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے یا کوئی اہمیت کی حامل چیز مذکور ہوئی ہے تو قرآنِ کریم نے اسی کو اس سورت کا نام قرار دیا ہے۔ یہاں بھی آلِ عمران سورت کی شناخت کے لیے ایک نام ہے' اسے عنوان سمجھ کر تفصیلات جاننے کی کوشش نہ کی جائے۔

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے' یعنی ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اس کے 20 رکوع، 200 آیتیں 3542 الفاظ اور 15336 حروف ہیں۔

اس سورت کے اجزاءِ مضمون کو دیکھتے ہوئے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے پہلے چار رکوع اور دو آیتیں معلوم ہوتا ہے جنگِ بدر کے بعد کسی قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

آیت نمبر 33 سے چھٹے رکوع کے اختتام تک کی آیات نو ہجری میں اس وقت نازل ہوئیں جب کہ نجران کا وفد آنحضرت ﷺ سے ملنے کے لیے آیا۔ نجران یمن کے راستے میں ایک عیسائی جمہوری ریاست تھی' جس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار مردانِ جنگی کسی وقت بھی اس ریاست سے میدانِ جنگ میں لائے جاسکتے تھے۔ جو ریاست ایک لاکھ بیس ہزار مردانِ جنگی اپنے دامن میں رکھتی ہے اس کی آبادی یقیناً دس لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد پورا جزیرۂ عرب اسلام کی وسعت سے متاثر بھی ہوا اور مرعوب بھی۔ مخالفین بھی یہ سمجھنے لگے کہ اب اس قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے پہلے کہ مسلمانوں سے ان کا تصادم ہوتا انہوں نے خود ہی اپنے وفود بارگاہِ نبوت میں بھیجنے شروع کردیئے۔ ریاستِ نجران نے بھی ہوا کے رخ کو پہچانا اور اپنا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا' جن میں ان کے مذہبی رہنما بھی تھے اور ریاست کے قائدین بھی۔ (تفصیل اس کی ان شاء اللہ ہم آگے چل کر عرض کریں گے) ان کے مذہبی رہنماؤں نے آنحضرت ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اور آپ کے بارے میں اپنے تصورات کے حوالے سے گفتگو شروع کی۔ جو مناظرے سے ہوتی ہوئی مباہلے تک پہنچی۔ اس پر قرآنِ کریم کی متذکرہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک کی آیات اپنے مضامین اور مفاہیم کے اعتبار سے' معلوم ہوتا ہے اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں جس زمانے میں اس صورت کے پہلے دو رکوع نازل ہوئے ہیں۔

Marfat.com

تیرہویں رکوع سے ختم سورت تک کی آیات جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

یہ سورۃ کے چار اہم اجزاء ہیں' جواگرچہ دوسرے جزو کو چھوڑ کر زمانے کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں' لیکن سورۃ کا دوسرا جزو مضمون کی وحدت کے اعتبار سے اس سورۃ کا طبعی اور قدرتی حصہ ہے۔ وہ اگرچہ نو ہجری میں نازل ہوا لیکن مضمون کے اعتبار سے اس سورت میں شامل کر دیا گیا۔

ا۔ زمانۂ نزول کے طے ہو جانے کے بعد یہ جاننا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی ہے اس وقت اسلامی تحریک کن حالات سے دوچار تھی اور مسلمان کیسے کیسے حوادث کا سامنا کر رہے تھے۔ سورت کے پہلے اور تیسرے جزو کے نزول کا زمانہ جنگ بدر کے بعد کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے احوال پر نظر ڈالتے ہوئے چند باتیں افقِ ذہن پر خود بخود ابھرنے لگتی ہیں اور تاریخ ان کی تائید بھی کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ باتیں اس زمانے کے حالات کا منطقی نتیجہ تھیں۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن میں ابھرتی ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ طیبہ آئے ہوئے دو سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے۔ اس وقت اگرچہ اوس وخزرج کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان کے ہمسائے میں یہود جو اپنی مذہبی برتری کے زعم میں کسی کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھے' ان کے لیے ایک نوزائیدہ مذہب (جو بڑی تیزی سے تحریک کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا) کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ نہایت تیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے مذہبی راہنما اور اہل علم اپنے علم اور مذہب کے حوالے سے اس نئے مذہب کے بارے میں عجیب وغریب مخالفانہ باتیں کہنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کا عام آدمی انہی کے زیراثر جو منہ میں آتا تھا اگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا ذہین طبقہ اس نئے مذہب کو اپنے لیے ایک سیاسی خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اوس وخزرج کے لوگ آج تک صرف ان کے باجگزار ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان کے علم اور مذہبی برتری سے متاثر بھی تھے۔ اس لیے ہمیشہ ان سے مرعوب رہتے تھے۔ ان کے مذہب کو نہ مانتے ہوئے بھی ہمیشہ ان کا احترام بجالاتے تھے۔ لیکن اب ہواؤں نے الٹے رخ چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ آہستہ آہستہ ان کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ ان مختلف النوع تاثرات نے ایک حسد اور بغض کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور جنگ بدر نے ان کے اندیشوں کو حقیقت کا رخ دے دیا تھا۔ ان کے بعض شرپسند اور سرپھرے عناصر محسوس کرنے لگے تھے کہ خطرہ ان کے سر پر آ پہنچا ہے تو انہوں نے اپنی مخالفتوں اور سازشوں کو پہلے سے زیادہ تیز کر دیا تھا۔ بدر کی فتح انہیں چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ ان کے کمزور عناصر نے تو نفاق کا لبادہ اوڑھ لیا لیکن اکثریت نے برہمی اور دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں سب سے زیادہ شوریدہ سر بنوقینقاع تھے جن کی سرکوبی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اقدامات کرنا پڑے۔ اوس وخزرج کے لوگ بھی ان حالات کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے جن لوگوں کے یہود سے قریبی روابط تھے انہوں نے بھی پہلے شوریدہ سری دکھائی اور جنگ بدر کے نتیجے میں منافقت کا راستہ اختیار کر لیا۔

۲۔ ایک سال کے بعد ہی جنگ اُحد پیش آئی۔ بعض مسلمانوں کی جلد بازی اور غلط فہمی کے باعث مسلمانوں کی جیتی ہوئی بازی شکست میں تبدیل ہو گئی۔ ہر لحاظ سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہوا۔ اللہ کی نصرت وتائید اور مخلص مسلمانوں کی قربانیوں نے اگرچہ قریش کو مدینے میں داخل ہونے کی ہمت نہیں دی اور وہ ایک نامکمل فتح کو غنیمت جانتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اس طرح سے مسلمانوں کا مرکز محفوظ رہا' لیکن اس شکست نے اہلِ کتاب اور مدینے کے گرد وپیش میں پھیلے ہوئے قبائل کی دشمنی اور شوریدہ سری میں اضافہ کر دیا۔ جن کمزور عناصر نے نفاق کا لبادہ اوڑھا تھا انہوں نے اتار پھینکا' اب وہ کھلم کھلا دشمنی پر تل گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسلمانوں کے لیے خطرات میں اضافہ ہو گیا اور نبی کریم ﷺ کی زندگی پر خطر ہو گئی۔ اب آپ کے لیے پہرے اور نگرانی کے بغیر سونا آسان نہ رہا۔ آپ ﷺ چند لمحوں کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تو مسلمان گھبرا کر تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔

Marfat.com

۳۔ مدینہ کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی۔ ان پر مہاجرین کا بوجھ ہی انہیں گراں بار کر دینے کے لیے کافی تھا' لیکن غیر مسلموں کی فتنہ انداز یوں اور سازشوں نے جہاں ان کے جسم و جاں کے لیے خطرات پیدا کیے وہیں ان کے معاشی توازن کو بھی درہم برہم کر دیا۔ ان کے لیے ایک مستقل جنگ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حفاظتِ خود اختیاری کے لیے انہیں بہت سی احتیاطوں سے کام لینا پڑا۔ ان کی زرعی پیداوار بھی اس سے متاثر ہوئی اور تجارت بالکل رک کر رہ گئی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگے کہ ساری دنیا انہیں تباہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی طرف سے اسلام کے خلاف اشتباہات اور غلط فہمیاں پھیلانے کا کام پہلے سے زیادہ تیز بھی کر دیا اور عریاں اور نمایاں بھی۔ مشرکین مکہ اور ان کے حمایتی قبائل کی جانب سے ہر وقت خطرات سر پر منڈلانے لگے اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ بنو نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے اپنی مخالفانہ کوششوں کو کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ ایسے حالات میں اس سورہ مبارکہ میں چند باتوں پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

۱۔ آغاز سورہ میں اہل کتاب کی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے نہایت مثبت انداز میں انہیں اسلام کی دعوت دی ہے تاکہ ان کا سنجیدہ طبقہ غور کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

۲۔ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہلِ کتاب جو نئے نئے سوالات اٹھاتے رہتے تھے' ان میں سے ایک ایک کا جواب دیا۔ یہود کی بیشتر باتوں کا جواب تو سورۃ البقرہ میں دیا جا چکا تھا' اس سورت میں زیادہ تر خطاب نصاریٰ سے فرمایا گیا اور ان کے عقائد کی کمزوریوں کو اس طرح کھول کر نمایاں کیا گیا اور ایسی علمی انداز میں تردید فرمائی گئی کہ اس کا جواب دینا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ نجران کے وفد نے بھی اپنے مذہبی عقائد کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تھی' اس لیے اس گفتگو کا جواب دینے کے لیے قرآنِ کریم نے جو کچھ ارشاد فرمایا' اسے بھی موضوع کی مناسبت سے اس سورت میں شامل فرما دیا گیا۔

۳۔ حالات کا نشانہ چونکہ مسلمان تھے جو ایک طرف جسم و جان کے خطرات سے گزر رہے تھے اور دوسری طرف اشتباہات اور غلط فہمیوں سے ان کی مذہبی یکسوئی پر حملے کیے جا رہے تھے' ضروری تھا کہ ان کی راہنمائی' استقامت اور یکسوئی کے لیے بطورِ خاص انہیں ہدایات دی جاتیں۔ چنانچہ اس آیت میں جا بجا مسلمانوں سے خطاب کر کے انہیں حوصلہ دیا گیا ہے' ان کے عقائد کو علمی اور عملی انداز سے دلائل کی سپورٹ مہیا کی گئی ہے اور اقتصادی ابتری پر قابو پانے کے لیے انہیں اخلاقِ عالیہ کی ترغیب دی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کے مقام بلند اور فرضِ منصبی کے حوالے سے بھی انہیں آگاہ کیا گیا ہے اور ان کی عظیم ذمہ داریوں کے تقاضوں کو بھی ایک ایک کر کے نمایاں کیا گیا ہے۔ انہیں مختصر گروہ ہوتے ہوئے چونکہ ساری دنیا سے نبرد آزمائی کرنا پڑ رہی تھی' اس لیے ان کے اندر اتحاد اور اللہ پر توکل کی بطورِ خاص ترغیب دی گئی ہے اور جن جن اخلاقی کمزوریوں سے مسلمانوں کی بلند و بالا حیثیت کو نقصان پہنچ سکتا تھا ان کی نشاندہی کی گئی۔

۴۔ جنگ بدر جس طرح آیتِ محکمہ بن کر حق و باطل میں فرقان ثابت ہوئی اور جس کے اثرات نے عرب کے معتدبہ حصے کو متاثر کیا اسی طرح جنگ احد بہت سے لوگوں کے لیے آیتِ متشابہ ثابت ہوئی۔ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی موجودگی میں حق کے علمبرداروں کو شکست کیسے ہو گئی۔ قرآنِ کریم نے اس بارے میں مسلمانوں کی غلطیوں پر تنقید فرمائی اور ان پر پوری طرح یہ بات واضح کر دی کہ جس فوج میں آستین کے سانپ موجود ہوں اور جس کے مخلص نوجوان بھی حبِّ مال پر قابو نہ رکھ سکیں اور جو اللہ کے آخری رسول کی موجودگی میں بھی آپؐ کے احکام کی اطاعت میں کمزوری دکھائیں' ان کے لیے شکست سے دوچار ہو جانا نہ صرف یہ کہ مستبعد نہیں بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا یہ بات مستبعد ہوتی۔ اللہ کے یہاں ایمان و عمل اور اطاعت و محبت کا سکہ چلتا ہے' باقی کسی اور چیز کا چلن وہاں نہیں۔

رہے اس سورۃ میں بیان کردہ ضمنی مسائل اور احکام ان کا ذکر کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ ہم جیسے جیسے اس سورۃ سے استفادہ کریں گے ویسے ویسے ہمیں ان تمام مضامین سے آگاہی ہوتی جائے گی۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ٢٠٠	سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّةٌ (٣)	رُكُوْعَاتُهَا ٢٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴿٢﴾ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿٣﴾
مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو
انْتِقَامٍ ﴿٤﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا
فِی السَّمَآءِ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿٦﴾ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ
مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ
فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ
ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا
اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ
رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ
اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾

Marfat.com

رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ ۹

رکوع: ۱۔ (ا ل م ۝ اللہ ہی معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ اور قائم رکھنے والا ۝ اس نے تم پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ، تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے اور اس نے نازل کی تورات اور انجیل ۝ اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور اس نے کسوٹی اتاری (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے) بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے ۝ بے شک اللہ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں میں جس طرح چاہتا ہے۔ کوئی معبود نہیں بغیر اس کے۔ وہ غالب اور حکیم ہے ۝ وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں حالانکہ نہیں جانتا اس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی۔ تو جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے اور یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہے اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند ۝ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ تو نہایت بخشنے والا ہے ۝ اور ہمارے پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ایسے دن میں جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۝) (۱ تا ۹)

الٓمّٓ ۝ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

(ا ل م ۝ اللہ ہی معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ اور قائم رکھنے والا ۝ اس نے تم پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ، تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے اور اس نے نازل کی تورات اور انجیل ۝ اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور اس نے کسوٹی اتاری (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے) بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے) (۱ تا ۴)

الم حروف مقطعات میں سے ہے۔ سورۃ البقرہ کے آغاز میں ہم مقدور بھر اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

Marfat.com

اللہ کی الوہیت پر حیات و قیومیت کی صفات سے استدلال

اَللّٰہُ خالق کائنات کا اسم ذاتی ہے۔سورۃ الفاتحہ کے آغاز میں ہم اس کے بارے میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔اسی بحث میں ہم نے الٰہ کے معنی اور مفہوم کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سورت کے اسلوبِ بیان کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں استدلال بیشتر صفاتِ الٰہی سے ہے۔پیش نظر آیتِ کریمہ میں بھی صفاتِ الٰہی سے استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔اس کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں جو اس کائنات کی خالق و مالک اور مدبر کہی جاسکے۔اس کائنات کی تمام مخلوقات پر اسی کی حکومت ہے،اسی کا قانون ہر جگہ کارفرما ہے،جن وانس پر اس کے قانونِ تکوین کے ساتھ ساتھ تشریعی قانون بھی نافذ ہے۔اس کے اثبات کے لیے "الحی" اور "القیوم" دو صفتوں کو ذکر کیا گیا۔الحی کا معنی ہے وہ ذات جو ازل سے زندہ ہو،جس کی زندگی ذاتی ہو،جس کی زندگی اور حیات کو کبھی زوال نہ آئے اور القیوم وہ ذات ہے جو اپنی ذات کے بل بوتے پر قائم ہو اور باقی تمام کائنات اس کے دم قدم سے باقی،آباد اور زندہ ہو۔وہ تمام کائنات کو سنبھالنے والی اور اس کو ثبات و قرار عطا کرنے والی ہو۔ظاہر ہے کہ یہ دونوں صفتیں صرف اللہ کے لیے سزاوار ہیں کیونکہ کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں جو ہمیشہ سے ہو۔مخلوق کا تصور بجائے خود اس کے حادث ہونے کی دلیل ہے۔یہ لفظ خود بولتا ہے کہ جس کو بھی مخلوق کہا جائے اس پر کبھی ایسا زمانہ ضرور گزرا ہوگا جب وہ معدوم تھا۔عدم سے وجود میں آنا ہی خلق ہے۔اللہ کی صفتِ تخلیق نے ہر چیز کو عدم سے وجود بخشا ہے اور ہر مخلوق اور ہر چیز پر جب عدم طاری تھا تو وہ حیات سے محروم تھی۔اس لیے اسے الحی نہیں کہا جاسکتا اور دوسری یہ بات کہ الحی وہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہے اور اسے کبھی موت نہ آئے۔یہ تعریف بھی اللہ کے سوا کسی اور پر صادق نہیں آتی کیونکہ کوئی ایسی مخلوق اللہ نے پیدا نہیں فرمائی جو فنا نہیں ہوگی۔ہر مخلوق کی ایک عمر ہے۔وہ چاہے کتنی طویل ہو لیکن کبھی نہ کبھی اس کا اختتام ہونا ہے۔مخلوقات میں سب سے برتر مخلوق اللہ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبروں میں اللہ نے جسے سب کی سیادت عطا کی ہے وہ سید الاولین والآخرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔اگر عزت و حرمت اور فضل و کمال دوام کا باعث ہوتا تو کسی پیغمبر کو موت نہ آتی اور ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو یقیناً ہمیشہ دنیوی حیات کے ساتھ موصوف رہتے۔لیکن سب مسلمان جانتے ہیں کہ تمام پیغمبر بھی اپنے اپنے وقت میں دنیا سے تشریف لے گئے اور آنحضرت ﷺ نے بھی دنیا سے سفر فرمایا۔اگر کسی مخلوق کو ہمیشگی اور دوام ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی موت کا سفر نہ کرنا پڑتا۔امیر مینائی نے ٹھیک کہا۔

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

اللہ کی یہ دونوں صفات اللہ کی حیاتِ ذاتی اور دوامِ مطلق پر دلالت کرتی ہیں اور اس سے بہتر اللہ کی ذات کا تعارف ممکن نہیں۔لیکن انہی دونوں صفات کے ذریعے بعض حقائق کی طرف بھی اشارے فرمائے گئے جو ان الفاظ پر غور کرنے سے خود بخود افقِ ذہن پر ابھرنے لگتے ہیں۔غور فرمائیے! اللہ کی ذات "الحی" ہے۔وہ زندہ ہونے کی وجہ سے کائنات کی ایک ایک حرکت اور ہمارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہا ہے ہمارے تصورات تک اس کے علم میں ہیں۔ہماری کوئی چیز خفیہ ہو یا اعلانیہ اس سے مخفی نہیں۔جن وانس کو اللہ نے عقل اور شعور سے نوازا ہے۔جب اللہ کی صفتِ حیات کا تصور کرتا ہے تو یقیناً اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ جب ہمارے تمام اعمال اللہ کی نگاہ میں ہیں تو کیا یہ اس فطری تقاضا نہیں کہ ہم جاننے کی کوشش کریں کہ اللہ کس طرح کے اعمال پر خوش ہوتا ہے اور کن اعمال سے ناخوش ہوتا ہے کیونکہ جو مخلوقات

Marfat.com

بندھے طریقے سے اپنی جبلت کے جبر کے تحت زندگی کے معمولات انجام دینے کی پابند ہیں ان کے لیے تو سوچنے کا کوئی موقع نہیں' لیکن جن مخلوقات کو شعور اور عقل سے نوازا گیا ہے ان کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہم جس کی نگاہوں میں ہیں اور جو ہمارا خالق و مالک بھی ہے۔ کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم اس کی نگاہوں میں رہ کر ایسے کام کریں جو اس کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں۔ ہماری سوچ کا اولین تقاضا ہے کہ ہمیں اگر اپنے آقا کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ معلوم ہو جائے تو ہم یقیناً اس طریقے سے عمل کر کے اپنے اللہ کی رضا کو حاصل کریں اور سعادت اور خوش بختی کا مقام پانے کی تگ و دو کریں۔

اسی طرح اللہ کی صفتِ ''قیومیت'' کو دیکھتے ہوئے خود بخود دل میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ وہ ذات جس نے ہمیں زندگی بخشی' زندگی کے امکانات عطا کیے' زندگی کی بقا کا سروسامان کیا' ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زمین کے اندر قوتِ روئیدگی رکھی اور زمین کے اوپر نعمتوں کا دسترخوان بچھایا اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا کہ ہماری ضرورت کے مطابق سامان ضرورت پیدا کر دیا بلکہ ہماری جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے حسن و جمال کی ایک پوری دنیا ہمارے گرد و پیش میں پھیلا دی۔ ہماری غذا کے لیے صرف گندم پیدا نہیں فرمائی بلکہ اس کو نقرئی لباس عطا کر کے نگاہوں کی لذت کا سامان پیدا کر دیا۔ زمین کو سبزے کا مخملیں لباس پہنایا پھر زمین کی سطح پر پھولوں کے ایسے خوش رنگ دستے پھیلائے جس نے زمین کو جنت نظیر بنا دیا۔ ہمیں لکڑی کی ضرورت تھی لیکن اس نے درختوں کو چھتریاں عطا کیں' ہمیں پانی درکار تھا' اس نے دریا بہائے' چشمے اچھالے' آبشاریں گرائیں اور پہاڑوں پر برف کے تودے پگھلا کر ایک ایسا حسن و جمال کا منظر پیدا فرمایا کہ جب برف کے تودے پگھلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے چاندی پگھلتی ہے۔ جب چشمے اچھلتے ہیں معلوم ہوتا ہے چاندی کے فوارے اچھلتے ہیں۔ یہ تمام ضرورتیں ہمارے جسم و جان کے رشتے کو باقی رکھنے کے لیے ہیں حالانکہ ہمارے جسم و جان کا رشتہ حیوانیت سے عبارت ہے اور انسان کی اصل قدر و قیمت حیوانیت سے نہیں انسانیت سے ہے۔ جس خالق کائنات نے حیوانی ضرورتوں کو اتنی خوبصورتی اور فراوانی سے پیدا فرمایا یہ کیسے ممکن تھا کہ ہماری انسانی ضرورتوں سے صرفِ نظر فرماتا۔ ہمارے احساس کو کوئی غذا مہیا نہ کی جاتی، ہمارے دلوں کو یقین و ایمان سے سیراب نہ کیا جاتا، ہماری نگاہوں کو لذتِ شوق عطا نہ کی جاتی، ہمارے دل و دماغ کی بالیدگی کے لیے اخلاقِ عالیہ کی تعلیم نہ دی جاتی، آدابِ زندگی نہ سکھائے جاتے اور انسانی معاشرت اور انسانی رشتوں کی شیرازہ بندی کے لیے کوئی نظامِ زندگی نہ دیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ اس کی صفتِ قیومیت کے خلاف ہوتا کیونکہ یہی تو وہ دولت ہے جس سے انسانی معاشرہ' انسانی سوسائٹی اور انسانی ریاستوں کے در و بست کو مضبوط کرنے اور حقوق و فرائض کے تعلقات کو استوار کرنے اور انسانوں کو انسانوں سے جوڑنے اور افادہ و استفادہ کے عمل کو مکمل کرنے کی ایک صورت پیدا ہوتی ہے۔

حیات و قیومت کا اقتضاء

اس لحاظ سے یہ دونوں صفات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ وہ خدائے زندہ ہماری معنوی اور روحانی زندگی کے لیے بھی ہمیں راہنمائی سے نوازے اور وہ قیوم ذات ہمیں سنبھالنے اور زندگی کے سفر کو رواں دواں رکھنے کے لیے نظامِ زندگی عطا کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا' اسی کی دلیل کے طور پر فرمایا نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ (اس نے آپ پر کتاب اتاری حق کے ساتھ) حق متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے' لیکن علامہ راغب اصفہانی نے اس کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے وہ زیادہ جامع ہے۔ وہ لکھتے ہیں

Marfat.com

"الحق للفعل والقول: الواقع بحسب ما يجب وقدر ما يجب وفي الوقت الذي يجب" (مفردات)

(کوئی قول اور فعل اس وقت حق کہلاتا ہے جب وہ اس طرح پایا جائے جیسے چاہیے' اس انداز سے پایا جایا جتنا مناسب اور موزوں ہو اور اس وقت پایا جائے جب کہ اس کی ضرورت ہو)

قرآن ایسے وقت آیا جب کہ پوری دنیا میں حق کی روشنی ماند پڑ چکی تھی اور اندھیروں کی حکمرانی تھی اور اس شان کے ساتھ آیا کہ عقلِ سلیم کو مطمئن کرنے کا مکمل سامان اس میں موجود ہے' دلائل و براہین کی کوئی قسم ایسی نہیں جس سے اس کتاب میں کام نہیں لیا گیا۔ لفظی اور معنوی اعجاز کے ساتھ ساتھ ایسا ضابطۂ حیات لے کے آیا جسے تجربے نے انسانی ضرورتوں کے لیے کافی وشافی پایا اور انسانی زندگی کی راہنمائی کے لیے ایسا اسلوب لے کے آیا جو وقت کے تغیرات کے ساتھ نہ صرف کہ از کار رفتہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اشاروں اور دلالتوں سے ہر دور کی ضرورتیں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پروردگار نے انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اس کی اصلاح کے عمل کو بروئے کار لانے کے لیے پہلی کتاب نازل کی ہے اور اس سے پہلے کے انسان کو اس رحمت سے محروم رکھا ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ یہ کتاب تو آخری کتاب ہے' جبکہ انسانیت اپنے شعور اور اجتماعی مصالح کے لحاظ سے بلوغ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے ہر دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق پروردگار مختلف کتابیں بھیج چکا تھا' جن میں سے بطورِ خاص تورات اور انجیل کو ذکر فرمایا۔ یہ دونوں کتابیں قرآنِ کریم سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھیں اور ان دونوں کے زمانہ نزول کے دوران اور بھی کئی صحیفے اور کتابیں مختلف رسولوں پہ نازل ہوئیں' لیکن ان کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کیونکہ مقصود تمام کتابوں کا استقصا نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ اللہ نے ہر دور میں اپنے حیّ اور قیوم ہونے کی وجہ سے انسانوں کی رہنمائی اور سنبھالنے کے فرض کو انجام دیا۔ ہر دور میں کوئی نہ کوئی ہدایت نامہ اترتا رہا۔ جب زمانہ نئی ضرورتوں کو جنم دیتا یا اہلِ زمانہ پہلے سے منزل من اللہ کتاب کو طاقِ نسیان میں سجا دیتے یا ترمیم اور تحریف کے ذریعے اس کی تعلیمات کو بگاڑ دیتے تو نئی کتاب نازل ہو جاتی۔ اب جبکہ کئی صدیوں سے انسان رفتہ رفتہ اپنے بگاڑ کی انتہا کو پہنچ رہا تھا اور پہلے سے منزل کتابیں بگاڑی اور بدلی جا چکی تھیں تو قرآنِ کریم قیامت تک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہدایت کی روشنی بن کر آیا اور ساتھ ساتھ فرقان بن کر بھی۔ یعنی توریت و انجیل کے حاملین نے اللہ کی تعلیمات میں جہاں جہاں حق و باطل کو آپس میں گڈمڈ کر دیا تھا یا حق کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا تھا کہ اجتماعی زندگی میں اس کا نشان تک باقی نہ رہا تھا تو قرآن "فرقان" بن کے نازل ہوا۔ اس نے ایک ایک گتھی کو سلجھایا' باطل کے پردوں کو ہٹا کر حق کو اپنی اصلی شکل میں ظاہر فرمایا۔ فرقان "کسوٹی" اور "حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز" کو کہتے ہیں۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ایک کسوٹی اور معیار بنا دیا ہے کہ اب لوگ جب بھی ہدایت کا راستہ پانا چاہیں تو قرآن کی طرف رجوع کریں اور جہاں بھی حق و باطل میں آمیزش یا الجھاؤ نظر آئے تو قرآنِ پاک کی راہنمائی میں اس الجھاؤ کو ختم کرنے کا راستہ نکالیں۔

قرآن کے مصدق ہونے کا مفہوم

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ قرآنِ پاک جس طرح پہلی کتابوں کے لیے فرقان بن کے آیا اسی طرح مصدّق بن کے بھی آیا۔ ان کی ہر صحیح بات کی تصدیق کی اور جو کچھ لوگوں نے غلط باتیں اس میں شامل کر دی تھیں اس کی تردید کی۔ مصدق ہونے کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ توریت و انجیل کی ایک ایک بات کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔ اگر یہ معنی مراد لیا جائے تو یہ قرآنِ کریم کی اپنی وضاحتوں کے خلاف

Marfat.com

کیونکہ اس نے جا بجا اہلِ کتاب کی خیانتیں پکڑی ہیں اور متعدد مواقع پر نشان دہی کی ہے کہ تورات میں اصل حکم یہ تھا تم نے اس کے بدلے میں یہ کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ وہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی ہر صحیح بات کا مصدق ہے غلط بات کا نہیں۔

بعض اہلِ علم نے مصدق کا ایک اور مفہوم مراد لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں نے اپنی پیش گوئیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ پاک کی متعدد صفات بیان کی ہیں کہ وہ آخری نبی جب آئے گا تو وہ ایسی اور ایسی صفات کا حامل ہوگا۔ آپؐ کے نام کا ذکر فرمایا گیا' آپؐ کے وطن کا' آپؐ کے دار الہجرت' آپؐ کو پیش آنے والے مصائب کا' پھر آپؐ کی کامیابیوں کا' آپؐ کے کامیاب انقلاب کا' اس ضمن میں آپؐ کے صحابہ کا بھی اور فتح مکہ کا بھی۔ اسی طرح یہ بھی بتایا گیا کہ آپؐ پر کوئی کتاب اترے گی' وہ کس شان و شوکت کے ساتھ نازل ہوگی' اس کی تعلیمات کی جامعیت کیسی ہوگی' اس میں وہ باتیں بھی کہی جائیں گی جو عیسیٰ علیہ السلام نہ کہہ سکے' وہ کتاب پہلی کتابوں کی تعلیمات کی جامع اور اللہ کے دین کو کامل کرنے والی ہوگی۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی کتابوں کے بیان کردہ صفات کا حامل بن کر تشریف لائے اور قرآنِ کریم انہی صفات کے ساتھ مرصع ہو کے نازل ہوا جو پہلی کتابوں نے بیان کی تھیں تو اس طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم نے پہلی کتابوں کی تصدیق کی اور دعوت دی کہ ہمیں غور سے دیکھو' ہمیں پرکھو' کیا ہم بالکل وہی نہیں ہیں جن کو اہلِ کتاب کی کتابوں نے صدیوں تک پیش گوئی کی صورت میں پیش کیا۔ اگر ہم واقعی وہی ہیں اور اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تو پھر یوں سمجھیے کہ ہم پہلی کتابوں کے مصدق یا مصداق بن کر آئے ہیں' اس سے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کے اللہ کی جانب سے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے وہیں پہلی کتابوں کی بھی منزل من اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے تو اہلِ کتاب کو سب سے آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم پر ایمان لانا اور قرآنِ کریم کو سر اور آنکھوں پر رکھنا چاہیے تھا کیونکہ ان دونوں کی سچائی نے ان کی کتابوں کی سچائی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی لیکن وہ ایسے محروم اور بدقسمت لوگ ہیں کہ بجائے اس ہیرے کو اپنی کلغی میں سجانے کے اس کے انکار اور دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔

پہلی کتابوں کے قرآنِ کریم کے مصدق ہونے کی وضاحت کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جن کتابوں کو ہم توریت اور انجیل کے نام سے جانتے ہیں ان کی اصل حیثیت کیا ہے؟ اور قرآنِ کریم جب ان کی تصدیق کرتا ہے تو وہ اصل میں کس چیز کی تصدیق کرتا ہے؟ اس سلسلے میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تورات اور انجیل سے کیا مراد ہے؟

عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیل اربعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

Marfat.com

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی اور بنی اسرائیل اس کو "تورات" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ تورات رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا، جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو ۲۔ سلاطین، باب ۲۲۔ آیت ۸ تا ۱۳)۔ یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے ہاں طاقِ نسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عزرا کاہن (عزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی، جو بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی خروج، احبار، گنتی اور استثناء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں۔ پس دراصل اب تورات ان منتشر اجزاء کا نام ہے جو سیرتِ موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران میں جہاں کہیں سیرت موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰ سے فرمایا، یا موسیٰ نے کہا کہ خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھا دی ہے وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر۔ تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزاء میں کہاں کہاں تفسیری و تشریحی اضافے ملحق کر دیے گئے ہیں۔

قرآن انہی منتشر اجزاء کو "تورات" کہتا ہے اور انہی کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزاء کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کہ بعض بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے، اصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرِ مو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

اسی طرح دراصل انجیل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں؟ اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انہیں نوٹ کر لیا ہو اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کر دیے گئے جو ان رسالوں کے مصنفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں بلکہ انجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے وہ ارشادات ہیں، جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو ممیز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیح نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزاء ہیں، قرآن انہی اجزاء کے مجموعے کو "انجیل" کہتا ہے اور انہی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزاء کو مرتب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصبانہ غور و تامل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔ (ماخوذ از: تفہیم القرآن)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

(بے شک جن لوگوں نے اللہ کے احکام ماننے سے انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے)

متذکرہ بالا وضاحتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حیّ اور قیوم ہونے کی حیثیت سے انسانوں کی معنوی، عملی اور اجتماعی زندگی کی بقا اور سدھار کے لیے کتابیں نازل کیں، رسول بھیجے اور آخر میں قرآنِ کریم کو حق کے ساتھ نازل کیا اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے اسے فرقان بنایا۔ جس طرح کوئی شخص غذا کے لیے ان گنت نعمتوں کو نظر کر کے مٹی پھانکنا شروع کر دے یا ایسی چیز کھانے کی کوشش کرے جسے اللہ نے غذا کے طور پر پیدا نہیں فرمایا بلکہ اس کا مصرف کچھ اور ہے، اسے کھانے سے ہلاکت تو ہو سکتی ہے، جسم کی افزائش نہیں ہو سکتی اور اس آدمی کو اگر سمجھایا جائے کہ تم اپنے ساتھ دشمنی کیوں کرتے ہو اور تم اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکری کیوں کرتے ہو جو اس نے تمہیں غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عطا فرمائی ہیں، لیکن یہ شخص کسی بات کو مان کر نہ دے اور اپنی روش پر قائم رہے تو ایسے شخص کو ہلاکت سے نہیں بچایا جا سکتا۔ یہی حال اس شخص کا ہے جسے اللہ نے ہر طرح کی راہنمائی سے نوازا۔ اس کی روحانی، معنوی اور اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتابیں اتاریں اور رسول بھیجے اور آخر میں قرآنِ کریم آیا۔ اگر اب بھی وہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے انہیں ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً اسی کا سزاوار ہے کہ اسے سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے کیونکہ جس طرح اللہ کی ذات رحیم و کریم ہے، وہ راہِ راست پہ چلنے والوں سے رحمت کا سلوک کرتی ہے، اسی طرح وہ منتقم اور عادل بھی ہے۔ اس کی صفتِ عدالت کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ نیکیوں کی جزا ملے اسی طرح یہ بھی تقاضا ہے کہ برائیوں پر سزا ہو اور ہٹ دھرم لوگوں کو عذاب سے دوچار کیا جائے اور مزید یہ بات بھی کہ جب وہ عذاب دینے پہ آتا ہے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا کیونکہ وہ عَزِیْزٌ یعنی "غالب اور طاقتور" ہے اور ذُو انْتِقَامٍ یعنی "انتقام لینے والا" ہے۔

Marfat.com

ممکن ہے کسی کو خیال آئے کہ اللہ کو کیا خبر کہ انسانی جنگل میں ایک ایک انسان کیا کرتا ہے؟ ان کی تنہائیوں میں کیا کیا مشاغل جاری رہتے ہیں؟ اس بے خبری کے باعث اللہ تعالیٰ ہر مجرم کو کس طرح سزا دے سکتا ہے؟ اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(بے شک اللہ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں، وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں میں جس طرح چاہتا ہے، کوئی معبود نہیں بغیر اس کے، وہ غالب اور حکیم ہے)　(۵ تا ۶)

زمین و آسمان میں جو کچھ ہوتا ہے اور انسان جس طرح کے مشاغل میں مصروف رہتا ہے اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ قرآنِ کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ جنگل میں درخت سے کوئی خشک پتہ گرتا ہے یا کوئی پھل ٹپکتا ہے تو وہ اللہ کے علم میں ہے۔ کائنات میں ہونے والی کوئی حرکت اس کی سماعت سے دور نہیں اور کوئی وقوع پذیر ہونے والا واقعہ اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں۔ سمندر کی نچلی تہہ میں کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو وہ اس کی آواز کو سنتا ہے اور اس کی حرکتوں کو دیکھتا ہے اور مزید یہ بات کہ وہی تو ہے جو ماں کے رحم میں بچے کے نین نقش بناتا ہے اس کی صورت آرائی کرتا ہے، گوشت کے لوتھڑے میں ہونے والے اس عمل سے کوئی واقف نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ایک ایک تبدیلی سے آگاہ ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا؟) کہ خالق اگر اپنی مخلوقات کے حالات سے بے خبر ہے تو پھر باخبر کون ہوگا؟ اس لیے اس غلط فہمی کا کوئی موقع نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کیا خبر کہ کوئی شخص کن حالات میں ہے۔ مزید فرمایا:

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ غالب اور حکمت والا ہے) یہ بھی ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ جو ذات ہر طرح کے علم سے بہرہ ور ہے اور جس کا علم ہر شے پر محیط ہے اور جس کی صفت عدل کرنا ہے، وہ اگر اللہ کے دین کا انکار کرنے والوں کو نہ پکڑے اور زمین کو فساد سے بھر دینے والوں کا ازالہ نہ کرے تو اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ عدل کرنا چاہتا ہے لیکن انسانوں کو سزا دینے کی اس میں قدرت نہیں۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اللہ کی صفات سے بے خبر ہو اور جس کے سامنے ان قوموں کی تاریخ نہ ہو جو اللہ کے غضب کا شکار ہوئیں اور دنیا سے مٹ گئیں اور دوسری وجہ غلط کار لوگوں کو نہ پکڑنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ اسے قدرت تو بہر صورت حاصل ہے، لیکن وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ برے لوگوں کو پکڑا جائے اور نیک لوگوں کو نیکی پر جزاء دی جائے۔ اگر نعوذ باللہ من ذالک یہ سمجھ لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اہلِ زمین کی تخلیق محض ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، جس میں کوئی حکمت نہیں۔ اللہ نے تفریحِ طبع کے طور پر اس کائنات کو پیدا کر دیا اور انسان کو زمین کی خلافت دے دی۔ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زمین میں خیر ہو یا شر، ظلم ہو یا انصاف؟ حالانکہ اللہ کی صفتِ عدل کا تقاضا اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسی لیے اس نے قرآنِ پاک میں متعدد جگہ پر ارشاد فرمایا کہ ہم نے زمین و آسمان کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا، اس کی پیدائش میں

Marfat.com

ایک حکمت ہے اس کے پیدا کرنے کا ایک مقصد ہے ان دونوں باتوں کے ازالے کے لیے فرمایا کہ اللہ عزیز ہے یہ نہ سمجھو کہ اسے برے لوگوں کے پکڑنے پر قدرت حاصل نہیں۔ لیکن وہ ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے۔ اس کے ہر کام میں عدل و حکمت کارفرما ہے۔ جب تک اس کی حکمت کا تقاضا نہیں ہوتا اس کی قدرت حرکت میں نہیں آتی۔ جو لوگ زمین میں فساد مچا رہے ہیں انہیں پکڑنے میں جلدی نہ کرنا درحقیقت انہیں سنبھلنے کی مہلت دینا ہے اور جب یہ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚؔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

(وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ حالانکہ نہیں جانتا اس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی۔ تو جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے اور یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہے۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند) (۷)

اللہ نے قرآنِ کریم کو حق کے ساتھ فرقان بنا کے اتارا ہے۔ وہ ایک کلمۂ فیصل اور حق و باطل کے لیے کسوٹی ہے۔ اس کی اس حیثیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ اسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر قرآنِ کریم کا ذکر کرنے سے پہلے "انا انزلناہ" کا ذکر فرمایا ہے یعنی قرآن وہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اس کے ذاتی خصائص اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور اس میں بیان کردہ ضابطۂ حیات کی وسعت اور جامعیت اپنی جگہ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اسے ہم نے نازل کیا ہے اس لیے جب بھی اس کتاب کو پڑھو یا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرو تو یہ سوچ کے کرو کہ یہ محض ایک کتاب نہیں بلکہ خالق کائنات کا کلام اور اس کے فرامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب نوعِ انسانی کے لیے اگر رحمت ثابت ہوئی ہے تو یہ اللہ کی رحمت ہے جس کی قدر کرنا ہم پر واجب ہے اور اگر کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو اسے یہ سمجھ کر انکار کرنا چاہیے کہ میں ایک کتاب کا انکار نہیں کر رہا بلکہ اس کے نازل کرنے والے کو ماننے سے انکار کر رہا ہوں۔

فائر کا لفظ اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن جب یہ ایک جرنیل کے منہ سے نکلتا ہے تو نہ جانے کتنی زندگیاں خاک میں ملتی ہیں اور کتنے مورچے تباہ ہوتے اور کتنی فصیلیں اڑتی اور کتنے شہر مسمار ہوتے ہیں۔ لفظ و معنی کی قوت جس طرح اس کی حقیقت میں ہے اس سے بڑھ کر اس لفظ کے بولنے والے میں ہے۔ قرآنِ کریم نے جہاں یہ فرمایا کہ اگر اس قرآنِ کریم کو پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو وہ اللہ کی خشیت سے ریزہ ریزہ ہو جاتا وہیں اس کے بعد اپنے سترہ صفاتی ناموں کا ذکر فرمایا اس میں صرف یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ پہاڑ پر قرآن کا اترنا پہاڑ کے لیے اس لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ پہاڑ کی فطرت میں اللہ کا استحضار گندھا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کا اترنا پروردگار

Marfat.com

کے جلال و جمال کا اترنا ہے۔ وہ چونکہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا اس لیے وہ دب جاتا اور بیٹھ جاتا۔ انسان کا قرآنِ پاک سے کما حقہ اثر قبول نہ کرنا صرف اس سبب سے ہے کہ وہ اللہ کی ذات وصفات کے استحضار سے محروم ہے۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ اس قرآنِ کریم کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اس لیے اگر ایمان لاؤ گے تو یہ اس کی سب سے بڑی نعمت اور رحمت ہے اور اگر انکار کرتے ہو تو سوچ لو کہ کس کی کتاب اور کس کے کلام سے انکار کر رہے ہو؟ جو عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک مختصر تعارف کرایا اور طریقہ سکھایا اور ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ قرآنِ کریم کے فہم اور استفادہ سے جو لوگ محروم رہتے ہیں' بلکہ بجائے ایمان میں اضافہ کرنے کے گمراہی کے راستے پر چل پڑتے ہیں' وہ کون لوگ ہیں اور ان کا طریقہ کیا ہے؟ اس لیے فرمایا کہ قرآنِ کریم میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک آیاتِ محکمات ہیں اور دوسرا آیاتِ متشابہات ہیں۔

آیات محکمات کا مفہوم

آیاتِ محکمات سے وہ آیات مراد ہیں جن کے الفاظ اور معنی متعین کرنے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔ ان کی زبان صاف اور مفہوم واضح ہے۔ ان کا تعلق اگر آفاق وانفس سے ہے تو وہ جانی پہچانی چیزیں ہیں اور علم کی وسعت سے ان کے سمجھنے میں مزید آسانی ہوتی جاتی ہے اور اگر ان کا تعلق خیر وشر کے حوالے سے مذہب سے ہے تو ان کا شمار مذہب کے مسلمات میں ہے اور اگر ان کا تعلق معروف ومنکر سے ہے تو وہ قطعیات ویقینیات میں شامل ہیں۔ جس شخص کی عقل سلیم ہے اور وہ لادینیت کی عینک سے قرآنِ کریم پڑھنے کی کوشش نہیں کرتا' یا ملحدانہ فلسفے نے اس کے دل ودماغ کو متاثر نہیں کیا تو اس کے لیے ان آیات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں آتی۔ یہی محکمات قرآنِ کریم کی اصل بنیاد ہیں۔ قرآنِ کریم کے احکام ایسی ہی صاف اور سادہ زبان میں دیے گئے ہیں۔ انہی آیات میں قرآنِ پاک کی دعوت دی گئی ہے' عقائد' عبادات' اخلاق کی تعلیمات بھی انہی آیات میں ہمیں ملتی ہیں۔

ام الکتاب کا مفہوم

ان آیات کی حیثیت ''ام الکتاب'' کی ہے۔ ''ام'' کسی چیز کی اصل' جڑ اور بنیاد کو کہتے ہیں۔ ایسی چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو بہت ساری چیزوں کا مرجع ہو۔ وہیں سے آغاز ہوتا ہو اور وہیں اختتام ہوتا ہو۔ دماغ کو اسی لیے ام الرأس کہتے ہیں کہ یہیں سے پورے جسم کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور یہیں ہر چیز پلٹ کر آتی ہے اور یا ''ام'' ایک ایسی اوپر کی چیز کو کہتے ہیں جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ مکہ معظمہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اردگرد کی تمام بستیوں کا مرکز' اعصاب اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ آیات محکمات ام الکتاب ہیں۔ یعنی ساری کتاب کا مرجع ومرکز یہی آیات ہیں۔ انہی سے سارے مسائل پھوٹتے ہیں۔ کسی آیت کے سمجھنے میں اختلاف ہو تو انہی آیات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پورا دین انہی آیات سے نکلتا ہے اور انہی آیات کی طرف لوٹتا ہے۔ ہدایت کا سرچشمہ یہی آیات ہیں۔ متشابہات کو سمجھنے کے لیے انہی کو معیار بنایا جاتا ہے۔ جو عقیدہ یا جو حقیقت ان آیات سے ثابت ہوتی ہیں متشابہات کی مراد بھی اس کے مطابق متعین کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

آیات متشابہات سے مراد کیا ہے؟

دوسری قسم کی آیات ''متشابہات'' ہیں۔ یعنی ایسی آیات جن کے مراد کے تعین میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ اشتباہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ آیات متشابہات کے الفاظ معنی کے اعتبار سے واضح نہیں ہوتے، یہ بات صحیح نہیں کیونکہ قرآنِ کریم عربی مبین میں نازل ہوا۔ ایک ایسی ٹکسالی زبان میں، جسے قریش بولتے تھے، جسے جزیرۂ عرب کی فصیح ترین زبان سمجھا جاتا تھا۔ ایسی زبان میں اترنے والی کتاب کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہوسکتا جس کا کوئی معنی نہ ہو اور جس کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آئے۔ یہ تو ممکن ہے بعض الفاظ کے سمجھنے میں دقت ہو کیونکہ قرآنِ کریم نے بعض ایسے الفاظ کو بھی زندگی بخشی ہے جن کا استعمال تمام قبیلوں میں عام نہیں تھا۔ لیکن قرآنِ کریم کے آجانے کے بعد تمام قبیلوں میں اس کا استعمال عام ہوگیا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ متشابہات وہ آیات ہیں جن کی مراد متعین کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے صرف ان معاملات پر گفتگو نہیں کیا جن کا تعلق محسوسات، معقولات اور طبعیات سے ہے۔ جنہیں انسان کے حواس جانتے اور پہچانتے ہیں اور جن کا عقل ادراک کرتی ہے بلکہ قرآنِ کریم کے موضوعات میں وہ معاملات بھی شامل ہیں جن کا تعلق مابعد الطبعیات سے ہے۔ قرآن جس طرح دنیا کی بات کرتا ہے اسی طرح وہ آخرت کی بات بھی کرتا ہے۔ اسلام کی بنیاد در حقیقت چند عقائد پر ہے جن میں اللہ کی ذات اور اس کی صفات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جہاں بھی صفاتِ خداوندی کا ذکر آئے گا وہاں بالعموم عقل پیچھے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح جزاء و سزا کا تصور یہ انسانی عمل کا محرک اور اس کا نتیجہ ہے۔ اس کے بغیر دین کی دعوت بے روح دعوت ہے اور انسانی زندگی ایک ایسا سفر بن جاتی ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ قرآنِ کریم جب عالمِ آخرت کی باتیں کرتا ہے اور جزا و سزا کی تفصیلات ذکر کرتا ہے، جنت کی نعمتوں اور جہنم کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان تمام بیان کردہ حقائق سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اپنے اللہ پر ایمان مضبوط ہو جائے، اس کا اپنے خالق کے ساتھ حقیقی تعلق قائم ہو جائے اور وہ اس بات کو سمجھنے لگے کہ میرے اللہ نے مجھے ایک خاص مقصد دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اس مقصد کی تعمیل میں میرے لیے جنت کی نعمتیں ہیں اور اس سے سرتابی یا پس و پیش میں میرے لیے جہنم کی ہولناکیوں کے اندیشے ہیں۔ قرآنِ کریم کے بیان کردہ حقائق سے یہ دونوں مقصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ انسان اللہ کی صفات کو فی الجملہ سمجھ کر اللہ سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل میں زندگی گزارنا اپنے لیے سعادت سمجھتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بیان کردہ حقائق اس کے اندر جزا و سزا کی فکرمندی پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک ایک عمل کے بارے میں یہ سوچ کر گراں بار ہو جاتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں اگر میں اپنے ہر عمل کے بارے میں اطمینان بخش جواب نہ دے سکا تو پھر میرے ساتھ کیا ہوگا، لیکن جہاں تک بیان کردہ حقائق کی صورت اور حقیقت کا تعلق ہے کوئی شخص ان کے حقیقی مقاصد کو نظر انداز کر کے ان کی صورت کا تصور باندھنے اور ان کی حقیقت جاننے کے درپے ہو جائے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کا کوئی نتیجہ بجز اس کے پیدا نہیں ہوسکتا کہ ایسی کوشش کرنے والا خود بھی فتنے میں مبتلا ہو اور دوسروں کو بھی مبتلا کرے۔ لیکن جو لوگ اپنی طبیعت میں کجی رکھتے ہیں وہ ان متشابہات کے اصل مقصد سے آگے بڑھ کر اصل حقائق کو جاننے اور ان کی صورت متعین کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ وہ جنت کی ایک ایک نعمت پر تبصرہ کرتے ہیں، خود جنت کا وجود ان کے لیے محل نظر ہوتا ہے۔ تمام مخلوقات کا فنا ہو جانا، پھر از سر نو زندہ ہونا، ایک محشر کا برپا ہونا، اعمال کے تول کے لیے ترازو کا رکھا جانا، اللہ کا انصاف کے لیے عدالت میں منصف بن کے بیٹھنا اور اپنے ہر عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا، جسم کے ایک ایک رونگٹے کا گواہی دینا اور اعمال کے تلنے کے نتیجے میں جزا و سزا کا ترتب ہونا اور پھر جنت کی ابدی نعمتیں اور جہنم کی ابدی سزائیں، جہنم کی بے پناہ آگ کے

Marfat.com

باوجود اس میں "زقوم" کے درخت کا پیدا ہونا' اس میں سے ایک مشروب کا نکلنا اور جہنمیوں کو بطور غذا کے اس کا مہیا کیا جانا' ان میں ایک ایک چیز مقصد کے اعتبار سے جزا و سزا کو ابھارتی ہے اور اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن اس نادیدہ عالم کی ایک ایک چیز کی صورت سمجھنا اور حقیقت جاننا ایک ناممکن بات ہے۔ جن کو اللہ نے علم میں پختگی عطا فرمائی ہے اور وہ یقین کی قوت سے بہرہ ور ہیں ان تمام حقائق کا اظہار ان کے ایمان میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے حقیقی مقصد کو نظر انداز کر کے محض محسوسات کے جانور بنے رہتے ہیں اور وہ ہر چیز کی اصل حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ان کا ادراک اس جہان میں ممکن نہیں تو وہ خود بھی فتنے کی نذر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی فتنے کی نذر کر دیتے ہیں۔ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (علم میں رسوخ رکھنے والے) چونکہ علم کی حدود کو جانتے ہیں اور وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمارے علم کی رسائی عالم محسوسات اور عالم طبعیات تک ہیں' لیکن ہماری زندگی اور ہمارے ایمان کا رشتہ عالم مغیبات اور عالمِ آخرت سے بندھا ہوا ہے۔ جو بات عالمِ محسوسات سے تعلق رکھتی ہے اس کا وہ ادراک کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جن حقائق کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس سے تعلق ہمارے ایمان کا تو ہے لیکن ہمارے علم کا نہیں' وہ وہاں ایمانی قوت کو حرکت دے کر پکار اٹھتے ہیں کہ ہماری عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ہم ہر چیز کا ادراک کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔ لیکن اس سے جو مقصد وابستہ کیا گیا ہے' اسے ہم سمجھتے ہیں۔ رہی ان کی حقیقت اور ماہیت تو اس کے درپے ہونے کی بجائے ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے رب کی جانب سے ہے۔ اس نے کچھ چیزوں کے ادراک کی قوت ہمیں یہاں بخشی ہے اور باقی وہاں بخشے گا جب عالمِ آخرت میں ہم داخل ہوں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو متشابہات کو سمجھتے ہوئے سامنے رہنی چاہئے کہ ہماری ہدایت سراسر آیاتِ محکمات میں ہے۔ وہی ہمارا معیار ہیں اور وہی ہمارے فکر و عمل کا مرجع۔ عقائد اور عمل کی تفصیل ہم ان آیات سے لیں گے اور متشابہات کو بھی انہی کے دیئے ہوئے تصورات پر محمول کریں گے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی جلوہ نمائی کے لیے بعض مثالیں بھی ارشاد فرمائی ہیں' جن میں سے ہم صرف ایک مثال عرض کرتے ہیں:

ایک مثال

سورۂ مدثر میں قرآنِ کریم نے دوزخ کے عذاب کی تصویر پیش کرتے ہوئے فرمایا:

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ٥ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سَقَرُ ٥ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ٥
لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ٥ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ٥

(میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا' اور تجھے کیا خبر کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی' جسموں کو جھلس دینے والی۔ اس پر انیس داروغے مقرر ہیں)　(المدثر: ۲۶ تا ۳۰)

ان آیات کو دیکھئے کافروں کے لیے سزا کا ذکر ہے اور جس آدمی کا یقین جزاء و سزا اور قانونِ مجازات پر ہے' اس کے لیے ان آیات کو سمجھنے کے لیے کوئی دشواری نہیں۔ لیکن جس شخص کی طبیعت میں فتنہ پسندی اور فتنہ جوئی ہے وہ اس کے اصل مقصد کو نظر انداز کر کے اس کے انیس (۱۹) کے لفظ کو لے کے بیٹھ جاتا ہے' کہ اتنے بڑے جہنم پر انیس (۱۹) فرشتوں کا تقرر کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اس سے مراد کیا ہے؟ چنانچہ قرآنِ کریم نے خود اس کا ذکر فرمایا ارشاد ہے:

Marfat.com

وما جعلنا اصحاب النار الا ملائكة ص وما جعلنا عدتهم الا فتنة للذين كفروا ليستيقن الذين اوتوا الكتاب ويزداد الذين اٰمنوا ايمانا ولا يرتاب الذين اوتوا الكتاب والمؤمنون وليقول الذين فی قلوبهم مرض والكافرون ماذا اراد الله بهذا مثلاً ط كذالک يضل الله من يشآء ويهدی من يشآء وما يعلم جنود ربک الا هو وما هی الا ذكری للبشر o

(اور ہم نے دوزخ کی پہرہ داری پر نہیں مقرر کیے ہیں مگر فرشتے اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں کے لیے فتنہ تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب پانے والے اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں اور جن کی دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے لیے یاددہانی)

اس ایک مثال کو سامنے رکھیے تو چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں کہ آیاتِ محکمات میں جن بنیادی عقائد پر ایمان لانا ایک مومن کے لیے لازم قرار دیا ہے ان میں آخرت پر ایمان بھی شامل ہے اور آخرت پر ایمان کا جو حقیقی مقصد ہے اسے بھی قرآن نے جابجا کھول دیا ہے۔ اس ایمان کی پختگی کی موجودگی میں ان آیات میں کافروں کے لیے جو سزا ذکر فرمائی گئی ہے اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔

آیاتِ محکمات سے یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ اللہ کی کائنات بہت وسیع ہے' تم تو چھوٹے سے زمین کے کرے پہ رہنے والی ایک مخلوق ہو اور تمہیں بڑا محدود علم دیا گیا ہے۔ تمہیں اگرچہ جوہر عقل سے نوازا گیا ہے لیکن اس کی رسائی بھی عالم طبعیات تک ہے۔ مابعد الطبعیات کیا ہوتا ہے؟ انسان کا علم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس جہان میں تمہاری زندگی گزارنے کے لیے' یہ عقیدہ ضروری ہے کہ ایک دن تم اللہ کے دربار میں پیش کیے جاؤ گے' حساب کتاب ہوگا' نیکیوں کا پلڑا جھک جانے سے تم جنت میں جاسکو گے اور برائیوں کا پلڑا جھکنے کی صورت میں تمہیں جہنم میں جانا ہوگا۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ اور اس پر جزا و سزا کا ترتب' یہ وہ بات ہے جسے عقل تسلیم کرتی ہے۔ رہی یہ بات کہ جس عالمِ آخرت میں یہ سب کچھ ہوگا وہ ایک نادیدہ عالم ہے۔ تمہارا علم اس کے بارے میں سماعی ہے' مشاہداتی نہیں۔ اس لیے تم اس پر یقین لاکر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ لیکن اگر اس کی ایک ایک چیز کی حقیقت و ماہیت کو جاننے کی کوشش کرو (اور یہاں تاویل کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے) تو یہ وہ کوشش ہے جو تمہاری عقل کی حدود سے ماوراء ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں تم فتنے میں مبتلا ہو سکتے ہو۔ جہنم کی سزا کا سمجھنا تمہارے ایمان کے لیے ایک معمولی بات ہے۔ لیکن یہ بات جاننے کی کوشش کرنا کہ جو انیس (۱۹) فرشتے مقرر کیے گئے ہیں اس کا کیا مفہوم ہے؟ اور انیس کے عدد میں کیا رمز ہے؟ یہ وہ متشابہ بات ہے جس میں الجھ کر تم اپنا وقت بھی برباد کرو گے اور اس کے نتیجے میں فتنے میں مبتلا ہو کر ایمان و عمل کی قوت بھی کھو بیٹھو گے۔ اس میں عافیت کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس بات کا یقین پیدا کرو کہ وما يعلم تاويله الا الله (اس نادیدہ عالم کے حقائق کی صورت و ماہیت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا)۔ اور پختہ فکر اور پختہ علم لوگ اپنی عقل اور اپنے ایمان سے یہ سمجھ لیتے ہیں اور اسی کا اظہار بھی کرتے ہیں (یہ سب کچھ ہمارے رب کی جانب سے ہے) اگر طبیعت میں سلامتی ہے اور اللہ نے کج فکری سے محفوظ رکھا ہے تو یہی عافیت کا راستہ ہے جس کو اختیار کرنا کوئی مشکل نہیں چنانچہ اسی پر قائم رہنے کے لیے اگلی آیات میں دعا سکھائی گئی۔

Marfat.com

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○
رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○

(اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ تو نہایت بخشنے والا ہے ○ اور ہمارے پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ایسے دن میں جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا) (۸ تا ۹)

راسخین فی العلم کی دعا

یہ ان لوگوں کی دعا ہے جنہیں اللہ نے علم میں رسوخ عطا فرمایا ہے اور جن کی فکر میں پختگی پیدا فرمائی ہے۔ وہ چونکہ علم کی حدود سے آشنا ہیں اور ساتھ ہی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ جب خواہشاتِ نفس کا عقل پہ غلبہ ہو جاتا ہے تو پھر عقل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود خواہشات کی ایجنٹ بن جاتی ہے۔ نفس کی حکمرانی ہو جاتی ہے اور دل آہستہ آہستہ موت کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ کش مکش ہے جو انسانی قلب و دماغ میں کجی کا باعث بنتی ہے۔ جس آدمی نے اپنے دل میں ایمان و یقین کی شمع روشن کر لی اور پھر اس میں اللہ کی توفیق سے اسے بجھنے سے محفوظ رکھا تو کج فکری کے ہزار حملوں میں بھی محفوظ رہتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سلامتیِ فکر اور ایمان کی صحت کے لیے اپنے اللہ سے دعا مانگتا رہے۔ وہ بجائے خود پر اعتماد کرنے کے اللہ سے توفیق مانگے۔ اللہ کی عطا کردہ ہدایت کو حقیقی سرمایہ سمجھے اور اس کی حفاظت کے لیے اللہ سے اس طرح مدد کا طلبگار ہو جس طرح اس آیتِ کریمہ میں تعلیم دی گئی ہے۔ آدمی اپنی ذات کی مکمل نفی کر دے اور اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلا کر نہایت عاجزی سے عرض کرے کہ (یا اللہ! دل و دماغ تیرے قبضے میں ہیں) میں نہایت کمزور آدمی ہوں۔ میری کاوشیں کج فکری کے حملوں میں کہیں ناکام نہ ہو جائیں۔ الٰہی! اپنی طرف سے رحمت کی کمک بھیج تاکہ نہایت نازک مواقع میں بھی میرے قدم اکھڑنے نہ پائیں) اور پھر دوسری آیتِ کریمہ میں اس عقیدے میں پختگی مانگی ہے جو عقیدہ آدمی کو ہر طرح کے نازک لمحات میں محفوظ رکھتا ہے وہ عقیدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ پر یقین رکھے کہ وہ ایک نہ ایک دن قیامت برپا کرے گا اور جس کے برپا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہاں وہ سب لوگوں کو عدالت کے کٹہرے میں بلائے گا۔ ایک ایک حساب کے مرحلے سے گزرے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اللہ نے جن و انس سے وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ چونکہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا اس لیے قیامت کا آنا اور جزاء و سزا کا واقع ہونا ایک لازمی حقیقت ہے۔ وہ اس یقین کی پختگی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ میں خواہشات کے ہجوم اور لادینیت کے دباؤ میں راہِ راست پر اس وقت تک کھڑا رہ سکتا ہوں جب تک آخرت کا یقین مجھے سہارا دے۔ میرے دل و دماغ میں یہ بات اتر جائے کہ میرا ایک ایک عمل اللہ کی نگاہوں میں ہے۔ یہی وہ یقین ہے جس کے نتیجے میں میں پھونک پھونک کر قدم رکھوں گا اور یہی وہ قوت ہے جس کے سہارے سے میں بڑے سے بڑے بہلاوے اور لالچ کا مقابلہ کر سکوں گا۔ میرے پروردگار! دل و دماغ میں یہ یقین کی قوت پیدا کرنے والا صرف تو ہے اس لیے میں تیرے دروازے پر اسی دولت کے لیے بھکاری بن کر آیا ہوں تو میرے دامن کو اس دولت سے بھر دے۔

Marfat.com

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَ
لَآ أَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ﴿١٠﴾
كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَأَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ إِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿١٢﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَأُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ
وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي
الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ
وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ
وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ
حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿١٤﴾ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ
أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿١٥﴾
اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ إِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿١٦﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَ

Marfat.com

الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ
حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

رکوع: ۲۔ (بے شک جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہرگز ان کے مال ان کے کام نہیں آئیں گے اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں، یہی لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے O ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے O اے پیغمبر! کہہ دیجیے، ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے کہ قریب ہے وہ وقت کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ جہنم بہت ہی برا ٹھکانہ ہے O تحقیق تمہارے لیے نشانی ہے ان دو گروہوں میں (جو بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا۔ یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے O مزین کر دی گئی ہیں لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس یعنی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے O اے پیغمبر! ان سے کہئے کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز کی خبر نہ دوں؟ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے ان کے رب کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے O جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا O جو صبر کرنے والے، راست باز، فرمانبردار، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں O اللہ نے شہادت دی ہے اس بات کی کہ

Marfat.com

اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور (یہی گواہی دی ہے) فرشتوں نے اور اہلِ علم نے (اور ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) عدل و انصاف کو قائم فرمانے والا ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے وہ غالب اور حکمت والا ہے ○ بیشک اصل دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آ جانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے کیا۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے ○ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہے پھر اہلِ کتاب اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اس طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اس طرح اسلام لے آئیں تو وہ راہِ راست پا گئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے معاملات دیکھ رہا ہے) (۱۰ تا ۲۰)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ○ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○

(بے شک جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہرگز ان کے مال ان کے کام نہیں آئیں گے اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں، یہی لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے ○ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے، انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے) (۱۰ تا ۱۱)

قبولیتِ حق میں اصل رکاوٹ

آیت ۴ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کیا ہے یعنی وہ ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں اور اللہ کی آیات کی تکذیب کو انہوں نے اپنا معمول اور مشغلہ بنا لیا ہے وہ قیامت کے دن سخت عذاب کا شکار ہوں گے۔ اللہ کی آیات سے مراد قرآنِ کریم ہے کیونکہ اسلامی دعوت کی بنیاد قرآنِ کریم کی دعوت پر ہے اور قرآنِ کریم پر ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا جزء اور توحید کا نتیجہ ہے۔ پیش نظر آیتِ کریمہ میں انہی لوگوں کے ایمان نہ لانے کے حقیقی اسباب بیان فرمائے گئے ہیں۔ سابقہ آیاتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں کا قرآنِ کریم پر ایمان نہ لانے کا اصل سبب آیاتِ متشابہات ہیں۔ وہ بجائے آیاتِ محکمات سے فائدہ اٹھانے کے آیاتِ متشابہات کے درپے ہوئے، خود بھی فتنہ میں مبتلا ہوئے اور لوگوں کو بھی اس میں مبتلا کیا اور وہ اپنے انکار کی بنیاد اسی بات پر رکھتے تھے کہ جس کتاب کی بعض آیات کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں، اس پر آخر ہم ایمان کیوں لائیں؟ لیکن پیش نظر آیتِ کریمہ میں بتلایا گیا ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب آیاتِ متشابہات کا ناقابلِ فہم ہونا نہیں کیونکہ جو شخص آیاتِ محکمات پر یقین رکھتا ہے اور وہ انہیں منزل من اللہ مانتا

Marfat.com

ہے تو اس کے ایمان کے لیے آیاتِ متشابہات رکاوٹ نہیں بنتیں ﴿اور ہم اس سے پہلے اس کی وضاحت کر چکے ہیں﴾ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب درحقیقت وہی ہے جو ہر دور کے کافروں کا رہا اور ہر دور کے کفار نے کبھی اسے تسلیم نہیں کیا وہ اسباب کے طور پر ہمیشہ دوسری باتوں کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ اللہ کے نبی کو کبھی شاعر کہتے‘ کبھی کاہن قرار دیتے‘ کبھی ساحر اور شعبدہ باز ٹھہراتے‘ لیکن جو اس کا حقیقی سبب ہے اس کے ذکر سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ یہاں اسی حقیقی سبب کو بالواسطہ بیان کیا جارہا ہے کہ جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی مال اور اولاد سے حد سے بڑھی ہوئی محبت اللہ کے عذاب سے انہیں بچا نہیں سکے گی۔ اس میں کہنا یہ مقصود معلوم ہوتا ہے تم جو آج اسلام کی دعوت اور قرآن کریم کو قبول کرنے کے بجائے اس کا انکار کرتے ہو جبکہ قرآنِ کریم کی حقانیت سورج سے زیادہ روشن ہے۔ اس کے الفاظ کی فصاحت و بلاغت‘ اس کے جملوں کا دروبست‘ اس کی ترکیب کا حسن‘ اس کے محاوروں کا جمال اور اس کے اسلوبِ کلام کی شیرینی اور ہیبت اور پھر اس کلام کے اندر باہمی حیرت انگیز نظم و ضبط اور اس میں بیان کیے جانے والے نظامِ زندگی کی یکسانی اور ہم آہنگی اور ہر طرح کے اختلاف اور تضاد سے پاکیزگی ہر قاری کو اپنی تاثیر اور تاثر میں کھینچ لیتی اور اپنی سحر آفرینی سے مسحور کر دیتی ہے اور پھر صاحبِ قرآن کی دل آویز شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والے معجزات اور اس کی غیر معمولی کامیابیاں اور مخالفتوں کے مقابلے میں حیرت انگیز استقامت‘ ان میں سے ایک ایک بات مخاطب کے لیے اپنے اندر ایک ایسی قاطع دلیل رکھتی ہے جس کا جواب ممکن نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جو شخص قرآن پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مال و دولت اور اولاد کی محبت نے اس کے دل و دماغ میں کسی اور بڑے مقصد کے لیے جگہ نہیں رہنے دی۔ وہ ہر وقت دولت کے لیے سوچتا اور دولت کے حصول کے لیے جان کھپاتا ہے۔ اولاد کا موہوم مستقبل ہمیشہ اسے پریشان رکھتا ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی انہی دو محبتوں کے سائے میں اس طرح گزارتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں کوئی اور چیز جچنے نہیں پاتی۔ دولت کے حصول اور اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے اگر انسانی رشتے توڑنے پڑیں‘ اخلاقی قدریں پامال کرنی پڑیں‘ عدل اور انصاف کا خون کرنا پڑے‘ ملک و ملت سے غداری کرنا پڑے‘ وہ یہ سب کچھ کر گزرے گا تا کہ مال و اولاد کی محبت کا حق ادا کر سکے۔ اپنے گردوپیش میں نظر ڈال کے دیکھیے کہ وہ خونی رشتے جو محبت اور مودت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں انہیں بھی جب مال و دولت یا اولاد کی محبت سے تقابل پیش آتا ہے تو ان رشتوں کے خون کو بھی سفید ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ آدمی اپنے بیوی بچوں اور مال و دولت کے لیے اپنے ماں باپ اور اپنے بہن بھائیوں کو نظرانداز کر دیتا ہے اور چند مرلے زمین یا چند گز کی دکان کے عوض اپنے بھائیوں حتیٰ کہ اپنے والدین تک کو بھی موت کی نیند سلا دینے سے خوف نہیں کھاتا۔ اخبارات ایسی خبروں سے بھرے رہتے ہیں کہ چند ٹکوں کی خاطر بھائی نے بھائی کو مار ڈالا۔ تو جو شخص چند ٹکوں کے لیے خون بہا سکتا ہے جب یہی ٹکے اور یہی درہم و دینار اس کا مقصود بن جائیں تو وہ کسی نظریئے اور کسی مقصد کی خاطر انہیں قربان کرنے کی کبھی حماقت نہیں کر سکتا۔ البتہ! ان کی خاطر بڑے سے بڑے مقصد سے دستبردار ہو جائے گا۔ سقوطِ بغداد ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار کی وجہ سے پیش آیا۔ ایک شخص نے اپنے اقتدار کی حفاظت بلکہ اس میں ترقی کے لیے مسلمانوں کی تاریخ پامال کر ڈالی۔ برصغیر میں سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو باوقار اور غیرت مند حکمران گزرے ہیں‘ لیکن ان کے مقابلے میں انگریز کی نسبتاً حقیر قوت نے اس لیے ان پر فتح پائی کہ ان کے قلعوں کی چابیاں ان لوگوں کے ہاتھ میں تھیں جو درہم و دینار اور کرسی و اقتدار کی ہوس میں مسلمانوں کے مفادات کا سودا کر چکے تھے۔ آج بھی ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں مر رہے ہیں‘ قرآن و سنت کے مراکز مسلمانوں کے ہاتھوں اجاڑے جا رہے ہیں‘ ہماری بڑی بڑی علمی دینی شخصیتیں اپنے ہی لوگوں کی سازشوں سے موت کے گھاٹ اتاری جا رہی ہیں۔ ان انسانیت دشمنوں کے طور اطوار کو ملاحظہ فرمایئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مال و اولاد کی محبت کس قدر انسان کو بدل دیتی ہے اور عہدہ و منصب کی درازی کی ہوس آدمی سے کیا کیا کروا دیتی ہے۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں اسی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔لیکن براہِ راست بات کہنے کی بجائے بالواسطہ انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ جولوگ قرآن سے کفر کررہے ہیں اوران کے کفر کا سبب مال اوراولاد کی محبت ہے۔انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قیامت کے دن جب انہیں اللہ کے عذاب سے سابقہ پیش آئے گا تو نہ مال ان کے کام آئے گا،نہ اولاد ان کے کام آئے گی اوراس بات کومزید مؤکد کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کا حال کوئی پہلا حادثہ نہیں بلکہ ان سے پہلے جو قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی ہیں وہ بھی اسی بیماری کا شکار تھیں اور یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے وہ اللہ کے نبیوں اوران پرنازل ہونے والی کتابوں پرایمان نہ لاسکے۔پھربطورِخاص آلِ فرعون کی مثال دی کہ موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر جس کے ہاتھوں بڑے بڑے معجزات کا صدور ہوااورفرعون اورآلِ فرعون نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا' لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے اورانہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کوسحر اور جادو قرار دیا اور آپ پر عجیب عجیب اتہامات باندھے' کئی سالوں تک موسیٰ علیہ السلام نے مسلسل فرعون اورآلِ فرعون کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی' لیکن فرعون اورآلِ فرعون اپنے تخت وتاج کی محبت اوراپنی قومی عصبیت کے باعث موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کے روادار نہ ہوئے۔وہ بار بار آپ پرالزام لگاتے کہ تم درحقیقت نبوت کے پردے میں مصر کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔جب ان کا کفراور حجود اپنی انتہا کو پہنچ گیا اورانہوں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اورآپ کی قوم پرمظالم کی انتہا کردی تب پروردگار نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا' یعنی انہیں بحرِ قلزم میں ڈبو کے ماردیا۔تو فرعون اورآلِ فرعون کی تاریخ اس بات کی دلیل ہے کہ جولوگ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہوجاتے ہیں اوراولاد کی محبت انہیں اپاہج بنادیتی ہے تو وہ حق کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔بالآخر اللہ کا عذاب حرکت میں آتا ہے اورانہیں تباہ وبرباد کردیا جاتا ہے۔

شَدِیْدُالْعِقَابِ کا مفہوم

آخرمیں فرمایا وَاللّٰہُ شَدِیْدُالْعِقَابِ (اوراللہ سخت عذاب اورسزا دینے والا ہے) وہ پیغمبر اور کتاب پرایمان نہ لانے والوں کو مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے' لیکن جب وہ کسی طرح بھی مال ودولت کی محبت سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر اللہ کی غیرت جوش میں آتی ہے تو ان کے اعمال کی پاداش میں انہیں وہ سزا دی جاتی ہے جو سخت ترین سزا ہوتی ہے۔یہ اس کا ایک ایسا قانون جس میں کبھی پس وپیش نہیں ہوتا۔جس طرح اللہ کے قانونِ تکوینی میں اسباب کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوتا ہے اسی طرح اس کے تشریعی قانون میں کفر،سرکشی اور تمرد کے نتیجے میں اللہ کا عذاب ضرور حرکت میں آتا ہے۔مہلت دینا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے تاکہ کوئی آدمی سنبھلنا چاہے تو سنبھل جائے' لیکن جب مہلتِ عمل کا وقت گزر جاتا ہے تو پھراسی قانون کے تقاضے کے طور پر اللہ کا عذاب آتا ہے اوروہ سخت ترین عذاب ہوتا ہے۔

ان بنیادی حقائق کوذکر کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اپنے مخالفین بالخصوص یہود کو وارننگ دیجیے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ ط وَبِئْسَ الْمِھَادُ o

(اے پیغمبر! کہہ دیجیے، ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے کہ قریب ہے وہ وقت کہ تم مغلوب ہوجاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اوروہ جہنم بہت ہی برا ٹھکانہ ہے) (۱۲)

Marfat.com

یہود کو وارننگ

لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یوں تو ہر طرح کے کافر مراد ہیں' لیکن یہاں معلوم ہوتا ہے خطاب بطورِ خاص یہود سے ہے۔ اوس و خزرج کے تمام لوگ ان آیات کے نزول تک' مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اکثریت چونکہ مسلمان ہو چکی تھی اس لیے ان کی طرف سے کسی بڑی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان میں جو منافقین تھے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بھی کرتے تھے اس کی ڈور ہمیشہ یہود کی طرف سے ہلتی تھی' یہ لوگ انہی کے آلۂ کار اور انہی کے زیر اثر تھے' اس لیے براہِ راست یہود سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم دشمنی میں حد سے بڑھ رہے ہو اور تمہاری سازشیں روز بروز ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ جہاں تک تمہیں سمجھانے کا تعلق ہے' اس میں کوئی کمی نہیں رہی۔ تمہارے ایک ایک سوال کا کافی وشافی جواب دیا گیا ہے۔ اس لیے اب تمہیں وارننگ دی جا رہی ہے کہ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ وقت دور نہیں جب تم مغلوب ہو جاؤ گے۔ اسلام اپنے غلبۂ عمومی کی طرف قدم قدم بڑھ رہا ہے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وسلم نے جنگ بدر کے بعد جب یہود کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور انہیں سمجھایا کہ تمہارے لیے عافیت کا راستہ یہی ہے کہ تم اسلام کے دامن میں آ جاؤ' لیکن ان میں سے بطورِ خاص بنو قینقاع نے کہا کہ

محمد (ﷺ)! جنگ بدر کی فتح نے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ مکے والے کیا جانیں کہ لڑنا کیا ہوتا ہے' اس لیے تم نے ان کو مار لیا' لیکن جب ہم سے واسطہ پڑے گا تو ہم تمہیں بتا دیں گے کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔

اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی' کہ تم سرکشی اور تمرد کا رویہ چھوڑ دو' لیکن اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو پھر یاد رکھو چند دنوں کی بات ہے' جب تم مسلمانوں کے سامنے مفتوح اور مغلوب ہو کر ذلت کی تصویر بنے کھڑے ہو گے۔ اس طرح سے تم دنیا ہی میں اپنے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ لیکن یاد رکھو! دنیا کی یہ سزا اصل سزا نہیں۔ اصل سزا تو تمہیں قیامت کے دن ملے گی' جب تم جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس وقت قرآنِ کریم اسلام کے غلبے اور یہود کی مغلوبیت کی پیش گوئی کر رہا تھا اس وقت مسلمانوں کی قوت اس قدر زیادہ نہیں تھی کہ وہ یہود پہ غالب آ سکتے۔ ان کا ایک ایک قبیلہ الگ الگ بھی مسلمانوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی تھا۔ بنو قینقاع کی افرادی قوت تنہا بھی مسلمانوں سے زیادہ تھی اور وسائل کے اعتبار سے تو مسلمانوں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ لیکن قرآنِ کریم حالات کے علی الرغم یہ دھمکی دے رہا ہے کہ عنقریب مغلوب ہونا تمہارا مقدر ہے' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بنو قینقاع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ کیا' انہوں نے شروع شروع میں تو بہت بدزبانی اور ہیکڑی سے کام لیا۔ لیکن چند دنوں کے سخت محاصرے کے بعد دماغ سیدھا ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی کے انتہائی اصرار کی وجہ سے ان کی جانیں تو بچ گئیں' لیکن انہیں اپنے قلعوں' اپنے کاروبار اور اپنے باغوں سے دستبردار ہو کر بے کسی اور بے بسی کی تصویر بن کر مدینہ سے شہر بدر ہونا پڑا۔ اس لحاظ سے یہ آیتِ کریمہ قرآنِ کریم کی حقانیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ دنیا میں تو ان کو یہ سزا ملی کہ وہ شہر سے نکال دیے گئے اور جا کر خیبر میں آباد ہو گئے' لیکن جو آخرت میں سزا ملے گی وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے کہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔

Marfat.com

یہود نے اپنے مصنوعی اور جاہلانہ تصورات کی وجہ سے جہنم کو ایک بے ضرر سی چیز سمجھ رکھا تھا اور یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ جہنم کی آگ ہمیں نہیں چھوئے گی اور اگر ہمیں عجل پرستی کی سزا کے طور پر چالیس دن جہنم میں رہنا بھی پڑا تو یہ محض ایک ضابطے کی کارروائی ہوگی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے آیت کے آخر میں ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ (جہنم بہت ہی برا ٹھکانہ ہے)

مِهَاد اصل میں ''بستر اور فرش'' کو کہتے ہیں۔ انسان کی تکلیف اور بے چینی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اسے بستر بھی کانٹوں کا معلوم ہوتا ہے۔ بستر پر بجائے آرام ملنے کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عذاب دیا جا رہا ہے۔ اور ''بِئۡسَ'' کے لفظ نے تو شدت عذاب کو انتہا تک پہنچا دیا اور قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عذاب کی شدت کو شائد الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ یہود نے اللہ کی رحمتیں دیکھیں، اس کی طرف سے مسلسل ڈھیل ملنے کے باعث یہ لوگ فریب خوردگی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس لیے اس لفظ سے انہیں تنبیہ کی گئی ہے ۔

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوۡنَهُمۡ مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡىَ الۡعَيۡنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ۝

(تحقیق تمہارے لیے نشانی ہے ان دو گروہوں میں ﴿جو بدر میں﴾ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا۔ یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے) (۱۳)

گزشتہ آیت میں دعویٰ کی دلیل

سابقہ آیتِ کریمہ میں مخالفین کو اسلام کے غلبہ اور ان کے مغلوب ہونے کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ایک ایسے واقعہ سے اس پر دلیل پیش کی جا رہی ہے جو تھوڑا ہی عرصہ پیشتر پیش آیا تھا۔ مراد اس سے جنگِ بدر کا واقعہ ہے۔ کفار کو اپنی عددی برتری اور وسائلِ جنگ کی فراوانی پر ناز تھا۔ یہی دونوں چیزیں ہمیشہ جنگ میں کامیابی کی ضمانت ہوتی ہیں اور یہی دونوں چیزیں کافروں کے پاس بہتات کے ساتھ تھیں اور مسلمان اس سے تہی دامن تھے۔ بدر کے واقعے سے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ واقعہ کو غور سے دیکھو تو تمہیں صاف معلوم ہوگا کہ جن چیزوں کو تم نے کامیابی کی ضمانت سمجھ رکھا تھا، بدر میں وہ دونوں چیزیں کام نہیں آئیں۔ اس جنگ میں قریش کا لشکر ساڑھے نوسو (۹۵۰) مردانِ جنگی پر مشتمل تھا اور وسائلِ جنگ کی ان کے پاس فراوانی تھی۔ اسلحۂ جنگ کی کوئی کمی نہ تھی، رسد اور کمک کے انتظامات مکمل تھے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کی صفوں میں صرف تین سو تیرہ (۳۱۳) آدمی تھے۔ اسلحۂ جنگ میں ان کے پاس صرف آٹھ تلواریں، دو گھوڑے اور چھ زرہیں تھیں۔ اللہ کے ان عظیم بندوں میں ایسے بھی تھے جن کے تن پر قمیص نہ تھی۔ اکثریت کے ہاتھوں میں شمشیریں یا کمانیں تھیں اور بعض ایسے مجاہد بھی تھے جو بالکل خالی ہاتھ تھے اور انہوں نے درختوں سے تنے توڑ کر اپنے لیے لاٹھیاں تیار کی تھیں۔ ایک صحابی

Marfat.com

نے آپ ﷺ سے خالی ہاتھ ہونے کی شکایت کی تو آپؐ نے ایک لکڑی کا تختہ اٹھا کے دیا جوان کے ہاتھ میں پہنچ کر ایک چمکتی ہوئی تلوار بن گیا۔اس بے سروسامانی کے باوجود جب مقابلہ ہوا تو قلت کثرت پر غالب آ گئی۔ نہتے لوگوں نے مسلح لوگوں کی کمر توڑ دی۔جنگ میں کامیابی کے تمام مسلمہ اصول دھرے رہ گئے۔اس واقعے میں سب سے بڑی نشانی یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں فتح وشکست افرادی قوت اور اسلحۂ جنگ میں کمی بیشی سے نہیں ہوتی' بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے ہوتی ہے اور یہ تائید ونصرت ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کے راستے میں' اللہ کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔فتح اس گروہ کو ہوتی ہے جو اخلاقی اقدار کا علمبردار ہوتا ہے' جن کا بھروسہ صرف اللہ کی ذات پہ ہوتا ہے' وہ اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود ہراساں نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے بھروسے پر میدان میں استقامت دکھاتے ہیں اور ان کا استقلال اور توکل اللہ سے انعام لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ان دونوں گروہوں میں اصل فرق یہی تھا۔ایک طرف قریشِ مکہ کے لشکر میں شرابوں کے دور چل رہے تھے' ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں اور خوب دادِ عیش دی جارہی تھی اور اپنی قوت اور برتری کے اظہار کے دعوے تھے' لیکن دوسری طرف مسلمانوں میں پرہیز گاری تھی' خدا ترسی تھی' انتہا درجے کا اخلاقی انضباط تھا' نمازیں تھیں اور روزے تھے' زبان پر اللہ کا نام تھا' اسی سے دعائیں مانگی جارہی تھیں' اسی سے التجائیں ہورہی تھیں' دل اسی کی امید سے لبریز تھے۔ان دونوں لشکروں میں یہ فرق ایمان اور اخلاق کا تھا جس نے بنیادی کردار ادا کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلحۂ جنگ اور افرادی قوت میں اگر کمی بھی ہو' لیکن اللہ سے تعلق اور تعمیل احکام میں کوئی کمی نہ ہو تو قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کی تلافی اللہ کی تائید ونصرت سے ہوجاتی ہے۔لیکن اگر ایمان میں کمزوری اور کردار میں کجی ہو تو اس کی تلافی کسی صورت ممکن نہیں ہوتی۔میدانِ جنگ میں وہی قومیں غالب آتی ہیں' جو اپنے سیرت وکردار اور حوصلوں میں زندہ ہوتی ہیں اور اسلحۂ جنگ کی تیاری میں بھی مقدور بھر کوتاہی نہیں کرتیں' لیکن کوشش کے باوجود بھی اگر اللہ والے بے سروسامانی کا شکار ہوجاتے ہیں تو اللہ کے فرشتے ان کی مدد کے لیے آجاتے ہیں۔اسی بات کو قرآنِ کریم نے دونوں جماعتوں کے تعارف کے طور پر نہایت اعجاز اور ایجاز کے ساتھ ذکر فرمایا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ دو مقابل باتوں میں سے ایک مقابل کو اختصار کے لیے بالعموم حذف کردیا جاتا ہے کیونکہ مذکور لفظ محذوف کی طرف رہنمائی کررہا ہوتا ہے۔یہاں بھی اسی اسلوب کے تحت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔اصل عبارت اس طرح ہے فِئَةٌ مُّؤْمِنَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ پہلے جملے میں لفظ ''مؤمنۃ'' کو حذف کیا گیا اور دوسرے جملے میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کو حذف کیا گیا۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر گروہ طاغوت کے راستے میں لڑ رہا تھا۔ظاہر ہے کہ جو اللہ کے راستے میں لڑنے والا گروہ ہے اس کا تعلق یقیناً اپنے اللہ سے ہوگا۔وہ اللہ ہی کے کلمے کی سربلندی کے لیے لڑے گا۔اس کا بھروسہ اسی کی ذات پر ہوگا اور وہ اپنے کسی عمل سے بھی اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرے گا اور دوسرا گروہ جو طاغوت اور لادینیت کے راستے میں لڑے گا وہ نہ جانے کس کس کا جھنڈا بلند کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ چونکہ بنیادی طور پر بندۂ نفس ہوگا' اس لیے اس کا ایک ایک عمل تمرد' غرور اور سرکشی کی تصویر ہوگا اور یہ دونوں گروہ جب آپس میں ٹکرائیں گے تو اللہ کی تائید ونصرت پہلے گروہ کے ساتھ ہوگی۔اس کی نصرت اور تائید کے سو طریقے ہیں' لیکن وہ سارے طریقے صرف مسلمانوں کے حوصلے توانا کرنے کے لیے ہیں ورنہ مدد تو صرف اللہ کی جانب سے آتی ہے۔فرشتوں کا اترنا بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے اور حالات کی سازگاری بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔لیکن وہ تائید ونصرت جو جنگ کا نقشہ بدلتی ہے وہ بطورِ خاص اللہ کی جانب سے آتی ہے۔

Marfat.com

تائید ونصرت کی ایک مثال

تائید ونصرت کے ظاہری اسباب میں سے ایک کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ انہیں ان کی اصل تعداد سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ مفسرین نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ یَرَوْنَ کا فاعل کون ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس کا فاعل مسلمان ہیں۔ وہ قریشِ مکہ کے لشکر کی تعداد کو جو کہ اس سے تین گنا تھی، دوگنا دیکھ رہے تھے۔ لیکن بعض محققین کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ یَرَوْنَ کا فاعل قریشِ مکہ تھے۔ وہ مسلمانوں کو ان کی اصل تعداد سے یا اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ یہ اللہ کی جانب سے تائید ونصرت کی پہلی شکل تھی کہ قریشِ مکہ جو عددی برتری کے زعم میں یہاں پہنچے تھے، جب انہوں نے میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تعداد ان سے دوگنا ہے۔ کافر چونکہ ہمیشہ اسباب ووسائل کی جنگ لڑتا ہے اس لیے جہاں بھی اسے وسائل نظر آتے ہیں اور اسباب کی کثرت دکھائی دیتی ہے وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس نے مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھا تو اس کے حوصلے چھوٹ گئے۔ ممکن ہے بعض لوگ ایک شبہ کا اظہار کریں، وہ یہ کہ سورۂ انفال میں پروردگار نے یہ فرمایا ہے کہ غزوۂ بدر میں کفار بھی مسلمانوں کی نظر میں کم کرکے دکھائے گئے تھے اور مسلمان بھی کفار کی نظر میں کم دکھائے گئے تھے اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو دوچند دیکھا تو ان دونوں باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کو اپنا حریف کم تر نظر آیا۔ مسلمانوں نے کفار کی تعداد کم دیکھی اور کفار نے مسلمانوں کی تعداد۔ اس کی وجہ قرآنِ کریم نے یہ بیان کی ہے کہ دونوں کو دوسرے کی تعداد اس لیے کم دکھائی گئی تاکہ دونوں فریق ایک دوسرے سے لڑنے اور جھپٹنے کے لیے دلیر ہوجائیں اور اگر ان کو واقعی ویسا ہی دکھایا جاتا یا قریش کو پہلے مسلمانوں کو زیادہ دکھا دیا جاتا تو ممکن تھا کہ کوئی ایک فریق میدانِ جنگ چھوڑ دیتا جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ آج اس میدان میں حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح کردیا جائے۔ لیکن جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو اب چونکہ بھاگنے کا مرحلہ تو گزر چکا تھا اب تو تصادم شروع ہوچکا تھا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی تائید ونصرت کے لیے کافروں کی نگاہوں میں مسلمانوں کی تعداد کو زیادہ دکھایا جائے تاکہ وہ مرعوب ہوکر حوصلہ چھوڑ دیں۔ تو آیاتِ انفال میں جس موقع ومحل کا ذکر ہے وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے اور پیش نظر آیتِ کریمہ میں جنگ شروع ہونے کے بعد کا ہے جب تائیدِ الٰہی ملائکہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ممکن ہے کہ انہیں ملائکہ کی شکلیں دکھائی گئی ہوں تو جب انہوں نے مسلمانوں کو بھی دیکھا اور ملائکہ کو بھی تو اس صورت میں مسلمانوں کی تعداد ان کو اصل تعداد سے بہت زیادہ معلوم ہوئی۔

آخر میں فرمایا کہ اس واقعے میں دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے بہت سبق پوشیدہ ہیں۔ وہ جتنا اس بات پر غور کریں گے ان دونوں گروہوں کے بارے میں انہیں نئے سے نیا سامانِ عبرت حاصل ہوگا۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

Marfat.com

(مزین کردی گئی ہیں لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس یعنی عورتیں' بیٹے' سونے چاندی کے ڈھیر' نشان زدہ گھوڑے' چوپائے اور کھیتی، یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے) (۱۴)

آیت نمبر ۱۰ کی مزید تشریح

یہ آیتِ کریمہ آیت نمبر ۱۰ کی تشریح بھی ہے اور ایک اہم حقیقت کا اظہار بھی۔ آیت نمبر دس میں یہ کہا گیا کہ جو لوگ قرآن اور قرآن کی دعوت کے مخالف اور دشمن ہیں وہ اپنی دشمنی کے دلائل کے طور پر قسم قسم کی باتیں کرتے ہیں' لیکن حقیقت میں ان کی مخالفت کا صرف ایک ہی سبب ہے وہ ہے حبِ دنیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد چونکہ ایک نئی طرح کی زندگی اختیار کرنا پڑتی ہے جس میں تمام احساسات اور انفعالات پر جو جذبہ حکمرانی کرتا ہے وہ اللہ' اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے دین سے محبت کا جذبہ ہے۔ محبت کے اور جتنے رشتے اور جتنے علاقات ہیں وہ سب اس رشتے کے تابع ہیں۔ کائنات کی سب سے پہلی اور ابدی حقیقت اللہ کی ذات ہے اور اسی سے تعلق اور اسی کی محبت انسان کا اصل سرمایہ ہے۔ پھر اس محبت کے تقاضے یا نتیجے کے طور پر جو رشتے وجود میں آتے ہیں ان رشتوں کی پاسداری اور ان کی محبت اللہ کی محبت کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ لیکن جو محبتیں اس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں یا اللہ سے محبت پر غالب آتی ہیں' اسلام نے ایسی ساری محبتوں اور تعلقات کو ممنوع قرار دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ انسان درحقیقت حبِ دنیا کا اسیر ہو کر اللہ کی محبت سے غافل ہو جاتا ہے اور یہی بات تمام خرابیوں کی اصل بنیاد ہے۔ پھر جن جن چیزوں سے انسان محبت کرتا ہے، ان کی تفصیل بیان فرمائی کہ انسان کی محبت کی اصل شکل مشتہیات یعنی مرغوباتِ نفس سے محبت ہے۔ اس آیت میں شہوات سے مشتہیات مراد ہیں۔ یعنی وہ مرغوباتِ نفس جن کی طرف نفس مائل ہوتا ہے' نفس جن کی خواہش کرتا ہے' جنہیں پسند کرتا ہے اور یہی پسند بالآخر محبت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ان مرغوبات میں پھر ایک ترتیب ہے جو بالکل فطری بھی ہے اور نفس کے تقاضوں کے مطابق بھی۔ آدمی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اہل وعیال سے محبت کرتا ہے کیونکہ اہل وعیال کی محبت انسان کی معاشرتی زندگی اور اس کی تنہائیوں کی آبادی کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے انسانی تعلقات میں سب سے بلند مقام اسی رشتے کا ہے۔ دوسری چیزوں کی محبت' اسی محبت سے پھوٹتی ہے بلکہ ضرورت کے تحت وجود میں آتی ہے۔ ہر آدمی اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسب اور اکتساب کرتا ہے' کسی نہ کسی طریقے سے مال کمانے کی فکر کرتا ہے تاکہ اس سے گھر کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ لیکن پھر نفس کی بے اعتدالیوں کے باعث یہ ضرورت محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ آدمی پھر اس پر قناعت نہیں کرتا کہ میں اس کے لیے اتنی محنت کروں جس سے میرے گھر کی ضروریات پوری ہو سکیں بلکہ وہ اسے مقصد بنا کر اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مال ودولت میں چونکہ سب سے قیمتی چیز سونا اور پھر چاندی ہے' اس لیے یہاں اسی ترتیب سے اس کا ذکر بھی فرمایا گیا۔ قناطیر قنطار کی جمع ہے اور مقنطرۃ اس کی صفت ہے۔ اس کے لیے خزانہ کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے' لیکن اس کا اصل معنی "مالِ کثیر" ہے۔ یہاں قنطار کے ساتھ مقنطرۃ کی صفت کا استعمال کثرت میں اضافے کے لیے ہے۔ جیسے "لیل الیل" یا "ظل ظلیل" بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مال کا اکتساب جو ضرورت کے تحت وجود میں آتا ہے لیکن پھر بڑھتے بڑھتے وہ خزانے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس

Marfat.com

اکتساب کرنے والے کی طلب کسی حد پر بھی قناعت نہیں کرتی اور یہی وہ چیز ہے جس کو کسی چیز کی محبت کہا جاتا ہے۔ پھر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے تو پھر وہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بھی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ عرب میں ایسی زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی ان میں پہلی چیز قیمتی گھوڑے ہوتے تھے۔ اہلِ عرب زینت' فخر اور دفاع تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جوان کے اصطبل کی زینت بھی تھا اور یہی لڑائیوں میں سب سے کارآمد ہتھیار بھی تھا اور یہی اس دور کی سب خوبصورت سواری بھی تھی۔ اس لیے ہر امیر آدمی کوشش کرتا تھا کہ میں ایسے قیمتی گھوڑے پر سواری کروں جیسا گھوڑا کسی اور کے پاس نہ ہو۔ جس طرح آج کے امراء قیمتی سے قیمتی گاڑی رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں' اس دور میں گاڑی کا متبادل گھوڑا سمجھا جاتا تھا۔ پھر قبائلی اور بدوی زندگی میں معاش کا زیادہ تر انحصار چوپایوں پر تھا۔ جن میں اونٹ بھی شامل تھے اور بھیڑ بکریاں بھی۔ اونٹ بار برداری کے کام بھی آتے اور صحرا کے سفر میں سب سے کارآمد سواری بھی یہی تھی' انہی کے بالوں سے خیمے تیار ہوتے' انہی کی کھالوں سے بہت سی ضرورتیں پوری کی جاتیں اور اہل مکہ کے یہاں یہ سب سے بڑی صنعت بھی تھی اور بھیڑ بکریاں ان کی غذا کا سامان تھیں۔ جس طرح وہ اونٹ کا دودھ شوق سے پیتے تھے اس طرح بھیڑ بکریوں کا دودھ بھی پیتے تھے اور ان کے چمڑے اور اون سے اپنی بہت سی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔

آخری چیز جو بیان فرمائی گئی ہے وہ ہے حــرث، حرث کا اطلاق کھیت پر بھی ہوتا ہے' کھیتی پر بھی اور باغ پر بھی۔ قرآنِ کریم کے نزول کے وقت چونکہ تمدن کا دور شروع ہو چکا تھا' بدویت کے دور میں اگرچہ حرث کی کوئی اہمیت نہ تھی' لیکن تمدن شروع ہوتے ہی جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہائش اختیار کی تو حرث کو زیادہ سے زیادہ اہمیت ملتی گئی۔ اس لیے مال و دولتِ دنیا میں اس کا ایک اہم مقام ٹھہرا۔ دنیا کی ان تمام چیزوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن نے جس اہم حقیقت کو منکشف فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی چاہت بھی اپنی ذات میں بری نہیں بلکہ یہ تو انسان کی ایسی ضرورتیں ہیں کہ جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ! وہ چیز جو حق کے قبول کرنے اور دین کا راستہ اختیار کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے وہ ان چیزوں کی تزئین ہے۔

تزئین کا مفہوم

تزئین کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اس کے اثر میں ڈوب کر ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے۔ یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ جس طرح بھوکا آدمی خواب میں بھی روٹیاں دیکھتا ہے اور اس سے پوچھا جائے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو وہ چار کی بجائے چار روٹیاں کہتا ہے کیونکہ پیٹ کی آگ اس کے دماغ تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ایک آدمی اپنی ضروریات کو مقاصد کا درجہ دے کر ان کے حصول میں رات دن لگ جاتا ہے تو وہ اس کے احساسات اور انفعالات پر غالب آ جاتی ہیں۔ وہ ہر چیز کو انہی کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ وہ اگر بیمار بھی ہوتا ہے تو ہندو بنیے کی طرح اپنی اولاد سے پوچھتا ہے کہ میرے علاج پر خرچ زیادہ آئے گا یا میری بعد از مرگ رسموں پر۔ ان دونوں میں سے جس پر کم خرچ آتا ہے تمہیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا کی محبت میں ڈوب جانے والا آدمی بے شک ہندو بنیے کی طرح یہ بات نہ کہے لیکن اس کی زندگی کے معمولات قدم قدم پر اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ دنیا کی محبت کا اس

Marfat.com

طرح غالب آ جانا' یہ فطرت کے بھی خلاف ہے اور خالق فطرت کے منشاء کے بھی۔ ایسی زندگی کو اختیار کر لینے کے بعد صرف یہودی ذہنیت یا بنیا پن تو باقی رہ سکتا ہے' دین یا اخلاق کے باقی رہنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے مال و دولت کے حصول سے نہیں روکا' لیکن اس کی تزئین یعنی اس میں ڈوب جانے اور اس کی محبت میں فنا ہو جانے سے سختی سے روکا ہے اور ایسے تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا ہے جس سے یہ ذہنیت فروغ پاتی ہے۔ اس لیے بڑی بڑی مرغوباتِ نفس اور مال و دولت کی مختلف صورتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (یہ ہے حیاتِ دنیا کا سامان) اس چھوٹے سے فقرے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معانی کا کیسا جہان پوشیدہ ہے۔ اس فقرے کے اسلوب سے دنیا کی بے ثباتی بھی جھلکتی ہے اور عالمِ باقی کے مقابلے میں اس کی بے حقیقتی بھی۔ مسلمان کو اللہ نے اپنی محبت اور آخرت کا شعور دے کر آخرت کا مسافر بنایا ہے۔ آخرت کی نعمتیں جنت کی صورت میں اس کے لیے چشم براہ ہیں۔ اس کی بے بصیرتی کی کیا انتہا ہے کہ ان سے منہ پھیر کر یہ دنیا کے خزف ریزوں کی محبت میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ پوری دنیا کی اصلاح اس کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے۔ لیکن جو شخص مرغوباتِ نفس کا اسیر ہو جائے گا وہ دنیا کی اصلاح کیا کرے گا؟ اس کی تگ و تاز تو گھر کے باورچی خانے تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس کا معدہ اس کا مطاف بن جائے گا۔ وہ دنیا کی اصلاح کی بجائے دنیا کو ہوس اور لالچ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دے گا۔ یہ وہ لازمی نتائج ہیں جو مرغوباتِ نفس کی خواہشات میں ڈوب جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے پاس ان کے لیے بہترین ٹھکانہ ہے۔ دنیا کی محبت میں ڈوب جانے والا شخص اللہ کے پاس بہترین ٹھکانے کو بھول جاتا ہے اور وہ دنیا ہی میں اپنا ٹھکانہ بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور یہ وہ حماقت ہے جس سے ہزاروں حماقتیں پھوٹتی ہیں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(اے پیغمبر! ان سے کہئے کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز کی خبر نہ دوں؟ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے ان کے رب کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے) (۱۵)

دنیا کی غلامی سے نکالنے کی ایک کوشش

قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے نہایت حکیمانہ طریقے سے انسان کو مرغوباتِ نفس کی محبت اور دنیا اور اموالِ دنیا کی غلامی سے نکالا ہے۔ اس نے عیسائیت کی طرح نہ تو ترکِ دنیا کی تعلیم دی اور نہ بدھ مت کی طرح بھکشو بننے کی اجازت دی اور نہ ہندو مت کی طرح جوگی ازم کو پسندیدہ ٹھہرایا۔ یہ چونکہ ایک فطری دین ہے جو دنیا کی آبادی اور انسان کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اگر انسان کو آبادی سے نکال کر جنگلات کا راستہ دکھاتا ہے اور دنیا کے معمولات سے ہٹا کر ترکِ دنیا کی ترغیب دیتی ہے تو یہ اصلاح نہیں بلکہ ذمہ داریوں سے فرار کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی صلاحیتیں بھی دم توڑ جائیں گی اور انسانی آبادیاں بھی بے آباد ہو جائیں گی۔ ترکِ دنیا اور

Marfat.com

اس سے ملتے جلتے دوسرے طریقے چونکہ خلافِ فطرت ہیں اس لیے انسان نے کبھی اسے سنجیدگی سے لینے کی کوشش نہیں کی۔ چند افراد سے زیادہ اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیوی ہماہمی باقی ہے اور انسانی قافلہ رواں دواں ہے اور خود رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم دینے والے اسے چھوڑ کر انسانی قافلے میں شریک ہو چکے ہیں۔ مذہبی عبادت گاہوں میں چند افراد کے سوا دنیا میں کہیں اس کے ماننے والے نہیں رہے۔ اس لیے کہ جو چیز خلافِ فطرت ہو گی اور جس کو منفی بنیادوں پر اٹھایا جائے گا وہ کبھی دیرپا نہیں ہوتی اور انسان اسے کبھی خوش دلی سے قبول نہیں کرتا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر دنیا اور اموالِ دنیا کی طلب انسان کا مقصد بن جاتی ہے اور وہ اس کی محبت کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے تو پھر نہ اخلاقیات باقی رہتی ہیں' نہ انسانی رشتوں کا تقدس باقی رہتا ہے' انسان بجائے انسان کے کام آنے کے انسان کو شکار کرنے والا اور بھنبھوڑنے والا ایک درندہ بن جاتا ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ دوسرے کی جیب پر رہتی ہے۔ وہ دوسروں کی ضرورتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی تجوری بھرنے والا ایک سنگ دل شخص بن جاتا ہے۔ اسے صرف اپنی دولت بڑھانے کی فکر ہوتی ہے' چاہے اس کے لیے اسے کیسے ہی جرائم کا ارتکاب کرنا پڑے۔ جس طرح ترکِ دنیا سے دنیا تباہ ہوتی ہے اسی طرح دنیا کی ہوس بھی دنیا کو تباہ کر دیتی ہے۔ اِن دونوں انتہاؤں کے درمیان قرآنِ کریم نے ایک زاویۂ نگاہ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے تم دنیا میں رہو' دنیا کو برتو اور دنیا کی ضروریات کے لیے محنت کرو اور ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے جن اشیاء کی ضرورت ہے ان اشیاء کو حاصل کرو۔ اگر تمہارے کسب اور اکتساب کے نتیجے میں تمہیں ضرورت سے زیادہ دولت ہاتھ آ جاتی ہے تو اسے اپنے پسماندگان کے لیے بھی بچا کے رکھو' لیکن اگر تمہارے گرد و پیش میں ضرورت مند لوگ موجود ہیں تو ان پر خرچ کرو۔ انسانی ضرورتوں پر کبھی ہوس اور خواہشات کو غالب نہ آنے دو۔ تم دنیا کے لیے محنت کرو' لیکن اسے مقصود اور محبوب نہ بناؤ۔ تمہاری محبوب ہمیشہ آخرت ہونی چاہیے۔ آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لیے جیسے سیرت و کردار کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تمہاری حقیقی منزل آخرت ہے اور آخرت میں بھی جو چیز تمہارا منتہائے نگاہ ہونی چاہیے وہ اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ چنانچہ عرب کے مادہ گزیدہ اور خواہشات پر فنا ہو جانے والے معاشرے میں جب اس زاویۂ نگاہ کو قبولیت کا موقع ملا تو حیرانی کی حد تک ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا۔ جس کا ایک ایک فرد سیرت و کردار کی اعلیٰ مثال تھا۔ اس کا مزدور ایک صابر و شاکر مزدور تھا اور اس کا مالک مزدور کا پسینہ خشک ہو جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اجرت دینے کا حریص تھا۔ اس کا طبقۂ امراء دولت کا امین بن کر دولت کو وہاں خرچ کر دینے کے لیے بے چین رہتا تھا جہاں ضرورت مند انسان بستے تھے۔ کسی شخص کی معمولی تکلیف بھی حکمرانوں کو بے چین کر دیتی تھی۔ اس معاشرے میں تختِ شاہی کا تصور ایک بوریے کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ حکمران راتوں کو چھپ چھپ کر لوگوں کی ضروریات معلوم کرنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ انہیں آسودہ زندگی دے سکیں۔ اس معاشرے میں دولت کمائی جاتی تھی' لیکن خیر کے حصول کے لیے' اس میں انسان محنت کرتا تھا' اپنی ضرورتیں پوری کرنے اور دوسروں کے کام آنے کے لیے۔ اس دنیا میں بسنے والے لوگ دنیا کو دارالعمل سمجھتے تھے اور آخرت کو اپنی منزل گردانتے تھے۔ آخرت کی نعمتیں ان کا مقصود اور مطلوب بن گئی تھیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی زاویۂ نگاہ کے بدلنے کی کوشش فرمائی گئی ہے اور جن لوگوں میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی' بعد کی آیات میں انہی کی صورت آرائی کی گئی ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اے پیغمبر ان سے کہیے کہ تم جو دنیا کی معمولی نعمتیں حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کرتے ہو' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہاری کوششوں کا اس سے بہتر ہدف بھی موجود ہے۔ بس اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ تم تقویٰ کی زندگی اختیار کرو۔ اس کے نتیجے میں تمہیں آخرت میں ایسی جنتیں ملیں گی جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ انسان چونکہ اکیلا رہ کر کبھی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے رفیقۂ حیات چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ ان جنتوں میں اہلِ

Marfat.com

جنت کو پاکیزہ بیویاں دی جائیں گی۔ اللہ نے ان کے ذوق اور ان کے طور اطوار کی ایسی اصلاح فرمائی ہوگی کہ وہ ہر لحاظ سے پاکیزہ کہلانے کی مستحق ہوں گی۔ ان کی کسی بات میں اپنے رفیقِ حیات کے لیے تکلیف دہ اشارہ تک موجود نہیں ہوگا۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی طور پر اخلاق عادات اور ذوق کی تطہیر کے عمل سے گزارا ہوگا۔ یہ نعمتیں بجائے خود ایسی ہیں کہ جن کی طلب میں آدمی بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے' لیکن ان سے بھی بڑی نعمت جنت میں اللہ کی رضا ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ یہ اعلان فرمائیں گے کہ لوگو! میں تم سے راضی ہوں اور تمہیں اپنی رضا سے نوازتا ہوں۔ یہ اعلان اہلِ جنت کے لیے اتنی بڑی نعمت ہوگا کہ جنت کی وہ نعمتیں جن کی رعنائی کو ہم تصور میں بھی نہیں لا سکتے وہ سب اس کے مقابلے میں ہیچ محسوس ہوں گی اور آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ' بِالْعِبَادِ اس میں بیک وقت تسلی بھی ہے اور دھمکی بھی۔ دھمکی تو یہ ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور یہ مت سمجھو کہ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہے۔ اس لیے اگر تم نے ایسے اعمال اختیار کیے جو اس سے بغاوت کے مترادف ہیں تو یقین جانو کسی وقت بھی تم گرفت میں آ سکتے ہو اور تسلی ان معنوں میں ہے کہ جو لوگ آخرت کی تیاری کے لیے دنیا کی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کریں گی انہیں مطمئن رہنا چاہیے کہ اس راستے میں وہ جن جن مصائب سے دوچار ہوں گے اور جو مشقتیں انہیں اٹھانا پڑیں گی ان کی ایک ایک کیفیت اور ایک ایک قربانی سے اللہ پوری طرح واقف ہے اور وہ ان کی ایک ایک نیکی کا زیادہ سے زیادہ صلہ دے گا اور ان کی کوئی قربانی ضائع نہیں جائے گی۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

(جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا ۝ جو صبر کرنے والے' راست باز' فرمانبردار' اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں) (١٦ تا ١٧)

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ' لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں کی بشارت دی گئی تھی جو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔ یعنی وہ دنیا کی بجائے آخرت کو اپنی منزل قرار دیتے ہیں۔ دنیا کو ضرورت سمجھتے اور آخرت کو مقصد قرار دیتے ہیں۔ وہ دنیا کی ایک ایک نعمت سے اس طرح کا تعلق رکھتے ہیں جس سے آخرت کے تعلق کو قوت اور استواری نصیب ہو۔ وہ دنیا کے ہر کام میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے دخل دیتے ہیں' لیکن وہ کسی کام سے اس طرح جی نہیں لگاتے جو انہیں آخرت سے غافل کر دے۔ وہ اپنے اور دنیوی نعمتوں کے بارے میں وہ تصورات رکھتے ہیں جو تقویٰ پیدا کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ متقی لوگ ہیں جن کے لیے دنیوی نعمتیں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں بھی۔ لیکن ان کی نگاہ آخرت کی نعمتوں پر ہے۔ دنیا کی نعمتیں ملتی ہیں تو اس پر اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں اور بجائے انہیں روک رکھنے کے دوسروں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ اس تقویٰ کی دعوت کو قبول کر لینے سے جو ان کے اندر بنیادی احساسات جنم لیتے ہیں اور جن کا اظہار ان کی زبانوں سے بار بار ہوتا ہے اور جو احساسات ان کی دعاؤں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اس آیتِ کریمہ میں ان کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ متقی لوگ وہ ہیں جب وہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو سب سے پہلے اس بات کا اقرار اور اظہار کرتے ہیں کہ تقویٰ کی زندگی کے لیے اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب نے جس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت دی تھی ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں

Marfat.com

ہمارے اندر یقین پیدا ہو گیا ہے کہ دنیوی اور اخروی کامیابیوں کے لیے اس دعوت کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ہم اللہ کے رسولؐ پر ایمان لائے اس پر نازل ہونے والی کتاب کی حقانیت پر یقین کیا اور اب ہم اپنی زندگی کو اس طریقے پر گزارنا چاہتے ہیں جس کی دعوت اللہ کے رسولؐ اور اس کی کتاب نے دی ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں' بلکہ اللہ کی شریعت کے مطابق ہو گا۔ ہم اسی کے مطابق جئیں گے اور اسی کی سربلندی اور توانائی کے لیے جان دینی پڑی تو دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ ہم اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ زندگی اللہ کی نعمت اور اس کی امانت ہے۔ اس کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کے بارے میں آخرت میں جوابدہی کرنا پڑے گی۔ اس لیے ہم اپنی زندگی کو عیش و عشرت میں نہیں بلکہ آخرت کی تیاری کے لیے گزارنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ زندگی کی اس شاہراہ پر آدمی ہزار احتیاط سے چلے کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ کہیں دماغ کے فیصلے غلطی کر جاتے ہیں' کہیں دل کے احساسات میں گناہ کی آلودگی شامل ہو جاتی ہے اور کہیں آدمی تعلقات کی دنیا میں ہوس اور حرص کا شکار ہو جاتا ہے۔ محبت اور نفرت کے جذبات ہماری طبیعت میں گندھے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کی گرفت راہِ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے۔ بنابریں ہر وقت اس بات کا امکان ہے کہ ہم کسی لغزش کا شکار ہوں' ہم سے کسی گناہ کا صدور ہو جائے' اس لیے ہم ہزار احتیاط کے ساتھ ساتھ اللہ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں اور اس سے گناہوں کی بخشش کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمارے وہ گناہ جنہیں ہم نے دانستہ کیا اور وہ گناہ جو نادانستگی میں ہم سے ہو گئے' سب کی مغفرت فرما۔ ہم اگر کسی نیکی کا موقع پا لیتے ہیں تو اسے ہم اپنی ہمت کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی سی نیکی بھی اس کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ گناہوں سے بچاؤ بھی اسی کی توفیق سے ہوتا ہے اور نیکی کا صدور بھی اسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ بعض دفعہ نیکی کا پندار انسان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس لیے ہم اس سے بھی اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر نیکی کا پندار پیدا ہو جائے۔ یہ متقی لوگ جنہیں اللہ نے جنت کی نعمتوں کا سزاوار ٹھہرایا ہے ایمان اور استغفار کی دولت کے باوجود کبھی اس بات سے بے خبر نہیں ہوتے کہ آدمی ہزار نیکیاں کرے' اللہ سے ہزار استغفار کرے' لیکن اسے کبھی یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ میرے اعمالِ صالحہ اللہ کے یہاں بخشش کے لیے کافی ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ایمان و عمل کے بغیر بخشش کا کوئی اور ذریعہ نہیں' اس لیے ہر بندۂ خدا کے لیے ایمان و عمل کے راستے میں زیادہ سے زیادہ جان مارنا اور محنت کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک مومن کے تمام تر اخلاص کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا عمل اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ وہ بارگاہ اتنی عظیم ہے اور اس کے تقاضے اس قدر نازک ہیں کہ انہیں دیکھتے ہوئے کوئی سا انسانی عمل بھی حتمی قبولیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ متقی لوگ اپنی اس کمزوری کو جانتے ہوئے ہمیشہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھتے ہیں کہ یا اللہ! جو ہم سے بن پڑا وہ ہم نے کیا' لیکن ہم ارادوں کی لغزشوں' نیتوں کے فساد اور عمل کی نارسائیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے ایمان و عمل پر ہرگز بھروسہ نہیں۔ بھروسہ اگر ہے تو تیرے فضل و کرم پر ہے۔ اس لیے تیرے فضل و کرم کے حوالے سے درخواست گزار ہیں کہ ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔

اس آیت میں بیان کردہ یہ تین باتیں ایک متقی کی زندگی کا اصل اثاثہ ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہیں جس کے نتیجے میں وہ اوصاف اور خصائص پیدا ہوتے ہیں جس کا ذکر دوسری آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ اس لیے ان تین باتوں کو ہر وقت مستحضر رکھنا ایک مومن کے لیے ضروری ہے۔ وہ ہر وقت اپنے ایمان کا جائزہ لیتا رہے کہ دین کی بنیادی باتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی دعوت کے بارے میں اس کے ایمان میں کوئی کمزوری تو نہیں۔ وہ کہیں شک و ارتیاب کا مریض تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے

Marfat.com

اسے یقین کی قوت سے محرومی کا احساس ہو اور دوسری یہ بات کہ وہ اللہ کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے کہیں اس بات کو کافی تو نہیں سمجھتا کہ بس فرض کی ادائیگی کسی طرح بھی ہو جائے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تقویٰ کی زندگی سے بہت دور ہے۔ تقویٰ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان کی پختگی کے ساتھ ساتھ عمل کی آمادگی بھی پیدا ہو اور عمل کی ادائیگی اس جذبہ کے ساتھ ہو کہ کسی نہایت پر پہنچ کر بھی اسے کبھی قرار نہ آئے۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے اور اپنی ساری کوششوں کو صرف کرنے کے بعد بھی اس خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہ ہو کہ میں ہر طرح کے گناہ سے بچ نکلا ہوں بلکہ اسے ہمیشہ اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگتے رہنا چاہیے اور تیسری یہ بات کہ وہ جیسے جیسے نیکی اور تقویٰ میں آگے بڑھتا جائے ویسے ویسے اس کے اندر یہ تصور اترتا چلا جائے کہ یہ نیکی کا عمل میری ہمت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سراسر اللہ کی دین اور اس کی توفیق ہے۔ میرا دل و دماغ اسی کے قبضے میں ہے۔ میرے عمل کی کاوشیں بھی اسی کی عطا ہیں۔ وہ اگر نہ چاہے تو میں کوئی سی نیکی نہیں کر سکتا۔ وہ نیکی کرنے سے پہلے اس سے توفیق مانگے اور نیکی کرنے کے بعد اس پر شکر ادا کرے اور اس کی قبولیت کے لیے ہاتھ پھیلا دے۔ ہر وقت اس کا احساس اس طرح رہنا چاہیے ؎

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا　　ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا ہوا کرم سے تیرے　　جو ہو گا ترے کرم سے ہو گا

اسی احساس کی شدت کے باعث وہ اللہ سے جہنم سے محفوظ رکھنے کی دعائیں کرتا ہے کیونکہ اصل کامیابی جہنم کی آگ سے بچنا ہے۔ دنیا کی مختصر زندگی جیسے کیسے حالات میں گزر جاتی ہے لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں اس کے لیے دو ہی راستے ہیں ایک جنت کا راستہ جو کامیابی کی صورت میں ملے گا اور دوسرا جہنم کا راستہ جو ناکامی کی صورت میں مقدر ہو جائے گا۔ اس لیے جو شخص جہنم کا سزاوار ٹھہرا اس سے زیادہ بدنصیب اور ناکام کوئی شخص نہیں اور جسے اللہ نے جنت سے نوازا اس کی کامیابی کے کیا کہنے۔ اس لیے قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (جو جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ٹھہرا)

ان بنیادی تصورات سے جو سیرت و کردار وجود میں آتا ہے دوسری آیتِ کریمہ میں اس کے پانچ بنیادی اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ کیونکہ یہی پانچ بنیادی صفات ہیں جن سے باقی صفات وجود میں آتی ہیں۔ یہ پانچ بنیادی صفات حسب ذیل ہیں:

صبر......صدق......قنوت......انفاق......استغفار

صبر:

صبر کا معنی رک جانا' اڑ جانا' جم جانا اور ثابت قدم رہنا ہے۔ اسلامی اصطلاح کے طور پر اس کا اطلاق تین باتوں پر ہوتا ہے۔

(۱) ...... صبر علی الطاعۃ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت نے جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے انہیں دل یقین کے ساتھ اس طرح ماننا کہ کوئی لالچ یا کوئی خوف اس سے ہٹنے پر مجبور نہ کر سکے۔ اسی سے حق پر جزم اور استقامت صبر کے مفہوم میں شامل ہوا ہے۔ توحید کا تصور ہر طرح کے شرک کو ختم کر دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہر طرح کی شخصیت پرستی کی بنیاد اکھاڑ دیتا ہے جبکہ دنیا میں نہ جانے کتنے آستانے ہیں جن پر انسان کو جھکنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور کتنی شخصیتیں ہیں جن کی پیروی انسان کو لازماً کرنا پڑتی

Marfat.com

جو شخص اللہ کی توحید پر ایمان لاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مانتا ہے وہ گویا پوری دنیا کو چیلنج کرتا ہے کہ میں اللہ کی کبریائی کے سوا کسی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا اور رسول ﷺ کے سوا نہ کسی کو آئیڈیل سمجھتا ہوں اور نہ کسی کو اس قابل جانتا ہوں کہ اس کی زندگی ہر طرح کی زندگیوں کے لیے نمونہ اور اسوہ بن سکے اور نہ میں کسی ایسے شخص کو تسلیم کرتا ہوں جو اپنی عصمت کا دعویٰ کرے۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈالیے کہ بظاہر تو یہ دونوں باتیں بڑی سادہ سی ہیں، لیکن درحقیقت پوری دنیا سے لڑائی مول لینے کے مترادف ہیں۔ جو شخص بھی یہ راستہ اختیار کرے گا اسے قدم قدم پر ہر بڑائی کے دعویدار سے تصادم کی نوبت آئے گی۔ ہر آستانہ اسے جھکنے کے لیے پکارے گا، ہر تخت اس کے سر کو کچل دینا چاہے گا، ہر قانون اس سے اپنی اطاعت کروانے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح کتنے سیاسی لیڈر، کتنے مشیخیت کے دعویدار، کتنے برادریوں کے چودھری اور وڈیرے اسے اپنے رسم ورواج اور طریقوں پر چلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ اگر ان کی بات ماننے سے انکار کرے گا تو یا تو اسے توڑ دیا جائے گا اور یا اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے گا۔

صبر علی الطاعۃ میں دوسری چیز اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ جو شخص ان دونوں اطاعتوں کے سوا ہر اطاعت سے انکار کرتا ہے، اسے کوئی بھی متمدن ملک جس کا اپنا ایک وضعی قانون ہے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ایسے شخص پر یا تو بغاوت کا مقدمہ چلے گا اور یا اسے ملک چھوڑ کر پہاڑوں کی راہ لینی پڑے گی۔ یہ ایک جانکسل مرحلہ ہے، جس سے گزرنا اور ثابت قدمی کا ثبوت دینا سب سے بڑا صبر ہے۔

(۲) ...... صبر عن المعصیات صبر کا اطلاق صبر عن المعصیات پر بھی ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے ایک نفسِ امارہ رکھا ہے جو اسے قدم قدم پر گناہوں کی ترغیب دیتا ہے۔ مزید اس کے اندر خواہشات اور آرزوئیں رکھی ہیں جو ہر وقت اس کے سامنے نئے نئے جال بچھاتی رہتی ہیں۔ کبھی اسے شکم پروری کی دعوت دیتی ہیں، کبھی اسے جنسی مریض بنا دیتی ہیں، کبھی شہرت ونمود کی خاطر اس سے دکھاوے کے کام کرواتی ہیں، کبھی اپنے سر پر کلغی سجانے کے لیے ظلم کے راستے کھولتی ہیں۔ جو شخص اللہ پر ایمان لایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان چکا ہے اس کی خواہشات قدم قدم پر اسے شریعت کی پابندی سے ہٹاتی اور گناہوں پر اکساتی ہیں۔ اس طرح کے تمام بہلاووں اور اکساووں کے مقابلے میں اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزارنا اور کسی خواہش کو خاطر میں نہ لانا، یہ وہ صبر ہے جسے صبر عن المعصیات کہا جاتا ہے۔

(۳) ...... صبر علی المصائب جو شخص بھی ایمان کے تقاضوں اور شریعت کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرے گا یہ ناممکن ہے کہ اسے مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کبھی اسے غربت سے واسطہ پڑے گا، کبھی بیماری سے، کبھی مخالفت کی چند در چند صورتیں اسے ہراساں کرنے کے لیے آگے بڑھیں گی، معاشرے کا ہر فرد اسے نگل جانا چاہے گا، حالات اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتے جائیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں امکان کی حد تک موقفِ حق پر جمے رہنا، دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوۂ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے رکھنا، یہ وہ صبر ہے جو ایک مومن مصیبتوں کے مقابلے میں کرتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ مضبوط کردار جنم لیتا ہے جسے کسی صورت بھی جھکایا نہیں جا سکتا اور یہی ایک مومن کے لیے ہر طرح کے حالات میں سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اسی کے نتیجے میں اللہ کی تائید ونصرت مومن کو نصیب ہوتی ہے۔

Marfat.com

صدق:

ان پانچ صفات میں سے دوسری صفت صدق ہے۔ اس کا معنی تو کسی شے کا مطابقِ واقعہ ہونا ہے۔ اگر ایک شخص ایک ایسی بات کہے جو واقعہ کے خلاف ہو تو ہر شخص کہے گا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن اگر اس کی بات واقعہ کے مطابق ہو تو اسے صدق قرار دیا جائے گا لیکن شریعت کی زبان میں صرف یہی بات کافی نہیں۔ یقیناً یہ بات تو ضروری ہے کہ ایک مومن کبھی خلافِ واقعہ بات نہ کہے۔ غلط فہمی اور بات ہے، جان بوجھ کر ایسا کہنا دروغ گوئی ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو بات کہتا ہے وہ واقعہ کے مطابق تو ہے لیکن اس کے دل کے مطابق نہیں۔ دل میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔ جس طرح قرآنِ کریم میں سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا:

(اے پیغمبر! جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو وہ آپ سے کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں) (المنافقون۔ ۱)

غور فرمایئے! منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول قرار دیا۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جو واقعہ کے مطابق ہے اور اللہ نے بھی اس کی تصدیق فرمائی۔ لیکن اس سچی خبر کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے جھوٹا قرار دیا کہ وہ جو بات کہتے ہیں وہ سچ ہونے کے باوجود ان کے دل کے خیالات کے مطابق نہیں۔ یہ دل میں آپ ؐ کو اللہ کا رسول نہیں سمجھتے، لیکن زبان سے محض منافقانہ اظہار کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ سچ بول کر بھی جھوٹے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سچ کے لیے جس طرح خبر کا مطابقِ واقعہ ہونا ضروری ہے اسی طرح زبان اور دل کا ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ قول اور عمل میں مطابقت بھی لازمی ہے۔ اس میں ظاہر اور باطن کو ہم رنگ ہونا چاہئے۔ کسی بھی نظریے یا حقیقت کے قبول کر لینے کے بعد جو چیز مضبوط سیرت و کردار کو جنم دیتی ہے وہ قول و فعل اور زبان اور دل کی ہم آہنگی ہے۔ اگر ایک شخص زبان سے کچھ اور کہتا ہے اور دل میں کچھ اور ہے تو اس کے اندر منافقانہ کردار پیدا ہوگا۔ لیکن جو شخص دل اور زبان کو ہم رنگ اور ہم آہنگ رکھتا ہے اس کے اندر ایک ایسا کردار پیدا ہوگا جس میں پختگی، صلابت، استقامت، یک رنگی، یکسانی اور شخصیت کی وحدت ہوگی اور یہی وہ کردار ہے جو کسی بھی نظریے کی عظمت کا محافظ ہو سکتا ہے اور اسی سے انسان کے اندر مصائب کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔

قنوت:

قنوت کا معنی عموماً اطاعت کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کی اصل روح اللہ جل شانہ کے لیے تواضع اور تذلل ہے۔ جیسے جیسے دل میں اللہ کی کبریائی، اس کی ہیبت اور عظمت اترتی جاتی ہے اور اس کی نعمتوں کا شعور دل میں جگہ بناتا جاتا ہے ویسے ویسے ایک بندۂ مومن کا دل اپنے اللہ کے سامنے عاجز ہوتا جاتا ہے۔ وہ سرتاپا عجز و انکسار کی تصویر بن کر اس کی عبادت اور اطاعت کرتا ہے پھر اسی کا عکس اس کی چال ڈھال گفتار و کردار، غرضیکہ ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے اندر کبھی غرور اور گھمنڈ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ غرور ہمیشہ بڑائی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور جس دل میں اللہ کی بڑائی اتر جاتی ہے وہاں کسی اور بڑائی کا دخل نہیں ہوتا۔ ایسا شخص جس طرح اللہ کا عاجز بندہ بن جاتا ہے اسی طرح انسانی معاشرے میں بھی اپنی عاجزی اور فروتنی کے باعث لوگوں کے لیے سایۂ رحمت بن جاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اسے اپنا بھائی سمجھ کر اسے اپنے لیے سرمایہ سمجھتا ہے اور ایسے ہی افراد پر مشتمل معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

Marfat.com

انفاق:

اس کا معنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔خرچ کرنے کو تو کافر معاشرے کے لوگ بھی خرچ کرتے ہیں' لیکن ایک مومن کے خرچ کرنے اور ان کے خرچ کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ لوگ شہرت کو حاصل کرنے' اپنے نفس کو موٹا کرنے اور اپنی بڑائی کا صور پھونکنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہوئے بھی ان کے ذہنوں میں ایک منصوبہ بندی ہوتی ہے کہ اس سے ہم نے کیا کیا فوائد حاصل کرنے ہیں۔آج کے مسلمان معاشرے میں بھی یہ ساری خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔لیکن ایک حقیقی مومن جب خرچ کرتا ہے تو وہ فی سبیل النفس نہیں کرتا بلکہ فی سبیل اللہ کرتا ہے۔اس کے خرچ کے جذبہ میں چند جذبات گندھے ہوتے ہیں۔ایک تو یہ جذبہ کہ میں جو مال خرچ کر رہا ہوں' یہ میرا نہیں اللہ کی دین ہے، وہی اس کا حقیقی مالک ہے، میں تو اس مال کا امین ہوں، میں اسے حقداروں تک پہنچا کر دراصل اس امانت کا حق ادا کر رہا ہوں۔ایسا شخص مال خرچ کرتے ہوئے اس کے سوا اپنے ذہن میں کوئی تصور نہیں رکھتا کہ میں اس کے ذریعے اپنے اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہوں۔وہ جب مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے تمہیں مال دیا تھا تم نے اسے کیا کیا؟ تو میں اسی انفاق کو جوابدہی کے لیے بطور دلیل پیش کروں گا۔

دوسرا جذبہ جو اس کے اندر کارفرما ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی نگاہوں میں حقیقی قدر و قیمت ان دنیوی حزف ریزوں کی نہیں ہوتی' بلکہ آخرت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتوں کی ہوتی ہے۔اس کا خرچ کرنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر میری نگاہوں میں ان کی حقیقی قدر و قیمت ہوتی تو میں انہیں بچا کے رکھتا۔میں نے انہیں خرچ کر ڈالا ہے اور اس کے ذریعے اس چیز کو حاصل کر لیا ہے جس کی حقیقی قدر و قیمت میرے دل میں ہے۔

تیسرا جذبہ اس کے اندر یہ کارفرما ہوتا ہے کہ میں جو اللہ کے راستے میں خرچ کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اپنا نقصان کر رہا ہوں کہ میں یہ سوچنے بیٹھ جاؤں کہ آج اگر میں نے اسے خرچ کر ڈالا تو کل جب مجھے ضرورت پڑے گی تو میں اپنی ضرورت کہاں سے پوری کروں گا۔اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ مال میری سعی و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے۔اگر میری محنت اور کوشش اس میں شامل ہے تو اس کی ہمت اور توفیق بھی اللہ نے ہی عطا کی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ اگر محنت اور کوشش سے ہی مال مل سکتا تو دنیا میں ہر مزدور اور محنت کش سب سے زیادہ مالدار ہوتا۔وہ اسے خرچ کرتا ہوا برابر یہ بات ذہن میں رکھتا ہے کہ پہلے بھی یہ مال اللہ نے دیا اور پھر بھی وہی عطا کرے گا۔اس کے ذہن میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مبارک گونجتا رہتا ہے ''بلال خرچ کر اور عرش والے سے تنگی کا شکوہ نہ کر''۔

استغفار:

استغفار' غفر سے ہے جس کا معنی ''ڈھانپنا'' ہوتا ہے۔استغفار سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے الحاح وزاری اور آہ و بکا سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کی لغزشوں اور گناہوں پر پردہ ڈالے۔یہ احساس دراصل اس حیا کا نتیجہ ہے جو ایک مومن کے دل میں اللہ کی بے پایاں نعمتوں کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ میں از سرتا پا جس کی رحمتوں میں ڈوبا ہوا ہوں' میرا وجود جس کا مرہونِ منت ہے' میری زندگی کے امکانات جس کے عطا کردہ ہیں' میرے وجود کی بقا جس کی رحمت کا نتیجہ ہے' میری غذائیں جس کی ربوبیت کا ثمر ہیں' میرے دل و دماغ کی رعنائیاں جس کی بخشش ہیں کیا میں اسی کے سامنے نافرمانیوں اور گناہوں کی سوغات لے کر جاؤں گا۔میں کس طرح اس کا سامنا

Marfat.com

کروں گا اور پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ذات عادل ہے۔ اس کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مجھے گناہوں پر سزا دے۔ کیا میں اس کی سزا کا متحمل ہوسکوں گا؟ جیسے جیسے یہ احساس پختہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برسنے لگتی ہے۔ خوف سے اس کا دل پگھلنے لگتا ہے۔ تو وہ بے تابانہ اللہ کے دربار میں استغفار کے لیے جھک جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ نے دو مزید کرم فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ استغفار کو آخر میں لا کر یہ اشارہ فرمایا ہے کہ تم اللہ سے صبر، صدق، قنوت اور انفاق کی توفیق مانگو اور اگر اللہ یہ توفیق ارزانی فرما دے تو دیکھنا اس پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جانا۔ تم ہزار حسنِ عمل کا سرمایہ پیدا کر لو یہ کبھی نہ سمجھ لینا کہ تمہارا ہر عمل لغزشوں سے مبرا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ خود نیکی کرتے ہوئے تمہارے خیالات میں کہاں کہاں جھول آیا ہے۔ اس لیے ہر حال میں استغفار ہی تمہارا اصل سرمایہ ہے۔ حسنِ عمل کی پونجی تمہاری اصل دولت ہے لیکن اسے قبولیت کی سند صرف استغفار سے نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا کرم یہ فرمایا کہ یہ بھی اشارہ فرما دیا کہ استغفار اور دعاؤں کی قبولیت کا وقت کونسا ہے۔ اسحار کا لفظ لا کر اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ صبح کا وقت جسے تہجد کا وقت کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے سامنے گڑگڑانے کا سب سے موزوں وقت ہے۔ یہی وقت ریا جیسی آفت سے محفوظ کہا جاسکتا ہے، اسی وقت میں دلجمعی نصیب ہوتی ہے۔ یہی وقت نفس کو کچلنے کا سب سے اچھا موقع ہے اور یہی وہ وقت ہے جس میں آیاتِ الٰہی میں تفکر و تدبر کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے جس خوش نصیب کو اس وقت میں استغفار کی دولت نصیب ہوجائے، اسے ہی اصل خوش نصیب کہا جاسکتا ہے۔ ایک اللہ والے نے نہ جانے کس بانکپن میں یہ بات کہی ؎

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(اللہ نے شہادت دی ہے اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور (یہی گواہی دی ہے) فرشتوں نے اور اہلِ علم نے (اور ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) عدل و انصاف کو قائم فرمانے والا ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے وہ غالب اور حکمت والا ہے) (18)

اس سورۃ کے آغاز میں یہی مضمون گزر چکا ہے۔ اب دوبارہ اسی مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے، لیکن ایک شاندار تمہید کے ساتھ بیان فرمایا جارہا ہے۔ پہلے صرف یہ بات بیان فرمائی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور اس کا انداز حاکمانہ اور شاہانہ تھا۔ گویا اپنی مخلوق اور رعایا کو پروردگار اپنی اصل حیثیت کے متعلق آگاہ فرمارہے ہیں اور جب یہ حیثیت ان کے سامنے واضح ہوگئی تو اس کے بعد فرمایا کہ ہم چونکہ معبود اور حاکمِ حقیقی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اپنی مخلوق، اپنی رعایا اور اپنے بندوں کے لیے ایسی کتاب نازل کریں، جو ہمارے فرامین کا مجموعہ ہو جس میں بندوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا گیا ہو اور بندگی کے آداب واضح کیے گئے ہوں۔ لیکن پیشِ نظر آیت کریمہ میں پروردگار نے اس بات کو نسبتاً تفہیم کے انداز میں ایک دلیل کے ساتھ واضح فرمایا اور مزید اپنے تعارف میں ایک صفت کا اضافہ فرمایا۔ جس سے بہت سارے حقیقتیں واشگاف ہوجاتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس آیتِ کریمہ میں پانچ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

Marfat.com

۱ ...... اللہ فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی۔

۲ ...... اس بات پر گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔

۳ ...... اس بات کی گواہی کہ اللہ انصاف اور قسط کو قائم کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔

۴ ...... اس بات کا تکرار کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔

۵ ...... اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم بھی ہے۔

اب ہم اسی ترتیب سے ان باتوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس ترتیب میں اگرچہ گواہی کا ذکر پہلے ہے اور اللہ کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کا ذکر بعد میں ہے' لیکن یہ ترتیب قرآنِ کریم کے اپنے اسلوب کے مطابق ہے۔ ہم اپنی تحریر وتقریر اور مخاطبت میں ہمیشہ اس کے برعکس طریقہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کا اپنی الوہیت میں یکتا ہونا ایک دعویٰ ہے اور اس پر اللہ' فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی دلیل ہے۔ انسانوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دعویٰ پہلے پیش کرتے ہیں' پھر اس کے ثبوت کے لیے دلیل لاتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کا اسلوب جیسا میں نے عرض کیا اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ اسلوب فطرت کے عین مطابق ہے۔ دعویٰ کی حیثیت انسانی دل و دماغ کے لیے اس طرح کی ہے جیسے زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے اور دلیل کی حیثیت ایسے ہے جیسے تخم ریزی سے پہلے زمین کو کاشت کے قابل بنایا جاتا ہے۔ فطری طریقہ یہ ہے کہ زمین کو کاشت کے لیے پہلے تیار کیا جائے اور اس کے بعد تخم ریزی کا عمل شروع ہو کیونکہ اگر زمین کو بیج کے لیے قابلِ قبول بنائے بغیر بیج بکھیر دیا جائے گا تو زمین چونکہ اس کے لیے تیار نہیں ہوگی اس لیے بیج اپنی جگہ نہیں بنا سکے گا اور بیج ضائع ہو جائے گا۔ دعویٰ اور دلیل کے سلسلے میں بھی دل و دماغ کی حیثیت زمین کی ہے۔ ضروری ہے کہ اسے دعویٰ کی قبولیت کے لیے پہلے تیار کیا جائے اور تیاری کے مراحل کو سر کرنا' جس طرح زمین کے سلسلے میں آلاتِ فلاحی کا کام ہے۔ جس میں بلڈوزر بھی ہیں جو زمین کو ہموار کرتے ہیں' جس میں کلہاڑا بھی ہے جو درختوں اور پودوں کو کاٹتا اور اکھاڑتا ہے' جس میں درانتی اور کسّی بھی ہے جو جڑی بوٹیوں کو جڑ سے مارتی ہیں۔ دلیل کو بھی مختلف صورتوں میں استعمال کر کے دل و دماغ کو اس طرح ہموار کیا جاتا ہے کہ وہ دعویٰ کو قبول کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ لیکن اسے پیش کرنے سے پہلے دل و دماغ کو ہموار کرنے کے لیے ایک ایسی دلیل پیش فرمائی گئی ہے جس کے بعد اس کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ دل و دماغ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے۔ یہ دلیل تین دلائل کا مرکب ہے۔ پہلی دلیل ہے اللہ کی گواہی اور دوسری ملائکہ کی اور تیسری اہلِ علم کی۔ جہاں تک اللہ کی گواہی کا تعلق ہے وہ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور کبھی کبھی ہمارے اندر سے بھی جھانکتی ہے اور یہی دونوں چیزیں ہیں' جنہیں دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس کو مآخذ کی حیثیت دیتے ہوئے فرمایا:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ

(ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق اور ان کے نفسوں میں بھی دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ بالکل حق ہے)

Marfat.com

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ

(اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کیلئے اور خود تمہارے نفسوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم یہ بات شدنی ہے جس طرح تم بول دیتے ہو)

اللہ کی گواہی دلائلِ آفاق کی روشنی میں

چنانچہ ہم بھی اسی ترتیب سے پروردگار کے وجود اس کی یکتائیت اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہونے پر استدلال کریں گے۔ یہی طریقہ عہدِ اول میں صحابہ کرام کا تھا اور یہی طریقہ ہر دور میں سلف صالحین کا رہا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے خالق کے وجود کو کیسے جانا؟ فرمایا: شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیسے؟ فرمایا: شہتوت کے پتے کو ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے ختن کا آہو کھاتا ہے تو اس کے ناف سے کستوری نکلتی ہے اور اگر کوئی اور جانور کھاتا ہے تو گوبر کر دیتا ہے۔ شہتوت کے پتے میں کوئی خصوصیت ہوتی تو ہر جگہ اس کا اظہار ایک ہی صورت میں ہوتا۔ یہ اظہار کی مختلف صورتیں اور مختلف چیزوں کا وجود میں آنا خود بولتا ہے کہ شہتوت کے پتے کے پیچھے کوئی ہاتھ کارفرما ہے اور یہ اسی کی کارفرمائیاں ہیں جسے ہم مختلف صورتوں میں دیکھ رہے ہیں۔ پس وہ ہاتھ میرے خالق کا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کو کیسے بلند کیا گیا؟ پہاڑوں کو کیسے میخوں کی طرح گاڑ دیا گیا؟ اور زمین کو کیسے بچھونے کی طرح بچھا دیا گیا؟)

یعنی ایک عرب چاہے وہ مالی لحاظ سے کتنا بھی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ جب آنکھ کھولتا تھا تو اس کی نگاہ ان چار چیزوں پر ضرور پڑتی تھی۔ وہ اونٹ پر سواری کرتا تھا۔ آسمان پر بادل بہت کم آتے تھے اس لئے وہ کھلے آسمان کو ہمیشہ دیکھتا تھا، پہاڑ ہر وقت نظروں کے سامنے گڑے رہتے تھے، زمین پر وہ چلتا پھرتا تھا۔ انہی چار چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے کم سے کم عقل رکھنے والا آدمی بھی ان چار چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ کیا سوچتا نہیں کہ آخر یہ چار چیزیں کیسے وجود میں آئیں؟ اور اگر گہری نظر رکھنے والا اور علم و بصیرت کا حامل آدمی ان چار چیزوں کو دیکھے تو اس کے سامنے علم و دانش کی وہ حیرت انگیز دنیا واشگاف ہوتی ہے کہ سوائے اس آدمی کے جس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یقیناً اس زمین، آسمان، ان پہاڑوں اور اونٹوں کا کوئی خالق ہے، جس نے ان میں ہمارے لئے منفعت کی ایک دنیا بسا دی ہے اور حقائق کا ایک جہاں سمو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے مخلوق پر اس لحاظ سے نظر ڈالی ہے تو وہ اپنے خالق

Marfat.com

پہچانے بغیر نہیں رہ سکا۔ عرب کے ایک بدو سے جب پوچھا گیا کہ تم نے اپنے خالق کو کیسے پہچانا؟ تو اس نے انتہائی سادگی سے کہا کہ ریگستان میں پڑی ہوئی اونٹ کی لید سے۔ سائل نے حیران ہو کر کہا وہ کیسے؟ کہا اونٹ کی لید یقیناً کسی گزرنے والے اونٹ کی خبر دیتی ہے اور اونٹ ریگستان میں بغیر سوار کے نہیں گزرتا اور کوئی سوار اس بدامنی کے دور میں تنہا سفر نہیں کرتا یقیناً کسی قافلے کے ہمراہ گزرتا ہے تو اونٹ کی لید دیکھ کر میں یقین کر لیتا ہوں کہ کوئی قافلہ گزرا ہوگا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر اونٹ کی لید سے میں ایک قافلے کا یقین کر سکتا ہوں تو کیا اس وسیع و عریض کائنات کو دیکھ کر میں اس کے خالق کا یقین نہیں کر سکتا۔ اسی لئے پروردگار نے فرمایا:

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِيٓ اَيِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ

(کس نے تجھے اپنے رب کریم سے غفلت میں ڈالا ہے جس نے تجھے پیدا کیا اور پھر ہر لحاظ سے درست کیا اور پھر جس شکل و صورت میں تجھے چاہا بنا دیا)

اس آیت پر غور فرمایئے! پروردگار انسان کو اس کے وجود کی طرف توجہ دلا کر یہ بتا رہا ہے کہ تم اگر اپنے آپ کو غور سے دیکھو تو یقیناً تمہیں تمہارے ایک ایک ریشے، ایک ایک بال، ایک ایک عضو، ایک ایک احساس، ایک ایک صلاحیت اور استعداد کے پیچھے اپنے خالق و مالک کی قوتِ تخلیق دکھائی دے گی۔ آخر اتنی واضح شہادت کے بعد وہ کون سی چیز ہے جس نے تجھے اپنے اللہ سے غافل کر دیا؟

انسان کا وجود ہی نہیں بلکہ جب آدمی اس کی صلاحیتوں، اس کے دل و دماغ کی قوتوں، اس کے تجسس، شعور اور اعضاء کی مختلف حالتوں پر غور کرتا ہے تو حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ ایک سائنس دان نے اپنی لیبارٹری میں اپنی نواسی کے کان کو دیکھ کر کہا یہ سماعت کا حیرت انگیز پرزہ ایسا ہے جس کی مثال لانے سے انسان عاجز ہے اور پھر سراپا حیرت بن کر کہا جس خالق نے اس کان کو پیدا کیا، کیا وہ خود سنتا نہیں ہوگا؟ پورے جسم کے ایک ایک ریشے پر غور کیا جائے تو حیرت انگیز چیزیں سامنے آتی ہیں بالخصوص ایک انگوٹھے کو دیکھ لیجئے جو کس قدر چھوٹا ہے لیکن اس کے پور پر کھنچے ہوئے خطوط جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی ان میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک انگوٹھے کے خطوط دوسرے انگوٹھے سے کبھی نہیں ملتے۔ اسی وجہ سے انسان کے انگوٹھے کے نشان کو دستاویزات میں قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے۔ انسانی چہرہ جو ایک بڑی محدود جگہ ہے، جس میں آنکھیں ہیں، ناک ہے، منہ ہے، پیشانی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اربوں انسان پیدا ہوئے مگر ایک دوسرے سے ملتی دکھائی نہیں دیتی۔ آپ جب غور کریں گے تو ضرور ایک دوسرے سے فرق محسوس کریں گے۔ اسی لئے یورپ کے فلسفی نے کہا تھا کہ کائنات میں سب سے بڑا معمہ یہ انسان ہے اور اس سے بڑا معمہ اس کا دماغ جو ذہانت، تجسس، شعور، حافظہ، فکر اور خرد کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان اوصاف کا خالق کون ہے؟ جواب یہ ہے، وہ جسے دل نے تو ہمیشہ پہچانا لیکن خرد ضرور اس سے غافل رہی پھر قرآن نے اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے انسانی ضروریات ہی نہیں بلکہ تمام مخلوق کی ضروریات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ خالقِ کائنات صرف خالق ہی نہیں بلکہ تمہاری زندگی کی بقاء کا سروسامان کرنے والا بھی ہے۔ تم اس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتے ہو مگر عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہو حالانکہ انسان اپنے کھانے پر ہی غور کرے تو اسے سوچنا چاہئے کہ یہ آخر کہاں سے آیا؟ انسان اپنی غذا کے لئے دانۂ گندم زمین میں کاشت کر کے اسے دفن کر کے آجاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ دانہ مر جائے

Marfat.com

مگر بجائے مرنے کے اس میں زندگی کی سوئی پھوٹتی ہے جو بڑھتے بڑھتے تنا بنتی ہے، پھر اسے خوشے لگتے ہیں، خوشوں میں دانوں کے موتی بھر دیئے جاتے ہیں، سورج کی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا دیتی ہیں ابر پانی برسا کر کھیتی کی آبیاری کا سامان کرتا ہے، سورج اسے گرمی پہنچاتا ہے، چاند اسے حلاوت دیتا ہے۔ ہوا اسے لوریاں دیتی ہے، زمین اپنی قوت نمو بروئے کار لاتی ہے اور پھر قدرت نہ جانے کیسی کیسی قوتوں کو کام میں لا کر انسان کے لئے غذا فراہم کرتی ہے۔ سائنس دان کہتا ہے کہ نائیٹروجن حیوانی و نباتاتی حیات کا لازمی جزو ہے۔ یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے۔ اول خوردبینی اجرام یا بیکٹیریا کے ذریعے جو زمین کی بالائی تہہ میں رہتے ہیں اور کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رس خارج کرتے ہیں جن میں نائیٹروجن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نصف چھٹانک زمین میں ان کی تعداد ایک کھرب، پینتیس ارب کے قریب ہوتی ہے اور زمین کے ہر ایکڑ میں ان کا کام بارہ آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اگر 100 ایکڑ کھیت میں 10 کسان ہل چلا رہے ہیں تو 1200 مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔ غور فرمایئے! اس غذا کو مہیا کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں انسان کا حصہ کتنا ہے اور اللہ کا کتنا؟ پروردگار فرماتے ہیں:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

(کیا تم نے اپنی کھیتی پر کبھی غور کیا زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم؟)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ

(انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے (کہ کہاں سے آئی) ہم نے مینہ برسا کر زمین کا سینہ چیرا، اس سے غلے، انگور، ترکاری، زیتون، کھجوریں، گھنے باغ، میوے اور چارہ پیدا کیا۔ یہ سب تمہارا اور تمہارے مویشیوں کا متاعِ حیات ہے)

اس کو اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں نظم کیا:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

Marfat.com

انسان کی دوسری فوری اور ناگزیر ضرورت پانی ہے۔ آدمی پانی کی حقیقت پر غور کرے اور پھر اس کے فوائد کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ کی قدرت نمایاں نظر آتی ہے۔ جس کے آئینے میں انسان اپنے پروردگار کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر فراخی اور وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پانی کے خزانے پیدا فرمائے اور زمین کی تخلیق کے ساتھ جب پانی کو پیدا فرمایا گیا تو کس طرح قیامت تک کی مخلوقات کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا' نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے لیکن آج تک پانی کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر چونکہ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے انسان کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا اس لئے ہوا کے بعد اس کے ناپیدا کنار سمندر پیدا فرمائے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پانی کا پہنچنا آسان نہیں کیا گیا۔ کہیں سمندروں کو پیدا کیا گیا، کہیں چشمے جاری کر دیئے گئے اور پھر ساتھ ساتھ یہ انتظام فرمایا کہ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جما کر گرمیوں میں اسے پگھلا کر زمین کی آبیاری کا سامان کیا گیا اور پھر ایک ایسا حیرت انگیز انتظام دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر بادلوں کی چادریں بچھائی جاتی ہیں اور انہیں اس طرح برسایا جاتا ہے کہ زمین کا ایک ایک گوشہ اس سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ سارا پانی زمین میں جذب ہو جائے اور زمین دلدل بن جائے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ سارا پانی بہہ جائے اور ندی نالوں میں پہنچ جائے اور زمین مناسب آبیاری سے محروم رہ جائے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کے مطابق ہم پانی زمین میں جذب کرتے ہیں جہاں مزید ضرورت ہوتی ہے اس کو روک دیتے ہیں اور باقی پانی ہم ندی نالوں اور جدولوں کی شکل میں واپس دریاؤں سمندروں میں لے جاتے ہیں اور پھر پانی کے اوصاف کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی یاد آنے لگتی ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1۔ پانی کو سیال پیدا کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے پیاس بجھتی نہ کپڑے صاف ہوتے اور نہ کھیتیاں سیراب ہوتیں۔

2۔ جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے جس سے نیچے کا پانی متاثر ہوتا اور غیر منجمد رہتا ہے۔ اگر سردیوں میں سارا پانی جم جاتا تو تمام مچھلیاں اور پانی کے دیگر جانور مر جاتے۔

3۔ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے یہ پانی کی سطح پر رہ کر نیچے کے پانی کو انجماد سے بچاتی ہے۔

4۔ اگر سمندر منجمد ہوتے تو دنیا سردی سے ہلاک ہو جاتی۔ اگر ابل رہے ہوتے تو گرمی سے مر جاتی۔ اس کا اعتدال ہی بقائے حیات کا باعث ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نباتات کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے ۔ درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ سبزے کی چادریں بچھی ہوئی ہیں، فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ لیکن کبھی ہم نے نباتات کے اعجاز پر غور نہیں کیا کہ یہ نباتات صرف کائنات کا حسن ہی نہیں یہ ہمارے لئے مدارِ حیات بھی ہیں۔ یہ غلہ اور پھل جو ہم کھاتے ہیں، یہ کپڑے جو ہم پہنتے ہیں، یہ چائے، کافی اور شربت جو ہم پیتے ہیں، سب نباتات سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ربڑ، یہ کاغذ، یہ کوئلہ، یہ تیل، یہ صابن، سب نباتات کا کرشمہ ہے۔ ہماری یہ الماری میں سجی ہوئی کتابیں، وہ جنگل ہیں جنہیں مزدور کاٹ کر کاغذ کے کارخانوں تک لے گئے تھے۔ پھولوں کے ننھے پودے سے لیکر چنار کے درخت تک آپ کو نباتات کی کروڑوں اقسام نظر آئیں گی۔ ان میں سے کچھ باغوں کی آرائش ہیں، کچھ ہماری غذا ہیں اور کچھ متاعِ حیات۔ یہ سب ایک ہی زمین سے اگتی ہیں اور ایک ہی پانی سے نشوونما پاتی ہیں۔ لیکن کمال تخلیق دیکھئے کہ سب کی حیثیت، رنگ، قامت، تاثیر، بو اور ذائقہ الگ ہے۔

Marfat.com

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

(زمین میں پاس پاس ایسے قطعات ہیں جن میں کہیں کھیتی، کہیں انگور اور کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ان میں سے کچھ ایک جڑ سے نکلتے ہیں اور کچھ الگ الگ جڑوں سے۔ان سب کی پرورش ایک ہی پانی سے ہوتی ہے لیکن ان کے ذائقے الگ الگ ہیں۔ان باتوں میں اربابِ دانش کیلئے کتنے ہی اسباب وشواہد موجود ہیں)

درخت اپنے پتوں کا دامن ہوا اور سورج کے سامنے پھیلا کر ان سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ان کی جڑیں بطنِ زمین سے پانی اور غذا لے کر بلند شاخوں تک پہنچاتی ہیں اور پھلوں میں رس، مٹھاس اور خوشبو بھرتی ہیں۔کیا یہ سب کچھ اتفاقاً ہو رہا ہے اور اس انتظام کے پیچھے ایک ہمہ بین آنکھ اور ہمہ دان دانش کارفرما نہیں؟ کیا یہ ایک اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی شہادت نہیں؟

دلیلِ توافق

کائنات کا مطالعہ ہمارے سامنے نصیحت و عبرت اور علم و دانش کے عجیب و غریب ابواب کھول دیتا ہے کہ ان میں سے ہر باب اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی یکتائیت، اس کے مدبر اعلیٰ اور ہمہ مقتدر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے ان میں سے بعض مخلوقات ایسی ہیں کہ ان میں ضدین کا تعلق پایا جاتا ہے۔قرآنِ کریم خود کہتا ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ

(ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے)

ان میں باہمی نسبت سازگاری کی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کی ہے۔باایں ہمہ ان کے درمیان ہمیں حیرت انگیز توافق اور سازگاری نظر آتی ہے۔بجائے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور الجھنے کے، ایک دوسرے کے وجود کی حفاظت اور مقصدِ تخلیق کی تکمیل میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بالکل بے معنی دکھائی دیتا ہے۔خود انسان کو دیکھئے اس کو مرد اور عورت کے دو انواع میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور پھر دونوں کو الگ الگ طبعی خصوصیات، جبلی صفات اور اندرونی احساسات کا اختلاف دے کر بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ شخصیتیں بنا دیا مگر دونوں میں ایک دوسرے کی کشش اور ایک دوسرے کی تکمیل کی فکر اس طرح دلوں میں راسخ کر دی گئی کہ مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کیلئے مطلوب و مرغوب بنا دیا گیا ہے اور عورت کے پاس جو کچھ ہے اسے مرد کے تقاضوں کا جواب ٹھہرایا گیا ہے۔اس طرح باہم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہو گئے ہیں۔یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کی طرح ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں مگر باہم شدید اتصال بھی رکھتے ہیں۔حتیٰ کہ ایک کا دوسرے کے بغیر وجود بے مقصد معلوم ہوتا ہے توافق کا یہ قانون ہم صرف ضدین میں ہی نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے۔

Marfat.com

ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشو ونما کیلئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کیلئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا ہی لے لیجئے یہ اپنے وجود میں کمال کو نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ زمین اس کیلئے گہوارے کا کام نہ دے۔ سورج اس کیلئے سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کے فضا میں ابر کی چادریں پھیلا کر اس کیلئے آبیاری کا سامان نہ کرے۔ موسم اس کے لئے نگرانی کا فرض انجام نہ دے۔ چاند اس کو ٹھنڈک نہ پہنچائے، سورج اس کیلئے گرمی مہیا نہ کرے اور ہوائیں اس کو لوریاں نہ دیں، یہ سارے عناصر باہم مل جل کر سرگرم کار رہتے ہیں تب جا کر گندم کا ایک پودا اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے اور گیہوں کا ایک دانہ تیار ہو کر خرمن تک پہنچنے کے قابل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف جگہ بیان فرمایا۔ سوۂ بقرۃ کی آیت نمبر 21 اور 22 میں فرمایا گیا:

(اے لوگو بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی کرو جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس نے تمہاری روزی کیلئے پھل پیدا کئے تو تم اللہ کا ہمسر نہ بناؤ درآں حالانکہ تم جانتے ہو)

سورۂ نحل کی آیت نمبر 65 تا 69 میں کائنات کی ہم آہنگی کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا:

(اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں اور بے شک تمہارے چوپایوں میں بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار' اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں پر اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں ان میں چھتے بنا پھر ہر قسم کے پھلوں، پھولوں سے رس چوس، پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے۔ جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کیلئے جو غور کرتے ہیں)

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں ان سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کیلئے نہائیت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے اور پھر اسی بارش کے پرورش کئے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں، پر درختوں کی شاخوں پر اور انگوروں کی ٹٹیوں میں اپنا چھتہ بنالیتی ہیں۔ پھول پھول کے رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں۔ جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان ان کو پالتا ہے، ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ بینا سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک حادثے کی طرح ظہور میں آ گئے ہیں۔

Marfat.com

سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ آغاز تخلیق میں جب زمین آفتاب سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے یعنی 12000 بارہ ہزار فارن ہائیٹ ۔ جب یہ حرارت کم ہوتے ہوتے 4000 فارن ہائیٹ ہوگئی تو آکسیجن کی ایک خاص مقدار ہائیڈروجن کی طرف بھاگی اور پانی تیار ہوگیا۔ ان گیسوں کی مختلف مقادیر سے کروڑوں مرکبات تیار ہو سکتے ہیں ۔لیکن پانی ان کی صرف ایک ترکیب تقریباً دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے بنتا ہے اور باقی تمام مرکبات زہر ہوتے ہیں سوال یہ ہے کہ اوزان ومقادیر کا یہ تعین خود بخود ہوگیا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کیمسٹ کی دکان میں مفردادویہ ازخود ایک دوسرے سے ملکر مرکب بن جائیں یا لکڑی کے تختے کشتی کی صورت اختیار کر لیں۔

زمین کے سلسلہ میں اس پر غور فرمائیں کہ یہ زمین کہاں سے آئی؟ ماہرینِ ارض نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ آج سے ہزارہا صدیاں پہلے ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے کٹ کر خلا میں گھومنے لگے ان میں سے ایک زمین تھی۔ ان ٹکڑوں کو قریب کے ستاروں نے کھینچ کر متوازن کر دیا۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد جو 365 دن لیتی ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج دو ارب صدیاں گزر چکی ہیں ۔لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ ورنہ علمائے ہیئت کے تمام حساب غلط ہو جاتے۔ اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68000 میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔ اگر اس کی پہلی رفتار کو دس گنا کم کر دیا جائے تو شب وروز دس گنا لمبے ہو جائیں گے۔ جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا اور جنوری کی اتنی ہی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا اور جب یہ رفتار 16200 میل فی گھنٹہ تک پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرادے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

زمین کا وزن پانچ ارب بلین ٹن ہے اگر آدھا ہوتا تو کششِ ثقل نصف رہ جاتی اور اشیاء کا وزن آدھا ہو جاتا اگر یہ وزن دوگنا ہوتا تو ہر چیز کا وزن ڈبل ہو جاتا۔

زمین سورج سے تقریباً 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہوتا تو ہم گرمی سے مرجاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مرجاتے۔ کرۂ زمین کا رخ آفتاب کی طرف بالکل سیدھا نہیں بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی، گرمی، بہار اور برسات کے مناظر، غذاؤں اور پھلوں سے محروم رہ جاتے۔

آغازِ آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو دو گیسیں یعنی نائٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہوگئیں۔ نائٹروجن کی مقدار 78.3 تھی اور آکسیجن کی 20.99- آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے۔ اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی تو آسمانی بجلی کے ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار سے نصف ہوتی تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔ کرۂ میں ذرات گرد آبی بخارات اور گیسوں کی وجہ سے کچھ کثافت ہو جاتی ہے ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو لاتعداد شہاب جو کثیف ہوا کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ہم پر اتنے شرر اور پتھر برساتے کہ زندگی ختم ہو جاتی۔

Marfat.com

سمندر کے پاس ہوا کا دباؤ 15 پاؤنڈ فی انچ ہوتا ہے اور ہزار فٹ کی بلندی پر تقریباً ساڑھے چودہ پاؤنڈ فی انچ۔ انسان کے کندھے اندازاً 10 مربع انچ جگہ گھیرتے ہیں۔ ان پر ہوا کا دباؤ 1160 پاؤنڈ یعنی ساڑھے چودہ من ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اس بوجھ کے نیچے پس کیوں نہیں جاتا؟ جواب یہ ہے کہ اس حکیم مطلق اور عقل کل نے ہوا اور پانی دونوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ ان کا دباؤ ہر سمت سے ہر سمت کو ہوتا ہے یعنی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر۔ اسلئے بوجھ کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ صورتحال اس امر کا نہائیت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم اور اس کا قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم وقدرت اور ربوبیت وحکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم وحکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط واتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی شہادت بھی مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین وآسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک ومتصرف ہے کوئی دوسرا اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان اور زمین کے الگ الگ ناظم ومدبر ہوتے یا خیر وشر اور نور وظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف افراد میں یہ توافق اور یہ ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشے میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

انگلستان کے ایک سائنسدان جارج ارس ڈیوس کہتے ہیں کہ میں مدت سے کائنات کے پیچیدہ نظام کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک ذرے سے لے آفتاب تک ہر جگہ ایک حیرت انگیز نظم ونسق پایا جاتا ہے۔ روشنی کی ہر شعاع، قطرۂ شبنم کی ہر لرزش اور ہر فطری کیمیائی تغیر پابند آئین ہے۔ یہ امر ناقابلِ تصور ہے کہ یہ نظم وضبط اور یہ ترتیب کسی ناظم کے بغیر خود بخود وجود میں کیسے آ گئی؟

خلاصہ بحث اور نتیجہ

مختصر یہ کہ کائنات کے مطالعہ کے نتیجے میں غور وفکر اور تحقیق کا قدم جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے آدمی کے سامنے عجیب وغریب حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ کہیں وہ مخلوق کے آئینے میں خالق کو دیکھتا ہے تو کہیں اس کائنات کا حسن اس کے جمال کو آشکارا کرتا ہے۔ کہیں عناصر میں باہمی توافق اور پاسداری اللہ کی بے پناہ قوت کا یقین دلاتی ہے تو کہیں ضد سے ضد کا وجود اسے حیرت میں ڈال دیتا ہے کہیں مظاہرِ کائنات کی تسخیر ایک ہمہ مقتدر ذات کا یقین دلاتی ہے تو کہیں کائنات کی محکم تدبیر اور حیرت انگیز نظم وترتیب ایک مدبر اعلیٰ کا اذعان پیدا کرتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان بالآخر یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کائنات کا حاکم ایک ہے اس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ اس کی حاکمیت میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں کیونکہ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی اجتماعی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے۔ جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کر دیں۔ اب غور کیجئے! یہ دنیا بے شمار اجزا پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت واستحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر وشر کے معرکے بھی ہیں، لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی، سنبھلتی، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلتی جارہی ہے اور اس خوبی اور صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے کیا مشرکین کا یہ عقیدہ کہ آسمان وزمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو زمینوں کا بھی خدا ہے اور آسمانوں کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور وظلمت کے الگ الگ الہٰ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی وتاریکی دونوں کو نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار

Marfat.com

دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے؟ یا یہ نظر آتی ہے کہ اس نظام کا ناظم و مدبر صرف اللہ واحد القہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا؟ یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت وانتشار کے ساتھ یہ وحدت کیونکر قائم ہے؟ یہی وہ شہادت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی تھیں۔

اللہ کی گواہی دلائل انفس کے نتیجے میں

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آدمی کے اندر کی دنیا، اس کے باطن کا شعور، اس کی طبیعت کا اقتضا اور اس کی تخلیق کا جوہر، انسان کو یہ بات ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ تمہارا کوئی نہ کوئی خدا ہے اور وہ صرف ایک ہے اور یہی وہ فطری طلب ہے جو انسان کو بعض دفعہ مختلف آستانوں پر جھکنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی وہ جستجو ہے جس کا سراغ کبھی وہ مظاہرِ فطرت میں لگاتا ہے اور کبھی مظاہرِ قدرت میں۔ یہی چیز کبھی محبت بن کر جھلکتی ہے اور کبھی عقیدت و عبدیت بن کر آشکارا ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر کی بے چینی اور بے تابی اس وقت تک سکون پذیر نہیں ہوتی جب تک وہ اپنے حقیقی مالک کے آستانے کو تلاش نہیں کر لیتا۔ اس کے اندر شکر کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے احسان مندی کا جذبہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کی تنہائیاں کسی محبوب کے تصور سے آباد ہونے کیلئے بے قرار رہتی ہیں۔ مختلف قوتوں کا پیدا کردہ خوف اسے کسی آغوش کی جستجو پر مجبور کرتا ہے اور اسے اس وقت تک قرار نہیں آتا جب تک یہ حقیقی آغوش اسے میسر نہیں آجاتی۔ شرک کی مختلف صورتوں نے انسان کے لئے عقیدت و محبت کے مختلف پیکر اور عبادت و عبودیت کے مختلف آستانے ضرور تراشے لیکن انسان کو حقیقی سکون صرف اس وقت ملا جب اسے احکم الحاکمین کا آستانہ مل گیا۔ جس طرح نمبروں والے تالے کے مختلف نمبر گم جائیں تو انسان ان نمبروں کی تلاش میں رہتا ہے بالآخر وہ نمبر جو کھولنے کی ضمانت ہیں وہ مل جائیں تو یہ بند تالا کھل جاتا ہے۔ یہی حال انسان کے قلب و ضمیر کے قفل کا ہے کہ انسان مختلف تجاویز آزماتا ہے مگر یہ قفل کھلنے میں نہیں آتا یہ اس وقت کھلتا ہے جب وہ اپنے خالق و مالک کو پالیتا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ اس پر شاہد و عادل ہے کہ لوگوں نے شرک کی ہزاروں صورتیں اختیار کیں لیکن انہیں سکون کی دنیا صرف توحید کے دامن میں نصیب ہوئی۔ اس لئے پروردگار فرماتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِکۡرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡب

(جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کی یاد سے ہی سکون پاتے ہیں، خبردار! اللہ کا ذکر ہی دلوں کے سکون کا باعث ہے)

یہ وہ شہادت ہے جو کائنات کا ایک ایک ذرہ دے رہا ہے اور جسے ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں، کانوں سے بھی سنتے ہیں، حواس سے محسوس بھی کرتے ہیں، عقل سے ادراک بھی کرتے ہیں اور ہمارا باطن بھی جس طرح آپ پڑھ چکے ان باتوں کا ادراک کرتا ہے اور گواہی بھی دیتا ہے۔

Marfat.com

اہلِ علم کی گواہی

یہی وہ گواہی ہے جو ہمارے وہ اہلِ علم بھی دیتے ہیں جو انبیاءِ کرام کے علم کے وارث ہیں، جو کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں اور اللہ کے دین کو سمجھتے ہیں اور وہ اہلِ علم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں جنہوں نے کائنات کا مطالعہ بغیر کسی ذہنی عصبیت اور تحفظ کے کیا ہے۔ وہ اللہ کی الوہیت اور اس کی وحدانیت کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں جس کی طرف اللہ کی کتاب رہنمائی کرتی ہے اور جس کے بعض حوالے آپ سابقہ گزارشات میں پڑھ بھی چکے ہیں۔

ملائکہ کی گواہی

اسی بات کی گواہی ملائکہ بھی دیتے ہیں۔ جس شخص کو اللہ کے دین اور اس کے رسول کی صداقت پر یقین ہے وہ اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ اللہ کی شریعت پیغمبروں پر فرشتوں کے واسطے سے نازل ہوتی ہے اور وہ اس بات کا بھی یقین رکھتا ہے کہ قضا وقدر کے فیصلے فرشتوں ہی کے واسطے سے عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کائنات کے ایک ایک گوشے میں ملائکہ ہی کی معرفت نافذ اور جاری وساری کیے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ملائکہ اللہ کے کارپرداز اور کائنات کے نظام کو چلانے والے ہیں۔ ان سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک وحدہ لاشریک ہے۔ اسی کے احکام ہیں جن کی تعمیل میں وہ شب وروز لگے رہتے ہیں۔ ان کا ہر وقت آمادۂ اطاعت رہنا اور کائنات کے نظام کو چلانے میں مصروفِ عمل رہنا یہ وہ گواہی ہے جو وہ ہر وقت ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سمجھا ہے قائم بالقسط ہونے کی گواہی

کائنات کا ذرہ ذرہ اور وقت کا لمحہ لمحہ جس طرح پروردگارِ عالم کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہے اسی طرح وہ اس کے قائم بالقسط ہونے کی بھی گواہی دیتا ہے۔ قائما بالقسط ترکیب کے اعتبار سے حال واقع ہوا ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک اس ترکیب کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ لفظ اللہ ذوالحال ہے اور یہ اس سے حال ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ھوَ ضمیر اسکا ذوالحال ہے اور یہ حال ہو کر معناً اس کی صفت ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ یہ انه کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ بعد کی دونوں صورتوں کے حوالے سے قائما بالقسط مشھود به ہوگا۔ یعنی اللہ اس کے فرشتے اور اہلِ علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی الوہیت میں یکتا ہے اسی طرح وہ انصاف کو قائم کرنے والا اور انصاف کو قائم رکھنے والا ہے۔ یہاں قسط کا معنی عدل وانصاف ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ ہر چیز کو جس طرح اس کو پیدا کرنے والے نے پیدا فرمایا، اس کی فطرت بنائی، اس کے خواص مقرر کیے، اس کے حدود وقیود کا تعین فرمایا، وہ چاہتا ہے کہ وہ چیز اپنی فطرت کے مطابق اور اپنی حدود وقیود میں رہ کر کام کرے۔ جب بھی وہ چیز اپنی فطرت اور نقطۂ اعتدال سے انحراف کرتی ہے تو وہیں سے ظلم، بگاڑ یا بدصورتی کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ عدل وقسط کی ٹھیک ٹھیک بقا کو میزان کہا گیا ہے۔ پروردگار نے اپنی تمام مخلوقات میں ایک میزان رکھی ہے اور اپنے نظام تکوین میں اس بات کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ اس کی کوئی مخلوق اس میزان سے سرتابی کرے۔ سورج اور چاند کا اپنے محور میں گردش کرنا اور کائنات کے ایک ایک کرے کا اپنے مدار میں محوِ پرواز رہنا اور جن اصولوں میں اس کی بقا رکھی ہے ان کی پاسداری کرنا یہ وہ میزان ہے جس نے

Marfat.com

کائنات کے پورے نظام کو کامیابی کے ساتھ روبعمل رہنے اور ہر طرح کے خلل سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ زمین و آسمان کے کسی گوشے میں بھی آپ نظر ڈال کر دیکھ لیجئے کہیں بھی اس نظام میں شکست و ریخت نہیں دیکھیں گے۔ آپ اسے کششِ ثقل کا نظام کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے لیجئے' اس کی مخالفت کرنا' کسی کرے کے بس میں نہیں اور یہی اس کی بقا کا راز ہے۔ انسانوں کی زندگی کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھنے کا بھی اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس لیے پروردگار نے جہاں کائنات کی دوسری اشیاء میں میزان کا ذکر فرمایا وہیں انسانوں کو بھی حکم دیا کہ کائنات کا پورا نظام اسی میزان کی وجہ سے ٹھیک نہج پر چل رہا ہے۔ تم بھی اگر زندگی کو الجھنوں اور دشواریوں سے بچانا چاہتے ہو تو میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو۔ چنانچہ سورۂ رحمان میں ارشاد فرمایا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝

(سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں ۝ ستارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں ۝ اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی ۝ کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو ۝ بلکہ وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو)　(الرحمن : ۵ تا ۹)

جس طرح اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے عمل اور مخلوقات کی عملی سرگرمیوں میں تکوینی طور پر ایک میزان رکھی ہے اسی طرح مخلوقات کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی ایک توازن اور ایک عدل و انصاف رکھا ہے۔ اس کا سورج چمکتا ہے تو اس کی روشنی اور دھوپ سے ہر مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ جس طرح بادشاہ کے محل میں وہ روشنی دیتا ہے اس طرح غریب کا جھونپڑا بھی اس کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ اللہ نے اگر زمین میں قوتِ روئیدگی رکھی ہے تو جس طرح ایک جاگیردار اور وڈیرے کی زمین غلہ اگاتی ہے اسی طرح ایک غریب اور شودر بھی اپنی زمین میں جو کچھ کاشت کرتا ہے زمین اس کو اگانے میں کبھی تامل نہیں کرتی۔ اس کا چاند جس طرح راجا کے گھر میں خوشیاں بکھیرتا ہے اسی طرح پرجا بھی اسی سے شادکام ہوتی ہے اور انسانی اعمال میں بھی اس کا یہی عدل و قسط کارفرما ہے۔ نیکی پر جزا دے گا اور برائی پر سزا دے گا۔ اپنے اسی عدل و قسط کے حوالے سے ارشاد فرماتا ہے افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون (کیا ہم فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو برابر کر دیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟)

اس کے بعد اپنے دعویٰ کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو پھر یاد رکھو جو اس معبود اور حاکمِ حقیقی کو تسلیم کرنے سے انکار کرے گا یا اس کی بندگی سے انحراف کرے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ صرف معبود ہی نہیں' عزیز یعنی غالب اور قوت والا بھی ہے۔ وہ جب چاہے پکڑ سکتا ہے اور سزا دے سکتا ہے۔ البتہ تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ عموماً وہ پکڑنے میں تاخیر کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ تاخیر اس قدر طویل ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہمیں پکڑنے والا کوئی نہیں۔ فرمایا یاد رکھو! پکڑنے میں تعجیل اور جلدی کمزور حکمران کیا کرتا ہے' لیکن وہ غالب اور قوت والا حکمران جس کی پکڑ سے بچ کر کوئی نکل سکتا ہو' گرفت میں جلدی نہیں کرتا۔ اللہ بھی چونکہ غالب ہے' وہ جلد باز نہیں بلکہ وہ حکیم ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نافرمانوں کو

Marfat.com

مہلت دے۔ تم بعض دفعہ اس کی مہلت کو تاخیر کا نام دیتے ہو اور یا یہ سمجھ بیٹھتے ہو کہ شاید گرفت کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر گرفت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو قوموں پر عذاب کبھی نہ آتے اور قیامت کے دن کا آنا کبھی یقینی نہ ہوتا۔ جس کسی کو مہلت ملی ہے اسے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے' یہ اللہ کی رحمت ہے۔ اگر وہ ہر غلطی پر پکڑنے لگتا تو کوئی ذی روح زندہ نہ رہتا۔ لیکن اس کی مہلت سے بے فکر بھی نہیں ہونا چاہیے ؎

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ ھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ ۭ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ○

(بے شک اصل دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آ جانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے کیا۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے) (۱۹)

دین کا مفہوم

دین درحقیقت ضابطۂ حیات' طرزِ زندگی اور آئین کو کہتے ہیں۔ ہر مہذب اور متمدن قوم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے ایک آئین بناتی اور ایک طرزِ حیات اختیار کرتی ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ قوم کی شیرازہ بندی ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی ادارے وجود میں آ سکتے ہیں اور اگر وجود میں آ بھی جائیں تو اپنے مقاصد بروئے کار نہیں لا سکتے۔ اس لیے ہر دور کا یہ ایک اہم سوال رہا ہے کہ یہ ضابطۂ حیات اور طرزِ زندگی کس طرح وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ بادشاہوں نے اپنی مرضی اور اپنی پسند کو آئین کی بنیاد قرار دیا اور انہوں نے اپنے مطلب کا دین بنایا۔ اکبر کا دینِ اکبری مشہور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی من مرضی کا ایک ضابطۂ حیات اپنے رعایا پر نافذ کرنا چاہتا تھا۔ جب سے جمہوریت متعارف ہوئی ہے تو دنیا نے پارلیمنٹ کو آئین اور ضابطۂ حیات بنانے کا اختیار سونپ دیا ہے اور اس سے گمان یہ کیا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے ارکانِ پارلیمنٹ پوری قوم کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا وضع کردہ آئین پوری قوم کی پسند ہوتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین مقرر کرنے اور وضع کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا بلکہ اپنے پاس رکھا ہے۔ انسان کی متمدن زندگی، معلوم ہوتا ہے نوح علیہ السلام سے کچھ پہلے شروع ہوئی۔ اس لئے قرآنِ کریم سب سے پہلے دین کے حوالے سے نوح علیہ السلام کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو دین اور آئین ہم نے نوح علیہ السلام کو دیا تھا وہی بعد میں تاریخِ انسانی کے بڑے بڑے انبیاء کرام کو دیا گیا اور اسی کی وارث امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ السلام کو بنایا گیا اور یہی دین تمام امتوں کا دین رہا اور اس دین کا نام ہر دور میں اسلام ہی تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دین کا مفہوم کیا ہے؟ میں نے اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے مستعار لے کر آئین کیا ہے۔ آئین اور دستور' ضابطۂ حیات اور طرزِ زندگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اسی سے کسی بھی قوم کی جہت منزل اور نہج کا تعین ہوتا ہے۔ اسی کی روشنی

Marfat.com

میں بائی لاز بنتے اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اداروں کے قواعد وضوابط وجود میں آتے ہیں۔ آئین میں چند اصولی دفعات طے کردی جاتی ہیں اور اس کی روشنی میں اجتماعی زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ چنانچہ پروردگار نے بھی ہر دور میں جو بنیادی تصورات' عقائد اور بڑے بڑے احکام دیئے وہ تمام امتوں میں یکساں ہیں۔ توحید' رسالت اور آخرت میں کبھی بھی اختلاف نہ رہا۔ عبادت کے طریقے بدلتے رہے' لیکن عبادت ہر امت پر لازم رہی۔ حلال وحرام میں تبدیلی آئی' لیکن تحلیل وتحریم کے تصور میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ یہ اصلاً دین کے بنیادی تصورات ہیں اور ہر دور کا دین انہی پر مشتمل رہا۔ البتہ احکام کی شکلیں مختلف رہیں۔ اس کو قرآن کی زبان میں شریعت یا منہاج کہا گیا۔ نماز' زکوۃ' روزہ اور حج بطورِ عبادت کے سب کے لیے مشروع ٹھہرے' لیکن ان کی شکل وصورت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مشترک چیز دین کہلائی اور جن چیزوں میں اختلاف ہوا ان کا تعلق شریعت سے رہا۔ لیکن ہر دور میں' ہر امت پر زندگی گزارنے کے لیے جو طریقہ کھولا گیا اور جو احکام نازل کیے گئے وہی ہر امت کا دین تھا۔ حتیٰ کہ انسانیت کے ارتقاء کی تکمیل پر جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تکمیلی شان عطا فرمائی۔ پہلے انبیاء پر جیسا کہ میں نے عرض کیا جو کچھ نازل ہوا وہ ان کا دین تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلی شان میں جو کچھ نازل کیا گیا وہ قیامت تک بننے والی امت مسلمہ کا دین ہے۔

اسلام کا مفہوم

دوسری بات جو اس میں ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح دین مقرر کرنا اللہ کی صفت اور اس کا اختیار ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے ایک نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات وضع کرے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جو طرزِ زندگی اور ضابطۂ حیات عطا کرے' اس کے بندوں کے لیے لازم ہے کہ وہ بسر وچشم اس کو قبول کریں۔ وہ اگر اللہ کو اپنا مالک ومحبوب تسلیم کرتے ہیں تو پھر ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی بندگی اور غلامی میں دے دیں اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کریں بلکہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت بھیجی ہے اسی کی بلاکم وکاست پیروی کریں۔ اللہ کو مالک ومعبود سمجھنا اور اس کے نازل کردہ دین کی غیر مشروط پیروی کرنا یہ وہ طرزِ فکر وعمل ہے جس کا نام ''اسلام'' ہے۔ اسلام کا معنی اپنے آپ کو سپرد کردینا ہے اور یہ خود سپردگی فکر وعمل کے ہر دائرے میں مطلوب ہے۔ جس طرح ایک بندۂ خدا کی تنہائیاں اللہ کے سامنے مناجات میں گزرتی ہیں۔ اسی طرح اس کے گھر کی زندگی سے لے کر پارلیمنٹ کی زندگی تک کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اللہ کی بندگی سے آزاد ہو۔ ان تمام شعبوں کو اللہ کے احکام کے تابع کردینا یہ وہ طرزِ عمل ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے اسی کا نام دینِ اسلام ہے اور اللہ کے نزدیک یہی دین یعنی یہی طرزِ عمل پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ جو آدمی جو قوم خود اپنے لیے ایک ضابطۂ حیات اور طرزِ زندگی وضع کرتی ہے وہ اسلام کے دائرے سے نکل جاتی ہے۔ اسی طرح جو فرد یا قوم اللہ کے دین کو مان کر اس میں پیوندکاری کرنے لگتی ہے یا اس پر عمل کرنے میں حیل وحجت کرتی ہے یا انکار کے راستے پر چل نکلتی ہے تو اس نے دین اسلام بجائے اپنے نفس کا دین اختیار کرلیا اب اس کا مطاع اللہ یا اس کا دین نہیں بلکہ اس کا نفس بن جاتا ہے اور اگر وہ یہ حق پارلیمنٹ کو دے دیتی ہے پھر اس کی خدا پارلیمنٹ بن جاتی ہے اور وہ پارلیمنٹ کی مرضی کو اپنا دین بنالیتی ہے اور اس طرح وہ اللہ کے دین سے کٹ جاتی ہے۔

Marfat.com

اسی تناظر میں اگلی بات ارشاد فرمائی کہ اہلِ کتاب جن کے پاس اللہ کی کتابیں موجود ہیں اور جس طرح امت مسلمہ کے پاس کتاب اللہ کی شکل میں دین موجود ہے ان کے پاس بھی دین موجود ہے' لیکن انہوں نے باہمی اختلافات کا جو راستہ کھولا اور پھر ہر گروہ نے اپنی بدعات وخرافات کو جس طرح دین کا درجہ دینا چاہا اس کے لیے انہوں نے اللہ کی کتابوں میں ترمیم اور تحریف تک کر ڈالی اور یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے نہیں کیا کہ ان کے پاس دین مختلف تھے بلکہ اس لیے کیا کہ وہ اپنے اپنے گروہ اور اپنے اپنے فرقے کی عصبیت پر باقی رہنا چاہتے تھے اور اس طرح سے اپنے مفادات اور اپنے امتیازات کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد مزید یہ فرمایا کہ اب جب کہ قرآنِ کریم کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد حق پوری طرح واضح ہو چکا لیکن پھر بھی کوئی شخص اللہ کی آیات کا انکار کرتا اور اپنی خواہشات اور بدعات وخرافات پر اصرار کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ان کے لیے مہلت ختم ہو گئی ہے اور فیصلے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا حساب اللہ جلد چکانے والا ہے۔ وہ وقت دور نہیں کہ نہ اہلِ کتاب باقی رہیں گے اور نہ مشرکینِ عرب کہیں جزیرۂ عرب میں جگہ پا سکیں گے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اس بات کو مزید کھول دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۟

(اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہے پھر اہلِ کتاب اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اس طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اس طرح اسلام لے آئیں تو وہ راہِ راست پا گئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے معاملات دیکھ رہا ہے) (۲۰)

مخالفین کو دھمکی اور دعوت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام اور جانفشانی سے مشرکینِ مکہ کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پر اتمامِ حجت ہو گیا اور ویسے بھی اتمام حجت سے پہلے پروردگار اپنے رسول کو کبھی ہجرت کا حکم نہیں دیتا اور مدینہ طیبہ کے باسیوں کا جہاں تک تعلق ہے' ان میں اوس وخزرج کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی اور جو لوگ ابھی دائرہ ایمان سے باہر تھے وہ بھی اسلام کے بارے میں کسی جہالت یا غلط فہمی کا شکار نہیں تھے۔ ان تک بھی اسلام کی دعوت پوری تفصیل کے ساتھ پہنچ چکی تھی۔ رہے اہلِ کتاب تو خود ان کی کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کی حقانیت کے تعارف کے لیے کافی تھیں۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات

Marfat.com

بیان کی گئی تھیں اور قرآنِ کریم کے بارے میں ایسی تفصیلات موجود تھیں، جن سے قرآنِ کریم کو پہچاننا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ اس طرح سے اہلِ کتاب اور عرب دونوں پر اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اب اگر وہ کسی بات پر بحث کرتے ہیں تو اس کا مقصد بحث برائے بحث یا بات کو الجھانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ بحث میں وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے صاف کہیے کہ قرآن کے مخاطب ہم بھی ہیں اور تم بھی۔ دونوں سے کل کو اللہ کے ہاں جواب طلب کیا جائے گا۔ ہم تو قرآن کی دعوت کے سامنے سر جھکا چکے ہیں۔ میں بھی اپنا آپ اللہ کے سپرد کر چکا ہوں اور میری پیروی کرنے والے لوگ بھی دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ کے دین کے سپرد کر چکے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں اسلام لانے یا اسلام کی دعوت کے سامنے سر جھکانے یا اس کے قبول کرنے کی بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ میں نے اور میرے پیروکاروں نے اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ عربی زبان میں جس طرح ہم سر جھکا دینا بولتے ہیں وہ چہرہ سپرد کر دینا بولتے ہیں اور دونوں کا مفہوم یکساں ہے۔ جس طرح ''سر'' پوری ذات کا استعارہ ہے اسی طرح ''چہرے'' سے بھی پوری ذات مراد ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اللہ کے چہرے کے)

دیکھیے! یہاں اللہ کے چہرے سے مراد اللہ کی ذات ہے۔ اسی طرح یہاں بھی چہرہ ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ ہم تو اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر چکے اور اسلام قبول کر چکے تم بتاؤ کہ تم بھی اسلام کے سامنے سر جھکاتے ہو یا نہیں۔ اہلِ کتاب بھی اس کا جواب دیں اور اُمی بھی۔ اُمی سے مراد عرب ہیں۔ اُمی کا لفظ ان کے لیے بطور تحقیر نہیں بلکہ بطور لقب کے استعمال ہوا ہے۔ اہلِ کتاب چونکہ رسمی تعلیم و کتابت سے تعلق رکھتے تھے اور عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناآشنا، شریعت کی ابتدائی باتوں سے بھی بے بہرہ اور اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے۔ اس لیے اہلِ کتاب کے مقابلے میں انہیں اُمی کہا گیا اور یہ لفظ اس طرح ان کی پہچان بن گیا کہ وہ خود بھی اپنی پہچان پر فخر کرتے تھے۔ علم و معرفت کی بہت سی باتیں اور زندگی کے بہت سے ہنر ایسے ہیں جنہیں لکھے پڑھے بغیر بھی آدمی سیکھ سکتا ہے اور زندگی کے حقائق کا بیشتر تعلق کتابی زندگی سے نہیں، انسانی تجربے سے ہے۔ ایسے تمام علوم اور زندگی کے حقائق عرب اُمی ہونے کے باوجود بہت اچھی طرح جانتے تھے اور معاملاتِ زندگی کے ادراک میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے اور اہلِ کتاب نے علم و معرفت سے تعلق رکھنے کے باوجود جس طرح اخلاق باختگی کا ثبوت دیا تھا اس سے امیوں میں علم ہی کی طرف سے ایک بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنی بدویانہ سادگی پر پوری طرح قائم تھے۔ ان کی اسی بداوت کی وجہ سے یہاں ان کو اُمی کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ مراد اس سے مشرکینِ عرب ہیں۔ حضور سے کہا گیا ہے کہ آپ اہلِ کتاب کے ساتھ ساتھ عربوں سے بھی پوچھیے کہ وہ بحث و جدال چھوڑ کر اسلام پر ایمان لاتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو انہوں نے راستہ پا لیا۔ وہ ہدایت پا گئے۔ اب ان سے کوئی جھگڑا نہیں، بلکہ وہ آپ کے ہمسفر ہوں گے۔ لیکن اگر وہ اس سے پشت پھیریں اور ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اے پیغمبر! آپ کو ہرگز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے ذمہ صرف دعوت کا پہنچانا تھا، سو آپ اپنا فرض بتمام و کمال ادا کر چکے۔ رہا ان لوگوں کا رویہ تو اس سے آپ کو دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ اپنے تمام بندوں کے احوال سے واقف ہے۔ ہر شخص اور ہر شخص کا عمل اس کی نگاہوں میں ہے۔ یہ لوگ جو کچھ کریں گے اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اس کے مطابق انہیں جزا یا سزا دے گا۔

Marfat.com

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ
وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا
نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ
تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ
كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ
الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَ
تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ
وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ
تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ
مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي

Marfat.com

شَيْءٍ إِلَّآ أَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَ
إِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ إِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ أَوْ تُبْدُوْهُ
يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ أَمَدًا
بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع

رکوع: ۳۔ (جولوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اوران لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں عدل وراستی کا حکم دینے کے لیے اٹھے۔ ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو O یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے O کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا وہی بلائے جارہے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ایک گروہ ان میں سے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ یہ لوگ ہیں ہی روگردانی کرنے والے O یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی دوزخ کی آگ مگر چند گنے ہوئے دن۔ اور انہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے ان کے دین کے بارے میں، ان باتوں نے جو وہ گھڑا کرتے تھے O سو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم انہیں ایک ایسے دن کے لیے جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا O اے پیغمبر دعا کیجئے! اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے۔ تو جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ساری بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے O تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے O نہ بنائیں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کے خلاف اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچو، جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے O کہہ دیجئے کہ جو کچھ

Marfat.com

تمہارے دلوں میں ہے، اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے O جس دن موجود پائے گا ہر شخص جو اس نے نیکی کی ہو گی اور جو اس نے برائی کی ہو گی اور وہ آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور اس کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہو جائے اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے) (۲۱ تا ۳۰)

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقۡتُلُوۡنَ الَّذِيۡنَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ O اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ O

(جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھے۔ ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو O یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے) (۲۱ تا ۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور یہود کی تاریخی حقیقت کا اظہار

ان آیات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور اہلِ کتاب جنہیں اپنے صاحب علم ہونے اور تقدس اور مشیخیت کا بڑا دعویٰ تھا کا پردہ چاک کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں متعدد مواقع پر تسلی دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنے دل میں اللہ کے بندوں کے لیے انتہا درجہ کی ہمدردی اور غمگساری رکھتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو اس معاملے میں مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپؐ جس جانفشانی سے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے تھے۔ جب لوگوں کی بے رخی بلکہ مخالفت کو دیکھتے تھے تو آپ کا دل خون ہو جاتا تھا۔ آپؐ جب تصور فرماتے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو جہنم کی آگ میں جلیں گے تو آپ کی پریشانی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا تھا۔ آپؐ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کے ایمان لانے کیلئے دعائیں فرماتے اور رو رو کر اللہ سے ان کے لیے ہدایت مانگتے۔ اس لیے پروردگار نے بار بار آپؐ کو تسلی دی کہ آپ کا کام ان لوگوں تک اللہ کا دین پہنچانا ہے۔ اسے قبول نہ کرنے کی ذمہ داری ان پر ہے آپؐ پر نہیں۔ آپ اس سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں۔ یہاں ایک دوسرے انداز میں آپؐ کو تسلی دی گئی کہ اہلِ کتاب کے ایمان نہ لانے سے آپؐ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے اس لیے کہ کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کے معاملے میں ان کی ایک تاریخ ہے اور یہ اب تک پوری طرح اس تاریخ کی گرفت میں ہیں۔ جن اسلاف کے یہ جانشین ہیں اور جن کے راستے پر یہ ابھی تک چل رہے ہیں ان کے کارناموں میں سے نمایاں ترین کارنامہ یہ رہا ہے کہ وہ نبیوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اور پھر صرف اسی پر بس نہیں جو اللہ کے نیک بندے ان کی حمایت میں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے انہیں سمجھانے کے لیے اٹھتے اور ان کی بداعمالیوں پر انہیں ٹوکتے، یہ انہیں بھی قتل کرتے رہے ہیں۔ تاریخ میں آتا ہے کہ بخت نصر کے پہلے حملے کے موقع پر جب وہ ہیکلِ سلیمانی کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا اس کی نظر ایک تیر کے نشان پر پڑی۔ اس نے اپنے ساتھ

Marfat.com

یہود کے علماء سے پوچھا کہ یہ تیر کا نشان کس بات کا اشارہ کر رہا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہاں زکریا علیہ السلام کو سنگسار کیا گیا تھا۔ اس نے پوچھا کیوں؟ یہود نے جواب دیا کیونکہ وہ ہماری بداعمالیوں پر ہمیں ٹوکتے تھے۔ جب ان کی روک ٹوک ناقابل برداشت ہوگئی تو ہم نے انہیں قتل کر ڈالا تو جن لوگوں کا ماضی یہ ہو کہ وہ اللہ کے نبیوں اور ان کے راستے پر چلنے والے اہلِ علم کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے رہے ہوں' ان کے اخلاف سے یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلام کو قبول کرلیں گے۔ اس آیت میں بِغَيْرِ حَقٍّ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ نبی معصوم ہوتے ہیں۔ وہ کبھی کسی ایسے حق میں ماخوذ نہیں ہو سکتے جس میں انہیں قتل کیا جاسکے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال یہود کے جرم کی شناعت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو یہود کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہود خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ہم نبیوں کو بغیر کسی جرم کے قتل کرتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدمے کی پوری روداد اب مرتب ہو چکی ہے' اسے پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس حد تک سنگدل واقع ہوئے تھے کہ عدالت نے جب صاف صاف کہا کہ کل کو عید کا دن ہے' ہمیں اس حوالے سے کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ ہمارے پاس دو بڑے مجرم ہیں ایک برابا ڈاکو اور دوسرے مسیح۔ تم چاہو تو ہم ان میں سے ایک کو چھوڑ سکتے ہیں تو یہود کے مجمع نے چیختے ہوئے کہا برابا کو چھوڑ دو مسیح کو مت چھوڑنا۔ ایسے لوگوں کے جانشینوں سے اسلام قبول کرنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو اس قابل ہیں کہ انہیں عذاب الیم کی بشارت سنائی جائے اور انہیں یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ اپنی جن دینداریوں پر فخر کرتے رہے ہیں یا اسلام کی مخالفت کو یہ نیکی سمجھتے رہے ہیں یہ سب کچھ ضائع ہو چکا۔ نہ دنیا میں کام آئے گا نہ آخرت میں اور کوئی ان کو مدد کرنے والا نہیں ملے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

(کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا وہ بلائے جا رہے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ایک گروہ ان میں سے پیٹھ پھیر لیتا ہے، یہ لوگ ہیں ہی روگردانی کرنے والے) (۲۳)

یہود پر تنقید کا سبب

یہود مدینہ کی آبادی میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے مال و دولت، اپنی کاروباری وسعت، اپنے علم اور اپنی مشیخیت کے باعث اوس و خزرج کے لوگوں پر ان کا بے پناہ اثر تھا۔ یہ قحطانی عرب اپنی تمام تر خودداریوں کے باوجود یہود سے مرعوب رہتے تھے۔ کسی بھی اہم فیصلے کے لیے وہ ہمیشہ ان کی طرف دیکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری کے بعد عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہود آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کا استقبال کریں گے۔ لیکن جب ان کی طرف سے شدید مخالفت بلکہ مخاصمت کا آغاز ہو گیا تو اوس و خزرج کے بہت سارے لوگ ان کے علمی رعب کی وجہ سے اسلام کے بارے میں شش و پنج کا شکار ہو گئے۔ وہ ایک طرف اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف یہود کا رویہ انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا

Marfat.com

تھا۔اس لیے قرآنِ پاک نے مختلف مواقع پر یہود کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش فرمائی ہے۔گذشتہ آیت کریمہ میں تاریخ کے آئینہ میں ان کی اصل شکل دکھائی گئی ہے اور پھر یہ سوال عام لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ جس قوم کی تاریخ یہ رہی ہو اس قوم سے کس طرح قبولیتِ ایمان کی امید کی جاسکتی ہے۔پیش نظر آیتِ کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے ان کی دینی حیثیت کو واضح فرما کر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے اور ان کے عملی اور فکری تضاد کو نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے ان کی اصل حقیقت لائی گئی ہے۔تعجب اس بات پر فرمایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ وہ لوگ ہیں جنہیں کتابِ الٰہی کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے پاس رکھنے کا شرف حاصل ہے۔

نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کا مفہوم

یہاں ممکن ہے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہود و نصاریٰ کے پاس مستقل اور مکمل کتابیں تھیں۔یہود کے پاس تورات تھی اور عیسائیوں کے پاس انجیل تو پھر اس ارشاد کا کیا مطلب لیا جائے کہ انہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ کتاب سے اگر تورات مراد لی جائے تو وہ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور جس کی ایک ایک نقل ہر قبیلے کے حوالے کی گئی تھی اور بنی لاوی کو اصل نسخہ دے کر حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور شاید وہی نسخہ یا اس کی ایک نقل تابوتِ سکینہ میں رکھی گئی تھی۔تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ اصل کتاب اور اس کی نقول یہود نے گم کر دیں۔بختِ نصر کے حملے کے بعد اس کا ایک ایک نسخہ جلا دیا گیا۔حضرت عزیر علیہ السلام اور بعض بزرگانِ بنی اسرائیل نے مل کر جو تورات مرتب کی وہ اصل تورات نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی تاریخ اور اس کے ضمن میں تورات کے وہ حصے شامل ہیں جو اس وقت تک لوگوں کے یا حضرت عزیر کے حافظے میں محفوظ تھے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگلی نسلوں نے اس کے بعد مزید تحریف و ترمیم سے کام لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہود کے پاس تورات نام کی جو کتاب موجود تھی وہ یقیناً اصل تورات کا حصہ تو کہی جاسکتی ہے، لیکن اصل تورات نہیں۔جہاں تک انجیل کا تعلق ہے وہ اگرچہ خود بھی محفوظ نہیں رہی، لیکن اس میں چونکہ احکامِ شریعت نازل ہی نہیں کیے گئے بلکہ نصاریٰ کو تورات ہی کی شریعت کی پیروی کا حکم دیا گیا۔اس لیے حقیقت یہی ہے کہ انجیل بھی تورات کے مقابلے میں اس کا ایک جز و تو کہی جاسکتی ہے، مکمل کتاب نہیں۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآنِ کریم ہے اور باقی تمام کتابیں اگر محفوظ بھی سمجھ لی جائیں تو وہ اس کے مقابلے میں اجزا کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ اللہ کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لیے ہر دور میں کتابیں اور صحیفے نازل ہوتے رہے، لیکن ہر صحیفے اور ہر کتاب میں نازل کیے جانے والے احکامِ شریعت اپنے اپنے دور کے انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کے مطابق تھے اور انسانی ذہن اور انسانی معاشرے نے چونکہ بتدریج ارتقاء کا سفر کیا ہے اور وہ دھیرے دھیرے اپنی بلوغ کی عمر کو پہنچا ہے، اس لیے ہر دور میں اترنے والے احکام باہمی تفاوت رکھتے تھے اور یہ تفاوت ان کے ذہنی معیار کا عکاس تھا۔جیسے جیسے انسان بلوغ کی طرف بڑھتا گیا ویسے ویسے اللہ کی طرف سے آنے والی شریعت تکمیل کی طرف بڑھتی گئی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت انسانیت چونکہ بلوغ کو پہنچ چکی تھی تو اللہ نے وہ کتاب نازل فرمائی جس میں مکمل شریعت عطا کی گئی۔اسی لیے قرآنِ کریم میں تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔پہلی تمام کتابیں چونکہ اپنے ادوار کی ضرورتوں کے مطابق تھیں، اس لیے ان میں عقائد، احکام اور آداب ان کی ذہنی سطح کے مطابق مختصر دیئے گئے تھے۔لیکن ہر دور میں جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ویسے ویسے ان میں بھی ارتقاء ہوتا گیا۔یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک بچہ پرائمری

Marfat.com

سکول میں جو کچھ پڑھتا ہے وہ انہی مضامین اور اسی علم کا پیش خیمہ ہوتا ہے جنہیں وہ آگے چل کر کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، ان میں اگر فرق ہوتا ہے تو صرف مختصر، نامکمل اور مکمل اور مطول کا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، علم کا ایک سفر ہے جس کا ایک حصہ ابتدائی سکولوں میں اور اس کا آخری حصہ بعد کے تعلیمی اداروں میں مکمل ہوتا ہے۔ یہی حال دین اور شریعت کا بھی ہے۔ اگر پہلی آسمانی کتابوں میں تحریف واقع نہ ہوئی ہوتی اور وہ بعینہٖ اسی طرح محفوظ ہوتیں جیسے وہ نازل کی گئی تھیں تو ہر پڑھنے والا دیکھ سکتا کہ ان کی تعلیم اور قرآنِ کریم کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو جو کتابیں دی گئی تھیں وہ اسی مشکوٰۃ علم و معرفت سے پھوٹی تھیں، جہاں سے قرآنِ کریم طلوع ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص ان کتابوں کا جاننے والا ہے وہ سارے تغیرات کے باوجود کتابِ الٰہی کا شناسا ضرور ہو جاتا ہے۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کتاب کس مزاج کی حامل ہوتی ہے اور ان کتابوں میں چونکہ انبیائے کرام کی تاریخ، ان کی شخصیت کے خدوخال اور ان کی دعوت کے مختلف مراحل کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے کتاب کے کسی حصے کا پڑھنے والا بھی کتاب پڑھنے کے بعد ایسے ذوق کا حامل ضرور ہو جاتا ہے جس سے سچے نبی کو پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس کتابیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس ذوق اور اس شناسائی کے حامل ہیں اور پھر ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کے بارہ میں پیش گوئیاں بھی موجود ہیں اور انہی کے یہ آج تک منتظر بھی رہے ہیں۔ تو عجیب بات ہے کہ جب انہی پیش گوئیوں کے مصداق اور انہی صفات کے حامل اللہ کے آخری رسول اور آخری کتاب نازل ہو گئے تو ان کو ماننے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ ایک نہ جاننے والا کسی حقیقت کا انکار کر دے تو چنداں تعجب خیز نہیں ہوتا لیکن جب جاننے پہچاننے والا جانی پہچانی ہوئی حقیقت کا انکار کرتا ہے تو تعجب بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہونے لگتا ہے کہ اس میں یقیناً بدنیتی اور بدطینتی کا دخل بھی ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ کا مفہوم

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ...... الخ اس کا فاعل کتاب اللہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اللہ کی آخری کتاب یعنی قرآنِ کریم پر عمل کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے تاکہ وہ اس کتاب اللہ کی مدد سے ان متنازعہ مسائل کا حل نکال سکیں جس میں وہ بری طرح مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہود نے اپنی کتاب میں ترمیم و تحریف کرنے کی وجہ سے خود اپنے لیے ایسی الجھنیں پیدا کیں کہ نہ ان کے عقائد سلامت رہے اور نہ احکام کی اصل صورت باقی رہی اور نصاریٰ نے اپنی کتاب میں تحریف کی وجہ سے اپنے عقائد کو اس طرح بگاڑا کہ چودہ سو سال سے وہ ایک ایسے تضاد کا شکار ہیں جس کا کوئی حل ان کے پاس نہیں۔ انجیل سے اللہ کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ان کا اختیار کردہ تثلیث کا عقیدہ کسی طرح توحید سے میل نہیں کھاتا۔ صدیوں سے وہ اس کی عقدہ کشائی میں لگے ہوئے ہیں کہ اللہ ایک بھی ہے اور تین بھی ہیں۔ ایک میں تین اور تین میں ایک۔ ایسا سوال ہے جس کا حل قیامت تک نہیں نکل سکتا۔ باوجود اس کے کہ ان کی انجیل انہیں تورات میں بیان کردہ شریعت کی پیروی کا حکم دیتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احکام اس پر شاہد ہیں، لیکن پال نے عیسائیت کو ایک ایسے ڈگر پر چلایا جس کی وجہ سے وہ شریعت سے آزاد ہو گئے۔ ان باتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ نے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ انکے اہلِ علم آگے بڑھ کر اللہ کے آخری رسول اور قرآنِ کریم کا استقبال کرتے تاکہ جن الجھنوں نے ان کی زندگی ویران کر کے رکھ دی ہے اس سے وہ نجات حاصل کر سکتے۔ لیکن وہ بجائے استقبال کرنے کے مخالفت اور معاندت کے راستے پر چل نکلے ہیں۔ آیت کے آخری حصہ میں پروردگار نے خود اس تعجب سے پردہ اٹھایا اور اس حقیقت کو افشا کیا ہے کہ

Marfat.com

لوگ اپنے پاس کتاب کا ایک حصہ رکھتے ہوئے بھی اس لیے ایمان نہ لا سکے وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (کہ وہ ہیں ہی اعراض کرنے والے) صدیوں کی تاریخ ان کے اعراض کی داستانوں سے بھری پڑی ہے اور یہ اعراض ان کا مزاج بن چکا ہے۔ تو جو چیز ان کا مزاج بن چکی ہے، وہ آج اس روش سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ اس میں ایک طرف تو اہلِ کتاب کو ملامت کی جا رہی ہے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ایسے لوگ جن کی فطرت بگڑ چکی اور قومی مزاج زہر آلود ہو چکا ہے آپ ان سے قبولیتِ حق کی امید کیسے رکھتے ہیں۔

تم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہی ان کا قومی مزاج ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک ہر پیغمبر نے ماتم کیا ہے اور قرآنِ کریم کی شہادت موجود ہے کہ بڑے بڑے نبیوں کی زبان سے ان پر لعنت کرائی گئی ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ O

(یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی دوزخ کی آگ مگر چند گنے ہوئے دن۔ اور انہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے ان کے دین کے بارے میں، ان باتوں نے جو وہ گھڑا کرتے تھے) (۲۴)

اہلِ کتاب کے ایمان نہ لانے کا سبب

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کے اعراض اور ایمان نہ لانے کا سبب بیان فرمایا گیا ہے۔ اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّاماً مَّعْدُوْدَۃً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَاللّٰہِ عَھْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ O بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ O

(اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد لے لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم نہیں O اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (البقرۃ : ۸۰، ۸۱)

انسان کو گمراہی یا سرکشی سے روکنے والی صرف ایک چیز ہے کہ اسے اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ تمہیں اس غلط روی کے بدلے میں ایسے کٹھن حالات سے واسطہ پڑے گا جس کا تم کبھی سامنا نہیں کر سکتے۔ یہ ڈر اور خوف انسان کو غلط راستے پر چلنے سے روکتا ہے۔ لیکن اگر اسے یہ تسلی دے دی جائے کہ تم جو چاہو کرو تمہارا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں کیونکہ تم ایک ایسے حسب و نسب سے تعلق رکھتے ہو جس کی موجودگی میں کوئی طاقت تمہیں سزا دینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ جنت کی نعمتیں صرف تمہارے لیے پیدا

Marfat.com

کی گئی ہیں، جہنم دوسروں کے لیے تو ہوسکتا ہے لیکن تم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نے چالیس دنوں تک جو بچھڑے کی پوجا کی تھی اس کے بدلے میں محض فارمیلٹی پوری کرنے کے لیے تمہیں چالیس روز تک جہنم میں رہنا پڑے گا، اس کے بعد تمہاری ابدی زندگی جنت میں گزرے گی۔ یہ وہ آرزوئیں اور امیدیں ہیں جس نے بنی اسرائیل کے سیرت و کردار کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اعمال کی ذمہ داریوں سے یکسر فارغ ہو گئے۔ وہ اخروی نعمتوں کو اپنا استحقاق سمجھنے لگے اور دنیا میں بھی باقی قوموں پر برتری اور تفوق کے احساس نے انہیں ہر طرح کے مکارمِ اخلاق سے بے نیاز کر دیا۔

ان تصورات کی چونکہ کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے خانہ ساز ہیں اور انہوں نے اپنے طور سے اللہ کی کتاب میں ترمیم و تحریف کرتے ہوئے ایسی باتوں کو کتاب میں شامل کر دیا۔ چنانچہ انہی افتراءات اور گھڑی ہوئی باتوں نے انہیں ان کے دین کے بارے میں فریب میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک ایسا میٹھا فریب ہے جس سے وہ نکلنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں۔ قرآن کی دعوت چونکہ ایمان و عمل کی دعوت ہے وہ کسی حسب و نسب پر اخروی کامیابیوں کا مدار نہیں رکھتا۔ وہ صاف صاف یہ کہتا ہے کہ دنیا میں بھی سرافرازیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیں اور آخرت کی نعمتوں کے بھی وہ لوگ سزاوار ہوں گے جو ایمان و عمل کا سرمایہ لے کر وہاں پہنچیں گے اور حساب و کتاب میں جن کی نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور وہ رحمتِ خداوندی کو اپنے ایمان و عمل کے باعث اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جو قوم محض امیدوں اور سہاروں کے بل بوتوں پر آخرت کی کامیابیوں کا یقین رکھتی ہو اس کے لیے عمل کی دعوت ایک گالی سے کم نہیں۔ وہ اسے اپنے لیے ایک سزا سمجھتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے اس قوم نے من حیث القوم قرآنِ کریم کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

امتِ مسلمہ کا حال

امتِ اسلامیہ جو اس دھرتی پر آخری امت ہے اور جسے اللہ نے حاملِ دعوت امت بنا کر اس کے سر پر عظیم ذمہ داری ڈالی ہے۔ خود اس کا حال بھی آج بنی اسرائیل سے مختلف نہیں۔ اس امت کی ایک قابلِ ذکر تعداد ایسی ہی آرزوؤں کے سہارے جی رہی ہے۔ نہ ایمان کی فکر ہے نہ عمل کا شوق۔ زندگی کے ہر شعبے میں گمراہیوں کا بسیرا ہے۔ نہ عبادات درست ہیں، نہ معاملات۔ لیکن کچھ لوگوں نے انہیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ تمہارے لیے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہونے کا شرف نجات کے لیے کافی ہے۔ تم کچھ کرو یا نہ کرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت تمہیں جنت میں پہنچا دے گی اور اگر کسی شخص کو آلِ رسول میں سے ہونے کی عزت حاصل ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ کو شریعت کی ذمہ داریوں سے فارغ سمجھتا ہے بلکہ اپنے دامن گرفتہ لوگوں کی نجات کی بھی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور وہ لوگوں کو تسلی دیتا ہے کہ ہم سیدزادے اگر تمہاری نجات کا سامان نہ کر سکے تو پھر ہمارا کیا فائدہ؟ تم ہماری خدمت جاری رکھو ہم تمہاری نجات کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح کے تصورات نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا اور ایسے ہی تصورات کے ہاتھوں یہ امت تباہ ہو رہی ہے اور قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر اس بات کو صراحت سے بیان فرمایا کہ نجات کے لیے ایمان و عمل کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ یہ وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے اللہ کا فضل شاملِ حال ہو گا اور اسی کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی میسر آئے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش ایک مومن کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے اور اللہ کا فضل ایک بہت بڑا سہارا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں اس شخص کو نصیب ہوں گی جس نے زندگی بھر ایمان و عمل کے حصول میں محنت کی لیکن طبعی کمزوریوں کے باعث کمالِ ایمان اور مقامِ احسان حاصل نہ کر سکا۔ بعض دفعہ خواہشات کا اسیر ہو کر عملی کمزوریوں کا

Marfat.com

شکار ہو گیا۔ لیکن دانستہ کبھی سرکشی یا لاپرواہی کا رویہ اختیار نہ کیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ان کے نصیب میں ہو۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

(سو اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم انہیں ایک ایسے دن کے لیے جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا) (۲۵)

جن لوگوں نے آخرت میں نجات کے لیے چند جھوٹے سہارے تراش رکھے ہیں اور امیدوں اور آرزوؤں میں بہل کر اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہمیں آخرت میں کوئی پکڑنے والا نہیں، اللہ نے جنت ہمارے لیے ہی پیدا کی ہے۔ ان سے فرمایا جارہا ہے کہ اس روز ان کا کیا حال ہو گا جب ہم انہیں قیامت کے دن قبروں سے اٹھائیں گے اور پھر یہ کشاں کشاں محشر میں پہنچیں گے۔ وہاں انہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا ان سے حساب لیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں ایک ضابطۂ حیات دیا تھا، تمہیں زندگی گزارنے کے لیے راہنمائی بخشی تھی۔ تمہاری طرف آخری نبی اور آخری کتاب بھیجی گئی تھی۔ ہر دور میں تمہیں شریعت کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، آج بتاؤ تم نے زندگی کیسے گزاری؟ تم نے جوانی کس طرح کے معمولات میں کھپائی؟ تم نے مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ زندگی کی راہنمائی کے لیے جس علم کی ضرورت تھی وہ تم نے حاصل کیا یا نہیں؟ اور اگر کیا تو اس کا کیا حق ادا کیا؟ جب تک ان باتوں کا جواب نہیں دیا جائے گا زمین سے قدم الگ نہیں ہو سکیں گے۔ اس وقت یہ لوگ حیران و پریشان چاروں طرف دیکھیں گے کہ جن سہاروں پر ہم نے زندگی برباد کی وہ تو آج کہیں دکھائی نہیں دیتے اور جو سوالات ہم سے کیے جا رہے ہیں ہمارے پاس تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ تو آج اگر اس کا جواب سوچ لیا جائے تو ممکن ہے کہ کل کی شرمندگی اور ہولناکی سے بچا جا سکے۔ لیکن اگر آج ان کا جواب مہیا نہیں کیا جائے گا تو وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ کس کا بیٹا ہے یا کس کا باپ ہے بلکہ ہر شخص سے اس کے اعمال پوچھے جائیں گے اور جس شخص نے جیسے اعمال کیے ہوں گے ویسا اسے اس کا صلہ اور معاوضہ ملے گا۔ نہ جزا میں کمی ہو گی نہ سزا میں کمی بیشی ہو گی۔ کسی سے اس لیے زیادتی نہیں کی جائے گی کہ وہ ایک شودر کا بیٹا ہے اور کسی سے اس لیے رعایت نہیں کی جائے گی کہ وہ ایک سید زادہ ہے۔ ہر ایک کو اس کے ایمان و عمل کا صلہ ملے گا۔ یہ آرزوئیں اور امیدیں کام نہیں آئیں گی، ایمان و عمل کی سفارش اصل سفارش ہو گی جس سے ہر شخص کی نجات وابستہ ہو گی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

Marfat.com

• (اے پیغمبر! دعا کیجیے، اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے۔ تو جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ساری بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے O تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے) (۲۶ تا ۲۷)

شانِ نزول

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں آیاتِ کریمہ جنگ خندق کے موقع پر نازل ہوئیں۔ سیاقِ کلام یہود سے متعلق ہے او یہود ہی کو سنا کر چند باتیں ارشاد فرمائی جارہی ہیں۔ لیکن جنگ خندق کے موقع پر ان آیات کے نزول نے وقت کی تمام سرکش قوتوں کی طرف اشارے کیے ہیں جس میں یہود بھی ہیں، مشرکینِ عرب بھی اور بعض علاقوں کے سردار بھی اور مزید یہ کہ چوں کہ جنگِ خندق کے انعقاد کا اصل سبب یہود ہی کی سازشیں تھیں، اس لیے اسی سیاقِ کلام میں ان آیات کو لایا گیا ہے۔ بنونضیر کو جب سے مدینہ منورہ سے نکا گیا تھا، انہوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے اس کا انتقام لیں گے۔ چنانچہ انہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے عرب میں اسلا دشمنی کی ایک لہر اٹھی اور ایک بڑے لشکر کی صورت میں مدینہ پر چھا گئی۔ روایات مختلف ہیں، اس لشکر کی تعداد دس سے چوبیس ہزار تک روایت کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے پاس زیادہ سے زیادہ تین ہزار کی تعداد تھی۔ انہیں اپنے بچوں اور خاندانوں کو بھی سنبھالنا تھا، بنوقر کی درپردہ دشمنی کا بھی سدباب کرنا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اتنی بڑی منہ زور قوت کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔ مدینہ کے اقتصادی حالات جنگ کے متحمل نہیں تھے۔ لیکن یہود کی سازشوں نے ایک طوفانِ عظیم کھڑا کردیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان حالات کی ہوئی تو آپؐ نے حضرت سلمانِ فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھودنے کا آغاز فرمایا تاکہ خندق کے پیچھے بیٹھ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جا چنانچہ جب یہ خندق کھودی جارہی تھی تو ایک چٹان رستے میں حائل ہوگئی جو کسی طرح ٹوٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ مسلمانوں نے ہر چند کو کی لیکن ناکام رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی، آپؐ اس حال میں تشریف لائے کہ مسلسل فاقہ کی وجہ سے کمر سی نہیں ہورہی تھی تو آپؐ نے اسے سیدھا رکھنے کے لیے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ آپؐ نے کمزوری کے باوجود پھاوڑا اٹھا کر چ پر ضرب لگائی، اس میں دراڑیں پڑیں اور ساتھ شعلے پھوٹے۔ آپؐ نے فرمایا تمہیں مبارک ہو مجھے اس میں قیصر کے محلات دکھائے ہیں۔ دوسری ضرب لگائی تو پھر اس سے روشنی نکلی۔ آپؐ نے فرمایا تمہیں مبارک ہو میں نے اس میں کسریٰ کے محلات دیکھے ہیں۔ تی چوٹ نے چٹان کو ریزہ ریزہ کرڈالا اور اس سے شعلے بھی نکلے آپؐ نے پھر فرمایا کہ تمہیں مبارک ہو میں نے اس میں یمن کے محلات ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ آج جب کہ تمہیں زندگی کے لالے پڑے ہیں اور بظاہر حالات بقا کی جنگ در پیش ہے، لیکن مجھے دکھایا جارہا ہے وقت دور نہیں جب یہ تینوں بڑی قوتیں مفتوح ہوکر مسلمانوں کے قدموں میں پڑی ہوں گی۔ جب یہ باتیں یہود اور منافقین کے تک پہنچیں تو انہیں مذاق اڑانے کا ایک نیا موقع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے اپنی مجلسوں میں یہ کہنا شروع کیا کہ ذرا ان مسلمانوں کو د انہیں کھانے کو ملتا ہے نہ پہننے کو اور خواب یہ محلات کے دیکھتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں بادشاہت کا سودا پیدا ہوگیا ہے۔

Marfat.com

یہ تمسخر اور استہزاء اگرچہ مسلمانوں کے لیے کوئی نئی بات نہ تھا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ دعوت ہی سے تمام لوگوں پر یہ بات واضح کردی تھی اور ہر آنے والے دن میں آپ نے اس بات کو ہمیشہ نئے نئے عنوانات کے ساتھ دہرایا کہ میں جس دین کو لے کے آیا ہوں اس کو قبول کرنے کے نتیجے میں صرف عاقبت اور آخرت ہی اچھی نہیں ہوگی بلکہ دنیا بھی سنور جائے گی۔ جو گروہ اس دین کا علم لے کر اٹھے گا اسے اللہ تعالیٰ دنیوی اور اخروی نعمتوں سے نوازیں گے اور وقت کی بڑی بڑی قوتیں اس کے مقابلے میں مفتوح ہو جائیں گی۔ آپؐ نے مکہ معظمہ میں بھی اس وفد کے سامنے یہ بات فرمائی جو ابوطالب کے مرض الوفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لیے آیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں جو کلمہ لے کے آیا ہوں اگر تم اسے قبول کرلو اور اسے زندگی کا راہنما بنالو تو تَـمْلِكُوْنَ بِهَا الْعَرَبُ وَتُدِيْنُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ (تم عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمہارے قدموں میں جھک جائے گا اور تمہارا مطیع ہو جائے گا) ایسی ہی باتوں پر مشرکین مکہ بھی مذاق اڑاتے تھے، انہیں بھی اپنی قیادت سعادت اور امارت پر ناز تھا اور یہود بھی اسی فریب میں مبتلا تھے۔ قرآنِ کریم نے ان آیات میں مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھا کیونکہ ان کے تمسخر اور استہزاء سے مسلمانوں کے دل ہمیشہ زخمی ہوتے تھے اور ان کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا ہے جس میں وہ آنے والے حالات کی صورت دیکھ سکتے ہیں اور یہود کو بطورِ خاص بالواسطہ توجہ دلائی جارہی ہے کہ تمہیں جس عظیم منصب پر فائز کیا گیا تھا، تم نے اس کی قدر نہ پہچانی، صدیوں تک تمہیں سنبھلنے کا موقع دیا گیا، اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں معزول کردیا جائے اور تمہاری جگہ قوموں کی دعوت و امامت کا منصب ان لوگوں کو سونپ دیا جائے، جو اپنے مضبوط ایمان اور صالح کردار کے باعث اس کے اہل ہیں۔ تم ہزار آلِ اسماعیل سے بغض رکھو اور اس فریب میں مبتلا رہو، لیکن تم اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس کائنات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں کے تغیرات اسی کے حکم سے وجود میں آتے ہیں۔ چونکہ وہ مالک ہے اس لیے بجا طور پر اس کا حق ہے کہ وہ جسے چاہے ملک دے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت کے دلدل میں اتار دے۔ تم اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ تمہیں صدیوں تک حاملِ دعوت امت ہونے کی عزت بخشی گئی۔ تم بجائے اس کے کہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے، تم نے اسے بھی اپنا ذاتی استحقاق سمجھا اور جہاں تک دوسری قوموں کا تعلق ہے انہوں نے حکومت و اختیار کو تقدس یا الوہیت کی علامت سمجھا۔ اس لیے جہاں اقتدار دیکھا اس کے سامنے جھک گئے اور مقتدر قوتوں نے بھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر جانا بلکہ بادشاہی کو الوہیت یا نیم الوہیت کا درجہ دے دیا اور بادشاہوں کو خدا کا اوتار بنا دیا۔ مصر میں فرعون کی پرستش ہوتی رہی، ہندوستان میں چندربنسی اور سورج بنسی، راجا مہاراجا خدائی اوتار سمجھے گئے، جاپان میں میکاڈو آج تک مظہرِ خدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں زور دے کر فرمایا گیا کہ مالک صرف اللہ کی ذات ہے، دنیا کی حکومتیں اور بادشاہتیں سب اللہ کے قبضے میں ہیں۔ وہ جب بادشاہوں سے اقتدار لینے پہ آتا ہے تو مسولینی اور ہٹلر جیسے آمر بھی عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو مشرکین عرب کے پاس قبائل کی سرداریاں رہیں گی اور نہ یہود کے پاس امارتیں اور مشیخیت کی مسندیں رہیں گی۔ عزت و ذلت کے پیمانے بدلنے والے ہیں۔ یہود سے امامت چھین کر مسلمانوں کو دی جارہی ہے۔ لیکن اسے کھل کے کہنے کی بجائے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی حالات اتنے واضح نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کی ہزیمت کھل کے سامنے آجاتی۔ مستقبل ابھی تک پردے میں تھا۔ اس لیے کھل کر بات کہنے کی بجائے یہی اسلوب زیادہ موزوں تھا اور دوسری یہ بات کہ خود مسلمانوں کو حالات کی نزاکت کا احساس دلانا تھا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ایک بہت بڑی ذمہ داری ان کے سپرد کررہا ہے۔ وہ اسے ان احساسات کے ساتھ قبول کریں جو احساسات دعا میں کارفرما ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے اعزاز سے فخر و غرور پیدا ہونے کی بجائے تواضع، تذلل

Marfat.com

اوراحساسِ عبدیت کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کو سامنے رکھیں کہ پوری کائنات کا مالک تو پروردگار ہے۔ وہی عزت دیتا ہے وہی ذلت دیتا ہے، ہمیں ہر حال میں اسی کی بندگی اور اطاعت کرنا ہے اور اسی کے سہارے اعلائے کلمۃ الحق کا فرض انجام دینا ہے۔

بِیَدِکَ الْخَیْرُ کامفہوم

بِیَدِکَ الْخَیْرُ آیتِ کریمہ میں پہلو بہ پہلو دو باتوں کا ذکر ہے کہ اللہ وہ ہے جو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ دو متضاد باتیں ایک ساتھ بیان فرمائی گئی ہیں، جن میں ایک خیر ہے اور دوسری شر۔ ایک اچھائی ہے اور ایک برائی۔ اس لحاظ سے ہونا یہ چاہئے تھا کہ ان باتوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا جاتا بِیَدِکَ الْخَیْرِ وَالشَّرِ (تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے اور تیرے ہی ہاتھ میں برائی ہے) تو جس طرح خیر کا مالک ہے اسی طرح شر کا بھی مالک ہے۔ نہ خیر کسی کو تیری اجازت کے بغیر پہنچ سکتا ہے اور نہ شر تیری اجازت کے بغیر کسی کو لاحق ہو سکتا ہے۔ لیکن شر کا لفظ حذف کر دیا گیا اور صرف خیر کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا۔ جب کہ مقتضائے حال کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو ذکر کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہی فکر کے باعث دو باتوں کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک یہ بات کہ وہ پوری انسانی دنیا کو جسدِ واحد سمجھنے کے بجائے ایک ایک فرد کو سامنے رکھ کر قیاس کرتا اور حکم لگاتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کو فائدہ سمجھتا ہے اور اپنی تکلیف کو تکلیف گردانتا ہے۔ لیکن اس کی فکری کوتاہی کبھی اسے یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کرتی کہ تم تو صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو لیکن کائنات کا خالق پوری کائنات اور پھر پوری انسانی دنیا کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کرتا ہے۔ وہ جہاں ایک ایک فرد کی مصلحت کو دیکھتا ہے وہیں پورے جسدِ انسانیت کی مصلحت بھی اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اگر فرد کی تکلیف میں جسدِ انسانیت کی راحت ہے تو وہ فرد کی تکلیف کا فیصلہ کرتا ہے اور اگر فرد کی بھلائی میں جسدِ انسانیت کے لیے خیر ہے تو وہ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر انسانیت کا اجتماعی فائدہ اور اجتماعی مصلحت ہے۔ ایک فرد کی مصلحت صرف اس کے لیے ہے، لیکن اجتماعی مصلحت میں تمام افراد شریک ہوتے ہیں اور ہر فرد اپنی قسمت کا فائدہ اٹھاتا ہے۔

دوسری بات جس کا ادراک عموماً ہر فرد نہیں کرتا وہ یہ ہے کہ خیر اور شر درحقیقت اضافی باتیں ہیں۔ اسی طرح فائدہ اور نقصان وہ بھی نسبت کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی کو پہنچنے والی بظاہر تکلیف ضروری نہیں کہ دوسروں کے لیے بھی تکلیف ثابت ہو۔ متنبّی کا مشہور مصرعہ ہے:

مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ

(ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں)

ایک قاتل جب قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹکتا ہے تو یقیناً اس کے اہلِ خانہ کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ بچے اس کے یتیم رہ جاتے ہیں، بیوی بیوہ ہو جاتی ہے، گھر کا پورا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی پھانسی بہت سے لوگوں کے لیے اذیت کا باعث ہے۔ لیکن جس گھر کا اس نے فانوس بجھایا، جن بچوں کے سر سے اس نے سایہ چھینا، جس عورت کا اس نے سہاگ لوٹا، ان سے پوچھ کر دیکھئے کہ کیا اس کی پھانسی کسی تکلیف کا باعث ہے یا راحت کا؟

Marfat.com

متذکرہ بالا دونوں حقیقتوں کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ خیر کی اور شر کی تقسیم ہماری کوتاہی فکر کا نتیجہ ہے ورنہ ہر چیز خیر ہے اور انسانوں کے غلط استعمال سے وہ شر ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس دعا میں ہمیں یہ سکھایا گیا کہ ہم یہ دعا کریں کہ یا اللہ! ہر بھلائی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں بھلائی نصیب فرما اور ہمیں ایسے ہر غلط استعمال سے محفوظ فرما جس میں تیری عطا کردہ بھلائی کو ہم برائی سے بدل ڈالیں کیونکہ

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

دوسری آیتِ کریمہ میں اسی بات کو موکد کرنے کے لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اختیارِ مطلق پر کائنات کا نظامِ تکوینی بھی شہادت دے رہا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بے دست و پا ہے۔ وہی اللہ ہے جو رات کو دن میں تبدیل کرتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے۔ یہ مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔ اسی کے حکم سے انڈہ سے مرغی نکلتی ہے اور مرغی سے انڈا پیدا ہوتا ہے۔ وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے یعنی وہ دونوں یکے بعد دیگرے ایک نظام میں بندھے ہوئے اس طرح محوِ پرواز ہیں کہ یُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (کہ رات دن پر لپٹی چلی آتی ہے اور دن رات پر لپٹا چلا آتا ہے) دونوں میں کہیں انقطاع نہیں ہوتا۔ دن کی روشنی میں اندھیرا اور اندھیرے میں دن کی روشنی اس طرح اتر جاتی ہے جس طرح کوئی دل میں اتر جاتا ہے۔

جس پروردگار کے غلبہ اور استعلاء اور بے پناہ قدرت کا یہ عالم ہے اس پر یہ اعتراض کرنا کہ ''وہ آلِ اسماعیل میں نبی کیسے پیدا کر سکتا ہے یہ تو سراسر بنی اسرائیل کا حق ہے'' کس قدر بے ہودگی ہے۔

بشارت کو دعائیہ اسلوب میں لپیٹ کر پیش کرنا اس کی مثالیں قرآنِ کریم میں اور بھی موجود ہیں مثلاً ہجرت کے حکم سے کچھ پہلے نبی کریم ﷺ کو یہ دعا سکھلائی گئی:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا ○ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○

(اے پیغمبر! دعا کیجیے، اے میرے رب! مجھے عزت کے ساتھ داخل کر اور مجھے عزت کے ساتھ نکال اور مجھے خاص اپنے پاس سے نصرت کا پروانہ عطا فرما ○ اور یہ بھی کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہوا اور باطل نابود ہونے ہی کے لیے ہے)

اس دعا میں دیکھ لیجیے کہ اس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بشارت بھی کہ آپ کا مکہ سے نکلنا اور دارالہجرت میں داخل ہونا دونوں عزت کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا سروسامان فراہم کیا جائے گا کہ ہجرت اور مدینے میں داخلہ آسان ہو جائے گا اور پھر اس میں عجیب بات یہ ہے کہ داخل ہونے کا ذکر پہلے ہے اور نکلنے کا بعد میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں آپ کے پروقار داخلے کا پہلے سے سروسامان ہو چکا ہے اور اس پیرایۂ دعا میں اس کٹھن سفر کو ایسی محبوبیت عطا کر دی ہے کہ اس کے راستے کا ایک ایک کانٹا پھول محسوس ہونے لگا۔ یہی حال اس دعا کا بھی ہے۔ اس میں مسلمانوں پر ایک عظیم ذمہ داری ڈالے جانے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن پیرایۂ دعا میں اس عظیم ذمہ داری کو محبوبیت عطا کر دی ہے اور ساتھ ہی دل و دماغ کو اس راستے میں آنے والی مشکلات کے لیے تیار کر دیا ہے۔

Marfat.com

بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مفہوم

اس لیے آخر میں فرمایا:

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)

بے حساب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کے یہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ اللہ کی حاکمیت تو اس حد تک مرتب اور مکمل ہے کہ اس میں کسی چیز کا توازن درہم برہم نہیں ہوتا، حقوق میں اختلال پیدا نہیں ہوتا اور کوئی چیز اس کے حکم سے باہر نکل نہیں سکتی۔ اس لیے بے حساب کے دو مطلب لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ جب عطا کرنے پہ آتا ہے تو انسانوں کے پیمانے اس کی قدر و پیمائش سے عاجز رہ جاتے ہیں اور انسان کے ظن و گمان اس کے سامنے سمٹ جاتے ہیں اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے یَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (وہ وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے سان گمان بھی نہیں ہوتا) اس کی بہترین مثال حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے۔ آپؓ رفع حاجت کے لیے کھجوروں کے ایک جھنڈ میں جا کے بیٹھے۔ آپؓ نے دیکھا کہ ایک چوہا بل سے نکلا۔ اس کے منہ میں سونے کی ایک اشرفی تھی جو اس نے بل سے باہر رکھ دی اور پھر بل میں گھس گیا۔ اس طرح اس نے سترہ چکر لگائے اور سترہ اشرفیاں لا کر باہر رکھ دیں اور پھر اس کی نگرانی کے لیے بیٹھ گیا۔ حضرت عبداللہ اپنی حاجت سے فارغ ہوئے تو اس کی طرف بڑھے وہ انہیں دیکھ کر بل میں گھس گیا۔ آپؓ نے وہ اشرفیاں اٹھائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سارا واقعہ سنا کر پوچھا کہ میرے لیے ان اشرفیوں کا استعمال حلال ہے یا حرام؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ حلال اور طیب رزق ہے جو تجھے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طریقے سے عطا فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے متذکرہ بالا آیت پڑھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ چوہا ایک ایسا جانور ہے جو باہر کی چیزیں اپنے بل میں لے جاتا ہے، اپنے بل سے کوئی چیز لا کر باہر رکھ دے، یہ اس کی عادت اور معمول کے خلاف ہے۔ ایسے جانور کے ذریعے رزق دینا ''بغیر حساب'' کہلاتا ہے یعنی ایسے ذریعے سے رزق دیا گیا جس سے کبھی گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حاصل کلام یہ کہ بظاہر حالات ابھی مسلمانوں کے حق میں نہیں، لیکن اس کائنات کا مالک جلدی تبدیلی لانا چاہتا ہے، تم عنقریب دیکھو گے کہ یہود کی سازشیں دم توڑ جائیں گی، ان کی گڑھیاں اور ان کے قلعے انہیں پناہ نہیں دے سکیں گے۔ مشرکین عرب بالآخر سرنگوں ہو جائیں گے اور انسانوں کی اصلاح و فلاح کی ذمہ داری مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے گی اور یہ سب کچھ اس طرح سے ہوگا جس کا آج گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ مسلمان اسی طرح نوازے گئے اور مسلمانوں کے دشمن ایک ایک کر کے یا مسلمان ہو گئے یا قتل ہو گئے یا تحلیل ہو گئے۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر نماز کے بعد سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی اور آلِ عمران کی دو آیتیں ایک آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ آخر تک اور دوسری یہ آیت قُلِ اللّٰهُمَّ سے بِغَيْرِ حِسَابٍ تک پڑھا کرے تو میں اس کا ٹھکانہ جنت میں بنا دوں گا اور اس کو اپنے حظیرۃ القدس میں جگہ دوں گا اور ہر روز اس کی طرف ستر مرتبہ نظرِ رحمت کروں گا اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا اور ہر حاسد اور دشمن سے پناہ دوں گا اور ان پر اس کو غالب رکھوں گا۔

Marfat.com

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ○

(نہ بنائیں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کے خلاف اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچو، جیسا کہ بچنے کا حق ہے، اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) (۲۸)

پس منظر

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں یہود کے مذہبی عقائد پر تنقید اور ان کے کردار کے گھناؤنے پن کے اظہار کے ساتھ ان کی اصل شکل مسلمانوں کو دکھائی گئی اور انہوں نے اوس و خزرج پر جو اپنے مذہبی علم کا ایک رعب طاری کر رکھا تھا، اس کا پردہ چاک کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو آنے والے دنوں میں جو غلبہ اور استعلاء نصیب ہونے والا تھا دعا کی صورت میں اس کی بھی نشان دہی کر دی گئی۔ اس طرح سے مذہبی، علمی اور سیاسی طور پر آنے والے دنوں کی پردہ کشائی فرما کر یہود کی اصل حیثیت کو کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا اور مسلمانوں کو اپنے موقف کی سچائی سے بہرہ ور فرما کر بے پناہ عزم اور اعتماد سے مسلح فرمانے کے بعد پیش نظر آیتِ کریمہ میں ایک خاص حکم دیا گیا کہ تم اب تک یہود کے علم اور ان کی سیاسی اقتدار کی وجہ سے ان کے بارے میں ایک رائے رکھتے تھے اور تمہارے کمزور لوگ ان کے غلبے کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، لیکن اب جب کہ تمہارے سامنے تصویر کا ہر رخ بے نقاب ہوتا جا رہا ہے تو ہم تمہیں پالیسی کے طور پر یہ حکم دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو کبھی بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایسا رشتۂ ولا نہیں رکھنا چاہیے اور ایسے گہرے تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں جو صاف صاف مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہوں یا آگے چل کر مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔ یہاں مومنون سے مراد وہ مسلمان ہیں جو ابھی تک یہود کے علمی اور سیاسی اثر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ اور الکافرین سے مراد یہود ہیں۔

وقتی اور مستقل ہدایت

بات تو انہی کے حوالے سے ہو رہی ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ایک مستقل پالیسی بھی دی جا رہی ہے۔ اس وقت کے حالات کے مطابق تو مسلمانوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہود اس وقت گرتی ہوئی دیوار کی مانند ہیں جو عنقریب خود اس دیوار کے نیچے دفن ہو جائیں گے تو تم ایک ایسے گھر کی پاسبانی کیوں کر رہے ہو جس گھر کے اجڑنے میں چند روز باقی ہیں۔ لیکن مستقل پالیسی کے طور پر ایک اصول دے دیا گیا ہے کہ مسلمان بھی اسی سرزمین پر اپنی حکومتیں قائم کریں گے، ان کے اپنے ممالک کی ضرورتیں ہوں گی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ہر طرح کی ضرورت ملک کے اندر پوری ہو ممالک ہمیشہ ایک دوسرے سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور اسی لیے ایک دوسرے سے تعلق قائم کرتے ہیں۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اس لیے یہ بات از بس ضروری تھی کہ اس کی لیئے کوئی اصول دے دیا جاتا کہ غیر مسلم ممالک سے تعلقات کی نوعیت کیسی ہونی چاہیے؟ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسلمان بنیادی طور پر اللہ کے دین کا مبلغ اور مناد ہے۔ وہ کسی طور بھی اپنے اس بنیادی فریضے سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ یہ ذمہ داری جس طرح ہر فردِ مسلم پر ہے اسی طرح مسلمانوں کی ہر مملکت

Marfat.com

پر بھی ہے۔اس فرض کی ادائیگی ممکن نہیں ہوسکتی، تاوقتیکہ غیر مسلم ممالک اور حکومتوں سے مسلمانوں کے مناسب تعلقات نہ ہوں۔اس لیے یہاں مطلق تعلقات رکھنے سے منع نہیں فرمایا گیا بلکہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کی قید لگائی گئی ہے۔یعنی ایسا تعلق جو مسلمانوں کے خلاف ہو یا مسلمانوں کو نظر انداز کر کے قائم کیا جائے۔جس تعلق میں مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہو یا مسلمانوں میں عقیدے کے تحفظ میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ ہو۔ایسی تمام صورتوں میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے تعلقات قائم کرنے سے منع فرمایا گیا۔اس لحاظ سے جب ہم تعلقات کی نوعیت پر غور کرتے ہیں تو تعلقات کی چار صورتیں ذہن میں آتی ہیں، جس کی اہلِ علم نے وضاحت کی ہے۔

۱۔ موالاۃ : یہ قلبی تعلق اور محبت کا نام ہے یعنی دو شخصوں یا دو قوموں کے درمیان ایسے تعلق کا قائم ہو جانا جو حمیت اور حمایت کے جذبے کی صورت اختیار کر لے اور دونوں ایک دوسرے کی نگہبانی اور پاسبانی کا عہد کر لیں۔اسے موالات کہتے ہیں۔یہ قلبی رشتہ صرف مسلمانوں کے درمیان ہونا چاہیے، غیر مسلموں کے ساتھ اس کی اجازت نہیں کیونکہ اس طرح کا تعلق دو طرح کے نقصانات پر منتج ہوتا ہے۔ایک تو یہ کہ مملکت کا کوئی راز، راز نہیں رہتا۔عوام جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے حکمران فلاں غیر مسلم حکومت کے ساتھ بالکل بھائیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انتہائی باہمی شیر وشکر ہیں تو اس کا اثر مملکت کے ہر ادارے تک پہنچتا ہے۔جس کے بعد غیر مسلموں کے لیے مسلمانوں کے اندرونی معاملات اور حساس حالات سے باخبر ہونے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی اور دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگر مسلمان ملک اپنی تہذیب وتمدن اور تعلیم کے حوالے سے حساس نہیں ہے اور اسے اپنی بنیادی اقدار کا پوری طرح پاس نہیں تو غیر مسلم قوت کو مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن پر اثر انداز ہونے کا موقع ملتا ہے اور وہ تعلیم کے حوالے سے مسلمانوں کی برین واشنگ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔اس لیے اسلام نے اس تعلق کو کافر ملکوں کے ساتھ قائم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی ہے۔

۲۔ مواساۃ: اس کا معنی ہے ہمدردی، خیر خواہی اور نفع رسانی۔مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ دین اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود انسانی رشتہ رکھنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔اگر کوئی آفتِ ارضی وسماوی کسی کافر ملک میں آتی ہے اور وہ مدد کے لیے پکارتے ہیں تو انسانی رشتے کے باعث اسلام مسلمانوں کو مکلف کرتا ہے کہ وہ ایسے ملک کی مدد کریں۔قریشِ مکہ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قحط کے دنوں میں مدد طلب کی تو آپ ﷺ نے متعدد اونٹ کھجور کے لدوا کر مکہ روانہ فرمائے۔جس علاقے سے اہلِ مکہ کو غلہ ملتا تھا جب اس کا سردار مسلمان ہو گیا تو اس نے غلہ بند کر دیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے غلہ کی ممانعت ختم کر دینے کا حکم دیا۔البتہ! اس میں صرف ایک شرط ہے کہ یہ تعلق اس کافر ملک کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے جس کی مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ ہو رہی ہو یعنی اگر دونوں ملک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہیں ہیں تو پھر ان کے ساتھ خیر خواہی کا تعلق رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔سورۂ ممتحنہ میں پروردگار نے واضح طور پر اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ارشاد فرمایا:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ط

(اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے نہیں دین کے معاملے میں، اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو) (الممتحنة : ۸)

Marfat.com

اسی حکم کی وجہ سے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ احسان کا سلوک کیا اور غیر مسلم ممالک کے ساتھ بھی ہمیشہ ہمدردی کا رویہ اختیار کیا۔

۳۔ مدارات: اس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ۔ اس کی بھی غیر مسلموں کے ساتھ اجازت ہے اور اگر دو مقاصد میں سے کوئی مقصد پیشِ نظر ہو پھر تو اسے واجب ٹھہرایا۔ ایک تو یہ کہ غیر مسلموں کے جس گروہ یا جس ملک سے امید کی جاسکتی ہو کہ وہ اسلام کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ انہیں اسلام کی تبلیغ و دعوت پر کوئی اعتراض نہیں اور وہاں کے لوگوں میں قبولیتِ اسلام کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں تو ایسے ملک اور ایسے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھنا اور خوش خلقی کا اظہار کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کا مہمان ہو۔ ایسی صورت میں مسلمان میزبان کے لیے غیر مسلم مہمان کا اکرام کرنا، اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال کرنا ضروری ہے۔

۴۔ معاملات: میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تمام ممالک کو اپنے اقتصادی حالات کی بہتری اور ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تمام ممالک سے تجارتی تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ صنعت و حرفت کا تبادلہ کرنا پڑتا ہے، بعض دفعہ ایک دوسرے کے ملکوں میں اجرت اور ملازمت کے معاہدے بھی طے پاتے ہیں۔ ایسے معاملات غیر مسلموں کے ساتھ رکھنے کی مسلمانوں کو آزادی دی گئی ہے۔ وہ شوق سے ان کے ساتھ تجارت کریں اور ملک کو جس قسم کے تعلقات کی ضرورت ہو اسے بروئے کار لائیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ جس تعلق سے مسلمانوں کو روکتا ہے وہ صرف موالاۃ کا تعلق ہے۔ اس لیے کہ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ کوئی بھی کافر اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے بارے میں غیر جانبدار نہیں ہوتا اور اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اسلام کو اپنے دین پر ترجیح دینے لگے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا چونکہ دل و دماغ کا رشتہ اپنے دین سے ہے تو وہ اس رشتے کو مسلمانوں کے ساتھ کبھی نہیں جوڑ سکتا۔ وہ مفادات کے حصول کی کوشش تو کرے گا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیر بھی کرے گا، لیکن اسلام اور مسلمانوں سے قلبی روابط قائم کر لے، یہ ممکن نہیں۔ تو مسلمان جن کا حقیقی تعلق صرف اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین سے ہے ان کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ کافر کو بھی اپنے دل میں جگہ دے دیں۔ اس لیے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۝

(تم کوئی ایسی قوم نہیں پاسکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو پھر وہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں خواہ اپنے باپ دادا ہی ہوں یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی یا اپنے خاندان والے)

Marfat.com

کفر اور اسلام باہمی متضاد ہیں

کفر اور اسلام دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ جس طرح اندھیرا اور اجالا اکٹھے نہیں ہو سکتے اسی طرح کفر اور اسلام کی مصلحتیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ جس دل میں اسلام کی روشنی ہے وہاں کفر کا اندھیرا نہیں آ سکتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک ہی دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت بھی ہو اور ساتھ ہی کفر سے پینگیں بھی بڑھائی جا رہی ہوں۔ مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے پیٹ میں دو دل پیدا نہیں فرمائے) اگر دو دل ہوتے تو متضاد تعلقات بھی الگ الگ دونوں دلوں میں رہ سکتے تھے۔ دل چونکہ ایک ہے اس لیے وہ ایک ہی محبت سے آباد رہ سکتا ہے۔ اس میں دو محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے محبت کا رشتہ اگر اللہ اور اس کے رسول سے قائم ہے تو پھر یہ رشتہ کسی اور کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک باقی تعلقات کی قسموں کا تعلق ہے وہ حربی کافروں کے سوا تمام دوسرے لوگوں سے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ حربی کافروں سے مراد وہ کافر ملک ہیں جن کے ساتھ مسلمان حالتِ جنگ میں ہوں۔ البتہ! آج کی دنیا میں حالتِ جنگ کی دو قسمیں ہیں ایک تو حالتِ جنگ وہ ہے جب باقاعدہ جنگ جاری ہو اور دوسری حالتِ جنگ وہ ہے جبکہ جانبین ایک دوسرے کی نفرتوں میں جل رہے ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتے رہتے ہوں۔ بعض دفعہ سرحدوں پر فوجیں بھی لا کھڑی کرتے ہوں۔ ایک دوسرے کے ملکوں میں جاسوس بھیج کر حساس معلومات بھی حاصل کرتے ہوں اور موقع ملنے پر وارداتیں بھی کراتے ہوں۔ لیکن حکومت کی سطح پر بظاہر مذاکرات بھی ہو رہے ہوں۔ ایسے ملک کے ساتھ بھی مذاکرات کے علاوہ کوئی دوسرا تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا۔

غیر حربی کافروں سے تعلقات کی شرط

غیر حربی کافر ممالک سے ہر طرح کے تعلقات رکھے جا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک شرط ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو اور مسلمانوں سے مراد صرف اپنے ملک کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمان مراد ہیں۔ اگر وہ ملک لالچ دے کر یا دھمکی دے کر کسی دوسرے مسلمان ملک کے خلاف تعلق قائم کرنا چاہے تو ایسا تعلق سراسر حرام ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ کسی جگہ بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ پوری امت اور ملت کا نقصان ہے۔ جس کے لیے پوری امت قیامت کے دن جواب دہ ہوگی اور اگر وہ مسلمان ملک جس کے خلاف اتحاد کیا جا رہا ہے پڑوسی ہو تو اس کے حقوق دوگونہ ہو جاتے ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور دوسرا پڑوسی ہونے کی حیثیت سے۔ اس کے خلاف نہ صرف کہ کسی کافر حکومت کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کی حفاظت بھی واجب ہو جاتی ہے۔ دوسرے مسلمان پڑوسی ممالک اس کی ہر طرح مدد کرنے کے دینی طور پر پابند ہیں اور اگر وہ اپنی کمزوریوں کے باعث مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تو یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ دشمن ملک کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا باعث بنیں۔ اس معاملے میں اسلامی احکام بہت واضح اور بہت حساس ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے سب سے مقدس اور اہم ترین رشتہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ جن کی حرمت تحفظ ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ لیکن اگر کبھی کوئی مسلمان کافروں کے قابو آ جائے اور وہ اسے بندوق کی نوک پر مجبور کریں کہ تم اپنے اللہ یا رسول کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہو تو ایسی صورت میں اس مجبور مسلمان کے لیے عزیمت کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ جان دے دے لیکن کلمۂ کفر زبان

Marfat.com

پر نہ آنے دے۔ لیکن اگر وہ یہ عزیمت نہیں دکھا سکتا تو اسے اس بات کی رخصت دی گئی ہے کہ وہ زبان سے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے بشرطیکہ اس کا دل پوری طرح ایمان کی قوت سے بھرپور ہو۔ صرف جان بچانے کے لیے اسے اس طرح کا کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی مسلمان سے بندوق کی نوک پر یہ کہا جائے کہ تم فلاں شخص کو گولی مار دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے اس شخص کے لیے کسی طرح بھی اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے مسلمان بھائی کو مجبوراً بھی گولی مارے۔ اگر اس کی جان بھی چلی جائے تو اسے پرواہ نہیں کرنی چاہیے، اسے اللہ تعالیٰ درجۂ شہادت عطا فرمائیں گے۔ لیکن وہ محض اپنی جان کی حفاظت کے لیے دوسرے مسلمان کو ہرگز نشانہ نہیں بنا سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

(''اگر ایک طرف مسلمان کا خون بہہ رہا ہو اور دوسری طرف کعبہ گر رہا ہو تو میں پہلے مسلمان کو بچانے کی کوشش کروں گا'')

مزید فرمایا کہ:

اگر ساری دنیا بھی مل کر کسی مسلمان کے قتلِ ناحق کا ارتکاب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس خونِ ناحق کے قصاص میں پوری دنیا کو بھی جہنم میں ڈالنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

ان باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے جو پالیسی دی گئی ہے وہ کس قدر واضح ہے۔ لیکن امتِ مسلمہ کے لیے یہ کس قدر عظیم حادثہ ہے کہ آج خود مسلمان ممالک مسلمانوں کے خلاف اس غیر مسلم قوت کے اتحادی بنے ہوئے ہیں جس کے دشمنِ اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اپنے وسائل مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے میں دشمنوں کے حوالے کیے جا رہے ہیں اور اسے نیکی سمجھ کر انجام دیا جا رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن شائد جو حکمران اس جرم کے براہِ راست مرتکب ہو رہے ہیں انہیں طویل انتظار نہ کرنا پڑے کیونکہ قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں واضح طور پر ان کے انجام کی خبر دے دی ہے۔ دنیا میں ممکن ہے کہ پروردگار انہیں ڈھیل دیتا رہے، لیکن آخرت میں ان کا انجام وہی ہوگا جو کافروں کا ہوگا کیونکہ اس آیت میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ○

(اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں (مسلمانوں سے ان کی کوئی دوستی نہیں) تو جو ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا)

اس میں واضح طور پر فرما دیا گیا کہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کرنے والے اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو انجام کافروں کا ہوگا اور ساتھ ہی ایک بہت بڑی حقیقت بھی منکشف فرمائی گئی کہ جتنی کافر قومیں ہیں وہ بظاہر بے شک ایک دوسرے کے خلاف ہوں، لیکن جب بھی ان میں سے کسی قوم کا مسلمانوں سے تصادم ہوگا تو تمام کافر قومیں اس کافر قوم کا مسلمانوں کے خلاف ساتھ دیں گی کیونکہ اسلام اور مسلمان کی دشمنی ان کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے۔ وہ کسی طرح بھی اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ محض اپنے

Marfat.com

مفادات کے لیے مسلمان ملکوں کو اپنے معاہدات میں بھی شریک کریں گے، لیکن کوئی نازک وقت آئے گا تو ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے خلاف، مسلمانوں کے دشمنوں کے حق میں ہوں گی۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جس سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے پردہ اٹھایا گیا اور آج تک ہر دور میں وقت نے اس حقیقت کو ثابت ہوتے دیکھا۔ لیکن انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار نہ جانے اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتے۔ ہماری اور ہمارے دشمنوں کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہے

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کا مفہوم

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً آیتِ کریمہ کے اس جملے کے انطباق میں اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ آیتِ کریمہ میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کو دوست نہ بنائیں، یہ جملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کافروں میں گھر جائے اور اسے اس بات کا یقینی اندیشہ ہو کہ اگر میں نے ایمان کا اظہار کیا یا ان کے سامنے اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کی تو یہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے تو اس کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ ان کے ساتھ اس طرح رہے کہ وہ اسے اپنی صف کا آدمی سمجھیں۔ اس کا ظاہری رویہ ان کے ساتھ بہتر اخلاق پر مبنی ہو۔ اس کے طور اطوار سے کسی طرح بھی اجنبیت کا احساس نہ ہونے پائے۔ اگر وہ اسلام کے بارے میں کوئی ناگوار بات بھی کہیں تو یہ خاموش رہے۔ لیکن اگر وہ اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہیں اور اس سے کوئی ایسا کام لینا چاہیں جس سے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں۔ البتہ! عام معاملات میں وہ ان کے ساتھ رہنے سہنے میں آزاد ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اپنی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دینے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو، لیکن مکرر یہ بات عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف یا مسلمانوں کی اجتماعی مصلحتوں کو نقصان پہنچا کر کسی کام کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ اس کے لیے اگر جان بھی دینی پڑے تو دینا ہوگی کیونکہ مسلمانوں کی اجتماعی مصلحتیں، مسلمانوں کی جان اور اسلام کی عزت و آبرو اس کی جان سے زیادہ قیمتی ہیں۔ تو اس جملے میں اسی بات کی اجازت دی گئی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ جملہ آیت کے اصل حکم سے مستثنیٰ نہیں بلکہ اپنے ساتھ والے جملے سے مستثنیٰ ہے۔ یہ جو فرمایا گیا کہ مسلمان کافروں کے ساتھ دوستی کا رشتہ نہ رکھیں اور جو شخص مسلمانوں کے خلاف کافروں سے دوستی کا رشتہ رکھے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس نفی سے استثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ سے تعلق رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچا کر رکھا جائے جو اللہ، اس کے دین اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں یعنی اللہ سے تعلق ان لوگوں کا ہوگا جو تا حدِ آخر کافروں سے مخالفِ اسلام موالاۃ سے بچیں گے اور یہ بچنا محض زبان کا جمع خرچ نہیں ہوگا بلکہ اس طرح بچیں جس طرح بچنے کا حق ہے۔ اسی سورت میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اے مومنو! اللہ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے)

اسی طرح یہاں بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ کافروں سے موالاۃ کا تعلق قائم کرنے میں اس طرح بچیں جس طرح بچنے کا حق ہے۔ یہاں بھی تُقٰىةً مفعول مطلق واقع ہوا ہے جس سے فعل کی تاکید مقصود ہے۔

Marfat.com

وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے) اس میں کمزور مسلمانوں یا منافقین کو تنبیہ ہے کہ تم غیر مسلم قوتوں سے اس لیے ترکِ تعلق کرنے سے ڈرتے ہو کہ کہیں تم کسی مشکل میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل تعلق اللہ سے ہونا چاہئے۔ تم اسی سے ڈرو اور اسی سے امیدیں رکھو لیکن تم انسانی قوتوں سے اللہ سے بڑھ کے ڈرتے ہو اور اصل قوت و طاقت کا سرچشمہ انہیں سمجھتے ہو۔ تو ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ کس قدر قوتوں اور قدرتوں کا مالک ہے۔ اس نے تمہیں مہلتِ عمل دے رکھی ہے اور اپنی رحمت کی وجہ سے تمہاری بداعمالیوں کے باوجود تمہیں ڈھیل دے رہا ہے، تو تمہیں اس کی شانِ کریمی سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ وہ جس طرح رحیم و کریم ہے اسی طرح عادل بھی ہے۔ جب اس کی صفتِ عدل کا ظہور ہو گا تو پھر تمہیں پچھتاوے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ اس وقت مہلتِ عمل ختم ہو چکی ہو گی۔ تم پلٹنا چاہو گے لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ اس لیے اب تمہیں موقع ہے کہ اللہ کی ذات کا ڈر اپنے اندر پیدا کرو اور باقی ہر طرح کے خوف سے اپنے آپ کو نجات دے دو اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہاں ہمیشہ کسی کو زندہ نہیں رہنا۔ ایک نہ ایک دن اس زندگی کا خاتمہ ہونا ہے۔ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانا ہے) اگر اس نے یہاں گرفت نہ فرمائی تو قیامت کے دن تو ہر صورت میں اس کے عدل کا ظہور ہو گا۔ ہر ایک کے ایمان و عمل کی جانچ ہو گی، اعمال تولے جائیں گے۔ اس دن تم اگر ایمان سے محروم رہے تو یہود سے تمہارے تعلقات تمہیں سزا سے بچا نہیں سکیں گے۔ اس دن تو اسے پناہ ملے گی جس پر اللہ رحم فرمائے گا۔ اس دن اندازہ ہو گا کہ اللہ کی ذات کتنی عظیم ہے اور تم نے اس کے مقابلے میں دوسری قوتوں کو بڑا سمجھ کر کیسی حماقت کی تھی اور آج کوئی قوت اس کے غضب سے تمیں بچا نہیں سکے گی۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَہَا وَبَیْنَہٗٓ اَمَدًا ۢ بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ ○

(کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○ جس دن موجود پائے گا ہر شخص جو اس نے نیکی کی ہو گی اور جو اس نے برائی کی ہو گی اور وہ آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور اس کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہو جائے اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے) (۲۹، ۳۰)

محبت اور دوستی کا تعلق چونکہ دل سے ہے اور دل ایک ایسی گہری وادی ہے کہ جس کے ایک ایک احساس کو جاننا اور اس کی ایک ایک لہر کو گننا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ ایک شخص چرب زبانی سے اپنی محبت کا اظہار کر کے دوسرے کو یقین دلا دیتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتا ہوں اور سننے والا اس کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر یقین کر لیتا ہے۔ لیکن حالات ثابت کرتے ہیں کہ اس کا زبانی اظہار دھوکا دہی کی واردات کے سوا کچھ نہ تھا اور یہی وہ مرحلہ ہے جس میں ہمیشہ تعلقات آزمائے جاتے ہیں اور انسان اسی طرح ایک دوسرے کو

Marfat.com

فریب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو آدمی اللہ کی صفات کا استحضار نہیں رکھتا وہ اپنے دینی تعلق میں بھی انہی کمزوریوں کا شکار رہتا ہے۔ زبان سے کچھ کہتا ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ اے پیغمبر! ان پر یہ بات واضح کر دو کہ تم اپنے سینے کی باتوں کو ظاہر کر دو یا چھپاؤ اللہ کی ذات کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، وہ تمہارے سینوں کے اسرار سے پوری طرح آگاہ ہے۔ تمہارے دل میں خیال کی لہر بعد میں اٹھتی ہے اللہ کے علم میں پہلے سے ہوتی ہے اور صرف تم ہی نہیں اس کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کے علم میں نہ ہو۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا (زمین پر کوئی پتہ نہیں گرتا مگر اللہ اسے جانتا ہے) خزاں میں زمین پر گرنے والے پتوں کو کون شمار کر سکتا ہے اور پوری زمین پر اٹھنے والوں آہٹوں کو کون سن سکتا ہے؟ لیکن اللہ کے علم کی وسعتوں کا کیا ٹھکانہ ہے کہ وہ ایک ایک پتے کو گرتا ہوا دیکھتا ہے اور اس کے گرنے کی آہٹ سنتا ہے۔ سمندر کی نچلی تہہ میں اگر کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو اللہ اس کی حرکت کو جانتا ہے، زمین کی پہنائیوں میں گھاس کی پتی چھوٹتی ہے کوئی دانہ اگتا ہے، کوئی گٹھلی سوئی نکالتی ہے، کوئی سیپ منہ کھولتی ہے، کوئی قطرہ گہر بنتا ہے، سورج کی کوئی کرن نکلتی ہے، کوئی کلی چٹکتی ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کے علم میں نہ ہو۔ جس طرح اس کا علم مکمل اور بے مثال ہے اسی طرح اس کی قدرتوں کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ اگر آج تم اس کے علم کی وسعتوں اور اس کی قدرتوں کی بے پناہی کو دل و دماغ میں بٹھا لو تو عاقبت سنور جائے گی اور زندگی پاکیزہ ہو جائے گی ورنہ اس بات کو یاد رکھو وہ دن زیادہ دور نہیں جس دن ایک ایک شخص اللہ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا اور ہر شخص کے ہاتھوں میں اپنا نامۂ عمل ہوگا۔ اس نے زندگی میں کوئی نیکی کی ہوگی تو اس میں وہ بھی موجود پائے گا اور کوئی برائی کی ہوگی تو وہ بھی موجود ہوگی۔ آدمی کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی جب وہ دیکھے گا کہ جو اعمال میرے حافظہ سے اتر چکے تھے وہ سب اس میں موجود ہیں، وہ چیختے ہوئے کہے گا:

يٰـوَيْلَتٰى مَا لِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا
وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا

(ہائے شامتِ اعمال...... ! یہ نامۂ عمل کیسا ہے؟ نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتا ہے نہ کوئی بڑی، انہوں نے زندگی بھر جو کیا ہوگا اس میں موجود پائیں گے (اب جزا سزا انہیں اعمال کے حوالے سے ہوگی) اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا)

اس وقت انسان آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور اس کی بد اعمالیوں کے درمیان ایک لمبی مسافت حائل ہو جائے تاکہ وہ اپنی بد اعمالیوں کو نہ دیکھ سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس وقت اس پچھتاوے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن اللہ کے کرم کا کیا کہنا، اللہ پھر امید کا چراغ روشن کرتا ہے اور دوبارہ وہی بات ارشاد فرماتا ہے جو پہلی آیت میں گزر چکی کہ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اس سے ڈرو اور اپنی بد اعمالیوں سے باز آ جاؤ۔ نفاق کا رویہ ترک کر دو، اسلام کے بارے میں یکسو ہو جاؤ۔ وہ بار بار اپنی ذات سے تمہیں اس لیے ڈراتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے لیے رؤف ہے۔ رؤف کا مصدر رأفة ہے۔ رأفت "دل کی نرمی اور خیر خواہی" کو کہتے ہیں۔ لیکن اس میں دفعِ شر کا پہلو غالب ہوتا ہے یعنی یہ ایک ایسی رحمت ہے جو بندوں کو ہر نقصان اور شر سے بچانا چاہتی ہے اور چونکہ اصل نقصان آخرت کا نقصان ہے اور اصل سزا جہنم کی سزا ہے اس لیے پروردگار اپنے بندوں کو اس سے بچانے کے لیے بار بار اپنی ذات کا حوالہ دے رہا ہے۔

Marfat.com

قُلْ
إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣١﴾ قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ
إِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾ ۙ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾ ۚ إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ
لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٥﴾
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَاۤ أُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ
بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى ۚ وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَ
إِنِّيْۤ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّأَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۗ
كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا ۗ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ
مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ
هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ
الْمَلٰۤئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ

Marfat.com

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ
الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ
رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ
اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع

رکوع: ۴۔ (کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے O کہہ دیجیے کہ اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ اعراض کریں (تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا O بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو سارے دنیا جہان پر برگزیدہ کیا ہے، یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے O یاد کرو! جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا تو اس کو میری طرف سے قبول فرما بیشک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے O تو جب اس نے اسے جنا تو اس نے (حیرت وحسرت سے) کہا: اے رب! میں نے تو جنم دیا ہے ایک لڑکی کو اور اللہ خوب جانتا تھا جو اس نے جنا اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا اور میں نے اس کا مریم نام رکھا ہے میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں O تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا اور اسے عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا نگران بنایا، جب بھی زکریا محراب میں اس کے پاس جاتے تو پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں۔ انہوں نے پوچھا: اے مریم! یہ تمہارے لیے کہاں سے آتا ہے؟ مریم بولی یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے O اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ عرض کی کہ اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد، بیشک تو ہی سننے والا ہے دعا کو O تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو اللہ کے کلمے کی تصدیق کرنے والا ہو گا، سردار ہو گا، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش ہو گا اور زمرۂ صالحین میں سے نبی ہو گا O (حضرت زکریا علیہ السلام) نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ اس حال میں کہ مجھے بڑھاپا آ چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اللہ نے فرمایا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے O اس نے کہا: اے میرے رب! تو

Marfat.com

میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کر) (۴۱ تا ۴۱)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (۳۱)

اس آیتِ کریمہ میں خطاب یہود سے بھی ہے اور ان مسلمانوں سے بھی جو اسلام کے بارے میں یکسو نہیں ہو رہے تھے۔ یہود کو ہمیشہ اس بات کا دعویٰ رہا کہ ہمارا اللہ سے خاص رشتہ ہے۔ ہم اس کے انبیاء کی اولاد ہیں، اس لیے ہم اللہ کے چہیتے ہیں۔ جب انہیں اسلام کی دعوت دی جاتی اور اللہ کے دین کی طرف آنے کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ بگڑ کر مسلمانوں سے کہتے کہ تمہیں بڑا دعویٰ ہے اللہ سے محبت کا حالانکہ ہم تم سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور وہ ہم سے محبت رکھتا ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر اس کا ثبوت بھی سامنے آنا چاہئے۔ ہر دور میں اللہ سے محبت اور اس کے تعلق کے لیے ایک ہی کسوٹی اور سند رہی ہے کہ اس دور میں آنے والے پیغمبر پر ایمان لایا جائے اور اس کا اتباع کیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں اللہ سے تعلق کا دعویٰ موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کے سوا ایک بے معنی بات تھی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد اللہ سے تعلق کی سند صرف یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے یا نہیں اور ان کا اتباع کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اللہ سے تعلق کی تفصیلات اور اس سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ اور اس کی شناسائی کا طریقہ اور اس کی صفات کی معرفت کا انسان کے پاس اللہ کے رسولوں کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ اپنی عقل سے کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ میرا پروردگار کیسا ہے؟ اور وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے تو جس آدمی کو اللہ کی محبت عزیز ہے وہ یقیناً اللہ کے رسول کی پیروی کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کے رسول کو ماننے اور پیروی کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ براہِ راست اللہ تک پہنچنا چاہتا ہے اور یا اپنے دعویٰ میں صرف سخن سازی سے کام لیتا ہے اور یہ دونوں باتیں کفر اور نفاق کے سوا کچھ نہیں۔ یہود سے اسی اصول کے تحت یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ تم اگر واقعی اللہ سے تعلق کے دعویٰ میں سچے ہو تو پھر اللہ کے آخری رسول پر ایمان لاؤ اور غیر مشروط طور پر اس کا اتباع کرو۔

منافقین سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم اگر اسلام کا دعویٰ کرنے میں سچے ہو اور اللہ کی بندگی کا دم بھرتے ہو تو پھر تمہیں اللہ کے رسول کے اتباع سے انکار کیوں ہے؟ اللہ کے رسولؐ کی ذات ایک اسوہ اور نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ سے محبت کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی محبت کے تقاضے کیا ہیں اور اس کی رضا اور خوشنودی کن باتوں میں ہے؟ اس کا علم اللہ کے رسول کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتا اور ویسے بھی محبت ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے ایک نمونے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ آدمی محض سخن سازی کو یا دعویٰ کو ہی محبت سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں ایک اسوہ موجود ہے۔ اس کی ذات اللہ کی پسند و ناپسند کا ایک نمونہ ہے۔ وہ ایک ایسا مینارۂ نور ہے جس کی روشنی میں صراطِ مستقیم کا سفر کیا جا سکتا ہے اور اسی کی زندگی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنا کسے کہتے ہیں؟ اس لیے

Marfat.com

تم اگر اپنے دعووں میں مخلص ہو تو اللہ کے رسول کا اتباع کرو۔ اس کا انعام تمہیں یہ ملے گا کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا، اس کی نوازشات کی بارش تم پہ برسنے لگے گی، تم اب تک جو غلطیاں اور کمزوریاں دکھا چکے ہو ان سب کو معاف فرما دے گا۔ اس کی ذات تو سرتاپا بخشش اور رحم ہے۔ کوتاہی بندے کی جانب سے ہوتی ہے، جیسے ہی بندہ اپنا استحقاق پیدا کرتا ہے اُدھر سے جواب ملنے میں دیر نہیں ہوتی۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○

(کہہ دیجئے کہ اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ اعراض کریں (تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا) (۳۲)

اطاعت احکام کی ہوتی ہے اور اتباع احکام سے لے کر اداؤں تک کا ہوتا ہے۔ مآل کار دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ پہلی آیت کریمہ میں نہایت نرم روی بلکہ از راہِ تلطف اتباع کی دعوت دی گئی اور ساتھ ہی نوازشات کی خبر بھی دے دی گئی۔ لیکن اس آیت کریمہ میں لہجہ بدل کر حاکمانہ اسلوب میں حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہیں بہر صورت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنا ہے۔ یہاں سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے۔ خالی دعوؤں سے کام نہیں چلتا، ایک ایک حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن اس صراحت اور تہدید کے بعد بھی اگر کچھ لوگ اعراض کا رویہ اختیار کریں اور مسلمانوں کے ساتھ یکسو ہونے کی بجائے پہلوتہی کا طریقہ اپنائیں۔ شامل رہنا بھی چاہیں اور الگ الگ بھی رہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ طریقہ کافر کا تو ہو سکتا ہے مسلمان کا نہیں۔ انہیں دعوت مسلمان بن کر رہنے کی ہے۔ اگر وہ اس سے ہٹ کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو یہ کفر کی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں جو محبت کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور گناہوں سے مغفرت کی نوید سنائی ہے وہ اتباع کرنے والوں کے لیے ہے۔ اگر یہ لوگ اتباع حتیٰ کہ اطاعت تک سے گریز کریں تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے رویئے میں کافر ہیں اور اللہ کافروں کو کبھی پسند نہیں کرتا اور ان سے کبھی محبت نہیں کرتا۔ یہی وہ بات ہے جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں ترغیب بھی دی اور تاکید بھی فرمائی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دین کا آغاز اللہ کے رسول کی اطاعت سے ہوتا ہے اور اس میں قوت اللہ کے رسول سے محبت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں اگر اپنے اندر اخلاص رکھتی ہیں اور ان میں کوئی جھول نہیں تو یقیناً اس سے اللہ کی محبت پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لیے جو شخص اللہ کے رسول کی اطاعت نہیں کرتا، لیکن ساتھ ہی وہ اللہ سے محبت کا دعویدار ہے یا رسول سے محبت کا دعویدار ہے تو وہ نہ جانتے ہوئے بھی نفاق کا شکار ہے اور بالآخر اس کا شمار کافروں میں ہو کر رہے گا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

كُلُّ اُمَّتِیْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی

(میری امت جنت میں جائے گی، ہاں! وہ نہیں جائے گا جس نے انکار کیا۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! کس نے انکار کیا؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا)

Marfat.com

ایک عرب شاعر نے کیا خوب بات کہی۔

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَ اَنْتَ تَظْهَرُ حُبَّهٗ
هٰذَا الْعَمْرِیْ فِی الزَّمَانِ بَدِیْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ
اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ

(تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اس حال میں کہ تو ان سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے، مجھے اپنی بقا کی قسم! زمانے میں یہ بالکل نئی بات ہے، اگر تو اپنی محبت میں سچا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا کیونکہ محبت کرنے والا ہمیشہ محبوب کا اطاعت گزار ہوتا ہے)

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

(بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو سارے دنیا جہان پر برگزیدہ کیا ہے، یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے) (۳۳، ۳۴)

اس سے پہلے کی آیت پر سورۂ آلِ عمران کی تمہید ختم ہوگئی جس میں اللہ کی توحید، دینِ اسلام اور اس کی مبادیات، انسانوں کے لیے وحیِ الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت، اہلِ کتاب میں پیدا ہونے والے اختلافات کا حل ہے۔ مضامین کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہود کے طرزِ عمل اور ان کی گمراہیوں سے پردہ اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپؐ کی حقانیت کو پوری طرح آشکار فرمایا گیا۔ اس کے بعد تمام دنیا کو عموماً اور یہود کو خصوصاً اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور انکار کرنے کی صورت میں انجام سے بھی آگاہ کیا گیا۔ آخری بات کے طور پر آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کو ایک مکمل راہنما اور مینارۂ نور کی طرح پیش فرما کر اتمامِ حجت کرنے کے ساتھ ساتھ نرمی سے آپؐ کے اتباع کی دعوت دی گئی اور پھر تہدید آمیز انداز میں اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر تم اس اطاعت سے انکار کرتے ہو تو یہ کافروں کا طریقہ ہے اور کافر اللہ کی سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔

تمہید میں بنیادی صداقتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہود پر تنقید بھی کی گئی کیونکہ مدینے میں اصل مؤثر رول انہی کا تھا۔ لیکن اہلِ کتاب ہونے کی حیثیت سے عیسائیت بھی دنیا میں اپنا ایک اثر اور کردار رکھتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت رومن ایمپائر کی مالک بھی تھی اور چند ہی سالوں بعد ان سے سابقہ بھی پیش آنے والا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ جن غلط فہمیوں کے باعث عیسائیت صراطِ مستقیم سے دور ہٹ گئی، ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور پوری دنیا کو سلسلۂ نبوت کی اصل بنیاد سمجھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیشِ نظر، پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے ایک دوسرے خطبے کا آغاز ہوتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ (۹) ہجری میں نازل ہوا جبکہ نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن

Marfat.com

اس کا مضمون چونکہ سورۂ آلِ عمران کے مضمون سے متحد ہے اس لیے اللہ کے حکم سے نو ہجری میں نازل ہونے والی ان آیات کو سورۂ آلِ عمران کا حصہ بنا دیا گیا۔ نجران سے آنے والا وفد عیسائیت کی ترجمانی اور نمائندگی کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ فتح مکہ کے بعد چونکہ ملک کا مستقبل اسلام اور آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آچکا تھا اس لیے عرب کے مختلف گوشوں سے آپؐ کے پاس وفود کی آمد شروع ہوگئی۔ اسی سلسلے میں نجران کا وفد بھی آیا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اس وقت اس علاقے میں تہتر بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار جنگی سپاہی اس میں سے نکالے جاسکتے تھے۔ اس جمہوریہ کی تمام تر آبادی عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ اس مملکت کا انتظام اور انصرام دنیوی اور دینی تین سرداروں کے ہاتھ میں تھا۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا اسید کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی اور سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا اور تیسرا اسقف (بشپ) تھا، جو ان کا مذہبی پیشوا تھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی اٹھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم جنگی طاقت ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے اور مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے مذہبی رہنما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کے بارے میں جو کچھ سن چکے تھے اس سے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ہماری کتابوں میں جس آنے والے نبی کا ذکر ہے، وہ آپؐ ہی ہیں۔ لیکن اپنی نسلی برتری اور ذہنی عصبیت کے باعث اسلام قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ساٹھ آدمیوں پر مشتمل یہ وفد تینوں سرداروں سمیت مدینے پہنچا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مذہبی اور سیاسی معاملات پر گفتگو کی۔ یہ لوگ چونکہ اپنا ایک مذہب رکھتے تھے اور اسی حوالے سے اسلام کے تابع رہنا انہیں پسند نہ تھا۔ ان کی اسی حیثیت کے پیش نظر ان سے زیادہ تر گفتگو مذہبی معاملات میں ہوئی اور اس سلسلے میں راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

ان آیات میں سب سے پہلے ان کی اصل بیماری کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔ ان کی اصل بیماری یہ تھی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول ماننے کی بجائے، اللہ کا بیٹا اور اس کی الوہیت میں اس کا شریک قرار دیتے تھے۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ارشاد فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے تھے، اللہ نے انہیں یہود کی ہدایت کے لیے چنا لیکن وہ اس برگزیدگی میں پہلے شخص نہ تھے۔ اس کا آغاز تو پہلے انسان سے ہوگیا تھا۔ حضرتِ آدم علیہ السلام نوعِ انسانی کے جدامجد ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اس مقام پر فائز فرمایا جس طرح ان سے انسانی نسل وجود میں آئی اسی طرح انسانوں کی راہنمائی کا آغاز بھی انہی سے ہوا پھر ہر دور میں انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو برگزیدہ فرماتا رہا اور ان سے انسانی راہنمائی کا کام لیتا رہا۔ نوح علیہ السلام جو لامخ کے بیٹے اور عراق کے رہنے والے تھے وہ حضرت آدم علیہ السلام سے بعض روایات کے مطابق دسویں پشت میں تھے۔ انہوں نے ساڑھے نو سو سال عمر پائی اور عمر کا بیشتر حصہ انسانوں کی ہدایت کے لیے صرف فرمایا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے آدمی اور انسان تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ عراق ہی میں سے انسانوں کی ہدایت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اٹھایا گیا جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام جیسے عظیم فرزند عطا کیے اور ان دونوں کے واسطے سے ہدایت کے دو سلسلے قائم ہوئے۔ ایک نے بنی اسرائیل کے نام سے مشرقِ وسطیٰ میں اللہ کے دین کا نور پھیلایا اور دوسرے نے آلِ اسماعیل کے نام سے عرب کو راہنمائی بخشی۔ انہی دونوں سلسلوں میں نبوت اور رسالت کا نور پھوٹتا رہا۔ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر انبیاء بنی اسرائیل میں آئے اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم آلِ اسماعیل یعنی قریش میں سے اٹھائے گئے۔ جس سلسلے

Marfat.com

نبوت نے مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر حصے کو راہنمائی بخشی اسی سلسلۂ بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جو باقی انبیاء کی طرح اللہ کی طرف سے برگزیدہ فرمائے گئے اور لوگوں کی ہدایت کے لیے انہیں چنا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے والد ماجد کا نام عمران بن ماتان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کے نواسے ہیں۔ آپ بیت المقدس کے امام اور کاہنِ اعظم تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم اور آلِ ابراہیم سے ہدایت رسانی کا کام لیا اسی مقصد کے لیے آلِ عمران میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا گیا۔ آپ کو نبوت دی گئی اور آپ پر کتاب نازل فرمائی گئی۔

اس آیتِ کریمہ میں عمران کے ذکر سے یا تو یہی عمران مراد ہیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا اور یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والدِ گرامی مراد ہیں جن کا نام عمران تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد میں سے تھے۔ دونوں باتوں میں سے جو بات بھی مراد لی جائے مقصود صرف یہ ہے کہ یہ سلسلۂ انبیاء جو انسانوں سے اٹھایا گیا اور یہ سلسلۃ الذہب جس نے ہمیشہ انسانوں کی شیرازہ بندی کی اسی کے ایک فرد اور اسی کی ایک کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں الوہیت کے تصورات کہاں سے پیدا ہو گئے جبکہ یہ تمام انبیاء ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور ایک دوسرے کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی تو سب انسان ہیں، اس کے ایک فرد یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر انسانی نسل سے الوہیت کے منصب پر کیسے فائز ہو گئے؟ اگر کسی کو یہ شبہ ہے کہ چونکہ ان کے والد نہیں اس لئے وہ یقیناً اپنے اندر الوہیت کی صفات رکھتے ہوں گے تو اس غلط فہمی کی کوئی بنیاد نہیں کیونکہ وہ بھی اپنے ماں کے بطن اسی طرح پیدا ہوئے ہیں جیسے باقی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ البتہ! یہ بات کہ ان کے والد نہیں، اس لیے ان کو خدا مان لیا جائے یہ نہایت بے عقلی کی بات ہے۔ آدم علیہ السلام کے سرے سے ماں باپ دونوں نہیں تھے۔ اللہ نے انہیں اپنی دستِ قدرت سے بنایا تھا اور اپنی قدرت سے ان میں روح پھونکی تھی۔ انہیں تو کبھی کسی نے خدا یا خدا کا بیٹا نہیں کہا، لیکن عیسیٰ علیہ السلام اپنا ننھیالی خاندان رکھتے ہوئے بھی اللہ کے بیٹے کیسے ہو گئے؟ چنانچہ اگلی آیاتِ کریمہ میں ان کی ولادت کے واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے تاکہ عیسائیوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا تدارک ہو سکے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

(یاد کرو! جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا تو اس کو میری طرف سے قبول فرما بیشک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے) (۳۵)

اس آیتِ کریمہ پر غور فرمائیے کہ عمران کی بیوی نے جن کا نام اسرائیلی روایات کے مطابق ''حنہ'' ہے۔ عام عورتوں کی طرح اپنے پیٹ میں حمل کی گرانی محسوس کی اور وہ سمجھ گئی کہ اللہ نے مجھے ایک امید سے گراں بار کیا ہے چونکہ وہ اپنے شوہر کی طرح اللہ کی نہایت پاک باز بندی تھیں، اس علیے اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں انہوں نے وہ دعا کی جو کوئی بھی نیک ماں تقربِ الٰہی کے لیے اپنے اللہ سے کر سکتی ہے۔ نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ میں اپنے اس ہونے والے بچے کو تیرے لیے تیرے گھر کی نذر کر دوں گی۔ میں اسے دنیا کے

Marfat.com

ہر کام سے آزاد کر کے تیرے گھر کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی تا کہ وہ شب و روز تیرے گھر کی خدمت کرے، وہاں کی جاروب کشی کرے، بندوں کی خدمت کرے اور تیری عبادت کا حق ادا کرے۔ جس طرح میں تیری عاجز بندی ہوں میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی تیرا عاجز اور فرمانبردار بندہ ثابت ہو۔ اندازہ فرمائیے! اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لیے ماں کا تصور سوائے ایک فرمانبردار بندے کے اور کچھ نہیں اور وہ اس کے لیے ایک آرزو رکھتی ہے کہ وہ اللہ کے گھر کی خدمت کرے۔ اس لیے وہ اپنی اس نذر اور پیش کش کے قبول کرنے کی استدعا کرتی ہے اور یہ بھی اس کے علم میں ہے کہ اللہ ہی سننے والا ہے اور اللہ ہی علم والا ہے۔ اس کے گمان میں یہ ہے کہ اللہ مجھے نرینہ اولاد عطا فرمائے گا تو میں اسے بیت المقدس کا خادم بناؤں گی۔ یہ اس دور میں دینی اعتبار سے سب سے بڑی آرزو تھی۔ لیکن:

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝

(تو جب اس نے اسے جنا تو اس نے (حیرت و حسرت سے) کہا: اے رب! میں نے تو جنم دیا ہے ایک لڑکی کو اور اللہ خوب جانتا تھا جو اس نے جنا اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا اور میں نے اس کا مریم نام رکھا ہے میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں) (۳۶)

پیدائش کے وقت ماں کو معلوم ہوا کہ مجھے تو اللہ نے بیٹے کے بجائے بیٹی دی ہے۔ اب اسے بڑا تردد پیش آیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہاں تو صرف لڑکوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ یا اللہ! میری گود سے تو لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور لڑکا تو لڑکی جیسا نہیں ہوتا کیونکہ جو خدمت لڑکا انجام دے سکتا ہے اور جس طرح وہ مردوں سے اختلاط رکھ سکتا ہے لڑکی اپنی نسوانیت اور اپنے حجاب کے باعث وہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن پروردگار نے ماں کی حکایت کے ضمن میں ارشاد فرمایا کہ اللہ کو خوب معلوم تھا جو کچھ اس نے جنا تھا۔ لیکن ماں کو معلوم نہیں تھا کہ جو لڑکی اس کے ہاں پیدا ہوئی ہے وہ کس قدر سعادتوں اور برکتوں کی امین ہے اور اللہ اس سے کتنی بڑی خدمت لینے والا ہے۔ ماں کے ذہن میں پیدا ہونے والی کے بارے میں ایک کہتری کا احساس پایا جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ پیدا ہونے والی بچی کل کو کتنی عظیم اور بابرکت ہستی بننے والی ہے۔ اس لیے ماں نے بڑی عاجزی سے درخواست کی کہ لڑکی لڑکے جیسی تو نہیں ہوتی لیکن میں چونکہ نذر مان چکی ہوں، اس لیے میں درخواست کرتی ہوں کہ اسی کو ہیکل کی خدمت کے لیے قبول کر لیا جائے اور پھر مستقبل میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت کے لیے میں اسے اللہ کی پناہ میں دیتی ہوں۔ اندازہ فرمائیے! ماں جس لڑکی کو اللہ کے حضور نذر کر رہی ہے وہ اسے لڑکی گمان کر کے احساسِ کہتری سے دبی جا رہی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ عیسائی اسی پیدا ہونے والی بچی کو خدا کی حیثیت دے کر نہ جانے کس دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس واقعہ میں قدم قدم پر بندگی اور فدویت عاجزی اور فروتنی کا اظہار ہو رہا ہے۔ لیکن عیسائیوں کے مذہبی رہنما اسی عاجزی اور فروتنی سے خدائی کشید کر رہے ہیں۔ اس داستان کا ایک ایک لفظ اگر خالص نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ صحیح عقیدہ کی طرف رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

Marfat.com

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۚ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

(تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا اور اسے عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا نگران بنایا۔ جب بھی زکریا محراب میں اس کے پاس جاتے تو پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں۔ انہوں نے پوچھا: اے مریم! یہ تمہارے لیے کہاں سے آتا ہے؟ مریم بولی یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے) (۳۷)

والدۂ مریم نے بچے کی بجائے بچی کے پیدا ہونے پر جس حسرت کا اظہار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے بالکل برعکس اس بچی پر اپنے انعامات کی بارش کردی۔ اسے حسنِ قبولیت سے نوازا اور اس طرح اس کی تربیت فرمائی کہ اس کی تمام عقلی، اخلاقی اور روحانی صلاحیتیں خوب پروان چڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اس بچی سے ایک بہت بڑا کام لینا تھا اس اپنی عنایات کے ساتھ ساتھ اس کے لیے خصوصی مربی کا بھی انتظام فرمادیا کہ ان کی کفالت وتربیت کی ذمہ داری حضرت زکریا علیہ السلام پر ڈالی جو حضرت مریم کے خالو بھی تھے اور اس دور میں بیت المقدس کے اسرائیلی اصطلاح میں کاہنِ اعظم بھی (اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام نے ایک محراب میں رکھا تھا۔ ہمارے یہاں محراب امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں لیکن لغت میں محراب کا معنی ہے اَكْرَمُ مَوْضَعٍ فِي الْمَجْلِسِ (مجلس میں سب سے باعزت جگہ) یہاں اس سے مراد وہ حجرۂ عبادت ہے جو سطحِ زمین سے کچھ بلندی پر بنایا جاتا ہے اور جس میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہیکلِ سلیمانی کے اردگرد ہیکل کے خادموں اور چلہ کشوں کے لیے جو کمرے بنے ہوئے تھے انہی میں سے ایک میں حضرت مریم مشغولِ عبادت رہا کرتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام چونکہ ان کے سرپرست تھے، اس لیے اکثر ان کی خبرگیری کے لیے ان کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہ جب بھی حضرت مریم کے پاس جاتے تو وہاں طرح طرح کے پھل دیکھتے۔ گرمی کے پھل سردی میں اور سردی کے پھل گرمی میں۔ تو حیرانی سے حضرت مریم سے پوچھا کہ تیرے پاس یہ پھل کہاں سے آتے ہیں؟ کیونکہ یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں آتا۔ پس مریم نے کہا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ اندازہ فرمائیے! ایک زیرِ تربیت بچی جو ابھی نوعمر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح دل ودماغ کی قوتیں عطا فرمائی ہیں اور کس طرح اپنی فیاضیوں سے نوازا ہے۔ اس سے بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ اللہ کی یہ نوازشات ان بندوں پر ہوا کرتی ہیں جنہیں وہ اپنا بنا لیتا ہے اور جو شب وروز اس کی بندگی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ایسے ہی بندوں کو اولیاء کہا جاتا ہے اور اس میں مرد وزن کی کوئی تقسیم نہیں۔ اللہ تعالیٰ مردوں کو بھی نوازتا ہے اور عورتوں کو بھی نوازتا ہے۔ حضرت مریم پیدائشی طور پر اللہ کی ولیہ تھیں۔ خصوصی حالات میں ان کی تربیت فرمائی گئی تاکہ مستقبل کی کٹھن ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے اضمحلال کا شکار نہ ہوں۔ لیکن اس پوری داستان میں صرف یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف سے بندگی، تواضع، خشیت اور عبادت ہے اور دوسری طرف سے عنایتیں اور انعامات ہیں۔ جو سراسر بندگی کے نتیجے میں نصیب ہورہے ہیں، لیکن اس میں الوہیت کے مفہوم کو داخل کرنا یا اس سے کشید کرنا ایک بگڑے ہوئے ذہن کا ہی کام ہوسکتا ہے یا وہ لوگ ایسا کرسکتے ہیں جو اللہ کے دین کو بگاڑنا چاہیں۔

Marfat.com

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَّدُنْكَ
ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ O

(اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ عرض کی کہ اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد۔ بیشک تو ہی سننے والا ہے دعا کو) (۳۸)

هُنَالِكَ کا مفہوم

هُنَالِكَ ظرف مکاں بھی ہے اور ظرف زماں بھی۔ یہ بھی ترجمہ ہوسکتا ہے کہ "اسی وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا" اور یہ بھی ہو سکتا ہے "وہیں زکریا نے اپنے رب کو پکارا" دونوں صورتوں میں توجہ دلانا یہ مقصود ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جو اللہ کے مقبول بندے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے تھے انہوں نے جب دیکھا کہ بے موسم اور تازہ پھل بغیر کسی واسطہ کے حضرت مریم کے پاس پہنچ جاتے ہیں تو فوراً خیال آیا کہ اولاد تو ماں باپ کی جوانی کا پھل ہے۔ میں بوڑھا کھوسٹ ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے۔ بظاہر اولاد کا موسم گزر گیا لیکن اگر وہ مریم جیسی پاکیزہ بچی کو بے موسم اور ترو تازہ پھل دے سکتا ہے تو اس سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک بوڑھے کی تمنا بھی پوری کر دے اور ایک بڑھیا کی گود ہری کر دے اور ممکن ہے کہ یہ خیال بھی آیا ہو کہ اگر وہ مریم کی والدہ کو مریم جیسی پاکیزہ اور صاحب کرامت بچی عطا کرسکتا ہے تو کیا تعجب ہے کہ مجھے بھی ایک پاکیزہ صفت بیٹا عطا کر دے۔ چنانچہ بڑھاپے کی وجہ سے جو خواہش دب چکی تھی اور جسے زبان پر لانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اسے مریم کی صفات و کمالات اور اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی عنایات نے زبان پر لانے کی جرأت عطا کر دی۔

توجہ طلب باتیں

یہاں متعدد باتیں توجہ طلب ہیں۔ پہلی یہ بات کہ حضرت زکریا اپنے تمام روحانی کمالات کے باوجود یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ کی قدرت کسی موسم کی محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو صحراؤں میں حباب اٹھا دے اور چاہے تو سمندر کو پایاب کر دے۔ دنیا کا ہر چھوٹا بڑا آدمی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اسی ذات بابرکات کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا محتاج ہے، اسباب کی احتیاج ہم بندوں کے لیے ہے۔ اللہ جب کسی پر کرم فرماتا ہے تو وہ اسباب سے بے نیاز ہو کر فرماتا ہے۔ اسے کبھی اسباب کی احتیاج نہیں ہوتی، وہ مسبب الاسباب ہے۔ اسباب اس سے اثر اور خواص کی بھیک مانگتے ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ روحانیت، خدا پرستی، اللہ کا قرب ترکِ دنیا میں نہیں بلکہ دنیا کو اللہ کے احکام کے مطابق برت کر دکھانے میں ہے۔ ترکِ دنیا تو ذمہ داریوں سے فرار کا راستہ ہے اور یہ سب سے آسان راستہ ہے۔ انسان کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ بازار سے گذرے اور خریدار نہ ہو، وہ محض اس خیال سے دریا کی موجوں سے کنارہ کش نہ رہے کہ میرا دامن تر ہو جائے کیونکہ مقصود اپنے دامن کو پانی سے بچانا نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ اگر دامن تر ہو جائے تو ہاتھوں میں اتنی طاقت ہونی چاہیے وہ جب چاہیں دامن کو نچوڑ دیں۔ اگر اولاد کی خواہش دنیا داری ہوتی تو پیغمبر کبھی اس کی خواہش نہ کرتے اور اپنے پیروؤں کاروں کو کبھی اس اجازت نہ دیتے اور مزید یہ بات کہ انسان کو اس کے فطری جذبات سے الگ کر دینا یہ انسانیت اور فطرت میں جنگ کا راستہ کھولنا ہے جو سراسر غیر انسانی اور غیر فطری بات ہے۔ جس کے نتیجے میں یا انسانیت ناکام ہو جاتی ہے اور یا فطرت اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

Marfat.com

سے بھی بڑھ کر نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کا قافلہ سمٹ کر رہ جاتا ہے اور جو کسی طرح بھی اللہ کو پسند نہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جا بجا اللہ کے نیک بندوں کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے۔ جس میں اولاد کی خواہش کا بار بار اظہار کیا گیا ہے۔ تیسری چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کی دعاؤں میں صرف اولاد کی خواہش کا ذکر نہیں بلکہ اولاد کی خواہش کو کہیں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے ساتھ مشروط کیا گیا اور کہیں قرة العين کے ساتھ یعنی انہوں نے جب بھی اولاد مانگی ہے تو صرف اولاد نہیں بلکہ ایسی اولاد مانگی ہے جو نیک سیرت اور اللہ کی فرمانبردار ہو۔ جن کے طور اطوار ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں، جن کی جوانی دین اور انسانیت کی شوکت کا اظہار اور جن کی کہولت دینی تجربہ اور دینی فکر کی غماز ہو اور چوتھی بات کی طرف آیتِ کریمہ کے آخری لفظ نے اشارہ کیا کہ اللہ کے نیک، صالح اور مقرب بندے اپنے مقاماتِ بلند کے باوجود اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے کہ کائنات کے فیصلوں اور انسانی مقدر کی تعمیر میں ہمارا بھی کوئی دخل ہے۔ اس لیے وہ اس بات کا ضرور اظہار کرتے ہیں کہ یا اللہ دعاؤں کا سننے والا، قبولیت سے نوازنے والا اور ناموافق حالات میں بھی امیدوں کا پورا کرنے والا صرف تو ہے۔ سورۂ مریم میں تو اس بات کو مزید کھول کر دعا میں ذکر کیا گیا ہے کہ یا اللہ! میری ہڈیوں میں گودا تک نہیں رہا۔ میرا سر بڑھاپے سے ہلنے لگا ہے اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے جس سے اولاد کی امید نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کے باوجود تیرے سامنے ہاتھ پھیلا کر مجھے بدبختی کا کوئی ڈر نہیں۔ تو ہر طرح کے حالات میں امیدیں پوری کرنے پر قادر ہے۔ اللہ کی رحمت سے پر امید رہنا، اسی کے سہارے زندگی گزارنا، اسی کی بے پناہ طاقتوں پر یقین رکھنا ایک مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ چنانچہ جب اس یقین سے بہرہ ور ہو کر ایک مومن اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو بالعموم ادھر سے استجابت آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ ادھر سے حضرت زکریا علیہ السلام نے درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی آواز میں دعا مانگی ادھر سے آواز آئی:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰي مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو اللہ کے کلمے کی تصدیق کرنے والا ہوگا، سردار ہوگا، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش ہوگا اور زمرۂ صالحین میں سے نبی ہوگا) (۳۹)

فرشتوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت اس وقت دی جب وہ محراب میں نماز ادا کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے محراب میں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس رکھے ہوئے تر و تازہ پھلوں اور حضرت مریم کی غیر معمولی شخصیت سے جو غیر معمولی اثر قبول کیا، دل و دماغ تو یقیناً اسی وقت اس سے مہک اٹھے لیکن اس کا اظہار انہوں نے اپنے محراب میں آ کر نفل نماز میں کیا کیونکہ نماز کی حالت ایک طرف قربِ الٰہی کی غماز ہے اور دوسری طرف بندگی کے اظہار کی سب سے پاکیزہ صورت ہے۔ نماز ہی میں آدمی سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے رب سے راز و نیاز کرتا ہے۔ ایسی حالت میں زبان سے جو دعا نکلتی ہے وہ اپنی عاجزی اور فروتنی میں بھی بے مثال ہوتی ہے اور اللہ کے درِ اجابت کو حرکت دینے کی بھی اپنے اندر طاقت رکھتی ہے۔ چنانچہ عاجزی اور سرافندگی اور امید اور آرزو کی توانائی دونوں نے مل کر جب اللہ کی بارگاہ میں التجا کی صورت اختیار کی تو ادھر سے فرشتوں کو زکریا علیہ السلام کے لیے بشارت دینے کا حکم ملا اور بشارت صرف بیٹے کی نہیں ملی بلکہ بیٹے کی صفات کا ذکر فرما کر حضرت زکریا علیہ السلام کی ان دعاؤں کو قبول کر لیا گیا جن کی وہ اپنے بیٹے سے امید لگائے بیٹھے تھے۔

Marfat.com

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات اور فرائض

سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ[1] آنے والا بیٹا اللہ کے کلمے کا مصدق بن کر آئے گا اور اس کا نام ''یحییٰ'' ہوگا اور یہ یحییٰ وہی ہیں جنہیں انجیلوں میں ''یوحنا'' کہا گیا ہے[1] اور سورۂ مریم میں بتایا گیا کہ بشارت میں یہ بات بھی فرمائی گئی کہ اس بیٹے کا نام یحییٰ رکھنا اور[2] اس نام کا بچہ ہم نے آج تک دنیا میں پیدا نہیں کیا[1] اور اس آنے والے کی اصل ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلمے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تصدیق کرنے کے لیے آئے گا۔ یہاں کلمۃ اللہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور کلمہ پر تنکیر لا کر یہ اشارہ کر دیا گیا کہ کائنات میں اور بھی بہت سے کلمات ہیں، انہیں میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کلمۃ اللہ سے مراد یہ ہے کہ ان کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف اللہ تعالیٰ نے کلمہ ''کُن'' سے فرمائی۔ دنیا میں ہر آنے والا بچہ ماں باپ کے اتصال سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بغیر باپ کے اللہ کے کلمہ ''کُن'' سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر یہ ایک طرف اللہ کی قدرت کا غیر معمولی اظہار ہے تو دوسری طرف انسانوں کے لیے آسانی سے الزام لگانے کا موقع بھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں پیدائش کے بعد ہی لوگوں کے سامنے اس طرح لاتا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کی غیر معمولی آمد کو اپنی نگاہوں سے دیکھتی اور بچپن ہی میں انہیں اللہ کا رسول ہونے کی گواہی دیتی۔ دوسری یہ بات کہ کسی برگزیدہ شخصیت کو ان کا راستہ صاف کرنے کے لیے بھیجا جاتا اور خود وہ برگزیدہ شخصیت دنیا میں ان کا نقشِ اول ثابت ہوتی۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اسی لیے دنیا میں تشریف لائے کہ ایک طرف تو ان کے والدین موجود ہونے کے باوجود بھی کالعدم تھے کیونکہ دونوں اولاد کی عمر سے نکل چکے تھے۔ والدِ گرامی انتہائی ضعف کی حالت کو پہنچ چکے تھے اور والدۂ ماجدہ بانجھ پن کی عمر گزار رہی تھیں۔ بظاہر اسباب ان سے بچے کی پیدائش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرتا کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم پہلے یہ تو ثابت کریں کہ ان کا باپ کون ہے؟ کیونکہ بغیر باپ کے تو کوئی بچہ دنیا میں نہیں آسکتا تو حضرت یحییٰ کہہ سکتے تھے کہ میری مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔ میں عملی لحاظ سے بغیر ماں باپ کے صرف اللہ کی قدرت سے دنیا میں آیا ہوں اور مزید یہ کہ[3] حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جس طرح زندگی گزاری وہ حیرانی کی حد تک پاکیزہ زندگی تھی، جس کی طرف ''حَصُوْر'' کہہ کر اشارہ کیا گیا۔ حصور، حصر سے فعول کے وزن پر ہے۔ جس کا معنی ہے ''اپنے آپ کو گھیرے رکھنے والا'' اور جس سے مراد لذاتِ دنیا سے کنارہ کش رہنے والا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے دنیا کو چھوڑا نہیں، لیکن اس کی لذات سے اس طرح کنارہ کش رہے ہیں کہ شاید اس کی مثال کہیں اور نہ مل سکے۔ جب تک زندہ رہے ان غذاؤں میں سے کسی غذا کو ہاتھ نہیں لگایا جنہیں بالعموم انسان کھاتے ہیں۔ ایسا کوئی کپڑا نہیں پہنا جسے عزت والے لوگ پہنتے ہیں۔ جنگل کی ٹڈیاں کھاتے اور جنگلی شہد سے اپنا پیٹ بھر لیتے۔ کسی عورت کا تصور بھی ان کے دل و دماغ سے نہیں گزرا۔ وہ ایک بانکے سجیلے جوان تھے کیونکہ ہر پیغمبر اپنے دور کا خوبصورت ترین فرد ہوتا ہے۔ بااین ہمہ! انہوں نے شادی تک نہیں کی اور پھر ایسا بھی نہیں تھا کہ انہیں لوگوں کے ساتھ میل جول سے نفور ہو اور آبادیوں سے دور رہتے ہوں بلکہ وہ لوگوں میں حق کی آواز اٹھاتے اور برائیوں پر برملا تنقید کرتے تھے۔ دنیا اور دولتِ دنیا سے گریز کی تصویر اور اس دور میں عام پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف صدائے احتجاج تھے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات و صفات کا کھلا کھلا اعتراف اور ان سے متعلق تمام حقائق کا اعلان اور اوامر و نواہی کا اظہار اس طرح فرماتے تھے جیسے وقت کا حکمران کرتا ہے۔ مرعوبیت انہیں چھو تک کے نہیں گئی تھی۔ بڑے سے بڑے حکمران سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے۔ کھلم کھلا اللہ کے احکام توڑنے والوں کے گریبان کھینچتے تھے۔ وقت کے

Marfat.com

حکمران کو اس کی بدکاریوں پر اس طرح برملا ٹوکا کہ یہ حق کی آواز اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر آپ کا سر کٹوا کر اس بدبخت عورت کو طشتری میں رکھ کر پیش کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں ولید بن عبدالملک کے زمانے میں جب جامع مسجد کی بنیادیں کھودی جارہی تھیں تو اس میں گرجے کی کچھ زمین بھی شامل تھی جو غالباً ان سے خریدی گئی تھی۔ اس کی کھدائی میں ایک کمرہ دریافت ہوا، جس سے ایک تابوت ملا۔ تابوت کھولا گیا تو اس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر مبارک تھا، بالکل صحیح سالم ایک بال تک ٹوٹنے نہیں پایا تھا۔ اسی طرح اسے دفن کردیا گیا۔ یہ اپنے وقت کے ایک ایسے نبی تھے جن کی دعوت نے گلی کوچوں اور عوامی جگہوں سے لے کر درباروں اور محلات تک میں تہلکہ مچا رکھا تھا اور جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کی پاکیزگی کی اس بلند آہنگی سے دعوت دی تھی کہ کسی کو بھی عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کے نسب کے بارے میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا وہ نبی ہوں گے اور زمرۂ صالحین میں سے ہوں گے۔ یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی تمام تر غیر معمولی صفات کے باوجود اللہ کے نبی ہوں گے خدا نہیں ہوں گے اور وہ اپنے سارے کمالات کے باوصف صالحین میں سے ہوں گے۔ وہ بالکل اسی طرح زندگی گزاریں گے جیسے شریعت کا فرمانبردار پیغمبر زندگی گزارتا ہے۔ وہ لذاتِ دنیا سے کنارہ کش اور ضبطِ نفس کی مثال ہونے کے باوجود تارک الدنیا راہب نہیں ہوں گے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک عمل شریعت کی تصویر ہوگا یعنی نہ انہیں الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہوگا اور نہ وہ شریعت سے الگ ہو کر ترکِ دنیا کی تعلیم دیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے بارے میں بالکل ٹھیک فرمایا کہ "ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنا سے بڑا کوئی نہیں۔"

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

(حضرت زکریا علیہ السلام) نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ اس حال میں کہ مجھے بڑھاپا آچکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اللہ نے فرمایا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۝ اس نے کہا: اے میرے رب! تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرادے۔ فرمایا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کرسکے گا مگر اشارے سے اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کر (۴۰ تا ۴۱)

حضرت زکریا علیہ السلام کی درخواست کا مفہوم

حضرت زکریا علیہ السلام نے جس طرح یقین و اعتماد سے بہرہ ور ہو کر ناموافق حالات میں اپنے اللہ سے اولاد کی درخواست کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں اللہ کی قدرت کے ظہور میں کوئی شک ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ بات تو خارج از بحث ہے کہ اس سوال کا تعلق کسی ایسی بات سے ہوگا۔ البتہ! یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ وہ یہ جاننے کی خواہش رکھتے ہوں گے کہ میری دعا کی قبولیت کی شکل کیا ہوگی۔ کوئی غیر معمولی طریقہ عمل میں آئے گا۔ ہم میاں بیوی کو از سرِ نو جوان کردیا جائے گا یا بغیر کسی تبدیلی کے محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

Marfat.com

اسباب کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ جس بات کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے حضرت زکریا علیہ السلام نہایت عاجزی کے ساتھ اسے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی خوشی مایوسی کے بعد ملتی ہے یا غیر معمولی طریقے سے ملتی ہے تو انسان یہ ضرور جاننا چاہتا ہے کہ مجھے یہ تو معلوم ہو کہ میرے لیے خوشیوں کا وقت کب آئے گا اور کیسے آئے گا؟ چنانچہ ایسی ہی سادہ اور پاکیزہ خواہش حضرت زکریا علیہ السلام کی بھی تھی جو خوشی اور امید سے زبان پر آ گئی۔ اس کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ تخلیق کے عمل کے لیے میاں بیوی کی جوانی اللہ کا مقرر کردہ ایک طریقہ ہے ورنہ بجائے خود جوانی کسی مؤثر عامل کا نام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی جوان جوڑا بے اولاد نہ ہوتا۔ وہ جس طرح جوانی کو عملِ تخلیق کا ذریعہ بنا سکتا ہے اسی طرح وہ بڑھاپے کو بھی بنا سکتا ہے۔ تم دونوں میاں بیوی اپنی حالت پر رہو گے لیکن تخلیق کا عمل تمہیں سے وجود میں آئے گا کیونکہ کائنات کی اصل قوت اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت ہے۔ اس کی مشیت جب کسی بات کو چاہتی ہے تو ویسا ہو کے رہتا ہے۔ اس کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام نے درخواست کی کہ ہمیں کوئی ایسی نشانی بتا دی جائے جس سے وقت کے تعین میں آسانی ہو تو فرمایا گیا کہ اس کی نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک کسی سے بات نہیں کر سکو گے۔ ہاں اگر کوئی ضروری بات کہنی ہو تو اشارے سے کام لے سکو گے۔ لیکن اللہ کی اس بے پایاں عنایت پر تم چونکہ سر تا پا شکر ہو اور چاہتے ہو کہ جیسے جیسے وہ موقع قریب آئے تو اظہارِ شکر میں اضافہ ہوتا جائے اس لیے ہم نے تم پر یہ عنایت کی ہے کہ تم تین دن تک دنیوی باتوں پر تو قادر نہیں رہو گے، البتہ اللہ کے ذکر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ ان دنوں میں تمہیں صبح و شام اللہ کے ذکر میں لگے رہنا چاہیے۔ یہاں بظاہر تو اس بات کا کوئی اشارہ نہیں کہ تم شکر ادا کر سکو گے، لیکن جب شکر ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ بات خود سے سمجھ میں آتی ہے کہ شکر کے اظہار کی قوت ہوگی تو اس پر عمل کرنے کی نوبت آئے گی۔ "بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ" بالکل اسی طرح ہی ہے جیسے ہم صبح و شام یا رات دن کا لفظ بولتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کام میں گزارو۔ یہاں بھی زیادہ سے زیادہ شکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَ
اسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ
نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ
يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ
الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ ق اسْمُهُ الْمَسِيْحُ

Marfat.com

عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾
وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ
اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا
اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ
اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ
طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ
عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾
اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ
اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾
رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ

Marfat.com

مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾

رکوع: ۵۔ یاد کرو! جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہیں ترجیح دی ہے دنیا کی عورتوں پر O اے مریم! خلوص سے اپنے رب کی عبادت کرتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو O یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اور آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے اور آپ اس وقت بھی ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے O اس وقت کو یاد کرو! جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں وجاہت والا ہوگا اور اللہ کے مقربین میں سے ہوگا O اور وہ لوگوں سے کلام کرے گا گہوارے میں بھی اور ادھیڑ عمر میں بھی اور وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا O (فرشتوں کی خوشخبری سن کر حضرت مریم نے) کہا: اے میرے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا جبکہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟ اللہ نے فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی عمل کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے O اللہ اسے تعلیم دے گا کتاب اور حکمت کی اور تورات اور انجیل کی O اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا O (چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی) میں تمہارے خداوند کی جانب سے نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کی مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں، بیشک ان باتوں کے اندر تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو O میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی توراۃ کی اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئیں اور میں تمہارے پاس تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو O بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے O اور جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو آپ نے دعوت دی کہ کون ہے جو میرا مددگار بنے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے مددگار اور ہم ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہئے کہ ہم مسلم ہیں O اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی۔ سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ O اور انہوں نے خفیہ چالیں چلیں اور اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا، اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے) (۴۲ تا ۵۴)

Marfat.com

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○

(یاد کرو! جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہیں ترجیح دی ہے دنیا کی عورتوں پر ○ اے مریم! خلوص سے اپنے رب کی عبادت کرتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو) (۴۲ تا ۴۳)

حضرت مریم وقت کے ساتھ ساتھ عمر کا سفر طے کرتی گئیں۔ بچپن گزرا، لڑکپن میں داخل ہوئیں، شعور نے آنکھ کھولی، ایک وقت آیا جب اللہ کی رحمت نے انہیں پکارا۔ یوں تو ان کا بیت المقدس میں تربیت کے لیے قبول کر لیا جانا اور پھر حضرت زکریا علیہ السلام جیسے مقربِ الٰہی کی تربیت میں رہنا اور ہر وقت بیت المقدس کی پاکیزہ فضاؤں میں سانس لینا، بجائے خود ان کے لیے اللہ کے قرب اور پسندیدگی کی علامت تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے شعور کو پختہ کرنے اور دل و دماغ کو ایک خاص رخ پر ڈالنے کے لیے ہاتفِ غیبی کے ذریعے یا ملائکہ کی زبان میں انہیں پکارا اور یہ خوشخبری سنائی کہ اللہ نے کسی خاص مقصد کے لیے ساری دنیا کی عورتوں میں سے تمہیں چنا اور برگزیدہ کیا ہے اور اس بڑے مقصد کی انجام دہی کے لیے سیرت و کردار میں جو پاکیزگی ہونی چاہیے اس کا پوری طرح انتظام کر دیا ہے۔ ایک مقربِ بارگاہ کی تربیت اور بیت المقدس کا پاکیزہ ماحول بجائے خود اس تطہیر کے لیے کافی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے پاکیزگی کے وہ انوار دل و دماغ میں اتارے جا رہے ہیں جو ہمیشہ خاصانِ خاص کا نصیب رہا ہے اور اس کی اہمیت کو مزید واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ مریم اس عنایت کو معمولی نہ سمجھ لینا، یہ اتنا بڑا منصب ہے کہ جو دنیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کی شکرگزاری اور اس کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ انتہائی تذلل اور عاجزی کے ساتھ اپنی ذات کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر دو، دل و دماغ میں صرف اسی کو بساؤ، زندگی کی ہر دلچسپی پر اسی کو ترجیح دو اور اسی کی محبوبیت کو حاصلِ زندگی سمجھو۔ تمہارا سراپا اور تمہارے احساسات ہر وقت اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے چاہئیں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ بیت المقدس میں رہنے کے باعث تم نماز کی جماعت میں شامل ہو سکتی ہو۔ اس لیے جب لوگ اللہ کے سامنے جھکیں تو تم بھی جماعت کی پابندی کے ساتھ جھکنے میں ان کا ساتھ دو۔ سجدہ غایتِ تذلل کا نام ہے اور رکوع جماعت میں شرکت کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس لیے پہلے سجدہ کا ذکر فرمایا تاکہ انفرادی اور اجتماعی دونوں حالت کو محیط ہو جائے اور پھر رکوع کا ذکر فرمایا تاکہ بندگانِ خدا کا ساتھ نصیب ہو جائے اور یہود چونکہ اپنی نمازوں میں بالکل رکوع کو گم کر چکے تھے۔ اس لیے بھی شاید رکوع کا اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

(یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ اور آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے اور آپ اس وقت بھی ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے) (۴۴)

Marfat.com

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہما السلام کے بارے میں اہلِ کتاب کی تاریخ کا جو حصہ بیان کیا ہے اس کا انجیل میں اولاً تو ذکر ہی نہیں اور اگر کہیں ذکر ہے تو کچھ غیر مربوط باتیں ہیں۔ اس لیے اثنائے کلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات فرما کر آپ ؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ غیب کی خبریں تمہارے علم و اطلاع سے غیر متعلق ہیں کیونکہ یہ واقعات عرب سے باہر پیش آئے اور عربوں کی تاریخ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کی تاریخ سے یہ واقعات متعلق ہیں انہوں نے تاریخ کا یہ حصہ نہایت نامکمل شکل میں تاریخ کے حوالے کیا ہے؟ جن علاقوں میں یہ واقعات پیش آئے آپ نہ کبھی وہاں رہے اور نہ کبھی گئے اور پھر وہ زمانہ بھی آپ ؐ کے زمانے سے نہایت دور کا زمانہ ہے۔ لیکن آپ ؐ پر جو کتاب نازل ہو رہی ہے وہ جس طرح ان واقعات کو حسنِ ترتیب، غایتِ صحت اور حکمت سے بھرپور انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کر رہی ہے یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو منصبِ نبوت سے نوازا ہے اور آپ ؐ پر اللہ کی طرف سے وحی اتر رہی ہے۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ عیسائی حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور زکریا کو بھی کاہنِ اعظم کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اور حضرت مریم کے بارے میں تو وہ انتہائی غلو کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ با ایں ہمہ! حضرت یحییٰ و زکریا کا تو کیا کہنا حضرت مریم کے واقعات کو بھی انجیل میں نہایت سرسری انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس سے یہاں تک مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ محترمہ کا اس طرح احترام نہیں کرتے تھے جس احترام کی وہ مستحق تھیں۔ بعد میں عیسائیوں نے حضرت مریم کے بارے میں جو بھی عقیدہ اختیار کیا ہو لیکن ان کی اصل حیثیت اور ان کا تقدس اور احترام انجیل نے نہیں، قرآنِ کریم نے واضح کیا ہے۔ لیکن کس قدر ستم کی بات ہے کہ عیسائی اس پر شکر گزار ہونے کی بجائے مسلمانوں کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

آیت میں قلمیں ڈالنے کا جو ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ قلم ہے جو بیت المقدس میں قرعہ اندازی کے لیے رکھے گئے تھے۔ بیت المقدس میں رکھے گئے تیروں کی طرح ان کا استعمال جوئے کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ انہیں قرعہ اندازی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اسلام نے حقوق مساوی ہونے کی صورت میں تصفیۂ نزاع کے لیے قرعہ اندازی بالکل جائز رکھا ہے۔ مثلاً چار بھائیوں کا ایک مکان ہے جس میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ اب ان میں نزاع یہ ہے کہ اسے کس طرح تقسیم کیا جائے؟ تو اس میں اگر وہ آپس میں قرعہ اندازی کر لیں تو اسلام اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ چنانچہ ہیکل کے تمام خدام حقِ کفالت میں برابری رکھتے تھے۔ حضرت مریم جب ان کے پاس آئیں اور سوال یہ پیدا ہوا کہ ان کی کفالت اور تربیت کی ذمہ داری کون اٹھائے؟ تو حضرت عمران کی صاحبزادی ہونے کی حیثیت سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ یہ نیک کام میرے حصے میں آئے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر میں چونکہ ان کی خالہ تھیں اور یہ بات ان کی ترجیح کے لیے کافی تھی لیکن دوسرے خدام نے اس وجہِ ترجیح کو کافی نہیں سمجھا۔ اس لیے حقِ کفالت کے فیصلے کے لیے باہمی قرعہ اندازی کرنا پڑی۔ آیت کے آخری حصہ میں پھر خدام کے جھگڑے کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ جھگڑا کفالت کا حق ادا کرنے کے سلسلے میں نہیں کیونکہ اس کا فیصلہ تو قرعہ اندازی سے ہو گیا۔ یہ جھگڑا ممکن ہے اس سوال پر ہوا ہو کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے آنے سے پہلے یہ روایت موجود نہ تھی۔

Marfat.com

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(اس وقت کو یاد کرو! جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں وجاہت والا ہوگا اور اللہ کے مقربین میں سے ہوگا ۝ اور وہ لوگوں سے کلام کرے گا گھوارے میں بھی اور ادھیڑ عمر میں بھی اور وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا) (۴۵ تا ۴۶)

سورۂ آلِ عمران کا اصل موضوع نصاریٰ اور ان کے غلط عقائد ہیں۔ ان کے غلط عقائد کی بنیاد چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط تصور پر ہے اس لیے اس آیتِ کریمہ میں ان کے اس غلط تصور اور پھر ان کے عقائد کی اصلاح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ اس سے پہلے کی آیات اسی کی تمہید ہیں۔ ان کے خاندان کو سلسلۂ انبیاء میں شمار کروا کر ان کی اصل حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر ان کی پیدائش کے واقعات کو حضرت مریم سے آغاز کیا گیا تاکہ معلوم ہوسکے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو غیر معمولی نوازشات ہوئی ہیں، ان کا آغاز ان کی والدہ ماجدہ سے ہی ہوگیا تھا اور پھر حضرت مریم کے کفیل اور مربی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا، قبولیت اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی غیر معمولی ولادت کو تفصیل سے بیان فرما کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات کو سمجھنے کے لیے ایک بنیاد فراہم کی گئی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو نبی نہ ہوتے ہوئے بھی ملائکہ کے ذریعے پکارا اور انہیں بیٹے کی بشارت عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت مریم جو اللہ کی نبیہ نہ تھیں، لیکن غیر معمولی التفات کے طور پر فرشتوں نے اللہ کی جانب سے انہیں پکار کر ایک ایسی بشارت دی جس کی زمین ہموار کرنے کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو صاف صاف بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم تمہیں ایک بیٹے کی بشارت دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ لیکن حضرت مریم کو بشارت دیتے ہوئے بیٹے کا نام نہیں لیا کیونکہ پروردگار سے بڑھ کر اور کسے معلوم ہوسکتا تھا کہ مریم ایک کنواری لڑکی ہے اور جو شرم وحیا کا پیکر ہے۔ جس نے شرم وحیا سے ہٹ کر کبھی کوئی بات کی نہ سنی۔ اس لیے نہایت اختصار بلکہ ابہام کے ساتھ بیٹا کا لفظ کہنے کے بجائے ایک کلمے کی بشارت دی۔ لیکن یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ کلمے سے مراد کوئی پہیلی نہیں اور نہ اللہ کی حمد وثنا کا کوئی کلمہ ہے بلکہ اس سے مراد ایک بچہ ہے۔ فرمایا اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔

یوں تو کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کے کلمۂ ''کن'' کے بغیر پیدا ہوئی ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری معلومات اور تجربات کی حد تک عالمِ ناسوت کی ہر چیز کو سبب اور مسبب اور علت اور معلول کے رشتہ میں پرودیا ہے۔ اس لیے جب بھی ہمارے سامنے کوئی وجود معرضِ وجود میں آتا ہے تو ہماری نگاہیں سبب اور علت کے حجاب میں اٹک کر رہ جاتی ہیں حالانکہ کائنات کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں قدرت نے پہلے مرحلہ میں کلمۂ کن سے پیدا فرمایا۔ خود انسانوں کے جدامجد کسی سبب سے وجود میں نہیں آئے بلکہ ان کا ظہور اللہ کے کلمۂ کن کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے شاید کَلِمَةٍ کی تنوین کو تنکیر کے لیے لایا گیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ صرف عیسیٰ علیہ السلام ہی اس صفت کے حامل نہیں بلکہ اس

Marfat.com

شرف سے اور مخلوقات بھی مشرف ہو چکی ہیں۔ پھر انسانوں میں آپ کو مشخص اور ممتاز کرنے کے لیے آپ کے لقب، آپ کے نام اور آپ کی کنیت کا ذکر فرمایا۔ مسیح آپ کا لقب ہے اور لقب کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ اسے نام سے پہلے لاتے ہیں۔ عیسیٰ آپ کا اسم مبارک ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت اور آپ کی وجہِ اختصاص ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ اگر نئے نبی کے آنے کے وقت، وقت کا نبی بقید حیات ہوتا تو وہ آنے والے نبی کے سر پر مقدس تیل مل کر اسے اپنا جانشین بناتا اور جب بنی اسرائیل کے یہاں بادشاہت کا سلسلہ شروع ہوا تو وقت کا نبی بادشاہِ وقت کے تقرر کے لیے اس کے سر پر تیل ملنے لگا۔ جس سے یہ بتلانا مقصود ہوتا کہ یہ شخص مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور خدا کا برگزیدہ بھی۔ دوسرے پارے کے آخری دور کوعوں میں ہم حضرت طالوت کا واقعہ پڑھ چکے ہیں۔ تورات نے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ طالوت کو حضرت سموئل نے اس وقت کے بنی اسرائیل کا امیر اور بادشاہ مقرر کیا تھا اور وہ جب ان کے گھر کے سامنے سے گدھوں کی تلاش کے سلسلے میں جا رہا تھا تو اسے بلا کر امارت کی خوشخبری دی اور تیل کی کپی منگوا کر اس کے سر پر تیل ملا۔ اسی طرح چند سالوں کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی اسی طرح حضرت سموئل نے ممسوح کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی اسی راویت کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ان کو بپتسمہ دیا، لیکن تیل ملنے کا کوئی ذکر نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدائشی مسیح تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں انہیں دیکھا تھا تو لوگوں کے سامنے ان کا حلیہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ حضرت عیسیٰ جب سر جھکاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر سے تیل ٹپک رہا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں مسیح کہا گیا ہو اور شاید اسی لیے انجیل میں ان کے لیے ''خدا کا مسیح'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

جہاں تک آپ کی کنیت کا تعلق ہے وہ تو ان کے لیے وجہِ اختصاص بھی ہے اور وجہِ امتیاز بھی اور یہی وہ چیز ہے جس نے انہیں باقی انبیاء کرام سے ممتاز کر دیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام اور رسولانِ عظام بجز حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ سب کا باپ بھی تھا اور ماں بھی تھی۔ لیکن ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو صرف اپنی والدہ کی طرف منسوب کیے گئے۔ عرب میں خصوصاً اور دنیا میں عموماً ماؤں کی طرف نسبت کو ہمیشہ ایک کمزوری سمجھا گیا۔ جب بھی کسی شخص کا انتساب ماں کی طرف کیا گیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا نسب نامعلوم ہے۔ ''زیاد'' جو عرب کے مدبروں میں ایک قابلِ ذکر نام ہے۔ اسے اقتدار ضرور ملا لیکن وہ عزت نصیب نہ ہوسکی جو ایک خاندانی شخص کو نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک فاحشہ عورت کا بیٹا تھا اور اس کا باپ نامعلوم تھا۔ اس لیے ہمیشہ زیاد بن ابیہ کہہ کر یاد کیا گیا یا اس کی نسبت اس کی ماں کی طرف کی گئی۔ اللہ کے نبی جس طرح شکل وصورت کے اعتبار سے دنیا میں ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح وہ خاندانی وجاہت لے کر بھی آتے ہیں۔ کوئی شخص انہیں کسی طرح کی گراوٹ کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے اگر کوئی والد ہوتے تو یقیناً انہیں والد کی طرف منسوب کیا جاتا لیکن قرآنِ کریم بار بار پوری تحدی اور اہتمام کے ساتھ انہیں ''عیسیٰ ابن مریم'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور یہی نسبت ان کے لیے باعث افتخار بھی ہے کیونکہ الزام کی بات تو یہ ہے کہ کسی کا باپ تو ہو لیکن معلوم نہ ہو یا جائز نہ ہو۔ لیکن یہ بات کہ کسی کو بغیر باپ کے پیدا کیا جائے، یہ تو ایک ایسا اعزاز ہے جو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہے اور شاید اسی لیے آپ کے لیے فرمایا گیا:

Marfat.com

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (آپ دنیا اور آخرت میں ذی وجاہت اور عزت والے ہوں گے)

دنیا آپ کے خیالات سے تو اختلاف کرے گی، آپ پر ایمان لانے سے ہزار انکار کرے گی لیکن آپ کی عزت وحرمت کو کبھی چیلنج نہ کرسکے گی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بارہ سال کی عمر میں پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت ومعرفت، کلام کی بلاغت وجزالت اور لب ولہجہ کی عظمت وجلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہود نے آپ کی دشمنی میں کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی میں کبھی آپ کے نسب پر طعن نہ کرسکے۔ آپ اللہ کے مقرب بندوں میں سے تو تھے ہی لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کی محبت اور عظمت کا عالم یہ تھا کہ یہودیوں کی بستیوں میں جب انہوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل چل مچ گئی، خلقت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے، لیکن سیدنا مسیح دو دو لفظوں میں ان کو ایسا جواب دیتے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔

حضرت مسیح کی انہی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے بارے میں جو خرافات مشہور ہو چکی ہیں اور جن میں سے بعض انجیلوں میں بھی مذکور ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ انتہائی وجیہ آدمی تھے، اس لیے یہودیوں کا یہ کہنا کہ انہوں نے ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا، ان کے طمانچے مارے، یہ سراسر خانہ ساز باتیں ہیں۔ اللہ کے رسولوں کی عزت کی حفاظت پروردگار خود فرماتے ہیں۔ ان کی قوم کو ایک خاص حد تک ڈھیل دی جاتی ہے لیکن جب قوم حد سے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو پھر ایسے نابکاروں کا بیڑا غرق کردیا جاتا ہے۔

اللہ نے ان کی عزت وحرمت کے تحفظ کے لیے اور بن باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی انگشت نمائی سے بچانے کے لیے جو انتظامات کیے ان میں سے ایک تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تشریف آوری تھی۔ جنہوں نے اپنی بے پناہ شخصیت سے ان کے بارے میں ایک ایک غلط فہمی کا ازالہ کردیا اور دوسرا انتظام پروردگار نے یہ فرمایا کہ جیسے ہی حضرت مریم بیٹے کی پیدائش کے بعد انہیں لے کر اپنی قوم میں آئیں تو انہیں یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ ہارون کی بہن اور عمران کی بیٹی کنوارپن میں کسی بچے کو جنم دے سکتی ہے، چنانچہ سورۂ مریم میں ان کی قوم کا قول دہرایا گیا ہے

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا

(اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی)

تو نے یہ کیا اندھیر کیا؟ مریم جو شرم وحیا کا پیکر تھیں اس کے سوا کچھ نہ کرسکیں کہ آپ نے نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اسی سے پوچھ لو۔ قوم حیران کہ ہم بچے سے کیسے پوچھیں۔ بچے نے بولنا شروع کیا:

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام بولے بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ نے کتاب دی ہے
اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے بابرکت بنایا ہے)

Marfat.com

پنگھوڑے اور گود میں سارے ہی بچے چند مہینے کے بعد "ہوں ہاں" کرنے لگتے ہیں۔لیکن یہاں فرمایا گیا ہے کہ عیسیٰ ایک ایسے بچے ہیں جن کے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا کہ وہ ایک دو دن کی عمر میں بھی اس طرح بولیں گے جس طرح ایک بڑی عمر کا باشعور نوجوان بولتا ہے بلکہ جس طرح ایک نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتا ہے۔مزید فرمایا کہ وہ کہولت اور بڑھاپے میں بھی بولیں گے۔ بڑھاپے میں بھی دنیا کے سارے لوگ بولتے ہیں۔لیکن بڑھاپے میں ایک خاص وقت ایسا آتا ہے جب علم و دانش کا پیکر بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے۔لیکن عیسیٰ علیہ السلام جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں گے تو ان پر اس طرح کا زوال نہیں آئے گا۔وہ اس وقت بھی ایک پیغمبر کی حیثیت سے بولیں گے۔

یہاں شاید ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ عیسائیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تینتیس سال ہوئی۔آپ بھرپور جوانی میں یہود و نصاریٰ کے کہنے کے مطابق سولی چڑھا دیئے گئے اور مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بڑھاپے اور کہولت کی عمر نہیں آئی اور اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ان پر بڑھاپا آئے گا اور وہ جوانوں کے لیے بھی باعث صدرشک ہوگا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ان کے بارے میں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرب قیامت میں وہ واپس تشریف لائیں گے اور دمشق کو فوجی کارروائیوں کے لیے مستقر بنائیں گے۔اس وقت وہ تینتیس سال کی عمر میں ہوں گے، پھر وہ چالیس سال تک ایک عادلانہ حکومت قائم کریں گے۔اس دوران دو دفعہ حج کے لیے جائیں گے۔تقریباً چوہتر سال کی عمر میں اللہ کی طرف سے بلاوا آئے گا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ میں دفن کیے جائیں گے۔آپ کے مدفن میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کو دفن کیا جائے گا۔اس طرح ان کا پاکیزہ بڑھاپا اپنی آخری عمر کو پہنچے گا۔

بالکل آخر آیت میں فرمایا وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے) اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ باوجود اس کے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیر معمولی کمالات کے حامل ہوں گے آپ بچپن میں علم و حکمت کی باتیں کریں گے۔نبوت کا اعلان کریں گے۔اپنے بابرکت ہونے کی خوشخبری دیں گے اور پھر زندگی میں بے شمار معجزات دکھائیں گے اور زندگی کے خاتمے کی کیفیت یہ ہوگی کہ جس عمر میں آدمی حواس گم کر بیٹھتا ہے اور بات کی شستگی اور شائستگی ختم ہو جاتی ہے اور بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے اس عمر میں بھی ایسی باتیں کریں گے جس کے سامنے علم و دانش بھی سرنگوں ہو جائیں گے۔لیکن ان سب کے باوجود وہ خدا یا کوئی اوتار نہیں ہوں گے نہ انہیں دیوتا ہونے کا دعویٰ ہوگا بلکہ وہ اللہ کے نیک بندے ہوں گے اور انہیں میں سے اپنے شمار پر فخر کا اظہار کریں گے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

(فرشتوں کی خوشخبری سن کر حضرت مریم نے) کہا: اے میرے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا جبکہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟ اللہ نے فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔جب وہ کسی عمل کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے) (۴۷)

Marfat.com

یہ بعینہٖ ویسا ہی سوال ہے جیسا حضرت زکریا علیہ السلام نے کیا تھا کہ میں بوڑھا کھوسٹ ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ ہم دونوں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو ہم سے اولاد کیسے ہوگی؟ یہی بات حضرت مریم نے کہی کہ میں ایک پاکباز لڑکی ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔ تخلیق کا عمل تو لڑکی لڑکے کے اتصال سے ہوتا ہے۔ میں چونکہ ایسے ہر طرح کے تعلق سے بری اور پاک ہوں تو میرے یہاں لڑکا پیدا ہونے کا کیا سوال؟ حضرت زکریا علیہ السلام کا سوال بھی اللہ کی قدرت اور رحمت پر عدمِ اعتماد نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت مریم بھی اللہ کی قدرت کے بارے میں بدگمان نہ تھیں بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلبِ تصدیق ہے اور ایک ایسی بات کے بارے میں سوال ہے جو بظاہر ناممکن ہے۔ لیکن اس کا صدور اور وقوع سراسر اللہ کے فیصلے اور قدرت سے ہوگا۔ لیکن اس کی قدرت اپنے اظہار کی کوئی شکل تو رکھتی ہے اور وہ چونکہ اپنے بندوں کے ساتھ کبھی سختی کا معاملہ نہیں کرتی، اس لیے پیش آنے والے واقعات کی پہلے سے اس میں پیش بندی بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ باتیں تھیں جو سوال بن کر زبان پر آ گئیں۔ لیکن پروردگار نے کسی فلسفے یا علت کو بیان کیے بغیر شاہانہ انداز میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا ظہور صرف اللہ کی قدرت کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کے بارے میں بشارت دیتے ہیں کہ وہ ہونے والی ہے تو پھر اس کے ہو کے رہنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اسے ویسے ہی تخلیق کا جامہ پہناتا ہے جیسے اس کی مشیت چاہتی ہے۔ البتہ اگلی آیتِ کریمہ میں یہ کرم ضرور فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی جو علت یا جو مقاصد ہو سکتے تھے ان میں سے چند ایک کو بیان فرما دیا تاکہ حضرت مریم جو اتنی بڑی اور نازک امانت کو ادا کرنے والی تھیں ان مقاصد کو دیکھتے ہوئے اس بوجھ کو اٹھانے کی اپنے اندر ہمت پیدا کر لیں۔

وَ يُعَلِّمُهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

(اللہ اسے تعلیم دے گا کتاب اور حکمت کی اور تورات اور انجیل کی ۝ (۴۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی غرض و غایت چار لفظوں میں سمیٹ کر بیان کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اسے اس لیے دنیا میں بھیج رہا ہے تاکہ اس کو کتاب کی تعلیم دے اور حکمت سے آشنا کرے۔ بعد کے دونوں لفظ کتاب اور حکمت کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ جس کتاب کی تعلیم دے گا وہ کتاب ''توراۃ'' ہوگی اور جو حکمت سکھائے گا اسے انجیل کی شکل میں نازل فرمائے گا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نئی شریعت عطا نہیں کی گئی بلکہ آپ کو تورات کی شریعت کا متبع اور اس کا داعی بنا کر بھیجا گیا۔ آپ نے بار بار اور بڑے زور اور تاکید کے ساتھ لوگوں سے فرمایا اور انجیلیں آج بھی اس پر شاہد ہیں کہ میں کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آیا بلکہ میری شریعت توراۃ کی شریعت ہے۔ میں اسی کی دعوت دیتا ہوں اور اسی کو صحیح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہود چونکہ احکامِ خداوندی کو بے جان رسوم کی شکل دے چکے تھے اور شریعت کا ایک ایک حکم اصل روح کی قوت سے محروم ہو چکا تھا اس لیے انجیل کی شکل میں آپ پر شریعت کی روح نازل کی گئی جسے یہاں حکمت سے تعبیر کیا گیا اور آپ نے اپنے دائرۂ کار کو متعین کرتے ہوئے واضح طور پر فرمایا کہ میرا دائرۂ کار اور دائرۂ تبلیغ صرف بنی اسرائیل کے لوگ ہیں۔ میں انہی کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ حتیٰ کہ اپنے حواریوں کو تبلیغ دین کی مہم پر روانہ فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرمایا کہ ''میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں۔ دیکھو! تم کسی غیر بنی اسرائیل کے پاس میرا پیغام لے کر مت جانا۔'' ایک غیر اسرائیلی عورت نے جب ان سے دعائے شفا کی درخواست کی تو آپ نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے فرمایا ''کہ بچوں کے حصے کی

Marfat.com

روٹی کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں۔'' چنانچہ آپ نے صرف بنی اسرائیل کو اپنی دعوت کا ہدف بنایا۔انہی کے معروفات پر اپنی دعوت کی بنیادیں اٹھائیں۔اسی سے دلیل وحجت کا تانا بانا استوار کیا۔اپنی نبوت کی حقانیت کے ثبوت کے لیے بے شمار معجزات دکھائے لیکن بنی اسرائیل نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا اور آپ کو جس کشمکش سے گزرنے پر مجبور کیا اور انبیاء کی تاریخ کے مطابق آپ نے صبر اور استقامت کی جو تاریخ روشن کی یہاں اس کا حصہ بالکل محذوف ہے۔لیکن آپ نے جو حیرت انگیز معجزات دکھائے ان میں سے چند ایک کا ذکر فرمایا گیا۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا، چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی) میں تمہارے خداوند کی جانب سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کی مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں، بیشک ان باتوں کے اندر تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو) (۴۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنی حیثیت واضح فرمائی کہ میں بنی اسرائیل کی طرف اللہ کا رسول بن کے آیا ہوں۔ بنی اسرائیل چونکہ اہلِ کتاب ہیں۔ نبوت، کتاب اور دین کے بنیادی تصورات کو سمجھتے ہیں اور ان کی تاریخ سینکڑوں انبیاء کی تاریخ سے معمور ہے۔ یہ نبوت کی شخصیت کو کماحقہ سمجھتے ہیں اور اس پر اترنے والی کتاب کے مندرجات کی حقیقت کو بھی جانتے ہیں۔ میری غیر معمولی ولادت بھی ان کے سامنے ہوئی۔ میری شخصیت کے بارے میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بلند آہنگی سے گواہی دی۔ اب میں ان کے سامنے وہ معجزات پیش کر رہا ہوں جس طرح کے معجزات وہ پہلے انبیاء کرام سے دیکھ چکے ہیں۔ میں مٹی سے پرندہ بناتا ہوں، اسے اللہ کے نام سے پھونکتا ہوں تو وہ اڑنے لگتا ہے۔ میں پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو ہاتھ پھیرتا ہوں تو وہ شفایاب ہو جاتے ہیں۔ میں ان کے سامنے مردوں کو زندگی دیتا ہوں۔ اگر میں ان میں سے ہر بات کی نسبت اپنی طرف کرتا تو میں ایک شعبدہ باز اور جھوٹا آدمی ہوتا۔ میں جس کمال کا بھی اظہار کرتا ہوں اسے بِاِذْنِ اللّٰهِ انجام دیتا ہوں۔ ہاتھ میرا ہے، پھونک میری ہے لیکن قدرت اللہ کی ہے۔ میں تو اس کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوں۔ وہ مجھ سے اپنا کام لے رہا ہے۔ اس لحاظ سے میں اس کا چاکر اور اس کا بندہ ہوں۔ میں لوگوں کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھا کے آئے ہو اور کیا گھروں میں چھوڑ کے آئے ہو؟ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی وحی سے مجھے خبر ہوتی ہے اور میں لوگوں کو خبر دیتا ہوں۔ ان میں سے ایک ایک بات، میری شخصیت کا ایک ایک حوالہ، میری دعوت کی ایک ایک حقیقت، خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہے کہ میں اللہ کا نبی اور رسول بن کر تمہارے پاس تمہاری ہدایت کے لیے آیا ہوں۔ جو نشانیاں تم میرے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے دیکھ رہے ہو یہ اپنے تئیں کیسی بھی عظیم ہوں، وہ اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ ان کا اظہار صرف تمہاری ہدایت کی آسانی کے لیے کر رہا ہے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے جن معجزات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر انجیل میں موجود ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہر معجزے کی روح یعنی بِاِذْنِ اللّٰہِ کو حذف کر دیا گیا ہے تا کہ عیسائیت کے لیے ان غلط عقائد کو پھیلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے جنہیں انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ ان کی ساری ہوشیاریوں کے باوجود انجیل میں آج بھی توحیدِ خالص کی شہادتیں موجود ہیں۔ مزید فرمایا:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

(میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی توراۃ کی اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئیں اور میں تمہارے پاس تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۝ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کر، یہی سیدھی راہ ہے) (۵۰ تا ۵۱)

میری دعوت اور میری شخصیت نہ بنی اسرائیل کے لیے اجنبی ہے اور نہ توراۃ کے لیے۔ میں توراۃ کی شریعت کی تصدیق کر رہا ہوں اور مجھ پر ایمان لانے والے اسی شریعت کے پابند ہوں گے اور میری شخصیت انہی احکام کی پابند ہے جن کا حکم توراۃ دیتی ہے اور بنی اسرائیل نے صداقت کے پیکروں کو جس سیرت و کردار کا حامل پایا ہے اور انہوں نے دکھا کر جس طرح اللہ کے احکام اس کے بندوں تک پہنچائے ہیں میں ان میں سے ایک ایک بات کی تصویر ہوں۔ مزید یہ بات کہ میرے بارے میں تورات اور بعض دوسرے صحیفوں میں جو علامات اور صفات بیان ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں مجھے اور میری دعوت کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ کیا تم مجھے اس سے ایک بال برابر بھی مختلف محسوس کرتے ہو؟ البتہ ایک فرق ہے وہ یہ کہ تمہارے علماء نے اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے جو باتیں حرام کر رکھی تھیں میں انہیں حلال کر رہا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی شریعت ہر طرح کی آلودگیوں سے صاف ہو جائے۔ اسی طرح بعض انبیاءِ کرام کی طبعی عادتوں کو تمہارے فقہاء نے جس طرح شریعت میں داخل کر کے حلت و حرمت کے بنیادی تصور کو بگاڑا تھا میں اس کی بھی اصلاح کے درپے ہوں۔ پہلے نبیوں کی جو دعوت تھی میں اسی کی تجدید اور از سرِ نو تشہیر کے لیے آیا ہوں اور پوری قوت سے اس کا اعلان کر رہا ہوں کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ عبرانی میں "اب" کا لفظ "باپ اور رب" دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح "ابن" کا لفظ "بیٹے اور عبد" دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہو تو سیاق و سباق سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہاں وہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ یہود نے ترجمہ در ترجمہ کی صورت میں سیاقِ کلام کو بدلا اور "اب" کے لفظ کو "باپ" کے معنی میں اور "ابن" کے لفظ کو "بیٹا" کے معنی میں مستقل طور پر متعین کر کے جہالت اور گمراہی کا ایک راستہ کھولا اور پھر اس پر ہر آنے والے نے نئی عمارت استوار کی اور عیسائی آج بھی اسی عمارت کی نگہبانی کے لیے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر رہے ہیں۔

محولہ بالا گزارشات کو سمیٹ کر اگر ایک ترتیب سے بیان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت اساسی طور پر انہی نکات پر محیط تھی جن کی دعوت تمام پیغمبر دیتے چلے آئے تھے۔ وہ نکات یہ ہیں:

Marfat.com

ا۔ اقتدارِ اعلیٰ اور حقیقی کبریائی کا مالک صرف اللہ بزرگ و برتر ہے۔اس کا اقتدار صرف اپنی مرضی منوانے کی حد تک نہیں بلکہ اس سے مراد اللہ کو ماننے والوں کی اطاعت کا وہ رویہ ہے جس سے ایک ایسا نظامِ اخلاق،ایک ایسا نظامِ تمدن اور ایک ایسی تہذیب وجود میں آتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی معرفت انسانوں میں نازل کرتا ہے اور اسی کی اطاعت واتباع کو دنیوی واخروی کامیابیوں کی ضمانت قرار دیتا ہے۔

۲۔ اللہ کے ہر حکم،اس کی ہر مرضی اور منشا کو جاننے کا ذریعہ چونکہ صرف اللہ کا رسول ہے،اس لحاظ سے وہی اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی نمائندگی کرتا ہے۔اس لیے وہ جس طرح اپنی اطاعت کو لازم ٹھہراتا ہے،اسی طرح اپنے رسول اور نبیؐ کی اطاعت کو بھی لازمی حیثیت دیتا ہے بلکہ اپنے احکام کی تشکیل وتعبیر میں رسول کی حیثیت کو آخری سند قرار دیتا ہے۔

۳۔ وہ اپنی اطاعت اور اپنی خوشنودی کے حصول کو محض ایک آورش اور شخصی آئیڈیالوجی کا نام نہیں دیتا بلکہ پوری انسانی زندگی کے مسائل کا حل اور حلت وحرمت کی اساس اور جواز وعدمِ جواز کے پیمانے کے طور پر ایک کتاب نازل کرتا ہے،جس میں اپنے اساسی قوانین کو بیان فرماتا ہے،دستوری بنیادوں کو واضح فرماتا ہے اور اسے قانونی شکل دینے اور اس کے انطباق کی تمام صورتوں کے لیے اللہ کے رسول کو مجاز قرار دیتا ہے۔

جب بھی دنیا میں کوئی نبی یا رسول آیا ہے اس نے انہی تین اساسی باتوں کی دعوت دی ہے اور یہی تینوں بنیادی اصول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی بنیاد ہیں۔کسی رسول کی دعوت کو دیکھ لیجیے ان اساسی نکات کے حوالے سے آپ کو ایک بال برابر بھی فرق نظر نہیں آئے گا۔چنانچہ جب ہم اناجیل اربعہ کو دیکھتے ہیں اگرچہ نہایت افسوس سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ ان اناجیل اربعہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح قرآنِ کریم اسے بیان کرتا ہے۔تاہم اگر تدبر سے کام لیا جائے تو آج بھی حکمتِ الٰہی کے جواہر اور موتی جابجا انجیلوں میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثلاً یہ بات کہ مسیح علیہ السلام صرف اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے لیے تشریف لائے تھے متی کی انجیل کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے:

''تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر'' (متی ۴:۱۰)

''تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو'' (متی ۶:۱۰)

اندازہ فرمایئے! جس طرح اللہ کی مطلق العنان،غیر مشروط اور ہر شرکت سے پاک بادشاہی آسمانوں پر دکھائی دیتی ہے وہی بادشاہی آپ زمین پر بھی انسانوں پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

پھر اسی پر کفایت نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش بھی فرماتے تھے اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت بھی دیتے تھے۔چنانچہ یہ وہ حقیقت ہے جو تمام انجیلوں میں جابجا دکھائی دیتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر وہ اپنے خطبات اور ارشادات میں اللہ ہی کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور اسی کی فرمانبرداری کو آسمان کی بادشاہت کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔

مذاہب کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہر نبی اور رسول کی دعوت کے یہی بنیادی نکات،ان کی قوموں کو مشتعل کرنے کا سبب بنتے رہے ہیں۔ان کیلیے یہ بات ہضم کرنا مشکل ثابت ہوتا رہا کہ ہر طرف سے منہ پھیر کر صرف اللہ کی اطاعت کا قلادہ اپنے گلے میں کیونکر ڈال لیا جائے۔اسی طرح یہ بات بھی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی کہ جو شخص ایک عام آدمی ہو کر اللہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہا ہے،ہم غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو اس کی اطاعت کے سپرد کیسے کر دیں؟ اور زندگی کا جو ضابطہ وہ لے کر آیا ہے ہم اسے مان کر اور اپنے کندھوں پر اس کا

Marfat.com

اٹھا کر اپنے آباؤ اجداد کی تذلیل کیسے گوارا کرلیں؟ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قوم کے لیے بھی یہی مشکلات راستے کا پہاڑ بن گئیں بلکہ ان کے لیے مزید ایک مشکل اور بھی پیش آئی، وہ یہ تھی کہ ان کے بڑے بڑے علماء پیشوایانِ دین، بڑی بڑی مسندوں کے سجادہ نشین اور مشیخت اور تقدس کے بڑے بڑے دعویداروں نے محسوس کیا کہ مسیح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ ہماری فتوحات کے راستے بند ہوجائیں، لوگوں کے دلوں سے ہماری عقیدت جاتی رہے، وہ ہمارے دامِ تزویر سے نکل کر اللہ کے راستے پر آجانے کی وجہ سے ہماری اصل شکل وصورت کو دیکھ کر ہم پر نفرین بھیجنے لگیں۔ ہماری آخرت تو پہلے ہی تباہ ہے اس کے نتیجے میں تو ہماری دنیا بھی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ امراء اپنی امارت کی وجہ سے، غرباء اپنے رسم ورواج کے باعث اور مذہبی طبقہ اپنی فتوحات کی حفاظت کی خاطر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگیا کہ کچھ بھی ہوجائے ہم اس نئے اٹھنے والے مبلغ اور مصلح کی بات نہیں چلنے دیں گے۔ چنانچہ ان کے مذہبی قائدین نے مختلف طریقوں سے لوگوں کو آپ سے بدگمان کرنے کے لیے وہ تمام طریقے ایک ایک کرکے اختیار کیے جو ہمیشہ اہلِ حق کو بدنام کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے جب دیکھا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام ہماری طرف سے مایوس ہوکر غریب لوگوں کو اپنی دعوت کا مرکز بنا چکے ہیں تو انہوں نے غریبوں کو جس جس طریقے سے اہلِ حق کے خلاف انگیخت کیا جاسکتا ہے، وہ تمام طریقے آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ قرآنِ کریم اگلی آیت میں انہی باتوں کی طرف اشارہ فرما رہا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ
وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ○

(اور جب عیسٰی علیہ السلام نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو آپ نے دعوت دی کہ کون ہے جو میرا مددگار بنے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے مددگار اور ہم ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں ○ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی، سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ) (۵۲ تا ۵۳)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قوم کے قابلِ ذکر اور بااثر لوگوں سے مایوس ہوکر عام لوگوں کی طرف رخ فرمایا۔ اس سے ہمیں پیغمبروں کی سنت سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور حکمتِ تبلیغ کو جاننے کی بھی۔ پیغمبروں کی سنت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ دعوت تو سب کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن اپنا خصوصی ہدف ان لوگوں کو بناتے ہیں، جن کے بارے میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں تو ان کے زیرِ اثر لوگ ان کی اس نئی تبدیلی کی پیروی کریں گے کیونکہ لوگوں میں ہمیشہ یہ کمزوری رہی ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) کسی بھی قوم کا فیڈ کرنے والا طبقہ بالعموم وہی لیڈ بھی کرتا ہے۔ جن باتوں کو وہ قبول کرلیتے ہیں وہی باتیں عام لوگوں کا معمول بن جاتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو پیغمبروں کی دعوت میں ہمیشہ پیشِ نظر رہی ہے۔ مدینہ طیبہ میں حضرت اسعد بن زرارہ نے، حضرت مصعب بن عمیر کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ ان کی کوششوں نے عام لوگوں سے پہلے اسید بن حضیر اور سعد بن

Marfat.com

معاذ کو اپنا ہدف بنایا اور ان کے واسطے سے چند ہی دنوں میں ان کے قبیلوں کے بیشتر لوگوں کو مسلمان کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی حکمت کے پیش نظر اشراف قریش کو اپنی توجہات کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ لیکن سورۂ عبس وتولی اور بعض دوسری آیات میں آپ کو توجہ دلائی گئی کہ ان تلوں میں تیل نظر نہیں آتا، آپ عام لوگوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنائیے۔

عوام میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو جن لوگوں کی طرف سے کسی حد تک پذیرائی ملی قرآن کریم نے انہیں حواری کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ حواری ''حَوَرَ'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لغت میں ''سفیدی'' کے ہیں۔ وجہ تسمیہ کے سلسلے میں لوگوں نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ یہ لوگ دھوبی تھے۔ دھوبی کا کام چونکہ کپڑے کو سفید کرنا ہے اس لیے انہیں حواری کہا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ لوگ جب ایمان کی طرف بڑھے تو صفائی قلب اور اخلاص کے جوش سے بڑھے تو ان کی اسی قلبی صفائی کو دیکھتے ہوئے انہیں حواری کے نام سے یاد کیا گیا۔ مزید برآں ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ یہ لفظ عبرانی سے عربی میں آیا اور اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ لیکن راجح تر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے معنی ''خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار'' کے ہیں۔ جس طرح اوس و خزرج کے لوگوں نے اپنے اخلاصِ قلب اور نصرت و جاںنثاری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لیے انصار کا لقب حاصل کرنے کا اعزاز پایا، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنے پاکیزہ اطوار اور جوشِ فدائیت کی وجہ سے حواری، یعنی انصار کے نام سے پکارے گئے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے اخلاص اور جاںنثاری کو دیکھتے ہوئے نہایت شفقت اور دل سوزی سے شب و روز ان کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی لوگ داعی، نقیب اور آپ کے پیغامبر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔ تاریخ اس سے متعلق کچھ زیادہ خبر نہیں دیتی کہ ان لوگوں کی کاوشوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو نفوذ کا کہاں تک موقع ملا، لیکن آپ کے رفع الی السمآء کے بعد یہی لوگ ہیں جن کی محنت کے ثمرات پھلتے پھیلتے ملکوں کو اپنے دامن میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں کہنا یہ مقصود ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے بڑے بڑے لوگوں کی طرف سے یہ محسوس کر لیا کہ وہ مجھے مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو آپ نے اپنی ساری توجہ کا رخ غریبوں کی طرف عموماً اور حواریوں کی طرف خصوصاً پھیر دیا۔ وہ مخالفتوں سے بالکل دلبرداشتہ نہیں ہوئے، حالات کے بگاڑ نے انہیں دل شکستہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے حواریوں اور عام لوگوں کو مخاطب ہو کر فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اس جملے میں بعض باتیں خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حالات تمہارے سامنے ہیں، فرض ہم سب کو پکار رہا ہے، یہ وقت نہیں کہ میں اس کی اہمیت اور افادیت پر بحث کروں، ایک سوالیہ نشان تمہارے سامنے ہے کہ بتاؤ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے بغیر کسی تأمل کے اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نتائج کچھ بھی ہوں، مجھے بہرحال ان طوفانوں سے ٹکرانا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دینے کے لیے کہاں تک تیار ہو؟ ''اِلٰی'' کا لفظ لا کر اظہارِ حقیقت کا حق بھی ادا کر دیا کہ میں جس راستے کی دعوت دے رہا ہوں، وہ پھولوں کی سیج نہیں، اس میں قدم قدم پر بلاؤں کا ہجوم ہے۔ وہ ایک طویل مسافت ہے جس میں کانٹوں پر چلنا ہوگا۔ اس راستے میں کہکشائیں نہیں ہوتیں بپھرے ہوئے طوفان ہوتے ہیں، جس میں چاروں طرف نہنگوں کے حملے بھی ہیں، جو شخص اپنی ذات کے تحفظ کا اسیر ہے اس کے لیے اس راستے میں کوئی جگہ نہیں ۔

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

Marfat.com

لیکن یہ کس قدر خوشگوار حیرانی کی بات ہے کہ وہ لوگ جن کے ایمان لانے کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں، لیکن اللہ جب کسی دل کو نورِ ایمان سے بھرنا چاہتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قبولیت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ اس راستے کی وہ مشکلات جسے برداشت کرنے کے لیے ایک طویل ریاضت چاہیے، اللہ کو جب منظور ہوتا ہے، وہ ایک جست میں تمام ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ بے ساختہ پکار اٹھے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم ہیں اللہ کے مددگار) اور آپ گواہ رہیے کہ ہم صرف دعویٰ کرنے والے لوگ نہیں بلکہ اس عظیم صداقت کو قبول کرنے کے بعد اس پر چلنے کے جو اور جیسے تقاضے ہیں، آپ ہمیں اس پر بھی ثابت قدم پائیں گے۔

غور فرمایئے! حواری جس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ "مسلم ہونا" ہے اور پھر اسلام کے راستے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان پر اپنے قول و عمل سے اور ضرورت پڑی تو قربانیوں سے شہادت کا حق ادا کرنا ہے۔ لیکن بعد میں حواریوں کے نام لیواؤں اور ماننے والوں نے اپنی ایمانی زندگی کو جس طرح نصرانیت کا نام دیا یہاں اس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ وہ اپنی زندگی شہادتِ حق میں کھپا دینا چاہتے ہیں اور کتمانِ حق سے انہیں حد درجہ نفور ہے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے شہادتِ حق تو دور کی بات ہے کتمانِ حق کی ہی نہیں، انکارِ حق کی مثالیں قائم کیں۔

سیدنا مسیح علیہ السلام کے سوال اور حواریوں کے جواب کو دیکھتے ہوئے دو باتیں فوری طور پر ذہن میں آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اللہ کا کوئی رسول چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا بھی عظیم کیوں نہ ہو اور بے شک اس کی پشت پر عناصرِ قدرت ہی کارفرما کیوں نہ ہوں اور بے شک اس کی ہمنوائی میں عناصرِ فطرت اس کے ہمرکاب ہی کیوں نہ ہوں، اللہ کا قانون یہ ہے کہ جس طرح زمین سے غذا پیدا کرنا کئی ہاتھوں کے تعاون سے ممکن ہوتا ہے، جس طرح دنیا کا ہر کام اسباب کی ترتیب سے وجود میں آتا ہے۔ سورج کا کام زمین سے پانی کھینچ کر ابر کی چادریں بچھانا ہے، لیکن ابر کا برسنا سورج سے ماورا ایک کام ہے۔ ابر برستا ہے لیکن زمین میں ایک خاص مقدار تک پانی کا سرایت کرنا اور باقی ندی نالوں میں واپس چلے جانا، یہ ابر کے بس کی بات نہیں۔ کاشتکار زمین میں ہل چلاتا ہے، سہاگہ دیتا ہے، تخم ریزی کرتا ہے، نگہبانی کے فرائض انجام دیتا ہے، لیکن زمین کے سینے سے غلے کا اگانا، پھر اس کو رفتہ رفتہ بڑھانا، کاشتکار کی قدرت سے باہر کی چیز ہے۔ پھر خوشۂ گندم میں دانوں کا پکانا اور پھلوں میں گداز پیدا کرنا یہ زمین کا نہیں سورج اور چاند کا کام ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں ہر چھوٹا بڑا کام اپنے اتمام کو پہنچنے کے لیے اسباب کا محتاج ہے حالانکہ جس پروردگار نے یہ اسباب پیدا فرمائے ہیں، وہ براہِ راست بھی ہر کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے پیغام کا لوگوں تک پہنچنا، دلوں میں سرایت کرنا، قبولیت کی صورت اختیار کرنا، عمل کے قالب میں ڈھلنا، ایک تحریک بن جانا، پھر انقلاب کی صورت بن کر لادینیت کے خس و خاشاک کو بہا کے لے جانا اور اللہ کی زمین پر اللہ کے نام اور اس کے پیغام کا ڈنکا بجنا صرف اللہ کے نبی کا کام نہیں۔ اللہ کا نبی یقیناً اس کام کا داعی، اس کی تشکیل دینے والا، اس راستے میں استقامت کی تصویر، حق کا علمبردار، مینارۂ نور، اپنی ذات میں حجتِ کامل اور پیغام اور معجزات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود تنہا اُس انقلاب کو برپا نہیں کرتا جسے اعلائے کلمۃ الحق کہتے ہیں، جو اللہ کے نبیوں کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے، اللہ سے مدد مانگتا ہے، اسی طرح وہ لوگوں سے بھی مدد چاہتا ہے اور پروردگار کے حضور یہ درخواست کرتا ہے یا اللہ! اسلامی دعوت کی توانائی کے لیے عمر یا ابوجہل میں سے کسی ایک کو اسلام کی توفیق دیدے۔ وہ بار بار لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی اللہ سے التجائیں کرتا ہے۔ ایک ایک دروازے پر دستک دیتا ہے، ایک ایک کا دامن کھینچتا ہے کہ لوگو! اس

Marfat.com

کام میں میرا ساتھ دو، میں تمہیں دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہوں۔ یہ وہ سنتِ رسالت ہے جو تمام انبیاء و رسل میں برابر کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ جیسے جیسے حالات ناموافق اور سرکش ہوتے جاتے ہیں، ویسے ویسے پیغمبر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے ساتھ ساتھ بندوں کو بھی زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انبیاء و رسل کی اسی سنت کے مطابق حواریوں کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے مدد اور نصرت کے لیے پکارا۔ ممکن ہے اس سوال کی تفصیلات کچھ اور بھی ہوں جس کا قرآنِ کریم نے ذکر نہیں کیا، لیکن حواریوں کے جواب سے وہ مترشح ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان سے صرف یہی نہیں کہا گیا کہ مخالفین مخالفت میں سب کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں، ان کے دل اللہ کے دین کے لیے پتھر ہو گئے ہیں، میں یہ نعمتِ عظمیٰ تمہارے پاس لے کے آیا ہوں، آگے بڑھو اور اپنی قسمت بنالو۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہوگا کہ جس طرح یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں بلاکم وکاست بغیر خطرات کی پرواہ کیے اللہ کا دین لوگوں تک پہنچاؤں اور پھر اس راستے میں مصائب پر استقامت دکھاتے ہوئے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دوں کہ اگر یہ دین سچا نہ ہوتا تو اللہ کا یہ بندہ اس پر دکھ اور تکلیفیں کیوں اٹھاتا؟ اور جن لوگوں کو میں دیکھوں کہ وہ علم اور عقل کی بات سمجھنے سے عاری ہیں تو میں اللہ کی توفیق سے ان کے سامنے معجزات بھی ظاہر کروں۔ اسی طرح تمہارا بھی یہ کام ہے کہ تم میری ہمنوائی میں اس دعوت کے دائرے کو پھیلا دو، گلی کوچوں میں اس دعوت کو لے کر چیختے پھرو۔ دنیا کی مخالفتوں پر صبر کرتے ہوئے اللہ کے دین کی سچائی کی گواہی دے دو۔ جب ایک بات بار بار بلند آہنگی سے اور خطرات سے بے نیاز ہو کر کہی جاتی ہے تو سننے والا یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس شخص کا ایک ایک قول اور ایک ایک عمل اور پھر اس پر بے پناہ صبر اس کی دعوت کی صداقت کی ایک ایسی دلیل اور گواہی ہے جس سے بڑی گواہی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اللہ کی بے شمار قدرتوں کا ظہور اس کے وجود کی گواہی ہے۔ اہلِ علم کا زندگی بھر علم کے زور سے اس کی ذات وصفات اور اس کے دین کی سربلندی کو ثابت کرنا یہ ان کی گواہی ہے۔ اسی طرح عام آدمی کا اللہ کے دین پر ایمان لا کر برے سے برے حالات میں اس کی موافقت کرنا، اسی کے نعرے لگانا، اسی کی تائید میں اپنا وزن ڈالنا، یہ بھی اللہ کے دین کی سچائی کی گواہی ہے اور اگر کبھی اس کی خاطر جان تک قربان کرنا پڑے تو جان بھی قربان کر دینا، یہ وہ شہادتِ عظمیٰ اور سب سے بڑی گواہی ہے جسے ہمیشہ اہلِ حق نے دنیا میں انجام دیا اور کتنے پیغمبر بھی اس راستے میں یہ شہادت دیتے ہوئے کام آئے۔ معلوم ہوتا ہے جب بھی کافر اسلام دشمنی میں یکجا اور متحد ہو جائیں اور کفر کی قوتیں اپنے اثرات کو مسلمانوں کے گھروں تک پہنچا دیں اور مسلمانوں کی قوت سمٹتی ہوئی دکھائی دینے لگے اور کفر کا غلبہ بڑھتا جائے تو پھر جس طرح ہر مومن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اس راستے میں جھونک دے اسی طرح اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت کو استعمال میں لاتے ہوئے اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی مدد کے لیے پکارے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کون سا موقع ہوگا جب اقبال نے سر عبدالقادر کو پکارا تھا، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ جس طرح ایک ایک مسلمان کو پکارتا تھا اسی طرح اس نے سر عبدالقادر کو پکارتے ہوئے کہا تھا۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامہ سے محفل تہہ و بالا کر دیں

Marfat.com

اس سے کوئی غرض نہیں کہ سننے والے سنتے ہیں یا نہیں، پکارنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ پکار پکار کر سننے والوں پر اتمامِ حجت کر دے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ سننے والے بھی ضرور سنیں گے اور اگر انسان نہیں سنیں گے تو آسمان کے فرشتے اتریں گے۔ اگر دل سخت ہو جائیں گے تو چٹانیں پھٹیں گی، اللہ کا دین سرنگوں ہونے کے لیے نہیں آیا، اسے کفر کبھی ختم نہیں کر سکے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے دریا کے مچھیروں یا گھاٹ کے دھوبیوں کو پکارا اور اپنی ہمنوائی میں لے کر ان کے اندر وہ روح پھونک دی کہ خود تو اللہ کی مشیت کے مطابق آسمانوں پر اٹھا لئے گئے، لیکن آنے والے دنوں میں ان چند حواریوں کی مساعی نے دور دور تک اس دعوت کو پھیلایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک نصاریٰ میں جو ایک قابلِ قدر طبقہ باقی رہا جو بالآخر مسلمان بھی ہوا، وہ انہیں حواریوں کی محنت کا ثمر تھا۔ انہوں نے اپنی محنت سے اللہ کے دین کی شہادت دی تو اللہ نے ان کی زندگی اور ذکر کو ایسا دوام بخشا کہ ہمیشہ رہنے والی کتاب میں ان کا تذکرہ شامل فرما دیا۔

قرآنِ کریم میں اس عبرت آموز داستان اور فکر انگیز حقیقت کو بیان کرنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ قیامت تک اس کو مشعلِ راہ بنائے۔ جب بھی کبھی اس پر ایسا وقت آئے کہ کفر کی آندھیاں شمعِ ہدایت کو بجھانے کے لیے مجتمع ہو جائیں اور مسلمان کا لہو پانی سے ارزاں ہو جائے اور مسلمان بچیوں کی عزتیں اور عفتیں پتنگوں کی طرح کٹنے اور لٹنے لگیں اور امتِ مسلمہ کا اجتماعی وقار دھجیوں کی صورت ملک ملک اڑتا پھرے اور مسلمانوں کے سربراہ جن کے سپرد مسلمانوں کی پاسبانی، تاریخِ اسلام کی آبیاری اور اللہ کے آخری دین کی سربلندی ہے، وہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو کر دنیا اور دولتِ دنیا کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیں اور وہ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے خوشامد اور غداری کی آخری حد تک جانے کو تیار ہو جائیں۔ طبقۂ امراء دنیا اور دولتِ دنیا کو مقصدِ زندگی قرار دے کر ایک دوسرے سے تنافس میں لگ جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں ایمان بیچنا پڑے، مسلمانوں کی روایات کو پامال کرنا پڑے، تو وہ یہ سب کچھ کر گزرنے کو بھی تیار ہو جائے اور امت کے علماء اور مشائخ اس بات پر قانع ہو جائیں کہ ہماری فتوحات کا سلسلہ چلتا رہے اور حکمران ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ امت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے، اجتہاد کے سوتے خشک ہو جائیں، امت سب سے بڑی افرادی قوت ہوتے ہوئے بھی دھرتی کا بوجھ بن جائے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح محسوس ہونے لگے کہ کفر ہمارے وسائلِ حیات پر قابض ہونے کی فکر میں ہے اور اب شائد ہماری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں تو اس وقت امت کی بقا کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کے صاحبِ علم، صاحبِ دل، اہلِ درد اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ اٹھیں، اپنی قلتِ تعداد کی پرواہ کیے بغیر گلی گلی کوچہ کوچہ حمیتِ اسلامی کی دہائی دیں، مسلمانوں کو ان کی روایات یاد دلائیں اور ان میں آخرت کی فکر پیدا کریں اور ایک ایک کا دامن کھینچ کر انہیں حالات کا آئینہ دکھانے کی کوشش کریں اور انہیں یقین دلا دیں

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مسلمانوں کو اس پیش پا افتادہ حقیقت سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ لادینیت کا مقابلہ دین سے ہی کیا جا سکتا ہے قوت کا مقابلہ قوت اور اللہ پر بے پناہ بھروسہ ہی کر سکتا ہے۔ کافر اگر صلیبی دور کے بغض سے مسلح ہو کر میدان میں آیا ہے تو ہمیں بھی صلاح الدین ایوبی کی روح کو زندہ کرنا ہو گا۔ ہماری بقا صلیبیوں کی خوشامد میں نہیں بلکہ اللہ کے بھروسے پر اٹھ کھڑے ہونے میں ہے۔ آج ضرورت ہے کہ وہ آندھی جو

Marfat.com

افغانستان کو روند چکی اور عراق کو جلائے دے رہی ہے اس کے آنے سے پہلے اپنے ایک ایک تنکے کو سمیٹ لیں۔ اپنی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کر لیں۔ طوفانوں کے اٹھنے سے پہلے اپنے بند مضبوط کر لیں۔ پورے عالمِ اسلام کو دین سے بے وفائی کی سزا مل رہی ہے۔ ہم اس سے وفاداری کا اظہار کر کے اور اپنی سیرت و کردار کی خرابیوں کو دور کر کے اس کی تائید و نصرت کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب کے قریب کہی جاتی ہے اور دنیا کے بیشتر وسائل پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ کمی اگر ہے تو سیرت و کردار میں پختگی کی، مقصد سے لگن کی، دین سے وابستگی کی اللہ ہی سے امید کی لو لگانے کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، اطاعت اور اتباع کی۔ جدید اور قدیم علوم میں مہارت پیدا کرنے کی اور یہ فیصلہ کرنے کی ہے کہ ہمیں بہر صورت زندہ رہنا ہے، ہمیں ایک آبرومندانہ زندگی گزارنی ہے۔ ہم نے اپنے گھروں، اپنے گلی کوچوں اور اپنے اجتماعی اداروں کی منڈیروں پر حمیت کے چراغ جلانے ہیں۔ ہمیں دنیا کو محبت کا پیغام دینا ہے، لیکن بے غیرتی کے طشت میں رکھ کر نہیں۔ ہمیں دنیا کو مکارمِ اخلاق سے آگاہ کرنا ہے، لیکن فقیری اور ضعیفی کے ساتھ نہیں۔ ہمیں وسعتِ ظرف کا ثبوت دینا ہے، لیکن شرم و حیا سے خالی ہو کر نہیں۔ ہمیں صنفِ نازک کو زندگی کے سفر میں ساتھ لے کر چلنا ہے، لیکن کرسٹن کیلر بنا کر نہیں بلکہ فاطمہ اور عائشہ بنا کر۔ ہمیں کسی سے لڑنے اور بگاڑنے کی بجائے اپنا گھر سنوارنا ہے، لیکن دوسروں کو اپنے گھروں میں داخلے کی اجازت دے کر نہیں۔ ہمیں لوگوں کو یہ باور کرانا ہے ؎

تم ہم سے ملو گے تو ہمیں پاؤ گے مخلص
ہر چند کہ اخلاص کا دعویٰ نہیں کرتے
ہم لوگ تو درویش ہیں کیا ہم سے الجھنا
جو ہم کو برا کہتے ہیں اچھا نہیں کرتے
لازم ہے زمانے کو کرے قدر ہماری
ہم لوگ کبھی لوٹ کے آیا نہیں کرتے

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

(اور انہوں نے خفیہ چالیں چلیں اور اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا، اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے) (۵۴)

اس سلسلے میں صاحب تدبر قرآن نے اشارات میں چند باتیں کہی ہیں ہم بھی اسی پر اکتفا کرتے ہیں:

لفظ مَکَر کا اصلی مفہوم

مَکَر کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے چونکہ عام طور پر صورت یہی ہوتی ہے کہ خفیہ تدبیریں کمزور لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کی مذمت کا پہلو ذہنوں پر غالب ہو گیا اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ مکر لازماً مذموم ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ایک خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی اعلانیہ انتقامی کارروائی کی جائے تو

Marfat.com

وہ اس کو ظلم وزیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔ اسی طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تا کہ اس پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں، جن کے لیے وہ جال بن رہا ہے، وہ اس کے اس جال سے واقف ہیں۔ یہ چیز اس کو رسوا بھی کرتی ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ایسی حرکتوں سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہو، یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو بے شمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہود کے شر سے بچانے کے لیے کیا تدابیر اختیار فرمائیں تو اس کے جواب کے لیے موزوں موقع سورۂ نساء میں آئے گا۔

حضراتِ انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت

اس آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ہے۔ تمام انبیاء کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے اعیان واکابر سے مایوس ہو کر اپنی پوری توجہ اپنے غریب ساتھیوں اور قوم کے عام لوگوں پر مرکوز کی ہے اور ان کی دعوت ان لوگوں کے اندر اپنے اثرات پھیلانے لگی ہے تو یہ اعیان واکابر اس چیز کو اپنے اقتدار کے لیے ایک شدید خطرہ سمجھ کر نبی کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف ہو گئے تا کہ اس کے قتل کا کوئی بہانہ پیدا کر کے اپنے خیال کے مطابق اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔

سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف یہود کی سازشیں

یہ مرحلۂ آزمائش یوں تو ہر نبی کی زندگی میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا پیش آیا ہے، لیکن ہم یہاں سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہود کے اعیان واکابر کی بعض سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے علماء اور ان کے کاہنوں اور ان کے فقیہوں نے اس موقع پر حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کے خلاف مختلف قسم کے جال پھیلائے۔

ایک تو انہوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین وتحقیر کا الزام لگایا تا کہ عوام کے جذبات ان کی خلاف بھڑکائے جا سکیں۔

دوسرا جال انہوں نے یہ بچھایا کہ اپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے ایسے سوالات کیے جن کے جوابوں سے ان کے خلاف کفر وارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہو سکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا

Marfat.com

اور مسیح علیہ السلام کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے انہوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کرلیا جس کی بنیاد پر ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جاسکے۔

تیسرا یہ کہ اس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا، اس وجہ سے ان کو بھڑکانے کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائیگی سے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام سے سوالات کیے گئے، جن سے یہ ثابت ہوسکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیح علیہ السلام نے ایسے دندان شکن دیئے کہ علمائے یہود اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ آنحضرت علیہ السلام کی مخبری کرے اور ان کو گرفتار کرائے۔

ان تمام سازشوں کی تفصیل انجیلوں میں موجود ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں جمع کر دیتے، لیکن بہتر یہی معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات پر اکتفا کریں۔ (ماخوذ از: تدبرِ قرآن)

گزشتہ دو رکوعوں میں ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات وصفات کے بارے میں وہ باتیں پڑھی ہیں جو ان کے غیر معمولی شخصیت ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر نبی تھے اور ان کے ساتھ پروردگارِ عالم کا خصوصی تعلق تھا اور دنیا میں انہیں آیت اللہ، کلمۃ اللہ اور حجۃ اللہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جس طرح رات کے پچھلے پہر طلوعِ سحر سے کچھ پہلے ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے اور اسے ستارۂ صبح کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی روشنی میں دوسرے سب ستاروں سے تیز ہوتا ہے۔ اپنے جسم اور اپنے حجم میں دوسروں سے زیادہ نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اکثر ستارے جیسے جیسے رات گہری ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے نمایاں ہوتے جاتے ہیں اور وہ اس وقت تک جھلملاتے رہتے ہیں جب تک سحر طلوع نہیں ہوتی یا آفتابِ عالم تاب منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ستارہ سب سے نرالا اور سب سے عجیب بن کے آتا ہے کہ طلوع اس وقت ہوتا ہے جب رات کی صف لپیٹی جانے والی ہوتی ہے۔ سب سے مختصر عمر لے کر آتا ہے، لیکن اپنے قد وقامت اور اپنی روشنی میں سب سے نمایاں اور سب سے وقیع ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ باقی ستارے تو اپنے حصے کی روشنی بکھیرنے اور انسانی دماغوں کو خوشی دینے کے لیے آتے ہیں، لیکن یہ ستارہ اس بات کا پیغامبر بن کر آتا ہے کہ میں تمہیں ایک ایسے آنے والے کی خبر دینے کے لیے آیا ہوں جس کے آتے ہی تمام ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ سب کی روشنیاں بجھ کے رہ جائیں گی۔ میری روشنی اسی لیے سب سے زیادہ ہے کہ تم میری ذات کے آئینے میں اس آنے والے کو دیکھ سکو جس کے آجانے کے بعد حال یہ ہوجائے گا

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

Marfat.com

لیکن انسانوں کی بدنصیبی کا کیا کہنا کہ وہ جو کسی کی خبر بن کے آیا تھا اور جس پر اترنے والی کتاب نے اس خبر کو یہ کہہ کر سند کا درجہ دے دیا:

اِنِّیْ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ

(میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری سنانے والا بن کر آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا)

اس کی غیر معمولی ولادت اور اس کے حیران کن معجزات صرف اس لیے اسے دیئے گئے تھے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں، ہدایت کا راستہ اختیار کریں اور بطورِ خاص اس خوشخبری کو اہمیت دیں لیکن اسے بدنصیبی نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ اس کی اعجازی ولادت، اس کے محیر العقول معجزات اور کارنامے اور غیر معمولی طور پر دنیا سے اس کا اٹھایا جانا اس کے ماننے والوں کے لیے ایک ایسا ابتلاء ثابت ہوا کہ وہ آج تک اس ابتلاء میں کامیابی کا کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بغیر باپ کے ''کلمہ کن'' سے پیدا ہوئے تھے اور اسی کلمہ کی نسبت سے آپ کو ''کلمۃ اللہ'' کا لقب عطا ہوا تھا۔ لیکن ان بدنصیبوں نے اسی کلمہ کو کلام کا ہم معنی قرار دے کر اللہ کی مستقل صفتِ کلام بنا ڈالا اور پھر اسی کی نسبت سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا بنایا اور مزید یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے انجیل اور قرآن میں ارشاد فرمایا کہ ''میں نے اپنی روح مسیح ابن مریم میں ڈالی'' تو اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اس کے اندر چونکہ اللہ کی روح حلول کر گئی ہے اس لیے وہ اللہ کا ایک حصہ بن کر خدا کے منصب پر فائز ہو گیا ہے۔ حالانکہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ کے کلمہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق پہلا واقعہ نہیں بلکہ کائنات میں بے شمار چیزیں اس کے کلمہ کن سے پیدا ہوئیں۔ وہ خود فرماتا ہے کہ میں جب کسی چیز کو وجود دینے کا ارادہ کرتا ہوں تو کُنْ کہتا ہوں تو وہ ہو جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ضرور پیدا ہوئے، لیکن آپ کی ماں تو بفضلہ تعالیٰ موجود تھیں، لیکن حضرت آدم علیہ السلام دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔ لیکن آج تک کسی کو ان کے ابن اللہ یا اللہ ہونے کا کبھی شبہ نہیں ہوا۔ جس طرح پروردگار نے اپنی روح عیسیٰ علیہ السلام میں پھونکی اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمایا نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (میں نے اس میں اپنی روح پھونکی) اس کے باوجود کسی نے بھی آج تک ان کو روح اللہ قرار دے کر اللہ کے منصب پر بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں انہیں آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ اور اس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حضرت زکریا نے جب اپنے بیٹے کے لیے دعا مانگی تو ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اس قدر بوڑھا ہو چکا ہوں کہ میرا سر جلنے لگا ہے اور میری ہڈیوں میں گودا تک نہیں رہا ہے اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے۔ بظاہر اسباب ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ (اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے بیٹا عطا فرمایئے) کیونکہ میری ذات اور میری بیوی کی ذات میں ماں باپ بننے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے اور جب فرشتوں نے بشارت دی کہ اللہ آپ کو ''یحییٰ'' کے نام کا بیٹا عطا فرمانے والے ہیں، جس کی یہ یہ صفات ہوں گی تو حضرت زکریا نے حیرت سے کہا کہ میرے یہاں بیٹا کیسے پیدا ہوگا؟ اور یہی اظہارِ تعجب حضرت مریم نے بھی کیا جب فرشتے نے انہیں بیٹے کی بشارت دی تو یہ زکریا اور یحییٰ کا واقعہ اسی لیے بیان کیا گیا تھا تاکہ لوگوں کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے کہ تخلیق کا عمل سراسر اللہ کی قدرت کا اظہار ہے۔ وہ چاہے تو بانجھ ماں باپ کو اولاد دیدے اور چاہے تو کنواری لڑکی کو بغیر خاوند کے اولاد دیدے اور چاہے تو آدم کی طرح ماں باپ یعنی دونوں کے بغیر پیدا فرما دے۔ رہی تیسری بات کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمانوں پر اٹھا لیا، اگلی آیتِ کریمہ میں اس کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

Marfat.com

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ

مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ
ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾
فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٧﴾
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى
عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۗ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ
وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ
لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ
مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۶۔ اس وقت کو یاد کرو جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور تجھے پاک کر دینے والا ہوں ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ پس میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں، جن میں تم جھگڑتے تھے O تو جن لوگوں نے کفر کیا میں انہیں سخت عذاب دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا O اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو اللہ ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا O یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں O بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی مانند ہے، اسے اللہ نے مٹی سے بنایا پھر اسے فرمایا ہو جا تو وہ ہو گیا O (اے مخاطب!) یہ حقیقت ہے تیرے رب کی جانب سے، پس تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جا O پھر جو شخص تم سے اس بارے میں حجت کرے بعد اس کے کہ تمہارے پاس صحیح علم آ چکا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی، اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی۔ پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں O بیشک یہی ہے سچا واقعہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بیشک اللہ ہی غالب اور حکمت والا ہے O پھر وہ اگر اعراض کریں تو اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے) (۵۵ تا ۶۳)

اِذْقَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ O

(اس وقت کو یاد کرو جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور تجھے پاک کر دینے والا ہوں ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ پس میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں، جن میں تم جھگڑتے تھے) (۵۵)

سیاقِ کلام کو پیش نظر رکھا جائے تو اس آیت کریمہ کا موضوع دو باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء یعنی دنیا سے آسمانوں کی طرف سفر جس طرح عیسائیوں کے لیے ایک ابتلاء اور گمراہی کا سبب بنا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور دوسری یہ بات کہ یہود نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور صلیب دینے کی کوشش کی اور جس طرح آپ کے خلاف سازشوں کا طوفان اٹھایا اور جس طرح رومیوں کو آپ کے خلاف برانگیختہ کر کے آپ کی موت کا سامان کرنے کی کوشش کی اور ایسی ہی وہ تمام کوششیں اور تدبیریں جن کو قرآنِ کریم نے ان کا مکر قرار دیا ہے ان کے توڑ کے لیے اللہ نے جو تدبیر فرمائی اور جس نے دشمنوں کی تمام تدابیر کو ناکام کر کے رکھ دیا اس کی تفصیل اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

ذہن میں ایک دفعہ پھر چند باتیں مستحضر کر لیجئے کہ یہود کے علماء اور مشائخ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقید اور آپ کی اصلاحی کوششوں سے تنگ آ کر عوام وخواص کو آپ کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ پر مختلف الزامات لگائے گئے، آپ کو دینِ موسیٰ علیہ السلام کا دشمن قرار دیا گیا، بزرگوں کا گستاخ ٹھہرایا گیا، تورات پر آپ کے ایمان کو مخدوش ثابت کیا گیا اور آپ نے اللہ کی طرف سے جو نہایت حیرت انگیز معجزات دکھائے، انہیں جادو اور شعبدہ بازی ٹھہرایا گیا لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود جب انہوں نے مخلوقِ خدا کے رجوع کو بیش از بیش ہوتے دیکھا اور انہوں نے محسوس کیا کہ آپ جس بستی میں بھی جاتے ہیں وہاں آپ کی دلآویز شخصیت اور حیرت انگیز معجزات کے باعث خلق خدا آپ پر ٹوٹی پڑتی ہے اور آپ کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے تو انہوں نے اسے توسیعِ دعوت یا آپ کی سچائی کی دلیل قرار دینے کی بجائے رومی حکومت کو آپ سے بدگمان کرنے کا ذریعہ بنایا۔ بدیشی حکومتیں چونکہ ہمیشہ اپنی رعایا کے بارے میں بدگمان رہتی ہیں اس لیے جب انہیں یقین دلایا گیا کہ مسیح نام کا یہ شخص مرجعِ خلائق بنتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ لوگوں کو یہ خوشخبری سناتا ہے کہ عنقریب خدا کی بادشاہت آنے والی ہے۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ شخص درویش ہونے کے باوجود سیاسی عزائم رکھتا ہے اور یہ کسی وقت بھی حکومت کے لیے فتنہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس بات کو مزید مؤکد کرنے کے لیے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے رومی حکومت اور اسے خراج دینے کے بارے میں سیاسی سوالات کیے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے کسی نبی کی بھی منزل اس سے مختلف نہیں ہوتی کہ وہ زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور اللہ کی حاکمیت کو ماننے والے دوسروں سے خراج لیتے ہیں دیتے ہرگز نہیں۔ لیکن یہ تمام اصولی باتیں ہیں جو کسی بھی نظریے کی بالادستی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جب اس نظریے کی دعوت ابھی ابتدائی مراحل میں ہو تو ان سے سیاسی نتائج اخذ کرنا فتنہ پروری کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن یہود نے ایسی ایک ایک بات سے فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ آپ کی ذاتِ والا صفات کو رومی حکومت کے لیے خطرہ بنا دیا اور مزید خطرناک اقدام یہ کیا کہ آپ کے حواریوں میں سے یہودا نام کے حواری کو بہلا کر آپ کی گرفتاری کے امکانات بھی پیدا کر دیئے۔ اس طرح سے یہود نے سازشوں کا ایسا جال بنا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچ نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پروردگار نے اس تمام صورتِ حال کا توڑ کرنے کے لیے جو کچھ کیا اس آیت میں نہایت اختصار کے ساتھ اس کی طرف اشارات فرمائے گئے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ اے عیسیٰ! دشمن تیرے خلاف ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تیری جان لینا چاہتا ہے، لیکن ہم اپنے بندوں کو دشمن کے لیے تر نوالہ بننے نہیں دیتے۔ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں کہ دشمن تمہاری ذات تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ وہ ہزار کوشش کرے لیکن تمہیں کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے یا تمہیں صلیب دینا چاہتا ہے ہم ہرگز اس کا موقع نہیں آنے دیں گے۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ تم تک پہنچیں ہم خود تمہیں اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ہم تمہاری جان قبض کر لیں گے، لیکن اس بات کو ایک لطیفہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دشمن آپ کے درپے ہے اور اس کا مقصد تمام سازشوں اور تمام اتہامات لگانے سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ آپ کی جان لینا چاہتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ آپ کو قتل کرے یا عدالت کے ذریعے آپ کو صلیب تک پہنچائے، مقصود تو صرف آپ کو ختم کرنا ہے۔ پروردگار اس انجام سے آپ کے بچانے کی خوشخبری سنا رہے ہیں تو کیا یہ واقعی خوشخبری ہے کہ آپ سے کہا جائے کہ ہم دشمن کو تو اس کا موقع نہیں دیں گے کہ وہ تمہاری جان لے سکے، البتہ ہم خود تمہاری روح قبض کر لیں گے۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ توفی کا اصل معنی عربی لغت میں اَلْاَخْذُ بِالتَّمَامِ ہے (یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا) اور یا اس کا معنی ہے (To Recall) کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ موت اس کا حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی ہے۔ اولاً تو حقیقی معنی اگر لیا جاسکتا ہو تو مجازی معنی لینے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ ثانیاً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قرائن جس معنی کو ترجیح دے دیں وہ معنی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آپ کے بچانے کی خوشخبری سنا رہے ہیں اور آپ کی نصرت وتائید کا وعدہ فرما رہے ہیں اور اس تاریخ کو زندہ فرمانا چاہتے ہیں جسے ہر رسول کے ساتھ دہرایا گیا کہ جب بھی اس رسول کی قوم نے پیغمبر کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے رسول کو ہجرت کا حکم دے کر وہاں سے بخیریت نکلنے کے اسباب پیدا کر دیئے اور اس کے بعد قوم پر اللہ کا عذاب آیا۔ اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا غور کیجئے کہ کیا اس لفظ کا یہ معنی لیا جاسکتا ہے کہ ہم یہود کو تو مارنے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن ہم خود تمہیں مار دیں گے۔ اس میں بشارت ونصرت کیا ہوئی؟ یہ تو بالواسطہ یہود کے ارادوں کو پورا کرنے کی ایک صورت ہوئی کہ وہ آپ کی موت کے خواہش مند ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو پورا کر دیا اور مزید ان پر یہ احسان بھی فرمایا کہ وہ تاریخ میں رسوائی اور بدنامی سے بھی بچ گئے۔ ان تمام قرائن کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے سوا کسی اور بات کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ پروردگار عیسیٰ علیہ السلام سے یہ فرما رہے ہیں کہ موت تو صرف جان قبض کرنے کا نام ہے، ہم تمہاری پوری شخصیت کو قبض کریں گے یعنی ہم تمہارے جسم اور جان دونوں کو اپنی تحویل میں لے لیں گے اور دونوں کو اپنی تحویل میں لینا یہ زندگی کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت ہے کیونکہ موت جب آتی ہے تو جسم وجان میں جدائی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جب تک یہ دونوں یکجا رہتے ہیں اس وقت تک زندگی باقی رہتی ہے۔ یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ "متوفیک" سے اگرچہ موت کا شبہ ہوسکتا ہے، لیکن جس طرح یہاں اس لفظ کو لایا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ موت کے معنی میں ہرگز نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی ہے۔ لیکن اس لفظ کا لانا بے سبب نہیں۔ سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے چونکہ آپ کو خدائی منصب پر فائز کرنے والے تھے اس لیے یہ لفظ لا کر فرمایا کہ جس طرح پیدا کرنا اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر اسے اپنی تحویل میں لینا چاہے وہ جسم وجان کی صورت میں ہو چاہے صرف جان اور روح کی شکل میں، یہ بھی اللہ کی قدرت میں ہے۔ اس لیے تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔

اگر اس لفظ سے یہاں موت دینا مراد لیا جائے تو اس کے بعد آنے والا لفظ "رافعک" بالکل بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس شخص کو بھی موت دی جاتی ہے یقیناً اس کی روح اٹھالی جاتی ہے اور یہ گویا اس کی زندگی اور زندگی کی ہر طرح کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہاں آپ کو نصرت وتائید کی خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ ہم تمہیں پورا کا پورا اپنی تحویل میں لے لیں گے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہم تجھے اپنی طرف اٹھالیں گے یعنی دشمن تمہیں قتل کرنا چاہے گا لیکن ہم تمہیں اس طرح ان کے اندر سے اٹھالیں گے کہ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوگا۔

یہاں ایک بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آخری سفر کے بارے میں جو کچھ یہود اور نصاریٰ نے کہا ہے اس میں قتل اور صلیب دینے کے الفاظ تو ہیں، لیکن ان دونوں میں سے کسی نے بھی آپ کی طبعی موت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا کیونکہ یہود آپ کو جھوٹا اور کذاب ثابت کر کے یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اس کو صلیب پر قتل کیا اور صلیب کی موت لعنت کی موت ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کو نہیں بلکہ کسی لعنتی کو آتی ہے۔ اس طرح سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کرتے ہیں اور جہاں تک طبعی موت کا تعلق ہے، اس

Marfat.com

سے تو ہر طرح کا آدمی دوچار ہوتا ہے اور نصاریٰ کی سادہ لوحی کا حال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہود کے اس دعویٰ کو تسلیم کیا بلکہ اسے اپنا ایک اہم عقیدہ بنالیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا کر ایک گناہ کا ارتکاب کیا، جس کے نتیجے میں ان کی ساری اولاد گنہگار ٹھہری۔ اب نوعِ انسانی کی بخشش اور گناہ سے معافی کی اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اکلوتے فرزند یعنی حضرت عیسیٰ کو دنیا میں ایک لعنتی کی موت دے کر نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا اور اس کے نتیجے میں انسان گناہوں سے پاک ہو گیا۔ اس عقیدے پر ذرا توجہ دیجئے کہ اس سے زیادہ نامعقولیت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ گناہ حضرت آدم علیہ السلام نے کیا اور گناہ گار پوری نوعِ انسانی ٹھہری اور پھر سزا کسی انسان کے بیٹے کو نہیں بلکہ اللہ کے بیٹے کو ملی جو معصوم بھی تھا اور خدائی میں شریک بھی اور اس کی سزا انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔ اس بے ہودگی کو تو ایک طرف رکھیے، لیکن ان کی سادہ لوحی کو دیکھئے کہ وہ یہود کے اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت صلیب پر ہوئی ہے، پھر ان کو دفن کر دیا گیا، لیکن دوسرے دن جب ان کی قبر کو ان کے جسم سے خالی دیکھا تو اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ وہ زندہ ہو کر آسمان پر جا چکے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم ان تمام باتوں کی تردید کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہرگز موت نہیں آئی، نہ انہیں کسی نے قتل کیا، نہ صلیب دیا۔ سورہ النساء میں واضح طور پر فرمایا گیا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (اور نہ انہوں نے اس کو قتل کیا اور نہ اس کو سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا)

اور آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ

(اور انہوں نے یقیناً اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اسے اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)

اس آیتِ کریمہ میں مُتَوَفِّيْكَ کا لفظ اڑا دیا گیا ہے بلکہ قتل اور سولی کی نفی کے بعد صرف بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ فرمایا۔ یہ اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جس چیز کو توفی قرار دیا ہے وہ اپنی طرف اٹھا لینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس قدر واضح قرینہ کے بعد اس کا کوئی اور ترجمہ کرنا علم اور دیانت کے خلاف ہوگا۔ لیکن قربان جائیے انیسویں صدی کے نبوت کے دعویدار پر انہوں نے ایک ایسا دعویٰ کیا جس کا دعویٰ نہ کبھی یہود نے کیا نہ نصاریٰ نے اور نہ کبھی مسلمانوں نے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، البتہ وہ طبعی موت کا شکار ہوئے اور مزید لطیفہ کی بات یہ کہ وہ اگرچہ دمشق میں رہتے تھے اور ان کی بعثت بھی اسی علاقہ میں بنی اسرائیل کی طرف تھی وہ انہی کی طرف پیغمبر ہو کر آئے تھے۔ لیکن اس دعویدار کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کشمیر کے شہر سری نگر میں کس طرح پہنچے اور وہاں انہیں کس طرح موت آئی اور ان کے دعویٰ کے مطابق وہیں وہ کسی گلی میں مدفون ہیں۔ یہ سارا ناٹک اس لیے رچایا گیا تاکہ لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ جس مسیح کے آنے کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں ہے وہ حقیقی مسیح نہیں کیونکہ وہ تو فوت ہو چکے بلکہ وہ مثیلِ مسیح ہیں اور وہ میں ہوں اور میں آچکا ہوں۔ اب مسلمانوں کو میری قیادت تسلیم کر لینی چاہیئے۔ اس سے پہلے کہ میں ذخیرۂ حدیث میں سے چند احادیث کا ذکر کروں جن میں قیامت آنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا ذکر ہے اور ان میں کسی مثیلِ مسیح کا ذکر نہیں بلکہ جابجا عیسیٰ ابن مریم کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کسی مغل کے گھر میں پیدا نہیں ہوں گے بلکہ وہ آسمان سے اتریں گے اور ان کا مرکز اور مستقر دمشق ہوگا۔ ان کے آنے کے جلد ہی بعد مسلمانوں کا یہود سے معرکہ ہوگا جس میں مسلمانوں کے سردار حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے اور یہود کا جرنیل اور سردار دجال اکبر ہوگا۔

Marfat.com

پہلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں بعض لوگوں کا گمان ہے کہ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کا معنی یہ نہیں کہ (اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا) بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ (اللہ نے اس کے درجات بلند فرمائے) چنانچہ قرآنِ کریم نے متعدد جگہ اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ

(اور ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے بات کی اور بعض کے مدارج بلند کئے) (۲۵۳۔البقرۃ)

حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (ہم نے اس کو بلند درجے پر فائز کیا) (۵۷۔مریم)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی کو اس لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ممکن ہے یہی کہا گیا ہو کہ ہم آپ کو وفات دیں گے اور آپ کے درجات بلند کریں گے۔ اس سلسلے میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ مُتَوَفِّيكَ کا معنی (آپ کو وفات دیں گے) سیاقِ کلام کے بالکل خلاف ہے اور عبارت کا کوئی قرینہ اس پر دلالت نہیں کرتا بلکہ عبارت خود بول رہی ہے کہ یہاں وفات یعنی موت مراد نہیں بلکہ آپ کو اٹھا لینا مراد ہے۔ جس کی وضاحت رافعک کے لفظ نے بھی کر دی ہے اور دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ رفع کا معنی ترقی درجات بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اِلٰی کا لفظ کبھی نہیں آتا۔ جب رفع کے لفظ کو اِلٰی کے ساتھ لایا جائے گا تو پھر نہ صرف اس کا معنی اپنی طرف اٹھانا ہوتا ہے بلکہ عزت و اکرام کے ساتھ اٹھانا ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ سورۂ نساء کی آیتِ کریمہ نے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں حتمی طور پر اس معنی اور مفہوم کی توثیق کر دی ہے کہ یہود و نصاریٰ آپ کے قتل اور صلیب کے دعویدار ہیں اور قرآنِ کریم نے یقینی انداز میں ان دونوں باتوں کا انکار کیا اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اسے اپنی طرف اٹھالیا اور اگر آپ طبعی موت سے دنیا سے اٹھائے گئے ہوتے تو صاف کہہ دیا جاتا کہ وہ لوگ آپ کو قتل کرنے یا سولی دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ آپ کے گلے تک پہنچتا ہم نے خود اس کی جان قبض کر لی۔ لیکن اس کا جواب پھر کوئی نہیں دے سکتا تھا کہ یہود کے پیش نظر نہ قتل کرنا تھا، نہ سولی دینا بلکہ آپ کی زندگی کا خاتمہ تھا اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے مقصد کو اپنے طور سے پورا کر دیا تو یہ تو وہی بات ہوئی جو یہود چاہتے تھے اور اس میں درحقیقت اگر رفع درجات والی کوئی بات ہے تو وہ یہود کے لیے ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے نہیں۔ لیکن ایسی دور از عقل بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عربی زبان سے نابلد اور قرآن فہمی سے ناآشنا ہو اور یا فسادِ نیت کے باعث وہ قرآنِ کریم کے مفہوم کو بگاڑنا چاہتا ہو۔

ہر صاحبِ علم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت جس طرح دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے اسی طرح احادیث اور سنتِ طیبہ قرآنِ کریم کے مفہوم و مراد کے تعین کے لیے سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ احادیث میں قرآن کی تائید موجود ہے بلکہ اس عقیدہ پر کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے اور وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قربِ قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے، امت کا اجماع ہے۔ حافظ ابن حجر نے تلخیص الخبیر صفحہ ۳۱۹ میں اس اجماع کو نقل کیا ہے۔ علمائے امت نے اس مسئلہ کو مستقل کتابوں میں پوری وضاحت سے لکھا ہے اور منکرین کے جوابات پوری تفصیل سے دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی تصنیف

Marfat.com

''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام'' مولانا بدرِعالم صاحب کی تصنیف ''حیاتِ مسیح علیہ السلام'' نہایت علمی کاوشیں ہیں، علاوہ ازیں عرب وعجم کے اور بھی علماء نے اس موضوع پر بہت موقر کتابیں لکھی ہیں۔ اسی سلسلہ میں مرزائیوں کی پھیلائی ہوئی بعض غلط فہمیوں کے تدارک کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی ''مسئلہ قادیانیت'' کے نام سے ایک نہایت تحقیقی اور موثر مقالہ لکھا تھا جس پر انہیں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس کی ایک منفرد حیثیت ہے۔

مرزا غلام احمد کی نبوت کی طرف دعوت دینے والوں نے جہاں اور بہت سی علمی خیانتیں کی ہیں وہیں انہوں نے یہ بھی حرکت کی ہے کہ حدیث میں جس مسیح موعود کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور پھر قربِ قیامت میں واپس آنے اور دجال کے فتنہ کے استیصال کا ذکر ہے وہ عیسیٰ ابن مریم نہیں ہیں ان کا تو انتقال ہو چکا بلکہ اس سے مراد مثیلِ مسیح یعنی حضرت عیسیٰ کی مانند ایک مسیح ہے، وہ اب آ چکا اور اس کا نام فلاں ہے، اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم چند مستند روایات نقل کئے دیتے ہیں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ کتنی بڑی علمی اور دینی خیانت کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم والذی نفسی بیدہٖ لَیُوْشِکَنَّ ان ینزل فیکم ابن مریم حَکَمًا عَدلًا فیکسر الصلیب و یقتل الخنزیر و یَضَعَ الحربَ و یُفِیضَ المال حتی لا یقبلَہٗ احدٌ حتی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرًا من الدنیا وما فیھا (بخاری کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابنِ مریم. مسلم باب بیان نزول عیسیٰ. ترمذی ابواب الفتن باب فی نزول عیسیٰ. مسند احمد، مرویات ابوھریرۃ)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے یعنی جزیہ ختم کر دیں گے اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ) لوگوں کے نزدیک اللہ کے حضور ایک سجدہ کر لینا دنیا مافیہا سے بہتر ہوگا)

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم (بخاری کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ. مسلم بیان نزول عیسیٰ، مسند احمد مرویات ابی ھریرۃؓ)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! کیسے ہو گے تم جبکہ تمہارے درمیان ابن مریم اتریں گے اور تمہارا امام اس وقت خود تم میں سے ہوگا؟)

Marfat.com

عن ابی هریرة ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم قال ینزل عیسی ابن مریم فیقتل الخنزیر و یمحو الصلیب و تجمع له الصلٰوة و یعطی المال حتی لا یقبل و یضع الخراج و ینزل الروحاء فیحج منها اویعتمر او یجمعهما (مسند احمد، بسلسلۂ مرویاتِ ابی ھریرہؓ کتاب الحج باب جواز التمتع فی الحج و القرآن)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے۔ پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور روحاء کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج وعمرہ کریں گے یا دونوں کو جمع کریں گے (راوی کو شک ہے)

عن ابی هریرة ان النبی صلی اللّٰه علیه و سلم قال لیس بینی و بینه نبی (یعنی عیسیٰ) وانه نازل فاذا رأیتموه فاعرفوه رجل مربوع الی الحمرة و البیاض بین ممصرتین کان رأسه یقطر و ان لم یصبه بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویهلک اللّٰه فی زمانه الملل کلها الاالاسلام ویهلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنة ثم یتوفی فیصلی علیه المسلمون (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال. مسند احمد، مرویات ابوھریرةؓ)

(ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اور ان (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اترنے والے ہیں۔ پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں۔ رنگ مائل سرخی و سپیدی ہے، وہ زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ملتوں کو مٹا دے گا اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھہریں گے پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے)

عن النوّاس بن سمعان (فی قصة الدجال) فبینما هو کذلک اذ بعث اللّٰه المسیح ابن مریم فینزل عندالمنارة الیضاء شرقی دمشق بین مهروذتین واضعاً کفیه علٰی

Marfat.com

اجنحة ملكين اذا طأطأ راسه قطروا اذا رافعه تحدر منه جمان كاللؤلؤ فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه الامات ونفسه ينتهي الٰی حيث ينتهي طرفه فيطلبه حتى يدركه بباب لُدٍّ فيقتله (مسلم، ذكر الدجال، ابوداؤد، كتاب الملاحم ،باب خروج الدجال. ترمذى، اباب الفتن، باب فى فتنة الدجال. ابن ماجه، كتاب الفتن، باب فتنة الدجال)

(حضرت نواس بن سمعان کلابی (قصہ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں۔ اس اثناء میں کہ دجال یہ کچھ کررہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابنِ مریم کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی اور وہ ان کی حدِ نظر تک جائے گی وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابنِ مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروزے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کردیں گے)

عن مجمع بن جارية قال سمت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول يقتل ابن مريم الدجال بباب لُدّ (مسند احمد، ترمذى، ابواب الفتن)

(مجمع بن جاریہ انصاری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابنِ مریم دجال کو لُدّ کے دروازے پر قتل کریں گے)

عن عائشةؓ (فى قصة الدجال) فينزل عيسٰى عليه السلام فيقتله ثم يمكث عيسى عليه السلام فى الارض اربعين سنة اماماً عادلاً و حَكَماً مُقْسِمًا (مسند احمد)

(حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں روایت کرتی ہیں) پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے)

عن سُفَينة مولى رسول الله صلى الله عليه و سلم (فى قصة الدجال) فينزل عيسى عليه السلام فيقتله الله تعالٰى عندعقبة افيق (مسند احمد)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سفینہ (دجال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو افیق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کردے گا)

غور سے ان احادیث کا مطالعہ کیجئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ یہ اور اسی مضمون کی اور مستند روایات ہیں جن میں کسی مسیح موعود یا مثیل مسیح یا بروزِ مسیح کا دور دور تک کوئی تصور نہیں پایا جاتا بلکہ ان میں صاف صاف اس مسیح کے آنے کا ذکر ہے جنہیں عیسیٰ ابن مریم کہا جاتا ہے

Marfat.com

اور جن کا لقب مسیح ہے۔ وہ آپؐ سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہی دوبارہ قربِ قیامت میں تشریف لائیں گے اور انہی کا ان احادیث میں ذکر ہے۔ ان کا نزول جیسا کہ آپ دیکھ چکے دمشق کی جامع مسجد کے ایک مینارہ پر ہوگا جس کا نام منارۃ المسیح ہے۔ وہ ایک ایسے دجالِ اکبر کے استیصال کے لیے تشریف لائیں گے جو اپنی ڈپلومیسی اور جنگی قوت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے۔ چنانچہ آپ اس وقت کی موجود مسلمان قوت کو ساتھ لے کر اس کے مقابلے کے لیے نکلیں گے، لُدّ پہاڑی کے قریب آپ کا دجال سے آخری معرکہ ہوگا۔ جہاں دجال آپ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے گا۔ یاد رہے کہ یہ لُدّ فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں ایک بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

ان احادیث کو دیکھنے کے بعد یہ تصور کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص آج قادیاں میں پیدا ہو کر مثیلِ مسیح بن کر نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہے اور قادیاں کو دمشق کے مشابہ قرار دے کر اپنے آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے قائم مقام ثابت کرنے کی حماقت کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کھڑاگ رچایا گیا اور غیر ملکی حکومت کے باعث اسے ترقی ملتی چلی گئی۔ قادیاں کو اس نے اس لیے دمشق کے مشابہ قرار دیا کیونکہ بقول اس کے وہاں یزید الطبع لوگ رہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چونکہ منارۃ المسیح میں اترنا ہے اس لیے اس نے قادیاں میں ایک مینارہ بنوایا جس کا نام مینارۃ المسیح رکھا گیا۔ لوگوں نے جب لُدّ کے بارے میں سوال کیا تو مختلف تاویلوں کے بعد ارشاد فرمایا ''اس سے لدھیانہ مراد ہے اور اس کے دروازے پر دجال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔'' اور جب ان سے بار بار یہ پوچھا گیا کہ وہ آنے والے مسیح تو نازل ہوں گے، پیدا تو وہ دو ہزار سال پہلے ہو چکے ہیں۔ تو اس کے جواب میں ایک ایسی مضحکہ خیز تاویل اختیار کی گئی جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہین احمدیہ کے تیسرے حصے میں میرا نام مریم رکھا، پھر جیسا کہ براہین احمدیہ سے ظاہر ہے دو برس تک صفتِ مریمیت میں میں نے پرورش پائی، پھر مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں بذریعہ اس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصہ چہارم میں درج ہے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا'' (کشتی نوح، ص: ۸۷، ۸۸، ۸۹)

محولہ بالا حوالہ جات کو دیکھتے ہوئے یہ دجل و فریب کی بڑی گھٹیا واردات نظر آتی ہے۔ لیکن آج اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر نگاہ ڈالے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پس منظر میں انہیں دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اس دجالِ اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمائے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس دان اور ماہرینِ فنون اس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں اور اس کی یہ طاقت گرد و پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ یہودی ریاست کا نقشہ دیکھتے ہوئے اس خطرے کا صحیح احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس نقشے میں مدینہ منورہ تک شامل ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالمگیر جنگ کی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں میں قبضہ کرنے کی کوشش کریں

Marfat.com

گے اور ٹھیک اس موقع پر وہ دجالِ اکبر ان کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے پر ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بناء پر آپ فتنۂ مسیح دجال سے خود بھی اللہ کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی امت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ اسی مسیح دجال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مثیلِ مسیح کو نہیں بلکہ اس اصلی مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار سال پہلے یہودی اپنے تئیں ٹھکانے لگا چکے ہیں۔

زیرِ بحث آیتِ کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لینے کی وجہ بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ جو در حقیقت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ کوئی بھی رسول جب کسی قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے ہیں تو وہ اس وقت تک اس قوم میں قیام پذیر رہے ہیں جب تک اس قوم سے ایمان لانے کی کچھ بھی توقع باقی رہی ہے اور جب وہ قوم اپنے طور اطوار اور اپنی مخالفت و مزاحمت سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس میں خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی بلکہ وہ اللہ کے رسول کو ختم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو وہاں سے ہجرت کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ کے رسول کا اس قوم سے نکل جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ قوم زندگی کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ یہ ایک ایسا جسد بے روح ہے جسے اب گلنے سڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس متعفن قوم کے تعفن سے نکالا اور انہیں ایک خاص مقصد کے لیے اپنی کائنات کے کسی ایسے گوشے میں محفوظ رکھا ہے جہاں اس کی مشیت کا تقاضا تھا اور جب اس مقصد کی ادائیگی کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں نازل فرما کر اسلام کی سربلندی کے اسباب پیدا فرمائیں گے۔ عیسائیت اور یہودیت پر چونکہ اتمامِ حجت ہو جائے گا اس لیے عیسائی عموماً مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیت اپنے انجام کو پہنچے گی۔ یہ وہ سنت ہے جس کو یہاں مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے یاد فرمایا گیا ہے۔

مزید یہ فرمایا کہ جو لوگ حضرت مسیح کے نام لیوا ہوں گے ان کی تبلیغ و دعوت سے حضرت مسیح علیہ السلام کا دائرہ ایسا پھیلے گا کہ ان کے نام پر سلطنتیں قائم ہوں گی، لیکن وہ یہود جنہوں نے بظاہر ان کا خاتمہ کر دیا تھا وہ سمٹتے چلے جائیں گے لیکن تاریخ میں انہیں عبرت کے طور پر زندہ رکھا جائے گا۔ لیکن یہ بات تقدیرِ الٰہی بن چکی ہے کہ عیسائی بے شک انتساب کی حد تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق رکھیں، یہودیت پر ہمیشہ ان کا غلبہ رہے گا۔ چنانچہ دو ہزار سال کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے ہر طرح کا عروج بخشا، یہودی اور عیسائی دونوں قوتیں اسلام کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔ مسلمانوں کے زوال سے عیسائیوں کو پھر اٹھنے کا موقع ملا، لیکن یہودی عیسائیوں کی طرح دوبارہ عزت کبھی نہ حاصل کر سکے۔ آج وہ بظاہر ایک ریاست کے مالک ہیں، لیکن در حقیقت یہ ریاست عیسائی ملکوں کی گماشتہ ہے بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں اسلام دشمن قوتوں کی چھاؤنی ہے اور وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے یہود سے وہی خدمت لے رہے ہیں جو وڈیرے ہمیشہ کرائے کے غنڈوں سے لیا کرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ سے یہ اعتراض کیا ہے کہ آج کے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے حقیقی متبعین کہاں ہیں؟ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے اور انہوں نے انہیں اللہ کا بیٹا بنا دیا ہے۔ انہوں نے ان پر تورات کی شریعت لازم کی تھی انہوں نے اپنے آپ کو شریعت سے آزاد کر لیا ہے۔ سوائے نسبت کے اور کوئی چیز ان میں باقی نہیں۔ لیکن جس سیاقِ کلام میں بات ہو رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد آپ کے ہر طرح کے متبعین ہیں کیونکہ قرآن کریم میں ہم جا بجا اہلِ کتاب کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر دیکھتے ہیں حالانکہ ان دونوں قوموں نے اپنی اپنی کتابوں کا جو حشر کیا اور جیسا کچھ ان سے تعلق رکھا وہ سب کو معلوم ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا کہ دنیا میں تو ان نام نہاد عیسائیوں کو بھی یہود پر غالب رکھوں گا، لیکن اصل فیصلہ قیامت کے دن ہوگا جب سب کو میری طرف لوٹ کے آنا ہوگا۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ ہے کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہودیوں کے مقابلہ میں چار وعدے فرمائے۔

(۱) یہود تمہاری جان لینے کی چاہے کتنی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ تمہیں یہودیوں کے ہاتھوں قتل نہیں ہونے دے گا بلکہ تم اپنی طبعی عمر گزار کر وفات پاؤ گے۔ البتہ تمہاری وفات کا وقتِ موعود قربِ قیامت میں آئے گا۔ جب اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ دجالِ اکبر کے خاتمے کے لیے دنیا میں امتِ مسلمہ کی مدد کے لیے بھیجے گا۔

(۲) دوسرا وعدہ یہ فرمایا کہ اس وقت تمہیں یہود کے ہاتھوں بچانے کے لیے ہم اپنی طرف اٹھا لیں گے۔ چنانچہ یہود کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پورے اعزاز کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور انہیں وہاں ایک وقتِ موعود تک غیر معمولی زندگی دی گئی جہاں اس کی مشیت کا تقاضا تھا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے تیسرا وعدہ یہ فرمایا کہ تمہیں بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے۔ یہود دشمنی میں اندھے ہو کر مختلف الزامات لگانے کی کوشش کریں گے۔ تمہاری زندگی میں اگر ایسا نہ کر سکے تو بعد میں دل کے پھپھولے پھوڑتے رہیں گے اور جب تک تم دنیا میں رہو گے اس وقت تک غیر معمولی پیدائش کے علاوہ اور قسم قسم کے الزامات لگائیں گے اور اپنی گندی طبیعت اور گندے ماحول کی وجہ سے تمہارا جینا مشکل کر دیں گے۔ لیکن ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں لوگوں سے پاک کر دیں گے کہ تمہیں آسمانوں پر اٹھا کر ایک خاص قسم کی ہجرت سے نوازیں گے اور اس طرح سے ان کے ماحول سے تمہیں دور لے جائیں گے اور قرآنِ کریم کے نزول اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تمہاری بن باپ پیدائش پر اور تمہاری ذاتی وجاہت اور نجابت پر زوردار دلائل کے ذریعے حجت تمام کر دیں گے جس کے بعد تمہارے دشمنوں کو ایسی باتیں کہنے کی ہمت نہیں ہو گی۔

(۴) دنیا سے اٹھا لینے کے باعث تمہیں اگرچہ اپنے تبلیغی مساعی کے نتائج دیکھنے کا موقع نہیں ملا لیکن ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے متبعین کو منکرین پر قیامت تک غلبہ عطا فرمائیں گے۔ تمہارے حقیقی متبع مسلمان ہیں اور نام کی حد تک نصاریٰ ہیں۔ ہم دونوں کو یہود پر ہمیشہ غلبہ دیں گے۔

چنانچہ یہ چاروں وعدے اللہ نے بلا کم و کاست پورے فرمائے اور آج بھی دنیا اپنی نگاہوں سے ان کا ایفاد یکھ رہی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ○
وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ○

(تو جن لوگوں نے کفر کیا میں انہیں سخت عذاب دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا ○ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو اللہ ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا) (۵۶ تا ۵۷)

ہم مختلف مواقع پر یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ دنیا میں اللہ کے رسول کی آمد ایک حجتِ عادلہ ہوتی ہے۔ جزا و سزا عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے کسی بھی رسول کی تشریف آوری پر اس کا انطباق اور نفاذ لازمی ہو جاتا ہے۔ ایمان لانے والے سرافراز ہوتے ہیں

Marfat.com

اور کفر کرنے والے بالآخر عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہی نہیں بلکہ اپنے غیر معمولی کمالات کے باعث جلیل القدر رسول ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ آخری رسول کی آمد کے مبشر بن کر آئے۔ جس کے آجانے سے جزا وسزا کے تقاضے مکمل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی عدالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہود بظاہر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جان چھڑا چکے ہیں لیکن انہیں اندازہ نہیں کہ مستقبل میں انہیں کیسے کیسے حادثات سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے مٹھی بھر حواری ایک بڑی قوم اور ایک بڑی ملت کے مؤسس ثابت ہوں گے اور یہود تاریخ کے مختلف ادوار میں قتلِ عام سے دوچار کیے جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی صفتِ عدل کا ظہور جو اللہ کے رسول کی صورت میں ہوتا ہے اس کا نشانہ صرف یہود ہی نہیں ہوں گے بلکہ عیسائی جب کما حقہ اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کریں گے تو سزا سے وہ بھی نہیں بچ سکیں گے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ بنیادی اللہ کی سنت ذہنوں سے محو نہیں کرنی چاہئے کہ ایمان و عمل اگر جزا کا باعث بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر انعامات کی بارش فرماتے ہیں تو اسی طرح اس کے دین سے انحراف اس کے احکام کی معصیت خواہشات کا اتباع اور دینی زندگی کے تقاضوں سے لاپرواہی یہ ایک ایسا ظلم ہے جس کا ارتکاب کرنے والوں کو اللہ کبھی پسند نہیں کرتا یعنی انہیں اس کی سزا ضرور دیتا ہے۔ کبھی تو اس سزا کا ظہور تنبیہ اور وارننگ کے لیے دنیا ہی میں ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو اس قانون کی گرفت سے کوئی بھی باہر نہیں ہوگا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ○

(یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں) (۵۸)

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا عیسیٰ علیہ السلام نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشر بن کر ایک بہت بڑی خدمت انجام دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہود نے جس طرح اللہ کی کتابوں میں تحریف اور ترمیم کے ذریعے شریعت کو بگاڑا تھا اور جس طرح شریعت کو حکمتِ شریعت سے محروم کر دیا تھا اور انسانی زندگی اللہ کے نور سے محروم ہو کر تاریکی کا شکار ہو گئی تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام نے حکمتِ شریعت کے بند دروازے کو کھولا اور یہود نے جس طرح احکام کو بگاڑا تھا اس کی حقیقت کو پوری طرح نمایاں کیا۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آپ نے ایک مختصر وقت میں جس عظیم کام کی بنیاد رکھی تھی اور جس کی تکمیل نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں انجام پانے والی تھی۔ آپ کی امت اس کی قدر کرتی اور اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر بجالاتی، لیکن انہوں نے اس کے بالکل برعکس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو ایک دیو مالائی شخصیت کی صورت میں تبدیل کر دیا اور آپ کی حیرت انگیز مساعی اور اس کے اثرات کو ایک میتھالوجی بنا کر رکھ دیا۔ اب قرآنِ کریم نے اسے از سر نو ان کی اصل حقیقت کو کھول کے بیان کیا ہے جس سے ان کی شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آئی ہے اور جن حقائق پر آج تک پردہ پڑا ہوا تھا انہیں کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ اس سے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور آپ کے کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملی ہے اسی طرح سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آج جس رسول کی زبان اور جس پر اترنے والی کتاب سے حکمت وبصیرت کے یہ موتی لٹائے جا رہے ہیں اور جس کے ناخنِ تدبیر نے یہود کی دی ہوئی گرہوں کو کھول کر رکھ دیا ہے وہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور ان پر نازل ہونے والی کتاب اللہ کی کتاب ہے۔

Marfat.com

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی مانند ہے۔اسے اللہ نے مٹی سے بنایا پھر اسے فرمایا ہوجا تو وہ ہوگیا۝ (اے مخاطب!) یہ حقیقت ہے تیرے رب کی جانب سے، پس تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجا) (۵۹ تا ۶۰)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں نے جن غلط فہمیوں کی بنیاد پر غلط عقائد اختیار کیے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ایک انسان اور رسول سمجھنے کی بجائے کبھی خدا اور کبھی خدا کا بیٹا بنا ڈالا۔ان میں سے ایک ایک غلط فہمی کا تجزیہ اور تنقید کر کے ازالہ کر دیا گیا۔اب اس آیت کی صورت میں بحث کو سمیٹتے ہوئے خاتمۂ بحث کے طور پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ متذکرہ بالا دلائل اظہارِ حقیقت اور اتمامِ حجت کے لیے کافی ہیں۔لیکن ہم آخرت میں ایک ایسی مثال دے رہے ہیں جسے جان لینے کے بعد کوئی غبی سا غبی آدمی بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوسکتا۔فسادِ نیت کا تو کوئی علاج نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر واضح تربات اور کیا ہوگی کہ تمہاری غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور پیدائش اور وجود کے لیے تمہارے نزدیک چونکہ باپ کا ہونا ضروری ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہیں تو تم نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ وہ یقیناً خدا کے بیٹے ہیں۔لیکن ذرا اس بات کا جواب دو کہ تمہیں بھی تسلیم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نوعِ انسانی کے جدامجد ہیں۔انہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا باپ بنایا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کے باپ نہیں۔لیکن انہیں کسی کا بیٹا نہیں بنایا کیونکہ نہ ان کی کوئی ماں ہے اور نہ باپ۔اللہ نے انہیں مٹی سے بنایا اور پھر کلمۂ کن سے انہیں پیدا فرما دیا۔بالکل سامنے کی بات ہے کہ ایک ذاتِ عزیز جس کے بارے میں تمہیں تسلیم ہے کہ وہ محض اللہ کے حکم سے وجود میں آئی۔اس کے سوا اور کوئی سبب اس کے وجود میں آنے کا نہیں۔اسے نہ تم نے اور نہ دنیا میں کسی اور نے نہ خدا بنایا نہ خدا کا بیٹا بنایا۔عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے۔اسباب کی دنیا میں ان کے باپ نہ سہی، ماں تو موجود ہے۔تو تم نے آخر کس بنیاد پر ان کو خدا کا بیٹا بنالیا؟ یہ وہ آخری بات ہے جس کے بعد اس بحث کو ختم ہوجانا چاہیے۔اس لیے فرمایا کہ اے مخاطب! تیرے رب کی جانب سے تو عیسیٰ علیہ السلام کی یہی حقیقت ہے کہ وہ انسانوں میں سے ایک انسان اور رسولوں میں سے ایک رسول تھے۔اللہ نے انہیں برگزیدہ فرمایا اور کلمۂ کن سے بغیر باپ کے انہیں پیدا فرمایا۔دلائل اور مثال سے یہ بات پوری طرح واضح کر دی گئی۔اس لیے اے مخاطب تمہارے لیے اب اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انسان سمجھنے میں کسی شک وشبہ کا اظہار کرو اور اگر یہ کہا جائے کہ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور آنحضرت کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کسی حقیقت کے بارے میں شک کا شکار ہوں گے۔تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب وہ اپنے مخاطب کو خطاب کے قابل نہیں سمجھتا تو پھر ان سے منہ پھیر کر خطاب تو اپنے پیغمبر سے کرتا ہے لیکن سناتا اسی کو ہے جسے سنانا مقصود ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطاب بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے، لیکن بات امت کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی مثال دے کر عیسائیوں کے سامنے یہ بات واضح کی ہے کہ تم اگر اللہ کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے ہو تو تب بھی، عقل کے تو تم بھی مالک ہو۔ تم صرف عقل سے فیصلہ کرو کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش پر یقین رکھنے والا شخص کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں کسی الجھن کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر تم اپنی عقل کو ایک قدم اور آگے بڑھنے دو تو تم نے جن الفاظ کو الجھنوں کا سبب جانا ہے اور غلط عقائد کی بنیاد بنایا ہے تم خود محسوس کرو گے کہ اس بنیاد کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بناتے ہوئے انجیل میں ''ابن'' کے لفظ کا سہارا لیا ہے کہ جب پروردگار خود عیسیٰ علیہ السلام کو ابن یعنی بیٹا کہہ کے پکارتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یقیناً اس کے بیٹے ہیں حالانکہ تم جانتے ہو کہ تورات اور انجیل میں ابن کا لفظ صرف عیسیٰ ہی کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ حضرت آدم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ فرشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ حتیٰ کہ نصاریٰ کو بھی بیٹے کہہ کر پکارا گیا ہے۔ تو اگر کسی کو خدا کا بیٹا یا معبود بنا دینے کے لیے یہ لفظ کافی ہے تو پھر تم نے صرف عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا کہنے پر اکتفا کیوں کیا ہے پھر تو تمہیں ہر اس ذات کو معبود ماننا ہوگا جس کے لیے بیٹے کا لفظ استعمال ہوا اور اس طرح معبودوں کا ایک لشکر تیار ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ تم بھی اتنی بڑی حماقت کبھی نہیں کر سکتے تو پھر سیدھی طرح اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہو۔

فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ○

(پھر جو شخص تم سے اس بارے میں حجت کرے بعد اس کے کہ تمہارے پاس صحیح علم آ چکا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی، اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی۔ پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں) (۶۱)

اس آیتِ کریمہ میں بات اگرچہ غائب کے صیغے سے کہی گئی ہے لیکن اشارہ بنی نجران کے وفد کی طرف ہے کیونکہ بحث انہی سے جاری تھی اور وہی عیسائیت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہی پر اتمام حجت کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن جب انہوں نے اس قدر واضح اور محکم حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو تب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ انہیں مباہلہ کی دعوت دیں۔ ابتہال کے معنی ''دعا اور تضرع'' کے ہیں۔ لیکن یہ ایک دوسرے پر لعنت کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی سے مباہلہ کا لفظ معروف ہوا۔

اختلاف اگر کسی ایسے معاملہ میں ہو جس کا تعلق عقل سے ہو تو پھر اس معاملے میں استدلال کی بنیاد عقل کو ہی بنایا جاتا ہے کیونکہ دنیا کا طریقہ بھی یہی ہے اور اہلِ علم کے یہاں بھی یہ بات مسلم رہی ہے کہ اختلافی معاملات میں عقل کو فیصل ہونا چاہئے۔ لیکن اگر معاملہ عقل و استدلال کے تمام مراحل سے آگے نکل جائے اور مخاطب کسی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو اور مخاطب اپنی بات کی پچ اور اپنی ہٹ دھرمی کی آن قائم رکھنے کے لیے اپنی بات پر اڑا رہنا چاہتا ہو تو معاملہ اگر باہمی حقوق کا ہو تو اس پر صبر کر لینا بہتر ہے اور مخاطب کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے اور یا اگر اس کے لیے کوئی عدالت فیصلہ کن ہو سکتی ہو تو اس کا رخ کرنا چاہئے۔ لیکن معاملہ اگر حق و باطل میں تمیز اور سچائی کا ہے تو پھر اس کے لیے آخری چارۂ کار کے طور پر مباہلے کے طریقے کو اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نجران کے وفد کو مباہلے کی دعوت دی اور وقتِ مقرر پر اپنے نواسوں، اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرا اور اپنے داماد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو

Marfat.com

لے کر مباہلے کی جگہ پر تشریف لے آئے۔ ان سے بھی اسی بات کا مطالبہ تھا کہ تم خود بھی میدان میں آؤ اور جو قریبی عزیز اس وقت تمہیں میسر ہیں انہیں بھی ساتھ لے کے آؤ (اپنی اولاد یا اپنے قریبی عزیزوں کو ساتھ لے کے آنا یہ مباہلے کی شرط نہیں، یہ صرف اس بات کا اظہار ہے کہ ہم اس معاملے میں سب کچھ داؤ پہ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ہم محض بحث کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کر رہے بلکہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد سے بھی زیادہ حق کو اہمیت دیتے ہیں۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کر لیتا ہے لیکن اپنے زن و فرزند اور اپنے محبوب رشتوں کو کبھی مصیبت میں جھونکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے لیے لعنت کی دعا کرے) چنانچہ نجران کے وفد نے جب یہ نورانی چہرے دیکھے تو ان کے مذہبی سربراہ نے اپنے وفد کے شرکاء سے کہا کہ ان لوگوں سے مباہلہ کرنے کی کبھی جرأت نہ کرنا۔ یہ یقیناً اللہ کے نبی ہیں اور اللہ کے نبی کے ساتھ جب بھی کسی نے مباہلہ کیا ہے اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے باہمی مشورے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مہلت طلب کی اور دوسرے روز جزیہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور صلح کر لی۔ یہ واقعہ دس ہجری میں پیش آیا جس نے دنیائے مذاہب پر یہ حقیقت ثابت کر دی کہ عیسائیوں کے غلط عقائد کی کوئی بنیاد نہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ نبوت اور اپنے دین کی حقانیت میں ہر شک و شبہ سے بالا ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ لوگ مباہلہ کے لیے تیار ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیتا اور ان کے گھروں پر آگ کے انگارے برستے۔"

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادیوں میں سے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ساتھ لے کر میدان میں تشریف لائے تھے اس سے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی صاحبزادی صرف ایک تھی ورنہ دوسری صاحبزادیاں بھی اس روز مباہلہ میں شرکت کرتیں۔ کوئی شخص سامنے کے حقائق کا انکار کرنے پر تل جائے تو اسے قائل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بہرحال اظہارِ حقیقت کے طور پر گذارش ہے کہ تمام تاریخ کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، لیکن مباہلے کے وقت تین انتقال فرما چکی تھیں۔ حضرت رقیہؓ نے دو ہجری میں، حضرت زینبؓ نے آٹھ ہجری میں اور حضرت ام کلثومؓ نے نو ہجری میں انتقال فرمایا۔ وہ چونکہ اس وقت اپنے اللہ کے پاس پہنچ چکی تھیں تو ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مباہلے میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ○

(بیشک یہی ہے سچا واقعہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بیشک اللہ ہی غالب اور حکمت والا ہے ○
پھر وہ اگر اعراض کریں تو اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے) (۶۲ تا ۶۳)

دلائل سے حقائق کو ثابت کر دیا گیا۔ مباہلہ سے عیسائیت کے غلط ہونے اور اسلام کے سچا ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی گئی اور توحید کا عقیدہ نکھر کر سامنے آ گیا۔ ہر طرح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معبودِ برحق صرف اللہ کی ذات ہے۔ عیسائیوں یا دوسرے لوگوں نے جو غلط عقائد اختیار کر رکھے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر کچھ لوگ ماننے کے لیے تیار نہیں اور وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو وہ درحقیقت مفسد ہیں جو زمین پر امن قائم نہیں ہونا دینا چاہتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب اس کی تقدیر کا فیصلہ حرکت میں آئے گا اور آج کے مفسد تاریخ میں عبرت کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔

Marfat.com

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى
كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ
شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ
فِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ
تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾
مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا
مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ
لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (کہہ دیجئے! اے اہلِ کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ بنائے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں اس سے تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں ○ اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو درآں حالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر ان کے بعد، تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے ہو ○ ہاں! تم لوگ وہی تو ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمہیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ○ ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ یکسو مسلم تھے اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھے ○ بیشک ابراہیم سے سب سے قریب لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ان پر ایمان لائے اور اللہ ایمان لانے والوں کا ساتھی ہے ○ دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہلِ کتاب میں سے کہ کاش تمہیں گمراہ کر دے حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو۔ لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے ○ اے اہلِ کتاب! کیونکر انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا؟ حالانکہ تم گواہ ہو ○ اے اہلِ کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور حق کو چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے ہو) (۶۴ تا ۷۱)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

(کہہ دیجئے! اے اہلِ کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ بنائے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا، پھر اگر وہ روگردانی کریں اس سے تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں) (۶۴)

اس آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ اہلِ کتاب کو ہے جن میں نصاریٰ اور یہود دونوں شامل ہیں، لیکن سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اصل روئے سخن نصاریٰ ہی کی طرف ہے۔ گزشتہ آیات میں دلائلِ قاطعہ سے ان کے خیالات کی تردید کی گئی اور دلائل کی دنیا میں انہیں بالکل بے بس ہونا پڑا۔ لیکن جب اس بے بسی کے باوجود بھی انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر آپؐ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی کہ آؤ ہم اور تم اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیں کہ وہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ کریں، جس کے ہم دونوں سزاوار ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حق کو قبول کرنے سے ہر طرح انکار کیا، وہ دلائل میں لاجواب ہو کر بھی اپنی بات پر اڑے رہے۔ اس کا مطلب یہی لیا جاسکتا ہے کہ انہیں اپنے موقف اور اپنے برسرِحق ہونے کا پوری طرح یقین تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دلائل میں پوری طرح مقابلہ نہ کر سکے۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جیسے ہی انہیں اپنے برسرِحق ہونے کو ثابت کرنے کا موقع ملا تو وہ آگے بڑھ کر اس موقع

Marfat.com

سے فائدہ اٹھاتے اور اپنے موقف کی حقانیت کو ثابت کر دیتے لیکن جب وہ اس مقابلے سے بھی بھاگ گئے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنے برسرِ حق ہونے کا بالکل یقین نہ تھا۔ البتہ! ایک ہٹ دھرمی تھی جسے وہ آخر حد تک نبھانا چاہتے تھے۔ سر ولیم میور انیسویں صدی کے مسیحی مستشرق ہیں اور صرف مستشرق ہی نہیں، انہیں مشنری کہنا چاہیے۔ لیکن حق وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ انہوں نے ''لائف آف محمد (ﷺ)'' (Lif of Muhammad) میں مباہلہ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے:

> سارے واقعہ میں محمد (ﷺ) کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے۔ نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالمِ غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لیے حق تمام تر انہیں کے ساتھ ہے، درآں حالیکہ ان کے خیال میں مسیحیوں کے پاس ظن و تخمین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

دعوت کا حکیمانہ انداز

اس طرح سے تمام ممکن ذرائع سے جب عیسائیوں پر اتمامِ حجت ہو گیا اور حق کھل کے ان کے سامنے آ گیا۔ لیکن وہ پھر بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک دوسرے پہلو سے اور نہایت ٹھہرے ہوئے اور مثبت اسلوب میں انہیں اسلام کی دعوت دی اور اس میں بجائے ان کے عقائدِ باطلہ کو زیرِ بحث لانے کے نہایت حکیمانہ طریقے سے ایک قدرِ مشترک کے ذریعے بات کا آغاز کیا۔ گفتگو جب مباحثے اور مناظرے کا اسلوب اختیار کر لے تو پھر قرآنِ کریم حکمت کے ذریعے دعوت کا حکم دیتا ہے اور حکمت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ جانبین میں قدرِ مشترک تلاش کی جائے کیونکہ اگر آغاز ہی میں فریقِ مخالف کے خیالات پر تنقید اور اس کے عقائدِ باطلہ کا ابطال شروع کر دیا جائے تو بات تو وہیں رک جاتی ہے البتہ لڑائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ قدرِ مشترک سے بات کے آغاز سے ایک تو بات کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے اور دوسری آسانی یہ ہوتی ہے کہ اس کی مقتضیات کو بڑی آسانی سے مخاطب کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی فرار کا راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہاں بھی اسی طریقِ دعوت کو اختیار کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ انہیں دعوت دیجیے کہ آؤ ایک ایسے کلمے کو بنیاد بنائیں جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے۔ کلمہ سے مراد لفظ بھی ہوتا ہے، لیکن قرینہ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد جملہ مفیدہ ہے۔ ابنِ کثیر نے بھی یہی کہا الكلمة تطلق على الكلمة المفيدة اور احادیثِ پاک میں اسی بات کو کہیں الكلمة سے اور کہیں الكلمة الجامعة سے یاد کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہوتا ہے کہ ہم تمہیں ایک ایسی بات اور ایک ایسی حقیقت کی طرف دعوت دے رہے ہیں جو دنیا میں نئی نہیں اور نہ وہ کسی کی میراث ہے۔ جو پہلا انسان دنیا میں آیا تھا وہ اسی دعوت کو لے کر دنیا میں اترا تھا اور پھر جب جب اللہ کا کوئی نبی دنیا میں انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ اس نے یہی بنیادی دعوت انسانوں کے سامنے پیش کی۔ انیسویں پارے میں پروردگار نے حضرت نوح، حضرت ہود حضرت صالح، حضرت شعیب اور بعض اور جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اور ہر ایک پیغمبر کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوم کی طرف صرف ایک ہی دعوت لے کے آئے تھے یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا اور کوئی الٰہ نہیں) یہ حقیقت اور دعوت کی یہ بنیاد جب تک دنیا میں نظامِ حیات کی بنیاد بنی رہی اس وقت تک انسانیت کا دامن محفوظ رہا اور انسانیت نے وہ برگ و بار پیدا کیے جس نے اس دنیا کو

Marfat.com

ہمیشہ چمن زار کی صورت باقی رکھا اور جب بھی یہ دعوت انسانی زندگی کی بنیاد نہ رہی تو انسانیت مختلف گروہوں میں بٹ گئی، جس کے نتیجے میں یہ گلشنِ ہستی جہنم زار بن گیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے توحید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی وہ اساس ہے جس پر ہر مذہب کی عظیم عمارت استوار ہوئی ہے۔ چنانچہ اہلِ کتاب کو دوبارہ اسی عہدِ رفتہ اور متاعِ گم گشتہ کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس طرح اس کلمے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کی جائے کیونکہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ نہ اس کا کوئی فرزند ہے، نہ کوئی اقنوم۔ نہ اس کا کوئی مظہر ہے جو اس کا اوتار بن سکے اور نہ کوئی دیوتا ہے جو اس کی قوتوں میں شریک ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عیسائی کیتھولک فرقہ کی صورت میں موجود تھے اور یا کلیسائے رومی کے متبع تھے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی صدی بعد کی چیز ہے۔ انہوں نے اللہ کی بندگی کے توڑ پر نہ جانے کتنی قسم کی پرستشیں ایجاد کر رکھی تھیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ شرکِ جلی کے ساتھ ساتھ شرکِ خفی کی کیا کیا صورتیں ان کے یہاں پائی جاتی تھیں۔ ان سب کی براہِ راست تردید کرنے کی بجائے انہیں دعوت دی جارہی ہے کہ اس بنیادی بات کو قبول کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس لیے اس کے سوا کسی اور کی بندگی روا نہیں۔ اسی طرح اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ اس کی بندگی میں شرک کا شائبہ بھی قابلِ قبول نہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس کے ذکر سے تورات آج بھی بھرپور ہے۔ جس میں توحید کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور شرک کی بار بار ممانعت فرمائی گئی ہے۔ انجیل میں اگرچہ تورات کی طرح اس حقیقت کی فراوانی تو نہیں لیکن وہ یکسر اس سے بیگانہ بھی نہیں۔ اس میں بھی اسی بنیادی عقیدہ کی تعلیم موجود ہے۔ مثلاً:

(تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اس کی عبادت کر) (متی ۴:۱۰)

(یسوع نے جواب دیا کہ اول (حکم) یہ ہے اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے) (یوحنا ۱۷: ۲۹-۳۰)

(اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد و برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں) (متی ۱۹: ۱۷)

عقیدہ توحید کا لازمی نتیجہ رب کی وحدت ہے

اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ جس طرح آسمانوں میں اس کا کوئی شریک نہیں اسی طرح مخلوق میں بھی کسی کو اس کا شریک نہ مانا جائے اور شرک کی برأت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ اللہ کے سوا جس طرح کوئی معبود نہیں، اسی طرح کوئی رب بھی نہیں۔ مخلوق میں سے کسی کو مطاعِ مطلق مان لینا یہ اس کو رب قرار دینا ہے۔ حدیث میں آتا ہے امام ترمذی نے حضرت عدی ابن حاتم طائی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور مذہبی پیشواؤں کو رب بنا رکھا ہے تو ہم اپنے مذہبی علماء و پیشواؤں کی عبادت تو نہیں کرتے کیونکہ عدی عرب اور عرب کے قبیلہ کے سردار ہونے کے باوجود عیسائی تھے۔ تو انہوں نے عیسائی ہونے کی وجہ سے ایمان لانے کے بعد اس بات کو جاننا ضروری سمجھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جس چیز کو تمہارے احبار و رہبان حرام ٹھہرا دیں تم اس کو حرام ٹھہرا دیتے ہو اور جس چیز کو حلال ٹھہرا دیں اس کو حلال جانتے ہو۔ عدی نے کہا کہ ہاں! ایسی بات تو ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنا دینا ہے یعنی اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو حلال و حرام کرنے کے کلی اختیارات سونپ دینا اور اس کو تحلیل و تحریم کے لیے اتھارٹی تسلیم کر لینا اس کو رب بنا دینا ہے۔ چنانچہ یہاں ان کو صاف صاف دعوت دی گئی کہ توحید کی دعوت تمہاری کتابوں نے بھی دی ہے اور ہم اسی کی تجدید کر رہے ہیں اور اس توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی

Marfat.com

بندگی نہ کی جائے اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور نہ کسی کو تحلیل وتحریم کا حق دیا جائے۔ اگر کسی کو یہ حیثیت دے دی جائے کہ زندگی میں حسن وقبح کے فیصلے جائز اور ناجائز کی حد بندی اور حلال وحرام کا قانون اور اوامر ونواہی کے اصول طے کرنا اس کا حق ہے اور اس معاملے میں اس کی بلاچوں وچراں اطاعت کی جائے گی۔ تو اسے قرآنِ کریم رب ماننے کے مترادف قرار دیتا ہے اور عقیدۂ توحید میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ عیسائی چونکہ اپنے کلیسا کے بارے میں خاص عقیدہ رکھتے ہیں، اس کی معصومیت ان کے ایمان کا جزو ہے اور ان کے مذہبی رہنما ان کی دینی زندگی کے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں اور عیسائیوں نے سینٹ پال کے زیرِ اثر چونکہ اپنے آپ کو تورات کی شریعت سے آزاد کرلیا ہے تو اس طرح سے انہوں نے کلیۃً انسان کو اللہ کی حاکمیت سے آزاد کر کے اپنے منتخب نمائندوں کو زندگی کے وہ فیصلے کرنے کا حق دے دیا ہے جو صرف اللہ کا حق ہے۔ بندے اور اللہ کا تعلق ان کے نزدیک ایک پرائیویٹ اور تنہائی کا تعلق ہے۔ پبلک زندگی میں اللہ کو دخل دینے کی قطعاً اجازت نہیں اور اگر کسی کو اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے تو پھر اسے رہبانیت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو قوم اس قسم کے تصورات رکھتی ہو اس کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ توحید کے بنیادی تصور کو قبول کر کے اپنے انفرادی اور اجتماعی ڈھانچہ کو تبدیل کرنے کے لیے تیار ہو جائے جبکہ اللہ کی تمام کتابوں نے اسی بنیادی بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور یہاں بھی اسی کی دعوت دی جارہی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم نے جس بات کو انسانیت کی قدرِ مشترک اور مسلمہ سچائی کے طور پر ان کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح سے وہ تو ہمیشہ کے لیے اسلام سے کٹ گئے لیکن امتِ مسلمہ کے ایک فرد کی حیثیت سے آج یہ بات کہتے ہوئے دلِ خون کے آنسو روتا ہے کہ توحید کو ماننے کے باوجود اور پانچ وقت ایک اللہ کے سامنے جھکنے کے باوجود ہم اس بات کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ ہم اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب کو وہ حیثیت دے دیں جو توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمانوں کی پارلیمان جب ان معاملات میں آزادانہ فیصلے کرتی ہے جس میں قرآن وسنت پہلے فیصلہ دے چکے ہیں اور قرآن وسنت کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات اور قوانین کو نافذ کرنے کے لیے کسی طور تیار نہیں۔ تو اس آیتِ کریمہ کا خطاب ان کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے اور انہیں بھی پکار پکار کر کہتا ہے کہ جس قرآنِ کریم کو تم چومتے ہو، جسے خوشبو میں بسا کے رکھتے ہو، جس سے ایصالِ ثواب کرتے ہو اور جسے پڑھ کر اجر وثواب کا یقین رکھتے ہو اسی قرآنِ کریم کی یہ آیت اور اس کی ہم معنی بیسیوں آیات تمہیں اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے فیصلوں میں پابند کرتی ہے کہ قانون سازی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بنیادی فیصلے تمہارا حق نہیں بلکہ اللہ کا حق ہے، تم اس میں دخل دے کر یا انہیں نظر انداز کر کے سوچو تو سہی کہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہو۔ ملک میں جرائم ہوتے ہیں، لیکن تم ان کا ازالہ اللہ کی حدود کے ذریعے کرنے سے گریزاں ہو۔ انسان بری طرح بگڑتا جارہا ہے۔ اجتماعی زندگی زخم زخم ہوگئی ہے لیکن تم اس کی اصلاح کے لیے قرآن وسنت کے دیئے ہوئے ضوابط کو نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے، لیکن تم اپنے تعلیمی اداروں میں اس کا فہم عام کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہو۔ جب تمہاری عدالتیں اسلامی قانون سے ہٹ کر فیصلے دیتی ہیں، جب تمہاری پارلیمنٹ اسلامی تعلیمات کے خلاف بل پاس کرتی ہے، جب تمہاری انتظامیہ شراب کے پرمٹ جاری کرتی اور ہوٹلوں میں پیش کرنے کی اجازت دیتی ہے، جب تمہارے قانون کے سائے میں قحبہ خانے کھلتے ہیں اور جب تمہارا مقتدر طبقہ اپنے اقتدار کے مقابلے میں اللہ کے اقتدار کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو غیر جانبداری سے کہو کہ اس آیت کی روشنی میں اس رویے کو کیا کہا جائے گا۔ جب کہ اس آیت میں ہمارے سپرد ایک دوہری ذمہ داری کی گئی تھی جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ کے آخری جملہ میں فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

منصب شہادت کے دو تقاضے

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ اس جملے کو غور سے دیکھئے! اس میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ پہلی یہ بات کہ اگر یہ اہلِ کتاب توحید کی اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں جو تمام مذاہب کے درمیان قدرِ مشترک اور تمام مذاہب کی اساس کی حیثیت رکھتی ہے تو پھر تمہاری پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ تم صاف صاف ان پر یہ بات واضح کر دو کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح و ہدایت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ ہم حاملِ دعوت امت کے اسی منصب پر فائز کیے گئے ہیں، جس منصب سے اے اہلِ کتاب تمہیں معزول کیا گیا ہے۔ تمہاری سازشوں اور تمہاری مخاصمتوں نے اگرچہ ہمارے دل زخمی کر رکھے ہیں، تمہارا رویہ اگرچہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ! ہم اس ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے ہر ممکن طریق سے تمہارے سامنے یہ دعوت پیش کرتے رہے ہیں۔ دلائل کی قوت سے ہم نے تمہیں پسپا کیا ہے۔ تمہاری بداخلاقی کو اپنی اخلاقیات کی ڈھال سے ہمیشہ کند کیے رکھا ہے۔ آخری بات اللہ سے فیصلہ طلب کرنا تھا سو مباہلے کی صورت میں وہ بھی ہم کر گزرے۔ اس طرح سے ہمارا وہ فریضہ جسے شہادتِ حق کہا جاتا ہے ہم نے اسے ادا کرنے میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس لیے تم گواہ رہو کہ کل کو ہمارے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس فریضہ کی ادائیگی کے ہم نے تمام تقاضوں کو پورا کیا تھا یا نہیں۔ ہم تمہیں گواہ بنا کر کہتے ہیں تا کہ تم کل کو تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکو کہ ہم نے واقعی اپنا فرض انجام دے دیا ہے اور دوسری یہ بات کہ تم ہماری اس دعوت کے مقابلے میں کچھ بھی رویہ اختیار کرو اور اپنے ظاہری علم و فضل کو ہمارے راستے کی رکاوٹ کے لیے چاہے کیسے ہی اسالیب سے استعمال کرو اور تم اسلام کا راستہ روکنے کے لیے جو بن پڑے بے شک اس سے دریغ نہ کرو۔ لیکن ہمارا طرزِ عمل بالکل ایک حقیقت کی طرح اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ہم ازاول تا آخر اللہ کے مسلم ہیں۔ ہم نے اپنے اللہ کے سامنے خود سپردگی اختیار کی ہے۔ جب وہی ہمارا رب اور وہی ہمارا معبود ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ ہم اس کے سوا اپنی زندگی کے فیصلوں میں کسی اور کو دخیل ہونے کا موقع دیں۔ کبریائی اسی کی، محبت اسی سے اور رہنمائی اور اطاعت اسی کی۔ یہ ہمارا وہ طرزِ عمل ہے جسے ہم کبھی بھی تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی زندگی انہی دونوں چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک طرف اللہ کی بلاکم و کاست بندگی و غلامی اور دوسری طرف اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے دین کے برسرِ حق ہونے کی ایک ایسی گواہی جو زندگی کے ہر میدان میں بولتی ہوئی سنائی دے اور جسے دیکھ کر کوئی شخص اللہ کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ مجھے تو تیرے دین سے کسی نے باخبر نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے وہ عملی زندگی کبھی نہیں آئی تھی جس پر صرف تیری کبریائی کی چھاپ ہوتی۔ اس لیے میں اہلِ دنیا کی دعوت اور طرزِ عمل کو قبول کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا۔

عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں بھی امت مسلمہ کی یہی دوہری ذمہ داری تھی جس نے ان کو دنیا میں سرافراز کیا تھا اور آخرت کے وعدوں کا حقدار ٹھہرایا تھا اور آج بھی اس کی یہی دوہری ذمہ داری ہے اور آج بھی اس کی آبرومندانہ زندگی کے حصول کی اگر کوئی ضمانت ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ذمہ داری ہے

ہم کو بخشی ہیں خدا نے دوہری خدمتیں
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
ہم کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

Marfat.com

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو درآں حالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر ان کے بعد، تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے ہو O ہاں! تم لوگ وہی تو ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمہیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے O ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ یکسو مسلم تھے اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھے O بے شک ابراہیم سے سب سے قریب لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ان پر ایمان لائے اور اللہ ایمان لانے والوں کا ساتھی ہے) (٦٥ تا ٦٨)

دلائل میں پسپائی کے بعد جذبات کا سہارا

متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ جب وہ دلائل کے مقابلے میں پسپا ہو جاتے ہیں اور ان کے پاس اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے کوئی مضبوط دلیل باقی نہیں رہتی تو بجائے راہِ راست اختیار کرنے اور اپنی ناکامی کو قبول کرنے کے، لوگوں کے جذبات کو ابھار کر بدگمانیوں کی دھول میں اپنے لیے پناہ گاہیں تعمیر کرتے ہیں۔ ایک عام آدمی دلیل سے غرض نہیں رکھتا۔ وہ جذبات پہ مرتا اور جذبات سے جیتا ہے۔ اسے اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ فلاں فرد یا فلاں گروہ اس عظیم شخصیت کے خلاف ہے جو تمہاری جذباتی عقیدت کا مرکز ہے تو اس کے بعد اہلِ حق کے مضبوط سے مضبوط دلائل بھی عوام کے ناقابلِ قبول ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ جس کے بارے میں بدگمان ہو جاتا ہے اس کی ہر بات اسے غلط اور جھوٹ معلوم ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے وقت بھی آج کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت مرجع خلائق اور تمام مذاہب میں مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہود اور نصاریٰ دونوں کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا جدِ امجد سمجھتے تھے اور اس نسلی تعلق کے ساتھ ساتھ یہ بھی مانتے تھے کہ وہ اللہ کے جلیل القدر رسول اور اس کے مقرب تھے۔ اسی طرح قریش اور مشرکینِ عرب بیت اللہ کے پجاری ہونے کی وجہ سے یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس گھر کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے بنایا تھا۔ عدنان اور قحطان کی اولاد آپس کے اختلافات کے باوجود اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے

Marfat.com

نسلی رشتے میں منسلک سمجھتی تھی اور اس کے علاوہ پورا عرب آپ کی عقیدت میں یک زبان اور رطب اللسان تھا۔ یوں تو اہلِ کتاب بھی آپ کی پیروی کا دعویٰ کرتے تھے لیکن عرب تو بطورِ خاص اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کا علمبردار یقین کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس وقت کی معلوم دنیا میں جن لوگوں سے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مقابلہ درپیش تھا وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بزرگ اور اپنا مرجع خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اہلِ کتاب نے جب آنحضرت ﷺ کی دعوت کے مقابلے میں بری طرح ہزیمت اٹھائی اور ہر محاذ پر پسپا ہوتے چلے گئے تو انہوں نے اسی عوامی جذباتیت کو ڈھال کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم لوگ جس دین پر قائم اور جس راستہ پر چل رہے ہیں یہ ابراہیم کا دین ہے۔ ہم اگر یہودی یا نصرانی ہیں تو یہ نسبتیں ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہیں اور مسلمانوں نے ایک نئی نبوت اور ایک نئے دین کا اعلان کر کے اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ نکالا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے بالکل مخالف ہے۔ اس لیے ہم ایک ایسے دین کو کیسے اختیار کر لیں جو ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے کاٹ دینا چاہتا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں ان سے سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ تم ابراہیم علیہ السلام کو اپنی تائید میں کس طرح پیش کر رہے ہو جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ یہود کی بنیاد تورات پر ہے اور نصاریٰ کی بنیاد انجیل پر اور یہ دونوں کتابیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں۔ یہود نے تورات کی بنیاد پر اپنے آپ کو یہودی کہنا شروع کیا اور نصاریٰ نے انجیل کی بنیاد پر اپنا نام نصاریٰ رکھا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ دونوں نسبتیں جو صدیوں بعد پیدا ہوئیں کیسے منسوب ہو سکتی ہیں؟ ایک ایسی چیز جو ایک شخصیت کے صدیوں بعد وجود میں آئی ہے وہ صدیوں پہلے گزرنے والی شخصیت کو اپنے لیے دلیل کیسے بنا سکتی ہے۔ وہ اگر صحیح ہے تو اس کے پاس اپنے دلائل ہونے چاہئیں اور اگر وہ غلط ہے تو اسے اپنی غلطی قبول کرنی چاہئے۔ صدیوں پہلے گزرنے والی شخصیت صحیح یا غلط ہونے کے حوالے سے کس طرح حوالہ یا جائے پناہ بن سکتی ہیں۔ یہ تو ایک ایسی عقل کی بات ہے جسے معمولی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے تو تم آخر اس بے عقلی کی بات پر اصرار کیوں کرتے ہو؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس سے بھی بڑھ کر بے وقوفی کی بات یہ ہے کہ تم نے اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خرقِ عادت ولادت اور غیر معمولی معجزات سے ان کے بارے میں اگرچہ ایک سے ایک غلط بات کی، لیکن تب بھی یہ بات کسی حد تک کہی جا سکتی ہے کہ تم نے جو کچھ بھی کہا اس کا تعلق یقیناً تمہاری معلومات سے تھا۔ تمہارے آباواجداد کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئے، انہیں کے سامنے معجزات کا ظہور رہا۔ یہ باتیں یقیناً ان کے علم میں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس سے غلط نتائج نکالے اور غلط دلائل اخذ کئے۔ لیکن جو کچھ بھی کہا ان کی بنیاد بہرحال ان کا علم اور ان کی معلومات تھیں۔ لیکن اب جو تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہہ رہے ہو اس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ ایک شخصیت جو صدیوں پہلے گزر گئی۔ تم نے ان کا زمانہ نہیں پایا، ان پر اترنے والا کوئی صحیفہ محفوظ نہ رہا اور تم نے جو کچھ مذہب کے نام پر تانا بانا تیار کیا اس کی بنیاد تورات ہے یا انجیل تو آخر اس میں تم ابراہیم علیہ السلام کو کس طرح کھینچ لائے ہو؟ جبکہ تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے

Marfat.com

ہو۔ ہاں ان کے بارے میں اگر کوئی باخبر ہے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس نے اپنا آخری رسول بھیج کر تمام صداقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ آج اگر کوئی بات قابلِ قبول ہو سکتی ہے تو وہ بات ہے جس کو اللہ کا آخری رسول اللہ کے حوالے سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اسے تم سننے کی بجائے ہر صداقت کو اپنی جہالت کی ہنگامے کی نذر کر دینا چاہتے ہو۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے وہ قطعی اور حتمی بات ارشاد فرمائی ہے جسے آج تاریخ بھی ثابت کر رہی ہے اور جسے عقل نے بھی ہمیشہ مانا ہے اور آج جیسے جیسے تحقیق اور تجسس کا قدم آگے بڑھ رہا ہے اور کھدائیوں میں بعض کتبات ہاتھ آ رہے ہیں تو قرآنِ کریم کی یہ حقیقت روز بروز واضح تر ہوتی جا رہی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی، وہ اللہ کے فرمانبردار بندے، مسلم اور حنیف تھے۔ عربی میں الحنف گمراہی سے منہ موڑ کر حق کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں اور حق سے روگردانی کر کے گمراہی کی طرف مائل ہونے کو الجنف کہا جاتا ہے۔ (مفردات) اس لحاظ سے حنیف وہ شخص کہلائے گا جو ہر باطل اور گمراہی سے منہ موڑ کر، ہر ماسوا اللہ سے کٹ کر ہمہ تن حق و صداقت سے وابستہ اور اللہ کی ذات سے لو لگانے والا ہو۔ قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حنیف کا لفظ بطورِ صفت استعمال کیا ہے۔ ان کی ذات میں ایک ایسے شخص نے ظہور کیا تھا جس کا راستہ صراطِ مستقیم، جس کا دل محبت الٰہی سے سرشار، جس کے تمام تعلقات تعلق باللہ کی نذر، جس کی تمام خواہشات اعلائے کلمۃ الحق سے وابستہ اور جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی تائید و نصرت کے نور سے روشن تھا۔ وہ از سرتاپا مسلم تھا۔ اس میں یہودیت یا نصرانیت کی پرچھائیوں کو کیسے جگہ مل سکتی تھی؟ اسی طرح اس موحد کی زندگی میں کسی ایسے شرک کو کیسے بار مل سکتا تھا جسے اللہ کی ذات اور صفات قبول نہ کر سکتی ہوں۔ اس لیے نہ وہ یہودی تھا نہ نصرانی اور نہ وہ مشرک تھا۔ یہاں روئے سخن اگرچہ اہلِ کتاب کی طرف ہے، لیکن مشرکین بھی چونکہ اسی مرض میں مبتلا تھے اور اس لیے ساتھ ہی اس کی بھی تردید فرما دی گئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ ابراہیم سے اگر کسی کو سچی نسبت ہو سکتی ہے تو وہ صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا اور ان کی ذات کی پیروی کی۔ اگر یہ نسبت نسب سے ملتی تو آزر سے رشتہ نہ ٹوٹتا اور اگر اس کے لیے وطن کافی ہوتا تو آپ وطن سے نکل کر مختلف ملکوں کو اپنی دعوت کی آماجگاہ نہ بناتے۔ آپ کے ساتھ ان لوگوں کا رشتہ رہا جو آپ کی دعوت میں آپ کے دست و بازو اور اللہ کے دین میں آپ کے متبع تھے اور آج اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان سے تعلق کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے جنہوں نے ملتِ ابراہیمی کو زندہ کیا اور یا آپ پر ایمان لانے والے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہوئے دینِ ابراہیم کو نئی زندگی اور تازہ قوت بخشی اور ان کی ایک ایک سنت کو از سرِ نو زندہ کیا۔ ہر سال عید قربان کے موقع پر پوری امتِ مسلمہ اللہ کے حضور جانوروں کی قربانی پیش کرتی ہے اور ساتھ یہ دعا بھی کرتی ہے کہ یا اللہ! اسے اسی طرح قبول فرما جس طرح تو نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اسے قبول کیا تھا کیونکہ یہ اسی عظیم شخصیت کی سنت ہے۔ جسے ہم پر ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لازم ٹھہرایا ہے۔ رہے وہ لوگ جو نام لیتے ہیں ملتِ ابراہیم کا لیکن وابستہ ہیں یہودیت یا نصرانیت یا عرب کی مشرکانہ زندگی سے تو ان کا تعلق آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا ہو سکتا ہے اور آیتِ کریمہ کے آخر میں یہ نوید بھی سنا دی گئی کہ اب ملتِ ابراہیم کو جو عزت ملنے والی ہے اور جو برگ و بار پھوٹنے والے ہیں وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے نتیجہ میں پھوٹیں گے اور انہیں پر ایمان لانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی نام لیوا ہوں گے اور یہی لوگ ہیں کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی اور حامی ہوگا۔

Marfat.com

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْيُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

(دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہلِ کتاب میں سے کہ کاش تمہیں گمراہ کردے حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو، لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے) (۶۹)

اہلِ کتاب کا اصل مرض

گزشتہ آیات میں جس طرح ایک ترتیب سے تاریخی اور عقلی دلائل قائم کرکے اہلِ کتاب کے طرزِ عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، اس کے بعد قرآنِ کریم کا ہر قاری یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے کیونکہ اگر معاملہ صرف مشرکین عرب کا ہوتا تو ان کی ہٹ دھرمی کو ان کی جہالت پر محمول کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اہلِ کتاب میں تو علم کا نہ صرف چرچا تھا بلکہ ان میں بڑے بڑے علماء اور مشائخِ طریقت موجود تھے جو کسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے بے ہودہ، جاہلانہ اور فرسودہ خیالات اور طرزِ عمل پر جمے رہنا ناقابلِ فہم سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کی اصل مرض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ ہر بات میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے، اس لیے اس مرض کا ذکر کرتے ہوئے طَآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کہہ کر یہ واضح فرمایا ہے کہ اس مرض کا شکار تمام اہلِ کتاب نہیں بلکہ ان میں سے ایک بڑا گروہ ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی گروہ کو اہلِ کتاب کی سربراہی اور پیشوائی حاصل ہے، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ ان سے مختلف فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہوسکے۔ جس بیماری کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے، وہ بیماری وہ ہے جس کا قرآنِ کریم نے اور بھی کئی جگہ ذکر فرمایا ہے۔ وہ ہے اہلِ کتاب کا مسلمانوں کے خلاف عناد اور دشمنی جس کی بنیاد ان کا یہ حسد ہے کہ یہ آخری نبی بنی اسرائیل کی بجائے حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے کیسے آ گیا؟ ہم مختلف جگہ اس کا حوالہ دے چکے ہیں کہ اہلِ کتاب کے بڑے بڑے علماء تسلیم کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی آخری نبی ہیں جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے۔ لیکن چونکہ وہ بنی اسماعیل میں آئے ہیں اس لیے ہم کسی طرح بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو ایک یہودی سردار کی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں، ان کی یہ بات حدیث کے ریکارڈ میں موجود ہے کہ میرے والد نے میرے چچا سے کہا کہ ہیں تو یہ وہی نبی، لیکن جب تک جان میں جان ہے میں ان کی بات چلنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ ان کا یہی جذبۂ حسد ان کی سازشوں اور مخاصمتوں کا ہمیشہ سبب بنا رہا۔ وہ بظاہر ہمدرد بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں آتے، مسلمانوں سے قربت کا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کرتے، لیکن مقصود صرف یہ ہوتا کہ کسی طرح ہم مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ مختلف طریقوں سے اشتباہات اٹھائے جاتے، غلط فہمیاں پیدا کی جاتیں اور اس طرح سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن ان نادانوں کو یہ خبر نہ تھی کہ اللہ کا آخری رسول دنیا میں اس انقلاب کی تکمیل کے لیے آیا ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا اور اس ہدایت کو عام کرنے کے لیے آیا ہے جس کے لیے ہر نبی نے کوششیں کیں اور اللہ کی دھرتی پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے آیا ہے، جس کے لیے ہر نبی اور رسول نے قربانیاں دیں۔ ان کی کوششوں سے ہدایت کا یہ سفر رک نہیں سکتا۔ یہ قافلہ اپنی منزل تک پہنچ کے رہے گا البتہ گمراہ کرنے والے اس قافلے سے بچھڑ جائیں گے اور اس طرح اپنی قسمت کھوٹی کرلیں گے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنا مقدر کھو رہے ہیں، لیکن انہیں اس کا احساس نہیں۔

Marfat.com

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(اے اہلِ کتاب! کیونکر انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا؟ حالانکہ تم گواہ ہو ○ اے اہلِ کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور حق کو چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے ہو) (۷۰ تا ۷۱)

ان دونوں آیتوں میں اہلِ کتاب سے خطاب ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ملامت بھی کی جارہی ہے اور اظہارِ افسوس بھی کیا جارہا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسا لگتا ہے کہ آخری فیصلہ بھی سنایا جارہا ہے۔ جسے اتمامِ حجت بھی کہا جاسکتا ہے اور بدنصیبی کی انتہا بھی۔

پہلی آیت میں یہ فرمایا کہ اے اہلِ کتاب تم اللہ کی آیات سے کفر کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے تم قرآنِ کریم کے مزاج آشنا ہو؟ تمہیں خوب اندازہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔ پھر وہ ان تمام باتوں کا مصداق بن کر آئی ہے جس کا ذکر تمہاری کتابوں میں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمہارے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کی آیات ہیں، جنہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا اور اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ تمہاری کتابوں میں تمہارے انبیاء کے ذریعے تم سے آخری نبی اور آخری کتاب کی آیات اور احکام کی شہادت دینے کا عہد لیا جاچکا ہے اور تم اس کا اقرار کرچکے ہو۔ چنانچہ اسی سورہ آلِ عمران میں آیت نمبر ۸۹ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ تفصیل سے بات تو وہاں ہوگی یہاں صرف اس کا ترجمہ نقل کیے دیتے ہیں۔

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ چونکہ میں نے تم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے تو جب آئے تمہارے پاس ایک رسول سچی ثابت کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری طرف سے تم نے ذمہ داری اٹھائی؟ بولے ہم نے اقرار کیا تو فرمایا اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

اندازہ فرمائیے! اہلِ کتاب کو پہلے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا پابند کیا گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف ایمان لانا تھا بلکہ باقاعدہ خلقِ خدا کے سامنے ان کی سچائی کی گواہی بھی دینا تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جب قومیں تنزل کا شکار ہوتی ہیں تو وہ پستی میں ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔ کہاں تو ان کا یہ منصب کہ وہ حق کی گواہی دیں اور کہاں ان کا یہ طرزِ عمل جس کا ذکر دوسری آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے کہ ''تم کیوں حق کو باطل سے گڈمڈ کرتے ہو؟ اور تم جانتے ہو کہ تم ایسی خیانتوں کا ارتکاب کرچکے ہو اور اس کی مثالیں سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل علیہما السلام اور تعمیرِ بیت اللہ سے متعلق جو کچھ تورات میں کہا گیا تھا اس کی ایک ایک چیز تحریف کی نذر کردی گئی۔ صفا اور مروہ کے تلفظ سے لے کر محلِ وقوع تک خیانت کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جسے دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ یہاں صرف اس کی یاددہانی فرما کر شرم دلائی گئی ہے شاید اس طرح کچھ دلوں میں ہدایت کا راستہ پیدا ہوجائے۔

Marfat.com

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ
اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ
لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ قُلْ
اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ
اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ
مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ
تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖٓ اِلَیْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ
لَّا یُؤَدِّهٖٓ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا
لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ
وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ
یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ
اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ
لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ

Marfat.com

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾

رکوع: ۸۔ اور اہلِ کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو مسلمانوں پر نازل کی گئی ہے صبح کے وقت اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تا کہ وہ بھی اس سے پھر جائیں O اور نہ مانو کسی کی بات سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کریں، ان سے کہئے کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جیسی تمہیں دی گئی ہے یا وہ حجت لا سکیں تم پر تمہارے رب کے حضور، ان سے کہئے! بیشک فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے O وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر دیتا ہے اور اللہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے O اور اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے ان کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو وہ تمہیں ادا کر دیں اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک تمہیں واپس نہ کریں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس سبب سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان اُمیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں، یہ لوگ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں O ہاں! کیوں نہیں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بیشک اللہ اپنے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے O بیشک جو لوگ بیچتے ہیں اللہ کے عہد کو اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض یہ وہ بدنصیب ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے O اور بے شک ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تا کہ تم اسے گمان کرو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ کہتے ہیں یہ بھی

Marfat.com

اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر O کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصب نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ تم ربانی بن جاؤ بوجہ اس کے تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو O اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلمان بن چکے ہو) (۷۲ تا ۸۰)

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ O

(اور اہلِ کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو مسلمانوں پر نازل کی گئی ہے صبح کے وقت اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تا کہ وہ بھی اس سے پھر جائیں) (۷۲)

اس سے پہلے آیت نمبر ۶۹ میں اہلِ کتاب کے جن عزائم کے بارے میں مسلمانوں کو باخبر کیا گیا تھا اس آیت کریمہ میں ان عزائم کی تکمیل کے لیے ایک منصوبہ اور ایک سازش کا انکشاف فرمایا جا یا رہا ہے۔ آیت نمبر ۶۹ میں تو اہلِ کتاب کے اندر جو مسلمانوں کے خلاف لاوا پک رہا تھا اس کی اطلاع دی گئی تھی، لیکن اس کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں، اسے مسلمانوں کی فراست پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس میں بنیادی بات جس پر زور دینا مقصود ہے۔ اسے سمجھنے کے اہلِ کتاب کا وہ تاریخی پس منظر جاننا ضروری ہے، جس نے انہیں نفسیاتی عوارض کا مرقع بنا دیا تھا۔ وہ پس منظر یہ ہے:

پس منظر

اہلِ کتاب دین سے بیگانگی کے باعث اپنے انبیاءِ کرام اور رسولانِ عظام کی احادیث وسنن کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ یہود کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ تورات کے آخری باب کا مؤلف خود تسلیم کرتا ہے کہ "انہیں کوہِ موآب کے دامن میں دفن کیا گیا تھا، لیکن آج کوئی شخص اس کا نشان تک نہیں جانتا"۔ رہے ان کی زندگی کے حالات اور ان پر اترنے والی شریعت کی تفصیلات اور اس کی عملی صورت جس کا تعلق ان کی پوری زندگی سے ہے اور جس کی وجہ سے تورات اور شریعتِ تورات کو ایک نظامِ زندگی کی صورت ملتی ہے اس کا تو شاید کوئی حصہ بھی یہود کے پاس باقی نہیں رہ گیا تھا اور اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر کتاب کے بارے میں پورے تیقن سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس میں شریعت کے اصول بیان کیے جاتے ہیں، بنیادی عقائد کو واضح کیا جاتا ہے، سفر کی منزل اور جہت مقرر کر دی جاتی ہے۔ بعض جگہ احکام کی وضاحت بھی کی جاتی ہے، لیکن بالعموم اصولوں کو تفصیلی شکل دینا اس کو عملی صورت میں ڈھالنا، زندگی کے معاملات پر اس کا انطباق اور اس کو ایک اجتماعی تعامل اور اداروں کی شکل دے کر ضابطۂ حیات اور تہذیب وتمدن کی صورت دے دینا، یہ کام ہمیشہ اللہ کے رسولوں نے کیا ہے اور ان کی زندگی کا ایک ایک طریقہ اور ایک ایک بات جسے حدیث اور سنت کہا جاتا ہے وہ

Marfat.com

درحقیقت دین کو عملی شکل دیتے ہیں۔ یہود چونکہ اس سے بالکل بے بہرہ تھے اس لیے ان کے دنیا دار علماء کو کتاب اللہ میں تحریف اور ترمیم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اور احکام کو عملی شکل دیتے ہوئے انہوں نے کتاب کو موم کی ناک بنا دیا کہ جب چاہا اور جیسے چاہا اسے عملی شکل میں ڈھال لیا۔ اس طرح سے وہ کہنے کو تو اہلِ کتاب اور حاملِ کتاب امت تھی، لیکن حقیقت میں وہ دینی اور شرعی ضرورتوں کے اعتبار سے ایک مفلس قوم تھے، جن کے پاس جھوٹے ادعا کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

جہاں تک نصاریٰ کا تعلق ہے ان کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تینتیس سالہ دنیوی زندگی میں ہم صرف تین سال سے باخبر ہیں۔ ان تین سالوں کی تبلیغی کاوشوں میں چند لوگوں کا دولتِ ایمان سے منور ہونا اور چند محیر العقول معجزات کا صدور اور یہود کی جانب سے مخالفتوں کے ہجوم میں بالآخر ان کا صلیب تک پہنچنا اور پھر آسمانوں پر اٹھایا جانا، یہ ان کی زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس کا نام عیسائیت ہے۔ انہوں نے اپنے ماننے والوں کو تورات کی شریعت پر چلنے کا حکم دیا تھا، لیکن پال کی سازشوں نے عیسائیت کو پٹڑی سے اتار کر شریعت کی پابندوں سے آزاد کر دیا۔ البتہ چند نا قابلِ فہم عقائد اور چند مذہبی رسومات میں ان کو ایسا الجھایا کہ ان کی گرہیں کھولتے ہوئے انہیں دو ہزار سال گزر گئے۔

یہود و نصاریٰ کے دینی اور علمی سرمائے کی اس وضاحت کے بعد آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اسلام جو قرآن و سنت کا مجموعہ ہے جس میں کتابِ خداوندی کی ایک ایک آیت اور ایک ایک شوشہ محفوظ ہے اور اس کو عملی شکل دینے، اس کے اجمالات کو کھولنے اور اس کے ابہامات کو واضح کرنے کے لیے سنت کا ایک عظیم ذخیرہ پوری احتیاط کے ساتھ امت کے ہاتھوں میں ہے اور ان دونوں چیزوں نے مل کر جو اسلامی آئین و قانون اور اسلامی تہذیب و تمدن کو تشکیل کیا ہے اس میں ڈیڑھ ہزار سال میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ امت پر زوال کے ادوار آئے۔ آج پھر وہ ابتلاء سے گزر رہی ہے۔ لیکن دین سے یکسر بیگانگی یا دینی ضرورتوں سے بے خبری یا اس سرمائے سے تہی دامن ہو جانے کا خطرہ کبھی آج تک پیش نہیں آیا۔ یوں سمجھئے کہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت میں درحقیقت دینی اعتبار سے ایسا ہی فرق ہے جیسا علم اور جہالت میں ہوتا ہے۔ وہ نام مذہب کا لیتے ہیں، لیکن عمل سیکولرازم پر کرتے ہیں۔ اپنی بظاہر شیرازہ بندی، ایک مذہب سے کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی شیرازہ بندی رنگ و نسل کی رہینِ منت ہے۔ وہ اپنی حکومتوں کا نام یہودی اور عیسائی حکومت رکھتے ہیں، لیکن حکومت چلانے اور اس کو عملی شکل دینے میں یہودیت یا نصرانیت کا دور دور تک کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کے گھر کی بے سروسامانی نے انہیں عجیب اشتعال میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ صدیوں سے اپنی بے سروسامانی کا انتقام مسلمانوں کے گھر کی بربادی کی صورت میں لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا یہ کہنا کہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنے دین و شریعت کو اسی طرح بھول جاؤ جیسے وہ بھولے ہیں اور تمہارے پاس بھی بے سروسامانی کی وہی صورت ہو جیسے ان کے یہاں ہے۔ وہ اگرچہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں، لیکن درحقیقت کسی کو عیسائی بنانے کے لیے ان کے پاس کوئی ٹھوس اپیل کرنے والا علم نہیں۔ اس لیے ان کا سارا زور اس بات پر نہیں کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی کر دیں بلکہ زور اس بات پر ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے دیں۔ ان کے اپنے علمی اثاثے کی جانب سے انہیں بدگمان کر دیں۔ پھر وہ بھی عقل کی پرستش اور خواہشات کی پیروی میں اپنی زندگی کے اہداف مقرر کریں اور ان کے حصول میں وہ تمام شکلیں اختیار کریں جو آج کی عیسائی اور یہودی دنیا اختیار کر چکی ہے۔ تاریخ گم گشتہ کو چھوڑیئے صلیبی دور کو بھی جانے دیجیے، لیکن ایک صدی یا دو صدی پہلے کے دور کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھیے یہ دونوں باتیں آپ کو قدم قدم پر دکھائی دیں گی۔

Marfat.com

لارڈ میکالے کی رپورٹ جو جدید تعلیمی نظام کی بنیاد ہے اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ ہمارے پیش نظر مسلمانوں کو عیسائی بنانا نہیں (کیونکہ یہ ان کے لیے ممکن نہیں) ہمارے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ ہم انہیں ایک ایسا نظامِ تعلیم دیں جس سے فارغ ہونے والا مسلمان تو کہلائے لیکن حقیقت میں مسلمان نہ رہے۔ اس کے دینی سرمائے کی ایک ایک چیز کے بارے میں اسے شک وشبہ میں مبتلا کر دیا جائے اور یہی کام ان کے نام نہاد تحقیق و تجسس کرنے والوں نے کیا۔ انہوں نے بظاہر لائبریریوں میں بیٹھ کر غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کا ڈول ڈالا۔ لیکن درحقیقت یہ مستشرقین استعمار کے ایجنٹ اور مذہبی مشنری تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن محفوظ تو ضرور ہے لیکن ابھی تک وہ حقیقی ترتیب سے بیگانہ ہے۔ چنانچہ ایک فرضی نزولی ترتیب کے مطابق گزشتہ صدی میں اسے شائع کیا گیا، جس کی پہلی سورۃ ”سورۃ الزلزال“ تھی اور اس طرح سے قرآنِ کریم کے عطا کردہ منظم ضابطۂ حیات کو تلپٹ کرنے کی ایک مذموم کوشش کی، جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ پھر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اپنا ہدف بنایا۔ آپ نے دنیا میں جس طرح کا صالح اور کامیاب انقلاب برپا کیا ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اس کا انکار کرنا چونکہ ممکن نہیں تھا اس لیے آگے بڑھ بڑھ کر اس کی تعریفیں کیں اور آپ کی ذات کو ذہانت و فطانت کا مرقع ٹھہرایا اور آپ کی کامیابیوں کو آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا نتیجہ قرار دیا۔ ایک سیدھا سادا مسلمان ان اعترافات کو دیکھ کر نہایت خوش ہوتا ہے کہ میرے نبی کی تعریف کی جا رہی ہے۔ لیکن وہ آخر میں پہنچ کر نہایت اطمینان سے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کامیابیوں کی تکمیل اور غیر معمولی کارناموں کی تشکیل کو کہیں نبوت کا نتیجہ نہ سمجھ لیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل فرد تھے لیکن وہ پیغمبر نہیں تھے اور پھر طریقے طریقے سے منافقین اور فرقۂ باطنیہ کے اختراع کیے ہوئے الزامات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ اس سے یہ ثابت کرنا آسان ہو جائے کہ آپ یقیناً ایک بہت بڑے آدمی ہیں، لیکن پیغمبر نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں اخلاق کی یہ یہ کمزوریاں موجود تھیں۔

منٹگمری واٹ جیسے لوگ جو بظاہر علمی دیانت کے پیکر دکھائی دیتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دل کھول کر تعریف کرتے ہیں، لیکن وہ بڑی خاموشی سے اپنے قاری کے ذہن میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً ایک ذہین و فطین اور انتہائی سچے انسان تھے، لیکن ان کے ذہن میں کوئی خرابی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو نبی سمجھنا شروع کر دیا حالانکہ وہ نبی نہیں تھے۔

یہ مختصر سا پس منظر اگر ذہن میں رہے تو ان آیات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جس کی بنیاد میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ لوگ دین و شریعت کے اعتبار سے انتہائی مفلس اور بے سروسامان لوگ تھے، لیکن اپنی نسبتوں پر اترانے کی وجہ سے سیرت و کردار کی ایسی خرابیوں کا شکار ہو گئے تھے جس میں سرفہرست حسد کی بیماری ہے۔ چنانچہ انہی خرابیوں کے باعث وہ مسلمانوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ! گمراہی کی جتنی شکلیں ممکن ہو سکتی ہیں اور اس کے لیے جیسی کچھ سازشیں کی جا سکتی ہیں، ان میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اقبال نے ان کی علمی اور دینی بے کسی اور بے سروسامانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سمانی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ کلیسا کی پیری

Marfat.com

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

حسد کی بیماری

اس بے سروسامانی نے ان کو جس طرح حسد کا مرقع بنا دیا اس کا ذکر بھی قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر کیا ہے۔ چنانچہ حسد کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے جو انہوں نے سازشیں تیار کیں اور جیسی کمینہ حرکتیں کیں اس سے بھی تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ مختلف مذاہب میں علمی مباحثے اور مناظرے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن جو کچھ یہود و نصاریٰ کرتے رہے ہیں اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انہی میں سے ایک انتہائی مکروہ حرکت یہ بھی کی گئی جس پر تاریخ آج تک گواہی دیتی ہے کہ ملکِ شام کی حکومت نے چند یہودیوں کو آلۂ کار بنا کر مدینہ طیبہ میں اس غرض کے لیے بھیجا کہ وہ زمین دوز سرنگ لگا کر کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کو نکال کے لے آئیں۔ اس کے بعد وہ کیا کرنا چاہتے تھے یہ سوچ کر بھی پسینہ آنے لگتا اور خون کھولنے لگتا ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ وہ یہ خباثت ایک ایسی شخصیت کے بارے میں کر رہے ہیں جو اللہ کے آخری سچے رسول ہیں اور جس کے بعد پروردگارِ عالم نوعِ انسانی سے کبھی ہمکلام نہیں ہوئے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ پروردگار اتنی بڑی خباثت کو برداشت کر لیتے۔ چنانچہ حضرت نورالدین زنگی رحمتہ اللہ علیہ جو اس وقت عراق اور فلسطین کے حکمران تھے انہیں خواب میں یہ صورتِ حال دکھلائی گئی اور انہوں نے فوراً مدینہ کا رخ کیا اور منزلوں پر منزلیں سر کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے اور ان دو بدبخت یہودیوں کو گرفتار کیا جنہوں نے جنت البقیع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اطہر کی طرف سرنگ کھود رکھی تھی، جب انہیں پکڑا گیا ہے تو وہ اپنے مکروہ مقصد کے اس قدر قریب پہنچ چکے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا پاؤں مبارک ننگا ہو چکا تھا کیونکہ جنت البقیع سے سرنگ کھودتے ہوئے پہلی قبر راستے میں حضرت عمرؓ کی حائل ہوتی ہے اور اس کے بعد حضرت صدیقِ اکبرؓ ہیں اور پھر وہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس کی عظمت سے زمین پر آسمان غش رہا ہے۔

ایک سازش

چنانچہ یہی وہ ذہنیت ہے جس نے دورِ نبوتؐ میں یہ سازش تیار کی کہ اپنے اندر سے چند ہوشیار لوگوں کو منتخب کیا کہ تم مسلمانوں کے پاس جا کر ان کے رسول کے ہاتھ پر ایمان لاؤ اور زیادہ سے زیادہ ان سے محبت اور شیفتگی کا اظہار کرو اور چند دنوں تک زیادہ سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش رہ کر آپ کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ یہ لوگ واقعی آپؐ کے جانثار اور اسلام کے سچے شیدائی ہیں اور پھر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسا ایک ہی مرتبہ کرو بلکہ وقفے وقفے سے یہ عمل جاری رکھو اور پھر آہستہ آہستہ اسلام سے نکلنے کا آغاز کر دو۔ جب اسلام میں جاؤ تو بلند آہنگی سے جاؤ تاکہ لوگوں کو پتہ چلے اور خوشیاں منائی جائیں کہ یہود کے اہلِ علم میں سے چند لوگ مسلمان ہوئے ہیں تو یقیناً وہ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہوئے ہوں گے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اوس و خزرج کے لوگ جو اپنی بے علمی کے باعث ہمیشہ یہود و نصاریٰ کے علم و فضل سے مرعوب رہتے ہیں، وہ جب ان کو ایمان لاتے ہوئے دیکھیں گے تو ان میں جو لوگ

Marfat.com

ایمان لاچکے ہیں ان کے ایمان میں استحکام آئے گا اور جو لوگ ابھی تک پس وپیش میں ہیں وہ پوری آمادگی سے اسلام کی طرف بڑھیں گے۔ لیکن پھر اچانک چند دنوں کے بعد تم واپسی کا سفر شروع کردو۔ ایک ایک کرکے اسلام سے برگشتگی کا اعلان کرنا شروع کردو اور جس طرح تم نے جاتے ہوئے محبت وشیفتگی کا اظہار کیا تھا اب نکلتے ہوئے اس سے بڑھ کر برگشتگی، بدگمانی اور خود فریبی کا ذکر کرو کہ ہم سے بڑی بھول ہوئی کہ ہم ایک سراب کو پانی سمجھ بیٹھے، ہم نے جسے آبِ حیات سمجھا تھا وہ تو آبِ بلا نکلا۔ ہم نے قریب جاکے دیکھا تو اصل ملمع اترنے لگا۔ جب حقیقت سامنے آئی تو ہم بھونچکا کر رہ گئے۔ حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا دھوکا دیا جارہا ہے کیسا بہروپ دھارا گیا اور نبوت ورسالت کے نام سے کس کامیابی سے ایک کھڑاگ رچایا گیا۔ اس کے نتیجے کے بارے میں بھی وہ یہ توقع کررہے تھے کہ ایسے چند واقعات مسلمانوں پر قیامت بن کر گریں گے۔ نئے ایمان لانے والوں کی آمد رک جائے گی اور جو لوگ ابھی تک یکسو نہیں ہوسکے وہ بدگمان ہو کر پسپا ہو جائیں گے اور اوس وخزرج کے لوگ جنہیں اہلِ کتاب کے علم پر بھروسہ ہے وہ بھی بدگمان ہوکر اسلام سے نکل بھاگیں گے۔ اس طرح سے اسلام پیغمبر اور مسلمانوں کی ایسی ہوا خیزی ہوگی کہ جس کا تدارک شاید وہ مدتوں تک نہ کرسکیں۔ لیکن اللہ نے کرم فرمایا وہ اپنے دین اور اپنے پیغمبر کا محافظ ہے۔ اس نے بروقت مسلمانوں کو اس سازش سے باخبر فرمایا۔ جس کا یقیناً یہ نتیجہ نکلا ہوگا کہ جو لوگ ابھی تک اہلِ کتاب کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے انہیں اصل حقیقت سے آگاہی ہوگئی جو اہلِ کتاب کی تمام تر سازشوں کے باوجود ابھی تک نرم گوشہ رکھتے تھے اور اہلِ کتاب سے اس لیے ملتے جلتے رہتے تھے کہ شاید وہ اسلام قبول کرلیں، انہیں ان کی اصل ذہنیت کا اندازہ کرنے اور اصل حقیقت سمجھنے میں آسانی ہوگئی اور انہیں یقین ہوگیا کہ بظاہر یہ اہلِ علم اور مشیخیت کے دعویداروں کا گروہ درحقیقت فتنہ پرور اور فسادیوں کی ایک منڈلی ہے جو کسی طرح بھی حالات کو روبہ اصلاح نہیں ہونے دیتی۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

(اور نہ مانو کسی کی بات سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کریں۔ ان سے کہئے کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جیسی تمہیں دی گئی ہے یا وہ حجت لا سکیں تم پر تمہارے رب کے حضور۔ ان سے کہئے بیشک فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے ○ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر دیتا ہے اور اللہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے) (۷۳ تا ۷۴)

سلسلۂ کلام کی توجیہ میں دو آراء

مفسرینِ کرام نے اس آیت کی تشریح وتفسیر میں بڑی طویل بحثیں کی ہیں اور انہیں اس سلسلے میں بڑا اضطراب پیش آیا ہے کیونکہ اس آیت میں مختلف جملے ہیں جن میں باہمی تعلق واضح کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ایسا بھی مشکل نہیں جسے اللہ کے فضل وکرم سے آسان نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ اللہ کی توفیق سے اہلِ علم نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ہم اس سلسلے میں صرف دو باتیں عرض کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم جن دو آراء کا ذکر کرنے لگے ہیں ان میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اس آیت کا دوسرا جملہ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ

Marfat.com

اصل سلسلۂ کلام کا جز ونہیں بلکہ یہ دو جملوں کے درمیان ایک جملۂ معترضہ ہے۔ دوسری زبانوں کے لیے تو شاید یہ ایک اجنبی بات ہو حالانکہ اس کا استعمال تقریباً ہر زبان میں ہوتا ہے۔ لیکن عربی زبان اور عربی اسالیب میں یہ ایک عام بات ہے۔ جس کا ہر ادیب کے یہاں استعمال شائع و ذائع رہا ہے اور قرآنِ کریم نے بیسیوں جگہ اس اسلوب کو استعمال کیا ہے۔ جہاں بھی قرآنِ کریم میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہے کہ جس کی فوری تردید یا تائید ضروری ہے۔ تو قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ سلسلۂ کلام کو روک کر پہلے جملۂ معترضہ کی صورت میں تائید یا تردید کی جاتی ہے اور اس کے بعد سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے جملے میں یہود کی متذکرہ بالا سازش کے حوالے سے فرمایا گیا ہے کہ یہود جب کسی اپنے آلۂ کار کو اپنے مذموم مقاصد کی بجا آوری کے لیے مسلمانوں میں یہ کہہ کر بھیجتے تھے کہ تم وہاں جا کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرو تو ساتھ ہی اسے نہایت تاکید کے ساتھ یہ بات کہتے تھے کہ تم وہاں جا کر مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار تو کرو لیکن خبردار ان میں سے کسی کی بات ماننے کی کبھی غلطی نہ کرنا۔ بات جب بھی ماننی ہے اپنے لوگوں کی ماننی ہے کیونکہ اہلِ کتاب ہوتے ہوئے کسی غیر اہلِ کتاب کی بات ماننا تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں۔ یہ بات وہ دو وجہ سے کہتے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہودی حق کو صرف اپنے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور عیسائی اپنے لیے۔ اپنے سے باہر یا اپنی نسل سے باہر حق کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرا چکے تھے اور اس میں وہ کسی طرح کی کمزوری کے در آنے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت صرف بنی اسرائیل کی خصوصیت ہے۔ نبی جب بھی آئے گا وہ بنی اسرائیل میں سے ہو گا۔ اس طرح سے انہوں نے نسل کی ایک ایسی فصیل کھینچ رکھی تھی جس کی موجودگی میں کسی حق کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ یہود چونکہ مدینے کے پڑھے لکھے اور صاحبِ علم لوگ تھے اور اوس و خزرج ان کے مقابلے میں بالکل اُمی اور ان پڑھ تھے اور یہ تو دنیا کا عام چلن ہے کہ ہر جگہ پڑھا لکھا طبقہ **Dominate** کرتا ہے اور ان پڑھ طبقہ ہمیشہ پڑھے لکھے لوگوں کی پیروی کرتا ہے۔ اب نئی آنے والی نبوت اور نیا اٹھنے والا دین چونکہ اپنے ساتھ علم کی فضیلت بھی لایا تھا بلکہ حقیقی علم اب انہی کے پاس تھا تو انہیں اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں میں سے اصحاب الرائے کی بات چلنے لگی تو ہمارا یہ نام نہاد طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے وہ اپنے آلۂ کار لوگوں کو سازش کے طور پر بھیجنے پر تو مجبور تھے لیکن ساتھ پوری طرح انہیں ہر آنے والے خطرے سے آگاہ کرنا بلکہ محفوظ کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے اور یہ دونوں باتیں چونکہ یہود کی تمام گمراہیوں کی جڑ تھیں اور اسی نسلی برتری اور نام نہاد علمی تفوق نے انہیں ہر طرح کی ہدایت کو قبول کرنے سے محروم کر دیا تھا اس لیے قرآنِ کریم نے سلسلۂ کلام کو روک کر سب سے پہلے برسرِ موقع اس کی تردید کرنا ضروری سمجھا کہ ایک طرف تو تم اپنے آپ کو اہلِ کتاب اور اہلِ ہدایت کہتے ہو اور دوسری طرف تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے ہدایت کو ایک نسل میں محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ تو ایک ایسا اندھا بہرہ گروہی تعصب ہے جسے کسی طرح بھی صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ اگر واقعی ہدایت تمہارے پاس ہے تو یہی تعصب دوسرے لوگوں میں اگر موجود ہو گا تو وہ تمہاری ہدایت کو کیسے قبول کر سکیں گے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اصل پیروی ہدایت کی ہونی چاہیے نہ کہ گروہی تعصبات کی اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے کوئی شخص یا گروہ نہیں تو اللہ کی ہدایت اسرائیلی پیغمبر کے ذریعے سے ملے یا کسی اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے، ترجیح تو ہمیشہ اس ہدایت کو دینا چاہیے۔

چنانچہ اس گمراہی کی تردید کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام کو شروع کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملۂ معترضہ کو درمیان سے نکال کر اگلے جملوں کو پہلے جملے سے ملا دیا جائے تو سلسلۂ کلام مربوط ہو جاتا ہے تو پھر بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی کیونکہ ہم نے

Marfat.com

مفہوم بیان کیا ہے دوسرا جملہ اسی کی تائید کر رہا ہے اور تائید کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے کارندوں کو بھیجتے ہوئے یہ جو تاکید کرتے تھے کہ اپنے لوگوں کے سوا کسی اور کی بات نہ ماننا اس کی وجہ اصل میں یہ ذہنیت اور یہ سوچ تھی کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنی نسلی فصیل سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ نفسیاتی طور پر اپنے اردگرد خانہ ساز تصورات کا ایسا تانا بانا بن چکے تھے کہ جس کی وجہ سے ان کے لیے کسی اور کی دینی سیادت اور پیشوائی کو تسلیم کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ بنی اسماعیل باوجود اس کے کہ نسل اور نسب کے اعتبار سے ان کے سب سے زیادہ قریب تھے کیونکہ دونوں کے جدامجد ایک تھے۔ بااین ہمہ! اپنی خانہ ساز برتری کے باعث یہ بات ان کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ تھی کہ بنی اسماعیل میں سے کوئی پیغمبر آ سکتا ہے اور اس کی دینی سیادت تسلیم کی جاسکتی ہے اور اسی کے نتیجے میں اگلے جملے میں جو بات کہی گئی ہے وہ اس کی بھی ہدایت کرتے تھے یعنی اپنے بھیجنے والوں کو یہ سمجھاتے تھے کہ تم جانتے ہو کہ آخری نبی اور آخری دین کے بارے میں تورات میں بہت سی باتیں اب بھی موجود ہیں دیکھنا ان میں سے کوئی بات مسلمانوں کو نہ بتانا ورنہ وہ قیامت کے دن تمہارے رب کے سامنے اسے بطورِ دلیل پیش کریں گے۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۷۶ اور ۷۷ میں یہ بحث گزر چکی ہے اور وہاں کسی حد تک ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

دوسری رائے امام ابوعبداللہ القرطبی رحمہ اللہ کی ہے، جو ترکیب و تالیف میں متذکرہ بالا رائے سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود مفہوم کے تعین میں کسی حد تک مختلف ہے۔ وہ اس آیت کو سلجھاتے ہوئے قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ کو متذکرہ بالا رائے کی طرح جملہ معترضہ ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے جملوں کا تعلق وَلَا تُؤْمِنُوْٓا سے اس طرح پیوست کرتے ہیں۔

اَلْمَعْنٰى وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ وَلَا تُصَدِّقُوْٓا اَنْ يُّحَآجُّوْكُمْ (تفسیر قرطبی)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ رؤسائے یہود اپنے جن لوگوں کو اس سازش کے لیے تیار کر کے بھیجتے تھے تین باتیں ان کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی بات یہ کہ اپنے دین کے ماننے والوں کے علاوہ کسی اور کی بات کی مت مانو اور دوسری بات یہ کہ اس بات کا یقین رکھنا کہ جن انعاماتِ خداوندی سے تمہیں نوازا گیا ہے وہ دوسری کسی قوم کو مرحمت نہیں کیے گئے اور تیسری یہ بات کہ تمہیں اس بات کا ہرگز کھٹکا نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان قیامت کے دن تم پر کوئی حجت قائم کر سکیں گے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس لحاظ سے محفوظ رکھا ہے کیونکہ تم اللہ کے برگزیدہ بندوں سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ قیامت کے دن تم کو ہرگز شرمسار نہیں ہونے دے گا۔ یہ تین باتیں ان کے دل و دماغ میں اتار کر انہیں مسلمانوں کے پاس بھیجا جاتا تھا کیونکہ یہود کو اس بات کا برابر اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تو انہیں اس لیے بھیج رہے ہیں کہ یہ لوگ چند روز دائرۂ اسلام میں رہیں، اپنا ایک اعتبار قائم کریں اور پھر اچانک اسلام سے نکل کر اس کی خود ساختہ برائیاں بیان کر کے لوگوں کو اسلام سے بدظن کریں۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنے تعصبات پر قائم نہ رہے اور مسلمانوں میں جا کر انہوں نے کھلے دل و دماغ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننا شروع کر دیں اور مسلمانوں کے مصفا و مجلا کردار کو دیکھا تو کہیں سچ مچ مسلمان بن کر اسلام کی قوت نہ بن جائیں۔ اس لیے ان کے گرد تعصبات کی جتنی دیواریں اٹھائی جاسکتی تھیں ان کے اٹھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ حقیقت کے مقابلے میں مصنوعی تہذیب اور توہمات پر مبنی مذاہب کی اصل قوت ان کے تعصبات ہی ہوتے ہیں۔ جیسے ہی اس میں غور و فکر کے شگاف کھلنے لگیں تو پھر ان کی فصیلوں کو گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہود نے اپنے نسلی تفوق سے ہر دور میں اپنی قوم کو بچایا اور یہی وہ تعصب ہے جس نے حقیقت کو قبول کرنے سے انہیں دور رکھا۔

Marfat.com

نیشنلزم (Nationalism)، دودھاری تلوار

یہ وہ چیز ہے جسے آج کی زبان میں قومی عصبیت یا نیشنلزم کا نام دیا جاتا ہے۔ یہود کا نیشنلزم نسلی تفوق اور مذہبی تفوق کے دوگونہ تعصبات سے مل کر تیار ہوا تھا اور عیسائیوں کا نیشنلزم بھی انہی دونوں چیزوں سے مل کر تشکیل پایا ہے۔ لیکن مرورِ زمانہ نے ان میں بعض ایسی ضرورتوں کا شعور ابھارا جس کی وجہ سے مذہبی تعصب کو انہوں نے پردۂ اخفاء میں رکھا اور نسلی تعصب کو پردۂ اظہار میں لا کر اپنی قوت کی فصیل بنایا اور اسی کو نیشن کا نام دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے نیشن کے اس تصور سے دودھاری تلوار کا کام لیا ہے۔ اس کی ایک دھار ان کے تحفظ کا ذریعہ بنی ہے اور دوسری دھار نے دوسری قوموں میں تخریب کے زخم لگائے ہیں۔ ان کے اپنے اندر جب بھی انتشار کی قوتوں نے سر اٹھایا ہے تو انہوں نے ہمیشہ نیشنلزم کی قوت سے ان قوتوں کو یا تو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور یا ان کا سر پھوڑ ڈالا اور ان تصورات نے ان کے اساسی تصورات میں اتنی جگہ بنا لی ہے کہ ان کا ہر بچہ، ہر جوان اور ہر بوڑھا ان تعصبات کی چلتی پھرتی تصویر دکھائی دیتا ہے۔ رنگ اور نسل پہچان کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن انہوں نے جرمن قوم کی طرح اسے برتری کا ذریعہ بنا لیا۔ خوبصورتی جس طرح گورے رنگ میں ہے، اسی طرح دوسرے رنگوں میں بھی ہے۔ لیکن ان کے نزدیک ایشیاء یا افریقہ کا خوبصورت ترین آدمی بھی ایک انگریز جیسا نہیں ہو سکتا اور اس معاملے میں وہ اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ ایک انگریز کسی بھی ایشیائی یا کلرڈ (Coloured) آدمی کے پاس سیاسی ضرورتوں یا مفادات کی خواہشوں کے سوا بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ ٹرین میں کھڑے ہونا پسند کرلے گا، لیکن اپنے سے مختلف رنگ کے آدمی کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرے گا بلکہ کلرڈ (Coloured) کہہ کر توہین کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا اور اس معاملے میں انہوں نے جو اخلاقی ضوابط بنا رکھے ہیں یہود نے تو انہیں پردۂ اخفا میں بھی نہیں رکھا کیونکہ تورات میں واضح طور پر ان کا تذکرہ موجود ہے اور ان کے پروٹوکول میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی بات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ اگرچہ دنیا میں مساوات کے مبلغ ہیں اور انسانی حقوق کے اپنے آپ کو چمپیئن سمجھتے ہیں اور امریکہ نے سب سے بڑھ کر ان باتوں کے دعوےدار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، وہ عام زندگی میں احساس نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جب کبھی بین الاقوامی معاملات میں الجھنیں پڑتی ہیں تو پھر ان کے پیمانے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ قومی مفادات میں وقت کے ساتھ ساتھ سچ اور جھوٹ صحیح اور غلط اور حق اور ناحق آپس میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور یہ سب چیزیں ان کے نیشنلزم کا تقاضا یا قومی تعصب کا نتیجہ ہیں۔

جہاں تک اس تلوار کی دوسری دھار کا تعلق ہے اس سے انہوں نے بالعموم مسلمانوں کی تخریب کے لیے کام لیا ہے۔ انہیں اچھی طرح اس بات کا شعور ہے کہ ان کا نیشنلزم ان کی بقا کا ضامن ہے۔ وہ جتنا اس پر زور دیں گے اتنی ان کی شیرازہ بندی پختہ ہوتی جائے گی۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس معنیٰ میں ایک نیشن نہیں کہ وہ ایک رنگ، ایک نسل یا ایک جغرافیے سے تعلق رکھتے ہیں، اسلام تو ایک نظریے زندگی کے ایک رویے یا چند حقائق اور صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ انہیں عقیدے کی قوت سے قبول کر لینا ایمان کہلاتا ہے۔ جو شخص بھی ایمان لا کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے وہ مومن اور مسلم کہلاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ وہ کس نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی جنم بھومی کہاں ہے؟ خونی رشتے میں شریک لوگ ایک علاقے سے تعلق رکھنے والے اور ایک جگہ پیدا ہونے والے آپس میں بیگانہ ہو جاتے ہیں، اگر ان کے درمیان ایمان کا رشتہ نہ ہو اور اگر وہ اسلام کی بنیادی صداقتوں کو قبول کر کے اسلام کے دائرے میں آ جائیں تو مسلمانوں کے بھائی بن جاتے ہیں۔ چاہے رنگ، نسل اور جغرافیے کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی بیگانہ کیوں نہ ہوں

Marfat.com

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
ابوجہل ز مکہ این چہ بوالعجبی است

حسنؓ بصرہ سے آئے اور اصحابِ ایمان کے مقتداء بن گئے۔ بلالؓ حبش سے بکتے بکاتے آئے لیکن اسلام سے وابستگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی نے انہیں یہ اعزاز بخشا کہ فتح مکہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کریں اور لوگوں کو یہ دکھا دیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اسلام سے وابستگی وہ دولت ہے جس کی وجہ سے ایک کالا کلوٹا آدمی اللہ کے گھر کی چھت پر کھڑا ہو کر اللہ کی کبریائی اور انسانی مساوات کا اعلان کر سکتا ہے۔ صہیبؓ روم سے غلام بنا کر لائے گئے اور مکہ کے بازاروں میں بیچے گئے۔ لیکن تاریخ کا وہ لمحہ آج تک دم بخود ہے جب اس نے یہ منظر دیکھا کہ اسلام کے بطلِ جلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جسد خاکی نمازِ جنازہ کے لیے سامنے رکھا گیا ہے اور تمام جلیل القدر صحابہؓ اس انتظار میں ہیں کہ اس عظیم انسان کی نماز کون پڑھائے گا؟ لیکن یہ دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے کہ امامت کے لیے آگے بڑھنے والا وہ صہیبؓ تھا جو کل مکہ کے بازاروں میں بیچا گیا تھا اور آج اسلام سے وابستگی نے اسے ان لوگوں کا امام بنا دیا ہے جن سے بڑھ کر دنیا اور آخرت میں معزز کوئی نہ تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں ابوجہل جو قریشِ مکہ کے اشراف میں سے تھا اور اسی طرح کے دوسرے لوگ جنہیں اپنے قومی افتخار پر ہمیشہ ناز رہا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ ابوجہل اور اس جیسے دوسرے عمائدینِ قریش گدھوں کی طرح کھینچ کر ایک بند کنویں میں پھینکے گئے۔ جس سے دنیا کے سامنے یہ بات مبرہن ہو گئی کہ عظمتیں، رفعتیں، عزتیں اور سربلندیاں، رنگ، نسل یا جغرافیے سے وابستگی میں نہیں بلکہ اسلام سے وابستگی میں ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی جو اس کے دامن میں آ جائے گا۔ وہ ان تمام عزتوں کا مالک ہو جائے گا اور جو اس سے کٹ جائے گا وہ چاہے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نسب اور ہم وطن کیوں نہ ہو اس کا ٹھکانہ آخرت میں جہنم ہو گا اور دنیا میں وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اسلامی قومیت کا حصہ نہیں بن سکتا۔

دنیائے کفر نے اس راز کو اچھی طرح سمجھا اور مسلمانوں کی قوت کے اس سرچشمہ کو غارت کرنے کے لیے نیشنلزم کی دوسری دھار کو استعمال کیا۔ ان میں قومیتوں کے فتنے اٹھائے، زبانیں جو مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ہوتی ہیں انہیں مستقل وحدت بنا کر اسلامی وحدت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ مسلمان ملکوں میں صوبائیت کو علیحدگی کا پیش خیمہ بنا دیا۔ قبائلی زندگی میں ہر قبیلہ کو وحدت کی ایسی عظمت بخشی کہ باقی ساری وحدتیں اس پر قربان ہو گئیں اور ان میں سے ہر ایک چیز کو الگ الگ نیشن (Nation) کی بنیاد بنایا گیا۔ ہسپانیہ کی عظیم مسلمان حکومت اسی فتنے کی نذر ہوئی۔ سقوطِ بغداد اور سقوطِ ڈھاکہ اسی عفریت کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ خلافتِ عثمانیہ عرب نیشنلزم سے تباہ کی گئی اور آج پاکستان ایک دفعہ پھر اسی نیشنلزم کے پیدا کردہ حوادث کا سامنا کر رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں قوم پرستی یا نیشنلزم کے اسی تباہ کن نظریے کا ذکر فرما کر بروقت اس کا ابطال کیا گیا اور پھر یہ بھی آگاہی دی گئی کہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کو اسی فتنہ سے واسطہ پڑے گا۔ اہلِ کتاب اسی کی بنیاد پر اپنا تحفظ کریں گے اور مسلمانوں کو اسی دو دھاری تلوار سے تباہ کیا جائے گا۔ لیکن افسوس قرآنِ کریم کی اس قدر واضح وارننگ کے باوجود امتِ مسلمہ آج پھر انہی حوادث کا شکار ہے۔ وہ ایک طرف اہلِ کتاب کی حقیقت کو نہ پہچان کر بے بصیرتی کا ثبوت دے رہی ہے اور دوسری

Marfat.com

طرف اپنی قوت کے اصل سرچشمہ اور اپنی قوم کی شیرازہ بندی کے اصل اسباب کو نظر انداز کر کے تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ہم زہر کو آبِ حیات سمجھنے لگے ہیں۔ اقبال نے شاید ایسے ہی تاثرات کے تحت کہا تھا۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اخوت کی زباں ہو جا محبت کا بیاں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ ایرانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ تم اپنی سیادت و پیشوائی کو بچانے کے لیے قومی عصبیت کی جو دیواریں کھڑی کر رہے ہو اور اس کے نتیجے میں تم یہ سمجھتے ہو کہ عزت و فضیلت ہمیشہ تمہارے گھر میں رہے گی۔ یہ تمہاری نادانی ہے کیونکہ فضیلت سراسر نبوت کا نتیجہ ہے۔ اگر بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ نہ چلتا اور کسی اور خاندان کو اس سے سرافراز کر دیا جاتا تو تم آج تک تاریخ کے غبار میں بے نشان ہو چکے ہوتے۔ نبوت کسی خاندان یا قوم کی خصوصیت نہیں وہ تو خالصتاً اللہ کی دین ہے۔ تمہاری کوششیں اور تمہاری سازشیں اسے اپنے گھر میں بند نہیں رکھ سکتیں۔ کل اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بنی اسرائیل کو منتخب کیا تھا تو آج وہ اس کے لیے بنی اسماعیل کو منتخب کر چکا ہے اور وہ اپنے فیصلوں میں بااختیار ہے، کوئی بھی اس میں دخیل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ہماری یہ ساری کاوشیں اللہ کے فیصلے کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتیں اور ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھو کہ اس کے فضل و رحمت کے پیمانے تم جیسے نہیں۔ وہ نہ تو اتنے تنگ ہیں کہ جو ایک خاندان میں سمٹ کے رہ جائیں اور نہ ان پیمانوں کا مالک اتنا بے خبر ہے کہ وہ نبوت کی عزت و فضیلت ایسے لوگوں کو دے دے جو اپنی نااہلیت ثابت کر چکے ہوں۔ وہ جس طرح بے انتہا فضل و کمال کا مالک ہے اسی طرح وہ علیم بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس چیز کا استحقاق رکھتا ہے اور کون صرف تعصبات کے سائے میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔

بنی اسرائیل کو اگر اس اعزاز سے محروم کیا جا رہا ہے تو یہ بھی سراسر اللہ کے علم و آگہی کا فیصلہ ہے اور اگر بنی اسماعیل کو اس سے نوازا جا رہا ہے تو وہ جہاں ایک اعزاز و اکرام ہے وہیں ایک آزمائش بھی ہے اور آزمائش بھی اتنی وسیع ہے جس کا دائرہ پوری نوعِ انسانی تک پھیلا ہوا ہے اس لیے بنی اسرائیل کو اگر اپنی بقا عزیز ہے تو اسے اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرنی چاہیے اور اپنے فخر و نخوت کے سارے سرمائے کو نبی آخر الزماں کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہیے اور بنی اسماعیل اگر چاہتے ہیں کہ وہ واقعی اس اعزاز و اکرام کے مستحق رہیں اور ان کا انجام کبھی بنی اسرائیل جیسا نہ ہو تو انہیں اس انعام پر اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے اور آگے بڑھ کر اس کا حق ادا کرنے کے لیے جان و تن کو کھپا دینا چاہیے۔

Marfat.com

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ
بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا
فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

(اور اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے ان کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو وہ تمہیں ادا کر دیں اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک تمہیں واپس نہ کریں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان اُمیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں) (۷۵)

اس آیتِ کریمہ میں ان کے اس کردار کی نقاب کشائی کی گئی ہے جسے ان کی قومی عصبیت اور نسلی تفاخر نے جنم دیا ہے۔ یوں تو اہلِ کتاب کا مجموعی کردار بری طرح زوال کا شکار تھا۔ ان کے عوام ہی نہیں مذہبی طبقہ بھی ہر طرح کی خیانت کا ارتکاب کر گزرتا تھا۔ سب سے بڑی جسارت اللہ کی کتاب میں خیانت کرنا ہے اور قرآنِ کریم نے بار بار شہادت دی ہے کہ اس معاملے میں ان کا نامۂ عمل بھیانک حد تک سیاہ ہو چکا تھا۔ جن کی جسارتیں یہاں تک پہنچ جائیں، ان کا عام معاملات میں شریعت کے پابند ہونے کا تصور بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود معاملات میں خیر کی قوت اور امانت کا تصور بالکل ختم ہونے میں نہیں آیا تھا۔ ان میں ایسے لوگ ابھی تک پائے جاتے تھے کہ ان کے پاس ڈھیروں مال بھی بطورِ امانت رکھ دیا جائے تو وہ طلب کرنے پر واپس کرنے میں تأمل نہیں کرتے تھے۔ لیکن بیشتر لوگ اس دیانت وامانت سے کوسوں دور تھے۔ لیکن ان کا سب سے تاریک اور قابلِ نفرت پہلو یہ تھا جو ان کے قومی تصورات کا لازمی نتیجہ تھا کہ جب ان کا معاملہ کسی غیر مذہب والے سے پڑتا یا خصوصاً امیوں یعنی عربوں سے ان کا لین دین ہوتا یا کاروبار کی کوئی صورت ہوتی تو اس میں خیانت کرنا بلکہ واجب رقم کو دبا لینا اور جہاں تک ہو سکے عربوں کو نقصان پہنچانا اسے وہ مذہبی طور پر جائز خیال کرتے تھے اور دعویٰ ان کا یہ تھا کہ ان اُمیوں کے بارے میں ہمارے مذہب اور ہماری شریعت نے ہر طرح کی خیانت اور بد معاملگی کی اجازت دے رکھی ہے۔ ان کا قرض دبا لو، ان کا مال ہڑپ کر جاؤ، ان کے ساتھ کیے ہوئے عہد سے پھر جاؤ، ہر چیز ہمارے لیے روا ہے کیونکہ یہ کافر لوگ ہیں انہیں ہر طرح نقصان پہنچانے کی ہمارا مذہب اجازت دیتا ہے۔ میں گزشتہ آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ برائی صرف یہود میں نہیں بلکہ عیسائیوں میں بھی موجود تھی اور ہے۔ یہود نے تو اسے کسی طرح چھپا کے نہیں رکھا۔ شروع میں تو ان کے دنیا دار فقہاء اور مشائخ نے ان خیانتوں کا راستہ اپنے فتاویٰ سے کھولا، لیکن پھر رفتہ رفتہ کتاب اللہ میں تحریف کی صورت میں یہی فتاویٰ تورات کا حصہ بن گئے اور آج کی ریاستِ اسرائیل جب مسلمانوں سے کوئی معاملہ کرتی ہے یا ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی عہد کرتی ہے تو وہ ہر طرح کی خیانت اور عہد شکنی کو مسلمانوں کے مقابلے میں جائز سمجھتی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ ہمارے مذہب نے ہمیں اس کی اجازت دے رکھی ہے اور تورات نے تو باقاعدہ انسانی حقوق و معاملات میں ایک تفریق پیدا کر رکھی ہے، جس میں بنی اسرائیل کے لیے احکام کچھ اور ہیں اور غیر بنی اسرائیل جنہیں تورات میں اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کے لیے احکام کچھ اور ہیں۔ جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے، وہ اگرچہ کھل کر اس بارے میں کچھ نہیں کہتے لیکن عملی زندگی میں

Marfat.com

ان کا معاملہ مسلم اور غیر مسلم سے بالکل الگ الگ ہے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت سینکڑوں سال رہی، تو عیسائی ہسپانیہ پر مسلمانوں کا کوئی حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن فلسطین جہاں کبھی یہود مختلف حالتوں میں رہ چکے ہیں اس پر نہ صرف ان کا حق تسلیم کیا جارہا ہے بلکہ جو اس ملک کے اصل باسی ہیں ان کو زبردستی نکالا جارہا ہے بلکہ نکالا جاچکا ہے اور وہاں اسرائیل کی ایک ایسی ریاست قائم کی جاچکی ہے جو عرب کے قلب میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتی ہے۔ انڈونیشیا کا ایک جزیرہ ''بلطائف الحیل'' عیسائیوں کے حوالے کیا جاتا ہے اور کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی تسلیم شدہ قراردادیں بھی فرسودہ قرار دے دی گئی ہیں۔ پاکستان جسے اپنا دوست ملک کہا جاتا ہے اس سے F-16 کی ادائیگی کے لیے اربوں روپے وصول کرلیا جاتا ہے اور پھر محض اس لیے طیارے دینے سے انکار کردیا جاتا ہے کہ انہیں جیسے ایک کافر ملک کو اس پر اعتراض ہے اور پیسے بھی ہڑپ کرلیے جاتے ہیں اور دنیا کا کوئی اخلاق انہیں نہ ملامت کرتا ہے اور نہ وہ اس کی شرم محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ کتاب کا یہ وہ رویہ ہے جس کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے اور جسے تاریخ کے ہر دور نے سچا ثابت کیا ہے۔

آج کے اہلِ کتاب تو معلوم نہیں کیا کہتے ہیں، لیکن قرآنِ کریم کے نزول کے وقت ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اُمیوں یعنی عربوں سے جو ناروا سلوک کرتے ہیں اس کا حکم ہمیں اللہ نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت پر ان کا بہتان ہے، اس کی اجازت کبھی انہیں اللہ کی کتاب نے نہیں دی اور نہ کبھی کوئی ایسی نامعقول بات اللہ نے کسی کتاب میں نازل فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (یہ لوگ خوب جانتے ہیں) کہ اللہ نے ان خیانتوں کا کبھی حکم نہیں دیا۔ البتہ! وہ اللہ کا نام لے کر اپنی خواہشات کی پیروی اور حرصِ دنیا کا جواز پیدا کررہے ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○

(ہاں! کیوں نہیں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بیشک اللہ اپنے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) (۷۶)

یہ آیت یہود کی مذکورہ بالا باتوں پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ یہود کی یہ غلط فہمی کہ انہیں اللہ کے یہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام حاصل ہے، اس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ہر طرح کی بدمعاملگی اور بدعہدی کرنے کا حق رکھتے ہیں اور دوسری قوموں کے مقابلے میں انہیں ہر طرح کی چھٹی دی گئی ہے کہ جو چاہیں سو کریں اللہ تعالیٰ ان سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا، یہ بالکل ایک بے سروپا بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے یہاں مقام و مرتبہ جھوٹے دعووں سے نہیں ملتا بلکہ اس نے ہر امت کو ایک شریعت دے کر اس کی پابندی کا عہد لے رکھا ہے۔ جو بھی اس عہد کی پاسداری کرتا ہوا اس کے احکام کی پیروی کرے گا اور ہر کام کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے جوابدہی سے ڈرے گا اور اللہ کی ناراضگی سے لرزاں و ترساں رہے گا حقیقت میں وہ شخص اس قابل ہے کہ اسے اللہ کے یہاں کوئی مقام و مرتبہ ملے کیونکہ شریعت کی پابندی اور اللہ سے ڈر کر پاکیزہ زندگی گزارنا تقویٰ ہے اور ایسے ہی لوگ متقی کہلاتے ہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہمیشہ متقین سے محبت کرتا ہے، جھوٹے دعویداروں سے نہیں۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

(بیشک جولوگ بیچتے ہیں اللہ کے عہد کواور اپنی قسموں کوایک حقیر قیمت کے عوض یہ وہ بدنصیب ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے) (۷۷)

اشتراء کا مفہوم

اشتراء یا شراء اور بیع، خریدنے اور بیچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے معنی میں بھی مستعمل ہیں۔ یعنی اشتراء کا معنی خریدنا بھی ہے اور بیچنا بھی اور بیع کا معنی بیچنا بھی ہے اور خریدنا بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیع وشراء کی اصل حقیقت مبادلۃ المال بالمال ہے۔ مال کو مال سے بدلنا یعنی بیچنے والا ایک مال دیتا ہے اور دوسرا مال لیتا ہے۔ اسی طرح خریدنے والا بھی ایک مال لیتا ہے اور دوسرا مال دیتا ہے اور قدیم زمانے میں تو بیع شراء ہوتی ہی دو جنسوں یا دو مالوں کے درمیان تھی۔ پھر اسی مفہوم نے مرورِ ایام سے ترقی کی اور یہ دونوں لفظ ترجیح دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔

ثَمَنًا قَلِیْلًا کا مفہوم

اسی طرح یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ یہاں ثَمَنًا قَلِیْلًا کا لفظ ''تھوڑی قیمت، حقیر قیمت'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ کسی چیز کا تھوڑا یا زیادہ ہونا اس کا حقیقی معنی نہیں بلکہ اضافی معنی ہے۔ ایک ہی چیز کسی ایک چیز کے مقابلے میں بڑی سمجھی جاتی ہے اور کسی دوسری کے مقابلے میں اسے تھوڑا یعنی حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ایک شخص ایک لاکھ روپیہ لے کر سبزی منڈی چلا جائے تو اسے ایک بہت بڑی رقم سمجھا جائے گا، لیکن اگر وہ سونے کے بازار میں چلا جائے تو ایک لاکھ کو حقیر قیمت ہی کہا جا سکتا ہے اور اگر وہاں سونے کے زیورات کے ساتھ ساتھ ہیرے بھی ملتے ہوں تو پھر تو اس ایک لاکھ کو نا قابلِ ذکر ہی کہنا چاہیے۔ تو قرآنِ کریم نے جہاں بھی آخرت یا دین کے بدلے میں دنیا یا دولتِ دنیا کا ذکر کیا ہے تو اس کی حقیقت چونکہ ان کے مقابلے میں کچھ نہیں اس لیے اسے ثمنِ قلیل کہا گیا ہے یعنی حقیر قیمت۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم بعض دفعہ دنیا کو دنیائے دوں یا دنیائے دنی کہتے ہیں۔

قوموں کے اخلاقی زوال کا اصل سبب

الفاظ کی حقیقت سمجھنے کے بعد اب سلسلۂ بیان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ اہلِ کتاب پر تنقید جاری ہے۔ ان کے عقیدے کی خرابیوں سے لے کر ان کی بداعمالیوں تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے ایمان وعمل کی کمزوریاں اور خرابیاں ایسی چند در چند اور تہ در تہ ہیں کہ ان کا بہ ہمہ وجوہ ذکر اور ان کا استقصا اگر نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لیے پروردگار نے بداعمالیوں کے سلسلے میں ان کی ایک ایسی

Marfat.com

کمزوری کا ذکر فرمایا ہے جسے ام الامراض کہا جانا چاہئے اور یہ ایسی بیماری ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن اس کے ذکر میں ایسی گہرائی، نزاکت اور حکمت سے کام لیا گیا ہے کہ جس پر جتنا غور کیا جائے اتنی ہی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اصل خرابی عام نگاہ میں حبِّ دنیا ہے۔ دنیا کی محبت بالخصوص یہود کی ایک ایسی علامت ہے جو آج تک ان سے الگ نہیں ہو سکی۔ عیسائی بھی حبِّ دنیا اور مادیت میں غلو کے اعتبار سے یہود سے پیچھے نہیں۔ لیکن ان کا طرزِ عمل ایک اور حیرت پیدا کر دینے کا باعث بنتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کی اجتماعی اور قومی زندگی تو حبِّ دنیا کی پوری تصویر ہے، لیکن جب وہ اللہ کے تقرب اور اس سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے وسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو دنیا کو اللہ اور بندے کے درمیان ایک مانع اور حائل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور حبِّ دنیا بجائے خود ان کے نزدیک ایک ایسی برائی ہے جس کا ارتکاب کرنے والا اللہ کے راستے پر چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس لیے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کرے اور اس بات میں وہ تنہا نہیں، ہندوؤں میں جوگی ازم اور بدھ مت میں بھکشو ازم اسی کا عکس ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو مادیت ان کا مطمعِ نگاہ ہے اور وسائلِ دولت پر قبضہ ان کی قومی زندگی کا سب سے بڑا ہدف رہا ہے اور آج بھی امریکہ اسی ہدف کے حصول میں ملکوں پر قبضہ کرنے کی پالیسی پر چل پڑا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب وہ مذہب کی بات کرتے ہیں تو رہبانیت کو اس کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں تصورات میں ایسا کھلا تضاد ہے جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے وہ فطرت کے مطابق زندگی گزارنے کے احکام دیتا ہے، فطرت سے لڑنا یا فطرت پر غالب آنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ جس طرح مادیت میں غلو اور حبِّ دنیا میں استغراق انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے اسی طرح وہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کو بھی خلافِ فطرت اور انسانی زندگی کی ہمہ ہمی کا دشمن سمجھتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے صاف فرمایا کہ اہلِ کتاب نے رہبانیت کا تصور خود اختراع کیا ہے اور اسے دین کی شکل دے دی ہے اللہ نے ہرگز اس کا حکم نہیں دیا ہے۔ ذرا غور فرمائیے! اگر دنیا میں رہبانیت کا تصور قبولِ عام حاصل کر لے تو آج کی دنیا اپنے جس علم و ہنر پر ناز کرتی ہے اور جس طرح اس کی ایجادات نے اہلِ دنیا کو مالا مال کر رکھا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ انسانی ترقی کی ہر چیز ختم ہو کر انسان غاروں کے زمانے میں پہنچ جائے گا۔ ہاں! البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر امریکہ اور مغربی طاقتیں جزوی طور پر بھی رہبانیت اختیار کر لیں تو باقی نوعِ انسانی کو ان کے ظلم سے نجات مل سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسلام نے دینِ فطرت ہونے کی وجہ سے نہ تو رہبانیت کی اجازت دی نہ اس نے حبِّ دنیا میں غلو اختیار کرنے کی اجازت دی۔ اس نے مال و دولت کو خیر قرار دیا، اسے جائز طریقے سے کمانے اور جائز مصرف میں خرچ کرنے اور حقوق کی ادائیگی کا ذریعہ بنانے کو نہ صرف جائز بلکہ فریضہ قرار دیا۔ لیکن اس بات کی سخت تاکید فرمائی کہ جس طرح اس سے لاتعلقی فطرت سے جنگ ہے اسی طرح ایک حد سے بڑھا ہوا اس سے تعلق انسانیت کے لیے مہلک ہے، یہ تمہاری ضرورت ہے، اس لیے اس کو ضرورت کے درجے میں رہنا چاہئے۔ یہ تمہارا مقصد ہرگز نہیں، اس لیے اسے زندگی کا حاصل قرار نہیں دینا چاہئے اور جب اس بات کو سمجھ لیا جائے کہ مقصد حاصلِ زندگی ہوتا ہے جس پر سب کچھ نچھاور کیا جا سکتا ہے اور ضرورت بقدرِ ضرورت اور بوقتِ ضرورت حاصل کی جاتی ہے اور اسے ہمیشہ مقصد کے تابع رکھا جاتا ہے تو پھر اصل بحث یہ رہ جاتی ہے کہ دنیا اور دولتِ دنیا سے تعلق کی شکل کیا ہو گی؟ اسے قرآنِ کریم نے واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ تم دولت کماؤ، اس سے فائدہ اٹھاؤ، لیکن یہ مت بھولو کہ وہ تمہاری ضرورت ہے اور دین تمہارا مقصد ہے۔ اس لیے اسے مقصد پہ غالب نہیں آنا چاہئے۔ جب بھی دونوں میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کا وقت آئے تو ترجیح مقصد کو ہونی چاہئے اور اگر غائر نظر سے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو

Marfat.com

ہے کہ جب بھی قوموں میں زوال آیا ہے اور ان میں اخلاقی بحران پیدا ہوا ہے تو ان کے زوال کا آغاز ہمیشہ اسی سے ہوا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاعلیٰ میں پروردگار نے اس بنیادی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بیماری ایسی خطرناک ہے کہ ہم نے اس کی خطرناکی کے پیشِ نظر اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ تم انسانوں کی اصل کمزوری یہ ہے کہ تم ہمیشہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز کو ترجیح دیتا ہے اسے باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی سے محبت کرتا ہے، اسی کے لیے دنیا کا ہر دکھ اٹھاتا ہے تو جب انسان دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے تو آخرت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگتی ہے اور دنیا اس کی نگاہوں میں بس جاتی ہے۔ آخرت کا ذکر محض برائے وزنِ بیت ہوتا ہے اور دنیا اوڑھنا بچھونا بنی رہتی ہے۔ تعلیم کا حاصل دنیا کا حصول اور دنیا میں ترقی ٹھہرتا ہے۔ ملک کے وسائل کا زیادہ حصہ دین کے احیاء کے لیے نہیں، بلکہ وسائل دنیا میں اضافے اور ترقی کے لیے صرف ہوتا ہے۔ انسانوں کا ہدف آخرت نہیں دنیا ہو کر رہ جاتی ہے۔ عزت و سربلندی دنیا سے وابستہ ہو جاتی ہے اور آخرت سے وابستگی کتابوں میں قابلِ تعریف ہو تو ہو عملی زندگی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اخلاقی اقدار صرف وہ باقی رہتی ہیں جن کی پابندی سے مفادات پہ ضرب نہ پڑتی ہو ورنہ بالعموم ہر اخلاقی قدر مادی نفع نقصان کے حوالے سے تولی جاتی ہے۔ دنیا کو ترجیح دینے کے باعث زندگی کا ہدف دنیا اور دولتِ دنیا میں روز بروز ترقی بن جاتا ہے۔ اس کے لیے اخلاقی اقدار کو کیسا ہی پامال کرنا پڑے انسانی رشتے چاہے کیسے ہی کمزور ہو جائیں، انسانیت کی ضرورتیں بے شک جاں کنی کا شکار ہو جائیں، دنیا کو ترجیح دینے والا معاشرہ ان باتوں کی کبھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایک صاحبِ اقتدار کو اقتدار چاہیے، چاہے اس کا محل غریبوں کے گھروندوں پر کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ایک کاروباری آدمی کے کاروبار میں اضافہ ہونا چاہیے چاہے اس کے لیے امانت و دیانت اور ایمان کے ترازو کو توڑ کر بھی کیوں نہ پھینکنا پڑے جیسے جیسے دنیا سے تعلق بڑھتا جاتا ہے اور آخرت سے تعلق کمزور ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے غداروں کی فصل بارآور ہونے لگتی ہے۔ طالع آزما کھل کھیلنے لگتے ہیں، نتیجتاً ایسی قوم کا کوئی قلعہ محفوظ نہیں رہتا، ان کے عبادت خانے اولاً تو اجڑ جاتے ہیں اور اگر کہیں آباد بھی نظر آئیں تو وہ فریبِ نظر اور ضمیر کو سلا دینے کے سوا اور کسی کام نہیں آتے۔

جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو قدم قدم پر اس حقیقت کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں امتِ مسلمہ کی تباہی، اقتدار اور دنیا کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کے تخت پہ بیٹھنے والا خلیفۂ بغداد اگر ہیروں اور جواہر کا پرستار نہ ہوتا، اس کے اندر اسلامی غیرت ہوتی اور وہ اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس سے بہرہ ور ہوتا تو تاتاریوں کو خوارزم شاہ کی حکومت پر حملہ کرنے کا کبھی حوصلہ نہ ہوتا اور اگر خلیفۂ بغداد کا وزیرِ اعظم علقمی اور اس کے گماشتے دنیا کو ترجیح دے کر اپنا مقصد و ملجا نہ بنا چکے ہوتے تو سقوطِ بغداد کبھی عمل میں نہ آتا۔ برصغیر میں اگر میر جعفر، میر قاسم اور پورنیا جیسے غدار امتِ مسلمہ میں پیدا نہ ہوتے تو سراج الدولہ اور ٹیپو کے قلعوں کو کبھی کوئی مسمار نہ کر سکتا۔ یہ دنیا کے وہ پرستار تھے جنہوں نے دنیا کے چند ٹکوں کے بدلے اسلامی غیرت و حمیت اور روایت کو بیچ ڈالا اور اسلام کی رسوائی کا باعث بنے۔ آج بھی امتِ مسلمہ جس صورتِ حال سے دوچار ہے، اس میں بھی اقتدار کی ہوس، ڈالروں اور پونڈوں کی چمک اور بڑی طاقتوں کے قرب کی چاہت (جو دنیا کے مختلف چہرے ہیں)، امت کے بااختیار لوگوں کے دلوں میں ترجیح نہ پاتی اور آخرت ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتی اور وہ وہاں کی بازپرس سے بے نیاز نہ ہوتے تو ہمارے سامنے مسلمانوں کا خون کبھی ارزاں نہ ہوتا۔ ہم خود اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر مسلمانوں کے درد میں تڑپنے والے لوگوں کو غیر مسلموں کے کبھی حوالے نہ کرتے۔ یہ رونا آج کا رونا نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ کا رونا ہے۔ مسلمان نے جب بھی ٹھوکر کھائی ہے آخرت کے بدلے میں دنیا کو ترجیح دے کر کھائی ہے۔ آخرت کو ترجیح دینے والا شخص جب تک دنیا میں جیتا ہے تو غیرت و حمیت کی تصویر بن

Marfat.com

کر جیتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اسلام اور انسانیت کے مقاصد کی سربلندی کی شہادت کو نقشِ دوام دے جاتا ہے۔ اس کی زندگی انسانیت کی سربلندی کے لیے ہوتی ہے اور اس کی موت پیچھے رہ جانے والے باغیرت لوگوں کے لیے حوصلوں کا سامان ہوتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ نے اس بنیادی کمزوری کا ذکر فرما کر انسانیت کے گریبان کے چاک کھول دیئے ہیں کہ وہ لوگ اللہ کے عہد پر دنیا کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں، اللہ کے عہد سے مراد وہ رشتۂ محبت اور وہ عہد بندگی ہے جو ایک بندے کو اپنے معبود سے اور ایک مسلمان کو اپنے خدا سے ہے۔ اہلِ کتاب بھی اپنے دور کے بگڑے ہوئے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے اللہ سے کلمۂ شہادت پڑھ کر ہماری ہی طرح جو عہد کر رکھا تھا ان کے عام آدمی سے لے کر ان کے علماء تک نے اسے توڑ ڈالا۔ علماء نے دین کو دنیا کی کمائی کا ذریعہ بنایا، مشائخ نے اصلاح و تربیت کے نام سے اپنے مریدوں کی جیبیں خالی کیں اور عام آدمی دنیاداری کا بہانہ بنا کر دین کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گیا اور جب ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈالتے ہیں تو ہماری صورت بھی اس سے مختلف نظر نہیں آتی۔ مادیت پرستی نے ان کی زندگی میں اس طرح حاکمیت قائم کی ہے کہ دین چند رسم و رواج کے سوا اپنی حیثیت حاکمہ ہی نہیں بلکہ اپنا وجود بھی ختم کر بیٹھا ہے۔

متذکرہ بالا گفتگو عہد اللہ کے حوالے سے اس معنی کی بنیاد پر تھی کہ عہد اللہ سے مراد وہ عہد ہے جو ایک بندہ اپنے اللہ سے کلمۂ شہادت پڑھ کر کرتا ہے اور جس کے بعد اس کی زندگی کی ساری کاوشیں اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کی کامیابی کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن عہد اللہ کا ایک اور معنی بھی ہے، جس کا ذکر اگلے رکوع میں آ رہا ہے۔ اُس آیتِ کریمہ میں جو آگے آ رہی ہے بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا اور ان کے پیغمبروں کو اس کا پابند ٹھہرایا تھا کہ وہ اپنی اپنی امتوں کے سامنے یہ بات واضح کر دیں بلکہ ان سے عہد لے لیں کہ اگر تمہارے زمانے میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے اور ان کی نصرت کرو گے۔ پھر تاکیداً ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا تم اس عہد کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہو؟ اور اس کے نبھانے کا اقرار کرتے ہو تو سب نے اقرار کیا تھا اور اللہ کو اس پر گواہ ٹھہرایا تھا۔ اس اقرار کی وجہ سے اہلِ کتاب پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام قبول کریں اور اسلام کی سربلندی اور بالادستی کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔

اَیۡمَانِہِمۡ کا مفہوم

اس کے بعد فرمایا وَاَیۡمَانِہِمۡ (یہ لوگ اپنی قسموں کو بھی ثمنِ قلیل کے بدلے میں بیچ ڈالتے ہیں) یہاں ایمان یمین کی جمع "قسم" کے معنی میں ہے۔ اس سے مراد ہر وہ قسم ہے جو اجتماعی معاملات میں ایک دوسرے کا اعتبار پیدا کرنے کے کام آتی ہیں اور قومی اور بین الاقوامی معاہدوں میں وقار کا باعث ہوتی ہیں۔ قسموں میں بھی عموماً اللہ کے نام کا حوالہ آتا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر اٹھنی والی قوم میں جب مذہبی طور پر زوال کا شکار ہوتی ہیں تو مذہب سے رشتہ جیسے جیسے ٹوٹتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کے نام کی عظمت اٹھتی جاتی ہے۔ چنانچہ انہیں کوئی معاہدہ اور کوئی قسم توڑتے ہوئے اس لیے شرم نہیں آتی کہ ہم اس پر اللہ کا نام لے چکے ہیں اور نہ انہیں اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ اس سے افراد اور قوم کے وقار کو دھچکا لگتا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ قسم آدمی اس وقت توڑتا ہے جب وہ وعدہ خلافی کرتا ہے اور وعدہ خلافی اس وقت ہوتی ہے جب سچ کی بجائے کاروبارِ زندگی کے لیے جھوٹ اچھا لگنے لگتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جسے افراد اور قوموں کے لیے اخلاق دیوالیے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا کبھی ایک مسلمان جھوٹا ہو سکتا ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی علامتوں میں شمار فرمایا۔ آپ ؐ کا ارشاد ہے:

Marfat.com

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا ائْتُمِنَ خَانَ

(منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان خیال کرے۔ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو ایفاء نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے)

عہد اللہ سے کیا مراد ہے؟

آیتِ کریمہ میں جن دو جرائم کا ذکر فرمایا گیا ہے دونوں کا تعلق عہد و پیمان اور وعدے سے ہے۔ عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو بندہ اپنے رب کے ساتھ اس کی بندگی اور فرمانبرداری کے متعلق کرتا ہے اور دوسرا وہ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ دونوں کی خلاف ورزی پر آگے وعیدات فرمائی جارہی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، انہیں آخرت میں ہر طرح کی نعمتوں سے محروم کردیا جائے گا۔ دنیا میں رہتے ہوئے اگر کسی شخص کو دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کردیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی زندگی کس قدر اذیت کی تصویر ہوگی۔ اسی طرح وہ شخص جسے آخرت کی نعمتوں سے محروم کردیا جائے جب کہ آخرت کی نعمتیں ہی اصل نعمتیں ہیں تو ایسے شخص کے بارے میں تو اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس کرب اور اذیت میں مبتلا ہوگا اور دوسری بات فرمائی کہ اللہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا کیونکہ یہ اس جلیل القدر پیغمبر کی امت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ ہمکلامی سے نوازا ہے۔ تمام رسولانِ گرامی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام واحد پیغمبر ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ ہمکلامی کی عزت بخشی اور اس طرح سے یہ اعزاز آپ کی امت تک پہنچا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوہِ طور پر جو ستر بڑے بڑے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے تھے انہیں بھی اللہ کی آواز سنائی گئی۔ اتنے بڑے مقام پر فائز کیے جانے کے باوجود اس قوم نے جس پر قدم قدم پر عنایات کی بارش ہوتی رہی اور جنہیں فرعونیوں کی ذلت آمیز حکمرانی سے نجات دی، انہوں نے آخر اس کا کیا صلہ دیا؟ اور بجائے دین کی قدر و قیمت پر جان دینے کے وہ دنیا کو دین پر ترجیح دینے لگے۔ اب وہ اسی قابل رہ گئے تھے کہ اللہ نے ان سے بات کرنا پسند نہ فرمایا۔ تیسری بات فرمائی کہ اللہ قیامت کے دن انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں فرمائے گا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ سے کوئی شخص بھی اوجھل نہیں۔ لیکن یہاں دیکھنے سے مراد شفقت سے دیکھنا ہے۔ جب باپ اپنے بیٹے سے غضبناک ہو کر یہ کہتا ہے کہ نکل جاؤ میں تیری شکل نہیں دیکھنا چاہتا تو اس سے مراد دیکھنا نہیں ہوتا بلکہ یہ مراد ہوتا ہے تم آج سے میری شفقت سے محروم ہوگئے ہو۔ ان سے بات کرنے سے انکار اور دیکھنے سے انکار درحقیقت ان کی انتہائی محرومی کی طرف اشارہ ہے کہ پروردگارِ عالم جس پر ہمیشہ رحمت غالب رہتی ہے اس دن یہ بدنصیب لوگ اس کی ہر طرح کی رحمت سے مایوس کردیئے جائیں گے۔

مزید فرمایا کہ اللہ ان کو پاک بھی نہیں فرمائے گا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے رسول اس لیے بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں۔ لیکن قیامت کے دن یہ لوگ خود پروردگار کے سامنے موجود ہوں گے، لیکن وہ ان کا تزکیہ نہیں فرمائے گا کیونکہ تزکیہ کا محل دنیا ہے، آخرت نہیں۔ آخرت تو جزا اور سزا کا دن ہے۔ یہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہلِ کتاب کا دعویٰ یہ تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح پاک فرما کر جنت میں داخل کردے گا اس لیے ہمیں دنیا میں اپنے تزکیے کی کوئی فکر نہیں اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ کا

Marfat.com

یہ قانون ہے کہ جن لوگوں کا خاتمہ کفر پر ہوا اور انہوں نے پوری زندگی ایک کافر کی طرح گزاری ہو، اللہ تعالیٰ انہیں براہِ راست ہمیشہ کے لیے جہنم کی نذر کر دے گا۔ البتہ! جن لوگوں نے اللہ کو کسی نہ کسی حد تک یاد رکھا اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا وہ کیسی بھی بداعمالیاں ساتھ لے کر جائیں اللہ تعالیٰ ایک مدت تک انہیں جہنم میں رکھ کر انہیں بداعمالیوں سے پاک فرمائے گا اور جب وہ اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں سے پاک ہو جائیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرما دے گا۔ لیکن اہلِ کتاب اپنے کفر کے باعث اس قابل نہیں ہوں گے کہ انہیں پاک کیا جا سکے۔ پاک تو آدمی کو بداعمالیوں کی سزا سے کیا جائے گا لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہوا ہو۔ لیکن یہ کفر پر مرنے والے لوگ اس رعایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ○

(اور بے شک ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تاکہ تم اسے گمان کرو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر) (۷۸)

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کی ان تدبیروں میں سے جو وہ عہدِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتے تھے اور یا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کے بارہ میں جو علامتیں اللہ نے ان کی کتاب میں بیان فرمائی ہیں انہیں تحریف کرنے یا ان کا معنی بدلنے کے لیے جو خیانتیں کرتے تھے اس کی مثال بیان فرمائی گئی ہے۔

یَلۡوٗنَ کا مفہوم

یَـلۡـوٗنَ کا اصل لَـیٌّ ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "جھکانا، مائل کرنا اور لفظ کو پڑھتے ہوئے زبان کو توڑنا موڑنا اور اینٹھنا۔ یَـلۡـوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ کے معنی ہوں گے (وہ کتابِ الٰہی کے بعض الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اپنی زبان اس طرح توڑتے موڑتے ہیں کہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں) لَوٰی بِـرَاۡسِهٖ کا معنی ہے (اس نے اپنا سر جھکایا) یعنی اس کی اصلی اور فطری وضع میں تبدیلی کر دی۔ اس لیے اب اس کا استعمال کسی کلام کے الفاظ یا اعراب میں ایسا ردوبدل کر دینے سے ہوتا ہے، جس سے اس کلام کا اصلی مفہوم بدل جائے یا اس کی ایسی من گھڑت تشریح کرنا جس کا اس کلام سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ عربی محاورہ میں جھوٹ بولنے اور من گھڑت بات بنانے کو لَوٰی لِسَانَهٗ بِكَذَا کہتے ہیں۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ علمائے یہود کا یہ شیوہ تھا کہ تورات کی جن آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک ہوتا یا تو ایسے لب ولہجہ سے انہیں پڑھتے کہ مطلب بگڑ جاتا یا اعراب میں ردوبدل کر دیتے۔ اس آیت میں ان کی یہی مذموم حرکت بیان کی گئی ہے۔ اس فعلِ شنیع کا ارتکاب جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شعائر اللہ کے بارہ میں بھی کیا گیا ہے۔ وہ کتابِ الٰہی سے ایسی ہر بات کو نکال باہر کرنا چاہتے تھے یا اس کا مفہوم بدل دینا چاہتے تھے جس سے قرآن کے

Marfat.com

مندرجات کی تصدیق ہوتی ہو اور قرآنِ کریم نے بیت اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے تعلق کے حوالے سے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، یہ کمی بیشی سے انہیں بدل دینے کی کوشش کرتے تھے اور پیش نظر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا کوئی تعلق بیت اللہ سے ثابت نہ ہونے پائے اور دوسری یہ بات کہ ذبیح اللہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کی بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم صرف ایک مثال دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آج بھی حجاجِ کرام دو پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتے ہیں، جن کا نام صفا و مروہ ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مروہ کے دامن میں بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مروہ وہ پہاڑی ہے جو بیت اللہ سے ملحق ہے تو پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہود نے مروہ کے تلفظ میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مروہ کو بگاڑ کر کبھی مریا پڑھا کبھی موریاہ اور کبھی موراہ اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ یہ جس پہاڑی کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت اللہ کے قریب مشہور پہاڑی نہیں بلکہ یہ وہ پہاڑی ہے جو فلسطین میں پائی جاتی ہے اور یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربان کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح کی حرکت انہوں نے لفظ بکہ کی قرأت میں بھی کی ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس مذموم حرکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ذرا ان کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے کہ اس قسم کی تحریفات کو یہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ اسے ہم نے نہیں گھڑا بلکہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایسے ہی نازل کیا ہے۔ اللہ نے اس کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ کتابِ الٰہی میں ایسی کوئی بات نہیں، یہ سراسر جھوٹ ہے جو یہ اللہ پر باندھ رہے ہیں اور یہ جانتے بھی ہیں کہ وہ ایک افترا کر رہے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصب نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ تم ربانی بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو ۝ اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلمان بن چکے ہو) (۷۹ تا ۸۰)

سورۂ آلِ عمران میں زیادہ تر روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہود کو بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ یہود کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور مزید یہ کہ سینٹ پال کی سازش نے ان کے اصل امتیازات گم کر دیئے اور پھر جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ ان میں سے بعض لوگوں کا مزاج ایمان کے بعد بھی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ان کے مزاج پر یہودیت کا اثر برابر کام دکھاتا رہا۔ اس لیے قرآنِ کریم کو تنقید کرتے ہوئے اپنے خطاب میں بار بار تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔

Marfat.com

عقلِ سلیم سے خطاب

اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ کتاب پر تنقید، منقولات کے حوالے سے تھی۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں خالصتاً عقل سلیم کو مخاطب کیا ہے اور عیسائیوں نے جو کچھ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط عقائد اختیار کر لیے تھے، قرآن انہیں بعض بنیادی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان غلط عقائد کی حقیقت کو سمجھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم ہزار سخن سازی سے کام لو، لیکن تم اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ باقی پیغمبروں کی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک انسان تھے اور پیغمبر چونکہ صرف انسانوں میں سے اٹھائے گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی انسانوں ہی کی اصلاح کے لیے نبوت عطا فرمائی تھی۔ تم اگرچہ ان دونوں باتوں کی تاویل کرتے ہو لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو اور پھر یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی بشر کو کتاب اور حکمت سے نوازے اور پھر اسے نبوت بھی عطا کر دے تو کیا عقل اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ وہ کتاب اور نبوت ملنے اور حکمت آشنا ہونے کے بعد کبھی لوگوں سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے اور غلام بن جاؤ۔ نبی تو دنیا میں لوگوں کو اللہ کے آستانے پر جھکانے کے لیے آتے ہیں۔ انہیں ان کی اصل حیثیت یاد دلانے کے لیے آتے ہیں اور اللہ کے بارے میں جو وہ غلط عقائد اختیار کر چکے ہوتے ہیں ان کی اصلاح کے لیے آتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی مقصد کے لیے تشریف لائے۔ ان کا پیدا ہونا، ان کا دوسرے انسانوں کی طرح غذا کا محتاج ہونا اور باقی تمام بشری احتیاجات سے آزاد نہ ہونا، کیا ان کے بشر ہونے کے لیے کافی نہیں؟ پھر اللہ کا انہیں کتاب اور نبوت دینا اور اس کا اعلان کرنا ان کے نبی ہونے کی دلیل نہیں؟ اگر یہ دونوں باتیں امرِ واقعہ ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بننے کی دعوت دیں؟ عقلِ سلیم بھی اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی شخص کو معلم بنا کر بھیجا جائے اور وہ لوگوں کو اپنی چاکری پر لگا دے۔ کسی کو سفیر بنا کر بھیجا جائے اور وہ اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دے اور پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں، خواہشات کبھی ان پر غلبہ نہیں پا سکتیں، احساسِ برتری کبھی ان سے چھو کر بھی نہیں گزرتا۔ وہ ہر قول و فعل میں اللہ کی نمائندگی کرتے ہیں تو ان کی طرف ایسی باتوں کا انتساب جو ان کی اصل حقیقت کو جلا کر رکھ دیں عقلی طور پر کس طرح ممکن ہے۔ اس سے تو نبوت سے متعلق مسلمات بھی خطرے کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ اس سے تو انبیاءِ کرام کی دعوت میں تضاد پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر نبی جو اپنی امت کی طرف کتاب لے کے آیا ہے، اس نے اس کی تعلیم بھی دی ہے اور اسی کی بنیاد پر لوگوں کی تربیت بھی فرمائی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی تو یقیناً آپ نے بھی اس کی تعلیم دی ہوگی۔ اسی کی بنیادی تربیت بھی فرمائی ہوگی۔ اس میں آج بھی دیکھ لیجئے کہ توحید پر زور دیا گیا ہے اور بار بار صرف ایک اللہ کی بندگی پر اصرار کیا گیا ہے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہونے کی وجہ سے چونکہ انجیل کی تعلیم کے پابند تھے اور تورات کی شریعت کے پیروکار تھے تو تورات اور انجیل دونوں تو اللہ کے ایک ہونے اور اسی کے بندہ ہونے کی دعوت دیتی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام انہی کتابوں کی تعلیم دیتے ہوئے اپنے بندہ ہونے کی لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دیں؟ اگر خدانخواستہ ایسا تصور کر لیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ وہ کتاب کی تعلیم دیتے ہوئے کچھ اور کہتے تھے اور اس سے ہٹ کر لوگوں کو کسی اور بات کا حکم دیتے تھے۔ یعنی جب انجیل پڑھاتے تو لوگوں کو اللہ کا بندہ بننے کی ترغیب دیتے، لیکن جب اس سے ہٹ کر موقع ملتا تو لوگوں کو اپنے بندہ ہونے کا حکم دیتے۔ یہ ایک ایسی گری ہوئی حرکت جس کی نسبت کسی عام شریف آدمی کی طرف بھی نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر کی طرف کی جائے۔

Marfat.com

آیتِ کریمہ میں مزید فرمایا گیا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو اپنا بندہ بنانے کی بجائے ربانی بناتے تھے اور یہی اصل حقیقت ہے اور باقی جو کچھ کہا جارہا ہے وہ سراسر خلافِ حقیقت بھی ہے اور خلافِ عقل بھی۔ اسی طرح وہ یہ دعوت بھی نہیں دے سکتے تھے کہ فرشتوں اور نبیوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا جائے کیونکہ جو اللہ کا نبی دنیا میں صرف اللہ کی ربوبیت کی تعلیم دینے اور اسی کا فیضان عام کرنے کے لیے آیا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو غیر اللہ کو رب بنانے کی ترغیب دے۔ اللہ ہی کو رب ماننا، ایمان کی بنیاد ہے اور غیر اللہ کو رب بنانا کھلا کفر ہے۔ ایک پیغمبر کی دعوت میں ایمان اور کفر تو جمع نہیں ہوسکتے ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبر ایمان کی بھی دعوت دیتا ہے اور کفر کی بھی۔ اس طرح کی بات وہی شخص سوچ سکتا ہے جس کے حواس اور عقل جواب دے چکے ہوں۔

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کو رب بنالیا تھا اور اس سے پہلے کسی جگہ ہم یہ حدیث بیان کرچکے ہیں کہ عدی بن حاتم طائی جب قبولیتِ ایمان کے لیے حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنے اطمینان کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کیے تھے۔ انہی میں سے ایک سوال یہ تھا کہ میں عیسائی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانتے تو قرآنِ کریم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ اہلِ کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو رب بنا رکھا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس کا حاصل یہ ہے کہ جس کو تحریم و تحلیل کا حق دیا جائے اور جسے جائز اور ناجائز کی اتھارٹی تسلیم کرلیا جائے وہی رب ہوتا ہے۔ تو تم یہ بتاؤ کہ تم اپنے علماء اور مشائخ کو یہ حق دے چکے ہو یا نہیں؟ تو عدی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے کہ ہاں ہم یہ حرکت تو کرتے ہیں تو آپ ؐ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے۔

رَبَّانِیُّ کی تحقیق

اس آیتِ کریمہ میں رَبَّـانِیُّ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ہے (خدا پرست اور اللہ والا) معلوم ہوتا ہے یہ لفظ عبرانی سے عربی میں آیا ہے۔ رَبِّیْ کا لفظ تورات و انجیل میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں کی صورت میں معمولی اختلاف ہے لیکن معنی میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ رَبَّانِیُّ اصل میں رَبِّیُّ ہے۔ لیکن بسا اوقات مبالغہ کے لیے الف نون کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ مثلاً جس کی بڑی گھنی داڑھی ہو، اسے ''لحیانی'' کہتے ہیں اور جس کی گردن بہت موٹی ہو، اسے ''رقبانی'' کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی شاید مبالغے کے لیے الف نون کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا معنی ہوگا (بالکل اللہ والا)۔ مبرد نے اس کا ایک دوسرا ماخذ بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ رَبَّانٌ کی جمع ہے جو رَبَّـہٗ یُرَبِّـہٗ فَھُوَ رَبَّانٌ سے اسمِ فاعل ہے اس کا معنی ہے (تربیتِ نفوس، اصلاحِ احوال اور تدبیرِ امور کرنے والا) اس صورت میں رَبَّـانِیُّوْنَ کا معنی ہوگا (نوعِ انسانی کی صحیح تربیت اور ان کی اصلاح کرنے والے) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر پر ابتدائی ایمان لانے والے جنہیں السابقون الاولون کہا جاتا ہے اور پھر درجہ بدرجہ وحی الٰہی نے ان کو اور خطابات سے بھی نوازا ہے۔ یہ وہ نمونے کے لوگ ہوتے ہیں جن کی سیرت و کردار میں لوگ پیغمبر کا عکس دیکھتے ہیں اور یہی لوگ پیغمبر کا دست و بازو ہوتے ہیں اور پیغمبر کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یہی دعوت کا اصل سرمایہ، دعوتِ اسلامی کی پہچان اور بعد کی نسلوں کے لیے حجت اور دلیل ہوتے ہیں۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام

Marfat.com

کی عزت وحرمت کی پاسداری کا حکم دیا اور صاف صاف فرمایا کہ دیکھنا میرے بعد صحابہ کی عزت پر طعن نہ کرنا، ان کی اصل پہچان میں ہوں۔ جوان سے محبت کرتا ہے وہ میری وجہ سے کرتا ہے اور جوان سے دشمنی رکھتا ہے وہ درحقیقت میرا دشمن ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پہچان بھی آپ کے بارہ حواری تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی بارہ نقیب مقرر فرمائے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اگرچہ یہ دونوں منصب اپنے بعض صحابہ کو تفویض فرمائے لیکن آپ کے کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ایک ایک صحابی راہِ ہدایت کا ستارہ ٹھہرا، جس سے ہدایت پانے والوں نے ہدایت پائی۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ
ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ
قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ
قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ
وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ
عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ
الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ
وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا

Marfat.com

يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ
لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ
تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَ
هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ
افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

رکوع: ۹۔ اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب اور حکمت سے دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر ایمان لانا اور ضرور اس کی نصرت کرنا۔ پھر فرمایا کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا تم گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے O کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ اسی کے فرمانبردار ہیں طوعاً و کرھاً جو آسمان و زمین میں ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے O آپ کہہ دیجئے! ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور اس چیز پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی ہے اور اس چیز پر جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں O اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہش مند ہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا O اللہ کس طرح ہدایت دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا حالانکہ ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس واضح نشانیاں بھی آ چکی ہیں اور اللہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا O ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی اور

Marfat.com

سارے لوگوں کی لعنت ہوتی ہے ○ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا نہ ان کو مہلت دی جائے گی ○ مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ○ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، یہی لوگ حقیقی گمراہ ہیں ○ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اگر وہ زمین بھر سونا فدیہ میں دے دیں تو ہرگز ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا) (۸۱ تا ۹۱)

وَاِذْ اَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

(اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب اور حکمت سے دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر ایمان لانا اور ضرور اس کی نصرت کرنا۔ پھر فرمایا کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا تم گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے) (۸۱ تا ۸۲)

سابقہ آیاتِ کریمہ میں اہلِ کتاب پر ہر پہلو سے تنقید کی گئی ہے۔ کتاب اللہ کے بارے میں ان کا رویہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ حقوق العباد کے حوالے سے ان کی خیانت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے دین کو جس طرح انہوں نے بازیچۂ اطفال بنایا ان میں سے بعض باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پھر انہوں نے جس طرح دین پر دنیا کو ترجیح دی حتیٰ کہ بندۂ درہم و دینار ہو کر رہ گئے اس پر بھی انہیں ملامت کی گئی ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں وہ جس طرح کتاب اللہ کے بارے میں گستاخانہ طرزِ عمل اختیار کرتے تھے اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے تھے اس کا بھی احتساب فرمایا گیا ہے۔ پھر آخری آیت میں نبوت کے بارے میں اہلِ کتاب جو تصورات رکھتے تھے ان کو بنیاد بنا کر اہلِ کتاب کے مزعومہ عقائد کے حوالے سے بعض عقلی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ اس طرح سے اہلِ کتاب کو دلائل کی دنیا میں ایسا بے بس کیا گیا ہے کہ جو شخص بھی عہدِ نبوت میں قرآنِ کریم کی تنقید اور اہلِ کتاب کا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کے عمل کو دیکھتا تھا اس سے یہ بات مخفی نہیں رہتی تھی کہ اہلِ کتاب دلیل کی دنیا میں بری طرح پسپا ہو چکے ہیں۔ اب اس رکوع کی پہلی آیت میں جو ہمارے پیش نظر ہے اہلِ کتاب کی تاریخِ نبوت و حکمت کے حوالے سے ایک ایسے عہد اور میثاق کا ذکر کیا جا رہا ہے جس سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اہلِ کتاب کو ہر دور کے پیغمبر اور بالخصوص نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی تائید و نصرت کرنے کا پابند ٹھہرایا گیا تھا۔ جس سے بتانا یہ مقصود معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انتہائی گری ہوئی قومیں بھی باہمی جو معاہدے کر لیتی ہیں تو انہیں ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اور اگر کوئی معاہدہ

Marfat.com

انبیاء کے واسطے سے پروردگار سے کیا گیا ہو تو اس کی اہمیت کو تو کسی طرح بھی نظر انداز کرنے کا گناہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان اہلِ کتاب کا عجیب حال ہے کہ وہ اپنے آپ کو انبیاءِ کرام کی اولاد اور وحیِ الٰہی کا تنہا مہبط و مورد سمجھتے ہیں اور انہیں بجا طور پر اللہ تعالیٰ سے اپنے خصوصی رشتے کا دعویٰ ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ مختلف وقتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا۔ لیکن جب اس کے ایفاء کا وقت آیا تو انہوں نے من حیث القوم نہ صرف اسے پورا کرنے سے انکار کیا بلکہ خم ٹھونک کر اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

اس آیتِ کریمہ کے پہلے جملے ہی میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ اہلِ علم نے اس کا ترجمہ دو طرح سے کیا ہے ایک تو یہ (کہ اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا تھا) اور دوسرا یہ کہ (اس وقت کو یاد کرو کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم سے نبیوں کے بارے میں عہد لیا تھا) پہلے ترجمے کی صورت میں اَلنَّبِیّٖنَ فاعل ہو گا اور میثاق اس کی طرف مضاف ہو گا اور دوسرے ترجمے کی صورت میں النبیین مفعول ہو گا اور میثاق مفعول کی طرف مضاف ہو گا۔ پہلے ترجمے کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءِ کرام سے یہ عہد لیا تھا کہ نبیِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری زندگی میں تشریف لے آئیں تو تمہیں ان پر ایمان لانا ہو گا اور ان کی مدد کرنا ہو گی اور یہی بات تمہیں اپنی اپنی قوم تک پہنچانی ہو گی۔ دوسرے ترجمے کی صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اے اہلِ کتاب! یہ عہد تمام تر تم سے لیے گئے تھے اور تمہیں اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ تمہارے زمانے میں جو نبی بھی تشریف لائیں تمہیں ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنی ہو گی اور اگر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو تمہیں بڑھ چڑھ کر ان کی تائید و نصرت سے کام لینا ہو گا۔ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ترجمے اور دونوں مفہوم صحیح ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے دوسرے نبیوں کی تائید و نصرت کا عہد لیا تھا اس کا ذکر سورۂ مائدہ میں کیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ ...... الخ

(اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مقرر کیے اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی عزت کی اور اللہ کو قرضِ حسن دیتے رہے تو میں تمہارے گناہ تم سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا اس نے سواء السبیل گم کر دی) (المائدہ : ۱۲)

اس آیت میں غور کیجیے اس میں واضح طور پر بنی اسرائیل سے عہد لینے کا ذکر ہے۔ اس عہد میں سب سے پہلے حقوق اللہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اسی سلسلے میں اپنے رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔ رُسُل رسول کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عہد و اقرار تمام رسولوں کے بارے میں ہے۔ بنی اسرائیل کو چونکہ حاملِ دعوت امت بنایا گیا ہے اور اللہ کے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ الحق کی ذمہ داری ان کے سر پر ڈالی گئی ہے۔ اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ جو رسول بھی دنیا میں تشریف لائیں یہ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کریں۔ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کریں اور ان کے ساتھ مل کر ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں

Marfat.com

جن سے انہیں گراں بار کیا گیا ہے۔اس لحاظ سے رسول کا آنا ان کے لیے کوئی ابتلاء یا آزمائش نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے تائید ونصرت ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ افراد اور قوموں میں زوال آتا ہے۔وہ ایمان کی کمزوری اور عمل کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔کتاب اللہ سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے اور نئی نئی بدعات ورسومات کو اپنا دین بنالیا جاتا ہے۔رسول کے آنے سے دین نکھر کر اپنی اصل شکل میں آجاتا ہے۔بدعات ورسومات ختم ہوجاتی ہیں اور امت کا شیرازہ ایک وحدت میں پرودیا جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے ترجمے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورہ اعراف میں کیا گیا ہے۔موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے اللہ سے اس کی رحمت کے لیے درخواست کی۔اس کے جواب میں پروردگار نے فرمایا:

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ O اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ......الخ

(پس میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے،زکوۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے،یعنی ان لوگوں پر جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے۔جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔جو انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے اور ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کی توقیر اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس پر اتاری گئی وہی فلاح پانے والے ہیں)

ان آیات میں غور فرمائیے!صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل یعنی اہلِ کتاب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا اور ان کی تائید ونصرت کرنے کا عہد لیا گیا تھا اور یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اہلِ کتاب سے جب یہ عہد لیا گیا تھا اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ عہد بنی اسرائیل سے براہِ راست تو نہیں لیا گیا تھا یقیناً ان کے پیغمبروں کے واسطے سے لیا گیا تھا تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس کی زمین پر رہنے والے اس کے فرمانبردار بندے بن کر زندگی گزاریں۔اس کی زمین پر اسی کی حکومت قائم کریں،اسی کے احکام کو نافذ کریں اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے زمین فتنہ اور فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے اور زمین پر بسنے والے آسودہ زندگی گزار سکتے ہیں۔چنانچہ اسی غرض کے لیے پروردگار نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی سے نوازا اور انہیں نبوت دے کر زمین پر اتارا۔پھر ہر دور میں جب بھی انسانوں کی رہنمائی کے لیے کسی نہ کسی مصلح یا نبی کی ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر بھیجتا رہا اور ہر پیغمبر کے واسطے سے لوگوں کو یہ بات سمجھائی جاتی رہی کہ تمہاری زندگی کا مقصدِ اولین اللہ کی زمین پر اور اللہ کے بندوں پر اللہ کے قانون کو نافذ کرنا اور اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر نبی اور اس کی امت آنے والے نبی کے لیے چشم براہ رہے،اس پر ایمان لایا جائے اور غلبہ دین کیلئے اس کی نصرت کی جائے تاکہ خلافتِ ارضی جو اللہ کے تمام بندوں کا ورثہ ہے اور جن کا کام زمین کو فتنہ وفساد سے محفوظ رکھنا اور اللہ کی دھرتی پر اللہ کے نظام کو غالب کرنا ہے،اس میں کہیں جھول نہ پیدا ہو۔لیکن افسوس یہ ہے کہ اہلِ کتاب نے اس میثاق کو بری طرح توڑا،ان کی اصلاح کے لیے جو مختلف اوقات میں اللہ کے نبی آتے رہے،

Marfat.com

انہوں نے حتیٰ الامکان نبیوں پر ایمان لانے سے گریز کیا اور پوری کوشش کی کہ وہ اپنے نیک ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکیں حالانکہ ہر نبی کی تائید ونصرت کا ان سے عہد لیا گیا تھا اور پھر اس عہد کا سب سے زوردار اور مؤثر حصہ وہ تھا جس کا تعلق آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ باوجودیکہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کے عہد میں بھی آپؐ پر ایمان لانا شامل تھا لیکن آپؐ پر ایمان لانے کی اہمیت کی وجہ سے آپؐ پر ایمان لانے کا الگ عہد لیا گیا اور آسمانی صحیفوں میں ہر دور میں آپؐ کی علامات کا تذکرہ فرمایا گیا۔ آپؐ کا نام، آپؐ کا خاندان، آپؐ کا وطن، آپؐ کا دارالہجرت، آپؐ کے کارنامے، آپؐ کے معجزات اور آپؐ کی کامیابیوں کا ہر کتابِ خداوندی میں مناسب حد تک ذکر فرمایا گیا ہے تاکہ اہلِ کتاب آپؐ کی پہچان میں غلطی نہ کریں اور انسانی اصلاح اور غلبۂ دین کی آخری کاوش اچھی طرح اپنی کامیابی وکامرانی تک پہنچے کیونکہ اس کی ناکامی انسانیت کی ناکامی ہوگی۔ آپؐ کے بعد چونکہ کوئی دوسرا آنے والا نبی نہیں اس لیے آپؐ کی ناکامی سے انسانی اصلاح کا یہ سلسلہ مستقل طور پر رک جائے گا۔ جو اللہ کی مشیت کے سراسر خلاف ہے۔ اہلِ کتاب سے فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں بھی اس عظیم مقصد کے لیے اٹھایا گیا تھا اور اسی مقصد کی سربلندی اور کامیابی کے لیے تم سے عہد وپیمان لیے گئے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں آنے والے آخری نبیؐ کے بارے میں مصدق کا لفظ بول کر اسی سلسلۂ اصلاح کی وحدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ آنے والا نبی جب آئے گا تو وہ ایسی تعلیم، ایسی تہذیب اور ایسا نسخۂ شفا لے کے نہیں آئے گا جو اس سے پہلے اللہ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں سے یکسر مختلف ہو بلکہ اس کی ذات اور اس پہ نازل ہونے والی کتاب دو طرح سے پہلے کے سلسلۂ اصلاح کی مصدق ہوں گی۔ ایک تو اس طرح سے کہ اہلِ کتاب کے پاس جو آسمانی کتابیں ہیں، وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کرے گا۔ وہ تسلیم کرے گا کہ توراۃ، زبور اور انجیل اللہ ہی کی طرف سے نازل ہونے والی کتابیں ہیں۔ جتنے آسمانی صحیفے اللہ کی طرف سے نازل ہوئے وہ سب سچے تھے اور جن جن رسولوں پر یہ صحیفے اور کتابیں اتاری گئیں وہ سب اللہ کے سچے رسول اور نبی تھے۔ کتابوں میں اگرچہ ترمیم وتحریف ہوئی، لیکن وہ منزل من اللہ ہونے کے اعتبار سے بالکل سچی کہلانے کی مستحق ہیں اور دوسرا مصدق ہونے کا معنی یہ ہے کہ توراۃ وانجیل اور بعض دیگر صحفِ آسمانی میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو تعارفی باتیں ارشاد فرمائی گئیں، جو علامات بیان کی گئیں اور آپ کی کامیابیوں کا جو کچھ تذکرہ ہوا یہ پیغمبر اس کے مصدق بن کر آئے یعنی ان کو دیکھو، ان کی سیرت وکردار کو دیکھو، ان کے طور اطوار کو دیکھو، ان کے مخلص اور جاں نثار صحابہ کو دیکھو، ان پر نازل ہونے والی کتاب کو دیکھو، ان کی ہجرت اور دارالہجرت کو دیکھو، ان میں سے ایک ایک بات خود گواہی دے رہی ہے کہ میں وہی ہوں جس کا تمہاری کتابوں میں ذکر کیا گیا تھا۔ صحفِ آسمانی میں جو جو صفات بیان کی گئی تھیں غور سے دیکھو! میں ان میں سے ایک ایک صفت کا حامل اور ایک ایک ادا کا امین ہوں۔ اس طرح سے میں نے ان کی کتابوں کی سچائی اور ان کے دین کی صداقت کو اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب اور اپنے کارناموں اور اپنی خدمات سے سچائی اور صحت کی سند عطا کی ہے۔ یہ ان پر اللہ کا ایک خاص احسان ہے، اس کا کم از کم شکریہ یہ ہونا چاہیے کہ یہ سر اٹھا کر چلیں اور آگے بڑھ کر اسلام کا جھنڈا اٹھالیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اپنی اصلاح بھی کریں اور لوگوں کی اصلاح کے لیے دست وبازو بنیں۔ مصدق صَدَّقَ سے اسم فاعل ہے۔ کسی حقیقت کو اپنے عمل سے ثابت کرنا عربی میں ہمیشہ اس کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ حماسی شاعر کا شعر ہے۔

فَدَتْ نَفْسِیْ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنِیْ

فَوَارِسَ صَدَّقُوْا فِیْهِمْ ظُنُوْنِیْ

Marfat.com

(میری جان اور میرا مال قربان ہو، ان شاہسواروں پر جنہوں نے اپنے بارے میں میرے گمان سچے کر دکھائے) یعنی میں ان کے بارے میں جس طرح جان لڑانے اور بہادری دکھانے کی امید رکھتا تھا اور لوگوں سے اس کا اظہار بھی کرتا تھا انہوں نے ویسی ہی بہادری کا اظہار کر کے اور جان لڑا کر میرے ایک ایک گمان کو سچا ثابت کر دکھایا۔ اس کے لیے صَدَّقُوْا کا لفظ استعمال کیا گیا یہاں آیتِ کریمہ میں بھی مصدق یعنی تصدیق کرنے والا اسی معنی ومفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوت الی اللہ کے لیے آپ کی کاوشوں، پھر آپ کی ہمہ گیر کامیابیوں کو غیر جانبدار ہو کر گہری نظر سے دیکھا ہے وہ کبھی آپ پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکے۔

کیونکہ اہلِ کتاب سے عہد وپیمان لینے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصدق بن کے آنے سے مقصد صرف یہ تھا کہ اہلِ کتاب کو آپ کی پہچان میں دشواری پیش نہ آئے اور وہ اپنے عہد وپیان کی بجاآوری میں تأمل کا شکار نہ ہوں۔ اسی لیے اس عہد وپیمان میں صاف صاف فرمایا گیا تھا کہ تمہیں اس آخری نبی پر ایمان لانا ہوگا اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اس کی ہر ممکن مدد کرنا ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو ہر نبی اور رسول کی تشریف آوری کے بعد ان لوگوں پر جن کی طرف وہ مبعوث ہوا ہے دونوں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ لیکن نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس مقصدِ اعلیٰ کی تکمیل کے لیے آخری پیغمبر ہیں اس لیے بطورِ خاص تمام نوعِ انسانی کو عموماً اور اہلِ کتاب کو خصوصاً یہ حکم دیا گیا کہ تم اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے اس پر ایمان لاؤ اور دنیا کی اصلاح کے لیے اس کے دست وبازو بنو اور ہر طرح سے اس کی مدد کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں۔ اور یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ آپ تمام تر انسانی عظمتوں کے تاجدار ہیں۔ اور کائنات میں آپ سے بڑھ کر کسی کو کمال، عظمت اور بزرگی حاصل نہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی قدرتیں ایسی بے پناہ ہیں کہ وہ انسانی اصلاح کے لیے کسی کی مدد کی محتاج نہیں۔ شر کے بڑے بڑے جتھوں کو توڑ دینا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ اور دلوں کو قبولیتِ حق کے لیے کھول دینا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے جس طرح دنیا کے تکوینی نظام کو اسباب کے ماتحت چلایا ہے اور اسباب ہی کی کارفرمائی ہمیں چاروں طرف دکھائی دیتی ہے، اسی طرح اس نے دعوت واصلاح کے عمل اور نظامِ تشریع میں بھی اسباب ہی کو لازم ٹھہرایا ہے۔ اللہ کا رسول جب دعوت الی اللہ کا کام شروع کرتا ہے تو وہ فرشتوں کے حصار میں ہوتا ہے۔ عناصرِ قدرت اس کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ اسے اپنی ذات کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ کے قانون کے تحت غلبۂ دین کے لیے وہ انسانوں کو اپنی مدد اور نصرت کے لیے پکارتا ہے۔ کبھی عمرؓ جیسے بہادر اور جی دار لوگوں کے لیے نام لے کر دعائیں کرتا ہے اور کبھی انسانی گروہوں کو اپنی مدد کے لیے اکساتا ہے۔ چنانچہ اسی سنتِ الٰہی کے تحت اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو حکم دیا تھا کہ تمہیں اس آخری رسول کی مدد کرنا ہوگی اور پھر یہ عہد ان سے اس طرح لیا گیا جس میں باقاعدہ اقرار اور شہادت کے پراسس کو بروئے کار لایا گیا۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی کسی اہم بات پر بنی اسرائیل سے عہد لینا مقصود ہوتا تھا تو آپ بنی اسرائیل کے ذمہ دار لوگوں کو خیمۂ عبادت کے سامنے جمع کرتے، تابوتِ سکینہ ان کے سامنے ہوتا، آپ پہلے ان کے سامنے عہد کی اہمیت واضح فرماتے، نصیحت سے ان کے دلوں کو مائل کرتے پھر اللہ کا حکم انہیں پڑھ کے سناتے اور پھر سب سے اس حکم کی اطاعت کا اقرار لیتے اور سب کے اقرار کے بعد لوگوں کو اس کا گواہ رہنے کی تاکید کرتے اور اللہ کو اس پر گواہ ٹھہراتے اور پھر آخر میں اس مجلس کے اختتام پر بنی اسرائیل کو اس حکم کی نافرمانی کی صورت میں دنیوی اور اخروی عواقب ونتائج سے بھی آگاہ فرمادیتے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا حکم اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد ومیثاق کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ چنانچہ اس سے بڑھ کر اہتمام کے ساتھ معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وتائید کا ان سے عہد لیا گیا تھا اور پھر یہ عہد ایک بار نہیں لیا گیا بلکہ کبھی عام انبیاء کے عہد کے ساتھ اور کبھی صرف آپ ؐ کے لیے ہر پیغمبر کے دور میں لیا جاتا رہا۔ اور ہر نسل دوسری نسل کو یہ امانت سپرد کرتی رہی۔ اور ان کی کتابوں میں اس اہم ترین حکم کا ہمیشہ چرچا ہوتا رہا۔ اب جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو یہ عہد اور بنی اسرائیل کی طرف سے اس پر اقرار پوری تفصیل کے ساتھ ان کی کتابوں میں موجود تھا کیونکہ مدینہ کے یہود اوس وخزرج کے لوگوں کو اسی حوالے سے آنے والے کی خبر دیتے اور اس کے ساتھ مل کر ان کو فتح کرنے اور ان کی زیادتیوں کا مزہ چکھانے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ طیبہ تشریف لا کر ایک سے زیادہ مرتبہ اہلِ کتاب کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور قرآنِ کریم نے انہیں ایمان لانے کی صورت میں دوہرے اجر وثواب کی نوید بھی سنائی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب پہچانا۔ قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب سمجھا اور ان کے اہلِ علم آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں اقرار کرتے تھے کہ یہ واقعی وہی نبی ہے جس کا ہماری کتابوں میں ذکر ہے۔ لیکن با ایں ہمہ! انہوں نے من حیث القوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا فیصلہ کیا اور آپ ؐ کو ناکام کرنے کے لیے ہر وہ جتن کیا جو ان کے بس میں تھا۔ چنانچہ ان کے اسی رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ (پھر جو لوگ اس کے بعد پھر گئے) بَعْدَ ذٰلِکَ پر غور کیجئے کہ جس قوم کو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ہر پیغمبر نے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی نصرت کے لیے تیار کیا اور اس پر ہمیشہ ان سے عہد وپیمان لیا جاتا رہا اور وہ اپنی مشکلات کے دور میں ہمیشہ اس آنے والے نبی کا انتظار کرتے رہے تاکہ اپنے مخالفین سے انتقام لے سکیں۔ لیکن اس سارے اہتمام کے بعد بھی جن لوگوں نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسلام کو جھوٹا مذہب قرار دیا، ان کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت یہ لوگ فاسق ہیں۔ یہاں فاسق کا لفظ فقہی معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ قرآنِ کریم کی اصطلاح ہے۔ فقہ کی زبان میں فاسق گنہگار کو کہا جاتا ہے جو کافر سے بہت نچلا درجہ ہے۔ جو قیامت میں اپنی نافرمانی کی سزا بھگت کر اگر اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا تو کبھی نہ کبھی جنت میں چلا جائے گا۔ لیکن قرآنِ کریم کی اصطلاح میں فسق کا معنی ہے ایمان و اطاعت کی ہر حد سے گزر جانا۔ شرافت کی ہر قدر کو توڑ پھینکنا، عہد وپیمان کی دھجیاں اڑا دینا۔ عربوں میں ایک محاورہ مشہور ہے

فَسَقَتِ الرُّطَبَۃُ عَنِ الْقِشْرَۃِ

(اگر کھجور کو انگشتِ شہادت کے پور پر رکھ کر انگوٹھے کے پور سے دبایا جائے تو گٹھلی کھجور کے چھلکے سے پھدک کر نکل جاتی ہے)

اس وقت عرب یہ محاورہ بولتے ہیں کہ گٹھلی کھجور کے چھلکے سے پھدک کر نکل گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فسق ہر حکم کو توڑ کر، ہر حد کو عبور کر کے شرافت کی ہر قدر کو پامال کرتے ہوئے پھلانگتے ہوئے نکل جانا فسق ہے اور ایسا کرنے والے کو فاسق کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شیطان کے بارے میں فرمایا گیا فَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ (وہ اپنے رب کے حکم سے نکل بھاگا) بنی اسرائیل کے لیے بھی فاسق کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے اگرچہ وہ اس میں تحریف اور ترمیم کر چکے ہیں، لیکن فی الجملہ وحی الٰہی کی قدر وقیمت سے واقف ہیں۔ نبی اور رسول بھی ان کی طرف مسلسل آتے رہے اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ پوری طرح باخبر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کی بیخ کنی میں پوری طرح سرگرمِ عمل ہو چکے ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے:

Marfat.com

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ O

(کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ اسی کے فرمانبردار ہیں طوعاً و کرہاً جو آسمان و زمین میں ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے) (۸۳)

نہایت تعجب سے سوال کیا جارہا ہے کہ اہلِ کتاب دین کے مزاج کو سمجھتے ہیں، وحی الٰہی کے سلسلے کو پہچانتے ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ تمام کائنات کا مذہب صرف اسلام ہے اور یہی وہ رویہ ہے جس سے کائنات کا نظام باحسن طریق چل رہا ہے۔ اسلام کا معنی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا اور اس کے احکام کی اطاعت میں دے دینا ہے۔ جن وانس کے علاوہ اللہ کی تمام مخلوق تکوینی طور پر اس کی مسلم ہے۔ سورج اسی کے حکم سے کرنیں بکھیرتا ہے، چاند اسی کی اطاعت میں ٹھنڈک برساتا ہے، ستارے اسی کی رضا کے تحت روشنی بکھیرتے ہیں، پھول اسی کے حکم سے کھلتا ہے، کلی اسی کے اشارے سے چٹکتی ہے، موسم اسی کے حکم سے تبدیل ہوتے ہیں، گھٹائیں اسی کے حکم کے تحت جھوم کر اٹھتی اور زمین پر جل تھل ایک کر دیتی ہیں۔ زمین و آسمان اور اس کے درمیان کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ O

(سورج کی مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے تمام اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں)

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں)

یہی اطاعت اور سرفگندگی تکوینی نظام کی جان ہے۔ اسی کے نتیجے میں کوئی سیارہ کسی سیارے سے ٹکراتا نہیں۔ کوئی کرہ دوسرے کرے کی جگہ نہیں لیتا۔ کائنات کی ہر چیز اپنے خواص کے مطابق اظہارِ عمل پر مجبور ہے۔ پانی بہنے سے انکار نہیں کر سکتا، زمین کی قوتِ روئیدگی غلے کے اگانے سے عذر نہیں کر سکتی، سورج کی گرمی غلے کو پکانے سے کبھی پہلو تہی نہیں کر سکتی، زمین بچھونے کی طرح بچھی ہوئی ہے وہ کبھی اپنی حالت کو بدل نہیں سکتی، یہ سب اللہ کی اطاعت میں اپنا اپنا فرض انجام دے رہے ہیں اور اسی میں کائنات کی زندگی اور امن اور اطمینان کا راز مضمر ہے۔

انسان اگر یہ چاہتے ہیں کہ تکوینی نظام کی پابند مخلوق کی طرح پرامن زندگی گزاریں اور انسانوں کے درمیان تصادم اور تضاد کی کیفیت ختم ہو جائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ بھی باقی مخلوقات کی طرح اللہ کے تشریعی نظام کی پابندی اختیار کر لیں۔ اُن کو زندگی میں اطمینان اور امن کی دولت اسلام یعنی اطاعت میں ملی ہے۔ ان کو بھی یہیں سے یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ دوہرے نظام کے مکلف بنائے گئے ہیں۔ اپنے جسم و جان کے اعمال میں تکوینی نظام کے پابند ہیں، اس میں تو یہ کسی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے (لیکن ایک خاص دائرے میں انہیں اختیار کی دولت دی گئی ہے اور اس دائرے میں بھی اپنے اختیار کو اللہ کی اطاعت میں دے دینے کے یہ پابند ٹھہرائے گئے ہیں) اگر یہ پابندی اختیار کر لیں تو ان کی زندگی کا وہ دائرہ جسے انہوں نے اپنے اختیارات کے غلط استعمال سے جہنم بنا رکھا ہے جنت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

اہلِ کتاب اس پوری صورتِ حال سے واقف ہیں۔ پھر نہ جانے وہ کیوں دین کے اس بنیادی مطالبے کو سمجھنے سے انکار کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کے دین کے سوا اللہ کی مملکت میں کسی اور دین کی

Marfat.com

کوئی گنجائش نہیں۔ چلئے اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں اپنے اختیارات کے تحت زندگی گزارنے کا ہمیں حق حاصل ہے اور یہاں ہمیں زبردستی کوئی نہیں روکے گا تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صحیح ہے کہ پروردگار نے عموماً دنیا کی زندگی میں انسانوں کو آزادی دے رکھی ہے اور اس کی جزا و سزا کا دن آخرت کا دن ہے۔ لیکن یہ تو انہیں معلوم ہے کہ آخرت بھی آنے والی ہے۔ ایک نہ ایک دن زندگی کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ پھر انسان اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے اللہ کی عدالت میں کھڑے کیے جائیں گے کیونکہ بالآخر اللہ کے حضور حاضری انسان کا مقدر ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہاں دنیا میں بے شک وہ عیش کی زندگی گزار لیں، لیکن آخرت میں اللہ کے سامنے کس طرح جواب دیں گے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

(آپ کہہ دیجئے! ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور اس چیز پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی ہے اور اس چیز پر جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں) (۸۴)

کلمۂ جامعہ

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایک ایسا کلمۂ جامعہ کا اعلان کرایا گیا ہے جس کے تمام انسان مکلف بنائے گئے ہیں۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہے کہ خیر و شر کی اس کشمکش میں اللہ کے نبیوں اور اس کے صالح بندوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ انہیں راہِ راست پر چلانے کی کوشش کریں اور اس کشمکش میں جو بھی قیمت ادا کرنا پڑے اس سے گریز نہ کریں اور پھر اگر ایسا وقت آ جائے کہ اہلِ باطل دلائل سے لاجواب ہو کر بھی اپنی بات پر اصرار جاری رکھیں اور وہ کسی طرح بھی اپنا رویہ بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر اہلِ حق کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ان سے الجھتے رہیں بلکہ وہ انہیں ان کی خواہشات کے حوالے کر دیں۔ وہ اگر شیطان کو اپنا راہنما مان چکے ہیں تو وہ اس کی راہنمائی میں جس جہنم میں جانا چاہتے ہیں جائیں، لیکن اہلِ حق کی یہ ذمہ داری اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ وہ مینارۂ نور بن کر پوری دنیا کو روشنی دکھاتے رہیں۔ دنیا اللہ کے راستے پر چلنے سے انکار کرے تو وہ آگے بڑھ کر ان راستوں پر ایمان کی روشنی بکھیریں۔ دنیا شیطان کی پیروی اور اللہ کی نافرمانی میں اپنا رویہ کچھ سے کچھ بنا لے لیکن اہلِ حق کا یہ قافلہ کبھی اپنی منزل کھوٹی نہ ہونے دے۔ وہ برابر دینِ حق کی سربلندی کے لیے اپنی کاوشیں جاری رکھے۔ کفر و شرک کے متوالے زمین کو ویرانہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لیکن اہلِ حق کا ایک ایک فرد مور کی طرح جہاں بھی موقع ملے چمن آرائی کرنے سے گریز نہ کرے، وہ جہاں بھی ہو اس کے دم سے نیکیوں کی بہار کھل اٹھے۔ تاریکیوں کے سوداگر تاریکیوں کو عام کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن اہلِ حق اطاعتِ حق کے نور سے کبھی تاریکیوں کو غالب آنے کا موقع نہ دیں۔ چنانچہ جب تک اہلِ حق کا یہ قافلہ اپنی صداقتوں کے دیپ جلاتا رہتا ہے شر کی قوتوں کو کبھی غالب آنے کا موقع

Marfat.com

نہیں ملتا بلکہ کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب شر اور کفر کی قوتیں ظلم پر اتر آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کو مٹا دیتا ہے اور خیر کی قوتوں کو غالب کر دیتا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ خیر کی قوتیں سرنگوں ہو جائیں یا حالات کے جبر کے سامنے جھک جائیں اور اپنے فریضے کا ادا کرنے میں تساہل سے کام لینا شروع کر دیں تو پھر شر کی قوتیں بڑھتی رہتی ہیں اور خیر کی قوتوں پر اللہ کی ناراضگی کے آثار غالب آنے لگتے ہیں۔ مسلسل مصائب ان کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ ذلت کی پھٹکار چاروں طرف سے برسنے لگتی ہے۔ جس طرح ہر طرح کی روشنی بجھ جانے سے تاریکی کے پھیلنے کو کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح اہلِ خیر کی طرف سے فرائض میں کوتاہی سے ظلم کی قوتوں کو ترقی کرنے سے بھی کوئی نہیں روکتا۔ البتہ! ہر آنے والا دن نام نہاد اہلِ خیر کے لیے تباہی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ وہ سنتِ الٰہی ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کو بروئے کار آتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ مسلمان اپنی افرادی قوت میں کسی سے کم نہیں۔ وسائل ان کے پاس بے پناہ ہیں۔ بہترین جغرافیے پر ان کا قبضہ ہے۔ ہر قابلِ ذکر ساحل پر ان کی آبادی ہے۔ ان کے پاؤں کے نیچے دولتِ سیال بہہ رہی ہے۔ لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی عزت ان کے گھر سے روٹھ چکی ہے اور ذلت کے سائے دراز ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس آیت کریمہ میں جس کلمۂ جامعہ اور حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے لیے مسلمان تیار نہیں۔ اگر آج بھی مسلمان اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کفر کے راستے میں حائل ہو جائیں اور اپنی وابستگیاں از اول تا آخر حق کے ساتھ مستحکم کر دیں تو قربانی وایثار کے چند ورق تو ضرور الٹنے پڑیں گے لیکن بالآخر کفر کی قوتیں پسپا ہونے پر مجبور ہو جائیں گی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی صداقت پر تاریخ مذہب اور تاریخِ نبوت کا ایک ایک ورق گواہی دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی ظاہری قوت کے دعوت الی اللہ کے لیے اٹھے۔ مخالفتوں نے ہجوم کیا۔ دلائل کی جنگ لڑی گئی ایک ایک قدم اللہ کی تائید سے آگے بڑھتے گئے بالآخر وہ وقت آیا کہ جب ان کی طرف سے مایوس ہو کر آپؐ سے اس کلمۂ جامعہ کا اعلان کروایا گیا۔ پھر اس کے بعد کی تاریخ آپ کے سامنے ہے کہ چند ہی سالوں میں اسلام جزیرۂ عرب سے نکل کر پوری دنیا کی فیصلہ کن قوت بن گیا۔ سپین میں اسلام اپنے چند جانثاروں کے ساتھ داخل ہوا اور چند ہی سالوں میں مسلمانوں کی ایک مستحکم حکومت قائم ہو گئی اور اسے اس وقت تک عزت نصیب رہی جب تک اس نے اسلام کے کلمۂ جامعہ سے اپنا رشتہ نہیں توڑا اور جب تہذیبی مظاہر اور نسبی تفاخر کو عزت وسربلندی کا ذریعہ بنا لیا گیا اور اس کلمۂ جامعہ سے رسمی سا تعلق باقی رہ گیا تو اسی ملک میں مسلمان عبرت کی علامت بن کر رہ گئے۔ تاتاریوں کی قوت نے کس طرح یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی قوت کو فنا کیا۔ لیکن جب اپنی قوت کے نشے میں مخمور تاتاری یہ سمجھتے تھے کہ اب ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تو صرف مصر سے ایک طاقت اسلام کا کلمۂ جامعہ لے کر اٹھی اس نے وقت کی اس منہ زور آندھی کو رخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اے کاش! مسلمان اس حقیقت کو سمجھیں آج بھی قوت کا سرچشمہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن وہ نہ جانے کس کس سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

(اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہش مند ہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا) (۸۵)

Marfat.com

فیصلہ کن بات کہہ دینے کے بعد ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو دین ہر پیغمبر لے کر آیا وہ صرف اسلام ہے۔ اسے دشمنوں کے جبر سے نہ بدلا جا سکتا ہے اور نہ واپس لیا جا سکتا ہے۔ اس میں کامل اطاعت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی ہے۔ امت کے تعامل نے اس کی ایک ایک چیز کو واضح کر دیا ہے۔ اس کا پورا نظام بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہے۔ آج اگر کوئی روشن خیالی یا اعتدال کا نام لے کر اس اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کرنا چاہتا ہے تو ممکن ہے کہ جلبِ زر یا حصولِ مفاد کے لیے منفعت بخش ہو، لیکن اللہ کے یہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے اور حقیقی ناکامی بھی آخرت کی ناکامی ہے۔ جو شخص اسلام میں تبدیلی کا ارتکاب کرے گا یا اس کے روشن چہرے پر اپنے نفاق کی سیاہی ملنے پر اصرار کرے گا وہ شخص آخرت میں انتہائی محروم و نامراد لوگوں میں سے ہوگا۔

اہلِ کتاب چونکہ اسلام کو من و عن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور انہیں اپنے اختیار کردہ ایک نظامِ زندگی کو اسلام کہنے پر اصرار ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی نامرادی اور بدنصیبی پر مہر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

(اللہ کس طرح ہدایت دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا حالانکہ ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس واضح نشانیاں بھی آ چکی ہیں اور اللہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا) (۸۶)

اس آیت کریمہ میں قَوْمًا سے اہل کتاب بالعموم اور یہود بالخصوص مراد ہیں۔ اللہ کی کتاب کا نزول اور اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت لوگوں کی ہدایت کے لیے ہوتی ہے۔ اس سے افراد بھی ہدایت پاتے ہیں اور قومیں بھی ہدایت سے بہرور ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی قوم جو اپنی کتابوں کے دیئے ہوئے علم کے مطابق اللہ کے نبی اور اس پر نازل ہونے والی کتاب پر دل سے یقین رکھتی ہے اور اسے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ وہی نبی ہے جسے ہماری کتابوں نے آخری نبی کہا ہے اور ایک باغوں والے شہر کو جس کا دار الہجرت قرار دیا ہے۔ اس یقین اور اطمینان کے بعد بھی وہ ایمان قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور مزید یہ بات بھی کہ ان کے دل کے یقین کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے ایسے واضح دلائل اور معجزات بھی آ جائیں جن کا انکار کرنا ممکن نہ ہو اور وہ پھر بھی اپنے رویے سے باز نہ آئیں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ ایسا جرم اگر افراد کی طرف سے سرزد ہو تو بعض دفعہ قابل معافی ہوتا ہے لیکن اگر کوئی قوم من حیث القوم اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس قوم کو کبھی ایمان نصیب نہیں ہوتا اور اس کا یہ رویہ ناقابل معافی ہوتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے کہا

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
مگر کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

یہود نے چونکہ من حیث القوم یہ جرم کیا اور اجتماعی طور اسلام کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اسلام کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور یہ بات تاریخی طور پر ریکارڈ پر موجود ہے کہ ان کے سرداروں میں سے مختلف سرداروں نے اس بات کی تائید کی کہ یہ نبی سچا نبی ہے اور یہ وہی ہے جس کا ذکر ہماری کتابوں میں کیا گیا ہے اور احادیث اور آثار صحابہ میں اس طرح کے بیشتر واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ایسے ظالم لوگ جنہیں

Marfat.com

اپنے علم اور آگاہی کے مطابق اسلام کے کیمپ میں ہونا چاہیے تھا وہ مخالفین کے ساتھ نہ صرف کھڑے ہیں بلکہ ان کی قیادت کر رہے ہیں۔ایسے لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں کرتا کیونکہ ہدایت کی بنیاد صحیح بات کا علم ہے اور اس کے بعد دل کا اس پر یقین کر لینا ہے۔ جب یہ دونوں باتیں کسی شخص یا قوم کو نصیب ہو جائیں لیکن وہ پھر بھی ایمان سے دور رہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اسے ایمان سے محروم کر دیا ہے۔

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

(ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوتی ہے ○ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا نہ ان کو مہلت دی جائے گی ○ مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) (۸۷ تا ۸۹)

یعنی جن لوگوں نے دل کے یقین اور ہدایت کے دلائل دیکھ لینے کے بعد بھی من حیث القوم ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ایسے لوگ ہدایت کے نہیں بلکہ لعنت کے مستحق ہیں اور لعنت بھی ایسی گھمبیر قسم کی کہ اللہ کی طرف سے بھی لعنت برسے، فرشتوں کی طرف سے بھی اور تمام انسانوں کی طرف سے بھی۔ درحقیقت سزاؤں کی بھی ایک نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ حکمران جب کسی کو سزا دیتا ہے تو وہ سزا دینے میں اگرچہ حق بجانب ہوتا ہے۔لیکن عام دیکھنے والی نگاہیں اسے سزا میں مبتلا دیکھ کر اپنے دل میں اس کے لیے رحم کے جذبات محسوس کرتی ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کاش یہ عذاب سے چھوٹ جائے لیکن بعض مجرم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو ملنے والی سزا ہر ایک کی نگاہ میں ایسی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے کہ کوئی اس پر رحم نہیں کھاتا بلکہ ہر ایک اپنے حصے کی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ لوگ جن کا تذکرہ کیا جا رہا ہے یہ بھی ایسے ہی لوگ ہیں ان پر جب اللہ کی لعنت برسے گی تو ساتھ فرشتے بھی ان پر لعنت کریں گے اور تمام لوگ بھی درجہ بدرجہ پھٹکار بھیجیں گے کیونکہ ان کے جرم کی شناعت اتنی واضح اور اتنی مکروہ ہوگی کہ بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نفرت اور لعنت کے الفاظ نکلیں گے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ الناس سے مراد لوگ ہیں اور لوگوں میں صاحب ایمان بھی ہیں اور کافر بھی۔ صاحب ایمان تو یقیناً اس طرح کے لوگوں پر لعنت بھیجیں گے لیکن کافروں کی لعنت بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کافر دو طرح کے ہوں گے۔ایک تو وہ جو کافروں کے امام ہوں گے اور دوسرے وہ جو ان کے پیچھے چلنے والے ہوں گے۔ جب یہ دونوں جہنم میں پھینکے جائیں گے تو دونوں ایک دوسرے پر لعنت ملامت کریں گے۔ پیچھے چلنے والے اپنے لیڈروں پر لعنت بھیجیں گے کہ تمہاری رہنمائی نے ہمیں یہ برے دن دکھائے اور آگے چلنے والے پیچھے چلنے والوں کو خود ان کی شامت اعمال کا ذمہ دار قرار دیں گے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا سے مراد بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہیں گے۔لیکن حقیقت میں یہاں جہنم مراد ہے کیونکہ لعنت کا معنی ہوتا ہے رحمت سے دوری اور رحمت سے دوری کی حقیقی جگہ جہاں کبھی رحمت کی توقع بھی نہیں ہو سکتی وہ جہنم ہے۔

ان میں جو لوگ لعنت کے مستحق ہوں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور وہاں ان کے عذاب میں نہ تخفیف کی جائے گی نہ کبھی ایک لمحے کی مہلت ملے گی۔ہاں جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور آج تک جن جرائم میں پیش پیش رہے ہیں ان کی تلافی کی

Marfat.com

اور اپنے پیدا کردہ بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کی تو اللہ اتنا کریم ہے کہ یہ لوگ اس قابل تو نہیں کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی نرمی کی جائے۔ لیکن پھر بھی اس بات کا امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی بڑی بات نہیں کہ اللہ ان کے ساتھ بخشش اور رحمت کا معاملہ کرے کیونکہ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ
یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ○ۧ

(جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، یہی لوگ حقیقی گمراہ ہیں ○ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اگر وہ زمین بھر سونا فدیہ میں دے دیں تو ہرگز ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا) (۹۰ تا ۹۱)

گزشتہ آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قانون بیان فرمایا ہے کہ جو قوم من حیث القوم دل کے یقین اور عقل کو مطمئن کرنے والے دلائل کے بعد بھی کفر کا راستہ اختیار کرے تو ایسی قوم کو اللہ تعالیٰ ایمان کی دولت سے بہرہ ور نہیں فرماتا کیونکہ بارگاہ ایزدی میں عموماً اجتماعی گناہوں کو معاف نہیں کیا جاتا۔ ان پر گرفت ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ایک اشارہ فرمایا کہ اللہ کی رحمت چونکہ اس کے غضب پر چھائی ہوئی ہے اس لیے کچھ بعید نہیں کہ اگر کچھ لوگ توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے اور وہ گناہوں کی تلافی کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ تلافی کا موقع عطا فرمائے حالانکہ ان کا حقیقی بدلہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی لعنت کے مستحق سمجھے جائیں۔

ان آیات میں ایک قدم آگے بڑھ کے فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ یقین و ایمان سے بہرہ ور ہونے کے بعد متذکرہ بالا لوگوں کی طرح پھر ایمان کی روش اختیار کریں لیکن سابقہ لوگوں سے مختلف ہوتے ہوئے توبہ کا راستہ اختیار نہ کریں بلکہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں ہر آنے والا دن ان کے کفر میں اضافہ کا باعث بنے۔ یہ اگر موت کی علامتوں کو دیکھ کر زبان سے توبہ توبہ کہنے لگیں تو ایسے لوگوں کی توبہ کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ دراصل حقیقی طور پر یہی گمراہ ہیں کیونکہ جس طرح ایمان میں استقامت ایمان کو حقیقی بناتی ہے اسی طرح کفر میں آخر حد تک اڑے رہنا اور کسی معقول اور ہدایت کی بات کی طرف توجہ نہ دینا یہ وہ حقیقی کفر ہے جس پر کبھی توبہ کا سایہ نہیں پڑتا اور ایسے ہی کفر کے حامل حقیقی گمراہ لوگ ہیں۔ یہ اگر قیامت کے دن اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے زمین بھر سونا بھی دے دیں تو تب بھی ان کی جان نہیں چھوٹے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہنم کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے فدیہ اور معاوضے کی کوئی صورت ممکن ہے بلکہ یہ ہر طرح کے معاوضے کے امکان کو ختم کرنے کا ایک انداز ہے اور حتمی بات وہی ہے جو آخر میں کہی گئی ہے کہ ان کے لیے عذاب الیم ہے اور یہ ایسے بے بس اور بے کس لوگ ہیں کہ کسی کی مدد ان کے مقدر میں نہیں۔

Marfat.com

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا
لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ قف فَاتَّبِعُوْا
مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ
اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۬ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ
كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ
اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ
عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ
مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا
فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ

Marfat.com

فِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾

رکوع: ۱۰۔ تم اللہ کی وفاداری کا درجہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم خرچ نہ کرو ان چیزوں میں سے جنہیں تم محبوب رکھتے ہو اور تم جو چیز بھی خرچ کرو گے تو یقیناً اللہ اسے جاننے والا ہے O سب کھانے کی چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں مگر وہ جو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے، کہہ دیجئے! لاؤ تورات پھر اسے پڑھ کے سناؤ اگر تم سچے ہو O جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں تو وہی ظالم ہیں O آپ کہہ دیجئے! سچ فرمایا ہے اللہ نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا O بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت تمام جہان والوں کے لیے O اس میں واضح نشانیاں ہیں جیسے مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو گیا وہ مامون ہو گیا اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے اوپر اس گھر کا حج ہے اور جس نے کفر کیا تو اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے O اے پیغمبر کہہ دیجئے! اے اہلِ کتاب تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو کچھ تم کر رہے ہو O کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! تم اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو، ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ تم اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہو حالانکہ تمہیں گواہ بنایا گیا تھا اور اللہ باخبر ہے اس سے جو کچھ تم کرتے ہو O اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے اہلِ کتاب کے ایک گروہ کا تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے O اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم پھر کفر کرنے لگو؟ حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کے رسولؐ موجود ہیں اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ پر) (۹۲ تا ۱۰۱)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ O

(تم اللہ کی وفاداری کا درجہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم خرچ نہ کرو ان چیزوں میں سے جنہیں تم محبوب رکھتے ہو اور تم جو چیز بھی خرچ کرو گے تو یقیناً اللہ اسے جاننے والا ہے) (۹۲)

اس آیت کریمہ میں مختلف باتیں تشریح طلب ہیں جن کے بغیر اس آیت کو سمجھنا آسان نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس آیت میں اَلْبِرُّ کا لفظ ایک خاص سیاقِ کلام میں وارد ہوا ہے اور یہی لفظ اس سے ملتے جلتے سیاقِ کلام میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں آ چکا ہے۔ مخاطب دونوں جگہ اگرچہ اہلِ کتاب ہیں لیکن سورۂ بقرہ میں روئے سخن کا اصل ہدف یہود ہیں اور یہاں سورۂ آلِ عمران میں نصاریٰ ہیں۔

Marfat.com

دونوں جگہ آپ دیکھیں گے کہ یہود و نصاریٰ پر مکمل اور جامع تنقید فرمانے اور اتمامِ حجت کے بعد یہ بات فرمائی گئی ہے کہ تم اَلْبِرَّ کو حاصل نہیں کر سکتے ہو۔ اَلْبِرَّ کو حاصل کرنے کے لیے جن حقائق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے یا جو حقائق اَلْبِرَّ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ میں انہیں تفصیل سے بیان فرما دیا گیا ہے اور وہاں ہم اپنے طور پر اس کی تشریح بھی عرض کر چکے ہیں۔ یہاں مقصود تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے لیکن ان کا دوبارہ ذکر کرنا شاید بلاغت کے خلاف سمجھا گیا ہے۔ اس لیے جس شخص کی نگاہ بھی اس آیت پر اس لحاظ سے ہوگی کہ یہ اُس سورۂ کریمہ کی آیت ہے جو سورۃ البقرہ کا تتمہ ہے تو پھر اسے یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہونا چاہیے کہ اَلْبِرَّ کے مقدمات اور اس کے نتائج کو یہاں ذکر کیوں نہیں فرمایا گیا۔

سورۃ البقرہ میں اَلْبِرَّ والی آیت اس وقت آئی جب یہود کے کاروبارِ مذہب کو پوری طرح بے نقاب کر دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنے بارے میں ان پڑھ عربوں کے دلوں میں جو خوش فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں اور اپنے تقدس اور مشیخیت کا جو رعب ان کے دلوں میں بٹھا رکھا تھا اس کا تار و پود پوری طرح بکھیر دیا گیا تھا اور ان کے بنیادی تصورات کی کمزوریوں اور ان کی اخلاقی خرابیوں کو ایک ایک کر کے اس طرح نمایاں کیا گیا تھا جس سے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہ رہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے حق کی روشنی ملی تھی لیکن انہوں نے اپنے لیے اندھیرے پسند کیے۔ اب اگر یہ اللہ کی طرف سے نئی آنے والی روشنی جو نبیِ آخر الزماں اور قرآنِ کریم کی شکل میں ان تک پہنچی ہے۔ اسے قبول نہیں کریں گے تو یہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو محروم کر دیں گے اور ان کی گزشتہ بداعمالیاں دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی محرومیوں میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں کریں گے۔

پیشِ نظر آیت کریمہ میں نصاریٰ کو بطورِ خاص تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان کے عقائد کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے عقلی اور نقلی دلائل سے اس طرح انہیں بے بس کر دیا گیا کہ بعد کے سوالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں۔ پھر انہیں توجہ دلائی گئی ہے کہ اب بھی تمہارے لیے موقع ہے کہ تم اسلام کی دعوت کو قبول کر لو اور تم نے لوگوں کے سامنے جو تقدس کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اسے اتار پھینکو ورنہ یاد رکھو تمہیں اس انجام سے واسطہ پڑنے والا ہے جس میں دنیا بھر کی دولت بھی تمہیں عذاب سے بچا نہ سکے گی۔

اس کے بعد انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تمہارا اپنے پروردگار سے جو حقیقی رشتہ ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمہارے اور اللہ کے درمیان اَلْبِرَّ کا تعلق ہونا چاہیے، اَلْبِرَّ کا ترجمہ عموماً نیکی سے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نامکمل اور ناکافی ترجمہ ہے۔ اس لفظ کی اصل روح ایفائے عہد اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ وہ حقوق و فرائض اللہ کے ہوں یا بندوں کے اس تقسیم سے ان کی حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ کے حقوق جس طرح اللہ کی ذات و صفات اور اس کے احکام سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بندوں کے حقوق بھی اللہ کے احکام کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ بندوں میں سے کوئی بندہ بھی ذاتی طور پر کسی طرح کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے جب آدمی اللہ کے حقوق ادا کرتا ہے تو تب بھی اللہ سے اپنے تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے تو تب بھی اللہ کی رضا کے حصول کی فکر کرتا ہے۔ مقصود ہر لحاظ سے اللہ کی ذات ہے۔ اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو پھر یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ ایک بندے کا اپنے رب سے تعلق تمام تر تعلقات کے حوالے سے وفاداری، نیازمندی اور کمٹمنٹ کا ہے۔ یہود ہوں یا نصاریٰ یہ دونوں اپنے آپ کو انبیاء کی اولاد کہتے ہیں اور دونوں ملتِ ابراہیم کے دعویدار ہونے کے داعی ہیں اور دونوں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے نبیوں کو جو عظمتیں ملی ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی قیادت کا جو منصب ملا ہے وہ ان کے کسی ذاتی رشتے یا ذاتی حیثیت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ وہ اللہ سے وفاداری کے حقوق کی ادائیگی کا نتیجہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی ملت پر ہونے کا انہیں دعویٰ ہے ان کے بارے میں یہ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے

Marfat.com

اللہ کی رضا کے حصول اور اس سے وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کیسی کیسی قربانیاں دیں۔ گھر چھوڑا، وطن سے بے وطن ہوئے، قوم نے برداشت نہ کیا، ملکوں ملکوں پھرتے رہے، دنیا بھر کی صعوبتیں اٹھائیں، بیوی اور نوزائیدہ بچے کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آئے، بیٹا لڑکپن کی عمر کو پہنچا، باپ کی آرزوؤں اور امیدوں کی علامت بننے لگا تو حکم ہوا کہ بیٹے کو ہماری خاطر ذبح کر دو۔ عظیم باپ نے اس حکم کی تعمیل میں آستینیں چڑھا لیں۔ زمین پر لٹا کر پوری قوت سے گلے پر چھری چلائی کہ اللہ نے ہاتھ روک دیا اور اس قربانی کو قبول فرمایا۔ اس طرح سے جب زندگی کے تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر نکلے تو تب دنیا کی امامت کا شرف حاصل ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تمام تر مناصب اور ان کی عظمتیں ان کے بر و تقویٰ کا نتیجہ تھیں اور تم نے محض ظاہری دینداری کا لبادہ اوڑھ کر یہ سمجھ لیا ہے کہ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔

اَلْبِرَّ کے مقام کو حاصل کرنے کے لیے یہاں صرف ایک چیز کا ذکر فرمایا گیا ہے اور یہی ایک چیز ہے جو اہلِ کتاب کی قلعی کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہود کی اصل کمزوری جس سے نصاریٰ بھی بری نہیں اور جو آج تک ان کی علامت بنی ہوئی ہے اور وہ جہاں بھی رہیں اس علامت سے پہچانے جاتے ہیں وہ ان کا بخل اور خست ہے۔ چنانچہ ان کی اسی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا گیا کہ تم جب تک محبوب ترین چیزوں کو اللہ کے راستوں میں خرچ نہیں کرو گے اس وقت تک اللہ سے وفاداری کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ یہود کی تو یہ شہرت رہی ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا تو بڑی دور کی بات ہے وہ تو اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہوئے ہمیشہ خست سے کام لیتے ہیں۔ آج بھی ان کی آبادیاں ان کے بخل اور کمینگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ جہاں بھی رہیں گے اپنی اس عادتِ بد سے ہمیشہ پہچانے جائیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بھلائی کا راستہ روکنے، خیر کے سرچشموں کو تباہ کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دنیا کو ہمیشہ کے لیے ایسے مہلک ہتھیاروں سے لیس کرنے کے لیے جو انسانیت کی مکمل تباہی کا باعث بنیں ان کی دولت ہمیشہ فراوانی سے لٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن خیر اور بھلائی کی قوتوں کو توانا کرنے کے لیے وہ کبھی ایک پیسہ خرچ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی برائی کے سرچشموں کا وجود ملتا ہے اس کے پیچھے آپ کو یہودی ذہن اور یہودی سرمایہ کار فرما دکھائی دے گا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ خدا کے ماننے والے لوگ ہیں، لیکن خدا کے انکار پر مبنی کمیونزم انہی کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ وہ اخلاقیات کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جن مفکروں نے اخلاق کی جڑ ماری ہے وہ انہی کے گھروں سے نکلے ہیں۔ ان کی کتابیں بے حیائی کی تردید کرتی ہیں لیکن دنیا بھر میں بے حیائی کو پھیلانے والا ہر ادارہ انہی کے دودھ سے پلتا ہے۔ انسانوں کی تباہی کے لیے مہلک سے مہلک ہتھیار انہی کی قوتِ ایجاد کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے اس آیت کریمہ نے ان کی اصل بیماری کو نشان زد کیا ہے اور پھر محبوب ترین چیزوں کو مال و دولت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو عموم کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کہ جس طرح مال و دولت کے معاملے میں ان کا بخل اور یا برائی کی خاطر مال و دولت کا خرچ کرنا ان کی سرشت بن چکا ہے اسی طرح ان کی ذاتی حیثیت ان کے عہدے اور ان کے مناصب اور ان کے دل و دماغ کی صلاحیتیں ہر جگہ برائی کے مراکز کے کام آتی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ یاد رکھو! تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ تم سازشوں میں اور سازشوں کے ذریعے خرچ کرتے ہو، لیکن اللہ کے علم سے وہ سازشیں مخفی نہیں رہتیں۔ تم نہایت رازداری سے مسلمانوں کی تباہی کے منصوبے بناتے ہو اور ان کی تشکیل پر دماغ لڑاتے ہو اللہ انہیں بھی خوب جانتا ہے اور اگر کہیں نیکی کے ارادے سے کوئی پیسہ خرچ کرتے ہو تو اللہ اس سے بھی واقف ہے جس طرح وہ ہر برائی پر سزا دے گا اسی طرح وہ نیکی پر جزا بھی دے گا۔ جب تک تم ان بنیادی تصورات کو دل و دماغ کا حصہ نہیں بناؤ گے اور البر کو اپنی حقیقی منزل قرار نہیں دو گے اور اس کی خاطر تمام ممکن ذرائع کو خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گے اس وقت تک اللہ کے یہاں تمہارا کوئی مقام نہیں ہو گا۔

Marfat.com

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ سیاقِ کلام کے حوالے سے تھا اور اہلِ کتاب کے چہرے سے وہ نقاب بھی اتارنا تھا جو انہوں نے اللہ سے اپنے تعلق کے حوالے سے پہن رکھا تھا اور ان کی اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کے اصل مرض کو بتانا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کی ہر آیت جس طرح اپنا سیاق وسباق رکھتی ہے اسی طرح اپنی ذات میں مستقل حیثیت کی مالک بھی ہے۔ اس آیت کو بھی جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں دونوں حیثیتیں دکھائی دیتی ہیں۔ سیاق وسباق کو تو ہم واضح کر چکے، لیکن مستقل حیثیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ صرف اہلِ کتاب کا نہیں بلکہ اب اس نئی بننے والی امت یعنی امتِ اسلامیہ کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگر وہ اللہ سے حقیقی تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتی اور البر کے مقام تک پہنچنا چاہتی ہے تو اس کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی مطلوب اور محبوب چیزوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا کرے۔ انسان کی پسند وناپسند یکساں نہیں ہوتی۔ لیکن جب اہداف اور مقاصد یکساں ہوں تو پسند وناپسند میں واجبی سا امتیاز رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تمام جائز حلال اور طیب نعمتیں جو اللہ نے انسانوں کو عطا فرمائی ہیں ان میں سے جو نعمت بھی ایک مومن کو زیادہ محبوب ہو اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر دینا کمالِ بندگی کے حصول کا ذریعہ ہے اور البر کا یہی تقاضا ہے۔ البتہ! اس میں دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ نعمتوں میں فرقِ مراتب کبھی تو انسان کی پسند وناپسند سے ہوتا ہے اور کبھی اسلامی ضرورتوں کے تحت ہوتا ہے۔ معرکۂ حق و باطل میں مسلمان فوج اور اسلامی حکومت کو جو ضرورتیں پیش آتی ہیں ان میں ہاتھ بٹانا اور آگے بڑھ کر ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ ادا کرنے کی کوشش کرنا یہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے کیونکہ اس وقت اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ہر وہ چیز قربان کی جائے جو اسلام کی بالادستی کا ذریعہ بنے اور اگر ملک وملت کے حالات پرسکون ہوں اور ضرورت اس بات کی ہو کہ تعلیمی ادارے زیادہ سے زیادہ کھولے جائیں تاکہ مسلمانوں میں تعلیمی تناسب بڑھے، ایسی صورت میں تعلیم سے متعلق جس چیز کی بھی ضرورت ہو ان میں سے بہتر سے بہتر چیزوں کو مہیا کرنا کمالِ بندگی اور البر کا تقاضا ہوگا۔ البتہ! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسلمان ملک میں سیلاب کی تباہ کاریاں نازک حالات پیدا کر دیتی ہیں یا زلزلے کی شکست وریخت زندگی دشوار کر دیتی ہے یا آفاتِ ارضی وسماوی حالات کی ابتری میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خرچ کرنے والا اپنے مہنگے کپڑے، اپنی پسندیدہ خوشبو، اپنے نفیس جوتے یا اور کوئی ایسی محبوب چیزیں مشکلات کا شکار لوگوں میں پہنچائے بلکہ اس وقت اگر لوگ وبا سے مر رہے ہیں تو سب سے پسندیدہ چیز دواؤں کا مہیا کرنا ہوگا اور اگر سر پہ چھت نہیں رہی اور لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں تو خیموں اور بستروں کا مہیا کرنا سب سے بڑی نیکی ہوگی غرضیکہ محبوب چیز کی ایک متعین تعریف بہت مشکل ہے۔ جس طرح خرچ کرنے والا اس کا فیصلہ کر سکتا ہے اسی طرح حالات اس فیصلے میں آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔ البتہ! اگر حالات کا دباؤ کسی بات پر مجبور نہ کرتا ہو اور آدمی اپنے طور پر اللہ کو راضی کرنے کے لیے محبوب سے محبوب چیز اس کے راستے میں دینا چاہتا ہے تو پھر اس کا آسان پیمانہ وہی ہے جس کو ہر انسانی طبیعت سمجھتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جیسے ہی یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور میرے پاس سب سے قیمتی چیز میرا وہ باغ ہے جس میں برحاً کنواں بہتا ہے اس سے بہتر میرے پاس کوئی اور چیز نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی حقیقی بندگی اور رضا کے مقام کو حاصل کرنے کے لیے اسے اللہ کے راستے میں صدقہ کر دوں۔ آپ اسے قبول فرمائیے اور جہاں چاہیں استعمال میں لائیے۔ آپؐ نے حضرت ابوطلحہؓ سے پوچھا کہ تمہارے کوئی اعزا وا قرباء بھی ہوں گے جو اپنی جائز ضرورتیں رکھتے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ تم یہ باغ ان میں تقسیم کر دو۔ چنانچہ آپؓ نے اپنے چچازاد بھائیوں میں اسے تقسیم کر دیا۔ یہ باغ

Marfat.com

بالکل بابِ مجیدی کے سامنے تھا۔لیکن موجودہ توسیع میں مسجد کا حصہ بن چکا ہے۔اسی طرح حضرت زید بن حارثہؓ نے جب یہ آیت سنی تو ان کے پاس ایک بڑا قیمتی گھوڑا تھا۔انہوں نے لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اور عرض کیا کہ میں اسے اللہ کے راستے میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔آپؐ نے وہ گھوڑا ان کے صاحب زادے حضرت اسامہؓ کو عطا فرمایا۔حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ دیکھ کر ملال ہوا کہ گھوڑا تو دوبارہ میرے ہی گھر میں آ گیا ہے۔آپؐ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہارا صدقہ قبول فرما لیا ہے۔اس آیتِ کریمہ کے نزول کے وقت ایسے کئی واقعات پیش آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کے مزاج پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور وہ اپنی قیمتی چیزیں اللہ کے راستے میں نثار کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قیمتی چیز کا فیصلہ چیز کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ دینے والے کی حیثیت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔بعض دفعہ لاکھوں روپیہ بھی ایک آدمی کے لیے کوئی بڑی دولت نہیں ہوتا۔لیکن کسی دوسرے دوست کے لیے معمولی چیز بھی بڑی دولت کا درجہ رکھتی ہے۔جنگِ تبوک کے موقعہ پر جب مسلمان بڑھ چڑھ کر جنگی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے انفاق کا ثبوت دے رہے تھے۔ایک شخص چھوہاروں کی ایک پوٹلی لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور میرے پاس اس پوٹلی کے سوا کچھ نہیں اور یہ بھی میرے دن بھر کی مزدوری کی اجرت ہے۔جو میں آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں۔آپؐ نے خوش ہو کر فرمایا کہ لوگوں کی داد و دہش سے جو خیرات کا ڈھیر لگ گیا ہے یہ پوٹلی اس ڈھیر پر بکھیر دی جائے تاکہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کا انفاق قبول فرما لے کیونکہ جو قدر و قیمت اللہ کی نگاہ میں اس پوٹلی کی ہے وہ اس پورے ڈھیر کی نہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو قیمتی بنانے والا وہ جذبہ اور وہ خلوص ہے جو انفاق کا اصل محرک ثابت ہوتا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(سب کھانے کی چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں مگر وہ جو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں تورات کے نازل ہونے سے پہلے، کہہ دیجئے! لاؤ تورات پھر اسے پڑھ کے سناؤ اگر تم سچے ہو ○ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں تو وہی ظالم ہیں) (۹۳ تا ۹۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ نے جب اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا وارث قرار دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑا تو یہود نے مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ تم اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر قرار دیتے ہو اور خود کو ان کا وارث سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے طور اطوار تو یکسر ان کے خلاف ہیں ملت ابراہیمی میں اونٹ کا دودھ اور اس کا گوشت پوست حرام کیا گیا تھا لیکن تم نہ صرف اسے حلال سمجھتے ہو بلکہ اس کا دودھ اور اس کا گوشت تمہاری پسندیدہ غذا ہے اور مزید یہ کہ اللہ کے راستے میں اس کی قربانی کو تم تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہو اس سے بڑھ کر عجیب بات اور کیا ہو گی کہ جو جانور ملت ابراہیمی میں حرام ہو اور تم اسے نہ صرف حلال سمجھو بلکہ اپنے لیے محبوب

Marfat.com

جانو اور پھر بھی ملت ابراہیمی سے اپنی نسبت پر فخر کرو۔ قرآنِ کریم نے ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ہر جائز اور طیب چیز اللہ نے بنی اسرائیل پر حلال کی تھی انہی میں سے اونٹ بھی تھا۔ اس کا دودھ اور اس کا گوشت پوست بنی اسرائیل کے لیے حلال ٹھہرایا گیا تھا۔ البتہ! جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف ہوئی تو انہوں نے اللہ سے نذر مانی کہ یا اللہ اگر مجھے اس بیماری سے شفا ہو جائے تو میں اپنی محبوب ترین چیز اپنے اوپر ممنوع قرار دے لوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عرق النساء سے شفا بخشی تو آپ نے اپنی نذر کو پورا کرتے ہوئے اونٹ کا گوشت پوست اور اس کا دودھ اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا۔ اسلامی شریعت میں کسی بھی حلال اور جائز چیز کو نذر کے طور پر ممنوع یا حرام نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اسے قسم توڑ کر قسم کا کفارہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی شریعت میں اس بات کی اجازت تھی۔ اس لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کے جواز سے فائدہ اٹھایا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے ان کا ذاتی معاملہ سمجھا جاتا لیکن بنی اسرائیل کے فقہاء نے اسے پوری امت پر نہ صرف لاگو کیا بلکہ اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنے لگے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سے اونٹ حرام چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس کی تردید کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے فرمایا کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت نے اونٹ کو حرام قرار دیا تھا اور یہ حرمت آج تک ہر شریعت میں باقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً تورات میں اس کا ذکر ہوگا کیونکہ تورات بنی اسرائیل کی تاریخ بھی ہے اور ان کے دعویٰ کے مطابق اس میں وہی شریعت دی گئی ہے جس کا آغاز ملت ابراہیم سے ہوا تھا، تو پھر تورات نکال کر دکھاؤ کہ یہ حکم تورات میں کہاں موجود ہے۔ اگر تورات میں یہ حکم مل جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، لیکن اگر تورات میں یہ حکم نہ ملے تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ حکم اپنی طرف سے گھڑا اور اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ ایک جھوٹ کا گھڑنا بجائے خود گناہِ کبیرہ ہے، لیکن اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا تو بہت بڑا گناہ ہے جس کا تم ارتکاب کر رہے ہو۔

بعض اہلِ تحقیق نے ٹھیک کہا ہے کہ تورات میں ملت ابراہیمی کے خلاف جن طیبات کو حرام ٹھہرایا گیا ہے وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو محض یہود کے فقہاء کے ذوقِ تحلیل و تحریم اور ان کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے اپنے فتویٰ کے تحت کسی چیز کو حرام ٹھہرایا اور بعد میں ان کا یہی فتویٰ تورات میں شامل ہو کر اس کا ایک جزو بن گیا اور اس طرح فقیہوں کے ایک فتوے نے کتابِ الٰہی کی حیثیت حاصل کر لی۔ تورات میں اس قسم کے جو گھپلے ہوئے ہیں ان پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے، ان کا تعلق تورات کی تاریخ سے ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے۔ دوسری وہ ہے جو یہود کی سرکشی ان کی کٹ حجتی اور ان کی سوال بازی کے سبب سے حرام ہوئی۔ انہوں نے کسی چیز کو متعین کرانے میں اتنے سوالات اٹھائے کہ ان کے لیے جواز کی راہ تنگ سے تنگ ہوتی چلی گئی اور اچھی بھلی طاہر و طیب چیزیں بھی ان کے لیے حرام ہو کر رہ گئیں۔ تیسری وہ ہیں جن سے احتراز و اجتناب کا تصور ان کے ہاں بزرگوں سے چلا آ رہا تھا۔ مثلاً بعض چیزیں حضرت یعقوب کسی احتیاط یا محض طبعی ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر استعمال نہیں کرتے تھے۔ یہود نے اس طرح کی چیزوں کا سرا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا دیا اور ان کی حرمت بھی تورات کی محرمات کی فہرست میں شامل ہو گئی۔

یہی وہ حرمتیں ہیں جن کو قرآن میں اِصر و اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہود کے صحیفوں میں ملت ابراہیم پر مبعوث ہونے والے پیغمبر کے بارے میں یہ پیشگوئی موجود تھی کہ جب وہ آئیں گے تو یہود کے تمام طیبات کو حلال کریں گے اور جو طوق و سلاسل انہوں نے اپنے اوپر لاد رکھے ہیں ان سے ان کو نجات دیں گے۔

Marfat.com

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّـةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(آپ کہہ دیجئے! سچ فرمایا ہے اللہ نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا) (۹۵)

یعنی قرآنِ کریم تمہیں جس بات کی راہنمائی دے رہا ہے یہی اللہ کی صحیح تعلیم ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سراسر اللہ پر جھوٹا بہتان ہے۔ اس لیے اپنی خرافات کو ملت ابراہیم ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس ملت ابراہیم کی پیروی کرو جس کی دعوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ سراسر اللہ کی بندگی پر قائم تھا اور وہ اس باب میں بالکل یکسو تھے۔ نہ انہوں نے اس راہ سے دوسری پگڈنڈیاں نکالیں اور نہ وہ مشرکین میں سے تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت تمام جہان والوں کے لیے ۝ اس میں واضح نشانیاں ہیں جیسے مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو گیا وہ مامون ہو گیا اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے اوپر اس گھر کا حج ہے اور جس نے کفر کیا تو اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے) (۹۶ تا ۹۷)

گزشتہ بعض آیاتِ کریمہ میں یہود کی بعض خیانتوں کا افشا کیا گیا ہے اور اسی حوالے سے ان کے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ انہوں نے تورات میں جو خیانتیں کی ہیں ان کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رشتہ کسی طرح بیت اللہ اور مکہ معظمہ سے کاٹ دیا جائے اور تورات میں جو فضائل بیت اللہ کے حوالے سے ذکر فرمائے گئے ہیں ان کا مصداق بیت المقدس کو ٹھہرایا جائے۔ نیز یہ بھی ثابت کیا جائے کہ آخری آنے والے پیغمبر وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں گے اور ان کا مرکز یہی بیت المقدس ہوگا۔ ان تمام باتوں کی اصلاح کے لیے بیت اللہ کی تاریخ کے چند ابواب کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ دنیا میں جس گھر کو اللہ کے گھر کی حیثیت سے قدامت کا شرف حاصل ہے اور جو ہمیشہ سے انسانوں کی سجدہ گاہ چلا آ رہا ہے اور جس کے طواف اور زیارت کے لیے دنیا کے دور دراز گوشوں سے لوگ کشاں کشاں آتے رہے ہیں وہ یہی اللہ کا گھر ہے جو مکہ معظمہ میں آباد ہے۔

مکہ اور بکہ کی تشریح

اس آیتِ کریمہ میں مکہ کو بکہ کے تلفظ کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ قدیم صحیفوں میں اس کا یہی نام آیا ہے اور آج بھی یہ لفظ شہر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بعلبک مشہور شہر ہے جس کا تاریخ کی عام کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔ اس کا معنی ہی یہ ہے کہ ''بعل کا شہر''۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بابل سے تشریف لائے تھے اور بابل کی زبان میں شہر یا آبادی کو ''بکہ'' کہتے ہیں۔ اس لیے حضرت

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر کے لیے اپنی زبان کا لفظ پسند فرمایا۔ قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں اسی اصل لفظ کو زندہ فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اہلِ کتاب نے اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ اور آخری بعثت کے نشانات کو گم کرنے کے لیے اس لفظ کے تلفظ اور قرأت میں سو طرح سے تغیرات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ اسے تحریف کی سان پر چڑھا کر بکہ کی بجائے ''بکاء'' بنایا اور اس کو مصدر قرار دے کر اس کا ترجمہ رونا کر دیا اور اس طرح وادی بکہ کو رونے کی وادی میں تبدیل کر کے اس سب سے بڑے نشان کو گم کرنے کی کوشش کی جس سے لوگوں کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ قرآنِ کریم نے بکہ کا لفظ بول کر قدیم نام کی یاد دہانی کی ہے جو تورات کے صحیفوں میں موجود تھا بلکہ بعض صحیفوں، مثلاً زبور میں اب بھی موجود ہے۔

سب سے پہلا اللہ کا گھر

چنانچہ یہی وہ گھر ہے جو سب سے پہلے روئے زمین پر اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا۔ بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعے حکم دیا کہ وہ اللہ کا گھر بنائیں۔ چنانچہ انہوں نے حکم کی تعمیل کی، پھر انہیں حکم دیا کہ اس کا طواف کریں اور ان سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ وہ گھر ہے جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی بناء کردہ یہ تعمیر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک باقی تھی۔ طوفانِ نوح میں منہدم ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات مٹ گئے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں کو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے تلاش کر کے ان پر اس گھر کی عمارت اٹھائی۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی ابتدائی طور پر تعمیر کی بلکہ فرمایا:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمَاعِيْلُ

(اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنیادیں پہلے موجود تھیں ان پر دیواریں چنی جا رہی تھیں۔ ایک دوسری آیتِ کریمہ میں اور بھی واضح اشارہ فرمایا ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (جب ہم نے ابراہیم کو اس گھر کی جگہ کا ٹھکانہ بتایا)

اسی علم کی روشنی میں آپ نے وہ بنیادیں تلاش کیں اور اس کے اوپر عمارت تعمیر کی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ پھر کسی حادثہ کے باعث بیت اللہ کی عمارت منہدم ہوگئی تو قبیلہ جرہم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی۔ پھر ایک دفعہ ضرورت پیش آئی تو عمالقہ نے اس کو تعمیر کیا۔ پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی دیواریں پھٹ گئیں تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت زندگی میں اسے بنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے حجرِ اسود اس کی جگہ پہ رکھا۔ لیکن قریش نے اس نئی تعمیر میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں، انہوں نے اپنے اوپر پابندی لگائی تھی کہ اللہ کے اس گھر کی تعمیر میں حلال کمائی کے سوا کوئی اور پیسہ نہیں لگایا جائے گا۔ چنانچہ اس طرح جو ان کے پاس مصارف جمع ہوئے وہ اتنے نہ تھے کہ پورا گھر اس سے تعمیر ہوسکتا۔ چنانچہ انہوں نے بیت اللہ کا ایک حصہ جسے حطیم کہا جاتا ہے۔ اسے بیت اللہ سے باہر چھوڑ دیا اور مزید یہ کیا

Marfat.com

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ میں دو دروازے تھے ایک داخل ہونے کا اور دوسرا پشت کی جانب باہر نکلنے کا۔ قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا اور مزید تغیر یہ کیا کہ دروازہ سطح زمین سے کافی بلند کر دیا تا کہ کوئی شخص بدوں اجازت آسانی سے اندر نہ جاسکے۔

زندگی کے آخری دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اسے بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنا دوں۔ لیکن نومسلم لوگوں کی وجہ سے میں احتیاط کرتا ہوں کہ کہیں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آپؐ نے اس میں کوئی تبدیلی نہ فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کا علم تھا چنانچہ جب وہ مکہ مکرمہ پر حکمران ہوئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق از سر نو بیت اللہ کی تعمیر کی۔ لیکن جب وہ شہید کر دیئے گئے تو حجاج بن یوسف اور اس کی حکومت کو چونکہ آپؓ کا ہر فعل ناپسند تھا اور وہ کسی طور یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کا یہ کارنامہ تادیر باقی رہے چنانچہ انہوں نے لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کی نئی تعمیر اپنی خواہش کے مطابق کی ہے۔ اس لیے ہمیں دوبارہ کعبہ کو ویسا ہی بنا دینا چاہئے جیسا حضور ﷺ چھوڑ کر گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بیت اللہ کو گرا کر پھر اسی طرح بنا دیا جیسے قریش نے بنایا تھا۔ اس کے بعد بنی عباس کی حکومت نے اسے از سر نو بیت ابراہیمی کے مطابق بنانے کا اظہار کیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب بار بار بیت اللہ کو منہدم کرنا اور بنانا مستقبل کے بادشاہوں کے لیے بیت اللہ کو کھلونا بنا دینا ہے۔ اس طرح سے ہر بادشاہ اپنی ناموری کے لیے اس کی اس سرِ نو تعمیر کرنا چاہے گا اس لیے اب جس حالت میں ہے اسے اسی حالت میں چھوڑ دینا بہتر ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اہلِ کتاب نے مختلف طریقوں سے بیت المقدس کو بیت اللہ سے قدیم ثابت کرنے کی کوشش کی حالانکہ دنیا کے تمام مؤرخین جانتے ہیں کہ بیت المقدس کی تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی ہے اور اس حقیقت کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کو عصبیت نے اندھا کر رکھا ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ایک حدیث سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مناسب ہے کہ اسے بھی ذکر کر دیا جائے۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا مسجد حرام یعنی کعبہ شریف۔ انہوں نے عرض کیا اس کے بعد کون سی مسجد ہے؟ آپؐ نے فرمایا بیت المقدس۔ پھر دریافت کیا کہ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا چالیس سال کا۔ اس کے عموماً دو جواب دیئے جاتے ہیں اور امکان یہ ہے کہ دونوں صحیح ہوں۔ پہلا یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے پہلے بیت اللہ تعمیر کیا اور اسکے بعد کسی وقت انہی کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر ہوئی۔ یہ دونوں اللہ کے گھر طوفانِ نوح سے منہدم ہو گئے۔ بیت اللہ کی تعمیر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ لیکن بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر فرمایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد دنیا میں تشریف لائے اور دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دونوں گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی تعمیر کیے تھے پہلے بیت اللہ اور پھر بیت المقدس، لیکن بیت المقدس کے مسمار ہونے کے بعد پھر اس کی دوبارہ تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔ کوئی سی بھی صورت رہی ہو اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ بیت ابراہیمی کو قدامت کا شرف حاصل ہے۔

Marfat.com

بیت اللہ کی برکات

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ نے اپنے گھر کو مبارک بھی بنایا ہے اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بھی۔ جہاں تک برکات کا تعلق ہے وہ ظاہری بھی ہیں اور معنوی بھی۔ ظاہری برکات کو تو اس گھر کے وجود سے لے کر آج تک ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھتی چلی آئی ہے کہ مکہ معظمہ ایک خشک جگہ ریگستان میں آباد ہے جس کی زمین اس حد تک بنجر ہے کہ اس میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دعائے ابراہیمی سے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ ہر موسم میں ہر طرح کے پھل، ترکاریاں اور تمام ضروریات اس قدر افراط کے ساتھ موجود رہتی ہیں کہ آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہاں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی اور پھر حج کے ایام میں تو لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے ہزاروں سے متجاوز رہی ہے اور اب تو یہ تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، لیکن تاریخ ہمیں نہیں بتلاتی کہ کسی دور میں بھی وہاں ضروریاتِ زندگی کی کمی کا شکوہ پیدا ہوا ہو۔

یہ بھی تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ عرب کی سرزمین ہمیشہ سے فتنہ و فساد کا مرکز رہی ہے۔ قبائل کی دشمنیوں نے اسے ہمیشہ جہنم بنائے رکھا، لیکن اس کے باوجود اشہر حرم میں بطورِ خاص اور باقی مہینوں میں بطورِ عام قافلہ ہائے تجارت کا آنا جانا اور ہر ملک سے سامان کی آمد و رفت ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جس کی ظاہر بین نگاہ کوئی توجیہ نہیں کرسکتی۔ لیکن حقیقت بین جانتے ہیں کہ یہ مکہ معظمہ میں جو ایک چوکور سادہ سا مکان قبا پہنے کھڑا ہے یہ اس سے عقیدت کی برکات ہیں اور اس کے مالک کی عنایات ہیں کہ اس نے جزیرۂ عرب کے رہنے والوں کو اپنی تمام خرابیوں کے باوجود اس گھر کی برکتوں سے محروم نہیں ہونے دیا۔

جہاں تک معنوی برکات کا تعلق ہے اس میں بعض باتیں تو بالکل واضح ہیں کہ حج اور عمرہ اسی گھر کے ساتھ مخصوص عبادت ہے جس کے اجر و ثواب کی کوئی انتہا نہیں اور پھر اس گھر میں پڑھے جانے والی نماز اور طواف اپنے اندر جو اجر و ثواب رکھتے ہیں وہ بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں اور اس کی وہ روحانی برکتیں جسے صرف اہلِ دل دیکھ سکتے ہیں، ان کا تو کوئی حد و شمار نہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس گھر کی روحانی برکتوں نے جزیرۂ عرب کو کتنا نوازا اور ان کے واسطے سے دنیا کو کیا کچھ دیا۔

بیت اللہ میں واضح نشانیاں

دوسری آیتِ کریمہ میں چند واضح نشانیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن میں سے تین نشانیاں تو اس آیتِ کریمہ میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ کتنی ایسی نشانیاں ہیں جنہیں دیکھنے والی نگاہ دیکھ سکتی ہے۔ آیتِ کریمہ میں متذکرہ نشانیوں کے علاوہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی گھر کی برکت سے اہلِ مکہ کو ہمیشہ مخالفین کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ ابرہہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی افرادی قوت کا مقابلہ پورے جزیرۂ عرب کے بس کی بات نہ تھی اور مزید یہ کہ اس کے ساتھ ایک بہت بڑی تعداد ہاتھیوں کی بھی تھی جس کا عربوں کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ لیکن تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے ذریعے اس عظیم لشکر پر ایسی سنگ باری کرائی کہ اس کا بھرکس نکال کر رکھ دیا اور سوائے اکا دکا آدمیوں کے کوئی شخص زندہ واپس اپنے وطن نہ جاسکا۔

Marfat.com

وہاں امن واطمینان کا عالم یہ رہا ہے کہ وحشی جانور تک حدود حرم میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ بیت اللہ کی جس جانب بارش ہوتی ہے اس جانب کے ممالک زیادہ بارش سے سیراب ہوتے ہیں۔

سید جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے خصائص کبریٰ میں بھی اس کا ذکر فرمایا اور ہر حاجی اپنی نگاہوں سے بھی دیکھ سکتا ہے کہ ہر حاجی تین دن جمرات پر کنکریاں پھینکتا ہے۔ حاجیوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ کروڑوں سے زیادہ تعداد میں یہ کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ ایک ہی دن میں وہاں کنکریوں کے ڈھیر لگ جائیں اور جمرات کنکریوں کے ڈھیر میں چھپ جائیں اور چند سالوں میں وہاں منیٰ کے دوسرے پہاڑوں سے بڑے پہاڑ کھڑے ہو جائیں۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ کنکریاں مارنے والے روزانہ دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک مختصر تعداد کے سوا باقی سب کنکر غائب ہو جاتے ہیں اور وہاں رہ جانے والے کنکر وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کنکر ان لوگوں کے ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ کنکر اٹھانے کے لیے آج کل تو معلوم نہیں گزشتہ سالوں تک تو حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا تو پھر آخر یہ کنکر کہاں چلے جاتے ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ یہ اس کے گھر کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک زندہ معجزہ ہے کہ کنکر اللہ کی جانب سے اٹھا لیے جاتے ہیں۔

آیتِ کریمہ میں بیان کردہ تین نشانیاں

جن نشانیوں کو قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے ان میں سب سے بڑی نشانی ''مقام ابراہیم'' ہے۔ مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی دیواریں اٹھائیں۔ یہ پتھر ''گو'' کا کام دیتا تھا۔ حسب ضرورت اوپر اٹھتا جاتا اور پھر خود بخود نیچے آ جاتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ اس پتھر پر کھڑے ہو کر پتھر چنتے اور دیواریں اٹھاتے تھے۔ اس لیے یہ پتھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں میں پگھل گیا اور آپ کے دونوں قدموں کے نشانات اس پتھر میں ثبت ہو گئے۔ آج بھی وہ پتھر کعبۃ اللہ کے ساتھ موجود ہے۔ پہلے یہ بالکل دیوارِ کعبہ کے ساتھ تھا اب پیچھے ہٹا دیا گیا ہے تاکہ طواف کرنے والوں کو دشواری نہ ہو۔ اس حکومت نے ایک بلوری خول کے اندر اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ وہ بلور اتنا صاف ہے کہ اس سے صاف وہ پتھر اپنی گہرائی سمیت بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پچھلی صدیوں میں چونکہ یہ پتھر باہر رہا تو لوگ برکت کے حصول کے لیے اس میں پانی ڈال کے پیتے، اس پر ہاتھ پھیرتے، اسے چومتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی گہرائی گہری ہوتی چلی گئی۔ اس لیے اس حکومت نے اسے انسانی دسترس سے بچا کر پیتل کی تاروں میں ایک صاف ستھرے بلور کے خول میں بند کر کے رکھ دیا ہے تاکہ لوگوں کے چھونے سے خراب بھی نہ ہو اور لوگ اپنی عقیدت کی آنکھوں کو ٹھنڈک دینے کے لیے آسانی سے دیکھ بھی سکیں۔

دوسری نشانی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ''اس میں جو شخص داخل ہوتا ہے وہ مامون اور محفوظ ہو جاتا ہے''۔ کسی کے باپ کا قاتل بھی وہاں بیٹے کے ہاتھوں غیر محفوظ نہیں ہوتا۔ اس محفوظ ہونے کے حوالے سے شریعت کے احکام یہ ہیں کہ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اسے نہ ستاؤ نہ قتل کرو۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے تو اسے حدودِ حرم میں سزا نہ دی جائے بلکہ اسے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جائے۔ جب وہ حرم سے باہر نکلے تو باہر آنے پر اس پر سزا جاری کی جا سکتی ہے اور جہاں تک تکوینی طور پر اس حفاظت کا تعلق ہے آج تو شائد اس کے مظاہر کم دکھائی دیں لیکن وہ زمانہ جو انسان کی بہیمیت اور بدتہذیبی کا زمانہ ہے اس میں تو ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھ سکتی تھی کہ وہاں

Marfat.com

اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو دیکھ کر بھی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ اس گھر کا ادب ایک ایسی رکاوٹ بن گیا تھا جس کی وجہ سے آدمی کے جذبات بے قابو نہیں ہوتے تھے بلکہ اگر اس کا اندیشہ بھی ہوتا تو ہر شخص اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

تیسری اس کی خصوصیت اور نشانی اس آیتِ کریمہ میں یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص پر جس کے پاس مصارف سفر ہوں اور جس کی صحت اور حالات سفر کی اجازت دیتے ہوں اس پر اس گھر کا حج فرض فرمایا"۔ ایک ایسی سرزمین جس میں دلچسپی کا کوئی ذریعہ نہ ہو، جس میں بظاہر خوبصورتی کا کوئی منظر ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا ہو اور جس کا موسم بھی ہر ملک کے رہنے والوں کے لیے سازگار نہ ہو اور حج کی عبادت بھی بجائے خود ایک مشکل عبادت ہو، لیکن اس کے باوجود ہر سال لوگوں کا دیوانہ وار وہاں پہنچنا اور جو پہنچ نہ سکیں ان کا پہنچنے کے لیے تڑپنا اور وہاں پہنچ کر پروانوں کی طرح اللہ کے گھر کے پھیرے لگانا اور زیادہ سے زیادہ طواف کرنے کی کوشش کرنا، ایک ایسا منظر ہے کہ جس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اس گھر کی خصوصیت ہے جو اللہ نے اس میں پیدا کر دی ہے۔ ایک سیدھا سادھا سا گھر جو قبا پہنے کھڑا ہے اسے دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک اترنے لگتی ہے۔ اس کا تصور کرنے سے دلوں کے جذبات بے قابو ہونے لگتے ہیں۔ اس کے گرد چکر لگانے سے عشق و جنوں کی وارفتگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ملتزم سے چمٹنے سے دل کی کدورتیں دھلتی اور دل میں آسودگی کی شبنم برسنے لگتی ہے۔ اس کے کنویں کا پانی پیتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی کوثر و تسنیم کے جام پی رہا ہے۔ کوئی ممکن ہے یہ سمجھے کہ یہ کیفیتیں مذہب نے پیدا کی ہیں۔ لیکن اسلام کے آنے سے پہلے کی تاریخ کھنگال کر دیکھ لیجیے آپ کو افراط و تفریط ضرور دکھائی دے گی لیکن جہاں تک عشق کی وارفتگی کا تعلق ہے اور اس گھر کی خصوصیات کا تعلق ہے اس میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم دیا گیا تھا کہ آپ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکاریئے کہ وہ اس گھر کا طواف کرنے کے لیے آئیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیران ہو کر کہا تھا کہ یا اللہ یہاں میری آواز سننے والا کون ہے؟ میری آواز تو ٹیلوں میں گم ہو کر رہ جائے گی تو اللہ نے فرمایا تھا کہ تم پکار کے تو دیکھو پھر دیکھنا کہ کس طرح تنگ اور دشوار گزار راستوں سے مریل سے مریل اونٹنیوں پر سوار ہو کر لوگ دیوانہ وار یہاں پہنچتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے سے لے کر جس زمانے کو ہم نہیں جانتے آج تک اس گھر کی کشش اور عقیدت میں اضافہ ہی ہوا ہے کوئی کمی نہیں آئی۔ سچ کہا تھا ریاض خیر آبادی نے۔

کوئی تو بات ہے آخر کو میکدے میں ضرور
جو دور دور سے میخوار آ کے پیتے ہیں

انڈیا کے ایک عمر رسیدہ شاعر سے میں یہ سن کر حیران رہ گیا جو بحری جہاز پر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

کہاں میری قسمت عنایت ہے ان کی سفینے پہ ان کے چلا جا رہا ہوں
ہواؤں کی بخشش لیے جا رہی ہے حرم کی کشش کے مزے پا رہا ہوں

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(اے پیغمبر کہہ دیجیے! اے اہلِ کتاب تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو کچھ تم کر رہے ہو) (۹۸)

Marfat.com

گزشتہ آیات میں قرآنِ کریم نے مختلف پہلوؤں سے اہلِ کتاب پر تنقید بھی کی اور ان کے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا اور پھر ان کے بنیادی سوال کو جس پر ان کی پوری تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مخالفت کا انحصار ہے۔ سوال کا ذکر کیے بغیر چھیڑا ہے اور نہایت پہلو دار طریقہ سے اس کا جواب دیا ہے۔ یہود کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کا وارث کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ کا وہ گھر جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا وہ مکہ معظمہ میں واقع بیت اللہ ہے بیت المقدس نہیں اور وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مرکز بنایا وہیں آخری نبی کی بعثت کے لیے دعائیں مانگیں، وہیں سے آخری امت کے اٹھائے جانے کی التجا کی اور وہی گھر ہمیشہ کے لیے نوعِ انسانی کی ہدایت کا مرکز بنایا، یہ تمام دعوے اور تمام حقائق صحیح نہیں حالانکہ ان تمام حقائق کا ذکر تورات میں موجود ہے۔ یہود نے انہیں غلط ثابت کرنے کے لیے کہیں تحریف کی، کہیں ترمیم کی، کہیں بعض الفاظ کا تلفظ بگاڑا۔ گزشتہ دو آیتوں میں بیت اللہ سے متعلق حقائق کو ثابت کر کے یہود کے تمام دعووں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اب حقیقت میں ان کے پاس کوئی ایسی علمی دلیل نہیں جسے وہ بنیاد بنا سکیں۔ لیکن حقیقت کے اسقدر واضح ہو جانے کے بعد بھی ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ برابر اپنے انکار پر قائم ہیں۔

چنانچہ ان کے اسی انکار پر تنبیہ اور ملامت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر ان سے کہیے کہ تم تو اہلِ کتاب ہو، اُمی عرب جو کوئی علمی اور مذہبی بنیاد نہیں رکھتے وہ جیسی کیسی بھی حرکتیں کریں، انہیں ملامت کرنا مشکل ہے۔ لیکن تمہارے پاس کتاب کی روشنی موجود ہے۔ تم صدیوں سے کتاب اللہ کے وارث ہو اور تمہارے اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے اور تم نے اسے کس طرح بدلا ہے۔ اس کے باوجود تم اگر کفر کا رویہ بدلتے نہیں ہو تو تمہیں ملامت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے اور تم اس بات پر بھی یقین رکھتے ہو کیونکہ اہلِ کتاب ہوتے ہوئے بھی یہ باتیں تمہارے لیے اجنبی نہیں ہیں کہ اللہ ہر جگہ اور ہر وقت ہر شخص کے اعمال سے باخبر ہے۔ سمندر کی گہرائیوں میں کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ صحرا کی وسعتوں میں کوئی پتہ گرتا ہے تو اللہ اس سے واقف ہے۔ کسی درخت پر کوئی کونپل نکلتی ہے تو وہ اللہ کی نگاہوں میں ہے۔ اسی طرح تمہارا ہر عمل اس کے سامنے ہے۔ تمہاری کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی تم اللہ کی آیات سے انکار کی جرأت کیسے کرتے ہو۔ ایک معمولی قوت کے مالک حکمران کی دار و گیر سے کوئی محکوم بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ اگر اسے میرے کرتوتوں کی خبر ہو گئی تو پھر میری خیر نہیں۔ لیکن تم اللہ جیسے حکمران جس کی حکومت کی گرفت میں پوری کائنات جکڑی ہوئی ہے کی باز پرس سے اس حد تک بے نیاز ہو کہ اسی کی کتاب کو تم نے نشانہ بنا رکھا ہے اور اسی کے پیغمبر تمہارے مشقِ ستم بنے رہتے ہیں۔ سوچ لو کل کو ان باتوں کا کیا جواب دو گے؟

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تم اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو، ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ تم اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہو حالانکہ تمہیں گواہ بنایا گیا تھا اور اللہ باخبر ہے اس سے جو کچھ تم کرتے ہو) (۹۹)

Marfat.com

مزید شرم دلائی گئی ہے

گزشتہ آیتِ کریمہ کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ تم نہ صرف خود اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو بلکہ تمہاری جسارتوں کا عالم یہ ہے کہ تم ہر ایمان لانے والے شخص کو اللہ کے راستے سے روکنے کی کوشش کرتے ہو۔ سادہ دل مومنوں کے دلوں میں تم طریقے طریقے سے بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ان کے دلوں میں عجیب وغریب شبہات پیدا کرتے ہو۔ نئے نئے ایمان لانے والے چونکہ ابھی زیرِ تربیت ہیں اور ان کی اسلامی معلومات بھی ابھی تک بہت محدود ہیں، تم اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنی علمی برتری سے مرعوب کرکے ان کا راستہ بدلنا چاہتے ہو۔ تمہارے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ تم مسلمانوں کے سامنے ایسی اڑچنیں کھڑی کردو جن سے وہ آسانی سے نکل نہ سکیں اور تم یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس بات کو بھول جاتے ہو کہ تمہاری اصل حیثیت شہدائے حق کی ہے۔ وہ ایک ہی حق ہے جو کبھی ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوا، کبھی موسیٰ علیہ السلام پر، کبھی عیسیٰ علیہ السلام پر اور آج وہی حق محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ تم صدیوں تک اس حق کی شہادت اور گواہی پر مامور رہے ہو۔ تمہیں اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے نہ صرف حق کو قبول کرنا تھا بلکہ اس کی گواہی بھی دینا تھی اور تمہاری کتاب نے اس گواہی کے لیے تم سے عہد بھی لیا تھا۔ لیکن تمہاری سرکشی اور نقضِ عہد کی کیا توجیہ کی جائے کہ تم سب کچھ بھول چکے ہو اور تمہیں اسلام کی دشمنی نے ہر چیز سے بیگانہ کرکے رکھ دیا ہے۔ اب تمہارے سامنے اللہ کے رسول کی مخالفت کے سوا اور کوئی ہدف نہیں۔ لیکن یہ مت بھولو کہ جو کچھ تم کررہے ہو وہ اللہ سے ہرگز مخفی نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ○

(اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے اہلِ کتاب کے ایک گروہ کا تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے) (۱۰۰)

مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے بچنے کی تاکید

اہلِ کتاب کو ملامت کرنے اور حجت تمام کردینے کے بعد اب خطاب مسلمانوں سے ہورہا ہے اور ان خطرات سے آگاہ کیا جارہا ہے جو اہلِ کتاب کی طرف سے انہیں پیش آسکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کا مسلمانوں پر حملہ دوطرفہ تھا۔ ایک طرف تو وہ ان کی سادگی اور اُمّی ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے بارے میں مسلسل بدگمانی پیدا کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے اور مختلف قسم کے سوالات ان کے دماغوں میں اٹھاتے رہتے تھے اور دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اوس وخزرج کی ساری کمزوریوں کا سبب ان کی آپس کی بے اتفاقی تھی۔ عرصۂ دراز سے یہود نے اوس وخزرج کو جنگ کی آگ میں جھونک رکھا تھا۔ طریقے طریقے سے وہ دونوں قبیلوں کی جنگ کے لیے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس غرض کے لیے انہیں قرض بھی دیتے اور بعض دفعہ خود بھی مدد کرتے اور اسی مقصد کے لیے ان سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کررکھے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک یہ آپس میں لڑتے رہیں گے ہم ان کی طرف سے محفوظ رہیں گے اور یہ اپنی عدمِ اتفاق کے باعث قرض لینے پر ہمیشہ مجبور ہوں گے اور اس طرح سے ہمارے دست نگر رہیں گے۔ مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف

Marfat.com

آوری کے بعد جب ان دونوں قبیلوں نے اسلام قبول کرلیا تو اسلامی اخوت ان کے تمام انتسابات پر غالب آ گئی۔ اس سے ان دونوں قبیلوں میں ایک ایسی وحدت پیدا ہوئی جس نے انہیں سیسہ پلائی دیوار بنا دیا۔ یہود کے لیے یہ بات نہایت پریشان کن تھی۔ اب اگر ایک طرف وہ انہیں اسلام سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے تھے تو دوسری طرف ان کے اس اتفاق واتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی تدبیریں سوچتے تھے۔ روح المعانی میں ابن اسحاق کی روایت سے اور ایک جماعت نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی ساس بن قیس مسلمانوں سے بہت کینہ رکھتا تھا۔ اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو ایک جگہ اکٹھے بیٹھے دیکھا تو حسد سے بے چین ہوگیا اور ان میں تفریق ڈالنے کی فکر میں لگ گیا۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک شخص سے کہا کہ ان دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک بڑی جنگ عرصہ دراز تک رہ چکی ہے اور اس کے متعلق فریقین کے فخریہ اشعار موجود ہیں، وہ اشعار ان کی مجلس میں پڑھے جائیں۔ چنانچہ اشعار کا پڑھنا تھا کہ فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں جذبات کی آندھی چلنے لگی۔ یہاں تک کہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ تلواریں بے نیام نہ ہو جائیں۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ ان کے پاس تشریف لائے اور آپؐ نے دونوں قبیلوں کے مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعے اتفاق واتحاد کی دولت عطا فرمائی ہے، یہ کیسی جہالت ہے کہ تم پھر اسی اختلاف کی دلدل میں دھنس جانا چاہتے ہو۔ چنانچہ جانبین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ یہ ایک سازش اور شیطانی حرکت تھی۔ چنانچہ ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم نے اہلِ کتاب کے اس گروہ کو پوری طرح نہ پہچانا جو تمہاری دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھا ہے اور تم ان کی باتوں میں آتے رہے اور محض اس لیے ان کی بات سنتے رہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی جانب سے کتابِ ہدایت دی گئی تھی تو پھر یاد رکھو وہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ تم جنہیں اہلِ کتاب سمجھ کر حسن ظن رکھتے ہو وہ بگاڑ کی اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے کمینی سے کمینی حرکت کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس آیت میں قرآنِ کریم نے یہود کے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے پوری یہودی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ورنہ دشمن کے بارے میں اس حد تک احتیاط انسانی جذبات سے بہت دور کی بات ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باقی قوم یہود مسلمانوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انہی میں سے کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا تھا، لیکن ان کی تعداد بڑی محدود تھی۔ یہود کا عام مزاج اگرچہ اسلام دشمنی پر مبنی تھا، لیکن بگاڑ اور زوال کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ عام افرادِ قوم بے حسی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اگر نئی روشنی کو قبول نہیں کرتے تو اٹھتے ہوئے انقلاب کا راستہ روکنا بھی ان کی بے چینی کا باعث نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کھانے کمانے میں لگے رہتے ہیں، البتہ ان کا وہ طبقہ جو قوم کو لیڈ کرتا ہے اس کے اندر یقیناً اسلام دشمنی ایک بحران کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ یہاں فریق کے لفظ سے وہی گروہ مراد ہے اور وہی گروہ اس قوم کا نمائندہ بھی ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ Think

(اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم پھر کفر کرنے لگو؟ حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کے رسولؐ موجود ہیں اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ پر) (101)

Marfat.com

مسلمان خود آگاہی سے کام لیں

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہود کا حملہ دو طرفہ تھا۔ اسلام کے بارے میں وسوسہ اندازی اور اوس وخزرج میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے کی کوشش۔ نئے نئے مسلمان ان دونوں کوششوں کا اثر قبول کر رہے تھے۔ شانِ نزول میں جس طرح بتا گیا ہے کہ ایک دفعہ تو دونوں قبیلوں کے درمیان تلواریں کھنچ گئی تھیں۔ اگر حضور بروقت نہ پہنچ جاتے تو نہ جانے کیا نتائج نکلتے۔ اسی کو اس آیتِ کریمہ میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم پر پوری طرح ابر کرم چھایا ہوا ہے۔ اللہ کی آیات رحمت کی بوندیں بن کر برس رہی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی مینارۂ نور کی طرح تمہارے درمیان موجود ہیں۔ تمہارے اختلافات کے شعلوں کو یہ ابر رحمت بجھا چکا ہے اور حق کی روشنی تمہاری جہالت کی تاریکیوں کو ختم کر چکی ہے۔ اس کے باوجود کیا یہ ممکن ہے کہ تم پھر کفر کا راستہ اختیار کرو۔ ان کی باتوں میں آ جاؤ یا پھر تمہارے اتفاق واتحاد میں دراڑیں پڑ جائیں۔ اس آیت پڑھتے ہوئے عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ اسلام کے ابر رحمت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ اللہ کی وہ دولت ہے کہ جس کسی نصیب ہو جاتی ہے وہ زندگی کی بھول بھلیوں سے نجات پا جاتا ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں جس طرح اتفاق واتحاد کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اختلاف وانتشار کو جس طرح کفر سے تعبیر کیا گیا ہے یہ انتہائی قابلِ توجہ بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فکری وحدت انسان کو صراطِ مستقیم پر ضرور چلاتی ہے، لیکن اگر اتفاق واتحاد کے ذریعے قومی اور دینی وحدت میسر نہ آئے تو امتیں سیاسی اور قوت سے محروم ہو جاتی ہیں اور یہ وہ حادثہ ہے جس کے بعد دین بھی سہارا نہیں بنتا، نہ صرف ملک ہاتھ سے نکلتے ہیں بلکہ ہر چیز قصہ پارینہ بن جاتی ہے۔ انیسویں صدی پر نگاہ ڈالیے برصغیر پاک وہند میں ملت اسلامیہ پر جو قیامت ٹوٹی وہ صرف اس بات کا نتیجہ تھا کہ مغرب کے عیسائیوں نے مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا تھا اور شرقِ اوسط اس لیے تباہ ہوا کہ وہاں کے فرمانرواؤں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اس طرح اپنے وقار کا جنازہ نکالا۔ مسلمانوں نے جب بھی اغیار پر اعتبار کر کے اپنی صفوں میں دراڑیں پیدا کیں تو انہیں ہمیشہ روح فرسا حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسی حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ صدیوں سے اس پر شہادت دے رہی ہے۔

مسلمانوں کو خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے اس سے بچنے کی تدبیر بھی بتائی گئی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ کو مضبوطی سے تھام لو۔ اللہ کی ذات تو ایسی نہیں کہ جسے پکڑا اور تھاما جا سکے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ کی رسی یعنی اس کے دین اور اس کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ سے اپنا تعلق مضبوط کر لیتا ہے وہ دینی اخوت ومحبت کو تمام انتسابات پر ترجیح دیتا ہے اور اللہ کا ہر تعلق اس کے سند اور اتھارٹی بن جاتا ہے۔ تو اللہ اسے ایک ایسے سیدھے راستے پر چلاتا ہے جس میں کہیں کھائیاں ہیں، نہ پر پیچ راستے جن میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہو۔ اس اعتصام باللہ کی مزید حقیقت اگلی آیتِ کریمہ میں کھولی گئی۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا
تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا
وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ
عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ
يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ
لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ ۙ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
ابْيَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْھَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ
تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

Marfat.com

رکوع: ۱۱۔ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو ○ اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ پاجاؤ ○ اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو خیر کی طرف بلائے جو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ○ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو پراگندہ ہو گئے اور جنہوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے ○ جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں ○ اور جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے ○ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا ○ اور اللہ ہی کے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور سارے معاملات اللہ کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں) (۱۰۲ تا ۱۰۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو) (۱۰۲)

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کو اہلِ کتاب کی طرف سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرمائی گئی اور ان کے خطرناک عزائم سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دوسری آیت میں یہ فرمایا کہ جہاں تک رہنمائی اور تربیت کا تعلق ہے تمہارے بگڑنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ شب و روز تم میں اللہ کی کتاب پڑھی جاتی ہے اور تربیت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمہارے اندر موجود ہے۔ لیکن اس سروسامان کے ہوتے ہوئے بھی تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اہلِ کتاب کی سازشوں سے بچنے اور گمراہی سے دور رہنے کے لیے ''اعتصام باللہ'' وہ ذریعہ ہے جس سے ایک مومن میں حقیقی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر طرح کے برے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اعتصام باللہ کی حقیقت

اب اس آیتِ کریمہ میں ''اعتصام باللہ'' کی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ ''اللہ کو مضبوط پکڑنا'' ایسا نہیں ہے جیسے ہم کسی محسوس چیز پکڑ لیتے ہیں کیونکہ اللہ کی ذات نہ حواس میں آسکتی ہے نہ عقل کی گرفت میں۔ اس کو پکڑنے کا معنی اس کا تقویٰ اختیار کرنا ہے۔ تقویٰ کا معنی ''اللہ سے ڈرنا''۔ لیکن اس ڈرنے سے مراد وہ ڈر اور خوف نہیں جو کسی ڈراؤنی چیز سے ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی ذات تو سرتاپا جمال ہے۔ انسان زندگی بھر اس کی رحمت کے سائے تلے جیتا ہے، اسی کی ربوبیت کے فیضان سے زندگی گزارتا ہے اور اسی کی نعمتیں انسان کے گردوپیش میں

Marfat.com

وقت اس کے احسانات کی یاد دلاتی ہیں۔ ایک ایسی ذات جس کے احسانات کے سامنے انسان سر نہ اٹھا سکے اور جس کی رحمت کے بغیر ایک سانس لینا بھی ناممکن ہو، وہ یقیناً ڈرنے کی نہیں، پیار اور محبت کرنے کے قابل ذات ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے صاحب ایمان لوگوں کی یہ نشانی بتائی ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں بار بار اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے تو یہ ڈرنا دراصل اس کی ذات سے نہیں بلکہ اس کی ناراضگی سے ہے۔ جیسے ایک محبّ اپنے محبوب سے انتہا درجے کی محبت کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر وقت اس کا دل ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں میری کسی بات سے میرا محبوب ناراض نہ ہو جائے، اللہ سے ڈرنا بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔ البتہ! ہر شخص اللہ سے محبت میں بھی یکساں نہیں اور نتیجتاً اس کے تقویٰ میں بھی برابر نہیں۔ جس درجے کا اللہ سے تعلق ہوگا اسی درجے کا اس کے اندر تقویٰ ہوگا۔ شائد اسی لیے اہلِ علم نے تقویٰ کے تین درجات بیان کیے ہیں۔ سب سے ادنیٰ درجہ تو کفر و شرک سے بچنا ہے۔ یہ تقویٰ کا کم سے کم معیار ہے کیونکہ یہ تقویٰ تو ایسے شخص کو بھی نصیب ہو سکتا ہے جس کی زندگی سراسر گناہ اور معصیت میں گزرتی ہے کیونکہ ایک گنہگار آدمی بھی اگر عقل سلیم سے محروم نہیں ہوا تو وہ بھی کبھی اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ تقویٰ کا دوسرا درجہ جو عام مسلمانوں سے مطلوب ہے وہ ہر اس چیز سے بچنا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ قرآن و سنت میں جس تقویٰ پر زور دیا گیا ہے اور جس کے فضائل و برکات بیان کیے گئے ہیں وہ اسی تقویٰ سے متعلق ہیں۔ تقویٰ کا تیسرا درجہ جو تقویٰ کا سب سے اعلیٰ مقام ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام اور اللہ کے خاص بندوں کو نصیب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دل کو غیر اللہ کی ہر آلائش سے بچایا جائے اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا کی طلب سے آباد رکھا جائے۔ تقویٰ کا یہ آخری درجہ اگرچہ عام مسلمانوں کے لیے بہت مشکل ہے لیکن اللہ سے محبت اور اس کا تعلق ایسی عظیم نعمت ہے کہ جس کے حصول کے لیے بڑے سے بڑا ہدف بھی مقرر کر دیا جائے تو ناروا نہیں۔ ایک مسلمان کا ہدف یہی تیسرے درجے کا حصول ہونا چاہئے۔ لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ دوسرے درجے کا تقویٰ مسلمانوں سے قبول کر لیتا ہے۔

یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ انسان اپنے اعمال کا جو بھی خاکہ بنا لیتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے کسی نہ کسی مزاج پر منتج ہوتا ہے کیونکہ جس طرح اعمال بنیادی احساسات کا نتیجہ ہوتے ہیں اسی طرح اعمال بھی نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہتے اور ان کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے اندر ایک مزاج اور ایک ذوق پیدا کر دیتے ہیں جس کے بعد انسان سے خود بخود ان اچھائیوں اور خوبیوں کا ظہور ہوتا ہے جو تقویٰ کی اصل شناخت ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک چشمہ پانی کی ایک مقدار جمع ہو جانے کے بعد خود بخود ابلتا ہے اور ایک آبشار خود بخود گرتی ہے اسی طرح انسانی خصائص کا ظہور بھی ایک خاص وقت میں پہنچ کر ایک ایسی صورت اختیار کر جاتا ہے جسے یہاں حَقَّ تُقٰتِہٖ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی جو تفصیل حضرت عبداللہ ابن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے وہ میری اس گزارش کی عکاس معلوم ہوتی ہے اور اس سے صحیح بات کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

حَقَّ تُقٰتِہٖ هُوَاَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَيُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَيُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرُ (بحر محیط)

(حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے، کوئی کام اس کی اطاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے، کبھی بھولا نہ جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے، کبھی ناشکری نہ کی جائے)

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وضاحت میں نہ صرف تمام تقویٰ کے مدارج کا ذکر آ گیا ہے بلکہ اسے ایسے آسان طریقے اور سہل الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ اس سے بہتر تعبیر ناممکن دکھائی دیتی ہے لیکن اللہ کا ایسا تقویٰ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی ذات اور اس کی صفات کا مکمل استحضار نصیب نہ ہو۔ بڑے سے بڑے لالچ میں اس کی رحمتیں نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں اور بڑے سے بڑے خوف میں اس کی قدرتیں کبھی بھولنے نہ پائیں۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو جائے تو بھی اس کے سہارے سے کبھی اپنے آپ کو الگ نہ سمجھے۔ ہزار تنہائیوں میں گھر کر بھی اسے یقین ہو کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ تعلق اتنا محکم، اتنا پائیدار اور اس قدر مستقل ہے کہ اس سے زندگی کا کوئی لمحہ بھی باہر نہیں۔ میں نے جیسے عرض کیا کہ تقویٰ درحقیقت اللہ کی محبت سے پھوٹتا ہے اور اللہ کی محبت تو بہت عظیم چیز ہے، عام محبتیں بھی جزوقتی نہیں ہوتیں۔ وہ عاشقِ صادق کے پورے وجود اور تمام احساسات کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ عاشق کی سوچ اور اس کے اعمال اسی محبت کے اسیر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ وہ چاہے بھی تو اس سے الگ ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

دریچے بند کر کے سونے والو
محبت عمر بھر کا رتجگا ہے

اسی لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ تمہاری موت بھی مسلمان ہونے کی حالت میں آنی چاہئے کیونکہ جب زندگی کا کوئی لمحہ اس تعلق سے آزاد نہیں تو اس زندگی کا خاتمہ اس سے آزاد کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ موت تو آدمی کے اختیار میں نہیں، وہ تو کسی حال میں بھی آ سکتی ہے۔ لیکن یہ محض وہم ہے حقیقت وہی ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ

كَمَا تُحْيُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ

(جس حالت میں تم اپنی زندگی گزارو گے اسی پر موت آئے گی اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کیے جاؤ گے)

جن احادیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک آدمی جنتیوں جیسے اعمال کرتا ہے، لیکن آخر عمر میں جہنمیوں جیسے اعمال کرنے لگتا ہے اور اس طرح سے جہنمی ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک مومن کو اپنا جائزہ لینے کی تلقین ہے۔ جو شخص اپنے بارے میں لاپرواہی کا شکار نہ ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بلاوجہ اسے کسی کھائی میں گرا دے۔ اس لیے جب ایک آدمی تقویٰ کی زندگی گزارنے کا عزم کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے موت بھی ایک متقی کی عطا فرماتے ہیں اور ایک متقی کی موت کو ہی یہاں مسلمان کی موت قرار دیا گیا ہے کیونکہ مسلم ہونا درحقیقت تقویٰ کی ایک تعبیر ہے۔ مسلم کا معنی ہے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینے والا۔ تو جس آدمی نے اپنے احساسات، اپنی صلاحیتیں، اپنا مال و دولت، اپنا عہدہ و منصب، حتیٰ کہ اپنی زندگی اور موت بھی اللہ کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد تقویٰ کا اور کونسا مقام باقی رہ جاتا ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں تقویٰ کی ایک دوسری تعبیر اختیار کی گئی جس سے تقویٰ کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تقویٰ کوئی خیالی چیز نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کو صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کا نام ہے اور اسی کا دوسرا نام اسلام ہے اور یہ اسلام ہی وہ ذریعہ ہے جو ہمیں اہلِ کتاب کی سازشوں اور ان کے برے ارادوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

Marfat.com

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ پاجاؤ) (۱۰۳)

دو ہدایات: (۱) اعتصام باللہ، (۲) اتفاق واتحاد

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنے، پھر اسے اجتماعی صورت دے کر ایک مضبوط قوت بنانے کے لیے دو ہدایات دی گئی ہیں۔ پہلی ہدایت تو یہ ہے کہ تم اگر واقعی اپنا تعلق اللہ سے پیدا کرنا چاہتے ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمان رہنے کے لیے اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے تعلق پیدا کرنے اور پھر اس کو ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے اللہ نے تمہیں ایک بہت بڑی دولت عطا فرمائی ہے اور اسی کو تمہارے قیام وبقا کی ضمانت ٹھہرایا ہے۔ وہ دولت وہ ہے جسے یہاں حَبْلِ اللّٰهِ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حَبْل کا معنیٰ ہے ''رسی''۔ اپنے اس معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ تعلق اور ربط کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے کیونکہ رسی دو چیزوں میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات سے براہِ راست قرب کا اگر کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے تو صرف وہ ہوسکتا ہے جو اس کی اپنی صفت ہے قرآنِ کریم کلام اللہ ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآنِ کریم اللہ کی صفت ہے۔ اللہ جیسی ذات جو زمان و مکان اور جسم کی احتیاجات سے بھی پاک ہے اس کے ساتھ وابستگی اور قرب اس کی صفت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ یہاں اسی صفت یعنی قرآنِ کریم کو حَبْلِ اللّٰهِ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اسی کو تھامنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابوسعید خدری کے واسطے سے ایک روایت نقل کی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدِ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے)

جس طرح رسی دو چیزوں کو آپس میں جوڑتی ہے اسی طرح قرآنِ کریم وہ عظیم دولت ہے جس سے وابستگی اللہ سے وابستگی اور قرب کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآنِ کریم سے وابستگی کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ اسے اللہ کی کتاب سمجھ کر اور اس کا کلام جان کر اسے ادب سے چوما جائے اور گھر کے بلند طاق پر اسے سجا کے رکھا جائے بلکہ اس رسی کو پکڑنے کا مفہوم وہی ہے جسے سابقہ آیات میں تقویٰ اور اسلام سے تعبیر کیا

Marfat.com

گیا ہے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ اللہ سے ٹوٹ کے محبت کرو اور اس کی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے دل و جان سے اسے چاہو تو اپنے دل کو اسی سے آباد کرو، اپنی فکری جہتوں کو اسی کی تعلیم کی روشنی میں متعین کرو، زندگی کا ہر فیصلہ اسی کی راہنمائی سے کرو، اس کے ایک ایک حکم کی اطاعت اس طرح کرو جیسے محبوب کی اداؤں اور احکام کی اطاعت اور قدر کی جاتی ہے۔ ہر وقت اسی کی رضا مندی کے حصول میں لگے رہو اور اس کی ناراضگی سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہو۔ اس نے اپنی کتاب میں جو قانونِ شریعت دیا ہے اس کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کماحقہ نافذ کرو اور تمہاری زندگی اور موت اسی اللہ رب العالمین کے احکام کی اطاعت کی آئینہ دار ہو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اب جبکہ تم ایک امت بن چکے ہو اس لیے انفرادی طور پر تمہاری اطاعت اور فرمانبرداری اس رسی کو پکڑنے کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ اب ضروری ہے کہ تم سب مل کر اس رسی کو تھامو۔ یعنی امتِ مسلمہ میں باہمی ربط و ضبط اس اخلاص اور وفا کا عکاس ہونا چاہئے جس سے معلوم ہو کہ اس امت کا ایک ایک فرد اللہ کی رسی کو اس قدر مضبوطی سے پکڑ چکا ہے کہ اسی کی رہنمائی میں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ سوچتے ہیں تو اسی کی فکر کے مطابق، جیتے ہیں تو اسی کے احکام کے سائے میں اور اسی کی قوت کا سامان بن کر اور مرتے ہیں تو اسی کے حفظ و بقا اور اسی کی سربلندی کے لیے۔ ایسی صورتِ حال میں اس بات کا تصور بھی گناہ ہے کہ امت کی اس مضبوط دیوار میں کوئی دراڑ پڑے، ان میں کسی طرح کی عصبیت سر اٹھائے، یہ قرآن کے دیے ہوئے اہداف سے ہٹ کر کوئی اور ہدف اپنے سامنے رکھے۔ ان کا ضابطۂ حیات قرآن کے علاوہ کوئی اور ہو کیونکہ یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس نے ان کے صدیوں کے اختلافات کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہی وہ اللہ کا عظیم احسان ہے جس نے ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔ یہ اختلاف و انتشار کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑے اس میں کودنے ہی والے تھے کہ اللہ کی رحمت نے انہیں سہارا دے کر بچا لیا۔ دریا کے کسی بند کا ٹوٹ جانا اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا قوموں کا انتشار خطرناک ہوتا ہے اور ٹوٹے ہوئے بند کو باندھ دینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا مختلف قبیلوں اور قوموں کو ایک شیرازے میں پرونا۔ لیکن اللہ کی اس رسی نے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ راہنمائی نے، اللہ کی تائید و نصرت سے وہ کام کر دکھایا جو کسی کے بس کا نہ تھا۔ اب حال یہ ہے کہ کل کے دشمن جو ایک دوسرے کے نام لینے کے روادار نہ تھے اور جو ایک دوسرے کا خون پی کر خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو تباہ کر کے ٹھنڈی سانس لیتے تھے آج آپس میں بھائی بھائی بن گئے ہیں۔ جنگِ بدر میں چشمِ فلک نے یہ حیرت انگیز منظر بھی دیکھا کہ میدانِ جنگ میں جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف، چچا ایک طرف تھا تو بھتیجا دوسری طرف، بھائی بھائی کے مقابل کھڑا تھا، ماموں بھانجے کا خون بہانے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ تمام عربی عصبیتیں، قبیلوں کے انتسابات، حسب و نسب کی رعونتیں سب اسلامی اخوت کے سامنے پامال ہو کر رہ گئی تھیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ جب قیدیوں کے معائنے کے لیے نکلے تو ایک انصاری صحابی کو دیکھا کہ وہ ان کے حقیقی بھائی کی مشکیں کس رہا تھا۔ تو آپ نے انصاری صحابی سے کہا کہ اسے کس کر باندھیے کہیں بھاگ نہ جائے۔ بھائی نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا مصعب! میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تمہارا خون اس قدر سفید ہو گیا ہے۔ تم میرے بھائی ہو کر میری مشکیں کسوا رہے ہو۔ حضرت مصعبؓ نے نہایت تحمل سے جواب دیا کہ تم میرے بھائی نہیں ہو، میرا بھائی وہ ہے جو تمہیں باندھ رہا ہے۔ اسی اسلامی اخوت نے مسلمانوں کو مضبوط قوت میں بدل دیا۔ اسی کا حوالہ دے کر فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر یہ حیرت انگیز تبدیلی قرآنِ کریم سے وابستگی کے نتیجے میں آئی ہے۔ دیکھنا اس رسی کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دینا اور آپس میں کبھی الگ الگ ہونا۔ تفرقے کا شکار نہ ہونا۔ لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہے جب تک تم اللہ کی کتاب کی راہنمائی میں اللہ سے اپنا تعلق مضبوط رکھو گے۔

Marfat.com

انسان کی فکری استقامت کیلئے مستقل نگہداشت ضروری ہے

انسان کے اندر جس طرح اللہ نے نیکی کا ملکہ رکھا ہے اور اس کی فطرت نیکی کی طرف میلان رکھتی ہے اور حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فطرت اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری چاہتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر خواہشات بھی رکھی گئی ہیں۔ برائی کے جذبات بھی رکھے گئے ہیں۔ بری باتوں سے متاثر ہونا اور برائی کی دعوت کو قبول کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ماحول بھی اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ جس طرح اچھے اثرات کو قبول کرتا ہے اسی طرح برے اثرات کو بھی قبول کرتا ہے۔ ان تمام احساسات اور ملکات کو دیکھتے ہوئے یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ انسانی معاشرہ چاہے کتنا بھی ہدایت یافتہ ہو اگر اسکی باقاعدہ نگرانی نہ ہو اور اس میں نیکی کی قوتیں مسلسل کام نہ کریں اور برائی کی قوتوں کو روکنے کا عمل جاری نہ رہے تو کسی بھی معاشرے کے گمراہ ہوجانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اندلس کو جن مسلمانوں نے فتح کیا تھا ان کی حمیتِ اسلامی، اخوتِ دینی، جذبۂ جہاد، نیکی کی طرف میلان اور اسلامی احکام کی پابندی میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔ لیکن انہی لوگوں کی اولادیں رفتہ رفتہ غلط ماحول سے متاثر ہوئیں، حسب ونسب کے انتسابات جاگنا شروع ہوئے، مادی زندگی روحانی زندگی پر غالب آنے لگی اور ایک وقت آیا کہ جنہوں نے ایک محدود تعداد میں ہوتے ہوئے کتنی بڑی اکثریت پر غلبہ پایا تھا اب وہ خود بری طرح شکست وریخت کا شکار ہوئے۔ وہ جو بھی ایک جھنڈے تلے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوتے تھے آج وہ بری طرح انتشار وافتراق کا شکار ہوئے اور بالآخر صدیاں حکومت کرنے کے بعد اس طرح وہاں سے نکالے گئے کہ صدیوں تک مسلمان کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ اسی طرح کی اور مثالیں مختلف ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اگر امتِ مسلمہ کو راہِ راست پہ رکھنا ہے اور امت مسلمہ کو ایک زندہ قوت کے طور پر اپنا رول ادا کرنے کے قابل رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ان کی فکری اور عملی راہنمائی اور نگہداشت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ اس لیے اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو خیر کی طرف بلائے جو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں) (۱۰۴)

مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کو ہر طرح کی خرابی سے بچانے کے لیے ایک ایسی جماعت، ایک ایسے گروہ یا ایک ایسے ادارے کا وجود عمل میں لائیں جس کے دو کام ہوں۔ (۱)......دعوت الی الخیر۔ (۲)......امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

اگر تو مسلمانوں کی حکومت اسلامی حکومت ہو تو اس کا شرعی فریضہ ہے کہ اسلامی زندگی کے احیاء کے لیے ایسے ادارے کا تقرر کرے اور اگر اسلامی حکومت نہ ہو، لیکن مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو تو پھر مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طور پر اس ضرورت کو پورا کریں، حکومت کی سطح پر تو وہ نہیں کرسکتے، البتہ! رفاہی اداروں یا N.G.Os کی طرح کچھ اہلِ علم اٹھیں اور اپنی بساط کی

Marfat.com

حد تک اس دینی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جن میں پہلا کام دعوت الی الخیر ہے یعنی انہیں اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں اور خیر کے ساتھ ان کا تعلق باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ خیر کیا ہے؟ ابن کثیر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلے میں ایک ارشاد نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَلْخَیْرُ ھُوَ اِتِّبَاعُ الْقُرْاٰنِ وَسُنَّتِیْ (یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ علمائے کرام اور علم دوست لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ہمیشہ اس ضرورت کا احساس دلاتے رہیں کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان وہ ہوتا ہے جو قرآن وسنت کی پیروی کرے۔ اس لیے اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں بہر صورت قرآن وسنت کی پیروی کرنی چاہئے۔ تمہاری زندگی کا کوئی عمل بھی اس کے خلاف نہ ہو۔ قرآن اللہ کی کتاب اور سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا وسیع نظام زندگی ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلے پر بحث کی ہے۔ مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہیں بغیر رہنمائی کے نہیں چھوڑا گیا بلکہ محفوظ اور منضبط راہنمائی ہر وقت ان کی دسترس میں ہے۔ ان کی حفاظت کا اللہ نے خود ذمہ لیا ہے۔ البتہ! مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے سیکھنے سکھانے کا انتظام کریں، لوگوں کو اس کی طرف بلائیں، اس کی ترغیب دیں اور کہیں بھی اس کا احساس نہ ہونے دیں کہ مسلمانوں کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کوئی ضابطۂ حیات نہیں۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ دین کا وہ حصہ جس کا تعلق دین کی بنیادی باتوں سے ہے۔ مثلاً وہ عقائد جنہیں مانے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہوتا۔ وہ احکام جن کی بجا آوری کے بغیر اسلامی زندگی وجود میں نہیں آتی اور وہ اخلاق جنہیں اختیار کیے بغیر ایک مسلمان میں اسلامی تہذیب پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ حقوق وفرائض جن کا تعلق انسانوں کے آپس کے معاملات سے ہے، یہ دین کا وہ بنیادی حصہ ہے جس کا جاننا ہر مسلمان پر ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے لازمی ہے۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف مراحل میں ان بنیادی باتوں سے ہر مسلمان کو باخبر کریں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں پہلی جماعت سے ذہنی سطح کے مطابق ان تمام شعبوں کی ابتدائی باتوں کی تعلیم شروع ہو جانی چاہئے۔ پھر درجہ بدرجہ علمی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت بھی بلند ہوتی جانی چاہئے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ہر بچہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بہرہ ور ہونا چاہئے کیونکہ میٹرک کی عمر تک بچہ بلوغ کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کی مکلف زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی آئندہ زندگی کا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ اللہ کے سامنے جوابدہی کے لیے پیش ہوگا۔ کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم میں انہی بنیادی باتوں کی سطح اور بلند ہو جانی چاہئے۔ عقائد پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس کے ازالے کے لیے ذہنوں کو تیار کیا جانا چاہئے۔ تہذیب کے بنیادی مسائل علمی حیثیت سے دل ودماغ میں اتارے جانے چاہئیں اور جن مسائل کا تعلق بلوغ کے بعد شروع ہوتا ہے خاص طور پر عائلی اور عملی زندگی میں اس کی تعلیم کالج سے شروع کرنی چاہئے۔

قرآن وسنت ہمارے دین وشریعت کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ان کا فہم ہمارے نظام تعلیم کا حصہ بنا دیا جائے۔ لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک امت مسلمہ کے پڑھے لکھے لوگ مکلف ہیں کہ وہ درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا اہتمام کریں اور جدید زبان میں جدید ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے فہم کو آسان بنایا جائے بلکہ ایسے حلقوں کو ایک تحریک کی شکل دے کر محلے محلے اور گھر گھر پہنچا دیا جائے۔ مساجد اس کا مرکز بنیں اور جدید تعلیم یافتہ لوگ اس سے بہرہ ور ہو کر اپنے اپنے اداروں کو اس کے مراکز بنائیں۔ جب اس

Marfat.com

کی ضرورت کا احساس اور اس کی تڑپ دلوں میں اتر جائے گی تو خود بخود اس کے لیے ہر شخص نئے نئے راستے سوچے گا اور امت کی دینی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ امت کی دین سے متعلق وہ ضرورتیں جن کا تعلق قانون یا تہذیب وتمدن سے ہے اور تقابلِ ادیان کی صورت میں جن چیزوں کی ہمیں ضرورت پیش آتی ہے اور معیشت اور معاشرت کی اسلامی بنیادوں کو واضح کرنے کے لیے نئے علوم سے تقابل کی ضرورت پڑتی ہے، یہ اسلام کی وہ ضرورتیں ہیں جن کا تعلق عام آدمی سے نہیں بلکہ اہلِ علم کے خاص دوائر اور قانون اور بعض عمرانی درس گاہوں میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ انہیں رہنمائی مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے علماء تیار کیے جائیں جو ادلۂ شرعیہ کی تفصیلات سے پوری طرح واقف اور ان کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ قرآنِ کریم نے جس طرح عام دینی ضرورتوں کے حوالے سے قرآنِ کریم کو سہل قرار دیا ہے اور ہر شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے اسی طرح اس نے دوسری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دین میں تفقہ پیدا کرنے کا حکم دیا ہے اور ایسے لوگ تیار کرنے کا حکم دیا ہے جو مسلمانوں کی علمی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ارشاد فرمایا:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ
وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ○

(مسلمانوں کے ہر طبقے سے ایک ایسا گروہ کیوں نہ نکلا (جو کسی تعلیمی مرکز میں رہ کر) دین کی سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کو انذار کرتا تا کہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے بچتے)

اس آیتِ کریمہ میں ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگوں کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو دین میں تفقہ پیدا کریں۔ دین میں تفقہ قرآن وسنت کے فہم میں زندگیاں کھپا کر جو گہری نظر پیدا ہوتی ہے اسے کہتے ہیں۔ اس طرح سے وہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے جس کا تعلق مسلمانوں میں قرآن وسنت سے وابستگی اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا کرنے سے ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کی علمی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ امت میں شریعت کی پابندی کو کمزور نہ ہونے دیا جائے اور مسلمانوں کے اعمال و اطوار کو ہر ممکن طریقے سے شریعت کی حدود میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ معروف ہر وہ چیز ہے جو شریعت کی نگاہ میں نیکی ہے اور منکر ہر وہ چیز ہے جو شریعت کی نگاہ میں برائی ہے۔ نیکی کو فروغ دینا اور برائی سے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر اس کا حکم دیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے اس کی تاکید فرمائی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْلَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ
اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ فَلَا يَسْتَجِيْبُ لَكُمْ

Marfat.com

(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا عذاب بھیج دے۔ اس وقت تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو قبول نہ ہو گی)

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ

(تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ اور قوت سے اس کو روک دے اور اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے روکے اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دل میں اس فعل کو برا سمجھے اور یہ سب سے ادنیٰ درجہ کا ایمان ہے)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر لازم ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ تمام احکامِ شرعیہ کے لازم ہونے کے لیے استطاعت اور قدرت ضروری ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی یہی بنیادی شرط ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے دیکھا ہے کہ آپ نے استطاعت پر ہی اس کا دارومدار رکھا ہے۔ دین چونکہ علم ہے اس لیے اس کی سب سے پہلی استطاعت علمی استطاعت ہے۔ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ معروف کیا ہے اور منکر کیا ہے؟ جس آدمی کو یہ بنیادی علم حاصل نہ ہو اس آدمی سے اندیشہ ہے کہ وہ معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھ بیٹھے۔ ایسے شخص پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ ایسے لوگوں کی جہالت سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے دین کے بارے میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

امر بالمعروف کی استطاعت جس طرح علم سے متعلق ہے اسی طرح حالات سے بھی متعلق ہے۔ حالات اگر کسی منکر کو روکنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کے نتیجے میں اگر کوئی ناقابل برداشت ابتلاء پیدا ہو سکتا ہے تو پھر اس پر عمل کرنے میں حکمت کی ضرورت ہے اور یا ایسے وقت کا انتظار کرنا چاہئے جب حالات میں تبدیلی آ جائے۔ ہاں! اگر معاملہ ایسا شدید ہو جائے کہ اگر منکرات پہ ٹوکا نہ گیا اور معروف کو زندہ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو دین کو ناقابلِ بیان نقصان پہنچے گا اور لوگوں پر اس پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے تو پھر خطرات سے کھیل کر بھی یہ فرض انجام دینا چاہئے۔ یہی وہ عزیمت ہے جس کا اللہ کے یہاں بہت اجر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک تو سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں دوسرے سید الشہداء وہ ہوں گے جو جابر اور ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں شہید کر دیے جائیں گے۔

یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ ایسی صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی منکر کا تعلق اجتماعی، آئینی، سیاسی یا حکومتی معاملے سے ہو۔ رہے وہ عام منکرات جو گھروں میں مختلف تقریبات میں پیدا ہوتے ہیں یا فرائض کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں جنم لیتے ہیں یا شرم و حیا کے بند ڈھیلے پڑنے سے نئی نسل میں پیدا ہوتے ہیں، ایسے منکرات کو روکنا تو ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جو کسی بھی ادارے کی سربراہی پر فائز ہے۔

Marfat.com

گھر کا سربراہ یا معاشرے کا سربر آوردہ آدمی تھوڑی سی ہمت سے بہت سے منکرات کو روک سکتا ہے اور برادریوں میں عام لوگ تھوڑی سی رائے عامہ کو منظم کر کے بہت سی برائیوں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جب کہ کسی حد تک عزیمت کا ثبوت دیتے ہوئے یا فکرمندی کی صورت میں بعض منکرات روکے جاسکتے ہوں اور پھر بھی ان کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے اور محض برائی کا اظہار کر کے وقت ٹال دیا جائے تو یہ اضعف الایمان ہے، جس کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اگر معاملے کی صورت یہ ہو کہ سب چھوٹے بڑے بعض برائیوں میں اس لیے شریک ہو جائیں کہ وہ خوشیوں کے اظہار کا ذریعہ ہیں، چاہے اس میں شریعت پر کیسی ہی قیامت گزر جائے اور مسلمانوں کی تہذیب چاہے کتنی مجروح ہو جائے تو ایسی صورتِ حال میں نہی عن المنکر کی بجائے امر بالمعروف کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ترغیب اور آگاہی کے وسائل سے کام لے کر ذہنوں کو پہلے ہموار کرنا چاہئے اور اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شاید دونوں کا موقع پیدا ہو سکے اور یہی وہ بات ہے جس کا یہاں لپیٹ کر حکم دیا جا رہا ہے۔

یہ وہ معاشرہ ہے جو سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے اعتصام باللہ سے کام لیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی فکری اور عملی بنیادیں راسخ ہو جاتی ہیں اور پھر جب کہیں اس میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ان دراڑوں کو کھلنے سے پہلے بند کر دیتا ہے۔ اس معاشرے کا ایک ایک فرد زندہ احساس اور کھلی آنکھوں سے جیتا ہے۔ وہ جس طرح نقصانات کے باقی مظاہر پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے ایک ایک سوتے کو رواں ہونے سے پہلے خشک کر دیتے ہیں اسی طرح وہ عقائد، اخلاق اور عمل کی ہر خرابی کو ایسی ہی فکرمندی کے ساتھ بچانے اور برے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ دنیا میں ان کی کامیابی ان کے گھروں کی آبادی، صحت مند خوراک اور بے میل تعلقات کی صورت میں نظر آتی ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ جو اجر و ثواب دیں گے آج صرف ان کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ○ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو پراگندہ ہوگئے اور جنہوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے ○ جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں ○ اور جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے) (۱۰۵ تا ۱۰۷)

Marfat.com

مسلمانوں کو آگاہی

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کو اہلِ کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور ان کی سازشوں سے بچنے کے لیے جو ہدایات دی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان صراطِ مستقیم پر باقی رہنا چاہتے ہیں اور ان کا پختہ ارادہ ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد جو ایک نیا راستہ اختیار کر چکے ہیں زندگی بھر نہایت اخلاص کے ساتھ اسی پر چلتے رہیں۔ تو اس کے لیے لازمی شرط اعتصام باللہ ہے یعنی اللہ کے ساتھ ایک ایسا مضبوط تعلق جو کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔ اس کے بعد اعتصام باللہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اعتصام باللہ سے مراد **اعتصام بحبل الله** ہے یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا اور مزید تسہیل کرتے ہوئے فرمایا کہ حبل اللہ سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں شریعت کے بنیادی اصول، آئینِ اسلامی کی بنیادی دفعات اور حکمتِ شریعت کی ہدایات لیکن انسانی زندگی کی خصوصیات کا ذکر اجمال کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ایک بات کی وضاحت ایک ایک ابہام کی شرح اور ایک ایک اجمال کی تفصیل اور ایک ایک قانون کا انطباق اور قانون کی اجتماعی مصلحتوں کو بروئے کار لانے کے بنیادی ذرائع، یہ وہ تمام حقائق ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑا گیا ہے چنانچہ یہی وہ حقائق ہیں جن کے مجموعے کو ہم حدیث اور سنت رسول سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن اور سنت کا باہمی رشتہ لازم و ملزوم سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حبل اللہ سے مراد صرف قرآنِ کریم نہیں بلکہ قرآن و سنت ہے۔ اعتصام باللہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھام لو۔ لیکن آیتِ کریمہ میں **جمیعًا** کا لفظ بھی موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یوں تو قرآن و سنت سے وابستگی اور اس کا اتباع ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت پر ضروری ہے۔ لیکن وہ چیز جو امت اسلامیہ کی بقا کے لیے ضروری ہے اور جس کی وجہ سے امتِ مسلمہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط ہو جاتی ہے وہ قرآن و سنت سے انفرادی وابستگی نہیں بلکہ اجتماعی وابستگی ہے کیونکہ انفرادی وابستگی کی حدود گھروں تک محدود رہتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بندے اور خدا کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام دے دیا جاتا ہے جبکہ اسلام اس تصور پر ہی لعنت بھیجتا ہے۔ جس طرح ایک ایک فرد قرآن و سنت کی اتباع کے ساتھ منسلک ہے اسی طرح امت مسلمہ کے تمام ادارے بھی قرآن و سنت کے اتباع کے پابند ہیں۔ جس طرح گھروں میں قرآن و سنت کا اتباع ہونا چاہئے اسی طرح گھروں سے باہر معاشرتی زندگی میں، معاشی زندگی میں، سیاسی طور اطوار میں، عدالتوں کے چیمبرز میں، حکومت کے ایوانوں میں اور پارلیمنٹ کے ہاؤسز میں بھی قرآن و سنت ہی کی حاکمیت نظر آنی چاہئے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے نتیجے میں امت ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر جس طرح قرآن و سنت ایک فرد کی فکر اور عمل بن جاتا ہے اسی طرح پوری ریاست کی ایک ایک قابلِ ذکر جگہ قرآن و سنت کی روشنی سے درخشاں دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح ایک مزدور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی محسوس کرتا ہے اسی طرح فوجوں کا کمانڈر اور ملک کا حکمران بھی ان احکام میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پوری امت کی نہج اور منزل ایک ہو جاتی ہے۔ امت کا ایک ایک ادارہ ایک ہی سوچ کے تحت پروان چڑھتا ہے اور ایک ہی جذبۂ عمل سے جلا پاتا ہے۔ ایسی امت دھرتی پر جس طرح اللہ کی رحمت ہوتی ہے اسی طرح شیطانی قوتوں کے لیے ناقابلِ مزاحمت طوفان ہوتی ہے۔ اس میں کمزوری کے آثار اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اس کی فکری راہنمائی میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ امت کی اجتماعی زندگی ایک دوسرے سے بیگانہ ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ قوم مختلف فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ اسی خطرے کی آگاہی کے لیے اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے حکم دیا

Marfat.com

گیا کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو آپس میں فرقوں کی صورت میں منتشر اور پراگندہ ہو گئے۔ وہ لکڑیوں کے گٹھے کی طرح ایک دوسرے سے بندھے ہونے کے باعث مضبوطی کی علامت تھے۔ لیکن جب ان کی گرہ کھل گئی اور وہ انتشار کا شکار ہو گئے تو ان کی مضبوطی کا راز ان سے الگ ہو گیا۔ اب وہ کمزور لکڑیوں کی شکل میں نا قابلِ ذکر ہو کر رہ گئے۔ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ قوم جس نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اور پر ہیبت حکمران پیدا کیا، لیکن ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ملک تقسیم ہو گیا، حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور پھر یہ انتشار ایسا بڑھا کہ دوبارہ ان کو یکجا ہونے کا کہیں موقع نہ ملا۔

تفرقہ اور اختلاف

آیتِ کریمہ میں تَفَرَّقُوْا اور اخْتَلَفُوْا دو لفظ ذکر فرمائے گئے ہیں۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو الگ الگ باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ منصوص احکام میں الگ الگ راستے نکالنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ انسانوں کا وہ گروہ جس کی راہنمائی کے سرچشمے متحد ہوں وہ ایک جماعت یا ایک فرقہ کہلاتا ہے۔ اب اگر اسی جماعت میں راہنمائی کے سرچشمے ایک سے زیادہ ہو جائیں اور قانون کے مآخذ مختلف ہو جائیں تو یہیں سے تفرقے کو راہ ملتی ہے۔ جب تک امت میں اس بات پر مکمل اتفاق پایا جاتا ہے کہ ادلۂ شرعیہ چار ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ ان میں بھی اصل الاصول قرآن و سنت ہیں تو پھر امت کے فرقوں میں تقسیم ہونے کا خطرہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی اجمال کی تفصیل اور کسی ابہام کی تشریح میں دو رائے ہو جائیں اور کہیں تعبیر کا اختلاف ہو جائے یا ایسے مسائل جن میں قرآن و سنت نے واضح احکام نہیں دیئے البتہ اس کے نظائر کی موجودگی میں اجتہاد اور استنباط کیا جا سکتا ہے تو ایسے مسائل میں آراء کا مختلف ہو جانا چنداں بعید نہیں۔ اگر نیت میں فساد شامل نہ ہو اور اللہ سے ڈر کر ان تمام معاملات میں فیصلے کیے جائیں تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی اتفاق کے فوائد باقی رہتے ہیں اور یہی وہ اختلاف ہے جسے فروعی اختلاف کہا جاتا ہے اور جسے برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایسے ہی امور ہیں جن میں فقہ کے آئمہ اور مجتہدین نے آپس میں اختلاف کیا، لیکن کبھی کسی نے ایسے اختلاف پر دوسرے کی نہ تکفیر کی نہ تنکیر۔ ہر مجتہد نے اپنی رائے کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ میرے نزدیک یہ صحیح ہے لیکن اس میں خطا کا احتمال ہے اور دوسرے مجتہد کی رائے میرے نزدیک غلط ہے لیکن محتمل الصواب ہے۔ ایسا منصفانہ طرزِ عمل جس کے پیچھے اللہ کا تقویٰ ہو کبھی امت کے لیے موجب ہلاکت نہیں ہو سکتا۔ اور ایسے اصحابِ علم ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے ہیں۔ یہی وہ عظیم لوگ ہیں جن کے بارے میں حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب نے اس رائے کا اظہار فرمایا کہ مجتہدین کرام اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں، ان کے آپس کے اختلافی مسائل کے بارے میں حتمی صداقت و اصابت کا علم کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک مجتہد جب کسی جدید مسئلے میں اسلامی حکم جاننے کے لیے کوشش کرتا ہے تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو گی کہ یا وہ نقطۂ صواب کو پا لے گا اور یا نہیں پا سکے گا لیکن اجر و ثواب کا مستحق دونوں صورتوں میں ہو گا۔ پہلی صورت میں دوگونہ ثواب ملے گا دوسری صورت میں یک گونہ اور یہ راز تو قیامت کے دن بھی نہیں کھلے گا کہ نقطۂ صواب کس کے ساتھ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں میں سے کسی کو بھی شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔

Marfat.com

البتہ ایک اختلاف نیت کا اختلاف ہے۔نیت کے اختلاف سے مراد یہ ہے کہ آدمی شریعت کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتا ہے، لیکن کھلم کھلا قرآن وسنت کے احکام سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی، اس لیے وہ مختلف احکام کا استخفاف کرتا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ احکام اللہ اور اس کے رسول کے نہیں بلکہ مولویوں نے اپنی طرف سے بنا لیے ہیں۔عوام کالانعام ہوتے ہیں انہیں یہ بات کون سمجھائے کہ ایسا شخص اسلام کو مان کر بھی نہیں مانتا بلکہ وہ اسلام کی تضحیک کرتا ہے۔جہاد کا انکار ممکن نہیں، تو جہادِ اکبر کی ایک پچ ساتھ لگا لیتا ہے۔اللہ کے رسول ﷺ کی وہ سنتیں جن پر لوگوں کا عمل کم کم دکھائی دیتا ہے اس کا مذاق اڑا کر دین کی اہمیت میں کمی کا راستہ کھول دیتا ہے۔اسلامی اقدار کو غیر معتبر ٹھہرانے کے لیے الفاظ کے طوطے مینا اڑاتا ہے۔یہ وہ اختلاف ہے جو کبھی الحاد سے جنم لیتا ہے اور کبھی اباحیت سے۔اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے کبھی انتہا پسندی کو گالی دی جاتی ہے اور کبھی بنیاد پرستی کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔درحقیقت اختلافات کی یہ نوعیتیں ہیں جس نے پیراہنِ اسلام کو داغ داغ کر دیا ہے۔جس فرقہ بندی کو اٹھتے بیٹھتے گالی دی جاتی ہے اس کا وجود مسلمانوں میں زیادہ نہیں اور جہاں کہیں وہ نظر آتا ہے اس کے پیچھے بھی حکمرانوں کی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں اور یا اس کا سبب جہالت ہوتا ہے۔اگر حکمران اس کے علاج کے لیے مخلص ہوں تو دینی احکام کی تعلیم کی طرف توجہ دے کر اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔اس آیتِ کریمہ میں دونوں طرح کے اختلافات سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ جو قومیں اس کا شکار ہوئی ہیں وہ دنیا میں بھی نامرادی کے عذاب کا شکار ہوئیں اور آخرت میں بھی اللہ نے ان کے لیے روسیاہی رکھی ہے کیونکہ قیامت کا دن عجیب دن ہوگا۔ایک طرف خنداں و فرحاں مسکراتے اور روشن چہرے ہوں گے جو اس طرح چمکتے ہوں گے جیسے سورج چمکتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق (وضو کا پانی جن جن اعضاء کو دھوتا ہے وہی قیامت کے دن سورج کی طرح چمکیں گے) اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے جن پر دنیا بھر کی نحوستوں کا سایہ ہوگا تارکول سے بھی زیادہ سیاہ ہوں گے۔چہروں پر لعنت برس رہی ہوگی، وہ اپنی روسیاہی کے باعث دور سے پہچانے جائیں گے۔یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دین کے روشن چہرے پر سیاہیاں ملنے کی کوشش کی ہوگی۔انہیں جہنم کی سزا سناتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ اللہ نے تمہیں ایمان کی دولت بخشی تھی، لیکن تم نے ایمان کو کفر سے بدل دیا۔ روشنی کی بجائے تم اندھیروں کے سوداگر بن گئے۔انسانیت کو تم نے تاریکیوں میں ڈبو دینا چاہا۔اس کا خمیازہ یہ ہے کہ اپنے کفر کی پاداش میں جہنم کا عذاب چکھو اور جن کے چہرے ایمان کے نور سے روشن ہوں گے ان سے فرمایا جائے گا کہ تم نے دنیا میں قدم قدم پر تاریکیوں کا مقابلہ کیا۔ ان بدبختوں نے ہر ممکن طریقے سے تمہیں پریشان کرنے کی کوشش کی۔آج تمہیں یکسو ہو جانا چاہیے۔اب تمہارے لیے پریشانی کا کوئی موقع نہیں۔اب تمہارے سروں پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہوگا اور تم ہمیشہ اس میں نہال رہو گے۔"

تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ○
وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

(یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا○ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور سارے معاملات اللہ کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں) (۱۰۸ تا ۱۰۹)

Marfat.com

ایک اہم ترین سوال کا جواب

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ٹھیک ٹھیک ہم آپ پر پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟ کیونکہ اس کی زندگی بے سبب تو نہیں اور نہ اس کی زندگی بے مقصد ہو سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے۔ یقیناً کسی مقصدِ عظیم کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اس مقصد کا سراغ لگانا اور اس کے حوالے سے انسان کی زندگی کے انجام کا تعین کرنا یہ انسانی بس کی بات نہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان ہمیشہ الجھتا رہا ہے۔ کبھی وہ زندگی کے مقاصد کے تعین میں ٹھوکر کھاتا ہے اور کبھی اپنے انجام کے بارے میں اندازوں سے کام لیتا ہے اور یہی وہ خرابی کی بنیاد ہے جس نے ہمیشہ انسان کی منزل کھوٹی کی ہے حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ انسان ایک مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا خالق ہے تو پھر خالق سے بڑھ کر مخلوق کی زندگی کے بارے میں رہنمائی اور کون دے سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ہیں اس لیے اگر ان باتوں کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے انسانوں کو نہ ملا تو پھر تو دنیا میں کوئی اور واسطہ ایسا نہیں آئے گا جس سے انسانیت کا بھلا ہو سکے۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں صاف صاف فرمایا گیا کہ قومیں کس طرح زندہ ہوتی ہیں اور کس طرح مرتی ہیں۔ اللہ کی نگاہ میں ان کی نجات کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کی ہلاکت کے کیا ہیں؟ اور اس بارے میں قدرت نے کیا اصول مقرر کر رکھے ہیں؟ یہ وہ اللہ کی آیات ہیں جس میں اہلِ کتاب نے بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اس لیے اے پیغمبر! ہم ٹھیک ٹھیک آپ پر انہیں نازل کر رہے ہیں کیونکہ آپ کے بعد کوئی اور آنے والا نہیں آئے گا۔ اللہ نے رسالت کو ختم کر دیا ہے۔ دنیا کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اسے حق کی ضرورت ہے تو وہ صرف آپ کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ قیامت کے دن ہم نے جس انجام کی خبر دی ہے یہ وہ یقینی انجام ہے جس کے بدلنے کا کوئی امکان نہیں۔ ایمان اور عمل، اعتصام بحبل اللہ اور اتفاق و اتحاد یہی وہ سکے ہیں جو قیامت کے دن کام آئیں گے۔ انسانوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے یہ تمام باتیں کھول کھول کے بیان کی جا رہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ تو ان کو اپنے رحم سے نوازنا چاہتے ہیں۔

کائنات میں فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کو ہے

مزید یہ بات بھی ذہنوں میں رہنی چاہیے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اگر کسی کو اختیار حاصل ہے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے کیونکہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کی ملکیت کا حق صرف اللہ کو ہے وہ چونکہ ان سب کا خالق ہے اس لیے اسے حق ہے کہ وہ جو چاہے ان کے بارے میں فیصلے کرے اور جس طرح چاہے احکام دے اور یہ بات انسانوں کو اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ انہیں جو احکام دیئے جا رہے ہیں اور زندگی کے جن حقائق سے انہیں آشنا کیا جا رہا ہے ان میں سے ایک ایک بات، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارادہ اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانے والا ہے۔ وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ جس طرح انسان مرنے کے بعد ایک دن اپنے اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا اسی طرح انسانوں کے اعمال بھی اور ان کی زندگیوں کی تفصیلات بھی اللہ کی طرف لوٹائی جاتی ہیں، وہیں سے جو فیصلہ ہوگا وہی انسان کا اصل مقدر ہوگا۔

Marfat.com

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ
اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ
الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ
الْاَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا
اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ
كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ
يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا
يُنْفِقُوْنَ فِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ

Marfat.com

حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ
لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا
بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ
بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ
قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ
وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ڻ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

رکوع: ۱۲۔ (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں O وہ تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی تکلیف کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے O تھوپ دی گئی ہے ان پر ذلت وہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں۔ سوائے اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لے کر۔ اور ماردی گئی ہے ان پر مسکنت۔ یہ سب کچھ اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور نبیوں کو بلا وجہ قتل کر ڈالتے تھے اور یہ اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حدود سے نکل جاتے تھے O سب یکساں نہیں، اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ اپنے عہد پر قائم ہے۔ یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ

Marfat.com

سجدے کرتے ہیں O وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور معروف کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں O اور جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں کو جاننے والا ہے O بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O مثال اُس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو، اس میں سخت ٹھنڈک ہو اور لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں O اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دان باہر والوں کو وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ وہ پسند کرتے ہیں اس چیز کو جو تمہیں مشقت میں ڈالے۔ ظاہر ہو چکی ہے عداوت ان کے مونہوں سے۔ جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی ترجیحات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو O یہ تمہی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو! تم اپنے غصے میں مر جاؤ، اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے O اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے کھل اٹھتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی کوئی تدبیر تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے) (۱۱۰ تا ۱۲۰)

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ O

(تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں) (۱۱۰)

بنی اسرائیل کی منصبِ امامت سے معزولی اور امتِ مسلمہ کا تقرر

سیاقِ کلام دیکھتے ہوئے یہ بات پورے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اہلِ کتاب کو حاملِ دعوت امت ہونے اور دنیا کی امامت کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ ان کی فکری کجرویوں، نیتوں کے فسادات، گروہوں کی عصبیتوں اور اعمال کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے اس طرح نمایاں کیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے کہ یہ امت جسے کبھی تمام جہان پر فضیلت دی گئی تھی اور جسے توحید کا علمبردار بنایا گیا تھا اور جسے ہدایت کا سرچشمہ قرار دے کر اللہ کے انعامات کا مورد بنا دیا گیا تھا۔ اب اس کا زوال اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے

Marfat.com

اب اس سے وہ عزتیں اور وجاہتیں واپس لی جارہی ہیں جس کا اسے حامل بنایا گیا تھا۔ اس کے طور اطوار اور معاملات نے نہ صرف اپنی حیثیت کو خراب کیا بلکہ وہ اللہ کے دین کی رسوائی کا بھی باعث بنے۔ جب باغبان ہی باغ کو اجاڑنے لگے، جب گھر کا پاسبان ہی گھر کی دیواریں توڑنے لگے اور جب قلعہ دار ہی دشمنوں کے لیے قلعے کے مورچے کھول دے تو ایسے لوگوں پر تو غداری اور بے وفائی کا مقدمہ چلنا چاہیے نہ کہ انہیں اصل منصب پر بحال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں جابجا اس حقیقت کو نمایاں ہوتے دکھایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کا قاری اہلِ کتاب کے کرتوت پڑھ کر انتظار کرنے لگتا ہے کہ کب یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور قدرت کب ان کے لیے سزا کا اعلان کرتی ہے۔ چنانچہ چند رکوع پیشتر قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ...... الخ کی دعا کے ضمن میں واضح اشارہ دیا گیا تھا کہ کاتبِ تقدیر فیصلہ لکھنے ہی والا ہے۔ چنانچہ یہاں تک وہ پہنچ کر تقدیر کا فیصلہ لکھا جا چکا اور اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے امتِ مسلمہ کو اس عظیم منصب پر فائز کیا جارہا ہے جس پر کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام فائز ہوئے تھے اور جن کی جانشینی امت بنی اسرائیل کو دی گئی تھی۔

امتِ مسلمہ کی صفات

اس آیتِ کریمہ میں براہِ راست امتِ مسلمہ کو خطاب ہے۔ خطاب میں نہ صرف ان کے ٹائٹل اور انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے بلکہ ان صفات کا بھی ذکر کردیا گیا جو اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد مسلمانوں کے اندر نظر آنی چاہئیں۔ ٹائٹل اور منصب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سب سے بہتر امت ہو۔ دنیا میں امتوں کی کمی نہیں۔ روئے زمین پر جابجا امتیں بکھری ہوئی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی اصل حیثیت کو نہ پہچان کر اپنی دوسری شناختیں مقرر کر رکھی ہیں۔ اپنی زندگی کے وظائف وہ ٹھہرا لیے ہیں جس کی وجہ سے وہ اصل امتیاز سے محروم ہوگئے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں بہت کم فرق رہنے دیا ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایک ایسی امت کو اٹھایا جاتا جو انسان کی اس بنیادی ضرورت کی امین بنتی۔ اس کی ذات اسی کی مبلغ و منادی ہوتی۔ اس کی زندگی کے فیصلے خود بخود بولتے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے؟ چنانچہ امت بنی اسرائیل کو صدیوں تک اسی کام کے لیے مصروفِ عمل رکھا گیا۔ لیکن ان کی نااہلی اور معزولی کے بعد اب یہ ضروری ہوگیا کہ کسی نئی امت کو اس عظیم اور کٹھن ذمہ داری پر فائز کیا جائے کیونکہ اللہ کی زمین ایسے لوگوں کے سپرد نہیں کی جاسکتی جو اسے درندوں کا بھٹ بنا دیں۔ جس میں ظلم اور بربریت کے سوا اور کسی چیز کو ترجیح ملتی نظر نہ آئے۔ چنانچہ اللہ نے انسانوں پر رحم فرمایا اور اس امت کو اس عظیم منصب پر فائز فرما کر انسانوں کی اصل ضرورت کو پورا کردیا۔ اس عظیم منصب پر فائز ہونے والی چونکہ ہر امت اسی لقب سے ملقب ہوتی رہی ہے اس لیے اس امت کو بھی یہی لقب دیا گیا کہ تم سب سے بہترین امت ہو اور سورۂ بقرہ میں اسی منصب کا اعلان دوسرے لفظوں سے کیا گیا ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا (چنانچہ ہم نے تمہیں ایک امتِ وسط بنایا ہے) اس کا معنی بھی بہترین امت ہے کیونکہ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا (بہترین امور ان کے اوسط ہوتے ہیں) ہر اہم چیز کو وسط میں جگہ ملتی ہے۔ صدارت کی کرسی ہمیشہ درمیان میں رکھی جاتی ہے۔ تخلیقی اور تکوینی طور پر اعتدال اور میانہ روی سب سے اہم صفت ہے۔ جس کا تعلق کمالِ اخلاق و صفات سے ہے۔

Marfat.com

اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ کا مفہوم

لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ خیر امت ہونے کا لقب یا اعزاز محض ایک عہدہ و منصب نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری ایسی ہے جو امت کو انفرادیت دینے کے لیے کافی ہے کہ تم وہ بہترین امت ہو جنہیں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی تمہاری بعثت تمہاری قدر و منزلت اور تمہارے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی فکر بعد میں کرو دوسروں کی فکر پہلے کرو حالانکہ انسانی سرشت اور فطرت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنی فکر کرتا ہے، پھر اپنے بچوں کی کرتا ہے، پھر اپنے عزیز و اقارب کی کرتا ہے، پھر اپنی قوم کی کرتا ہے، پھر اپنے ملک کی کرتا ہے۔ اس میں غور فرمایئے کہ انسانی ترجیحات اور اس کی فکر مندیوں میں سب سے بڑا جو امتیاز ہے وہ اپنا ہے۔ یعنی وہ ہر وہ کام کرتا ہے جس کے ساتھ اپنا ہونے کی صفت لگی ہوئی ہے۔ اگر وہ بڑوں کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنے بڑوں کی۔ بچوں کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنوں بچوں کی۔ قرابت کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنے قرابت داروں کی۔ قوم اور وطن کے بارے میں سوچے گا تو سب سے پہلے اپنی قوم اور اپنے وطن کے بارے میں، لیکن اس امت کو مبعوث کرتے ہوئے جو بات کہی گئی ہے وہ اس رویے کے بالکل خلاف ہے۔ کہ تمہیں اس لیے اٹھایا جا رہا ہے تاکہ تم اپنی اور اپنے بچوں کی فکر کرنے کی بجائے دوسروں کی فکر کرو۔ تمہیں بھوک لگی ہو تو خود کھانا کھانے کی بجائے پہلے اسے کھلاؤ جو تم سے زیادہ بھوکا ہے۔ اسے کپڑا پہناؤ جو تم سے کم وسائل رکھتا ہے۔ اس کا علاج کرو جو تم سے زیادہ تکلیف میں ہے۔ ایسا ہونا بظاہر مشکل محسوس ہوتا ہے، لیکن اگر ہم ایک خاص پہلو سے اس پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ دنیا میں عزت و نجابت اور فضیلت و وجاہت اگر ملتی ہے تو صرف اسے جس کا زندگی گزارنے کا طریقہ یہی ہو۔ کہ وہ اپنی بجائے دوسروں کی فکر کرتا ہو۔ اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتا ہو۔

دنیا میں ہر پیشہ ور آدمی اور ہر مزدوری کرنے والا شخص صرف روٹی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے موچی جوتا گانٹھتا ہے، مزدور مزدوری کرتا ہے، کاشت کار ہل جوتا ہے، نان بائی روٹی پکاتا ہے، مقصد سب کا ایک ہے کہ اپنی ضرورتیں پوری کی جاسکیں اور اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک کا علاج کیا جاسکے۔ صرف پیشہ ور لوگ نہیں، بلکہ جو لوگ دماغی محنت سے کام لیتے ہیں مختلف صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں، ان کا مقصود بھی معاش پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نوکری کرتے ہیں، جان کھپاتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ جان قربان بھی کر دیتے ہیں، ہر طرح کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں، لیکن ان کا مقصودِ حقیقی روٹی کمانا یعنی معاش پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی ضروریات نہیں ہوتیں یا وہ غذا سے بے نیاز ہوتے ہیں یا ان کے بچوں کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی یا انہیں رہنے کے لیے چھت نہیں چاہیے، وہ یہ سب ضرورتیں رکھتے ہوئے بھی ان ضرورتوں کی خاطر جان نہیں کھپاتے۔

فوج ہر ملک کی ضرورت ہے۔ ملک کا وقار فوج سے ہے۔ ملک کا دفاع فوج کی ذمہ داری ہے۔ فوج کے بغیر کوئی ملک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ فوج میں بھرتی ہونے والا یا کمیشن لینے والا کوئی شخص بھی تنخواہ کی خاطر فوج میں نہیں جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں تنخواہ بھی ملتی ہے۔ قوم ان کی ضروریات کو پورا بھی کرتی ہے، لیکن خود ایک سپاہی سے لے کر جرنیل تک تنخواہ کے لیے کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ انہیں کمیشن دیتے ہوئے یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ تم یہاں نوکری کے لیے نہیں بلکہ ایک مقصد کے لیے آئے ہو۔ مقصد یہ ہے کہ تم قوم اور ملک کی حفاظت

Marfat.com

کرو۔ تم اس لیے جاگو تا کہ قوم اطمینان کی نیند سو سکے۔ تم اس لیے ملک کی سرحدوں پر پہرہ دو تا کہ ملک کا ایک ایک باسی اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کو محفوظ سمجھے۔ تم اس لیے زندہ رہو تا کہ قوم کی زندگی پر آنچ نہ آئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آ جائے کہ تمہیں مر کر قوم کو زندگی دینا پڑے تو پھر تمہارا اصل ہدف اور اصل کام مرنا ہے جینا نہیں۔ ہر فوجی کے دل و دماغ کو اسی حقیقت سے آشنا کیا جاتا ہے اور اسی حقیقت کے ساتھ ہر فوجی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی فوج صرف تنخواہ لینے اور کمانے کے لیے فوج کی نوکری کرے اور فوجی ذمہ داریاں ادا کرے تو ایسی کرائے کی فوج ملک و قوم کے لیے بوجھ تو ہو سکتی ہے، ملک کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

جانور جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف احساسات کی دولت بخشی ہے جوہر عقل سے نہیں نوازا اور خیر و شر کی تمیز تو ان کا موضوع ہی نہیں۔ بایں ہمہ! ہم دیکھتے ہیں کہ جانور بھی سب یکساں نہیں۔ جانوروں میں بیشتر انواع ایسی ہیں جنہیں صرف اپنی ضروریات کے حصول کی فکر ہوتی ہے۔ انہیں روٹی کا ٹکڑا یا دانہ دنکا ملنا چاہیے چاہے کسی بچے کے ہاتھ سے چھیننا پڑے۔ وہ ہر وقت پلٹنے جھپٹنے میں رہتے ہیں تا کہ کہیں سے بھی اپنی ضرورت پوری کی جا سکے۔ لیکن انہیں میں سے ایک جانور شاہین بھی ہے۔ وہ اپنی پرواز کی قوت اور اڑان کی بلندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوتوں سے نوازا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کسی مردار پہ نہیں اترتا۔ کبھی کسی کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا نہیں چھینتا۔ کبھی کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ وہ سب سے زیادہ پلٹتا جھپٹتا ہے، لیکن ضروریات رکھتے ہوئے بھی پلٹنے جھپٹنے کا مقصد ضروریات کا حصول نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک مرد مومن کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ ہمارے قومی شاعر اقبال نے اس کے اندر مومنانہ صفات دیکھی ہیں۔ اسی لیے اسی کی زبان سے اس نے کہلوایا

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اس امت کو بھی ایسی ہی صفات دے کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ایک فرد کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اسے بھی تن پوشی کے لیے کپڑا چاہیے، اسے بھی موسم کی شدت سے بچنے کے لیے وسائل درکار ہیں، اسے بھی اپنے سر کے لیے گھر کی چھت کی ضرورت ہے، اس کے بچے بھی تعلیم کے محتاج ہیں، انہیں بھی دوسرے بچوں کی طرح تمام ضرورتیں ملنی چاہئیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں اس کا مقصد نہیں۔ اس کا مقصد بھی فوج کی طرح دوسروں کے لیے جینا ہے۔ یہ زندگی کی ضروریات پر محنت سے زیادہ اپنے منصبی مشاغل پر محنت کرتا ہے۔ اس کے سامنے لوگوں کی اصلاح و ہدایت

Marfat.com

ہے۔جس طرح ایک دنیادار ایک ایک روپے کی طلب میں جان کھپاتا ہے یہ ایک ایک شخص کی ہدایت کے لیے محنت کرتا ہے۔اس کی نگاہ میں درہم ودینار اور سونا چاندی کے ڈھیروں کی وہ قیمت نہیں جو ایک انسان کی ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس زمین کی خوشحالی اور زمین پر رہنے والے انسانوں کی آسودگی خود انسان کے اصلاح یافتہ ہونے میں ہے۔انسان میں اگر محنت کا جذبہ ہے تو وسائل فراہم ہوتے دیر نہیں لگتی۔اگر اس میں اللہ کا خوف اور تقویٰ ہے تو وسائل کو انسانی فلاح وصلاح میں خرچ کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔اگر انسان کے اندر شکر کی صفت پائی جاتی ہو تو وہ جہاں اللہ کی نعمتوں کا قدردان ہوگا وہیں انسانوں کی خدمتوں کا قدردان بھی ہوگا۔اگر اس کے اندر صبر کی قوت پائی جائے گی تو وہ ہوس زر میں بھی مبتلا نہیں ہوگا اور بڑی سے بڑی مشکل کو بھی برداشت کر لینے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔آپ مثال کے طور پر ایک ایسے گھر کا تصور کیجئے جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کے پاسدار ہوں۔وہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد کے لیے سراپا شفیق ہوں اور ان کی اولاد اسلامی تربیت سے آراستہ ماں باپ کی فرمانبردار ہو اور اگر گھر میں اور افراد بھی ہیں تو ہر فرد دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کے لیے بے چین ہو۔اندازہ فرمائیے! اس گھر سے بڑھ کر خوش قسمت اور سعادت مند گھر اور کونسا ہوگا؟ لیکن اس کے برخلاف اگر ایک گھر میں دولت کی ریل پیل ہے،لیکن میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے خیانت کرتے ہیں،شرم وحیا گھر سے رخصت ہو چکے ہیں،اولاد ماں باپ کی شفقت سے محروم اور ماں باپ اولاد کی محبت اور خدمت سے بیگانہ ہیں۔غور فرمائیے! کہنے کو تو یہ گھر بڑا خوبصورت گھر ہوگا لیکن حقیقت میں یہ گھر نہیں بلکہ حیوانوں کا باڑا ہے۔اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ تم بہترین امت ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں خود سے زیادہ دوسروں کی ہدایت وفلاح کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔تمہاری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔تمہاری بھی باقی قوموں کے افراد کی طرح یقیناً یہ خواہش ہوگی کہ ہمارے ملک میں وسائل کی فراوانی ہو،سڑکیں صاف ستھری،مکانات خوبصورت اور آرام وراحت کا ہر ذریعہ میسر ہو،ہمارے کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگلتی ہوں،ہمارے کھیت سونا اگلتے ہوں،ہر طرف دولت کی ریل پیل ہو۔ان میں سے کوئی خواہش بھی بری نہیں۔لیکن یہی تمام خواہشیں اور یہی تمام وسائل عذاب بن جاتے ہیں جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے پر عمل نہیں ہوتا۔مال لٹتا ہے،عزتیں اچھلتی ہیں،انصاف بے وقار ہوتا ہے،عدالتیں بکنے لگتی ہیں،احتسابی اداروں کی قیمتیں لگنے لگتی ہیں،حکمران حکومت کے نشے میں اندھے ہو جاتے ہیں تو اولاً تو یہ وسائل مہیا نہیں ہو سکتے اور اگر ہو جائیں تو آسودگی کی بجائے تباہی کا سبب بنتے ہیں جیسے آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ تمہیں اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ تم دنیا میں معروف کو سربلند رکھنے کی کوشش کرو۔برائی کو کبھی سر چڑھنے نہ دو۔دنیا میں ان دونوں کا شعور عام کر دو اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دو کہ تمہارا اصل سرمایہ نیکی کا فروغ اور بدی کا زوال ہے۔اسی میں تمہاری زندگی ہے اور اسی میں انسانی وقار ہے۔باقی ساری امتیں وہ بے شک دنیا طلبی میں اندھی ہوتی رہیں لیکن تم اپنی اس بنیادی خصوصیت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔تمہاری فکرمندی بہتر سے بہتر وسائل کے لیے نہیں ہونی چاہئے بلکہ تمہاری فکرمندی اور پریشانی ایک ایک نیکی کے فروغ کے لیے،ایک ایک فرض کی ادائیگی کے لیے،ایک ایک حق کی بجا آوری کے لیے اور ایک ایک بھلائی کی سربلندی کے لیے ہونی چاہئے۔لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو یعنی تمہارا دل ودماغ کبھی اس تصور سے خالی نہ ہونے پائے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو تمہارا اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔تمہارا ہر کام اس کی نگاہوں میں ہے۔تم اسی کے عائد کردہ فرائض کی پابندی میں اسی کی رضا کی خاطر لگے ہوئے ہو۔تمہاری رات کی تنہائیاں بھی اسی کی یاد اور اسی کے خوف سے آباد ہیں کیونکہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کا استحضار وہ دولت ہے جو انسان کو ہر برے تصور سے محفوظ رکھتی ہے۔اگر یہ دولت آدمی کو نصیب نہ ہو تو نیکی بھی برائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔بظاہر نیکی کا وعظ کہا جاتا ہے لیکن اس کا اثر اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے ایمان کا نور نہیں ہوتا۔جگر مراد آبادی نے ٹھیک کہا ہے

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
؎ آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

ایسی صورت میں خالی باتیں انسان کی قسمت بناتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہیں۔

امتِ مسلمہ کی عزت افزائی اوران کی حقیقی قدر ومنزلت کو بیان کرنے کے بعد ایک عجیب بات ارشاد فرمائی۔ دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی نا اہل کو اس کی نا اہلی کی وجہ سے کسی عظیم منصب سے معزول کیا جاتا ہے تو پھر اسے کسی رحم یا مہربانی کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اہلِ کتاب کو سینکڑے سالوں کی نا اہلی کے بعد اس عظیم منصب سے معزول کیا گیا۔ اب ان کی اصل جگہ سوائے جہنم کے اور کہیں نہیں۔ لیکن قربان جایئے اللہ کی کریمی کے کہ آخری آیت میں فرمایا:

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ

؎ (اگر اہلِ کتاب اپنی تمام تر بداعمالیوں اور چیرہ دستیوں کے باوجود اب بھی ایمان لے آئیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا)

گزشتہ صدیوں کا ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ وہ ایمان لاکر نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور اپنے صدق واخلاص سے اپنے لیے جو مقام پیدا کریں گے وہی ان کا حقیقی مقام ہوگا۔ گزشتہ حوالوں سے کسی بات کا ان سے تذکرہ نہیں ہوگا۔ اس قدر مروت ورحمدلی کے باوجود افسوس یہ ہے کہ ان میں ایمان لانے والے بہت کم ہیں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نافرمان اور حد سے گزر جانے والے ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

؎ (وہ تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی تکلیف کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے) (۱۱۱)

یہود کی اجتماعی اور عسکری قوت سے متعلق چند پیشگوئیاں

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اہلِ کتاب کو دنیا کی امامت وقیادت کے منصب سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس عظیم منصب پر فائز کیا گیا۔ اہلِ کتاب بطورِ خاص یہود چونکہ ایک کینہ ور قوم ہیں۔ وہ اتنے بڑے نقصان کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے وہ اپنی تاریخی جبلت سے مجبور ہو کر جو ان سے بن پڑے گا مسلمانوں کے خلاف کر گزریں گے۔ مسلمان ان کی اس سرشت سے واقف ہونے کی وجہ سے یقیناً متفکر اور پریشان تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اب یہود کیا کرتے ہیں؟ پروردگار نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے چند ایسی پیش گوئیاں فرمائی ہیں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ جس شخص کی نگاہ ظاہری حالات پر ہو وہ یقیناً سوچے گا کہ یہود کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں اور پناہ گاہوں کے لیے مضبوط قلعے ان کی ملکیت میں ہیں اور اس کے مقابلے میں مسلمان اپنی تعداد اور وسائل کے اعتبار سے نہایت کمزور ہیں۔ ایک ظاہر بین ان حالات کو دیکھ کر اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ اگر یہود اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ گئی تو مسلمانوں کے لیے نہایت تباہ کن ہوگی۔ لیکن پروردگار نہایت مؤکد انداز سے فرما رہے ہیں کہ مسلمانو! تمہارے

Marfat.com

لیے فکر کی کوئی بات نہیں، تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت دے کر ایک نئی زندگی سے بہرہ ور کیا ہے۔ جنگ میں وسائل کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن اصل فیصلہ کن چیز ہر سپاہی کا عزم اور کردار ہے۔ وہ اگر اپنے مؤقف پر بے پناہ یقین رکھتا ہے اور اس کے اندر اپنے مؤقف کے لیے قربانی دینے کا جوش و جذبہ موجود ہے اور وہ ہر طرح کے حالات میں اللہ پر اعتماد کی دولت سے سرشار ہے تو پھر ایسی فوج کو میدانِ جنگ میں شکست دینا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ مسلمان تمام معنوی اور اجتماعی قوتوں سے مسلح تھے اور یہود کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ وہ بظاہر کتاب اللہ کے حامل تھے، ان کے یہاں حصولِ علم کے لیے مدارس کی کمی نہ تھی، سود خور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے پاس بڑی مقدار میں دولت بھی رکھتے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں! البتہ تھوڑی بہت تکلیف سے ضرور دو چار کر سکتے ہیں۔ اَذٰی کا معنی ضَـرَرٌ یَسِیـْرٌ ہوتا ہے۔ یعنی تھوڑی سی تکلیف۔ مراد اس سے یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گالی گلوچ کر سکتے ہیں، زبان کے جوہر دکھا سکتے ہیں، تہمتیں باندھ سکتے ہیں، طعن و تشنیع کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے وہ اپنی دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ لیکن میدانِ جنگ میں کوئی معرکہ سر کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ اطمینان رکھنا چاہئے کہ یہود کی جڑ کٹ چکی ہے اب ان کے اندر کوئی دم خم باقی نہیں۔ ممکن ہے قومی عصبیت سے مجبور ہو کر وہ میدانِ جنگ میں آنے کی جرأت کر لیں تو پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر وہ تم سے لڑنے کی کوشش بھی کریں تو میدان سے پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے۔ چنانچہ بعد کے حالات نے ایک ایک پیش گوئی کو سچا ثابت کر دکھایا۔ جنگِ بدر سے واپسی پر سب سے پہلے یہود کے ایک قبیلے بنو قینقاع نے شوریدہ سری اور بدطینتی کا مظاہرہ کیا۔ مدینے میں سونے کے کاروبار پر یہی قبیلہ چھایا ہوا تھا۔ کوئی مسلمان عورت شاید کسی زیور کے حصول کے لیے ان کی کسی دکان پر گئی۔ ان بدبختوں نے ایسی کمینی حرکت کی جس سے اس کا ستر کھل گیا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر دہائی دی "کیا محمد ﷺ کے شہر میں بھی میری عزت محفوظ نہیں؟" کوئی مسلمان پاس سے گزر رہا تھا اس کی حمیت برداشت نہ کر سکی۔ اس نے آگے بڑھ کر جس یہودی نے یہ حرکت کی تھی اسے قتل کر دیا۔ یہود نے اس مسلمان کو جو بالکل اکیلا تھا حملہ کر کے یہودی کے قتل کے انتقام میں مار ڈالا۔ آنحضرت ﷺ کو اطلاع ہوئی، آپؐ تشریف لائے اور آپؐ نے بنو قینقاع کے ذمہ دار لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور یہ بھی فرمایا کہ دیکھو! قریش تم سے کہیں زیادہ طاقتور تھے، لیکن اللہ کی جب گرفت آئی تو میدانِ بدر میں جو ان کا حشر ہوا تم سب کے سامنے ہے۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو قریش کا ہوا ہے۔ لیکن بنو قینقاع نے بجائے اس کے کہ اپنے رویے پر معذرت کریں انتہائی دریدہ دہنی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ محمد (ﷺ)! بدر کی کامیابی نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو بہت بڑی قوت سمجھنے لگے ہو۔ قریش کیا جانے کہ لڑنا کسے کہتے ہیں اس لیے وہ تمہارے ہاتھوں مارے گئے۔ ہم سے جب واسطہ پڑے گا تو اندازہ ہوگا کہ لڑنا کسے کہتے ہیں۔" اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ بنو قینقاع کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے چنانچہ آپؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے جب مسلمانوں کو دیکھا تو اپنی گڑھیوں میں قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ روز تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ اب وہی لوگ جو بات بات پر بدزبانی کرتے تھے اور بچھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے، ان کی ساری ہیکڑی جاتی رہی اور اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان و مال، آل اولاد اور عورتوں کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے انہیں منظور ہوگا۔ اس کے بعد آپؐ کے حکم سے ان سب کو باندھ لیا گیا۔ ممکن ہے آپؐ ان کے بارے میں کوئی سخت فیصلہ فرماتے لیکن عبداللہ بن ابی نے منافقانہ کردار ادا کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ آپ کو مجبور کر دیا کہ آپؐ ان کو شہر سے نکال دیں، لیکن ان کی زندگیوں سے تعرض نہ کریں۔

Marfat.com

یہود کا دوسرا قبیلہ بنونضیر کے نام سے معروف ہے۔ بنوقینقاع کے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے بنونضیر کو کسی حد تک پر سکون رہنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن غزوۂ احد کے بعد ان کی جرأتیں بڑھ گئیں اور وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف مختلف طریقوں سے دشمنی کا اظہار کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ سیرت نگاروں نے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ کے ہمراہ ایک معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے یہود کے پاس تشریف لے گئے۔ یہود نے آپؐ سے کہا کہ ابوالقاسم! آپ فکر نہ کریں جیسا آپ فرمائیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔ آپ کچھ دیر کے لیے تشریف رکھیں ہم ابھی آپ کی ضرورت پوری کیے دیتے ہیں۔ آپ ان کے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور ان کے وعدے کی تکمیل کا انتظار کرنے لگے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت علی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت تھی۔ ادھر یہود تنہائی میں جمع ہوئے تو ان پر شیطان سوار ہو گیا۔ انہوں نے باہم مشورے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں کہا کون ہے جو اس چکی کو اٹھا کر اوپر جائے اور آپؐ کے سر پر گرا کر آپؐ کو کچل دے۔ اس پر ایک بدبخت یہودی عمرو بن جحاش نے کہا میں یہ کام کروں گا۔ ان لوگوں میں سلام بن مشکم نے کہا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ خدا کی قسم! انہیں تمہارے ارادوں کی خبر دے دی جائے گی اور پھر ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد و پیمان ہے یہ اس کی خلاف ورزی بھی ہے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کوششیں کرنے لگے۔

رب العالمین کی جانب سے حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپؐ کو یہود کے ارادوں سے باخبر کیا۔ آپؐ تیزی سے اٹھے اور مدینے کے لیے چل پڑے۔ بعد میں صحابہ کرام بھی آپؐ سے آن ملے اور کہنے لگے کہ آپ تشریف لے آئے۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کیوں واپس تشریف لے آئے۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کو یہود کے ارادے سے باخبر کیا۔ مدینہ پہنچ کر آپؐ نے فوراً ہی محمد بن مسلمہؓ کو بنی نضیر کے پاس روانہ فرمایا اور انہیں یہ نوٹس دیا کہ تم لوگ مدینے سے نکل جاؤ۔ اب یہاں میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں دس دن کی مہلت دی جاتی ہے اس کے بعد جو شخص بھی پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی۔ اس نوٹس کے بعد یہود کو جلاوطنی کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ وہ چند دن تک سفر کی تیاریاں کرتے رہے، لیکن اسی دوران عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے کہلا بھیجا کہ اپنی جگہ برقرار رہو۔ ڈٹ جاؤ اور گھر بار نہ چھوڑو۔ میرے پاس دو ہزار مردانِ جنگی ہیں جو تمہارے ساتھ تمہارے قلعے میں داخل ہو کر تمہاری حفاظت میں جان دے دیں گے اور اگر تمہیں نکالا ہی گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور تمہارے بارے میں کسی سے ہرگز نہیں دبیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی ہم تمہاری مدد کریں گے اور بنوقریظہ اور بنوغطفان جو تمہارے حلیف ہیں وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔ یہ پیغام سن کر یہود کی خود اعتمادی پلٹ آئی اور انہوں نے طے کر لیا کہ جلاوطن ہونے کی بجائے ٹکر لی جائے گی۔ ان کے سردار کو توقع تھی کہ رئیس المنافقین نے جو کچھ کہا ہے وہ پورا کرے گا۔ اس لیے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیج دیا کہ ہم اپنے دیار سے نہیں نکلتے، آپ کو جو کرنا ہو کر لیں۔ لیکن اللہ کی قدرت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ چھ سات دن کے محاصرے کے بعد ہی بنونضیر کے حوصلوں نے جواب دے دیا اور وہ جن کے اعتماد پر ہتھیار ڈالنے سے انکار کر رہے تھے ان میں سے کوئی شخص بھی ان کی مدد کے لیے نہیں پہنچا۔ چنانچہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ ہم مدینے سے نکلنے کو تیار ہیں۔ آپؐ نے ان کی جلاوطنی کی پیش کش قبول فرما لی اور یہ بھی منظور فرما لیا کہ وہ اسلحہ کے سوا باقی جتنا ساز و سامان اونٹوں پر لاد سکتے ہوں سب لے کر بچوں سمیت نکل جائیں۔ اس طرح سے بنونضیر کا کام تمام ہوا۔ نہ ان کے ہتھیار ان کے کام آئے نہ ان کی افرادی قوت حوصلہ دکھا سکی، نہ ان کے حلیف وقت پر امداد کے لیے پہنچ سکے۔

Marfat.com

یہود کا تیسرا قبیلہ مدینہ منورہ میں بنو قریظہ کے نام سے معروف تھا۔ ان لوگوں کا مسلمانوں سے معاہدہ تھا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ کرے گا تو ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدینے کی حفاظت کریں گے۔ لیکن غزوۂ خندق میں انہوں نے کھلم کھلا معاہدہ توڑ ڈالا اور مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کی۔ چنانچہ جب اللہ نے قریش اور ان کے حلیفوں پر تیز آندھی کا عذاب بھیجا تو وہ اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ مسلمان جیسے ہی ادھر سے یکسو ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا تا کہ انہیں ان کی عہد شکنی کی سزا دی جائے۔ محاصرے کی شدت نے بنو قریظہ کا دم خم توڑ ڈالا اور وہ سمجھ گئے کہ صلح کی پیشکش کے سوا اور ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ ہمارے بارے میں سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔ چنانچہ حضرت سعدؓ جو غزوۂ خندق میں زخمی ہو چکے تھے وہ مدینہ میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلب فرمایا۔ سعدؓ تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا "سعد! یہ لوگ تمہارے فیصلے پر اترے ہیں" حضرت سعدؓ نے کہا: کیا میرا فیصلہ ان پر نافذ ہوگا؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ انہوں نے کہا: مسلمانوں پر بھی؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ تو آپؐ نے کہا "میرا فیصلہ یہ ہے کہ مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور اموال تقسیم کر لیے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔" حضرت سعدؓ کا یہ فیصلہ انتہائی عدل وانصاف پر مبنی تھا کیونکہ بنو قریظہ نے مسلمانوں سے موت وحیات کے نازک ترین لمحات میں جو خطرناک بدعہدی کی تھی وہ تو انتہائی قابلِ نفرت تھی ہی لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے مسلمانوں کے خاتمے کے لیے ڈیڑھ ہزار تلواریں، دو ہزار نیزے، تین سو زرہیں اور پانچ سو ڈھالیں مہیا کر رکھی تھیں۔ جن پر فتح کے بعد مسلمانوں نے قبضہ کیا۔

یہود کے یہ وہ تین قبائل تھے جو اس طرح سے اپنے انجام کو پہنچے۔ قرآنِ کریم نے جب ان کے بارے میں پیش گوئی فرمائی تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہود کے ان قبائل کا یہ انجام ہوگا۔ ان تینوں میں سے ایک ایک قبیلہ اپنے انجام کی طرف بڑھتا گیا، لیکن قرآنِ کریم کی پیش گوئی کے مطابق کسی طرف سے ان کو مدد نہ پہنچ سکی حالانکہ مدینہ منورہ کے گردو پیش میں پھیلے ہوئے قبائل سے ان کے معاہدے تھے۔ لیکن کوئی معاہدہ ان کے کام نہ آیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

(تھوپ دی گئی ہے ان پر ذلت وہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں۔ سوائے اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لے کر۔ اور ماردی گئی ہے ان پر مسکنت، یہ سب کچھ اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور نبیوں کو بلاوجہ قتل کر ڈالتے تھے اور یہ اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حدود سے نکل جاتے تھے) (۱۱۲)

Marfat.com

قومِ یہود عبرت کا نمونہ

یہود کا وجود اہلِ دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ ہے۔ انسانی اسٹیج پر بے شمار قومیں نمودار ہوئیں جو عروج و زوال کے مختلف ادوار سے گزریں اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ آج تاریخ میں سوائے ان کے ذکر کے کوئی چیز بھی باقی نہیں ہے۔ لیکن یہ واحد قوم ہے جو ہزاروں سال سے دنیا کے سٹیج پر زندہ ہے۔ اس نے زوال کا شکار ہونے کے بعد کبھی عروج کا منہ نہیں دیکھا۔ ایک عظیم منصب سے معزول کیے جانے کے بعد دنیا کی نگاہوں میں بھی کبھی اسے عزت نہیں مل سکی۔ اللہ نے شاید اس کو اسی لیے زندہ رکھا ہے تاکہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ جو قوم اللہ کی ناشکر گزاری کے جرم میں ماخوذ ہوتی ہے اس کے طور اطوار کیا ہوتے ہیں اور وہ کن حوادث کا شکار ہوتی ہے۔ اس قوم کے لیے سنبھل جانے کا آخری موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ تھی۔ لیکن اس موقعہ کو کھو دینے کے بعد دوسرا اس کے لیے کوئی موقع نہیں تھا۔ اس لیے وہ بار بار ایسے مصائب کا شکار ہوتی گئی جس سے دوسری قومیں عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قوم کے افراد میں غیر معمولی ذہانت پائی جاتی ہے، اس نے بڑے بڑے سائنسدان پیدا کیے ہیں۔ عالی دماغ لوگ اس قوم میں پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اللہ کی طرف سے جو ذلت اس پر تھوپ دی گئی ہے وہ کبھی عزت میں تبدیل نہیں ہو سکی۔ ان کی ذہانتیں کبھی خیر کو بالا بلند کرنے میں کام نہ آئیں۔ ان کی ایجادات ہمیشہ ظلم کا ذریعہ بنیں۔ ان کی منصوبہ بندی کی صلاحیت ہمیشہ سازشوں میں استعمال ہوتی رہی۔ اس نے علم کے نام سے دنیا میں وہ وہ برائیاں پھیلائی ہیں، جن کا تصور ہی کپکپا دینے کے لیے کافی ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ جس ملک میں بھی رہے ہیں بالآخر وہاں سے نکالے گئے ہیں اور کبھی بھی انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ یہ دنیا کی امیر ترین قوم سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ان کی دولت کبھی خیر کے کام نہیں آئی۔ گزشتہ صدی میں جرمنی میں، ہنگری میں، اٹلی میں، زیکوسلاویکہ (چیکوسلواکیہ) میں اور دوسرے ملکوں میں باوجود ان کی خوشحالی اور امارت کے جو ان کی گت بن چکی ہے اور جس طرح کا سلوک ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے، وہ یہ بات بتانے کے لیے کافی ہے کہ ذلت کی پھٹکار کسے کہتے ہیں؟ اور اس آیتِ کریمہ میں جو فرمایا گیا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟

R

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں کو یہ خیال گزرتا ہے کہ ماضی میں یہ قوم جیسی کچھ بھی رہی ہو لیکن آج تو اس کی ایک خاص حیثیت ہے جسے دنیا تسلیم کرتی ہے۔ وہ نہایت محدود افرادی قوت کے باوجود ایک بڑے علاقے کو فتح کر چکی ہے۔ وسائل کی انتہائی کمی ہونے کے باوجود وہ سائنسی طور پر اتنی ترقی یافتہ ہو گئی ہے کہ عرب اپنی سارے وسائل کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ اپنے جغرافیے کے اعتبار سے عربوں کے وسیع صحرا کے مقابلے میں ایک گٹھلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ عرب اتنی بڑی افرادی قوت رکھتے ہیں کہ اگر وہ اس کی طرف منہ کر کے تھوکنا شروع کر دیں تو یہ قوم شاید اس کے سیل میں بہہ جائے۔ لیکن آج وہ عربوں کے سینے پر چڑھ کر مونگ دل رہی ہے اور عرب بے بسی سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس ذلت اور مسکنت کی بات کہی ہے یہ تو بالکل اس کے برعکس ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورتِ حال فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک سراب ہے جس کو ہم حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور قرآنِ کریم کی اس آیتِ کریمہ میں جو آج نازل نہیں ہوئیں، بلکہ ڈیڑھ ہزار سال سے اسے قرآنِ کریم میں پڑھا جا رہا ہے اس کی پوری منظر کشی کی گئی ہے اور ڈیڑھ ہزار سال پہلے بتا دیا گیا تھا کہ یہ قوم ہر جگہ ذلیل ہو کر رہے گی بجز دو صورتوں کے۔ ایک حَبْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اور دوسرا حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ

Marfat.com

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: فِی الْکَلَامِ اِخْتِصَارٌ وَالْمَعْنٰی اِلَّا اَنْ یَّعْتَصِمُوْا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ ......الخ یعنی اس کلام میں اختصار ہے۔اس میں اَنْ یَّعْتَصِمُوْا محذوف ہے یعنی ذلت اور مسکنت اس قوم کا مقدر بنادی گئی ہے۔ یہ جہاں بھی رہیں گے ذلیل سمجھے جائیں گے۔ وقتی طور پر کہیں انہیں عروج مل بھی جائے وہ پائیدار نہیں ہوگا۔ وہی عروج ایک وقت گزرنے کے بعد ان کے لیے تباہی کا باعث ہوگا۔ جیسے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح ان پر مسکنت کی پھٹکار ماری گئی ہے یعنی یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی عزتِ نفس سے محروم رہیں گے۔ قومیں انہیں اپنے حق میں استعمال کریں گی اور یہ کرائے کے بدمعاشوں کی طرح ان کی خدمت بجالائیں گے۔ لوگ ان کی بدمعاشی کو ان کی عزت خیال کریں گے حالانکہ بدمعاش کی بظاہر عزت حقیقت میں عزت نہیں ہوتی۔ آج بھی باوجود اس کے کہ انہیں ایک مضبوط ملک میسر ہے اور وہ ایٹمی طاقت بن چکے ہیں، لیکن دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہو اور مزید یہ کہ یہ اپنے ملک میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی خدمت بجالا رہے ہیں۔ عیسائیت جو صلیبی جنگوں کے زمانے سے مسلمانوں کی تباہی کے درپے ہے اور اہلِ مغرب اور امریکہ مختلف لبادے اوڑھ کر ہمیشہ مسلمانوں کی تباہی کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے انہوں نے مسلمانوں کی تباہی کے لیے عربوں کے دل میں ایک خنجر کی طرح انہیں گاڑ رکھا ہے اور ان سے وہ وہی کام لے رہے ہیں جیسے بستی کے چوہدری کرائے کے بدمعاشوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ایک آزاد ملک میسر آ گیا ہے حالانکہ وہ مغرب وامریکہ کے آلۂ کار ہیں اور وہ ان سے وہ کام لے رہے ہیں جو ان کے لیے خود کرنا مشکل ہوتا اور جب کبھی وہ محسوس کریں گے کہ یہ ہمارا پروردہ ہمارے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر اسے تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ یہی بات قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں فرمائی ہے کہ ان کے دنیا میں زندہ رہنے اور کسی حد تک عزت حاصل کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں یعنی اسلام قبول کرلیں تو پھر یہ مسلمانوں کا حصہ ہوں گے اور ان کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہوگی اور یا مسلمانوں سے معاہدہ کرلیں کیونکہ حبل کا معنی جس طرح رسی ہے اسی طرح یہ لفظ معاہدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ملک میں ذمی بن کر یا معاہد بن کر رہنا قبول کرلیں تو اس صورت میں ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں کی ذمہ داری ہو گی۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ گزشتہ صدیوں میں انہیں آرام اور عزت کی زندگی صرف مسلمانوں ملکوں میں میسر آئی ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ان سے فیاضانہ برتاؤ کیا لیکن یہ اپنی عقربی فطرت سے مجبور ہیں۔ جب بھی ان کا بس چلتا ہے یہ نیش زنی ضرور کرتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی رسی کو پکڑ لیں یعنی کسی بڑی قوت کی پناہ میں آجائیں، ان کے مفادات کے ایجنٹ بن کر اپنے لیے مراعات حاصل کرلیں۔ آج کا اسرائیل اس دوسری حیثیت کا حامل ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی کوششوں سے اسے فلسطین میں جگہ ملی۔ عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے اور تاریخ کے چہرے کو بگاڑتے ہوئے یہود کو فلسطین میں بسایا گیا اور پھر انہیں افرادی قوت مہیا کرنے کے لیے روس نے پورے ملک میں پھیلے ہوئے یہود کو اکٹھا کر کے اپنے جہازوں کے ذریعے فلسطین پہنچایا۔ اس طرح سے وہ تمام قوتیں جو مسلمانوں کی بدترین دشمن ہیں انہوں نے اسلام دشمنی میں یہود کے لیے آسانیاں مہیا کیں، ہر طرح اسے سپورٹ کیا اور دیکھے دیکھتے اسے ایٹمی قوت میں تبدیل کردیا۔ اب اس ملک کے دفاع کی فکر یہود کو شاید اتنی نہ ہو جتنی امریکہ اور برطانیہ کو ہے۔ یہ ایک طرح سے امریکہ اور مغرب کی چھاؤنی ہے۔ جسے بوقتِ ضرورت وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس پوری تفصیل سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے یہود کی بقا کے لیے جو راستہ تجویز کیا تھا اسی راستے پر چل کر وہ آج ایک ملک قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ طاقتور ملکوں کی رسی ہے جسے تھام کر ان لوگوں نے اپنے لیے وسائلِ حیات اور ترقی کے وسائل پیدا کیے ہیں۔

Marfat.com

یہود پر ذلت ومسکنت کے اسباب

یہود پر جو ذلت اور مسکنت کی پھٹکار پڑی اور جس طرح یہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرے آیتِ کریمہ کے آخر میں اس کے اسباب بیان فرمائے گئے ہیں۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ ...... الخ یہود باوجود حاملِ دعوت امت ہونے اور باوجود انبیاء کرام کی اولاد ہونے کے اس لیے اپنے انجام بد کو پہنچے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ جب کسی امت کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کی امانت سپرد کرتا ہے تو پھر اس کی رفعت اور سربلندی اس امانت کی پاسداری میں ہوتی ہے۔ وہ جس قدر اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کے نفاذ کے لیے مخلصانہ کوشش جاری رکھے گی اسی قدر اللہ کی عنایات اس کے شاملِ حال ہوں گی۔ لیکن جب وہ اپنی اصل حیثیت کو بھول کر دنیا کی دوسری قوموں کی طرح دنیا طلبی اور حبِّ دنیا میں ڈوب جائے گی، جلبِ زر اس کا مقصد بن جائے گا اور وہ دنیا کے لیے جئے گی اور دنیا کے لیے مرے گی تو پھر باقی قوموں کو تو اللہ تعالیٰ مہلت عطا فرماتے رہتے ہیں لیکن اس امت کو جو اللہ کے دین کی علمبردار اور پاسدار تھی مہلت نہیں ملتی اور اگر مہلت دی جاتی ہے تو اسے دنیا میں عبرت بنا کے رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں دونوں صداقتوں کی شہادت ملتی ہے۔ قومِ عاد وثمود تباہ کر دی گئیں، لیکن قومِ یہود عبرت کے لیے زندہ رکھی گئی ہے اور اس کی تاریخ کے مختلف ادوار اس کا عبرت ہونا بار بار ظاہر کر چکے ہیں۔ غضب خدا کا کہ جس قوم کو نبیوں کی اولاد ہونے پر فخر ہے اور وہ اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے ہیں وہی اللہ کی آیات یعنی کتابِ خداوندی کو بدلتے اور اسے عضوِ معطل بنا کے رکھ دیتے ہیں اور انہی کے ہاتھوں اللہ کے نبی قتل ہوتے رہے ہیں۔ جب بھی نبیوں نے انہیں راہِ راست پہ لانے کے لیے ان کی بداعمالیوں پر تنقید کی اور ان کے سامنے آئینہ رکھا تا کہ وہ اپنی اصل شکل دیکھ سکیں تو بجائے اپنی شکل کی اصلاح کرنے کے انہوں نے آئینہ توڑنے میں عافیت سمجھی۔ حضرت ذکریا علیہ السلام کو سنگسار کیا گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کیا گیا اور نہ جانے کتنے انبیاء ان کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر گئے۔ بنی اسرائیل کے سب سے آخری پیغمبر جو غیر معمولی شان سے تشریف لائے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہیں بھی انہوں نے صلیب پر پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

بِغَیْرِ حَقٍّ کا مفہوم

یہاں قرآنِ کریم نے نبیوں کے قتل کے سلسلے میں بِغَیْرِ حَقٍّ کا لفظ استعمال کیا ہے کہ بنی اسرائیل نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اللہ کے نبی تو معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے کبھی کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوتا جس سے ان کا خون مباح ہو جائے۔ وہ تو جب بھی قتل کیے جائیں گے بے گناہ اور ناحق ہی قتل کیے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہاں بِغَیْرِ حَقٍّ کے استعمال کا کیا مفہوم ہے؟ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مقتول تو اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتا ہے لیکن قاتل اسے گنہگار سمجھ کر قتل کرتا ہے یا عدالت اسے گنہگار سمجھ کر سزا دیتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے کہ بنی اسرائیل نے جب بھی کسی نبی کو قتل کیا ہے تو یہ سمجھ کر نہیں کیا کہ جسے ہم قتل کر رہے ہیں وہ قتل کا واقعی سزاوار ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس نبی کے قتل کو قتلِ ناحق سمجھ کر کرتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدمے کی پوری روداد اب تاریخ کی روشنی میں آ چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدالت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معصوم اور بے گناہ سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل کے اصرار پر عدالت نے انہیں سزا دی اور کہا جاتا ہے کہ عدالت کے جج نے سزا کا حکم سنانے

Marfat.com

سے پہلے اپنے ہاتھ دھو کر لوگوں پر واضح کیا کہ میں اس ظلم سے بری ہوں۔ یہ سب کچھ تمہارے اصرار پر کر رہا ہوں۔ حیرانی کی بات ہے کہ اللہ کے نبی جو انسانیت کے گلِ سرسبد ہوتے ہیں اور انہیں کے سہارے انسانیت سعادت اور کمال کے مدارج طے کرتی ہے، لیکن یہود کا ان کے قتل پر اس حد تک دلیر ہو جانا ناقابلِ فہم بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

(یہود یہ ناقابلِ فہم حرکت اس لیے کر گزرے کہ وہ نافرمان اور حد سے گزر جانے والے لوگ تھے)

جو قوم اللہ کے احکام کی پرواہ نہ کرے اور اسے اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کا خوف لاحق نہ ہو اور جو اللہ کی حدود کو پامال کرتے ہوئے نہ شرمائے اور نہ خوف کھائے ایسی قوم سے پیغمبروں کا قتل کوئی بڑی بات نہیں۔

امتِ مسلمہ آخری امت ہے۔ جسے دنیا کی اصلاح کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ اس امت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ البتہ! نبیوں کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے علماءِ کرام، مجتہدینِ عظام اور مجددین پیدا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے تجدید و احیائے دین کا کام لیں گے اور یہ لوگ اللہ کی دھرتی پر اللہ کی دلیل ہوں گے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ میں گذشتہ صدیوں میں فی الواقع ایسے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انہوں نے ہر قربانی دے کر امت کی اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہی اللہ کی برگزیدہ ہستیاں جو اصلاحِ امت کے لیے پیدا کی گئیں اس امت کے ہاتھوں کبھی عافیت میں نہ رہ سکیں۔ جس نے بھی ان کے سامنے حق کہا اس کی رات آرام سے نہیں کٹی۔ کتنے ایسے علماء گزرے ہیں جنہیں شہید کیا گیا، خود مسلمان ریاستوں میں بڑے بڑے علماء حوالۂ زنداں کیے گئے۔ امام ابوحنیفہ جیسا عظیم آدمی جیل میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ امام احمد ابن حنبل پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے۔ ہماری قریبی تاریخ میں اور پاکستان جیسا عظیم ملک بن جانے کے بعد اس ملک میں اللہ والوں پر کیا کیا قیامتیں نہ ٹوٹیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم میں اللہ کی نافرمانی عام ہو جاتی ہے اور وہ حدود اللہ کو پامال کرنے میں دلیر ہو جاتی ہیں، اس کے بعد اس کے لیے بڑا سے بڑا جرم کرنا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں رہتی۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○

(سب یکساں نہیں، اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ اپنے عہد پر قائم ہے۔ یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدے کرتے ہیں ○ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور معروف کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں ○ اور جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں کو جاننے والا ہے) (۱۱۳ تا ۱۱۵)

Marfat.com

اہلِ کتاب سب یکساں نہیں

یہود و نصاریٰ پر تنقید کے سلسلے میں ان کی بدترین بداعمالیوں کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی طرف سے وہ جس سزا کے سزاوار ٹھہرے اسے بھی بیان فرمایا۔ اس تنقید سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کسی کو بھی شائد ہدایت کی دولت نہیں ملی۔ لیکن قرآنِ کریم چونکہ اپنے اسلوبِ اخبار و انشاء میں نہایت امین واقع ہوا ہے، اس لیے وہ حقِ امانت کی ادائیگی کو کبھی نہیں بھولتا۔ اس لیے یہاں صاف صاف فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ اہلِ کتاب سب ایک جیسے تھے۔ نہیں! انہی لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان سے بالکل مختلف تھے۔ پھر ان کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ جو عہد و میثاق باندھا تھا اور اس کی شریعت پر چلنے کا جو عہد کیا تھا وہ آج بھی پوری طرح اس پر قائم ہیں۔ ان کا اللہ سے تعلق کا حال یہ ہے کہ جب دنیا سو رہی ہوتی ہے تو وہ رات کے اوقات میں اٹھ کر کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ راتوں کو نیند سے اٹھ کر اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہونا اور پھر اس میں کتابِ الٰہی کی تلاوت کرنا یہ اس لیے ہے کہ ان کا اپنے رب سے گہرا تعلق ہے۔ اسی تعلق کے اظہار کے لیے راتوں کو کبھی قیام میں ہوتے ہیں اور کبھی سجود میں۔ سجدہ چونکہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے اور یہی وہ رکن ہے جس میں خشیت اور تذلل اپنے عروج پہ ہوتا ہے۔ آدمی اپنی ساری شخصیت اللہ کی بارگاہ میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ اس لیے بطورِ خاص سجدے کا ذکر فرما کر ان کی بندگی کی تحسین فرمائی ہے اور سجدے کا ذکر کرنے میں شاید یہ مصلحت بھی ہو کہ ان لوگوں کا تعلق اگرچہ اہلِ کتاب سے ہے لیکن یہ باقی اہلِ کتاب سے اس حد تک مختلف ہیں کہ وہ لوگ تو اپنی نمازوں سے سجدے کو نکال چکے ہیں۔ لیکن یہ لوگ راتوں کو اٹھ کر تنہائی میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہ چونکہ اپنے عہد پر قائم رہنے والے لوگ ہیں، اس لیے یہ اللہ پر مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔ یومِ آخرت کا تصور ان کے دل سے محو نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اہلِ کتاب میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اگرچہ ان آیات کے نزول تک اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے لیکن اندر سے وہ بالکل مومنِ صادق تھے۔ قرآنِ کریم نے اور بھی کئی مواقع پر اس گروہ کا ذکر کیا ہے۔ جو تعداد میں اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھے لیکن اپنے علم اور اثر میں دوسرے اہلِ علم سے کم نہ تھے۔ تاریخ ان میں سے کئی بڑے بڑے لوگوں کا تذکرہ کرتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ؕ
وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فَاَهْلَکَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰکِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○

Marfat.com

(بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O مثال اُس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو، اس میں سخت ٹھنڈک ہو اور لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں) (۱۱۶ تا ۱۱۷)

یہود کا قومی تجزیہ

اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے دو باتوں کا احساس ہوتا ہے۔ حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے، لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں یہود کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروہ مخالفین اور معاندین پر مشتمل ہے۔ یہ یہود کا وہ طبقہ ہے جنہیں مذہبی طبقہ کہنا چاہیے۔ جنہیں اسلام دشمنی کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔ ان کے لیے سب سے بڑا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی دعوت بن چکا ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اس دعوت کو روکنا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہود کا دوسرا گروہ وہ ہے جن کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہوا، ان کی تعریف بھی کی گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ جو نیکی بھی کریں گے اللہ اسے کبھی ضائع نہیں فرمائیں گے۔ اس آیتِ کریمہ میں قومِ یہود کے تیسرے طبقے کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ لیکن ان کی اصل دلچسپیاں (جس نے ان کی زندگی کو گھیر رکھا ہے) مال و دولت سے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ یہود قوم سے اور یہودی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی زندگی کے معاملات دولت کے گرد گھومتے ہیں اور دولت کا پرستار فطری طور پر اولاد سے اس لیے زیادہ محبت کرتا ہے تاکہ اسے اپنا وارث میسر آئے اور زندگی میں اس کی دولت کو بڑھانے میں معاون ثابت ہو۔ قرآنِ کریم نے مجموعی طور پر تو پہلے اور تیسرے گروہ پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار کا ذکر فرمایا اور قیامت کے دن ان کے بارے میں اللہ کے غضب کی خبر دی اور اس آیتِ کریمہ میں جن لوگوں کو ان باتوں کی پرواہ نہیں ان پر صرف ایک ہی بات کی دھن سوار ہے، وہ ہے دولت اور اولاد۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ان کی دولت اور اولاد قیامت کے دن اللہ کے عذاب سے انہیں بچا نہیں سکیں گی۔ انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے اور انہوں نے یہ جو عقیدے تراش رکھے ہیں کہ ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی، اگر جہنم میں جانا پڑا بھی تو زیادہ سے زیادہ چالیس دن کے لیے ہوگا۔ ان کی غلط فہمی پر چوٹ لگاتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ جہنم کی آگ میں ہمیشہ جلیں گے۔

دولت مند آدمی اگرچہ ہوسِ دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے اور اسے اقدارِ انسانیت یا مذہب سے کوئی رشتہ کم ہی باقی رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن قوموں میں مذہبی تصورات کی کسی حد تک بھی حکمرانی رہتی ہے ان کا برگشتہ طبقہ بھی بالکل اس سے دور ہٹنے پر قادر نہیں ہوتا۔ انہیں کبھی نہ کبھی آخرت کا خیال آتا ہے اور پھر اس کے لیے وہ صدقہ و خیرات کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کہ یہ جو ہم اللہ کے راستے میں اس قدر خرچ کرتے ہیں۔ نیازیں پکواتے ہیں، مسجدوں میں قالین بچھواتے ہیں، بعض دفعہ اپنی شہرت کے لیے غریبوں میں خشک راشن تقسیم کرتے ہیں۔ یہ یقیناً ہماری مغفرت کے لیے کافی ہوگا۔ ایسے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے

Marfat.com

لیے پروردگار نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کے خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی تیار کھیتی پر پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو برباد کر کے رکھ دے۔ کھیتی کا مالک یہ سمجھتا ہے کہ کھیتی کے کٹنے کی دیر ہے، غلے کے کھلیان لگ جائیں گے اور پھر غلہ بکے گا اور دولت کی ریل پیل ہو جائے گی۔ وہ اسی تصور میں مست رہتا ہے، لیکن اس وقت اس کی محرومی کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب کہ ایک ٹھنڈی آگ اس کی کھیتی یا اس کے باغ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ کفر اور شرک کے ساتھ اللہ کے راستے میں کچھ بھی خرچ کیا جائے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں کیونکہ کفر و شرک ٹھنڈی آگ کی طرح ہیں جو ساری محنت کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

انفاق سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ

معلوم ہوتا ہے ہر دور میں مذہب سے واجبی رشتہ رکھنے والے بدعمل اور بے عمل لوگوں کی ہمیشہ یہ غلط فہمی رہی ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے ایمان و عمل کے بغیر بھی جنت خریدی جاسکتی ہے۔ وہ ایمان و عمل کی ہر خرابی میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے رفاہی کاموں کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہر دور میں ملے گی جو نہ ایمان کی پروا کرتے ہیں نہ عملِ صالح کی۔ لیکن رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ گنگا رام اور گلاب دیوی ہسپتال غیر مسلموں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہماری بعض تعلیمی ادارے کسی نہ کسی غیر مسلم کی سخاوت و فیاضی کا ثبوت ہیں۔ ایسے ہی بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تھے۔ انہی میں ایک شخص ابن جدعان رفاہی خدمات میں بہت مشہور تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بطورِ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ آپؐ نے فرمایا وہ جہنم میں جائے گا کیونکہ اس نے کبھی اپنے اللہ سے یہ التجا نہیں کی تھی کہ یا اللہ میرے گناہ معاف فرما دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے اپنا نام رجسٹرڈ کروانا اور اللہ کی کبریائی کو اپنی زندگی اور معاملات پر حاوی کرنا اور اس کے احکام کو زندگی کا چلن بنانا نجات کے لیے شرطِ اول ہے۔ اس کے بعد صدقہ و خیرات، سخاوت و فیاضی اور رفاہی خدمت کی قیمت پڑتی ہے ورنہ ان خدمات کا کوئی صلہ اللہ کے یہاں سے نہیں ملے گا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ جو غیر مسلم فاہی کاموں میں خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا میں ان کے رزق میں اضافہ فرما دیتے ہیں۔ لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی حاکیت، الوہیت اور کبریائی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے بغیر ان کا سارا کیا کرایا ضائع ہو جائے گا اس کی کوئی قیمت نہیں پڑے گی۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہئے کہ ان کے تمام رفاہی کاموں کا ضائع ہو جانا یہ اللہ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں بلکہ یہ وہ ظلم ہے جس کا ارتکاب خود وہ بندے کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ ان کا دل و دماغ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور اسے اللہ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے جسم کا انگ انگ بھی اللہ کی چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ لوگ اپنی جسمانی قوتیں اور دل و دماغ کی رعنائیاں غیر اللہ کے حوالے کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں کہ ان چیزوں کو اللہ نے پیدا اپنے لیے کیا تھا اور انہوں نے انہیں غیروں کے حوالے کر دیا۔ یہی وہ ظلم ہے جس کا وہ خمیازہ بھگتتے ہیں ورنہ اللہ کی ذات تو رحیم و کریم ہے۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ O

(اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دان باہر والوں کو وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ وہ پسند کرتے ہیں اس چیز کو جو تمہیں مشقت میں ڈالے۔ ظاہر ہو چکی ہے عداوت ان کے مونہوں سے۔ جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی ترجیحات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو) (۱۱۸)

آیت میں چند الفاظ لغوی طور پر وضاحت طلب ہیں۔ بِطَانَةٌ کپڑے کا وہ حصہ جو اندر کی جانب ہوتا ہے اور جسم سے ملا ہوتا ہے اس کو بِطَانَةُ الثَّوْبِ کہتے ہیں۔ لحاف کے استر کو بِطَانَةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس آدمی کو جس پر کامل اعتماد اور بھروسہ ہو اور جسے آدمی اپنا ہمراز سمجھتا ہو اسے بھی بِطَانَةٌ کہا جاتا ہے۔ بِطَانَةُ الرَّجُل سے آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص مراد ہوتے ہیں۔

لَا يَاْلُوْنَ کا معنی ہے وہ کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ لَا يَاْلُوْ فِی الْاَمْرِ کا معنی ہے کسی معاملے میں کسر نہ اٹھا رکھنا۔

خَبَالًا جسمانی، عملی اور عقلی خرابی اور فساد کو خَبَالٌ یا خَبَلٌ کہتے ہیں۔

انصار اور یہود کے تعلقات کا پس منظر

یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ اوس و خزرج کے لوگ مدینے کے یہود سے دیرینہ مراسم رکھتے تھے۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور اٹھنا بیٹھنا چلا آ رہا تھا۔ یہود چونکہ اپنے دین کو تبلیغی دین نہیں سمجھتے اس لیے انہیں اس پر اصرار نہیں تھا کہ اوس و خزرج کے لوگ ان کا دین قبول کر لیں۔ اس طرح دینی معاملات میں دونوں فریق اپنی اپنی جگہ یکسو تھے۔ یہود چونکہ اہلِ کتاب اور صاحبِ علم تھے اس لیے اوس و خزرج اپنی بعض رسوم کی ادائیگی میں ان کی طرف رجوع کرتے، اپنے معاملات میں ان سے فیصلے کرواتے اور وہ چونکہ مالدار لوگ تھے اس لیے اپنی ضرورتوں کے تحت ان سے قرض بھی لیتے۔ دو اچھے ہمسایوں کے جیسے تعلقات ہوتے ہیں صدیوں سے ان میں قائم تھے۔ جب کبھی ان میں آپس میں تلخی ہوتی تو بعض یہودی علماء اوس و خزرج کو یہ کہہ کر ڈراتے کہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہم ان کے ساتھ مل کر تمہاری زیادتیوں کا تم سے انتقام لیں گے اور تمہیں اپنا مفتوح بنا کے رکھیں گے چنانچہ جیسے ہی اہلِ مدینہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کی اطلاع پہنچی انہوں نے آگے بڑھ کر اس خیال سے کہ یہود پہلے ایمان قبول کر کے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہ ہو جائیں ایک دوسرے کو مشورہ دیا کہ ہمیں آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آنا چاہیے۔ چنانچہ چند سالوں میں ان دونوں قبیلوں کے بیشتر لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے اور پھر آپ کو مدینہ طیبہ آنے کی دعوت دی۔ ان کی دعوت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے آئے اور ایک اسلامی ریاست کو وجود بخشا۔ اب اوس و خزرج اس انتظار میں تھے کہ یہ یہود جس نبی کی آمد سے ہمیں ڈرایا کرتے تھے وہ اب تشریف لا چکے ہیں یہ یقیناً آگے بڑھ کر ان کا دامن تھامنا چاہیں گے، لیکن ان کی حیرانی کی

Marfat.com

انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ یہود تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر تل گئے ہیں اور وہ انہیں بھی طریقے طریقے سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں جو ذہین اور بیدار مغز لوگ تھے وہ تو یہود کی اصل حقیقت کو پہچان گئے لیکن عام لوگوں میں ابھی تک یہ خوش فہمی پائی جاتی تھی کہ یہود چونکہ اصحابِ علم ہیں اس لیے ہمیں ان کے علم سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر ان سادہ دل مسلمانوں کی خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ آیاتِ کریمہ میں ان کے چہرے سے پوری طرح نقاب کھینچ کر اتار دیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں یہود کے بارے میں یکسو ہو جانا چاہیے۔ ان سے دنیوی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ حالات اجازت دیں تو ان کے ساتھ کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کے ملک میں اسلامی مملکت کے باشندے بن کر رہیں یا مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ میں شریک ہوں تو ان کے حقوق کی پاسداری کرنا اسلام کی تعلیم ہے۔ اگر ان کے ساتھ ہمسائیگی ہو تو جس طرح مسلمان ہمسائے کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جاتے ہیں اور مروت سے کام لیا جاتا ہے بالکل اسی طرح ان سے بھی لیا جائے گا۔

اہلِ کتاب کو ہمراز نہ بناؤ

لیکن جہاں تک قلبی تعلقات اور ہمراز بنانے کا تعلق ہے یہ غلطی کبھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایک نظریاتی مملکت کا تمام تر انحصار اپنی نظریاتی قوت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص یا ایک ایسی قوم جو اس نظریے کو نہ صرف قبول کرنے سے انکار کرے بلکہ ہر ممکن طریقے سے دشمنی کا راستہ اختیار کرے تو کوئی بھی نظریاتی قوم ایسے لوگوں کے ساتھ قلبی اور گہرے تعلقات نہیں رکھ سکتی کیونکہ اس سے نظریاتی قوت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے۔ اگر اس کو آپ اپنا میر منشی بنا لیں تو بہتر ہوگا۔ اس پر فاروق اعظم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

قَدِ اتَّخَذْتُ اِذًا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

(اگر میں ایسا کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کو چھوڑ کر دوسری ملت والے کو رازدان بنا لیا ہے)

جو نصِ قرآن کے صریح خلاف ہے۔ یہود جیسی قوم جن کی دشمنی تاریخ کا حصہ ہے، ان کی ہمیشہ آرزو رہتی ہے کہ وہ تمہیں کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کریں۔ تم ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر دیکھو تمہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے ہزار چھپانے سے بھی ان کے اندر کا بغض چھپنے میں نہیں آتا۔ کسی نہ کسی بات کے حوالے سے اندر کی بات باہر آ جاتی ہے۔ ان کے سینوں میں کینہ و بغض کی جو بھٹی سلگ رہی ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔ انفرادی معاملات میں بھی ایک غیر مخلص آدمی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جہاں تک قومی معاملات کا تعلق ہے وہ چونکہ ملک و ملت کے اجتماعی مفاد سے متعلق ہوتے ہیں اس لیے ان میں کسی ایسے شخص یا ایسی قوم کے افراد کو اعتماد میں لینا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے قومی راز دوسروں تک پہنچتے ہیں اور دشمن ایسی باتوں سے باخبر ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ بڑی آسانی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور پھر جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ وہ انہیں اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھتے ہیں اور ان کی باتوں کی کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کی اسی سادگی اور ان کی عیاری سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

Marfat.com

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ
وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ
مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ O

(یہ تمہی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اورامرِ واقعہ یہ ہے کہ تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو! تم اپنے غصے میں مرجاؤ، اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے) (119)

مسلمانوں کی سادگی اور یہود کی عیاری

ھَا حرف تنبیہ ہے۔ یہ ضمیرِ خطاب اور اُولَآءِ کے درمیان میں آئی ہے۔ اس طرح ھَا کا استعمال تاکید پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں نہایت مؤکد انداز میں مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح ان کی دشمنی میں کوئی ابہام نہیں۔ وہ ہر شبہے سے بلند ہے۔ اسی طرح تمہاری سادگی میں بھی کوئی کلام نہیں۔ ان کی بات بات سے دشمنی جھلکتی ہے اور ان کی کوئی بات ایسی نہیں جس سے ان کی دوستی پر دلیل لائی جاسکے۔ لیکن تمہاری سادگی کا کیا کہنا کہ تم اس کے باوجود ان سے دوستی کا دم بھرتے ہو حالانکہ تمہاری بہت سی باتیں ان کے لیے دوستی کی دلیل بن سکتی ہیں۔ لیکن وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات کو بھی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اور جو انہوں نے طرزِ عمل اپنالیا ہے اس میں تبدیلی کے لیے آمادہ نہیں۔ اب تک جتنی کتابیں ان پر نازل ہوئی ہیں۔ تم سب پر ایمان رکھتے ہو بلکہ اب تمہارا ایمان قرآنِ کریم پر ہے جو درحقیقت مکمل کتاب ہے۔ اس سے پہلے دنیا میں اترنے والی کتابیں اسی کتاب کے اجزاء ہیں۔ جو مختلف قوموں کو عطا ہوئے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے تورات کو کتاب کا ایک حصہ قرار دیا۔ یہود کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا)

اس سے مراد یہودی ہیں جنہیں بظاہر پوری کتاب دی گئی۔ لیکن حقیقت میں وہ کتاب قرآنِ کریم کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح باقی کتابیں بھی قرآنِ کریم کے اجزاء ہیں۔ ہر دور میں اور ہر قوم پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی کتاب یا صحیفہ اترتا رہا ہے اور وہ ان کی ضرورت کے لیے کافی ہوتا تھا۔ جب انسانیت بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی تو انسان کو ایک مکمل کتاب سے نوازا گیا، جو قیامت تک ان کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ یہاں یہی فرمایا گیا ہے کہ تم تو ایک مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور انہیں کتاب کے اجزاء دیے گئے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت اس مکمل کتاب کی قدر کرتے۔ اس پر ایمان لاتے اور اسلام اور مسلمانوں سے مخلصانہ تعلق قائم کرتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ تم اپنے پاس مکمل کتاب رکھتے ہوئے بھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہو اور وہ ایک نامکمل کتاب اور محرف کتاب رکھتے ہوئے بھی تمہاری دوستی کے جواب میں دشمنی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ ہر قدم پر تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو تم سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور جب وہ آپس میں علیحدہ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ تم ان کی دوستی کے فریب میں مت آؤ۔ یہ تمہاری دشمنی کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اس لیے بجائے ان سے دوستی کرنے کے ان سے کہو کہ ہم تمہارا اصل چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اب ہم کسی فریب میں آنے کے لیے تیار نہیں تم اپنے غیظ وغضب سے اگر نکل نہیں سکتے تو پھر اسی میں مر رہو یہی تمہارا انجام ہے۔ تم ہمیں تو سخن سازی سے دھوکا دے سکتے ہو لیکن اس کا کیا کرو گے کہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

(اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے کھل اٹھتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی کوئی تدبیر تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے) (۱۲۰)

یہود سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

اس آیتِ کریمہ میں یہود کے بارے میں آخری بات فرمائی گئی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کیسی ہی دشمن کیوں نہ ہو لیکن وضع دار افراد کی طرح وضعدار قومیں بھی اپنی وضع کا بھرم قائم رکھنے کے لیے ایسے تعلقات ضرور رکھتی ہیں جس سے باہمی مفادات کسی نہ کسی حد تک قائم رہتے اور بعض دفعہ پروان بھی چڑھتے ہیں۔ لیکن ان بدبختوں کا حال تو یہ ہے کہ تمہیں اگر کوئی خوشی میسر آتی ہے یا کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو ان سے وہ بھی گوارا نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ اگر کوئی مصیبت پڑتی ہے، کوئی نقصان ہوتا ہے، کوئی ارضی وسماوی آفت آتی ہے تو یہ اس سے نہایت شاداں وفرحاں ہوتے ہیں۔ اندازہ فرمائیے! کس طرح ایک ترتیب سے پروردگار نے قومِ یہود کو مسلمانوں کے سامنے تعلقات کے حوالے سے بالکل کھول کے رکھ دیا ہے۔ ذرا اس ترتیب کو ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ وہ ہر ممکن طریقے سے تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں اور کوئی سی خرابی کی بھی ان سے امید کی جاسکتی ہے۔

۲۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی آرزو پوری ہوگئی۔ گویا ان کی تمناؤں میں بھی دشمنی گھر کر چکی ہے۔

۳۔ وہ مانے ہوئے سخن ساز اور ڈپلومیٹ ہیں۔ کبھی دل کی بات زبان پر نہیں آنے دیتے۔ لیکن مسلمانوں کی دشمنی ان کی ایک ایسی کمزوری بن گئی ہے کہ ہزار چھپائے بھی چھپتی نہیں بلکہ کہیں نہ کہیں ان کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ رہی وہ دشمنی جن سے ان کے سینے آباد ہیں اس کی تو انتہا ہی کوئی نہیں۔

۴۔ پالیسی ساز ادارے تو ایک طرف رہے عام افراد کا حال بھی یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے تمہیں بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے ایمان کا یقین دلاتے ہیں۔ لیکن جب آپس میں علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے تمہارے خلاف انگلیاں کاٹتے ہیں۔

۵۔ قوموں کی ظاہرداری یا نام نہاد وضع داری بھی ان کی دشمنی پر قربان ہو چکی ہے وہ بہرصورت دشمنی پہ جیتے اور دشمنی پہ مرتے ہیں۔

Marfat.com

ایک ایسی قوم کہ جس کی قومی زندگی پر یہ پانچ باتیں غالب ہوں اور وہ مسلمانوں کے حوالے سے ان کمزوریوں کے حامل بن چکے ہیں کیا مسلمانوں کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں؟ چنانچہ جب یہ تفصیلات عہد نبوت کے مسلمان کے سامنے آئیں تو انہوں نے یہود سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیے کیونکہ انہیں بہر صورت اسلام کا مفاد عزیز تھا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے مقابلے میں کسی کی محبت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن آج کا مسلمان وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں اس سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ ''کروسیڈ'' کا لفظ کتنی دفعہ ان کی زبانوں سے ابل چکا ہے اور ان کی تلواریں ہر جگہ مسلمانوں کا خون پینے پر مصر ہیں۔ ان کی پالیسیاں مسلمانوں کو ختم کرنے کی غماز ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ایک ملک کو دوسرے مسلمان ملک کے خلاف استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ بر و بحر میں انہوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ با ایں ہمہ! ہم ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے پر مصر ہیں۔ وہ قدم قدم پر زہر اگل رہے ہیں۔ ہم اسے اپنے لیے آبِ حیات سمجھتے ہیں۔

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

آیتِ کریمہ کے آخر میں دشمنانِ دین کا عموماً اور یہود کی دشمنی سے بچنے کا خصوصاً ایک علاج تجویز کیا گیا ہے اور اس علاج کے نتیجے میں مکمل ضمانت دی گئی ہے کہ ان کی ہر تدبیر ناکام ہوگی اور وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ نسخہ نہایت مختصر ہے لیکن نہایت مجرب۔ جب بھی مسلمانوں نے اللہ کے عطا کردہ اس نسخۂ شفا کو آزمایا ہے تو اللہ نے انہیں ہمیشہ دشمن کی ہر تدبیر سے بچایا اور ہر مصیبت سے شفا بخشی ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے دشمنوں کی کوئی تدبیر، کوئی منصوبہ اور کوئی چال تمہیں نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اب ہم دونوں الفاظ کی الگ الگ وضاحت کرتے ہیں۔

صبر کا مفہوم

صبر کا معنی ہے ''اڑ جانا، ثابت قدم رہنا، رک جانا، مضبوطی سے اپنے مؤقف پر قائم رہنا اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا'' اہلِ علم نے اسے تین دائروں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا پہلا دائرہ ''اطاعت'' ہے۔

۱. صَبرٌ عَلَی الطَّاعَاتِ

اس لحاظ سے صبر کا معنی ہے صَبرٌ عَلَی الطَّاعَاتِ (اللہ کے احکام اور اس کی عطا کردہ ہدایات پر مضبوطی سے عمل کرنا اور قائم رہنا) اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے اور زندگی کا ہر شعبہ اس میں سمٹ جاتا ہے۔ عبادات بھی اس میں شامل ہیں، معاشرت اور معیشت بھی، سیاست اور حکومت بھی، فرائض اور حقوق بھی اور قومی اور بین الاقوامی آداب بھی۔ ان تمام حوالوں سے پروردگار نے جو شریعت عطا فرمائی ہے اور ہر ایک کے بارے میں جو احکام دیے ہیں ان میں سے ہر حکم پر پابندی سے عمل کرنا اور حالات چاہے اجازت دیں یا نہ دیں ہر حال میں اس پر ثابت قدم رہنا یہ صَبرٌ عَلَی الطَّاعَاتِ ہے اور یہ مومن کی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔

Marfat.com

۲. صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَاتِ

دوسرا ہے صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَاتِ آدمی کا نفس، اس کی خواہشات، اس کی آرزوئیں اور اس کے مفادات جب اللہ کی نافرمانی پر اکسائیں اور ایسے کام کرنے پر مجبور کریں جنہیں اللہ کی شریعت نے روکا ہے اور شیطان پوری طرح دلوں میں یہ بات ڈال دے کہ اگر تم اللہ کے احکام پر چلتے رہے تو تمہاری زندگی دکھوں میں گزرے گی، تم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلاسکو گے۔ تم ساری عمر کرائے کے مکان میں گزارا کرو گے۔ اگر تم آسائش اور آرام کی زندگی چاہتے ہو تو پھر شریعت کی پابندیوں کو کچھ نہ کچھ ڈھیلا کرنا پڑے گا کیونکہ آج کے دور میں اپنے آپ کو ہر طرح سے بچا کے رکھنا ممکن نہیں۔ تمہارے گردوپیش میں سب رشوت لے رہے ہیں۔ سارے اس گنگا میں ہاتھ دھور ہے ہیں۔ اب لوگوں کی نگاہ میں عزت ان لوگوں کی ہے جن کے پاس پیسہ اور لمبی کار ہے۔ اس آدمی کی کوئی عزت نہیں جو سائیکل پہ آتا جاتا اور شریعت کی حدود میں سمٹ کر رہتا ہے۔ ایسے بہلاووں اور ایسے بہکاووں کے مقابلے میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور نہایت پابندی سے حالات کا مقابلہ کرنا، نہ گناہوں کو قریب آنے دینا اور نہ گناہوں کے قریب جانا یہ صَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَاتِ ہے۔

۳. صَبْرٌ عَلَى الْمَصَائِبِ

تیسرا ہے صَبْرٌ عَلَى الْمَصَائِبِ آدمی صراطِ مستقیم پر چلنے کا فیصلہ کرلے اور پختہ تہیہ کرلے کہ میں کسی حرام چیز کے قریب نہیں جاؤں گا اور مجھے بہر صورت حلال کمانا اور بچوں کو حلال کھلانا ہے اور اگر مجھ سے غلط کام لینے کی کوشش کی گئی تو میں کسی طرح اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ وہ روش ہے جس کے مقابلے میں مصیبتیں سر اٹھاتی ہیں۔ ایک شریف آدمی کا جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے۔ بیوی کی فرمائشیں اور ہر فرمائش کے ساتھ آنکھوں میں جھلملاتے آنسو زندگی ویران کر دیتے ہیں۔ بچوں کو دائیں بائیں سے بہکایا جاتا ہے کہ تمہارا باپ اگر چاہے تو تمہارے لیے زندگی کی ہر آسائش مہیا کر سکتا ہے۔ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح پُرتعیش زندگی گزار سکتے ہو۔ اولاد ان باتوں سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو محروم سمجھ کر باپ کے سامنے محرومی کا رونا روتی ہے۔ بچوں کی آنکھوں سے ابلتا ہوا ایک ایک آنسو باپ کے دل ودماغ کے لیے انگارہ بن جاتا ہے۔ سخت سے سخت دل باپ بھی ڈولنے لگتا ہے اور اس کا دل مجبور کرتا ہے کہ بچوں کی محرومیوں کے ازالے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔ یہ اور اس طرح کے اور مصائب ہیں جو آدمی کو ہلا ڈالتے ہیں۔ ایسے تمام مصائب پر حوصلہ مندی سے صبر کرنا ایک مومن کی شان ہے اور یہاں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ کے احکام پر پوری توانائی کے ساتھ عمل کرنا اور زندگی کی کسی اور بات کو کبھی اس پر ترجیح نہ دینا اور اس کی نافرمانی کو کبھی قریب بھی نہ پھٹکنے نہ دینا۔ اس راستے پر چلتے ہوئے مصائب کے طوفان اٹھیں گے، ان کے سامنے پہاڑوں جیسے عزم واستقلال کے ساتھ ڈٹے رہنا، ہر دکھ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، ہر محرومی کو اللہ کی جانب سے آزمائش سمجھنا، لوگوں کے سارے اکساووں اور بہلاووں کے باوجود اپنے آپ کو سمیٹ کر رکھنا اور آخرت میں اللہ کے انعامات کا یقین رکھنا یہ وہ طرزِ زندگی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی ضمانت دی ہے۔ یہی طرزِ زندگی اور آخرت میں اللہ کے انعامات پر یقین، جب دل کی آرزو اور دل کی پکار بن جائے تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔

Marfat.com

تقویٰ کا مفہوم

تقویٰ اصل میں ''وقویٰ'' ہے، جس کا معنی ہے بچنا، پرہیز کرنا اور لحاظ کرنا۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا ''تقویٰ کسے کہتے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا ''امیر المؤمنین آپ کو کبھی ایسے راستے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ''بارہا۔'' انہوں نے پوچھا ''تو ایسے موقعہ پر آپ کیا کرتے ہیں؟'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا ''میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور کپڑے اوپر اڑس لیتا ہوں اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھلی آنکھوں سے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہوا چلتا ہوں کہ کانٹے دامن میں الجھ کر اسے تار تار نہ کر دیں۔'' حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ نے کہا ''بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔''

زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے دونوں طرف افراط و تفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات کی گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے اس راستے پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے۔ صبر کے ساتھ جب یہ قوت شامل ہوتی ہے تو ایک ایسا مضبوط کردار مومن کے اندر جنم لیتا ہے جس کے مقابلے میں کفر اور اس کی پیدا کردہ مشکلات خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم یہود کے مقابلے میں صبر اور تقویٰ کی تصویر بن جاؤ تو تمہارا ایک ایک عمل ایک چراغ کی طرح چمک اٹھے گا اور تم دیکھو گے کہ راستے کے اندھیارے کس طرح روشنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور تمہاری قربانیاں کس طرح تمہارے مصائب کو سمیٹنے لگتی ہیں۔ تمہارے اعمال اگر ایک طرف انسانوں کو راہِ راست کی طرف کھینچیں گے تو دوسری طرف اللہ کی نصرت و تائید تمہارے شاملِ حال ہو گی۔ تمہارا اپنے اللہ پر یقین روز بروز بڑھتا جائے گا۔ تم محسوس کرو گے کہ میں ایک مضبوط حصار میں ہوں جسے کوئی وقت کا طوفان مسمار نہیں کر سکتا۔ بڑے سے بڑا دشمن تمہیں راہِ راست سے ہٹانے میں ناکام رہے گا۔ تم بجائے سراسیمہ ہونے کے اللہ پر اعتماد کی وجہ سے قوت اور طاقت کا سرچشمہ بن جاؤ گے۔ کوئی بڑی سے بڑی دھمکی تمہیں راہِ راست سے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکے گی۔ ایسے افراد پر مشتمل جب ایک جماعت یا قوم تیار ہوتی ہے تو ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے کہ جس سے ٹکرانا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے لیے زندگی اور موت بے معنی لفظ بن جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اللہ کی رضا، اس کے دین کی بالادستی اور اس کے بندوں کی خدمت کے سوا کوئی اور ایسا مقصد نہیں ہوتا جسے وہ ان مقاصد پر ترجیح دے سکیں۔ وہ زندہ رہتے ہیں تو اسی مقصد کی توانائی کے لیے اور وہ مرتے ہیں تو اسی مقصد کی آبیاری کے لیے۔ مقصد کے یہ وفادار لوگ ایسے لوگوں کے ساتھ کبھی گہرے اور محبت کے تعلقات استوار نہیں کر سکتے جنہیں ان کے مقصد سے تعلق کی بجائے دشمنی ہو۔ دشمن چاہے کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو وہ چونکہ اپنے اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس طرح ہمیں دیکھ رہا ہے اسی طرح ہمارے دشمنوں اور ان کی تمام منصوبہ بندیوں کو بھی گھیرے ہوئے ہے۔ اس لیے ہمارا بڑے سے بڑا دشمن بھی ہمیں ایسا نقصان نہیں پہنچا سکتا جس سے ملی تشخص کے بے آبرو ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

Marfat.com

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ
مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ
مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ ؕ
بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ
رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ
لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

رکوع: ۱۳۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب اے پیغمبر تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے، بٹھا رہے تھے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ○ جب ارادہ کیا تم میں سے دو جماعتوں نے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا اور اللہ ہی پر چاہئے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں ○ اور اللہ نے تمہاری مدد بدر میں بھی کی

Marfat.com

جبکہ تم نہایت کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ اس کے شکر گزار رہ سکو O یاد کرو! جب اے پیغمبر! تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے O ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن تمہارے اوپر اچانک آ دھمکے تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے O اور نہیں بنایا اس کو اللہ تعالیٰ نے مگر تمہارے لیے بشارت تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد نہیں آتی مگر اللہ کی جانب سے جو غالب اور حکمت والا ہے O تا کہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انہیں رسوا کر دے کہ وہ خوار ہو کر لوٹیں O اے پیغمبر! تمہیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے، بے شک وہ ظالم ہیں O اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) (۱۲۱ تا ۱۲۹)

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O

(اور اس وقت کو یاد کرو جب اے پیغمبر تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے، بٹھا رہے تھے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے O جب ارادہ کیا تم میں سے دو جماعتوں نے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں) (۱۲۱ تا ۱۲۲)

غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ

مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے گزشتہ آیتِ کریمہ میں صبر اور تقویٰ کو لازمی شرط اور ضمانت کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ جنگِ احد میں چونکہ مسلمانوں کو بظاہر شکست سے دوچار ہونا پڑا اس لیے ضرورت پیدا ہوئی کہ یہ دیکھا جائے کہ مسلمانوں کی فتح و نصرت چونکہ ان دو صفات پر مدار رکھتی ہیں تو کیا جنگِ احد میں ان میں کہیں کمی واقع تو نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اتنا بڑا واقعہ پیش آیا۔ جنگِ احد کا واقعہ چونکہ ان آیات کے نزول کے زمانے ہی میں پیش آیا ہے اس لیے اس جنگ کے وقوع اور ان آیات کے نزول نے ایک تقریب پیدا کر دی جس کی وجہ سے قرآنِ کریم نے پیش نظر آیتِ کریمہ سے جنگِ احد کے حالات پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک تمہید اٹھائی ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ جنگِ احد میں مسلمان اتنے بڑے نقصان سے دوچار کیوں ہوئے۔ تمہید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگ کی خاطر گھر کے نکلنے سے واقعات کا آغاز کیا گیا ہے۔

جنگ بدر کو گزرے ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ لیکن یہ سال قریش نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارا تھا۔ ان کے لیے مسلمانوں کے ہاتھوں یہ شکست ایک ایسا المیہ تھا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں جیسی کمزور طاقت سے وہ اتنے بڑے حادثے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا شکست خوردہ لشکر واپس مکہ پہنچا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ کوئی شخص اپنے

Marfat.com

مقتولوں پر رونے کی غلطی نہ کرے تا کہ یہ صدمہ آنسوؤں میں تحلیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کا یہ صدمہ آتشِ انتقام کو بڑھکاتا چلا گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جنگِ بدر سے پہلے جو قافلۂ تجارت ایک بڑے نفع کے ساتھ واپس آیا تھا وہ سارا نفع تقسیم کرنے کی بجائے اس جنگ کا انتقام لینے پر صرف کیا جائے۔ چنانچہ وہ جنگ کے دوسرے ہی سال یعنی شوال ۳ ہجری میں تین ہزار کا لشکرِ جرار لے کر نکلے اور جوش حمیت کو تیز کرنے کے لیے ان کی عورتیں بھی ساتھ آئیں جن کی قیادت ابوسفیان کی بیوی ہند کر رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس ساری نقل وحرکت اور جنگی تیاریوں سے متعلق پوری تفصیلات لکھ بھیجیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاصد نے پانچ سو (۵۰۰) کلومیٹر کی مسافت صرف تین دن میں طے کر کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دی۔ جب قریش کا لشکر احد کے میدان میں پہنچ گیا تو آپؐ نے اکابر مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ طلب کی۔ آپؐ نے ان کے سامنے اپنا خواب بیان فرمایا کہ واللہ! میں نے ایک بھلی چیز دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح کی جا رہی ہیں اور میں نے دیکھا کہ میری تلوار کے سرے پر کچھ شکستگی ہے اور یہ بھی دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ زرہ میں داخل کیا۔ پھر آپؐ نے گائے کی یہ تعبیر فرمائی کہ کچھ صحابہ قتل کیے جائیں گے۔ تلوار میں شکستگی کی یہ تعبیر بتلائی کہ آپ کے گھر کا کوئی آدمی شہید ہو گا اور محفوظ زرہ کی یہ تعبیر بتلائی کہ اس سے مراد شہر مدینہ ہے۔ پھر آپؐ نے صحابہ کرام کے سامنے دفاعی حکمتِ عملی کے متعلق اپنی رائے پیش کی کہ مدینے سے باہر نہ نکلیں بلکہ شہر کے اندر ہی قلعہ بند ہو جائیں۔ اب اگر مشرکین اپنے کیمپ میں مقیم رہتے ہیں تو بے مقصد ہو گا اور اگر مدینے میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمان گلی کوچے کے ناکوں پر ان سے جنگ کریں گے اور عورتیں چھتوں کے اوپر سے ان پر خشت باری کریں گی۔ یہی صحیح رائے تھی اور اسی رائے سے عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے بھی اتفاق کیا جو اس مجلس میں خزرج کے ایک سرکردہ نمائندہ کی حیثیت سے شریک تھا۔ جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ جنگ سے دور بھی رہے اور کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا اس نے چاہا کہ یہ شخص اپنے رفقاء سمیت پہلی بار رسوا ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی آستین میں کتنے سانپ رینگ رہے ہیں۔ چنانچہ نوجوان صحابہ کی ایک جماعت نے جو شوقِ شہادت سے بے تاب ہو رہے تھے اس بات پر اصرار کیا کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ بعض صحابہ نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم تو اس دن کی تمنا کیا کرتے تھے اور اللہ سے اس کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اب اللہ نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے اور میدان میں نکلنے کا وقت آ گیا ہے تو پھر آپ دشمن کے مدمقابل ہی تشریف لے چلیں، وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم ڈر گئے ہیں۔

ان گرم جوش حضرات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرفہرست تھے جو معرکۂ بدر میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ''اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی میں کوئی غذا نہ چکھوں گا یہاں تک کہ مدینے سے باہر اپنی تلوار کے ذریعے ان سے دو دو ہاتھ کر لوں۔'' چنانچہ کثرتِ رائے کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی فیصلے سے اتفاق فرمایا اور خود زرہ پہن کر گھر سے باہر تشریف لائے اور ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ ۶ شوال بروز جمعہ ۳ ہجری عصر کے بعد مدینہ طیبہ سے احد کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ نے شیخان نامی ایک مقام پر پہنچ کر لشکر کا معائنہ فرمایا، جو لوگ چھوٹے یا نا قابلِ جنگ نظر آئے انہیں واپس کر دیا۔ لشکر کی تیاری میں چونکہ شام ہو چکی تھی لہٰذا آپؐ نے یہیں مغرب اور پھر عشاء کی نماز پڑھی اور یہیں رات بھی گزارنے کا فیصلہ فرمایا۔ پچاس صحابہ پہرہ دینے کے لیے منتخب فرمائے جن کے قائد محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ طلوعِ فجر سے کچھ پہلے آپؐ پھر آگے بڑھے اور مقامِ شوط پر پہنچ کر فجر کی نماز ادا فرمائی۔ اب آپؐ دشمن کے بالکل قریب تھے اور دونوں

Marfat.com

ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یہیں پہنچ کر عبداللہ بن ابی نے دھوکا دیا اور اپنے تین سو ہمراہیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا کیونکہ اب مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد سے چوتھائی سے بھی کم ہو گئی۔ اس نے علیحدگی کا بہانہ یہ کیا کہ چونکہ ہماری بات نہیں مانی گئی ہم اندر رہ کر مدینے کی مدافعت کرنا چاہتے تھے اس لیے اب ایسی لڑائی میں ہم شریک نہیں ہو سکتے جو صریحاً خودکشی کے مترادف ہے حالانکہ اس کا یہاں تک مسلمانوں کے ساتھ چلے آنا بجائے خود اس بات کی دلیل تھا کہ اس کا بہانہ غلط ہے۔ وہ محض اپنی سازش پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ ایسے نازک موقع پر بعض لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی، انہیں میں حضرت جابرؓ کے والد حضرت عبداللہ ابن حرامؓ نے بھی انہیں ہر ممکن طریقے سے ان کا فرض یاد دلایا۔ لیکن وہ جو کچھ کہتے رہے قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر اس کا پردہ چاک کیا:

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ

(وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور یہ جو کچھ چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے)

اس نے یہ سازش اپنے ساتھیوں سے مل کر اس لیے کی تھی کہ ہم جب عین وقت پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑیں گے تو یقیناً اس کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی پڑے گا۔ وہ یا تو ہمارا ساتھ دیں گے اور یا حوصلہ ہار جائیں گے۔ وہ کسی حد تک اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے ہی والے تھے کہ اللہ نے ان کی چال ناکام کر دی۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی بات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

آیت میں دو گروہوں کا تذکرہ

اس آیتِ کریمہ میں جن دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ وہ قبیلہ خزرج کے بنو سلمہ اور قبیلہ اوس کے بنو حارثہ ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں منافقین کی پسپائی کی وجہ سے کچھ کمزوری کے آثار پیدا ہوئے اور وہ بھی واپس جانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو سنبھالا اور ان کے اندر جو اضطراب پیدا ہوا تھا اسے دور فرما دیا۔ اگر اللہ انہیں سہارا نہ دیتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ لوگ ہمت ہار جاتے لیکن اللہ نے فرمایا کہ اللہ ان کا ولی ہے یعنی کارساز ہے، غمگسار ہے اور سہارا دینے والا ہے۔ ان کے اندر بے ہمتی کا اثر ایک وقتی بات تھی اور یہ بڑے سے بڑے صاحبِ ایمان میں بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے گزشتہ اعمال اور قربانیوں کے باعث وہ اللہ کی ولایت کے مستحق بن چکے تھے اس لیے اللہ نے بروقت ان کو سنبھالا اور ساتھ ہی یہ بات فرمائی کہ جب اللہ کسی کا سہارا بن جاتا ہے تو پھر ساری دنیا بھی مخالف ہو جائے تو اسے ڈولنے اور ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اللہ کی طاقت کے مقابلے میں صفر ہے۔ جس شخص کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ میرا کارساز ہے، اس کے لیے پھر ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنے اللہ پر بھروسہ کرے کیونکہ صاحبِ ایمان لوگ غیر اللہ پر نہیں اللہ ہی پر بھروسہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں نے بھی اللہ پر بھروسہ کیا اور نہایت پامردی کے ساتھ دشمن کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ آیتِ کریمہ میں چونکہ ان کی بے ہمتی کا ذکر ہوا ہے اور یہ قیامت تک پڑھا جائے گا اس لیے جب بھی اس آیت کی تلاوت ہوتی تو ان دونوں گروہوں کے لوگوں کو نہایت شرمساری ہوتی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم اپنی کمزوری پر اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، لیکن ہمارے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ پروردگار نے اپنی ذات کو ہمارا ولی قرار دیا ہے۔ یہ اتنے بڑے فخر کی بات ہے کہ جس میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

(اور اللہ نے تمہاری مدد بدر میں بھی کی جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو
تاکہ اس کے شکرگزار رہ سکو) (۱۲۳)

غزوۂ بدر سے استدلال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں آخر میں فرمایا کہ صاحبِ ایمان لوگوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اس بھروسے کے نتیجے میں کیا ملتا ہے؟ اور کیسے کچھ انعامات اللہ کی جانب سے اترتے ہیں؟ اس کے لیے جنگِ بدر کا حوالہ دیا اور ساتھ ہی اَذِلَّةٌ کا لفظ بول کر اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ بھی مسلمانوں کے سامنے رکھ دی۔ اَذِلَّةٌ ذلیل کی بھی جمع ہے اور ذلول کی بھی۔ یہ لفظ عزیز کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ عزیز کے معنی ہیں، غالب، زور آور اور دوسروں کی دسترس سے باہر۔ اس کے متضاد کے طور پر ذلیل کے معنی ہیں کمزور، ناتواں اور دوسروں کے لیے لقمۂ تر۔ جس معنی میں ہم ذلیل کا لفظ اردو میں بولتے ہیں عربی میں جب یہ عزیز کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو پھر اس کا وہ معنی نہیں ہوتا یعنی اسے اخلاقی طور پر کمزور اور کمینے آدمی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اس آدمی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو یا تو کمزور ہو یا نہایت نرم خو اور سہل الحصول ہو۔ سورۂ مائدہ میں مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ

(وہ مسلمانوں کے لیے نہایت نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہیں)

اگر کافر انہیں اپنی خواہشات کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو وہ پتھر کی چٹان ہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے وہ ریشم سے بھی زیادہ نرم اور پھول کی پتی سے زیادہ نازک ہیں۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں اس وقت تمہاری مدد کی جب تم انتہائی کمزور تھے۔ تعداد بھی کم تھی اسلحۂ جنگ نہ ہونے کے برابر تھا اور تمہارا مقابل ہر اعتبار سے ایسا تھا کہ اس کے شکست کھا جانے کی کوئی شخص بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے ناموافق حالات میں اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کر چکا ہے تو اب کیوں نہیں کرے گا۔ اس لیے تمہیں منافقین کے الگ ہو جانے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ پر تمہارا توکل اور بڑھ جانا چاہیے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○

Marfat.com

(یاد کرو! جب اے پیغمبر! تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے ○ ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن تمہارے اوپر اچانک آ دھمکے تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے) (۱۲۴ تا ۱۲۵)

قرآن کریم نے اس منظر کی مسلمانوں کو یاد دلائی ہے جب وہ منافقین کی علیحدگی سے پریشان اور متاثر ہو رہے تھے تو اللہ کے رسول نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا تم ان تین سو کی پروا نہ کرو اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے۔ اس کی قوتیں بے پناہ ہیں۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ تین سو آدمیوں کی جگہ وہ تین ہزار فرشتوں کو بھیج دے اور فرشتے بھی ایسے آئیں جو تازہ دم ہوں۔ وہ کارکنانِ قضا و قدر جو زمین پر اپنے فرائض انجام دینے میں لگے رہتے ہیں انہیں ادھر سے ہٹا کر تمہاری مدد کے لیے نہیں بھیجا جائے گا بلکہ تازہ دم فرشتے آسمان سے اتارے جائیں گے۔ یہ بات صرف مسلمانوں کے حوصلے بڑھانے کے لیے کہی جا رہی ہے کہ افرادی قوت انسانوں کے لیے یقیناً ایک حوصلے کا سامان ہے۔ اس لیے ان کی کمی بیشی انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن جن کے پیچھے اللہ کی قوت کارفرما ہو انہیں ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تم تین سو آدمیوں کے جانے سے پریشان ہو اللہ تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری پریشانی کا ازالہ فرما دیں گے۔ پروردگار نے اس کی تائید فرماتے ہوئے اس خوشخبری کو مؤکد بنا دیا کہ تین ہزار تو ایک طرف رہے ہم تو پانچ ہزار بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہی دو شرطیں جن کا ذکر آغازِ کلام میں ہوا یعنی صبر اور تقویٰ۔ اگر ان میں کمی نہ آنے دی جائے بلکہ اس کا معیار پہلے سے بھی بہتر ہو جائے اور دوسری یہ بات کہ دشمن اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دے۔ ایسی صورتِ حال میں یقیناً زیادہ افرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو پروردگار فرشتوں کے ذریعے پوری فرمائیں گے اور یہ پانچ ہزار فرشتے وہ ہوں گے جو اللہ کے یہاں نہایت قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ مُسَوِّمِیْنَ کے لفظ سے ان کے قدر و منزلت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ سَامَةٌ یا سِیْمَةٌ سے بنا ہے۔ اس کا معنی "علامت" ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتے اپنی مخصوص علامت کے باعث باقی فرشتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی عزت و وجاہت اور اللہ کے یہاں قرب کا کیا کہنا کہ ان کی مدد کے لیے جو فرشتے بھیجے جاتے ہیں وہ بھی نہایت قدر و منزلت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی عزت افزائی مقصود ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگلی آیتِ کریمہ میں ایک ایسی بات فرمائی گئی ہے جس سے مسلمانوں کو ایک بہت بڑی غلط فہمی اور عقیدے کی خرابی سے بچانا مقصود ہے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ○ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ○

(اور نہیں بنایا اس کو اللہ تعالیٰ نے مگر تمہارے لیے بشارت تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد نہیں آتی مگر اللہ کی جانب سے جو غالب اور حکمت والا ہے ○ تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انہیں رسوا کر دے کہ وہ خوار ہو کر لوٹیں) (۱۲۶ تا ۱۲۷)

Marfat.com

فرشتوں کا اترنا صرف بشارت ہے، مدد اللہ کی جانب سے ہے

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو فرشتوں کے نازل کرنے کی خوشخبری سنائی ہے اس سے بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ بھی اگر کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اپنے فرشتوں کا محتاج ہے۔ جیسے بڑے سے بڑا بادشاہ کسی دشمن کو زیر کرنے یا اپنے کسی مخلص کی مدد کرنے کے لیے اپنی فوجوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ انسان چونکہ ظاہری اسباب کی خوشخبری سے متاثر ہوتا اور اس کا پریشان دل ایسی خوشخبری سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہ خوشخبری اس لیے سنائی گئی تاکہ تین سو منافقین کے الگ ہونے سے جو ایک دھچکا لگا ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز سے مسلمان دوچار کر دیے گئے ہیں اس کا ازالہ ہو جائے اور مسلمانوں کے دلوں کو ایک اطمینان ملے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید فرشتوں کی شکل میں ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ یہ محض تمہاری تسلی کے لیے ہم نے فرشتے بھیجے یا ان کی آمد کی خوشخبری سنائی ورنہ تمہاری مدد کے لیے اللہ تعالیٰ کو فرشتوں کی ہرگز احتیاج نہیں، وہ کسی کام میں کسی کا محتاج نہیں۔ البتہ فرشتے ہر کام میں اس کے محتاج ہیں۔ مدد جب بھی آتی ہے اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ حقیقی مدد دینے والا وہی ہے۔ مخلوقات میں سے اگر کوئی کسی کی مدد کرتا ہے تو وہ اللہ کی دی ہوئی طاقت سے کرتا ہے۔ تو وہ مدد بھی درحقیقت اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جنگِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ریت کے کنکروں کی مٹھی بھر کے پھینکی تو اس سے قریش کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ قرآنِ کریم نے اس کے بارے میں فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

(وہ مٹھی آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی)

یعنی اس میں قوت اور اثر پیدا کرنا اللہ کی قدرت سے تھا، آپ کی قدرت سے نہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں فرمایا:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ

(مسلمانو! تم نے کافروں کو قتل نہیں کیا انہیں تو اللہ نے قتل کیا ہے)

یعنی اللہ کی تائید و نصرت نہ آتی تو تم کافروں کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بھروسہ اور توکل اللہ پر رکھو مدد کے لیے ہاتھ اسی کے سامنے پھیلاؤ۔ قدرتوں کا مالک اسی کو جانو۔ درمیان کے واسطے سب اسی کی توفیق سے ہیں۔ کسی کو حقیقی قدرت کا مالک نہ جانو۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو ہمیشہ مسلمان کی قوت کا باعث رہا ہے اور اسی میں کمزوری پیدا ہو جانے سے مسلمان در در کی ٹھوکریں کھانے لگا ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ مسلمانوں کی تائید و نصرت بجائے خود مقصود نہیں بلکہ وہ اس لیے نوازے جا رہے ہیں کہ ان کے ذریعے سے کفر کی طاقت کو توڑنا اور ان کو ذلیل و خوار کرنا مقصود ہے۔ جب تک مسلمانوں کے پیشِ نظر اعلائے کلمۃ الحق، غلبۂ دین اور دین کے دشمن کو ناکام کرنا رہے گا اس وقت تک اللہ کی تائید ان کے شاملِ حال رہے گی۔ لیکن جب ان کے اندر کمزوریاں پیدا ہوں گی اور وہ خدائی

Marfat.com

فوجدار بننے کی بجائے اپنی ذات کی سربلندی یا کسی اور کی سربلندی کے لیے کام کرنا شروع کر دیں گے تو پھر وہ اللہ کی تائید ونصرت سے محروم ہو جائیں گے۔ اللہ کی نافرمانی اور اس کی تائید ونصرت ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔ جب بھی اس کی نافرمانی ہو گی مسلمان تائید ونصرت سے محروم ہو جائیں گے۔ چاہے اللہ کا رسول بھی ان میں موجود ہو۔ چنانچہ جنگِ بدر میں فتح کی صورت میں اسی حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کی گئی اور جنگِ احد میں شکست کی صورت میں مسلمانوں کو یہی سبق دیا گیا۔

منافقین کے علیحدہ ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی تعداد سات سورہ گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کو لے کر احد کی طرف بڑھے۔ دشمن پہلے سے وہاں پہنچ چکا تھا۔ آپ دشمن کو ایک طرف رکھ کر چکر کاٹتے ہوئے احد کے سامنے پہنچ گئے۔ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر آپ نے صف آرائی کی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فوج کے اس حصے کی کمان دی گئی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف سے احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر دے کیونکہ کوہِ احد اور جبل الرماۃ کے درمیان درّے کی صورت میں ایک گزر گاہ تھی۔ جہاں سے دشمن کو راستہ مل سکتا تھا۔ آپؐ نے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ اس ٹیلے پر متعین فرمایا جسے اب جبل الرماۃ کہا جاتا ہے۔ اب تو اس کی بلندی بہت کم رہ گئی ہے اور وسعت بھی شاید تجاوزات کا شکار ہو گئی ہے۔ لیکن اس وقت وہ یقیناً قابل ذکر ایک چھوٹا پہاڑ تھا ان تیر اندازوں کے افسر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر کیے گئے اور انہیں ہدایت کی گئی کہ لڑائی کا نتیجہ کچھ بھی ہو تمہیں کسی صورت اپنی جگہ سے نہیں ہٹنا۔ تمہارے سامنے ہماری بوٹیاں کیوں نہ نوچ لی جائیں تم اپنی جگہ ڈٹے رہنا۔ قریش نے بھی جنگِ بدر کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صف بندی کی اور نمایاں لوگ نمایاں جگہوں میں مقرر کیے گئے۔ سب سے پہلے طبلِ جنگ کی بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں، جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقامِ خون کے رجز تھے۔ ھندا آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ تھیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ اشعار پڑھ رہی تھیں۔

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقِ (ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں)

نَمْشِیْ عَلَی النَّمَارِقِ (ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں)

اِنْ تُقْبِلُوْا نُعَانِقُ (اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی)

اَوْ تُدْبِرُوْا نُفَارِقُ (اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی)

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا ''کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے جو مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے اور یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے؟'' حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صف سے نکل کر کہا ''میں ہوں''۔ یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کا بھائی عثمان رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھا، علم ہاتھ میں لیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر گئی۔ ساتھ ہی انکی زبان سے نکلا ''میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں''۔

Marfat.com

اب عام جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفوں کی صفیں الٹ ڈالیں۔ اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیام سے تلوار نکالی اور ہوا میں لہرائی۔ فرمایا کون اس کا حق ادا کرے گا؟ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی بہادروں نے ہاتھ بڑھائے لیکن ابودجانہؓ کی قسمت نے یاوری کی۔ آپؐ نے اپنی تلوار انہیں عنایت فرمائی۔ حضرت ابودجانہؓ سر پر سرخ پٹی باندھ کر تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ چال اللہ کو پسند نہیں لیکن آج یہی چال پسند ہے۔ حضرت ابودجانہؓ فوجوں کو چیرتے ہوئے لاشوں پر لاشیں گراتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی۔ اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس سے بلند ہے کہ عورت پر آزمائی جائے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دودستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفوں کی صفیں صاف ہوتی جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباغ غبشانی سامنے آ گیا۔ پکارے ''او ختانة النساء کے بچے کہاں جاتا ہے'' یہ کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔ وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تو حضرت حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ کی طاق میں تھا۔ حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔

لڑائی اپنے عروج پر تھی، بہادر بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے، کفار کے علمبردار ایک ایک کر کے کٹتے جا رہے تھے۔ بالآخر مسلمانوں کی ہمت، شجاعت اور اللہ کی تائید ونصرت کام آئی کہ کافروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ بہادرانِ اسلام کا مقابلہ کرنے کی بجائے پاؤں سر پر رکھ کر بھاگے۔ بہادر نازنین جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیرانداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے وہ بھی غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت روکا، لیکن وہ رک نہ سکے۔ خالد بن ولید جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اس وقت بھی دوربینی اور شجاعت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی نگاہِ بیدار نے جب تیراندازوں کی جگہ خالی دیکھی تو پہاڑ کا چکر کاٹ کر سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی تھیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علمبردار تھے ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا۔ شور مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیے گئے ہیں۔ اب کچھ نہ پوچھئے مسلمانوں پر کیسی قیامتیں گزریں؟ جیتی ہوئی بازی ہار میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن یہ بات ثابت ہو گئی کہ صبر وتقویٰ کے بغیر اللہ کی تائید ونصرت شامل حال بھی ہو تو واپس پلٹ جاتی ہے۔ اللہ کے رسول کی نافرمانی کے ساتھ رسول موجود بھی ہو تو اللہ کی نصرت نہیں اترتی۔ اسی سورت میں آگے چل کر پروردگار نے اس بات کا ذکر فرمایا ہے:

K.P

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ (۱۵۲)

Marfat.com

(اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ تم خدا کے حکم سے ان کافروں کو تہہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی اور تعمیلِ حکم میں اختلاف کیا اور اس وقت نافرمانی کی جب کہ خدا نے تمہیں تمہاری محبوب چیز "فتح" دکھادی، تم میں کچھ دنیا کے طالب ہوئے اور کچھ آخرت کے تو اللہ نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے)

اسی افراتفری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک کھائی میں گر پڑے۔ مغفر کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ جانثاروں نے جانیں دے کر آپ کو محفوظ رکھا۔ لیکن آپ کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ انتہائی تاسف کی حالت میں آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ اس پر اگلی آیت کریمہ نازل ہوئی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(اے پیغمبر! تمہیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے، بے شک وہ ظالم ہیں ۝ اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) (۱۲۸ تا ۱۲۹)

سُنتِ الٰہی

اے پیغمبر! کسی قوم کو فلاح دینے یا نہ دینے میں آپ کا کوئی اختیار نہیں، آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ کا کام لوگوں تک اللہ کا دین پہنچانا اور بقدرِ رحمت اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں لوگ کیا کرتے ہیں وہ پروردگار دیکھ رہا ہے۔ آپ بہر صورت لوگوں تک اللہ کے دین کی دعوت پہنچانے کے مکلف ہیں۔ وہ قبول کریں تو آپ اللہ کا شکر ادا کریں اور اگر وہ قبول کرنے کی بجائے آپ کی جان کے درپے ہو جائیں تو آپ کو اپنا فرض ادا کرنے سے پھر بھی رکنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر بھی کسی وقت ہدایت قبول کر سکتا ہے۔ آپ ان لوگوں کے وقتی اعمال کو دیکھ کر مایوس نہ ہوں اور ان کے لیے بددعا نہ فرمائیں کیونکہ یہ بات عین ممکن ہے کہ انہی میں سے کل کو کچھ لوگوں کو ایمان نصیب ہو۔ چنانچہ حالات نے ثابت کیا کہ وہی خالد بن ولید جس نے اس جنگ میں فتح کو شکست سے بدل ڈالا تھوڑے ہی عرصے کے بعد خود مدینہ آیا اور اپنے آپ کو آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا اور اسلام کی سربلندی اور قوت کا ایسا ذریعہ ثابت ہوا کہ بارگاہِ نبوت سے سیف اللہ کا خطاب پایا۔ عمرو بن العاص جو جنگِ احد میں کافروں کا سرمایہ تھا زیادہ دیر نہیں گزری کہ اس نے اپنے آپ کو اسلام کی آغوش میں ڈال دیا اور پھر تاریخ اسے فاتح مصر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ابوجہل کا بیٹا جو اس جنگ میں فوج کا ایک اہم افسر تھا فتح مکہ کے بعد وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا اور کئی اہم جنگوں میں اسلام کا حق ادا کرتے ہوئے بالآخر جنگِ یرموک میں اللہ کے راستے میں جان دے دی اور تاریخ نے تعجب سے دیکھا جس کے باپ نے کبھی اسلام کا نام سننا گوارا نہ کیا تھا اس کا بیٹا اسلام کے لیے سر کٹواتا ہے۔ وہ ابوسفیان جو فوجیں لے لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا رہا ایک وقت آیا کہ اس نے اسلام کو قبول کیا اور پھر اسلام ہی کی راہ میں اپنی ایک آنکھ قربان کر ڈالی۔ ایسے ہی کتنے لوگ ہیں جو اس جنگ میں شریک تھے اور پھر وقت کے

Marfat.com

فاتح اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے۔ اس لیے فرمایا جار ہا ہے کہ عالم الغیب اللہ کی ذات ہے وہی جانتا ہے کہ ان میں سے کون کل کو اسلام کی آغوش میں آنے والا ہے اور کون ہے جس کی قسمت میں اللہ کا عذاب لکھا ہے۔ جو ان میں توبہ کرے گا وہ اللہ سے مغفرت کا حقدار ہو گا اور جو کفر پر اڑا رہے گا وہ بالآخر جہنم کا سزاوار ٹھہرے گا۔ زمین و آسمان اللہ کے ہاتھ میں ہیں ان کا اختیار اللہ کے قبضے میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ لیکن وہ جلد باز نہیں وہ مہلت دیتا ہے اے پیغمبر! آپ بھی اپنی دعا میں جلد بازی نہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ
عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا
فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ قف
وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ قف وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَ
هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى

Marfat.com

وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ
مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ
الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ ع

رکوع: ۱۴۔ (اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم فلاح پاؤ O اور بچو اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار ہے O اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے O اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے O وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں کشادگی میں بھی اور تنگی میں بھی اور غصے کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے O اور (متقی) وہ لوگ ہیں کہ جب کسی کھلی برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جان پر ظلم توڑتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے O یہ لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی اچھا صلہ ہے عمل کرنے والوں کا O تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا O یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے O اور پست ہمت نہ بنو اور غم نہ کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو O اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو دشمن قوم کو بھی اسی طرح کی چوٹ لگی ہے۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے درمیان الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں تاکہ اللہ تمہارا امتحان کرے اور ممیز کردے ایمان والوں کو اور تم میں سے کچھ لوگوں

Marfat.com

کوشہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا○ اور تا کہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے○ کیا تم گمان رکھتے ہو کہ جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی اللہ نے ممیز نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا تا کہ ممیز کر دے ثابت قدم رہنے والوں کو○ اور تم آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو، سواب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے تھے) (۱۴۰ تا ۱۴۳)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ○ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ○ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ○

(اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا اور ڈرو اللہ سے تا کہ تم فلاح پاؤ○ اور بچو اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار ہے○ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے) (۱۳۰ تا ۱۳۲)

جنگ احد کی شکست کے مضمر اسباب

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ اپنے مفہوم میں عموم بھی رکھتی ہیں اور خصوص بھی۔ عموم تو یہ ہے کہ ان آیات میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ تمام مسلمانوں کے لیے ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں اور خصوص ان معنوں میں کہ گزشتہ آیاتِ کریمہ میں جنگِ احد کے حالات پر تبصرہ ہے اور اس وقت کے مسلمانوں کی کمزوریوں پر توجہ بھی دلائی گئی ہے اور یہ تبصرہ قرآنِ کریم کے اپنے اسلوب کے مطابق ہے، مختلف وادیوں سے گذرتا ہوا ابھی آگے بڑھ رہا ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کو جو احکام دیے گئے ہیں اس میں مسلمانوں کی کمزوریوں کی طرف اشارے بھی ہیں۔ جنگِ احد میں جس طرح اللہ کی تائید و نصرت سے مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دشمن اپنی برتر افرادی قوت اور بہتر اسلحۂ جنگ کے باوجود شکست کھا کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ لیکن جلدی ہی بعد خالد بن ولید کے مسلمانوں کے لشکر کے عقب سے اچانک حملے نے صورتِ حال بدل دی اور ایک جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہوگئی اور ایک فاتح لشکر شکست خوردہ لشکر میں بدل گیا۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ ان آیاتِ کریمہ میں دو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میں پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے عقبِ لشکر سے حملے کا خطرہ محسوس فرماتے ہوئے ایک ٹیلے پر مسلمانوں کو مقرر کیا تھا تا کہ اس درے اور راستے پر نگاہ رکھیں جس سے مسلمانوں کی پشت پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ پچاس تیر اندازوں کو اس ٹیلے پر مقرر فرمایا اور یہ حکم دیا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تمہیں کسی صورت بھی اپنے مورچے چھوڑ کر آنے کی اجازت نہیں۔ حضور نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تم یہ دیکھو کہ ہماری بوٹیاں نوچی جا رہی ہیں، یعنی کافر لشکر مسلمان لشکر کو تہِ تیغ کر رہا ہے تو تم ایسے حالات میں بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ہماری طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ لیکن جب قریشِ مکہ شکست کھا کر بھاگے اور ابھی اس کی بعض ٹکڑیاں ادھر ادھر میدانِ جنگ میں بکھری ہوئی تھیں کہ مسلمانوں نے لڑائی روک دی اور دشمن کا سامان اور ان کا مال و دولت لوٹنے میں لگ گئے۔ جبل الرماۃ کے تیر اندازوں نے جب دیکھا کہ لڑائی رک گئی ہے اور مسلمان سامانِ غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر مسلمان لشکر کی طرف بڑھے لیکن ان کے سالار حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں روکا اور یاد دلایا کہ آنحضرت صلی

Marfat.com

اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر قیمت پر اپنے مورچوں پر قائم رہنے کی نصیحت فرمائی تھی۔ لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ چند سپاہیوں کے علاوہ تمام سپاہی مالِ غنیمت کی محبت میں اپنے مورچے خالی چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ خالد بن ولید کی عقابی نگاہوں نے جب اس مورچے کو خالی دیکھا اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ مسلمان مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہیں اور ہتھیار اتار چکے ہیں۔ انہیں اس سے بہتر موقع کیسے ہاتھ آ سکتا تھا۔ انہوں نے نہایت بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے پہاڑ کا چکر کاٹا اور مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک افراتفری مچ گئی، مسلمان چونکہ خالی ہاتھ تھے۔ اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے ادھر ادھر تلواروں کی تلاش میں بھاگے۔ فوج ایک بھیڑ کی شکل اختیار کر گئی۔ ایسی مصیبت آئی کہ اپنے اور پرائے کی پہچان بھول گئی۔ حضرتِ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد خود مسلمانوں کے نرغے میں آ گئے۔ مسلمانوں نے انہیں کافر لشکر کا سپاہی سمجھ کر تلواریں برسانا شروع کر دیں۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چیختے ہی رہے کہ مسلمانو! یہ میرے والد ہیں، لیکن اس ہنگامے میں کون سنتا تھا۔ چنانچہ ان کے والد شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صبر کی تصویر بنے صرف یہ کہہ سکے کہ مسلمانو تمہیں اللہ معاف فرمائے۔ تم نے بے خبری میں میرے والد کو قتل کر ڈالا اور پھر اس کے نتیجے میں ستر (۷۰) صحابہ شہید ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور حضرت عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ کی لاشوں کو مثلہ کیا گیا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بری طرح زخمی ہوئے۔ خود کی کڑیاں روئے مبارک میں گھس گئیں۔ چار دانت متاثر ہوئے۔ چہرہ مبارک پر زخم آئے اور خون بہنے لگا۔ دشمن کی کھودی ہوئی کھائیوں میں سے ایک کھائی میں آپ گر گئے۔ اس طرح سے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے باعث مسلمانوں میں یہ بات مشہور کر دی گئی کہ پیغمبر ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اپنی جانوں پر کھیل جانا اتنا گراں نہ تھا جتنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ سننا کہ آپؐ دنیا میں نہیں رہے۔ بڑے بڑے جی داروں نے حوصلے ہار دیئے اور زبان پر ایک ہی بات تھی کہ وہ ذاتِ عزیز جس کی نظیر پوری کائنات میں نہیں اور جو مسلمانوں کے دل کی دھڑکن ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی تھی، جب وہ دنیا میں نہ رہے تو اب آخر کس کے لیے لڑا جائے۔ ایسی ابتر اور تشویشناک صورتِ حال اور قیامت کا سماں صرف اس لیے پیش آیا کہ مسلمانوں نے حبِ زر میں مبتلا ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اللہ کے رسول کے احکام سے سرتابی عمل میں آئی چنانچہ ان آیات میں انہی دونوں غلطیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا مفہوم

سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ مسلمانو! سود مت کھاؤ دوگنا چوگنا بڑھتا ہوا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ سود کھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کو دوگنا چوگنا بنانے کی فکر میں رہنا شاید اس سے روکا گیا ہے۔ اصل بات یہ نہیں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کے اضافے سے محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کو نمایاں کرنا مقصود ہے اور قرآنِ کریم کے اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بعض دفعہ کسی حکم کے ساتھ ایسی قیود کا ذکر کرتا ہے جو مقصود نہیں ہوتیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہوتا ہے کہ اس کی بدترین شکل درحقیقت ہے۔ اس لیے تمہیں اس سے بچنا اور نفرت کرنا چاہیے۔ جس طرح فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا

(اپنی لونڈیوں کو پیشہ کرنے پر مجبور نہ کرو، اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہوں)

Marfat.com

اس میں اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی شرط مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود اس سے صرف حال کی تصویر اور اس کی شناعت کو نمایاں کرنا ہے۔ یہی بات اس آیت میں بھی پیشِ نظر ہے۔ مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ فطرت نے کچھ فطری اشارے بھی فرمائے ہیں۔ ایک اشارہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سود کو اگر بروقت نہ روکا جائے تو یہ ایک ایسا وبائی مرض ہے اور اس حوالے سے انسان میں ایسی کمزوری ابھرتی ہے کہ پھر یہ سود دوگنا چوگنا بڑھے بغیر نہیں رہتا بلکہ اس کے بڑھنے کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی۔ تو جو نتیجہ آگے چل کر نکل سکتا ہے اسے تعبیر کے انداز میں پہلے واشگاف کر دیا گیا ہے تاکہ قرآن کے قاری اس سے فائدہ اٹھائیں۔

سود انفاق کا متضاد ہے

دوسرا اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اور اس کے علاوہ متعدد جگہ قرآنِ کریم نے سود کو انفاق کے متضاد کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اللہ کے راستے میں انفاق تو عین مطلوب ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہر صاحبِ ایمان اپنی ہمت اور اپنے عشق کے مطابق اس میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح حبِّ دنیا بھی انسانی سیرت و کردار کا ایک ایسا گناہ ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے کسی انتہا پر بھی چین نہیں ملتا۔ اس لیے اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کے لفظ سے اس کی حقیقت کو نمایاں فرما کر مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی انفاق کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ فطرت بگڑتی ہے تو انسان سود کی کمائی میں آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اگر فطرت صحیح رخ پہ کام کرتی ہے تو اس کے جذبۂ انفاق میں ہمہ جہت ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ان دونوں کے تقابل سے مسلمانوں کو صحیح راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

اس جنگ میں دوسری غلطی جیسا کہ گزارش کی گئی ہے مسلمانوں سے یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو نظرانداز کیا اور آپ کے تاکیدی احکام کے باوجود اپنے مورچے چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔ اس لیے فرمایا کہ:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے) ۲

مسلمانوں کا جو گروہ اللہ کے رسول کی اطاعت میں کمزوری دکھاتا ہے وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ کے رحم کا مستحق نہیں ہوتا۔ جس طرح سودی لین دین کرنے والا مسلمان ہوتے ہوئے بھی جہنم کا سزاوار ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا (اس آگ سے بچو جو کافر لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے) سودی کاروبار کرنے والے بے شک اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق ان کا انجام بھی کافروں والا ہوگا۔ اسی طرح جو شخص اللہ کے ساتھ ساتھ اس کے رسول کی بھی اطاعت کرتا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس پر رحم کیا جائے۔ یوں تو دنیا میں حشرات الارض سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق کو زندگی اور اس کے امکانات اور زندگی کی بقا اور اس کے اسباب میسر ہیں لیکن خصوصی فضل و کرم اور خصوصی رحم و مروت وہ صرف اللہ کے رسول کی اطاعت ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ

Marfat.com

قرآنِ کریم عموماً جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے وہیں اس کے ساتھ ہی رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ کی طاعت مستقلاً فرض ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی اپنی جگہ مستقل طور پر فرض اور واجب ہے کیونکہ اس کی وجہ قرآنِ کریم کے مطابق یہ ہے کہ اللہ کا پیغمبر کبھی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا بلکہ جب بھی وہ دین کے بارے میں کوئی حکم دیتا ہے تو وہ وحیِ الٰہی ہوتا ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ۚ

(اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے ۝ وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں کشادگی میں بھی اور تنگی میں بھی اور غصے کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے) (۱۳۳ تا ۱۳۴)

ایک مومن کا اصل ہدف

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت جس شخص کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے اس شخص کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ سود کھائے یا سودی کاروبار کرے۔ اسی طرح یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان اللہ یا اس کے رسول کی اطاعت نہ کرے بلکہ ہر حرام چیز سے بچتے ہوئے اور ہر حکمِ الٰہی اور حکمِ رسول کی اطاعت کرتے ہوئے ان کے سامنے دو ہی باتیں رہنی چاہئیں کہ میں اپنے امکان کی حد تک وہ کیا کوششیں بروئے کار لاؤں جس کی وجہ سے مجھے بخشش نصیب ہو جائے۔ اس کے لیے صحابہ اور تابعین نے اس کے بارے میں جو کچھ بھی فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر صاحبِ ایمان کو اسبابِ مغفرت کے حصول کی کوششیں کرنی چاہئیں۔ البتہ صحابہ و تابعین کے یہاں اس کی تعبیرات مختلف ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تفصیل ادائیگیِ فرائض سے فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام سے، ابو العالیہ نے ہجرت سے، انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تکبیرِ اولیٰ سے، حضرت سعید بن جبیر نے ادائے اطاعت سے، ضحاک نے جہاد سے، عکرمہ نے توبہ سے کی۔ ان تمام اقوال کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمالِ صالحہ ہیں جو مغفرتِ الٰہی کا باعث اور سبب ہوتے ہیں۔

ایک مومن کا ہدف اور ذہنی افق پروردگار نے بہت بلند رکھا ہے۔ تمام اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں بخشش اور مغفرت سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوسکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارا اصل ہدف تو جنت ہے۔ جنت کے حصول کا دارومدار چونکہ مغفرت پر ہے اس لیے مغفرت کو پہلے ذکر فرمایا گیا۔ ہمارے تمام اعمالِ صالحہ مل کر بھی جنت کی قیمت نہیں بن سکتے۔ لیکن اللہ کی سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو اعمالِ صالحہ کرتا ہے بلکہ جس کو اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے یوں تو ہر نیکی عملِ صالح کہلاتی ہے، لیکن ضرورت کے مطابق

Marfat.com

عملِ صالح جنت کا سزاوار بناتا ہے۔ جس کی دعوت خود شریعت دیتی ہے اور جس کی پکار اسلام کے تقاضے ہوتے ہیں۔ نماز کتنا بڑا عمل ہے لیکن ایک بھوکا شخص جس کی جان پر بنی ہے اس کے لیے جس عملِ صالح کو پکارا جائے گا وہ نماز نہیں بلکہ سخاوت و فیاضی ہے اور اعلائے کلمۃ الحق اور دین کی بقا کے لیے عبادت نہیں بلکہ جان و تن کی قربانی درکار ہوتی ہے۔ ایک ایسی جنت جس کی وسعتوں کے سامنے زمین و آسمان کی وسعتیں حقیر ہو جائیں ایسی جنت کا اللہ کے بندوں کو عملِ صالح کے عوض میں ملنا اللہ کی ایسی عطا اور بخشش ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

کہنے کو تو یہ عظیم نعمت جسے جنت کہا جاتا ہے ایمان اور عملِ صالح کے عوض میں نصیب ہوگی لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ جب تک ایک خاص حد تک ترقی نہ کر جائیں اور ایک خاص شکل اختیار نہ کر لیں اس وقت تک جنت کا حصول ایک خواہش کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ صورتِ خاص جس تک اعمالِ صالحہ کو پہنچنا اور اسے اختیار کرنا ہے اس کا نام تقویٰ ہے اور اس کے اختیار کرنے والوں کو متقی کہا جاتا ہے۔ تقویٰ قرآنِ کریم کی ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس کو قرآنِ کریم نے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے اور دنیوی اور اخروی نعمتوں کا دارومدار اسی صفت کو بنایا ہے اور جب ہم اس کی حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ درحقیقت قرآن و سنت کی تمام تعلیمات کا ست اور روح اور عملی تشکیل کا نام ہے۔ آدمی جیسے جیسے اس میں ڈوبتا جاتا ہے اور دل و دماغ کو اس کے حوالے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے تقویٰ کی کیفیت اس میں اترتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب آدمی کا ذوق اور اس کا مزاج تقویٰ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی پسند و ناپسند کے زاویے اسی کے سائے میں ڈھلتے ہیں اور اس کی روحانی کیفیات پر تقویٰ ایک سایہ بن کر چھا جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کی رعنائیاں اسی کے نور سے روشن ہوتی اور اس کے جسم و جان کی قوتیں اسی کے عشق سے توانا ہوتی ہیں۔ دنیا اور دولتِ دنیا ایک مومن کو ہزار بہکانے کی کوشش کریں لیکن وہ تقویٰ کی قوت سے ان سارے بہکاووں پر غالب آ جاتا ہے۔ کبھی وہ اللہ کا خوف بن کر دل میں اترتا ہے، کبھی اللہ کی محبت بن کر دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ ایک مومن اللہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ اس کا سب کچھ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اس طرح وقف ہو جاتا ہے کہ دوری کے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ ایک مومن کے اپنے ارادے اور اپنی ترجیحات اللہ کے دین کی ترجیحات پر قربان ہو جاتی ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے متقی لوگوں کی چند صفات بیان فرمائی ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ایک مومن کی زندگی جسے تقویٰ سے تعبیر کیا جا سکے وہ اگلی آیت میں بیان کردہ صفات ہی پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں وہ صفات بھی پائی جاتی ہیں جو قرآن نے جابجا ذکر فرمائی ہیں۔ لیکن ان آیات کا موضوع چونکہ جہاد و قتال ہے اس لیے اس موضوع کی مناسبت سے چند صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ خیر و شر کے معرکے میں کوئی جہاد بھی انفاق کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ خیر و شر کا معرکہ پوری اجتماعی زندگی پر حاوی ہو چکا ہو اور ایک نئی امت تشکیل پذیر ہو اور کفر اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتے ہوئے دیکھ کر آخری حرکت مذبوحی کرنے پر تل گیا ہو اور حالات ایک فیصلہ کن معرکے کی طرف بڑھ رہے ہوں تو ایسی صورتِ حال میں انفاق فی سبیل اللہ یقیناً دین کی پہلی طلب اور سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور اس کے لیے جو لازمی صفات ہیں ان کی اہمیت بھی نہایت ترقی کر جاتی ہے۔

Marfat.com

متقی کی پہلی صفت انفاق ہے

اسی لیے اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی صفت انفاق ہی کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جو ہر طرح کے حالات میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ وہ تنگ دست ہوں تو پیٹ کاٹ کر اور خوشحال ہوں تو دوسروں سے آگے بڑھ کر خرچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دورِ صحابہ میں ہمیں دونوں طرح کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک غنی آدمی تھے۔ مال و دولت کے مالک بھی تھے اور دل اس سے بھی بڑھ کر غنی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جنگ تبوک کے لیے انفاق کی اپیل فرمائی تو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک طرف تو اشرفیوں کی ایک بڑی تعداد پیش کی اور دوسری طرف سینکڑوں آدمیوں کے لیے سواری اور اسلحۂ جنگ مہیا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں نے دیکھا کہ آپ منبر پر تشریف فرما ہیں اور دونوں ہاتھوں سے اشرفیاں ایک دوسرے پر الٹ پلٹ رہے ہیں اور ساتھ یہ فرما رہے ہیں کہ ”عثمان! آج کے بعد تمہیں تمہارا کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا“ اور دوسری طرف غریب صحابہ کو دیکھئے کہ ان کے پاس کھانے کا سامان تک نہیں لیکن وہ کسی سے پیچھے بھی نہیں رہنا چاہتے۔ وہ دن بھر اور رات کا ایک حصہ مزدوری کرتے ہیں اور جو انہیں مزدوری میں چھوہارے ملتے ہیں وہ ایک پوٹلی میں باندھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت معذرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ آپؐ وہ پوٹلی وصول فرما کر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ صحابہ کو حکم دیتے ہیں کہ ”مسلمانوں نے اللہ کے راستے میں جو مال دیا ہے جس سے صحنِ مسجد میں ایک ڈھیر لگ گیا ہے۔ یہ کھجوریں اس ڈھیر کے اوپر پھیلا دو تاکہ اللہ تعالیٰ اس اخلاص کی برکت سے جس سے کھجوریں لائی گئی ہیں سارے ڈھیر کو قبول فرما لے۔“ اسی سلسلے میں ہم ایک اور انفاق بھی دیکھتے ہیں جس کی مثالیں امتوں میں کم کم ملیں گی کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ڈھیروں سامان لے کر حاضر ہوتے ہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ ”گھر میں کیا چھوڑا ہے؟ اور یہاں کیا لے کر آئے ہو؟“ تو صدیقِ اکبرؓ عرض کرتے ہیں ”گھر میں جو کچھ تھا وہ خدمت میں حاضر کر دیا ہے اور گھر میں اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔“ اقبال نے نہایت سادہ انداز میں اس واقعے سے متاثر ہو کر ایسا لافانی شعر کہا ہے کہ جس کی مثال شاید کہیں مل سکے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

گھر میں دولت کی ریل پیل ہو تو اللہ کی رضا کے لیے بقدرِ ہمت دینا تقویٰ ہے۔ لیکن تقویٰ کے مدارج ہیں۔ ہر درجہ اپنی جگہ اجر و ثواب کا حامل ہے۔ لیکن سب سے افضل تقویٰ وہ ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال دے کے واضح فرمایا کہ ”سب سے افضل صدقہ اس شخص کا ہے جو خود ایک بے مایہ آدمی ہے۔ گھر میں بھوک ناچتی ہے لیکن پھر بھی وہ پیٹ کاٹ کر اپنے ایک ایسے عزیز کی ضرورت پوری کرتا ہے جو اس کا دشمن ہے اور اس کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتا۔“ ایسی مثالیں اگرچہ بہت کم ملتی ہیں، لیکن عہد صحابہ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جس نے ایک مومن کے ذہنی افق کو بہت روشن کر دیا ہے اور ہدف کو بہت بلند کر دیا ہے۔ بھوکے رہ کر مہمان کو کھانا کھلانا اور فاقہ کر کے مہمان کے سامنے سب کچھ رکھ دینا اور پیاسا رہ کر دوسروں کو پانی پلانا حتیٰ کہ دوسروں کی جان بچانے کے لیے خود زخمی حالت میں جان دے دینا یہ وہ اعلیٰ مثالیں ہیں جس نے انسانیت کا سر بہت اونچا کر دیا ہے۔ یہاں انہی مثالوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

متقی کی مزید دوسری، تیسری اور چوتھی صفت

دوسری صفت اس آیتِ کریمہ میں یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ لوگ غصہ پی جانے والے ہیں۔ یہ بظاہر کہنے کو ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں انسانی سیرت و کردار کی تعمیر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک شخص جب اللہ کے راستے میں دوسرے شخص کو دیتا ہے تو بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ لینے والا انفاق کی اس مقدار پر قناعت کرنے کی بجائے اور زیادہ مانگتا ہے اور پھر اس پر بے جا اصرار کرتا ہے اور بعض دفعہ ناخوشگوار جملوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں دینے والے کا برہم ہو جانا عین فطری بات ہے۔ ایسے وقت میں غصے کا ضبط کرنا اور پی جانا آسان نہیں ہوتا۔ اگر غصے کا اظہار کیا جائے تو نیکی برباد ہو جاتی ہے اور اگر غصہ ضبط کیا جائے تو اس کے لیے بہت صبر چاہیے جو آسانی سے میسر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے اللہ والوں کے سوا اور کسی میں ہمیں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔

قرونِ اولیٰ میں انسانیت چونکہ بے حد ترقی کر گئی تھی اس لیے ایسی مثالیں ملنا مشکل نہیں۔ لیکن پھر بھی ایسی عام بھی نہیں کہ ہر گلی کوچے میں دکھائی دیں۔ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تذکرہ نگاروں نے اسی حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور دستر خوان بچھ چکا تھا۔ آپ نے غلام کو کھانا لانے کے لیے کہا۔ اس نے کھانا لانا شروع کیا۔ نہ جانے اس کا کیسے پاؤں الجھا کہ گرم گرم شوربے کا پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور سیدنا حسنؓ کی کمر پر گرا۔ یقیناً آپ کی کمر پر آبلے پڑے ہوں گے یا کھال ادھڑ گئی ہو گی۔ آپ نے تکلیف کی شدت سے بے کل ہو کر غصے سے اس غلام کی طرف دیکھا۔ وہ غلام بھی چونکہ خاندانِ نبوت کا پروردہ تھا، حکمتِ دین کو بھی جانتا تھا اور افرادِ خاندان کے مزاج کو بھی۔ اس نے فوراً اس آیت کا پہلا جملہ پڑھا وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (متقی لوگ غصے کو پی جایا کرتے ہیں) آپ نے فوراً نگاہیں جھکا لیں اور غصہ پی گئے۔ اس نے دیکھا کہ موقع غنیمت ہے تو فوراً دوسرا جملہ پڑھا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (اور وہ لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں) آپؓ نے فرمایا جا میں نے تجھے معاف کیا۔ اس خوش نصیب نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے ہلکی سی چوٹ بھی کام دے جائے گی اس نے آخری جملہ پڑھا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اور اللہ نیکی اور احسان کرنے والے کو پسند کرتا ہے) حضرت حسنؓ نے فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ وہ غلام آپ کو بے حد محبوب تھا اس کی ادائیں اور خصلتیں نہایت پیاری تھیں۔ آپ اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اس انداز سے اس غلام کو آزادی مل گئی۔ بجائے اس کے کہ اسے اس کی غلطی کی سزا ملتی اس نے نہ صرف سزا سے معافی حاصل کی بلکہ غلامی سے بھی آزادی مل گئی۔

دوسروں کی غلطیوں پر غصہ پی جانا اور پھر درگزر کرنا اور پھر مزید احسان بھی کرنا یہ وہ صفات ہیں جو اعلیٰ انسانی کردار کی بنیادیں ہیں۔ اشتعال اور غصہ انسان کی فطرت ہے، یہ بے لگام ہو جائے تو اس سے بڑی برائی کوئی نہیں اور اگر اس پر قابو پا لیا جائے تو اس سے بڑی خوبی کوئی نہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ اگر یہ خصلت بھی شامل ہو جائے تو پھر انسان ایسی خوبیوں کا مالک بن جاتا ہے جنہیں اہلِ جنت کی خوبیاں کہا جاتا ہے اور سود خوری جن خصائل کو پیدا کرتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ عادتیں اور وہ خصلتیں جنم لیتی ہیں جو انسانی معاشرے کے لیے لعنت اور سزا سے کم نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی سیرت و کردار کی تعمیر میں ایسی خصلتوں کا ذکر فرمایا جو ایک طرف انسانیت کا نمونہ ہیں اور دوسری طرف سیاقِ کلام کا تقاضا بھی۔

Marfat.com

انفاق میں جذبۂ انفاق دیکھا جاتا ہے

ہماری ان گزارشات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے مال کی بڑی مقدار ضروری ہے اور نہ یہ بات کہ انفاق میں صرف مال ہی دیا جاسکتا ہے اور کوئی چیز نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح معاف کرنے اور احسان کرنے کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے اسے بھی محدود نہیں کرنا چاہئے۔ انفاق کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا:

اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ وَ رُدُّوا السَّآئِلَ وَلَوْ بِظِلْفِ شَاۃٍ

(تم جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا صدقہ میں دے کر ہی ہو اور سائل کو خالی واپس نہ کرو اور کچھ نہیں تو بکری کے پاؤں کی کھری ہی دے دو)

انفاق کے سلسلے میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی تو جن کے پاس سونا چاندی تھا انہوں نے وہ صدقہ دے دیا۔ ایک شخص کھجور کے چھلکے لایا کہ میرے پاس اور کچھ نہیں وہی صدقہ کر دیے گئے۔ ایک اور شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس کوئی چیز صدقہ کرنے کے لیے نہیں ہے۔ البتہ! میں اپنی قوم میں عزت دار سمجھا جاتا ہوں میں اپنی عزت کو خیرات کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی مجھے کتنا ہی برا بھلا کہے میں اس سے ناراض نہیں ہوں گا۔ اندازہ فرمائیے! انفاق فی سبیل اللہ کے تصور نے کہاں کہاں اصلاح و تعمیر کا حق ادا کیا ہے اور جہاں تک عفو و درگزر کا تعلق ہے اس کی وسعتیں بھی بے کنار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خلق عظیم کے منصب پر فائز تھے اور آپ معلم اخلاق بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس لیے آپؐ کو عفو و درگزر اور احسان کے حوالے سے بھی وہ بلند پایہ تعلیم دی گئی جس کی مثال پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ آپؐ سے پروردگار نے ارشاد فرمایا:

صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاعْفُ عَنْ ظَلَمَکَ وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَآءَ اِلَیْکَ

(جو شخص آپ سے قطع تعلق کرے آپ اس سے ملیں اور جو آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کر دیں اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے آپ اس پر احسان کریں)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی سطح تو اس قدر بلند ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے بھی بڑی ہمت چاہئے۔ البتہ! آپؐ کی تعلیمات کی برکت سے یہی اخلاق و اوصاف اپنے اپنے مرتبے کے مطابق آپ کے خدام میں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیئے ہیں۔ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھرے بازار میں امام اعظم کی شان میں گستاخی کی اور گالیاں دیں۔ حضرت امام نے بجائے جواب دینے کے غصہ کو ضبط فرمایا اور خاموشی سے گھر تشریف لے گئے۔ گھر پہنچ کر ایک خوان میں کافی درہم و دینار رکھ کر اس کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے پر دستک دی۔ یہ شخص باہر آیا تو اشرفیوں کا یہ خوان اس کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا ”آج آپ نے مجھ پر بڑا احسان فرمایا اپنی نیکیاں مجھے دے دیں، میں اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں۔“ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس واقعے کا اثر نہ ہوتا۔ اس شخص نے آپ سے معافی مانگی اور آئندہ کے لیے اپنی بداخلاقی سے تائب ہو گیا حتیٰ کہ آپ کے شاگردوں میں رہ کر ایک بڑے عالم کی عزت حاصل کی۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حقوق العباد میں سے چند حقوق کا ذکر فرمایا اور اسے حقوق اللہ پر اس لیے مقدم رکھا کہ اللہ کی ذات کریم بھی ہے اور بے نیاز بھی۔ انسان اگر اس کے حقوق میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا اور پھر اسے معاف کر دینے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آتی۔ اس لیے جیسے ہی آدمی حقوق اللہ کی کوتاہیوں کی معافی چاہتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے درگزر سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا تاوقتیکہ متاثر ہونے والا معاف نہ کرے۔ اس لیے حقوق العباد کے بعد حقوق اللہ کا ذکر کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ انسان انسانوں میں رہے اور پھر اس سے کبھی کسی غلطی کا صدور نہ ہو۔ جنگلوں میں بسنے والے جوگی بھی غلطیوں سے بالکل مبرا نہیں ہوتے۔ لیکن اسلام تو انسانوں کو انسانوں میں رہ کر اعلیٰ سیرت و کردار کا مرقع دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ انسان سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ کبھی غلطی نہ کرے بلکہ وہ انسان کو انسان کی حدود میں رکھ کر ایسے خصائل کا مرقع دیکھنا چاہتا ہے جس پر فرشتے بھی رشک کریں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں ایک ایسی ہی تصویر کھینچی گئی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۪ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۪۟ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝

(اور (متقی) وہ لوگ ہیں کہ جب کسی کھلی برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جان پر ظلم توڑتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے ○ یہ لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی اچھا صلہ ہے عمل کرنے والوں کا) (۱۳۵ تا ۱۳۶)

انفاق کی راہ کی ایک اور مزاحمت

سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ جس طرح ساہوکارانہ ذہنیت ہے جس سے روپے کی ایسی تونس پیدا ہو جاتی ہے کہ ساون کے اندھے کی طرح اسے ہر طرف روپیہ ہی روپیہ دکھائی دیتا ہے۔ ایسے آدمی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ درہم و دینار کی محبت میں ڈوب کر انفاق فی سبیل اللہ سے کام لے گا، بہت مشکل بات ہے۔ اس لیے انفاق کے سلسلے میں سب سے پہلے اس کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ یعنی سود کو ذکر فرمایا، اس پر تنبیہ فرمائی، عذاب کی تہدید سنائی تاکہ لوگ اس برائی سے بچ سکیں۔ اسی طرح انفاق کے راستے کی ایک دوسری بڑی رکاوٹ بدکاری اور عیاشی کی چاٹ لگ جانا ہے۔ جو شخص آوارگی اختیار کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ غلط صحبتیں اٹھاتا ہے تو وہ وقت دور نہیں رہتا جب وہ بے حیائی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور پھر یہ بات مسلم ہے کہ بے حیائی تنہا نہیں آتی، اس کے ساتھ عیاشی بھی آتی ہے، جاریاری بھی آتی ہے، بدکاری تک بھی معاملہ پہنچتا ہے، پھر شراب و کباب کا دور چلتا ہے اور اسراف و تبذیر کا ایک ایک چلن زندہ ہو کر اس کے کردار کا لازمی عنصر بن جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص جب ان عوارض کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اس کے گھر کا اجڑ جانا،

Marfat.com

بیوی سے لاتعلقی، بچوں کو نظرانداز کرنا، حتیٰ کہ فاقوں تک نوبت پہنچ جانا چند دنوں کی بات ہوتی ہے۔ اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کے لیے جس طرح سودی ذہنیت کا خاتمہ ضروری ہے، اسی طرح بے حیائی کی ہر صورت کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔ بے حیائی یکلخت کبھی نہیں آتی۔ سب سے پہلے تفریح کے نام سے فاسقانہ جذبات کو غذا مہیا کی جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسے جذبات رکھنے والا ایک چلتا پھرتا حیوان بن جاتا ہے۔ جس سے آپ کسی خیر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ وہ تفریح کے لیے مختلف فلسفے بگھارے گا۔ انسانی غموں کے علاج کے لیے اسے تریاق کے طور پر پیش کرے گا۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ہر دیکھنے والے کو نظر آئے گا کہ یہ تو سفلی جذبات کی ایک فصل اٹھائی جارہی تھی جس کے اب کٹنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ اس کا راستہ روکنے کے لیے پروردگار نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا اور تقویٰ کے حاملین یعنی متقی لوگوں کی مختلف صفات بیان فرمائیں تاکہ یہ لوگ بداخلاقی کے عوارض سے محفوظ رہ سکیں۔

سب سے پہلے تو اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ انسانی معاشرے سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں کبھی اخلاق سے گری ہوئی کوئی حرکت پیدا نہیں ہوسکتی یا کبھی بھی اس میں بے حیائی کو راستہ نہیں مل سکتا۔ یہ انسانی فطرت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ فرشتوں کو اللہ نے ایسا پیدا فرمایا ہے کہ وہ کبھی معصیت یا بے حیائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ ان کے اندر سرے سے یہ داعیہ رکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن انسان جو ہر طرح کے احساسات کا حامل، جذبات سے متاثر ہونے والا، اچھی اور بری خواہشات کا پیکر اور سفلی جذبات کا اسیر کبھی کسی برائی کا ارتکاب نہ کرے یہ ناممکن ہے۔ صرف اللہ کے نبی ایسے ہوتے ہیں۔ اللہ جنہیں معصوم پیدا فرماتا ہے ان کی ہر برے ارادے اور برے عمل سے حفاظت فرماتا ہے۔ بعض ایسے خوش نصیب بھی ہوتے ہیں جنہیں محفوظ کہا جاتا ہے، لیکن عام انسانی مزاج گناہ، سرکشی اور معصیت سے ہمیشہ دور نہیں رہ سکتا۔ ایک حدیث قدسی ہے جس میں پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ

> ”اگر ایسا ہوتا کہ انسانوں میں سے کوئی انسان کبھی خطا نہ کرتا، اس سے کبھی گناہ کا صدور نہ ہوتا، ان میں سے ہر ایک کا دل محمد ﷺ کے دل جیسا ہو جاتا تو میں ایسے لوگوں کو مٹا دیتا اور اس مخلوق کو پیدا کرتا جو اللہ کی فرمانبرداری بھی کرتی اور معصیت کا ارتکاب بھی کرتی اور پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی۔“

کیونکہ اللہ کو اگر صرف یہ مطلوب ہوتا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو کبھی گناہ نہ کرے تو وہ پہلے سے فرشتوں کی صورت میں موجود تھی۔ انسانوں کو تو اس لیے پیدا کیا اور ان میں خیر و شر کے جذبات رکھے اور ان کو خیر و شر کی پہچان کی تمیز بھی بخشی۔ پھر ان کو آزادی دے دی کہ وہ جس طرح چاہیں زندگی گزاریں۔ اب ان میں سے جو شخص بالکل گناہ کے قریب نہیں جائے گا وہ بھی بخشا جائے گا اور اسی طرح وہ لوگ جن سے کبھی نہ کبھی گناہ کا صدور ہو گا یا وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے اور پھر انہیں اللہ کی یاد آئے گی اور وہ ٹھٹھک کر رک جائیں گے اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں گے کہ ہمارے خالق و مالک نے تو ہمیں ایسے ہر گناہ سے روکا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی نگاہیں ہر وقت ہماری تعاقب میں رہیں گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہم سے یہ گناہ سرزد کیوں ہوا؟ چنانچہ جیسے ہی اللہ کی یاد آئی، تنبہ ہوا تو پشیمانی اور پریشانی نے آپکڑا۔ اب آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، زبان سے التجائیں کی جارہی ہیں، ہاتھ توبہ اور معافی کے لیے پھیلائے جارہے ہیں اور اللہ کی رحمت کو پکارا جارہا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے پروردگار دیکھنا چاہتا ہے۔ فرشتے بھی پہلے موجود تھے جو معصوم تھے۔ ابلیس بھی موجود تھا جس نے سرکشی کی اور پلٹنے کا راستہ بھول گیا۔ اللہ نے آدم اور اس کی ذریت کو اٹھایا کہ وہ غلطیوں سے بچیں اور اگر کبھی نسیان یا خواہشات کا شکار ہو کر غلطی کر بیٹھیں تو فوراً اللہ سے معافی مانگیں۔ یہی وہ معافی اور رونا دھونا ہے اور عاجزی اور سرافگندگی ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ ماہر القادری مرحوم نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

انسان سے اصل مطلوب یہی ہے۔ ہم گھروں میں دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ وہ ہے جو کبھی شرارت نہیں کرتا، لدھڑ بنا سویا رہتا ہے، کوئی شوخی نہیں کرتا، برتن نہیں توڑتا، امی کو تنگ نہیں کرتا، تو وہ پیارا تو ضرور ہوتا ہے، لیکن زیادہ پیار نہیں لیتا۔ لیکن اس کی بہ نسبت دوسرا بچہ جو نہایت شوخ اور چنچل ہے، سارا دن شرارتیں کرتا ہے، برتن توڑتا ہے، امی کو تنگ کرتا ہے اور اس کی امی جب اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے تو اسی کی آغوش میں گھس کر پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے یہی بچہ گھر کی رونق سمجھا جاتا ہے اور یہی ماں باپ کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ماں باپ سے زیادہ رحیم و کریم اور نوازنے والے ہیں۔ وہ جب اپنے بندے کو دیکھتے ہیں کہ اس نے گناہ کیا، سرکشی دکھائی، لیکن جیسے ہی اپنے رب کی یاد آئی تو ساری سرکشی نکل گئی۔ اب اس کی آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں، دل خون ہو رہا ہے کہ ہائیں! میں یہ کیا کر بیٹھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے تو وہ اس کی پیشانی کے قطروں کو بھی موتی بنا دیتی ہے۔ کیا بات کہی اقبال نے ۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

ایک پر لطف بات

اس آیتِ کریمہ میں اک اور بہت پر لطف بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے بندے جب متنبہ ہونے اور خدا کی یاد آنے پر فوراً استغفار کی طرف لپکتے ہیں اور معافی پہ معافی مانگتے چلے جاتے ہیں۔ تو دیکھنے والا حیران ہوتا ہے کہ یہ لوگ آخر پلٹ پلٹ کر اللہ کے دروازے کی طرف ہی کیوں آتے ہیں؟ اسی کے آستانے سے کیوں بار بار چمٹتے ہیں؟ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ

(اللہ کے سوا اور گناہوں کو کون بخش سکتا ہے؟)

اگر کوئی اور دروازہ بھی ہوتا تو اس کے بندے اس کا طواف کرتے، اس سے لپٹتے اور دعائیں مانگتے۔ جب آستانہ ہی ایک ہے تو پھر اس کے بندے کسی اور طرف کیسے جا سکتے ہیں؟ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ انہوں نے غیب سے ایک آواز سنی کہ کسی کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ''نکل جاؤ یہاں سے ہمیں تمہارا آنا منظور نہیں''۔ شیخ نے جب یہ آواز بار بار سنی تو آپ نے اس شخص کو تلاش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس شخص کو پالیا۔ اس سے پوچھا کہ بھائی یہ جو میں آواز سنتا ہوں آپ بھی سنتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بہت دنوں سے سن رہا ہوں۔ تو شیخ نے کہا پھر چلے کیوں نہیں جاتے۔ اس نے غور سے شیخ کو دیکھا اور حیران ہو کر کہنے لگا کہ بھلے آدمی! تم مجھے بتاؤ۔ میں کہاں جاؤں؟ اگر تو اس آستانے کے سوا کوئی اور آستانہ ہے تو مجھے اس کا پتہ دے دو۔ میں وہاں چلا جاتا ہوں۔ جب اس آستانے کے سوا کوئی اور آستانہ ہی نہیں تو میں کہاں جاؤں؟ مجھے تو اسی سے لپٹ کر جان دینی ہے۔ چاہے ہزار دفعہ نکلنے کا حکم دیا جائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ۔

Marfat.com

جفا سے ہٹو تم وفا سے ٹلوں میں
نہ یہ بات ہو گی نہ وہ بات ہو گی
قسم آستاں کی نہ اٹھیں گے ہرگز
یہیں دن چڑھے گا یہیں رات ہو گی

شیخ کہتے ہیں کہ میں ابھی وہیں تھا جب وہ صاحب مجھے دوبارہ ملے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اللہ نے بالآخر میری سن لی۔ میری غلطیوں سے درگزر فرمایا اور مجھے وہ تمام مقامات پھر عطا کر دیئے گئے جن سے میں محروم کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ جذبہ ہے جو حاصلِ بندگی ہے۔ انسان کی یہی وہ متاعِ بے بہا ہے جس پر اسے فخر کرنا چاہئے۔ جب وہ اللہ کے سامنے آنسو بہاتا ہے تو وہ قدر و قیمت میں موتیوں سے کہیں بڑھ جاتے ہیں۔ جب اس کا دل ہر طرف سے کٹ کر اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ ایسے دل کو اپنا مرکز بنالیتا ہے۔ وہ جو ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں پھیلاتا ہے اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کی ہمیشہ لاج رکھتا ہے۔ یہی وہ متاعِ بے بہا ہے جس پر اقبال نے وہ بات کہی جسے جسارت کہنا چاہئے کہ:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
متاعِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

حاصل کلام یہ کہ حقوق اللہ میں اللہ کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کبھی اس کی معصیت نہ کی جائے اور اگر کبھی معصیت ہو جائے تو اس وقت تک بے کلی اور بے چینی الگ نہ ہو جب تک ادھر سے معافی نہ مل جائے۔ غلطی کا ہو جانا انسانی فطرت ہے لیکن اس پر اصرار کرنا شیطانی فطرت ہے۔ اس لیے ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو کبھی دہرانے کی جسارت نہ کرے، فوراً معافی مانگے پھر دیکھے کہ اللہ کتنا رحیم و کریم ہے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھے کہ اللہ کا علم اس قدر وسیع اور محیط ہے کہ اس کے علم سے نہ بندوں کی غلطیاں باہر رہتی ہیں اور نہ غلطیوں کے بعد بندوں کا طرزِ عمل۔ اگر طرزِ عمل وہ اختیار کرتا ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیے اللہ کی بخشش انتظار میں ہے۔ اس کی جنتیں ان کی منتظر ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ جب قیامت کے دن جنتوں کا دیدار ہو گا تب اندازہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے اعمال کی جزا کتنی عظیم رکھی ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ O هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ O

(تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہواO یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے) (۱۳۷ تا ۱۳۸)

سُنَنٌ ...... سنت کی جمع ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس کی مثالیں ساری دنیا میں بکھری ہوئی ہیں۔ قرآنِ کریم کے چونکہ براہِ راست مخاطب عرب ہیں اس لیے جزیرۂ عرب اور اس کے گرد و پیش میں قوموں کے ساتھ جو سلوک ہوا اور ان کے کھنڈرات جس کی منہ بولتی تصویر تھے ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم جزیرۂ عرب میں چل پھر کر

Marfat.com

دیکھو اور ان علاقوں میں بھی دیکھو جہاں تم اپنے کاروانِ تجارت لے کر جاتے ہو، تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے ضابطے کبھی نہیں بدلے۔ جس قوم میں بھی اللہ کے رسول آئے اگر وہ قوم ایمان لے آئی تو اللہ کی نعمتوں کی سزاوار ٹھہری اور اگر اس نے سرکشی اختیار کی تو وہ قوم ہمیشہ کے لیے تباہ کردی گئی۔ یہ ضابطے آج بھی نہیں بدلے۔ اسی لیے ہم نے لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کردیا ہے اور ان کی ہدایت کے لیے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں اور آخری ہدایت نازل ہو چکی ہے۔ یہی تمہارے لیے ہدایت بھی ہے، نصیحت بھی اور سمجھ جانے کا موقع بھی۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ تو بچ جاؤ گے ورنہ تباہی سر پر تلی کھڑی ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

(اور پست ہمت نہ بنو اور غم نہ کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو) (۱۳۹)

مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح اور حوصلہ افزائی

احد کی شکست سے کمزور قسم کے لوگوں میں جو دل شکستگی پیدا ہوئی اس سے ایک طرف تو کمزور مسلمانوں کے دماغوں میں بہت سے وسوسوں نے جگہ بنالی اور دوسری طرف منافقین اور یہود کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔ کمزور مسلمان یہ سوچتے تھے کہ ہم اگر حق پر ہیں اور ہم میں واقعی اللہ کے رسول موجود ہیں تو پھر ہمیں شکست کیوں ہوئی اور منافقین اور یہود مسلمانوں کے دلوں میں مزید وسوسے پیدا کرتے تھے کہ تم آج تک یہ سمجھتے رہے ہو کہ محمد ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ وہ جو اللہ کی تائید و نصرت کی باتیں کرتے ہیں اور فتح و غلبہ کی نوید سناتے ہیں، وہ واقعی ایک حقیقت ہے۔ لیکن احد کی شکست نے یہ ثابت کردیا کہ یہ سب پادر ہوا باتیں تھیں جس کے ذریعے اپنا ایک بھرم قائم رکھنا مقصود تھا اور مسلمانوں کو اس طرح سے عقیدت و محبت کی زنجیروں میں باندھنا مطلوب تھا کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی کی عقیدت میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر اس کی ہر بات کو حجت سمجھتا ہے اور اگر کوئی بات بالکل ہی لایعنی ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کرتا ہے۔ منافقین یہ کہہ رہے تھے کہ تمہارا بھی آج تک یہی معمول رہا ہے۔ تم نے جو بات سنی اس پر کمربستہ ہو گئے۔ لیکن اب اصل حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ اب تمہیں اپنے ایمان کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ قرآنِ کریم میں ان تصورات کا ابطال اور اس پراپیگنڈے کو رد کرتے ہوئے مسلمانوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا جارہا ہے۔ اس سے پہلے کی آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کی چند کمزوریوں کی نشاندہی فرمائی اور پھر صاف صاف فرمایا کہ اللہ کے یہاں سیرت و کردار کی پختگی اور اصولوں کی پابندی کام آتی ہے اور اسی کے مطابق فتح و شکست کے فیصلے ہوتے ہیں۔ احد میں جو کچھ ہوا وہ ان حقائق سے یکسر مختلف نہیں بلکہ انہی حقائق کی حرف بہ حرف تائید ہے اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کا حوصلہ بندھاتے ہوئے مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ احد کی شکست تمہاری زندگی کا آخری معرکہ ہے۔ یہ ایک واقعہ تھا جو تمہاری کمزوریوں کی وجہ سے رونما ہوا۔ آئندہ اگر تم اپنی کمزوریوں کا سدِباب کرلو اور اپنی کوتاہیوں پر قابو پالو اور بجائے جنگ احد کے واقعات سے ہراساں اور دل گرفتہ ہونے کے زخمی شیر کی طرح انگڑائی لے کر اٹھو تو مستقبل اب بھی تمہارا ہے۔ اس لیے اس آیت میں فرمایا کہ کمزوری نہ دکھاؤ، اس حادثے کی وجہ سے جو رونما ہو چکا اور غم نہ کھاؤ اس نقصان پر جو تمہیں پہنچ چکا۔

Marfat.com

وھن سے مراد

لَا تَھِنُوْا ، وہن سے ہے۔ وہن کا معنی ''کمزوری اور ضعف'' کے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے صحابہ سے فرمایا کہ ''ایک زمانہ آئے گا کہ جب تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہو جاؤ گے۔ دنیا تم پر اس طرح چڑھ دوڑے گی جیسے بھوکے دستر خوان پر جھپٹتے ہیں۔'' صحابہ نے پوچھا ''کیا ہم اس وقت بہت تھوڑے ہوں گے؟'' آپؐ نے فرمایا تمہاری تعداد تو ریت کے ذروں کی طرح ہوگی۔'' صحابہ نے پوچھا ''پھر ہمیں کیا ہو جائے گا؟'' کیونکہ ان کے سامنے اپنی تاریخ تھی جس کی وجہ سے انہیں یہ بات بعید از قیاس معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ جب ہماری تعداد تین سو تیرہ ہوئی تو ہم نے ایک ہزار کے لوہے میں ڈھلے ہوئے لشکر کا بھرکس نکال دیا اور جب ہم سات سو ہوئے تو اپنی غلطیوں کے باعث اگرچہ ہم نے زخم اٹھائے لیکن دشمن ہم پر غالب نہ آ سکا۔ ہم اپنے آخری معرکے میں تیس ہزار تھے جب کہ مقابلے پر اپنے وقت کی سب سے بڑی قوت رومن ایمپائر تھی۔ ہم ان کے ملک کی سرحدوں تک پہنچے لیکن انہیں آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہ ہوئی تو آخر ہمیں کیا ہو جائے گا کہ دنیا ہمیں تر نوالہ سمجھنے لگے گی۔ آپؐ نے فرمایا ''تمہیں وہن کی بیماری لگ جائے گی۔'' صحابہ نے پوچھا ''وہ کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا ''دو بیماریوں کا مرکب ہے۔

حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھَۃُ الْمَوْتِ (دنیا کی محبت اور موت کا ڈر)

یہ حدیث وہن کی بہترین تشریح ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دنیا کی کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آ سکتی۔ لیکن اگر تم وہن کا شکار ہو جاؤ یعنی تم آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے لگو، تمہاری نگاہوں میں اصل قدر و قیمت درہم و دینار کی ہو، تم دنیا کے خزف ریزوں کے بدلے اقدارِ انسانیت کا سودا کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں موت کا ڈر اور خوف کسی بڑے معرکے میں شریک ہونے کی اجازت نہ دے۔ جب آدمی دنیا سے محبت کرتا ہے تو پھر زندگی اسے اس قدر عزیز ہو جاتی ہے کہ وہ ہر وقت موت سے خوف کھاتا ہے۔ اسے ہر جگہ موت کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔ اسے دنیا چونکہ آخرت سے زیادہ پیاری ہے اس لیے وہ ایسے معرکے میں کبھی شریک نہیں ہوتا جس میں موت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہو۔ زندگی موت سے خراج لینے کا نام ہے۔ جو موت سے ڈرتا ہے وہ زندگی کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ لوگ موت کا ایک دفعہ شکار ہوتے ہیں وہ ہر روز موت کا شکار رہتا ہے۔ ایسے شخص سے کسی بڑے معرکے کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اکبر مرحوم نے ٹھیک کہا۔

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ ؕ وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَآءَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ۝

Marfat.com

(اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو دشمن قوم کو بھی اسی طرح کی چوٹ لگی ہے۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے درمیان الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں تا کہ اللہ تمہارا امتحان کرے اور ممیز کر دے ایمان والوں کو اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا o اور تا کہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے) (۱۴۰ تا ۱۴۱)

اَلْاَیَّامُ کا مفہوم

جنگِ احد میں مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے۔ بعض سربر آوردہ مسلمانوں کی لاشوں کو بگاڑا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک ایک زخم مسلمانوں کے دل و دماغ اور جان و تن کو زخمی کرنے کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ ان آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ انسانی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں۔ پہلے بھی ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اَلْاَیَّامُ سے مراد تاریخ کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات و حوادث پیش آئے ہوں۔ اَیَّامُ الْعَرَبِ سے مراد اہلِ عرب کی جنگیں ہیں۔

احد کے حادثہ میں مضمر حکمتیں

پروردگار نے قرآنِ کریم میں ان ایام کو اَیَّامُ اللّٰہِ قرار دیا ہے جس میں اللہ کی جانب سے فتح و نصرت کا ظہور ہوا ہے یا قوموں پر اللہ کا عذاب ٹوٹا ہے۔ پروردگار اس آیت میں فرما رہے ہیں کہ اس طرح کے فتح و شکست کے جو واقعات پیش آتے ہیں یہ ہر قوم میں پیش آتے ہیں اور ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ اگر یہ حادثہ ہوا ہے تو یہ بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہے۔ جس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں کارفرما ہیں۔ اس لیے ان حکمتوں کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے دل برداشتہ ہو کر پست ہمت نہیں بننا چاہیے۔ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ وہ ہے لِیَبْتَلِیَکُمْ (اس حادثے کی پہلی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتا ہے) کہ تمہارے ایمان میں قوت کتنی ہے اور تم کس حد تک استقامت دکھا سکتے ہو اور دوسری حکمت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تم میں شہید اٹھانا چاہتا ہے۔ شہید سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی صداقت کے اثبات کے لیے جان کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ کسی بھی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے جان دے دینا یہ اس حقیقت کے برسرِ حق ہونے کی سب سے بڑی گواہی اور سب سے بڑی دلیل ہے، اسی لیے ایسے لوگوں کو شہید کہا جاتا ہے۔ ایک مسلمان کو جو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے اس کے تقاضوں میں سے سب سے بڑا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی دین کی شہادت کے لیے موت سے کھیلنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ ہر جان والا جان سے پیار کرتا اور موت سے خوف کھاتا ہے۔ لیکن ایک مومن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ موت سے محبت کرتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ یہ موت ہی ہے جس سے گزر کر میں اللہ کے دین اور اس کی صداقت پر گواہ بنوں گا اور اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ بات کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ شہادت اتنا بڑا مقام ہے کہ جس کی وہ ہر وقت تمنا کرتا رہتا ہے۔ جنگِ احد ہی کے حالات میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ جس صبح کو یہ جنگ لڑی جانے والی تھی اس صبح کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپس میں ملے اور دونوں نے ایک دوسرے سے خواہش کی کہ آؤ دونوں مل کر آج کے معرکے کے حوالے سے اللہ سے دعا کریں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعا مانگی کہ:

Marfat.com

یا اللہ! آج کی جنگ میں میرا مقابلہ ایک ایسے بہادر اور جنگجو سے ہو کہ جو ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ پر حملہ کرے اور میں اس پر بڑھ بڑھ کر وار کروں۔ حتیٰ کہ مجھے توفیق دے کہ میں اس پر غالب آ جاؤں۔ اسے قتل کر دوں اور اس کے ہتھیار اور اس کے مال پر قبضہ کر لوں تاکہ آئندہ جنگوں میں وہ کام آئے۔

حضرت عبداللہ ابن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دعا پر آمین کہی اور پھر انہوں نے دعا کی کہ:

یا اللہ! آج میرا مقابلہ بھی ایسے بہادر جنگجو سے ہو جس نے کبھی شکست کا داغ نہ اٹھایا ہو، ہم دونوں ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملے کریں حتیٰ کہ ایک وقت آئے وہ مجھ پر غالب آ جائے۔ مجھے قتل کر دے، میرے ناک، کان اور ہونٹ کاٹے، میری لاش کا مثلہ کرے، قیامت کے دن جب اپنی اس کٹی پھٹی لاش کے ساتھ میں اٹھایا جاؤں تو الٰہی آپ مجھ سے پوچھیں کہ "عبداللہ! تیرے ساتھ یہ حشر کس جرم کی بنا پر کیا گیا؟" تو میں جواب دوں۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی دعا اسی طرح قبول ہوئی اور عبداللہ کی دعا مجھ سے بہتر تھی۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں شہادت کی تمنا کس قدر تھی۔ جنگِ احد میں بعض خوش نصیبوں کو یہ شہادت کا مرتبہ بھی دینا مقصود تھا اور مزید ایک مصلحت یہ بھی پیشِ نظر تھی کہ بعض کمزور مسلمانوں کے دل و دماغ میں ابھی تک کچھ نہ کچھ میل کچیل اور کھوٹ باقی تھا جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں ان میں یکسوئی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ضروری تھا کہ اس میل کچیل اور کھوٹ کو نکال کر دلوں کو اتنا صاف اور شفاف کر دیا جائے کہ آئندہ حقیقتِ ایمان جاننے کے لیے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور اللہ کے کسی کام کی حکمت سمجھنا ان کے لیے دشوار نہ رہے اور وہ اسلام کے ایسے کارآمد سپاہی ثابت ہوں جیسے سپاہی کی اسلام کو ضرورت تھی۔

اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ اس عظیم واقعے کے پیچھے اور کیا کیا حکمتیں کارفرما ہیں۔ لیکن تین حقائق جو سرسری نگاہ سے سامنے آئے ہیں ان پر ہی غور کر لیا جائے تو یہ بات سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ ایسے واقعات کا وقوع پذیر ہونا ایک مومن کے ایمان کو جلا بخشنے کا کتنا بڑا ذریعہ ہے اس لیے ایسے واقعات کے بعد ایمان میں قوت آنی چاہیے نہ کہ دل برداشتہ ہونا چاہیے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

(کیا تم گمان رکھتے ہو کہ جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی اللہ نے ممیز نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا تاکہ ممیز کر دے ثابت قدم رہنے والوں کو ○ اور تم آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو، سو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے تھے) (۱۴۲ تا ۱۴۳)

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ایک مومن اور کافر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کافر کا ہر کام دنیاوی مقاصد میں سے کسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔لیکن اس کے برعکس مومن کے ہر کام کے پیچھے اللہ کی رضا کے حصول کی تڑپ اور جنت کی تمنا ہوتی ہے کیونکہ جنت درحقیقت اللہ کی رضا کا انعام ہے۔اس لئے مومن کا کوئی کام اس کی خواہش کے بغیر نہیں ہوتا۔لیکن بعض صاحبِ ایمان لوگوں میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کارفرما رہتی ہے جس کی وجہ سے ایمان کے مدارج میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ اس معاملے میں شدید نقصان کا باعث بھی ہوتی ہے۔وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آدمی جنت کی تمنا ضرور کرتا ہے لیکن اس کے حصول کیلئے جتنی شدید محنت، جتنی زیادہ ریاضت، جتنا بڑا اخلاص اور جتنی عظیم قربانی درکار ہے اس کی طرف دھیان بہت کم جاتا ہے۔خاص طور پر وہ نومسلم جنہیں ابھی تربیت حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا وہ بہت جلد اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان کے ذہن میں یہ بات نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے کہ ہمارا کام صرف اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے،اس کے بعد جنت میں داخلہ ہمارا استحقاق ہے اور اگر کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے جیسی جنگِ احد میں ہوئی کہ صاحبِ ایمان لوگوں کے جنازے اٹھے۔ایک بڑی تعداد میں اسلام کے مخلص سپاہی زخمی ہوئے،تو وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور یا ان کے دائیں بائیں منافقین کی ٹولیاں انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ دیکھو اگر تمہارا دین سچا دین ہوتا اور تمہارے پیغمبر واقعی اللہ کے نبی ہوتے اور جو کچھ تمہارے ساتھ وعدے کیے گئے تھے وہ اگر واقعی منجانب اللہ تھے تو یہ شکست اور یہ بہت بڑا حادثہ کیوں وقوع پذیر ہوتا؟

قرآنِ کریم نے اس غلط فہمی کو کئی جگہ دور فرمایا ہے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے ملتی جلتی آیت سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۱۴ قرآنِ کریم میں موجود ہے جس کے تیور اور بھی تیکھے ہیں۔جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم نے گمان کر لیا ہے کہ تم سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ قیامتیں نہیں ٹوٹیں اور وہ حوادث تم پر نہیں گزرے جو پہلے لوگوں پر گزر چکے ہیں۔حالات کی سنگینی نے انہیں بری طرح ہلایا،تکالیف نے انہیں بری طرح جھنجھوڑا حتیٰ کہ رسول بھی کہہ اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟اسی طرح سورۃ العنکبوت کے آغاز میں فرمایا گیا کہ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیئے جائیں گے،یعنی وہ یونہی فوز و فلاح کی منزلیں سر کر لیں گے۔صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے ایمان لانے کا دعویٰ کر دیا ہے حالانکہ ابھی انہیں آزما کر نہیں دیکھا گیا کہ وہ اخلاص اور استقامت کی کس منزل میں ہیں۔

آزمائش کا دوگونہ فائدہ

اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر غائت درجہ رحیم و کریم ہوتا ہے اور اس کی رحمت کی بارش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔لیکن جنت کے مستحق اور دنیا کی امامت کے قابل وہ اس وقت تک کسی کو نہیں بناتا جب تک وہ آزمائشوں سے گزر کر اپنے آپ کو کندن ثابت نہیں کر دیتا۔افراد بھی آزمائے جاتے ہیں اور جماعتیں بھی آزمائی جاتی ہیں کیونکہ یہ آزمائش ہی یہ جاننے اور نمایاں کرنے کا واحد ذریعہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں ان میں سیرت و کردار کی پختگی کہاں تک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی سے بڑی صداقت سے تعلق جوڑ لینا اگرچہ آسان نہیں کیونکہ خالی انتساب کو بھی بعض دفعہ دنیا برداشت نہیں کرتی۔لیکن اللہ کے

Marfat.com

یہاں محض انتساب کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ مسلسل امتحانات میں ڈال کر اسے ایک طرف آزماتا ہے تو دوسری طرف اس آزمائش کے قابل بھی بناتا ہے۔ جس طرح ایک آدمی کو یہ جاننے کیلئے کہ وہ تیراک ہے یا نہیں اسے پانی میں اتارا جاتا ہے اگر وہ تیرنے میں کامیاب رہتا ہے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی تیراک ہے۔ لیکن اگر وہ کسی کمزوری کا اظہار کرتا ہے تو پھر اسے مزید پانی میں رہنے اور تیرنے کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی کمزوریوں کا تدارک کر سکے۔ انسانی سطح پر انسانی مفادات، انسانی خواہشات اور انسانی صداقتوں کے بپھرے ہوئے سمندر میں اس طرح کامیابی سے تیرنا کہ کسی مفاد کا بھنور، کسی خواہش کی موج اور کسی مخالف ہوا کا بگولہ اسے تیراکی سے روک نہ سکے بلکہ وہ کامیابی سے آگے بڑھتا جائے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے ایمان کے حامل لوگ اپنی اہلیت بھی ثابت کرتے ہیں اور اللہ کے انعامات کے مستحق بھی ٹھہرتے ہیں۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا گیا ہے کہ تم نے جنگِ احد سے پہلے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ ایمانیات کے اقرار و اثبات اور عبادت و بندگی کے چند دعوؤں سے شاید جنت میں داخلے کا سامان ہو جائے گا اور تمہیں کسی آزمائش سے گزرنا نہیں پڑے گا۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جس نے ہمیشہ اہلِ حق کو نقصان پہنچایا ہے۔ جیسے ہی ان کی خانہ ساز آرزوؤں کا طلسم ٹوٹتا ہے، وہ حوصلہ ہارنے لگتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں

بہر غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

جنت کی خواہش بہت آسان ہے لیکن اس کا حصول آسان نہیں۔ اس میں جس طرح اپنی ذاتی خواہشات اور مفادات کو شریعت کے احکام پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر حق و باطل کا معرکہ برپا ہو جائے اور باطل اہلِ حق کو فنا کر دینے پر تل جائے تو پھر زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر اور ہر تکلیف برداشت کر کے اللہ کے دین پر قائم رہنا اور پھر وقت آنے پر اس کو غالب کرنا یہ وہ پل صراط ہے جس پر چل کر آدمی جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا:

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جنت میں داخلے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب مسلمان اپنی سرفروشیوں سے میدانِ جہاد کو لالہ زار بنا دیں گے اور وقت کے ہر اٹھتے ہوئے طوفان کے مقابلے میں چٹان کی طرح حائل ہو جائیں گے اور صبر کا ایسا پہاڑ بن جائیں گے کہ جس سے باطل کو ٹکرا کر سر پھوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اور اہلِ باطل پر یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ ایک مسلمان اپنے اندر جذبۂ جہاد کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں رکھتا اور اس کی تمام سرفروشیاں اللہ کی رضا کے حصول کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتیں۔ عَلِمَ یَعْلَمَ کا معنی اگرچہ "جاننا" ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو بغیر کسی آزمائش کے بندوں کے جذبوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ لیکن یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یَعْلَمَ جاننے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ممیز کر دینے اور نمایاں کر دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی مجاہدین کا جذبۂ بے پناہ خود اپنے آپ کو ثابت کرے کہ وہ کس وادی میں ہیں۔

Marfat.com

آیت کا پس منظر

دوسری آیتِ کریمہ کا ایک پس منظر ہے۔قریش نے جب مدینہ پر تین ہزار کا لشکر لے کر چڑھائی کر دی تو آنحضرت ﷺ نے صبح کو صحابہ سے مشورہ کیا کہ ہماری افرادی قوت تو تمہارے سامنے ہے اور دشمن تین ہزار جنگجوؤں کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے۔کس طرح مقابلہ کرنا چاہیے؟مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔عبداللہ بن ابی جواب تک شریکِ مشورہ نہیں ہوا تھا اب اسے پہلی دفعہ مشاورت میں شریک کیا گیا تھا۔اس نے بھی یہی رائے دی۔لیکن ان نوخیز صحابہ نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔انہیں شوقِ شہادت چین نہیں لینے دیتا تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کھلے میدانِ جنگ میں دو دو ہاتھ کیے جائیں۔ان کا اصرار دیکھ کر آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے،اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو شاید مرضی کے خلاف نکلنے پر مجبور کیا ہے۔سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں،ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔اس آیتِ کریمہ میں انہیں سرفروشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم شوقِ شہادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کی تمنا کرتے تھے اور تمہاری آرزو یہ تھی کہ کاش!جنگِ بدر کی طرح دشمنوں سے ایک اور معرکہ برپا ہو تو ہم اس میں دل کھول کر اپنے حوصلے نکالیں۔ارشاد فرمایا گیا ہے (تم موت سے دوچار ہونے سے پہلے اس کی تمنا کرتے رہے اب تم نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا ہے) تمہاری سرفروشیوں کے سامنے اب موت کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔تم اس سے پہلے موت کی تمنا ضرور کرتے تھے لیکن وہ ایک تخیلاتی بات تھی۔اب تو اس تخیل نے واقعہ بن کر تمہارے ایمان کو آزمایا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ تم نے کہیں بھی کمزوری کا ثبوت نہیں دیا۔تم نے جس طرح موت سے آنکھیں چار کی ہیں یہی وہ مشاہدہ ہے جو کل کو یقین کی قوت بنے گا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ
لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ
ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ
مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ

Marfat.com

رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا
ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا
كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا
فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

رکوع: ۱۵۔ (محمد ﷺ! تو بس ایک رسول ہیں، گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول، تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے؟ جو پھرے گا الٹے پاؤں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور جلدی اجر دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو O اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو آخرت کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں آخرت میں سے دیں گے اور ہم خوب جزا دیں گے شکر ادا کرنے والوں کو O اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، تو نہ تو وہ پست ہمت ہوئے اس مصیبت کی وجہ سے جو اللہ کے راستے میں انہیں پہنچی اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ اللہ پسند کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں کو O ان کی دعا تو ہمیشہ یہی رہی کہ اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہوں کو، ہماری بے اعتدالیوں کو اور ہمارے قدموں کو جمائے رکھ اور ہمارے گناہ بخش دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما O پس اللہ نے انہیں عطا فرمایا دنیا کا صلہ بھی اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) (۱۴۴ تا ۱۴۸)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى
اَعْقَابِكُمْ ۗ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ O

(محمد ﷺ! تو بس ایک رسول ہیں، گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول، تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے؟ جو پھرے گا الٹے پاؤں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور جلدی اجر دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو) (۱۴۴)

Marfat.com

آیت کا پس منظر

اس آیتِ کریمہ کا بھی ایک پس منظر ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے شروع میں کافروں پر فتح عطا فرمائی۔ حضرتِ حمزہ، حضرتِ علی، حضرتِ ابودجانہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر بہادرانِ اسلام نے دشمن فوج کی صفیں الٹ ڈالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بدحواسی سے میدانِ جنگ سے بھاگے۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دشمن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا ہے تو بجائے ان کا تعاقب کرنے کے وہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں لگ گئے اور وہ پچاس تیر انداز جو پشت کے ایک درے پر مقرر کئے گئے تھے تاکہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر سکے۔ ان تیر اندازوں نے بھی جب دیکھا کہ مالِ غنیمت اکٹھا کیا جا رہا ہے اور دشمن بھاگ گیا ہے تو وہ بھی نیچے اتر آئے۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ جوان کے امیر تھے انہوں نے ہر چند روکا اور انہیں آنحضرت ﷺ کے تاکیدی احکام یاد دلائے۔ لیکن وہ یہ سمجھ کر کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی، چند آدمیوں کے سوا باقی سب مالِ غنیمت اکٹھا کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ خالد بن ولید جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ ان کی دور بین نگاہوں نے جب عقب سے راستہ صاف دیکھا تو سواروں کا ایک دستہ لے کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا، لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی تھیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو آنحضرت ﷺ سے صورت میں مشابہ تھے اور آج مسلمانوں کے علمبردار بھی تھے۔ ابنِ قمیہ نے انہیں شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرتِ حذیفہؓ کے والد یمان اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا مسلمانو! اللہ تمہیں بخش دے۔ رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں۔ جن میں حضرتِ علی مرتضیٰ، حضرت ابوبکر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر ابن العوام، حضرت ابودجانہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام بہ تخصیص معلوم ہیں۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ صرف حضرت طلحہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما رہ گئے تھے۔ اس ہلچل اور اضطراب میں اکثر نے بالکل ہمت ہار دی لیکن جاں بازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا، آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے لیکن کعبۂ مقصود رسول اللہ ﷺ کا پتہ نہ تھا۔ حضرت انسؓ کے چچا حضرت ابنِ نضر لڑتے بھڑتے موقعہ سے آگے نکل گئے دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیئے ہیں پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ ﷺ نے تو شہادت پائی۔ ابنِ نضرؓ نے کہا ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو (۸۰) سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان نہ سکا ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر پہچانا۔ جاں نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرورِ عالم ﷺ کو ڈھونڈتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ کی نظر پڑی، چہرہ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں۔ یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے، کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کون مجھ

Marfat.com

پر جان دیتا ہے؟زیاد بن سکنؓ پانچ ساتھی لے کراس خدمت کے ادا کرنے کیلئے بڑھے اور ایک ایک نے جان بازی سے لڑ کر جانیں فدا کردیں۔حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ان کالاشہ قریب لاؤ لوگ اٹھا کر لائے کچھ کچھ جان باقی تھی قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرہ مبارک پر تلوار ماری۔اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپ کو دائرہ میں لے لیا،ابو دجانہؓ جھک کر سپر بن گئے ،اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا،ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔بے درد رحمتِ عالم ﷺ پر تیر برسا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں)

ان واقعات میں آپ نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کس طرح کوہِ استقامت واستقلال بن کر ایک جگہ جمے کھڑے رہے۔اور لڑائی کی ساری چکی آپ کے گرد گھومتی رہی اور ایک وقت آیا کہ دشمن کا سارا زور اس چراغ کو بجھانے پر صرف ہو رہا تھا۔لیکن سب سے خطرناک وقت وہ تھا جب یہ بات مشہور کر دی گئی کہ آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا۔بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ نے اس سے ایسا شدید تأثر لیا کہ ہتھیار پھینک کر مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور جب ان سے کہا گیا کہ آپ بیٹھ کیوں گئے ہیں؟ تو شدتِ غم سے فرمایا کہ جب وہ شمع نہ رہی جس پر پروانے قربان ہوتے تھے تو اب کس کیلئے لڑیں۔لیکن ایسے بھی جاں نثار تھے جنہوں نے یہ کہہ کر فوج میں ایک تازہ روح پھونک دی کہ تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ جب حضور نہیں رہے تو ہم کس کی خاطر لڑیں۔تمہیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ جس مقصد کی خاطر آنحضرت ﷺ نے جان دی ہے ہمیں بھی اسی مقصد کی خاطر جان دے دینی چاہیے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے اسی غلطی کا ازالہ فرمایا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شاید اللہ کے رسول کیلئے لڑتے ہو لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ کا رسول کس کیلئے لڑتا ہے اور تمہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ محمد ﷺ صرف اللہ کے رسول ہیں، خدا نہیں ہیں، جو ہمیشہ رہیں گے۔۔دنیا میں بڑی سے بڑی شخصیت جانے کیلئے آئی ہے ہمیشہ رہنے کیلئے نہیں۔آنحضرت ﷺ اگرچہ خلاصۂ کائنات اور باعثِ تخلیقِ عالم ہیں۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کو بھی دنیا سے جانا ہے۔جس طرح پہلے رسول دنیا سے چلے گئے۔تین سو چودہ رسول اور سوا لاکھ پیغمبر تقریباً دنیا میں بھیجے گئے لیکن آج دنیا میں ان کی عظمتیں زندہ ہیں لیکن وہ خود تو واصل بحق ہو چکے ہیں۔امیر مینائی نے ٹھیک کہا

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

اگر تم نے اس حقیقت پر غور کیا ہوتا کہ پیغمبروں کے آنے کا مقصد اللہ کے نام اور اس کے دین کی سربلندی ہے۔پیغمبر اسی کیلئے محنت کرتے اور اسی کیلئے تکلیف اٹھاتے ہیں۔اسی کیلئے وطن سے بے وطن ہوتے اور اسی کیلئے ہر طرح کی قربانی پیش کرتے ہیں۔ان کی ذات اللہ کی بندگی، اللہ کے دین کی خاطر سرفروشی کا نمونہ ہوتی ہے وہ جب تک دنیا میں رہتے ہیں مینارۂ نور بن کر رہتے ہیں اور جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کی زندگی کا ایک ایک عمل لوگوں کیلئے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ان پر نازل ہونے والی کتاب اور اس کے مطابق گزاری ہوئی

Marfat.com

زندگی انسانوں کیلئے قانون ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اللہ کے راستے میں وفات نہیں پاسکتے یا شہید نہیں ہوسکتے۔ انبیائے کرام کے بارے میں تو قرآنِ کریم بھرا پڑا ہے جس میں ان انبیاء کرام کا تذکرہ موجود ہے جو اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے شہید کئے گئے اور ان رسولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنہیں اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑی، رسول اللہ ﷺ بھی اسی قافلۂ حق کے سالار ہیں۔ اگر وہ بھی اللہ کے دین کی خاطر شہید کردیئے جائیں یا طبعی طور پر وفات پاجائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاؤ گے یعنی دین چھوڑ دو گے اور جو شخص ایسا کرے گا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ کے دین کا کچھ نہیں بگاڑے گا نہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اللہ کے راستے میں قدر و قیمت کے مستحق وہ لوگ ہیں جو بہر صورت اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کے راستے میں جان کھپاتے ہیں۔

جذبۂ محبت کی کارفرمائی

عقیدت و محبت کا جذبہ ایسا زوردار جذبہ ہے کہ بعض دفعہ ایسے بڑے بڑے لوگوں کی عقل پر غالب آجاتا ہے جن کی عظمتوں کے سامنے تاریخ جھکی ہوئی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ اور عظمت سے کون ناواقف ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جیسے ہی انہیں یہ خبر ملی کہ آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو ان کیلئے اس خبر کو برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ سرتاپا جذبات میں ڈوب کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد کے صحن میں برہنہ تلوار لے کر بار بار یہ بات دھرانے لگے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ انتقال فرماگئے ہیں، میں اس کا سر اڑادوں گا۔ آپ تو اسی طرح اللہ کے پاس گئے ہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اللہ کا پیغام وصول کرنے کیلئے جاتے تھے۔ آپ واپس آئیں گے اور جو منافقین اس طرح کی افواہیں اڑا رہے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔ اسی اثناء میں حضرت صدیق اکبرؓ تشریف لے آئے انہوں نے بھی آپ کو بیٹھنے کیلئے کہا لیکن آپ ہوش میں نہ تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ منبر پر گئے اور لوگوں سے خطاب فرمایا: خطاب کا پہلا جملہ ہی یہ تھا:

من یعبد محمداً (ﷺ) فان محمداً (ﷺ) قد مات ومن یعبدالله فان الله حی لایموت

اور اس کے بعد آپ نے محولہ بالا آیتِ کریمہ پڑھی۔

جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ آپ وفات پاگئے ہیں اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۗ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ O

(اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو آخرت کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں آخرت میں سے دیں گے۔ اور ہم خوب جزا دیں گے شکر ادا کرنے والوں کو) (۱۴۵)

Marfat.com

بعض حقائق اعتراف کے باوجود استحضار سے محروم رہتے ہیں

بعض حقائق ایسے ہیں جو نوکِ زباں رہتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح احساس دل و دماغ میں نہیں ہوتا۔ انہی حقائق میں سے ایک بہت بڑی حقیقت ''موت'' ہے۔ ہر شخص اس کا معترف ہے کہ موت ہمیشہ وقت پر آتی ہے۔ نہ وہ مقررہ وقت سے پہلے آسکتی ہے اور نہ مقررہ وقت سے ٹل سکتی ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ موت کا یہ وقت آپ سے آپ مقرر نہیں ہو گیا بلکہ اللہ جلّ شانہٗ کا مقرر کردہ ہے اور اس کا یہ مقررہ کردہ وقت اپنی پوری تفصیلات سمیت وہاں لکھا ہوا ہے جہاں ایسی تفصیلات لکھی ہوئی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ایسی حقیقت جس کا اعتراف ہر ایک کو ہے یہ کیسی بات ہے کہ دل و دماغ اس کا استحضار نہیں رکھتے۔ اولاً تو یہ بات ہی ذہن میں تازہ نہیں رہتی کہ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ روزانہ جنازے اٹھتے ہیں اسی طرح جنازہ میرا بھی اٹھے گا۔ لیکن ہر جنازہ اٹھاتے ہوئے ہر شخص کا رویہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اسی شخص کو مرنا تھا جس کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے میری باری کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور غلط فہمی جس کا تدارک شاید اس سے بھی مشکل ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی زندگی میں ایسے مقصد کی طرف بلایا جاتا ہے جس کی ادائیگی میں خطرات سے واسطہ پڑنے کا اندیشہ ہو اور بات موت تک بھی پہنچ سکتی ہو تو پھر باوجود ہمارے اس اعتراف کے کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آسکتی۔ ہم ہمیشہ موت سے ڈر کر مقصدِ زندگی سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، زبان سے چاہے کہیں یا نہ کہیں لیکن ہمارا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے کہ میں ایسے خطرناک مرحلے میں جانے کی کبھی حماقت نہیں کر سکتا جس میں جان کے چلے جانے کا اندیشہ ہو وہ مقصدِ زندگی چاہے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو ہم اپنی جان کا سودا کرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ اسلام اس کمزوری کو ایک مومن کیلئے سمِ قاتل سمجھتا ہے اور ایسے شخص کے ایمان کو نامکمل قرار دیتا ہے جو اللہ کی تقدیر پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی طرح مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جن چیزوں کو انتہائی نقصان دہ قرار دیتا ہے، ہم گزشتہ آیتوں میں پڑھ چکے ہیں، وہ وہن ہے، ضعف ہے اور استکانت ہے۔ جب بھی کبھی مسلمانوں میں یہ امراض پیدا ہوئے ہیں تو ان کی اجتماعی زندگی خطرات کا شکار ہو گئی ہے اور کافروں نے ہمیشہ ان کو ادھیڑ کھدیڑ کر رکھ دیا ہے اور ''وہن'' کے بارے میں ہم آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ وہ حُبُّ الدنیا و کراھة الموت کا نام ہے۔ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ تم موت کو ایک حقیقت جانو اور ہر وقت اس کے آنے کی امید رکھو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم غفلت سے بچے رہو گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین رکھو کہ موت اللہ کے ''اِذن'' سے آتی ہے۔ اس لئے اس کے آنے کے ڈر سے ذمہ داریوں کی ادائیگیوں سے گریز نہ کرو یعنی وہ کام جنہیں کرنے کیلئے لمبا وقت چاہئے ان سے اس لئے ہاتھ اٹھا لیا جائے کہ پتہ نہیں موت کب آجاتی ہے۔ حالی مرحوم نے بڑے پتے کی بات کہی

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاوِدانی سمجھو

Marfat.com

ایک اور کوتاہی

کمزور مسلمانوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں میں سے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ وہ دنیاوی کامرانیوں اور مفادات کے حصول کو تمام تر اپنی سعی اور تدبیر ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اگر ہم نے دینی ضروریات اور اخروی مصروفیات پر زیادہ وقت دینا شروع کر دیا تو ہماری دنیا کو نقصان پہنچے گا اور ہم دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے حالانکہ انہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ دنیا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آخرت کا اجر وثواب بھی اللہ ہی دے گا۔ اگر دنیا ہر ایک کو بقدر محنت ملتی تو دنیا میں کوئی محنت کرنے والا غریب نہ ہوتا اور آخرت کی فکر کرنے والا کبھی دولت مند نہ ہوتا حالانکہ دونوں طرح کے لوگ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہاں صاف صاف فرمایا گیا کہ دنیا کیلئے مرنے والوں کو بھی ہم اتنا ہی حصہ دیتے ہیں جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ لیکن وہ آخرت کی پرواہ نہ کرنے کی وجہ سے آخرت کے اجر سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جو آخرت کے طلب گار ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے انعامات سے بھی نوازتا ہے اور دنیا میں بھی وہ اپنے حصے سے کبھی محروم نہیں رہتے۔ اس لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ آدمی آخرت کیلئے اتنی محنت کرے جتنی آخرت کیلئے ضروری ہے اور دنیا کیلئے اتنی جان مارے جتنی دنیا بسانے کیلئے ضروری ہے۔ ان دونوں میں توازن قائم رکھنا یہ قرآنِ کریم کی عطا کردہ بصیرت ہے جس کی فکر کرنی چاہئے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اللہ کا قانون ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کے دل سے قدر دان ہوتے ہیں اور اس کی ہر نعمت کا بجا طور پر شکر ادا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ شکر ادا کرنے والوں کو بھرپور صلہ عطا فرماتا ہے۔ اللہ ان کی دنیا میں بھی برکت دیتا ہے اور آخرت میں تو ایسا سرخرو فرمائے گا کہ دنیا دیکھ کر رشک کرے گی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، تو نہ تو وہ پست ہمت ہوئے اس مصیبت کی وجہ سے جو اللہ کے راستے میں انہیں پہنچی اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ اللہ پسند کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں کو ۝ ان کی دعا تو ہمیشہ یہی رہی کہ اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہوں کو، ہماری بے اعتدالیوں کو اور ہمارے قدموں کو جمائے رکھ اور ہمارے گناہ بخش دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ۝ پس اللہ نے انہیں عطا فرمایا دنیا کا صلہ بھی اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) (۱۴۶ تا ۱۴۸)

Marfat.com

بعض اوہام کی اصلاح

پیشِ نظر تین آیاتِ کریمہ میں ایک اور انداز میں ان کمزور مسلمانوں کو سمجھایا جارہا ہے جو منافقین کی لگائی بجھائی اوران کی وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہورہے تھے۔ وہ بار باران کے ذہنوں میں یہ بات ڈال رہے تھے۔ کہ اللہ کے نبی تو دنیا میں نصرتِ الٰہی کی علامت ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آہی نہیں سکتا۔ وہ جدھر بھی رخ کرتے ہیں اللہ کی تائید ونصرت اور فتح ان کے ہمرکاب ہوتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم میں اللہ کے نبی موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ایک بہت بڑے خونی حادثے سے دوچار ہوئے۔ اس طرح کی وسوسہ اندازیوں کا جواب تاریخ کے آئینے میں دیا جارہا ہے کہ نبی کریم ﷺ دنیا میں آنے والے پہلے رسول نہیں اور نہ یہ پیش آنے والی جنگ حق وباطل کا پہلا معرکہ ہے۔ جب تک اولادِ آدم نے غلط راستہ اختیار نہیں کیا تھا تو دنیا میں کوئی کشمکش نہ تھی۔ لیکن جب شیطانی قوتوں نے پر پرزے نکالے اور انسانوں میں سے کچھ لوگوں نے شیطان کی پیروی شروع کی تو حق وباطل کی کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کشمکش میں نشیب وفراز آتے رہے جب بھی اہلِ باطل اہلِ حق کیلئے مسائل پیدا کرتے رہے اور حق کا زندہ رہنا مشکل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حق کی سربلندی کیلئے نبی اور رسول بھیجے جن کے آنے سے یہ کشمکش تیز ہوگئی۔ پھر جیسے جیسے کفر کی بعض قوتیں سرنگوں ہوتی گئیں انسانوں کو خوف وحزن سے پاک زندگی میسر آتی گئی۔ لیکن جب پھر باطل نے زور پکڑا تو پھر وہی کشمکش جاگ اٹھی تو کہنا صرف یہ ہے کہ مسلمان جس کشمکش میں مبتلا ہوئے ہیں اور لڑائیوں کا جو سلسلہ چل پڑا ہے یہ حق وباطل کا پہلا معرکہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اور دوسری بات یہ کہ رِبِّیُّوْنَ نے ہمیشہ حق وباطل کی کشمکش میں اپنے نبیوں کا ساتھ دیا رِبِّیُّوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو وقت کے نبی اور رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کو اپنا رب سمجھتے ہیں۔ انہیں رَبَّانِیُّ بھی کہا جاتا ہے اور رِبِّیُّ بھی۔ رِبِّیُّ معلوم ہوتا ہے عبرانی لفظ ہے، جو عربی میں آکر رَبَّانِیُّ ہوگیا۔ اللہ پر ایمان لانے والوں نے ہمیشہ اس کشمکش میں اللہ کے نبی کا ساتھ دیا ہے۔ اس کشمکش میں جیسے بھی حالات پیش آئے انہوں نے ہمیشہ اس کا سامنا کیا۔ مصیبتوں سے واسطہ پڑا تو مصیبتیں برداشت کیں، ہزیمتوں سے سابقہ پیش آیا تو کبھی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرانا پڑا تو کبھی تھڑدلے پن یا بے صبری کو قریب نہیں آنے دیا۔ ہمیشہ اللہ کے راستے میں استقامت دکھائی۔ بالآخر ایمان کی یہ قوت اور صبر واستقامت کی بے پناہی اللہ کے حضور کام آئی اور اللہ نے انہیں اپنی پسندیدگی سے نوازا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہو یا حضرت داؤد علیہ السلام کا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا دور ہو یا حضرت سموئیل علیہ السلام کا۔ ہر دور میں حق وباطل کے معرکے اور سرفروشوں کی سرفروشی کا ایک ہی رنگ رہا۔ جس طرح کفر نے کبھی اپنے طور اطوار نہیں بدلے اسی طرح مسلمانوں نے بھی کبھی صبر واستقامت سے منہ نہیں پھیرا اور کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی، جیسے جنگِ احد میں پہنچنے والے نقصان کی شکایت مسلمانوں میں کمزور لوگ کر رہے تھے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے

Marfat.com

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

ہر دور کا مسلمان ہمیشہ آزمایا گیا ہے۔ بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گزارا گیا ہے۔ لیکن مجال کیا ہے جو اس نے موت سے ڈرنا سیکھا ہو۔ بزدلی کا راستہ اختیار کیا ہو، قربانی وایثار سے جی چرایا ہو۔ یا نازک سے نازک وقت میں بھی حریف کے آگے گھٹنے ٹیکے ہوں۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں لٹایا، کھپایا اور اس طرح اللہ سے پسندیدگی کا سرٹیفکیٹ لینے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی اور بڑے سے بڑا معرکہ سر کرنے کے بعد بھی ان کے اندر کبھی اپنے استحقاق کے فتنے نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ جیسے جیسے معرکہ آرائی میں سرخرو ہوتے گئے ویسے ویسے عجز و نیاز مندی اور فروتنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بڑے سے بڑا معرکہ سر کرنے کے بعد بھی ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ شاید ہم سے اس راستے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی بارگاہ اتنی عظیم ہے کہ بڑے سے بڑا عمل بھی وہاں پزیرائی کے قابل نہیں ہوتا۔ وہاں تو سب کچھ کرنے کے بعد بھی ایک ہی عمل پسند آتا ہے جسے ''عاجزی اور نیازمندی'' کہا جاتا ہے۔ وہ عاجزی میں ڈوب کر چار طرح کی دعائیں کرتے ہیں

۱۔ یا اللہ! ہم نے جو کچھ کیا اگرچہ اپنی ہمت سے بڑھ کر کیا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں کوئی گناہ یا کوتاہی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہم عرض گزار ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے۔

۲۔ اس جنگ سے پہلے بھی زندگی کا ایک حصہ گزرا ہے اس میں بھی یقیناً غلطیاں ہوئی ہوں گی یا اللہ! انہیں بھی معاف فرمادے۔

۳۔ زندگی کا بڑے سے بڑا عمل بھی کوئی معنی نہیں رکھتا اگر اس کے ساتھ ثباتِ قدم اور استقامت شامل نہ ہو۔ اس لئے یہ دعا ہے کہ ہمیں ثابت قدمی کی دولت عطا فرما۔

۴۔ ہم اپنی ساری کوششوں کے باوجود کمزور اور ناتواں ہیں الٰہی تو ہمیں دشمنوں پر غالب کردے۔

ان ساری دعاؤں میں جو چیز روح کی طرح کارفرما دکھائی دیتی ہے وہ یہ احساس ہے کہ حق و باطل کے معرکے میں یا عام معمول کی زندگی میں اگر کوئی نیکی اور عملِ صالح کی توفیق ملی ہے تو یا اللہ! وہ سراسر تیری عطا ہے۔ دل و دماغ میں نیکی کا ارادہ بھی صرف تو ہی پیدا کرتا ہے۔ پھر اس ارادے کو عمل کی شکل دینا بھی تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور پھر ایسے تمام اعمال کو دکھاوے اور تعلّی سے محفوظ رکھنا بھی سراسر تیرے ہاتھ میں ہے۔ اکبر نے ہماری ترجمانی کرتے ہوئے کہا

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا، تیرے کرم سے ہو گا

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ
مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ
مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ
اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ
تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ
مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ
صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ
فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي
اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ
لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً
نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ
اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ
هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ

Marfat.com

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ
لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ
وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٥٤﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ
وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٥٥﴾

رکوع: ١٦۔ اے ایمان والو! اگر تم بات مانو گے کافروں کی تو وہ تم کو پھیر دیں گے الٹے پاؤں اور تم نامراد ہو کر رہ جاؤ گے ○ بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے ○ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے ○ اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ کر دکھایا جبکہ تم ان کو تہِ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے، یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑ گئے اور تم نے حکم میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ اس نے دکھا دی تمہیں وہ چیز جس کو تم پسند کرتے تھے، تم میں سے کچھ وہ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں اور تم میں کچھ وہ ہیں جو آخرت کے طالب ہیں۔ پھر اللہ نے تم کو ان سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اللہ نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے ○ یاد کرو! جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسولِ (کریم ﷺ) تمہیں تمہارے پیچھے سے پکار رہے تھے پس اللہ نے تمہیں غم پر غم پہنچایا تا کہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ○ پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی "نیند"۔ جو چھا رہی تھی تم میں سے ایک گروہ پر اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی، وہ بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت، زمانہ جاہلیت کی قسم کی بدگمانی۔ وہ کہتے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل۔ کہہ دیجئے! اختیار تو سارا اللہ کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں (اپنے دلوں میں) اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ

Marfat.com

مارے جاتے۔ کہہ دیجئے! اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو ضرور نکل آتے وہاں سے وہ لوگ جن کا قتل ہونا لکھا جاچکا تھا اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ یہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ آزمائے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اور صاف کردے جو میل کچیل تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا O بیشک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم میں سے دو گروہوں کی مڈھ بھیڑ کے دن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کو شیطان نے ان کے کسی عمل کے سبب سے پھسلا دیا تھا۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (۱۴۹ تا ۱۵۵)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ O بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ O سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ O

(اے ایمان والو! اگر تم بات مانو گے کافروں کی تو وہ تم کو پھیر دیں گے الٹے پاؤں اور تم نامراد ہو کر رہ جاؤ گے O بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے O ہم ان کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے) (۱۴۹ تا ۱۵۱)

منافقین کا پروپیگنڈا اور اس کا ازالہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ احد کے بعد جو صورتحال پیش آئی اس سے منافقین اور غیر مسلم قوتوں نے پوری طرح فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح سے اسلام اور مسلمانوں کو جزیرۂ عرب میں قابلِ ذکر طاقت سمجھا جانے لگا تھا۔ غیر مسلم قبائل کا بغض اور کینہ اپنی جگہ پر تھا لیکن اب وہ اس کے اظہار میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔ جنگِ احد کے حادثے نے اس پوری صورتحال اور تاثر کو الٹ کر رکھ دیا اور منافقین نے اس تاثر سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جیسے ہی نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر اڑی تو منافقین جو مسلمانوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے انہوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اب ہمارے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی۔ اس سے پہلے کہ قریش کا لشکر مدینے میں جا گھسے اور ہماری عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے ہمیں عبداللہ بن ابی سے کہہ کر ان سے کوئی معاملہ طے کرلینا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے پوری طرح اسلام کی صف لپیٹ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی اور آپ کی خیریت سے اگرچہ مسلمانوں کو حوصلہ ملا لیکن منافقین اور دشمن برابر گھات میں تھے اور وہ ہر وقت کمزور مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے پہلی آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ منافقین اور دشمنانِ دین جو کچھ چاہتے ہیں مسلمانو اگر تم نے ان کی باتوں پر کان دھرنے شروع کردیئے تو وہ تمہیں آخر کار کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ ذرا اندازہ کرو! تمہیں اللہ نے جہنم سے نکالا ہے کیا تم پھر اسی جہنم میں واپس چلے جانا چاہتے ہو۔

Marfat.com

شرک کی کوئی بنیاد نہیں

مسلمان جس صورتحال سے دوچار ہو گئے تھے اور ان کے مصائب سے منافقین جس طرح فائدہ اٹھانے کے درپے تھے، پروردگار نے مسلمانوں پر رحم فرمایا اور مسلمانوں کو سنبھالا دیا۔ ایک طرف تو ان پر یہ بات واضح کی کہ اگر تم نے منافقین کی باتوں پر توجہ دی تو ان کے ارادے نہائیت بھیانک ہیں اس لئے تمہیں اس سے باخبر رہنا چاہئے۔ اور دوسری یہ بات فرمائی کہ رہی یہ بات کہ مرعوب دشمن نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے اور سانپ پھر اپنے بل سے نکل آیا ہے اور مخالف قوتیں پھر پرپرزے نکالنے لگی ہیں۔ تو تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے۔ تم بظاہر جس طرح ان کو بپھرا ہوا دیکھ رہے ہو حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو حالات نے زخمی ضرور کیا ہے لیکن زخمی شیر جب انگڑائی لے کر اٹھتا ہے تو پہلے سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور اگر تم ان کی ہیئت ترکیبی پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ بزدلی، کمزوری اور انتشار کے اسباب خود ان کے اندر مضمر ہیں۔ ان کا تعلق کسی ایک آستانے سے نہیں بلکہ مختلف آستانوں سے ان کی عقیدتیں وابستہ ہیں۔ شرک نے ان کی اجتماعی قوت کو اتفاق واتحاد کی بجائے انتشار کی نذر کر دیا ہے۔ وہ کسی بھی مشکل گھڑی میں کسی ایک قوت سے استمداد کرنے کی بجائے مختلف قوتوں سے مختلف گروہوں میں بٹ کر مدد طلب کرتے ہیں۔ جس سے قدرتاً ان کے اندر ایک ضعف کا احساس اٹھتا ہے۔ ایسے بکھرے ہوئے لوگ ایک ایسی متحدہ قوت سے کبھی نہیں ٹکرا سکتے جن کا سر صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ جو اللہ سے مدد مانگتے اور اللہ کے سہارے پر سب کچھ کر گزرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ جن کے عقیدے کی بنیاد دلائل وبراہین پر کھڑی ہے جو ایک زندہ خدا پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ اس کی محبت وعقیدت میں کٹ مرنے میں ہمیشہ کی زندگی سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلے میں وہ لوگ کبھی کھڑے نہیں ہو سکتے جن کے عقیدے کی قوت سے لے کر عمل کی ساکھ تک ہر چیز شرک کی ریت پر کھڑی ہے۔ وہ اپنے کسی عمل کی کوئی دلیل نہیں رکھتے، چند رسم ورواج ہیں یا اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے انہیں ایک قوم کی شکل دے رکھی ہے۔ ورنہ حقیقت میں ان کی قوت کی کوئی بنیاد نہیں ایسے لوگوں کا انجام دنیا میں تباہی اور آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ کیا جانیں کہ جہنم ایسے ظالموں کیلئے کس قدر برا ٹھکانا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○

اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ کر دکھایا جبکہ تم ان کو تہِ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے، یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑ گئے اور تم نے حکم میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ اس نے دکھادی تمہیں وہ چیز جس کو تم پسند کرتے تھے، تم میں سے کچھ وہ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں اور تم میں کچھ وہ ہیں جو آخرت کے طالب ہیں۔ پھر اللہ نے تم کو ان سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اللہ نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے) (۱۵۲)

Marfat.com

مسلمانوں کی شکست فتح کے بعد اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ایک پروپیگنڈے کا بطورِ خاص جواب دیا ہے۔ وہ بڑا زور دے کر یہ بات کہہ رہے تھے کہ تم یہ کہتے تھے کہ جنگِ بدر تم نے اس لئے جیتی کہ وہاں اللہ نے تمہارے ایمان کی وجہ سے تمہاری مدد فرمائی فرشتے تمہاری مدد کیلئے نازل ہوئے اور اس طرح کافروں کو اپنی ساری طاقت کے باوجود ناکام اور نامراد ہونا پڑا۔ لیکن جنگِ احد میں وہ مدد کہاں چلی گئی؟ نہ فرشتے اترے، نہ اللہ کی مدد آئی بلکہ تمہیں اتنی بڑی شکست سے دوچار ہونا پڑا جس میں تمہارے ستر سربرآوردہ آدمی شہید ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وعدے اور فرشتوں کا نازل ہونا یہ محض سخن سازیاں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ پروردگار نے اس پراپیگنڈے کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدے کا تعلق ہے کہ وہ مسلمانوں کو کافروں پر ہمیشہ فتح عطا فرماتا ہے اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ مشروط ہے غیر مشروط نہیں۔ مسلمانوں نے شروع میں ایمان کی تمام شرائط کے ساتھ قریش کے لشکر کا مقابلہ کیا تو اللہ نے ان کو فتح عطا فرمائی۔ حضرتِ حمزہ، حضرتِ علی اور حضرتِ ابودجانہ رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے بہادروں نے صفیں الٹ ڈالیں۔ مسلمانوں نے کافروں کو تیغوں پر دھر لیا، چند ہی لمحوں میں وہ لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ تحسونھم، حس یحس سے ہے۔ اس کا معنی صرف قتل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دشمن کا مکمل استیصال کرنا ہوتا ہے۔ شروع میں مسلمانوں نے اس طرح دشمن کو تہِ تیغ کیا ہے کہ اگر دشمن بھاگ نہ جاتا تو اس میں سے شاید کوئی بچ کر نہ جاتا لیکن جب مسلمانوں نے خود ان شرائط کو پامال کرنا شروع کر دیا جن شرائط پر عمل کیے بغیر اللہ کی طرف سے تائید و نصرت نہیں اترتی۔

سب سے پہلی کوتاہی مسلمانوں نے یہ کی کہ انہوں نے فشل کا ارتکاب کیا یعنی وہ ڈھیلے پڑ گئے۔ جنگِ بدر میں اس بات پر عتاب نازل ہوا تھا کہ دشمن کو اچھی طرح تہِ تیغ کرنے سے پہلے مسلمان مالِ غنیمت کی طرف متوجہ کیوں ہوئے کیونکہ مقصود اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے راستوں کا صاف کرنا ہے دنیا کا مال اکٹھا کرنا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کوتاہی کو معاف کر دیا لیکن اب پھر اس کو دھرایا گیا کہ دشمن جیسے ہی شکست کھا کر بھاگا تو بجائے دشمن کا تعاقب کرنے اور اس کا استیصال کرنے کے مالِ غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ دشمن کو بھاگتے ہوئے دوبارہ پھر اکٹھے ہونے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ فاتح لشکر بجائے ہمارا تعاقب کرنے کے دل پسند مصروفیت میں کھو گیا ہے تو انہیں پلٹنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔

دوسری سنگین کوتاہی مسلمانوں سے یہ ہوئی کہ پشت کے درے پر جن لوگوں کو حفاظت کیلئے مامور کیا گیا تھا انہیں تاکید کی گئی تھی کہ جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہو تمہیں کسی قیمت پر اس جگہ سے نہیں ہلنا۔ لیکن انہوں نے جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت لوٹتے ہوئے دیکھا تو آپس میں اختلاف کا شکار ہو گئے ان کے امیر نے ہر چند انہیں سمجھایا کہ ہمیں یہاں سے ہلنا نہیں چاہیے لیکن اکثریت نے ان سے اختلاف کیا کہ فتح ہو چکی ہے اب یہاں رکنے کا کیا فائدہ، وہ دوسرے لوگوں کیساتھ جا ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خالد بن ولید نے درے کو خالی پا کر گھوڑ سوار دستے کے ساتھ حملہ کر دیا اور ادھر مفرور لشکر بھی واپس آ گیا اب مسلمانوں نے پلٹ کر دیکھا تو ہر طرف تلواریں برس رہی تھیں اور کندھوں سے سر اتر رہے تھے۔

اس طرح سے تم لوگوں نے اللہ کے رسول کی نافرمانی کی کہ کچھ لوگ دنیا کے طلب گار ہو گئے اور کچھ آخرت کے، اسلام کی صفوں میں ایسے لوگوں کا موجود ہونا جو دنیا کی خاطر رسول کے حکم کو نظر انداز کر دیں اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ تمہیں امتحان میں ڈالے پھر اس امتحان میں مسلمانوں پر جو گزری وہ تاریخ کا حصہ ہے۔لیکن اللہ نے پھر ان سے درگزر فرمایا کہ باوجود اس کے کہ مسلمان بری طرح بکھر گئے تھے مسلمانوں کی مکمل شکست میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔قریش کیلئے بہترین موقعہ تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی فتح کی تکمیل کرتے مسلمانوں کو گرفتار کرتے اور مدینہ پر چڑھ دوڑتے۔لیکن اللہ کی رحمت پھر جوش میں آئی اس نے مسلمانوں سے درگزر کیا کیونکہ ہمارا پروردگار مومنوں پر بڑا فضل و کرم والا ہے۔اس نے قریش کی فوج کو اس کی ہمت عطا نہیں فرمائی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی فتح کو مکمل کر لیتے بلکہ انہوں نے ڈاکوؤں کے لشکر کی طرح جو حاصل ہوا اسی کو غنیمت سمجھا اور مسلمان ابھی تک وہیں تھے اور فاتح لشکر وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(یاد کرو! جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول (کریم ﷺ) تمہیں تمہارے پیچھے سے پکار رہے تھے پس اللہ نے تمہیں غم پر غم پہنچایا تا کہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو) (۱۵۳)

زمین میں دور تک دوڑے چلے جانے یا کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کو ''اصعاد'' کہتے ہیں۔ابو حاتم نے کہا ہے کہ بلندی پر چڑھنے کو ''صعود'' اور ہموار زمین اور وادیوں میں چلنے کو ''اصعاد'' کہتے ہیں۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ منہ اٹھائے بدحواسی میں دوڑے چلے جانا اور شدتِ غم سے کسی طرف دھیان نہ دینا اور بلندی پر بھی چڑھنا اور ہموار زمین میں بھی سرپٹ دوڑے چلے جانا ان تمام کیفیتوں کو ''اصعاد'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اصحابِ سیر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا پہلا حملہ اتنا زوردار تھا کہ قریشِ مکہ اپنی ساری بہادری اور منہ زوری کے باوجود میدان میں جم کر لڑ نہ سکے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بے تحاشہ بھاگ نکلے۔دشمن کی اس پسپائی نے مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ دشمن مکمل طور پر شکست کھا چکا ہے اور اب اس کے پلٹ کر حملہ آور ہونے کا کوئی امکان نہیں۔چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر صحابہ نے ہتھیار کھول دیئے اور بجائے دشمن کا تعاقب کرنے کے اطمینان سے مالِ غنیمت سمیٹنے لگے۔ جبل الرماۃ پر جن تیراندازوں کو متعین کیا گیا تھا انہوں نے اپنی فوج کے طرزِ عمل سے یہ سمجھا کہ اب لڑائی ختم ہو گئی ہے چنانچہ وہ اپنے امیر کے روکنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے والوں میں شامل ہو گئے۔خالد بن ولید کی عقابی نگاہوں نے جیسے ہی درے کو خالی دیکھا تو پہاڑ کا چکر کاٹ کر پیچھے سے حملہ آور ہوا۔درے کی حفاظت پر جو چند لوگ ابھی باقی تھے ان کو روندتا ہوا آگے بڑھا اور وہ نہتے مسلمان جو ہتھیار کھول چکے تھے اور اب سامان اکٹھا کرنے میں مصروف تھے ان پر عقاب کی طرح جھپٹا اور کوئی بعید نہیں کہ چند سواروں کو بھاگتی ہوئی فوج کے پاس پیغام دے کر بھیجا ہو کہ میدان صاف ہے تم واپس پلٹ آؤ۔چنانچہ ایک طرف دشمن کے گھڑ سوار دستے نے مسلمانوں کو تلواروں پر رکھ لیا اور دوسری طرف ان کی پیادہ فوج واپس پلٹ آئی اور انہوں نے بھی حملہ کر دیا،اب مسلمان دفاعی قوت کی بجائے دونوں طرف سے دشمن فوج میں گھر گئے۔اس قدر افراتفری مچی کہ مسلمانوں کی تلواریں

Marfat.com

مسلمانوں پر برسنے لگیں۔ جن مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کیلئے کوئی تلوار یا کوئی اور ہتھیار نہ مل سکا ان میں کچھ لوگ تو وہ تھے جنہوں نے نہتے ہونے کے باوجود دشمنوں کا مقابلہ کیا اور دشمنوں سے ہتھیار چھین کر انہیں روکنے کی کوشش کی یا اپنے نہتے جسموں کو دوسرے مسلمانوں کیلئے ڈھال بنا دیا لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جو انسانی فطرت کے خلاف صرف قتل ہونے کیلئے میدان میں ٹھہر نہیں سکتے تھے ان میں سے کچھ پہاڑ کی طرف بھاگے اور پہاڑ پر چڑھ گئے اور کچھ میدانی علاقے میں بھاگتے ہوئے مدینہ منورہ میں جا کر رکے۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ صورتحال دیکھی تو آپ نے لوگوں کو اپنی طرف پکارنا شروع کیا۔ آپ بجائے اپنی جگہ چھوڑنے کے پہاڑ کی طرح ایک جگہ جم گئے۔ روایت کے مطابق آپ کے ساتھ کل بارہ آدمی باقی رہ گئے تھے باقی یا تو شہید ہو گئے اور یا بکھر گئے اور یا بھاگتے ہوئے میدانِ جنگ چھوڑ گئے۔ آپ نے نہایت پامردی، استقلال اور شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک جگہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ بار بار آپ پکارتے رہے: الیّ عباد اللہ الیّ عباد اللہ ''اللہ کے بندو میری طرف آؤ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ'' لیکن اس ہنگامہ آہ و بکا اور ہنگامۂ رستاخیز میں کون کسی کی سنتا ہے۔ چنانچہ اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا: ''ذرا اس وقت کو یاد کرو! جب تم بدحواس ہو کر ہر نشیب و فراز کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے اور اللہ کے عظیم رسول تمہیں پیچھے سے پکار رہے تھے لیکن تم کسی طرف دیکھنے کی بھی ہمت کھو چکے تھے''۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے جو نہایت بلند آواز تھے، نے مسلمانوں کو پوری قوت سے پکارا کہ مسلمانو! کدھر جا رہے ہو؟ نبی کریم ﷺ تو یہاں ہیں۔ تب مسلمان پلٹے لیکن اس وقت اتنی دیر ہو چکی تھی کہ مسلمانوں پر ایک طرف تلواروں کی بارش ہو رہی تھی اور دوسری طرف غموں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پر غم پہنچایا اس جملے کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو ایک طرح کی سزا دی گئی لیکن اس سے مقصود سزا نہیں بلکہ تادیب تھا۔ دوسرا جملہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تادیب کی صورت کو واضح کر رہا ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بظاہر یہ سزا تھی لیکن حقیقت میں یہ ابتلاء تھا جو مسلمانوں کیلئے سراسر اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ جہاں تک سزا کا تعلق ہے اس کا سبب تو بالکل واضح ہے کہ جب مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کی آواز پہچاننے میں کوتاہی کی اور بجائے آپ کی فکر کرنے کے بدحواس ہو کر ادھر ادھر جا نکلے۔ تو یہ بہرحال ایک فروگزاشت تھی جس کا صدور ان لوگوں سے تو نہیں ہونا چاہیے تھا جو اسلام کا ہراول دستہ تھا اور جن کی حیثیت زمین کے نمک کی تھی اور جن کی کمزوریاں کل کو تاریخ کی کمزوریاں بننے والی تھیں اور جن کے کندھوں پر دنیا کی اصلاح کا دارومدار تھا۔ لیکن ان کی اس بدحواسی کے پیچھے بھی ایک عذر کارفرما تھا اور وہ عذر یہ تھا کہ یہ افواہ پھیلا دی گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ صحابہ کیلئے ہر چیز قابلِ برداشت تھی لیکن اس خبر کا برداشت کرنا صحابہ کیلئے ناممکن تھا۔ وہ شمع جس سے انہیں روشنی ملی، وہ آفتاب جس کی تمازت سے ان کا کاروبارِ زندگی رواں دواں ہوا، وہ جانِ جہاں جس کی حرارت ہر دل کیلئے حرکت کا باعث تھی اس کے اٹھ جانے کی خبر ایسی نہ تھی جسے برداشت کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی خبر نے بڑے بڑے لوگوں کے حوصلے توڑ ڈالے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو مسلمان فوج کے علمبردار تھے ابن قمیہ نے جب انہیں شہید کیا تو وہ چونکہ آنحضرت ﷺ سے شکل و صورت میں کسی حد تک مشابہت رکھتے تھے تو یہ بات مشہور ہو گئی یا کر دی گئی کہ آنحضرت ﷺ کو شہید کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ جیسے بطلِ جلیل بھی اس افواہ کی زد میں آئے اور تلوار پھینک کر بیٹھ گئے کہ اب کس کیلئے لڑنا ہے؟ حضرت انس ابن نضر ؓ نے دیکھا کہ آپ تلوار رکھے بیٹھے ہیں تو پوچھا عمر یہ کیا ماجرا ہے؟ بولے جب وہ نہ رہے جن کیلئے ہم لڑتے تھے اب لڑ کر کیا کریں گے؟ انہوں نے برجستہ کہا تو ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ انہوں نے جس مقصد کیلئے جان دی ہے ہمیں بھی اسی مقصد کیلئے جان دینی چاہیے۔ اس سے اندازہ ہوتا

Marfat.com

کہ اس خبر نے مسلمانوں پر واقعی غیر معمولی اثر ڈالا۔ چنانچہ وہ غم جو پہلے ہی ان کیلئے جان لیوا تھے اس غم نے ان کی شدت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم زخموں سے چور ہیں، ان کے عزیزوں کے لاشے خاک وخوں میں تڑپ رہے ہیں۔ ان کی فتح شکست کے خون میں نہلائی جا رہی ہے کہ عین اس وقت آنحضرت ﷺ کے دنیا سے اٹھ جانے کی خبر ملتی ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خبر نے کیا قیامت برپا کی ہوگی۔ یہ صورتحال بظاہر ایک سزا معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت مسلمانوں کیلئے ایک ابتلا تھی اور اسی ابتلاء کا اشارہ گزشتہ آیت کریمہ میں بھی دیا گیا ہے۔ ابتلاء سے ہمیشہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ جن کمزوریوں کی وجہ سے یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے۔ آئندہ یہ کمزوریاں باقی نہ رہیں اور نہ دوبارہ پیدا ہو سکیں۔ اس لئے فرمایا: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ہم نے تمہیں اس ابتلا میں اس لئے مبتلا کیا ہے کہ تم نے جو یہ کمزوری دکھائی ہے کہ جیسے ہی تم پر مصائب کی بارش برسی اور غموں کا ہجوم ہوا تو تم بدحواس ہو گئے، تم پر ہراس طاری ہو گیا اور تم نے ہراساں ہو کر وہ کمزوریاں دکھائیں جو تمہارے شایانِ شایان نہ تھیں۔ تمہیں دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنا ہے۔ دنیائے کفر تمہارے خون کی پیاسی ہے۔ تمہیں انہی دشمنوں میں رہ کر ان کی اصلاح کا کام کرنا ہے۔ جہاد وقتال سے تمہارا واسطہ ایک دن کا نہیں بلکہ زندگی بھر کا ہے۔ تمہیں ابھی اندازہ نہیں کہ دشمنوں کی کتنی بڑی تعداد تمہاری گھات میں ہے۔ اگر تم نے ہراساں ہو کر کمزوریوں کا شکار ہونا نہ چھوڑا اور تمہارے اندر پہاڑوں جیسی استقامت اور پانی کی روانی جیسی راستہ بنانے کی عزیمت پیدا نہ ہوئی اور تم نے چٹانوں کے دل میں شگاف ڈالنا نہ سیکھا اور تم نے وقت کی آندھیوں سے نبرد آزما ہونے کی مشق نہ کی تو آنے والے معرکہ ہائے حق وباطل میں اپنا فرض پوری طرح ادا نہ کر سکو گے۔ اس لئے تمہیں غموں کے اس ہجوم سے گزارا گیا ہے، تمہاری کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ آئندہ ہر طرح کی صورتحال کا تم وقار کے ساتھ سامنا کر سکو اور دوبارہ اسلام کو ایسی خطرناک صورتحال سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ حوادث اور آزمائشیں ہمیشہ قوموں کی باوقار زندگی کی ضامن بنتی ہیں۔ جو قومیں مصائب سے گزرنا نہیں جانتیں اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا نہیں جانتیں وہ کبھی مشکل حالات میں اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکتیں اور جو شخص یا جو قوم اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکے اسے خطرناک حالات میں صحیح فیصلے کرنے کی کبھی توفیق نہیں ملتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس آیت کریمہ میں پیش فرمائی جا رہی ہے۔ ممکن ہے تم اپنی کمزوریوں کا کوئی جواز بھی رکھتے ہو کیونکہ آدمی جب کبھی اپنے بارے میں سوچتا ہے تو ہمیشہ اپنے آپ کو الاؤنس دیتا ہے۔ لیکن تمہارے ذہنوں میں یہ بات ہمیشہ تازہ رہنی چاہئے کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ ہمیشہ اس سے باخبر رہتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ
اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ
الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ
يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ
وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

Marfat.com

(پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی ''نیند''۔ جو چھا رہی تھی تم میں سے ایک گروہ پر اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ وہ بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت، زمانہ جاہلیت کی قسم کی بدگمانی۔ وہ کہتے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل۔ کہہ دیجئے! اختیار تو سارا اللہ کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں (اپنے دلوں میں): اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجئے! اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو ضرور نکل آتے وہاں سے وہ لوگ جن کا قتل ہونا لکھا جا چکا تھا اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ یہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ آزمائے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اور صاف کردے جو میل کچیل تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا) (۱۵۴)

گزشتہ آیتِ کریمہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ مسلمان جو اتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہوئے وہ درحقیقت ان کی تربیت کے لئے ایک ضروری امر تھا اور آئندہ انقلابی عزائم کو بروئے کار لانے کیلئے یہ امتحان ضروری تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مسلمانوں کا رشتہ اپنے اللہ سے ٹوٹ چکا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو سنبھالا آنحضرت ﷺ کی حفاظت کیلئے مسلمان چاروں طرف سے امڈ امڈ کر آئے۔ بالآخر آپ کو لے کر ایک گھاٹی پر چڑھ گئے اور ایسی پامردی دکھائی کہ دشمن اپنی افرادی قوت اور مسلمانوں کی وقتی غفلت سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اپنی فتح کی تکمیل نہ کرسکا۔ بجائے قدم آگے بڑھانے کے اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ بچ کر واپس چلا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کا لشکر ابھی میدانِ احد میں تھا کہ غنیم کی پوری فوج احد کی وادی سے نکل چکی تھی۔ یہ خطرہ ضرور موجود تھا کہ مسلمانوں کو چونکہ بہت نقصان پہنچ چکا ہے ستر لاشے ابھی بے گور و کفن پڑے ہیں، ہر صحابی زخموں سے چور ہے، دشمن نے اگر ذرا بھی تدبر کا ثبوت دیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں پلٹ کر حملہ نہ کردے اس لئے مسلمان پوری طرح چوکنا اور کمربستہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اچانک مسلمانوں پر اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی۔ دلوں میں سکون کی شبنم برسی۔ غموں سے تپتے ہوئے سینے اللہ کی رحمت کی ٹھنڈک محسوس کرنے لگے۔ (ماہرینِ جنگ کہتے ہیں کہ فوج کے ایک ایک فرد کو جس طرح مناسب غذا ملنی چاہئے اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اسے آرام اور نیند کا موقعہ ملنا چاہئے جو بالعموم جنگوں میں نصیب نہیں ہوتا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے تو بھاگتے ہوئے بھی سپاہی کچھ نہ کچھ کھانے کا موقعہ تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن جنگ کی ہولناکیاں اور سفر کی رواروی اور دشمن کے حملہ کا خطرہ سونے کا کبھی موقعہ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اگر مسلسل فوج بے خوابی کا شکار رہے تو اعصاب کی شکست کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ نے مسلمانوں پر جو اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی اس کی اہم ترین بات یہ تھی کہ فوج کی ایک بڑی تعداد پر نیند طاری کردی۔ عین خطرات کے موقعہ پر نیند کا آنا اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ امن کی حالت میں آدمی اس کا اندازہ ہی نہیں کرسکتا۔ اسی لئے پروردگار نے جنگِ بدر میں جو مسلمانوں پر احسانات کیے ان میں سے بطورِ خاص اس احسان کا ذکر فرمایا کہ اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تم پر نیند غالب کردی کہ قریشِ مکہ کی ساری فوج رات بھر جاگتی رہی اور مسلمانوں کی فوج جنہیں پریشانی کے اسباب نے گھیر رکھا تھا وہ رات بھر کمر کھول کر سوئی۔ مسلمانوں کو جس فوج سے مقابلہ تھا اس کی تعداد تین گنا سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا ایک ایک سپاہی لوہے میں ڈھل کر نکلا تھا۔ ان کے پاس بڑی تعداد میں گھوڑے تھے۔ کمک اور رسد کے وسائل کی کوئی کمی نہ تھی اور مسلمانوں کے پاس نہ ہتھیار تھے، نہ گھوڑے۔ وسائل کی کمیابی خود اپنے منہ سے بول رہی تھی۔ ان میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جو نیند اچاٹ کردینے کیلئے کافی تھی۔ اس کے باوجود یہ سراسر اللہ کا کرم تھا کہ رات بھر وہ نیند کی آغوش کے مزے لوٹتے رہے اور دشمن پریشان کن بیداری میں

Marfat.com

دوچار رہا۔ یہی انعام اللہ تعالیٰ نے میدانِ احد میں بھی کیا۔ حضرت ابوطلحہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کرم کا حال یہ تھا کہ ہمارے خوف و ہراس کو دور کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہم پر غنودگی طاری کر دی، مضمحل اور منفعل لشکر پھر سے تازہ دم ہو گیا۔ ایک ایک سپاہی اونگھ رہا تھا۔ تلواریں ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ کر گرا چاہتی تھیں۔ لیکن اسی فوج میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جنھیں اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ منافقین کی تین سو کی تعداد تو راستے ہی میں مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ لیکن ایک مختصر سی جماعت معب بن قشیر اور اس کی پارٹی مسلمانوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی تاکہ جب بھی موقعہ ملے مسلمانوں کو نقصان پہنچائے۔ انہیں سوائے اپنی جانیں بچانے کے اور کوئی فکر نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیند کے لطف سے محروم رکھا۔ چنانچہ جب تک حالات نے پلٹا نہیں کھایا وہ برابر پریشانیوں میں گھلتے رہے۔ جب حالات ذرا پرسکون ہوئے تو ان کا چھپا ہوا نفاق اور اسلام دشمنی آہستہ آہستہ ان کی زبان سے ظاہر ہونے لگی اور وہ ایسی باتیں مسلمانوں سے کہنے لگے جس سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کیا جا سکتا تھا یا ان کے حوصلوں کو پست کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مسلمان اب چونکہ منافقین کی طرف سے کھٹک گئے تھے اس لئے ان کے بقیہ لوگ اپنے نفاق کے اظہار میں بڑے محتاط ہو گئے۔ وہ بات کہتے تھے لیکن الفاظ میں لپیٹ کر۔ وہ خود تو اپنے دلوں میں ابھی تک جاہلیت کے خیالات بسائے ہوئے تھے اور یہی وہ خیالات تھے جو درحقیقت ان کے نفاق کا سبب تھے۔ چنانچہ انہیں خیالات کو وہ الفاظ میں لپیٹ کر آہستہ آہستہ مسلمانوں میں پھیلانے کے درپے تھے۔ انہوں نے پہلی بات مسلمانوں سے یہ کہی: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے؟ یعنی جنگ کے معاملات پیش آتے ہیں، اس کے لئے تدبیریں طے کی جاتی ہیں۔ مناسب تیاریاں ہوتی ہیں باہمی مشورے ہوتے ہیں، دشمن سے عہدہ برآ ہونے کی منصوبہ سازی کی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں تو کسی معاملے میں اعتماد میں نہیں لیا جا رہا۔ ہمیں تو پوچھا ہی نہیں جاتا کہ ہم یہ کام کریں یا نہ کریں۔ لیکن جب کوئی ناگوار صورتحال پیدا ہوتی ہے تو اس کا خمیازہ ہمیں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کے جواب میں پروردگار نے فرمایا: اے پیغمبر ان سے کہو! مسلمانوں کے معاملات کے سارے اختیارات تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کا نبی ہمیشہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور مسلمان انہیں فیصلوں کے پابند ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ درحقیقت یہ منافق دبی دبی زبان میں جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ وہ بات نہیں جو وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ اصل میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے ہمارا مشورہ قبول کیا ہوتا کہ مدینہ ہی میں رہ کر مدینہ کا دفاع کیا جائے تو یہ جو آج ستر لاشے پڑے دکھائی دیتے ہیں یہ یہاں آ کر اس طرح قتل نہ ہوتے۔ یہاں ان کا قتل ہونا سراسر بے تدبیری کا نتیجہ ہے اور ہماری بات نہ ماننے کا خمیازہ ہے۔ یہ چونکہ سراسر ایک عقیدے کا معاملہ ہے اس لئے قرآن کریم نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے یہ عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی شخص کو کب مرنا ہے اور کس سرزمین میں اس کی موت آئے گی اس کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا اس سے کوئی واقف نہیں۔ جن کے بارے میں یہ طے ہو چکا کہ ان کی موت احد کے دامن میں آئے گی وہ گھر بھی بیٹھے ہوتے تو موت انہیں احد کے دامن میں خود لے آتی۔ کتنی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ سے لوگ خیریت سے گھر واپس آ جاتے ہیں اور گھر میں بیٹھنے والے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس نے زندگی بھر کبھی کسی جگہ کا نام بھی نہیں سنا، حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ حالات کا الٹ پھیر اسے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کی موت اس کے انتظار میں ہوتی ہے اور وہاں کی مٹی اس کا مدفن بننے والی ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسی وقت آئے گی جب اسے منظور ہو گا یہ اتنی بڑی قوت ہے جو انسان کو موت کے سامنے سپرانداز ہونے سے بچاتی ہے۔ وہ موت کو اللہ کا حکم سمجھتا ہے اور جانے والے کو اس کی امانت۔ اس لئے نہ اسے خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ اس کے اندر شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ایک نومسلم انگریز نے اپنے ایمان لانے کی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

Marfat.com

ایک بڑے میاں میرے پاس ملازم تھے ایک دن اس کی بیوی فوت ہوگئی۔ میں دوسرے دن افسوس کرنے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ بڑے ادب واحترام سے بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر کتاب بند کر کے میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا کہنے لگا: صاحب! افسوس کس بات کا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے زندگی کا بڑا حصہ اسے میرے ساتھ گزارنے کا موقعہ دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی محبت اور خدمت سے فائدہ اٹھایا۔ اب اس کی زندگی کا وقت ختم ہوگیا۔ اللہ نے اسے اتنی زندگی دی تھی تو وہ اسے لے گیا۔ مجھے اس کی موت کا دکھ تو ضرور ہے، شکایت نہیں کیونکہ موت اللہ کے حکم سے آتی ہے اور اس کے حکم پر شکایت نہیں کی جاتی، صبر کیا جاتا ہے۔ میں اس کا شکرگزار بھی ہوں کہ ہم اتنے سال اکٹھے رہے اور اب موت آئی ہے تو میں صبر کروں گا تا کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو۔ یہ نومسلم انگریز کہتا ہے کہ اتفاق یہ ہوا کہ چند مہینے کے بعد اس کا جوان بیٹا مر گیا۔ میں نے سوچا کہ اتنے بڑے صدمے کو برداشت کرنا اس بڑے میاں کے بس کی بات نہیں۔ میں افسوس کیلئے گیا تو دیکھا کہ پھر وہی کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں نے افسوس کیا تو کہنے لگا کہ صاحب میرا بیٹا اللہ کی امانت تھا۔ جب تک وہ میرے پاس رہا میں نے اس کی زندگی اور اس کی خدمت سے فائدہ اٹھایا اب اللہ کو منظور ہوا تو وہ اپنی امانت واپس لے گیا۔ مجھے اس پر کوئی شکایت نہیں مال والا اپنا مال واپس لے جائے تو شکایت کیسی۔ میں صبر کروں گا تا کہ میرے صبر کا صلہ مجھے ملے۔ وہ لکھتا ہے کہ اللہ کی شان چند مہینوں کے بعد اس کے مرنے والے بیٹے کا ایک ہی بچہ تھا جو وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اب یہ بوڑھا زندہ نہیں رہ سکتا یا تو اس کا دل فیل ہوجائے گا اور یا یہ خودکشی کر لے گا کیونکہ ہمارے یہاں کبھی کوئی شخص اتنے صدمے برداشت نہیں کرتا۔ کہا: میں اس کے پاس افسوس کرنے گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر مایوسی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ بڑے آرام سے بیٹھا وہی کتاب پڑھ رہا تھا جو ہمیشہ میں اسے پڑھتا دیکھتا تھا اور وہی باتیں کہہ رہا تھا جو اس سے پہلے کہتا تھا۔ میں نے اس سے حیرانی سے پوچھا کہ تمہیں یہ باتیں کس نے سکھائی ہیں اور تمہیں یہ حوصلہ کون دیتا ہے؟ یہ تو حیران کن قوت ہے جو تمہارے اندر کام کر رہی ہے۔ اس نے کہا: صاحب! یہ باتیں مجھے میری اس کتاب نے سکھائی ہیں جس کا نام ''قرآن مجید'' ہے۔ یہ کتاب ہمارے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اسی سے ہم عقیدہ لیتے ہیں اور یہی ہماری زندگی کی رہنما ہے۔ کہا: میں نے اس سے وہ کتاب لے لی اس کا ترجمہ منگوا کر پڑھا تو میری دنیا بدل گئی اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور موت کے بارے میں اسلام کا دیا ہوا یہ عقیدہ کہ وہ سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اللہ کے حکم سے پہلے نہیں آسکتی، اس کا ایک وقت اور ایک جگہ مقرر ہے، نہ وہ وقت سے پہلے آسکتی ہے اور نہ اس کی جگہ بدل سکتی ہے، مسلمانوں کی قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگِ احد جیسے حالات میں مبتلا فرما کر ان تمام خیالات باطلہ اور فاسد عقائد کی اصلاح فرما دی جو انسانی زندگی اور مسلمان کے ایمان کے فساد کا باعث بن سکتے ہیں تا کہ آئندہ کبھی مسلمان اس طرح کی کمزوری میں مبتلا نہ ہو۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۟

(بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم میں سے دو گروہوں کی مڈھ بھیڑ کے دن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کو شیطان نے ان کے کسی عمل کے سبب سے پھسلا دیا تھا، اللہ نے ان سے درگزر فرمایا ، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (۱۵۵)

جن لوگوں نے جنگِ احد میں میدانِ جنگ سے بھاگ کر کمزوری دکھائی۔ پچھلی آیتِ کریمہ میں بھی اللہ نے انہیں بخشنے کا اعلان فرمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں پہلی بات تو یہ فرمائی گئی کہ جو لوگ میدانِ جنگ سے پشت پھیر گئے اور حالات کی سنگینی نے انہیں وقتی طور پر وہاں سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا انہیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ ان سے یہ عمل شیطان کی وسوسہ اندازی سے وجود میں آیا تھا کیونکہ جیسی کچھ صورتحال پیدا ہوئی اس کی سنگینی میں شیطان کے وساوس کا بہت دخل تھا۔ لیکن ان مسلمانوں کو صرف اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ ہمیں چونکہ شیطان نے پھسلایا اور ہم پھسل گئے۔ اس میں اگرچہ قصور ہمارا بھی ہے لیکن زیادہ تر شیطان کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کو کبھی بھی کسی مسلمان کو بہکانے کا موقعہ نہیں ملتا تاوقتیکہ مسلمان خود اس کیلئے اپنے دل کا پٹ کھلا نہ رہنے دے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ نیکی مزید نیکی کے اسباب پیدا کرتی ہے اور برائی برائی کو جنم دیتی ہے۔ جو آدمی کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس کے بعد نیکی کرنا یا اللہ سے معافی مانگنا بھول جاتا ہے اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے شیطان کی دراندازی کیلئے دل کا ایک پٹ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ شیطان ہمیشہ اس کھلے دروازے سے آنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ کبھی اس میں تساہل نہیں کرتا۔ میدانِ جنگ سے ہٹنے والے صحابہ سے یقیناً اس سے پہلے کوئی ایسی غلطیاں ہوئی ہیں جس سے شیطان کو انہیں بہکانے کا موقعہ ملا ہے۔ آئندہ اس سے سبق سیکھنا چاہئے کہ کبھی غفلت میں بھی غلطی ہو جائے تو اس کا تدارک کرنا بہت ضروری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک بات کا اعلان بھی فرمایا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں صحابہ کا مقام و مرتبہ کتنا بلند ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ میدانِ جنگ سے بھاگے انہوں نے بہت بڑا قصور کیا اور مزید یہ کہ ان سے یہ غلطی شیطان کے پھسلانے سے ہوئی اور شیطان کا پھسلانا اس لئے ممکن ہو سکا کہ صحابہ اس سے پہلے بعض ایسی غلطیوں کا ارتکاب کر چکے تھے۔ اب اس کے بعد بظاہر تو اس بات کا انتظار شروع ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تنبیہ آئے گی لیکن اس کے برخلاف اس کے بعد ہم ایک دل آویز اور جانفزا کلمہ پڑھتے ہیں:

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ

(بے شک اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور نہایت حلم والا ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ آنے والی دنیا سابقہ آیاتِ کریمہ کو دیکھ کر اور جنگِ احد کے واقعات کو پڑھ کر صحابہ کے بارے میں کسی بدگمانی کی شکار نہ ہو اور نہ کسی دریدہ دہنی کا ارتکاب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے بعض صحابہ کرام پر غزوۂ احد کے اسی واقعے کا ذکر کر کے طعن کیا تو اس پر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا: جس چیز کی معافی کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا، اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ عقائد نسفیہ میں ہے:

Marfat.com

ویکف عن ذکر الصحابة الابخیر

(واجب ہے کہ صحابہ کا ذکر بغیر خیر کے اور بھلائی کے نہ کرے)

ایک دفعہ حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہم میں کسی بات پر تیز کلامی ہوگئی تو حضرت عبدالرحمٰن ؓ نے حضرت عثمان ؓ سے کہا کہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ مجھے برا بھلا کہو کیونکہ میں بدر میں شریک تھا اور تم غیر حاضر تھے۔ میں نے بیعتِ رضوان کی اور آپ نے نہیں کی اور میں احد میں ثابت قدم رہا اور آپ نہ رہے، تو حضرت عثمان ؓ نے کہا کہ غزوۂ بدر میں میری غیر حاضری کی وجہ تم جانتے ہو حضور ﷺ کی صاحبزادی اور میری زوجۂ محترمہ کی خطرناک علالت تھی اور میں ان کی تیمارداری اور ان کی خدمت میں رہا اور حضور نے مجھے مجاہدینِ بدر جیسے اجر کی خوشخبری بھی دی اور مالِ غنیمت میں سے مجھے ان کے برابر حصہ بھی دیا۔ بیعتِ رضوان کے وقت میں آنحضرت ﷺ کا سفیر بن کر کفارِ مکہ کے پاس گیا ہوا تھا اور جب تم لوگ بیعت کر چکے تو حضور نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ فرمایا: ھذہٖ لعثمان ''یہ ہاتھ عثمان کی طرف سے ہے''۔

فیمین رسول اللہ ﷺ وشمالہ خیرلی من یمینی وشمالی

(میرے دائیں اور بائیں ہاتھ سے سرورِ عالم کا دایاں اور بایاں ہاتھ میرے لئے ہزار درجہ بہتر ہے)

باقی رہا غزوۂ احد کا حادثہ تو اس کے متعلق خود اللہ کریم نے فرمادیا: وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ (اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا)۔ یہ مسکت جواب سن کر حضرت عبدالرحمٰن کو خاموش ہونا پڑا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا
فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا
لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿١٥٧﴾ وَ
لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ

Marfat.com

اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا
مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي
الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾
اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ
يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٦٠﴾ وَمَا
كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾ اَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾ اَوَلَمَّآ
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ
هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَآ
اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾
وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ

Marfat.com

اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ
يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ
وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ
بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا
بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ
اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

رکوع: ۱۷۔ (اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں کے بابت جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آ جاتی ہے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے، یہ خیال ان کے اندر اس لئے پیدا ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعث حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے ○ اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے یا مر گئے تو اللہ کی طرف سے ملنے والی مغفرت اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں ○ اور اگر تم مر گئے یا قتل ہو گئے ہر حال میں اللہ ہی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ○ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لئے نرم خو ہیں اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کریں ان کیلئے مغفرت چاہیں اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیں، پس جب آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ○ اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے گا تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا؟ اور اللہ ہی کے اوپر چاہیئے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں ○ اور ایک نبی کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا

Marfat.com

تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے دن آئے گا، پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے O کیا وہ شخص جو اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اس شخص کے مانند ہو جائے گا جو اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہے؟ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے O اللہ کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کو دیکھ رہا ہے O تحقیق اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے کہ انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے O اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی کہ پہنچا چکے تھے تم اس سے دونی، تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو! یہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے O اور جو پہنچی تمہیں مصیبت دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن پس وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تا کہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کر دے O اور منافقین کو بھی ممیز کر دے اور جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفعہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہوتے یہ لوگ اس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں O یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا حالانکہ وہ خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ کئے جاتے ان سے کہہ دو! ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو O اور ہرگز یہ خیال نہ کرو ان لوگوں کو جو قتل کئے گئے ہیں اللہ کے راستے میں، مردہ، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں O خوش ہیں ان نعمتوں سے جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں۔ اور وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے ہیں ان کے اخلاف میں سے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا) (۱۵۶ تا ۱۷۱)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ O

(اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں کے بابت جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے، یہ خیال ان کے اندر اس لئے پیدا ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعثِ حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے) (۱۵۶)

Marfat.com

عقیدہ کا ضعف کفر تک پہنچا دیتا ہے

گزشتہ آیات سے جنگِ احد کے حالات پر تبصرہ جاری ہے۔ مسلمانوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان کی نشاندہی کی جارہی ہے اور منافقین وغیرہ کے طرزِ عمل سے بچنے کی ترغیب دی جارہی ہے اور ان کے طرزِ عمل میں جس چیز نے ان کے اندر بزدلی پیدا کی ہے وہ جس تصور نے ان کی پوری عقائد کی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ مسلمانوں کو اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان تصورات نے نہ صرف ان کو بزدل بنایا بلکہ ان سے ان کی طمانینتِ قلب اور آسودگی کو بھی چھین لیا ہے اور تم بھی اگر ان تصورات کو قبول کرو گے تو ظاہر ہے کہ اس کا انجام بھی یہی ہوگا اور کَفَرُوْا کا لفظ بول کر یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ تصورات کا یہ بگاڑ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک یہ کفر ہے اور کفر کا جو نتیجہ آخرت میں ظاہر ہوگا وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ ان کے رویے کی پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اگر ان کے عزیزوں میں سے کوئی شخص سفر پر چلا جائے یا جہاد میں شریک ہو اور اسی حالت میں مرجائے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا عزیز ہمارے ساتھ ہوتا یا گھر میں رہتا تو اس طرح مسافرت کی موت نہ مارا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں ان کا مطلب یہ ہے کہ موت اور زندگی انسان کی اپنی تدبیروں کے ماتحت ہے۔ آدمی اگر تدبیر کی غلطی نہ کرے تو موت کا شکار ہونے سے بچ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے قبضے میں نہیں بلکہ وہ آدمی کے اپنے قبضے میں ہے اور جب کوئی شخص سفر یا جہاد کی حالت میں مرتا ہے یا شہید ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی بے تدبیری کی نذر ہو گیا۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو انسان کو بزدل بھی بناتا ہے اور کفر تک بھی پہنچاتا ہے جبکہ اسلام نے انسان کے دل کی مضبوطی اور اس کے کردار میں پختگی کیلئے جو عقیدہ عطا فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی مارتا اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے۔ زندگی اور موت سراسر اس کے قبضے میں ہے۔ کوئی آدمی مضبوط سے مضبوط قلعے میں بھی موت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کتنے ایسے لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے ساحل پر پہنچ جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو تیرتے تیرتے ڈوب جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جنہیں کشتیاں بھی خیریت سے ساحل پر نہیں پہنچا پاتیں ٹھیک کہا کسی نے

وہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

خطرات سے کھیلنے والے بچ جاتے ہیں اور گھروں میں چھپنے والے خطرات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے عقیدے کی اس پختگی پر زور دیا کہ دیکھنا تم ان کی طرح کمزور عقیدے کا شکار نہ ہونا ورنہ تم بھی ان کی طرح بزدلی کا شکار ہو جاؤ گے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو شخص موت کو حالات کا نتیجہ سمجھتا ہے اور اپنے اللہ کے بارے میں یہ مضبوط عقیدہ نہیں رکھتا کہ زندگی اور موت اس کے قبضے میں ہے وہ جب کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ اس کے اندر سے بہادری اور بے خوفی جاتی رہتی ہے بلکہ وہ ایک عجیب کرب کا شکار ہو جاتا ہے جو اس کے لئے سزا سے کم نہیں ہوتا۔ وہ کرب یہ ہے کہ جب بھی اسے وہ حادثہ یاد آتا ہے یا اسے اپنے عزیز کی موت یاد آتی ہے تو وہ اپنے تصورات کے تحت یہ سوچنے لگتا ہے کہ کاش! میں نے تدبیر کی یہ غلطی نہ کی ہوتی، کاش! میرا بھائی جنگ پر نہ گیا ہوتا، کاش! میرا بھائی سفر پر نہ جاتا تو یقیناً وہ آج زندہ ہوتا۔ یہ سوچ اس کے اندر حسرت کا ایسا زخم لگا دیتی ہے کہ جو زندگی بھر مندمل ہونے میں نہیں آتا وہ جب بھی اپنے مرحوم کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل سے آہیں نکلنے لگتی ہیں کہ کاش! اس نے ایسا نہ کیا ہوتا، کاش! اس

Marfat.com

نے ایسا نہ کیا ہوتا، کاش! وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاتا۔ یہ ایک ایسا خارِ غم ہے جو کبھی انسان کو چین نہیں لینے دیتا ان تمام کمزوریوں کا مداوی اور ایسی تمام کمزوریوں میں مضبوط قوت ارادی کا پیدا ہونا صرف اس بات پر موقوف ہے کہ آدمی وہم کی ان باتوں کو چھوڑ کر یہ مضبوط عقیدہ اختیار کرے کہ جب تک اللہ کو منظور نہ ہو موت نہیں آسکتی اور جب موت کا وقت آجاتا ہے تو بڑی سے بڑی حفاظت بھی موت سے بچا نہیں سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی دیوانہ وار موت کی وادی میں اترتا چلا جائے اور کسی معاملے میں کبھی احتیاط کا دامن نہ پکڑے اور بلاوجہ خطرات سے کھیلنا شروع کردے۔ نہیں! بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے ذمہ جو فرائض عائد کیے گئے ہیں ان سے محض اس لئے گریز کا راستہ اختیار نہ کرے کہ اس میں زندگی کے چلے جانے کا امکان ہوسکتا ہے۔ محض امکانات پر فرائض سے دست کش ہوجانا یہ وہ کمزوری ہے جو انسان میں مضبوط ارادہ پیدا ہونے نہیں دیتی اور وہ کبھی بھی کسی مشکل کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا جبکہ زندگی صرف آسانیوں کا نام نہیں اللہ کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا راستہ بعض دفعہ موت وحیات کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا

مثلِ خلیل ہو اگر معرکہ آزما کوئی !

اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

مزید اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم اپنے عزائم اور اپنے کاموں کے بارے میں ذہول اور نسیان کا شکار ہوسکتے ہو لیکن تمہارا رب تمہارے اعمال سے کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔ اگر تم نے اپنے اعمال سے اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی وقت بھی تم اس کی رحمت سے محروم کردیئے جاؤ۔ انتہائی خطرناک لمحوں میں بھی تم جب اسے پکارو گے تو تم اسے موجود پاؤ گے۔ آنحضرت ﷺ جب ایک درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے کہ اچانک ایک بدو برہنہ تلوار لئے آپ کے سر پر جا پہنچا اور آپ سے کہا کہ محمد (ﷺ)! بتاؤ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ تو آپ نے نہائیت مضبوط لہجے میں فرمایا: اللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل پر خوف طاری ہوگیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب آپ نے اس سے فرمایا کہ بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ تو اس نے گڑگڑانا شروع کردیا۔ اس کے اندر چونکہ عقیدے کی مضبوطی نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گڑگڑانے لگا اور یہ سمجھا کہ اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اللہ پر بے پناہ اعتماد اور اس کی جانب سے عائد شدہ فرائض کی ادائیگی دونوں ملکر انسان کے اندر وہ توانا کردار پیدا کرتے ہیں جو ایک مومن کی اصل شناخت ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

(اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے یا مرگئے تو اللہ کی طرف سے ملنے والی مغفرت اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کررہے ہیں ۝ اور اگر تم مرگئے یا قتل ہوگئے ہر حال میں اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیئے جاؤ گے) (۱۵۷ تا ۱۵۸)

Marfat.com

ایک نویدِ جانفزا

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں سے خطاب فرما کر ایک نہائیت دلنواز بات فرمائی گئی ہے کہ ان کافروں اور منافقوں کو تو چھوڑو زندگی اور موت کے بارے میں ان کے تصورات دنیا میں بھی ان کے لئے عذاب کا باعث ہیں اور آخرت میں تو سرتاپا عذاب ہوں گے۔لیکن مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ اگر تم اللہ کے راستے میں قتل کر دیئے جاؤ یا اللہ ہی کے راستے پر چلتے ہوئے کبھی موت کا شکار ہو جاؤ تو دوسرے لوگوں کیلئے تو یہ دونوں باتیں غم واندوہ کا باعث ہیں لیکن تمہارے لئے اس میں ایک نوید جانفزا مخفی ہے۔وہ یہ کہ تمہیں اللہ کے ہاں جا کر سب سے پہلی چیز جس کی خوشی سے تم دوچار کیے جاؤ گے وہ یہ ہوگی کہ تمہیں بتایا جائے گا کہ اللہ نے تمہاری سب غلطیاں، سب گناہ اور سب لغزشوں پر مغفرت کا قلم پھیر دیا ہے۔تمہارا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اللہ کی وہ رحمت میسر آئے گی جس سے بڑی نعمت کا ایک مومن تصور بھی نہیں کر سکتا۔یہ رحمت دراصل وہ انعام اور وہ نوازشات ہوں گی جو اللہ کی طرف سے اس مومن پر کی جائیں گی۔مغفرت بجائے خود اتنا بڑا مقام ہے کہ جس کی اہمیت اگر دل میں اتر جائے تو پھر اس راستے میں سب کچھ جھونک دینا مومن کیلئے آسان ہو جاتا ہے اور رحمت تو اللہ کی بخشش کے بعد ملنے والے وہ ثمرات ہیں جو بخشش کے بعد عطا کئے جائیں گے۔حدیث شریف میں آتا ہے: جب ایک مردِ مومن اللہ کی طرف سے ملنے والے انعامات اور نعمتوں کو دیکھے گا تو وہ تمنا کرے گا کہ اگر یہ نعمتیں میری زندگی میں برداشت کی جانے والی تکلیفوں کا صلہ ہیں تو اے کاش! میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی یعنی میں ناقابلِ برداشت اذیتوں سے دوچار کیا جاتا اور پھر مجھے یہاں ان اذیتوں کا بیش از بیش صلہ ملتا۔آخرت کی نعمتوں اور دنیا کی نعمتوں کا درحقیقت آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔نادانی سے لوگ بعض دفعہ اخروی نعمتوں کی بجائے دنیوی نعمتوں کے پیچھے دوڑتے اور انہیں جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی شعور ہو جائے کہ اخروی نعمتیں کیا اور کیسی ہیں تو وہ دنیوی نعمتوں کی بجائے اخروی نعمتوں کے حصول میں لگ جائیں۔صحابہ کی زندگی میں یہی روح کارفرما دکھائی دیتی ہے۔وہ چونکہ آخرت کے یقین سے بہرور تھے اس لئے بعض دفعہ دنیا میں اس کی خوشبو سونگھتے یا لذت یاب ہوتے تھے۔حضرت نضر بن انس رضی اللہ عنہ نے جنگِ احد میں فرمایا تھا کہ میں تو احد کے پیچھے سے جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔چنانچہ اسی خوشبو کی تلاش میں دیوانہ وار دشمن کی فوج میں جا گھسے اور اسی (۸۰) سے زیادہ زخم کھا کر شہید ہوئے۔ایک صحابی کھجوریں کھا رہے تھے جب معرکہ کارزار پوری طرح گرم تھا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ حضور اگر میں شہید ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت۔کھجوریں حضور کے حوالے کیں۔کہا: جب تک کھجوریں کھاؤں گا بہت دیر ہو جائے گی اور اتنی دیر تک جنت کا انتظار بہت مشکل ہے۔جنگ میں گھس گئے اور شہید ہو گئے۔آپ نے خود ان کو لحد میں اتارا۔حضرت عمر فاروق ؓ فرماتے تھے کہ وہ شخص شاید اسی وقت مسلمان ہوا تھا لیکن جب حضور نے اس کے جنتی ہونے کی خبر دی اور خود بچشمِ تر اس کو لحد میں اتارا تو مجھے اس سے رشک پیدا ہوا کہ کاش! میں اس کی جگہ شہید ہوا ہوتا اور حضور مجھے اپنے مبارک ہاتھوں سے قبر میں اتارتے۔

یہاں انہیں باتوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم دنیا کے خزف ریزے جمع کر کے اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہو لیکن تمہیں کیا معلوم کہ خوش قسمتی تو آگے ہے۔دوسری آیت میں ایک اور بات ارشاد فرمائی کہ جو مومن بھی اللہ کے راستے میں مارا جاتا ہے یا شہید ہوتا ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کسی اور جگہ نہیں اللہ ہی کے پاس پہنچتا ہے۔اگر وصلِ محبوب جنت سے بھی بڑی نعمت

Marfat.com

ہے تو یہ نعمت بھی اللہ ہی کے راستے میں مرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ دنیا میں عشاق وصلِ محبوب کی تمنا میں عمریں گزار دیتے ہیں لیکن جنہیں یہ خوشخبری سنا دی جائے کہ وصلِ محبوب اتنا ہی دور ہے جتنا زندگی سے موت کا فاصلہ تو اندازہ فرمایئے ان کیلئے جینا کس قدر مشکل ہو جائے گا۔ عام وصل کیلئے بے تابی دیکھنا ہو تو غالب کے اس شعر میں دیکھئے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
کچھ اور جیتے ہوتے یہی انتظار ہوتا

اس معمولی وصال کیلئے اگر عمر بھر انتظار کیا جاسکتا ہے تو اللہ کے وصال کیلئے ایک مومن میں کیا بے چینی ہونی چاہئے اس کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ سید احمد شہید کے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کو، جبکہ لڑائی چھڑ چکی تھی، تھوڑا سا دودھ اور کچھ چاول ملے۔ اس نے ایک برتن میں ڈال کر چولہے پر پکنے کیلئے رکھے اور ایک لکڑی لے کر اسے ہلانے لگا۔ میدانِ جنگ کی طرف دیکھا تو گولیاں برس رہی تھیں۔ سید صاحب پہاڑ سے نیچے اتر چکے تھے۔ اچانک اس نے کھیر کے برتن پر زور سے چھڑی ماری اور اسے زمین پر گرا کر کہنے لگا کہ ادھر دوسرے پہاڑ پر حوریں کھڑی ہمارا انتظار کر رہی ہیں میں کب تک اس کھیر کے پکنے کا انتظار کروں چنانچہ دیوانہ وار نیچے اترا اور شہید ہو گیا۔ ٹھیک کہا ماہر القادری مرحوم نے:

درود اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں اک ٹکڑا شجاعت کے فسانے میں

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝

(یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لئے نرم خو ہیں اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ سو ان سے درگزر کریں ان کیلئے مغفرت چاہیں اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ پس جب آپ فیصلہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کریں بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) (۱۵۹)

آنحضرت ﷺ کے کریمانہ اخلاق اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں

آیتِ کریمہ کے پہلے لفظ میں ”ما“ کا استعمال اہلِ نحو کے نزدیک تاکید کیلئے ہوا ہے۔ لیکن محققین یہ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ ایسے مواقع پر ”ما“ کا استعمال محض آہنگ کو ٹھیک رکھنے کیلئے بھی ہوتا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آپ کے اخلاقِ عالیہ جس کا آئندہ ذکر ہو رہا ہے وہ اتنے عظیم اور بلند ہیں کہ محض کسب و اکتساب سے انہیں حاصل کرنا ممکن نہیں ایسے اخلاق محض اللہ کی رحمت سے نصیب ہوتے ہیں اور آپ پر صرف اللہ کی رحمت ہی نہیں بلکہ آپ دنیا میں رحمت للعالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں اس لئے ایسے اخلاق کا وجود محض آپ کی خصوصیت اور سراسر اللہ کی رحمت ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ سابقہ آیات میں منافقین پر سخت تنقید ہوئی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ منافقین کی

Marfat.com

سازشوں اور عین جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران ان کی حرکتوں سے حد درجہ دل گرفتہ تھے۔ لیکن اس کا اظہار نہیں فرما رہے تھے۔ اب جو پروردگار کی طرف سے سخت تنقید سامنے آئی تو اندیشہ پیدا ہوا کہ آپ بھی ان پر گرفت فرمائیں گے اور سختی کا اظہار کریں گے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ابھی آپ ان منافقین کو مزید مہلت دیں اور ان سے اپنا کریمانہ رویہ بدستور جاری رکھیں تاکہ ان میں جو لوگ اصلاح کے قابل ہوں وہ اصلاح قبول کر کے مخلص مومنین میں شامل ہو جائیں۔ لیکن آگے چل کر جب ان منافقین پر اتمامِ حجت ہو گیا اور اب مزید اصلاح کی امید اس گروہ میں باقی نہ رہی تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رویہ بدلنے کا حکم دیا اور ان کے بارے میں سخت احکام نازل کئے۔ سورۂ توبہ میں ان کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے عفو و درگزر کی سفارش

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو عفو و درگزر کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے وہ منافقین نہیں بلکہ مخلص مسلمان ہیں۔ جن سے بعض اسباب کے تحت اجتہادی غلطیاں ہوئیں، وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے، کہیں اشتعال کا شکار ہوئے اور کبھی ہراس کا نشانہ بنے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غیر معمولی نقصان ہوا۔ جنگ کے بعد جب حالات نارمل ہوئے تو جن مسلمانوں سے کوتاہیاں ہوئی تھیں وہ حد درجہ پریشان رہنے لگے تھے۔ مسلمانوں کو مختلف حوادث کا سامنا چونکہ ان کی وجہ سے کرنا پڑا اس لئے وہ اپنے تئیں مجرم سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کے لئے صدمے کا باعث یہ تھا کہ ان کی بعض کوتاہیوں کے نتیجے میں خود آنحضرت ﷺ زخمی ہوئے۔ آپ انہیں پکارتے رہے لیکن جنگ کی ہولناکی نے جو بدحواسی پیدا کی اس کی وجہ سے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی آواز نہیں سنی چنانچہ ان کی اس فروگزاشت کی انہیں سزا یہ ملی کہ اللہ نے انہیں غم پر غم پہنچائے۔ لیکن اب مزید دل گرفتگی اور دل کے صدمے سے نکالنے کیلئے آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پر اللہ کا یہ خصوصی کرم ہے کہ اس نے آپ کو نرم خو بنایا ہے۔ حالات کیسے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں آپ نے اپنی نرم خوئی کو کبھی نہیں بدلا۔ اگر آپ تندخو ہوتے تو عرب کے بدو اور ان پڑھ لوگ جو اپنی طبیعتوں میں سختی اور اکھڑپن رکھتے تھے وہ تو آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ لیکن یہ آپ کی نرم خوئی، آپ کی محبت اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا نتیجہ ہے کہ جن سرپھرے لوگوں کو کبھی کوئی رام نہ کر سکا وہ آپ کی ایک ایک ادا پر قربان ہونے لگے اور آپ سے اس درجہ انہوں نے محبت کی کہ کسی ذات سے آج تک انسانوں کے کسی گروہ نے اس طرح ٹوٹ کر محبت نہیں کی ہوگی۔

جنگِ احد کا حادثہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے سب کے دل زخمی ہوئے ہیں اور آپ کا خصوصی طور پر زخمی ہونا مسلمانوں کیلئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ اگر آپ نے ان سے درگزر سے کام نہ لیا تو وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے اس لئے آپ ان سے درگزر فرمائیں۔ وہ چونکہ آپ کے صحابہ ہیں اور دین کی انہوں نے بے پناہ خدمت انجام دی ہے۔ مہاجرین نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور انصار نے اپنا سب کچھ ان کے قدموں میں ڈال دیا، اس لئے اللہ کی نظر میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ پروردگار آنحضرت ﷺ سے سفارش فرما رہے ہیں کہ آپ ان سے درگزر فرمائیں اور مزید یہ فرمایا کہ صرف درگزر ہی نہ فرمائیں بلکہ ہم سے سفارش بھی کریں کہ ہم ان کی مغفرت کر دیں۔ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا یہی مفہوم ہے۔ شیخ الہند نے بھی یہی مفہوم مراد لیا ہے کہ اپنے رسول سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے جو غلطی ہو گئی ہے اسے خود بھی معاف کر دیجئے اور میری جناب میں بھی شفاعت کیجئے کہ میں بھی ان سے راضی ہو جاؤں۔ سبحان اللہ! کیا شان

Marfat.com

ہے صحابہ کرام کی اور کتنا مقام ہے ان کے نبی مکرم کا اور اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے جب درگزر فرمائیں گے اور اللہ سے ان کیلئے استغفار کریں گے تو یقیناً آپ کا دل ان کی طرف سے بالکل صاف ہو جائے گا اور یہ خطرہ باقی نہیں رہے گا کہ کہیں آپ کے دل کا کوئی احساس اللہ کے یہاں ان کی آخرت کو مجروح کردے۔ لیکن صحابہ کرام کی دلجوئی اور ان کو حوصلہ دینے کیلئے مناسب یہ ہے کہ حسبِ سابق اپنے فیصلوں اور اپنے کاموں میں انہیں اپنے مشورے میں شامل رکھیں تاکہ انہیں پورا اطمینان ہو جائے اور وہ یقین کرلیں کہ آنحضرت ﷺ کی وہی نظرِ کرم ان کے حال پر ہے جو اس سے پہلے تھی۔ حالات کا تقاضا اگرچہ کچھ اور تھا لیکن آنحضرت ﷺ کے جود و کرم کے بحرِ زخار نے رحمت کا مینہ برسانے سے دریغ نہیں فرمایا۔ جو عطا اور بخشش صحابہ کے حال پر پہلے تھی اب بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔

نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ حسنہ کے ذکر کے ساتھ آپ کو جو ہدایات عطا کی گئیں وہ قیامت تک کیلئے ارشاد و اصلاح اور تبلیغ و دعوت کا کام کرنے والوں کیلئے ایک ہدایت نامہ بن گئیں جن سے معلوم ہوتا رہے گا کہ ایک داعی الی اللہ کو کن صفات کا مرقع ہونا چاہیے؟ اور اگر کبھی ناموافق صورتحال سے بھی دوچار ہونا پڑے تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے اپنی رحمت سے آپ کو نرم خو بنایا ہے۔ اگر آپ کہیں تندخو ہوتے تو عرب کے سرپھرے جن میں آزادی کی حس خودسری تک پہنچی ہوئی تھی وہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کبھی دیوانوں کی طرح آپ کے گرد جمع نہ ہوتے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ ایک مرشد و مبلغ کیلئے ترش روئی، سخت کلامی اور نازک مزاجی اس کی دعوتی اور اصلاحی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کی موجودگی میں دعوت کا کام انجام دیا ہی نہیں جا سکتا)

صحابہ کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے آپ کو درگزر کرنے کا حکم دیا گیا جبکہ کوئی ایسی کوتاہی جس سے پیغمبر کا دل دکھے اس سے ایمان چلے جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ کو درگزر کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو کسی شیخ اور مربی یا دین کا کام کرنے والی جماعت کے امیر کیلئے بدرجہ اولیٰ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ چلنے والوں کیلئے دل آویزی کا پیکر بنے، بات بات پر ان سے بازپرس نہ کرے اور برا کہنے والوں سے بھی کبھی انتقام لینے کا ارادہ نہ کرے بلکہ نرمی اور چشم پوشی کو اپنا رویہ بنائے۔

مزید فرمایا کہ آپ کو صحابہ کیلئے استغفار کرنا چاہیے یعنی آپ کے دل میں ان کیلئے اتنی جگہ ہونی چاہیے کہ آپ نہ صرف اپنا دل ان سے صاف رکھیں بلکہ اللہ سے بھی ان کی مغفرت کی سفارش فرمائیں۔ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کیلئے ناخوشی میں بھی دعائیں کرتا اور بھلائی مانگتا ہے اسی طرح دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کو اپنے ساتھیوں کیلئے ایسے ہی جذبات کا حامل ہونا چاہیے۔

مشاورت کی ہدایت

مزید فرمایا کہ عفو و درگزر اور استغفار کے ساتھ ساتھ آپ انہیں مشاورت میں بھی شریک رکھیں تاکہ وہ اجتماعیت سے کٹنے نہ پائیں اور باہمی حسنِ ظن اور اعتماد میں اضافہ ہو۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو دینی امور میں تو مشورہ لینے کی بالکل ضرورت نہیں تھی کیونکہ دینی امور میں قدم قدم پر وحیِ الٰہی راہنمائی کرتی تھی۔ البتہ! انتظامی معاملات میں وحی نہ اترنے کی صورت میں آپ کو مشاورت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگرچہ آپ کی اجتہادی قوت آپ کی راہنمائی کیلئے کافی تھی اور کسی بھی فروگذاشت کی صورت میں وحیِ الٰہی کی نگہداشت حفاظت کیلئے کافی تھی۔ بایں ہمہ! آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امت کو مشاورت کی اہمیت کا اندازہ ہو اور نیز یہ بات بھی معلوم ہو جائے کہ مشورہ سنتِ نبوی ہے اور امتِ مسلمہ کیلئے اس کا اتباع ضروری ہے۔ اس لئے امام ابوعبداللہ القرطبی نے خوب لکھا ہے:

Marfat.com

قال ابن عطیه والشوریٰ من قواعدالشریعة وعزائم الاحکام ومن لایستشیر اهل العلم والدین فعزله واجب

(مشورہ شریعت کے مسلمہ اصولوں اوراہم ترین احکام سے ہےاور جو حاکم اہل علم ودین سے مشورہ نہیں کرتا بلکہ خودرائی سے کام لیتا ہے اسے معزول کردینالازمی ہے)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص کسی کام کاارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعداس کے کرنے یانہ کرنے کافیصلہ کرے تواللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کوصحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

ایک اورحدیث میں ہے۔

جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اورتمہارے مالدارسخی ہوں اورتمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں توزمین کے اوپر رہناتمہارے لئے بہتر ہےاور جب تمہارے حکام بدترین ہوں اورتمہارے مالدار بخیل ہوں اورتمہارے معاملات عورتوں کے سپردہوں توزمین کے اندردفن ہوجاناتمہارے لئے بہتر ہوگا۔

امت میں اس کورواج دینے کیلئے آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ صحابہ سے مشورہ کیا۔غزوۂ بدر میں آگے بڑھنے کافیصلہ مشورہ سے ہی ہوااورآپ کے ساتھیوں نے مشورہ دیتے ہوئے جس سرفروشی کاثبوت دیا وہ ہمیشہ یادگاررہے گا۔بدر میں پہنچ کر پڑاؤ کیلئے جگہ کے انتخاب میں آپ نے مشورہ ہی سے تبدیلی کی۔غزوۂ احد میں مدینہ سے باہرنکل کرلڑنے کافیصلہ صحابہ کرام کے مشورے سے ہی ہوا۔غزوۂ خندق میں بنوغطفان وغیرہ سے صلح کا معاہدہ اوس وخزرج کے سرداروں کی مخالفت کی وجہ سے ختم کیا گیا۔حدیبیہ کے ایک معاملے میں صدیق اکبرؓ کے مشورہ پرفیصلہ ہوا۔مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کواپنی سنت کے طورپر امت میں چھوڑا تاکہ امت اسی کوشورائیت کی بنیاد بناکراپنے اجتماعی امورسرانجام دے سکے۔

فیصلے کے بعداللہ تعالیٰ پربھروسہ کرو

اس آیتِ کریمہ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جب مشورہ کے بعد آپ کسی نتیجہ پرپہنچ جائیں توپھراللہ پربھروسہ کریں اورجس کام کاارادہ کیا ہے اسے سرانجام دینے کافیصلہ کرلیں اورعزم کی قوت کے ساتھ اسے بروئے کارلائیں۔مشاورت میں یقیناً موجوداسباب میں سے ایک ایک بات پربحث ہوتی ہے۔مثبت اورمنفی پہلوسامنے آتے ہیں،تحفظات بھی طے کیے جاتے ہیں اوراقدامات کابھی فیصلہ ہوتا ہے۔اپنی قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہےاور موانع اورمشکلات کابھی۔ان تمام باتوں کوسمجھ لینے کے بعد جب یہ فیصلہ ہوجائے کہ اب اقدام کرنا ہےاوراس کام کو سرانجام دینا ہے توپھراسباب کی کمی کودیکھتے ہوئے کسی کمزوری کوپاس نہ آنے دینا بلکہ اللہ کے بھروسے پرایک ایک قدم اٹھانا''توکل''کااصل مفہوم ہے۔ہم نے توکل کوتعطل کاہم معنی سمجھ لیا ہے۔جب کسی کام کونہ کرنے کاارادہ ہواوراس کیلئے جان مارنے کی ہمت نہ ہوتوہم بےعمل ہوکر بیٹھ جاتے ہیں اوریہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب ہم اللہ کے بھروسے پرہی حالات کوآگے بڑھنے دیں گے۔توکل کیلئے اولین شرط موجوداسباب کی

Marfat.com

فراہمی ہے اس کے بعد اللہ پر بھروسہ ہے۔ اس لئے حضور نے فرمایا: اعقل ثم توکل ''اونٹ کا گھٹنا باندھو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو کہ اب یہ کہیں نہیں جائے گا۔'' اونٹ کو کھلا چھوڑ کر یعنی احتیاطی عمل کو ترک کر کے توکل کرنا، یہ توکل نہیں۔ شاعر نے ٹھیک کہا:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

(اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے گا تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا؟ اور اللہ ہی کے اوپر چاہئے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں) (۱۶۰)

گزشتہ آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی تقسیم ایک ہی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ پسند نہیں کرتا اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پسندیدہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ایک طرف کافر ہیں اور دوسری طرف مومن ہیں۔ مومن اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں اور کافر ناپسندیدہ لوگ ہیں۔ دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ جنہیں پسند کرتا ہے انہیں نوازتا ہے اور ان کی غلطیوں پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصلاح سے بے فکر نہ ہوں اور اس کے احکام کو کبھی نظر انداز نہ کریں تو وہی دنیا و آخرت کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی جزا عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ توکل کو بطور عقیدہ کس طرح ماننا چاہئے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ توکل ترکِ اسباب اور ترکِ تدبیر کا نام نہیں بلکہ تمام ممکن اسباب کی فراہمی ایک مومن کیلئے بھی ضروری ہے۔ توکل اس بات کا نام ہے کہ جب ممکن اسباب فراہم ہو جائیں تو اب اپنی کامیابی کا دارومدار اسباب پر نہیں اللہ پر ہونا چاہئے۔ یہی ایک مومن اور کافر میں فرق ہے۔ کافر بھی اسباب فراہم کرتا ہے اور اس کا تمام تر بھروسہ اسباب پر ہوتا ہے۔ لیکن مومن کا اصل بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہوتا ہے اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ مدد صرف اللہ کی طرف سے آتی ہے۔ اگر وہ مدد کرے تو پھر چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اور اس کی مدد کی موجودگی میں کسی اور مدد کی ضرورت نہیں ہوتی اور کوئی اور قوت ایسے بے پناہ یقین رکھنے والوں پر غالب بھی نہیں آسکتی اور ساتھ ہی وہ یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ اگر اللہ مدد سے ہاتھ کھینچ لے اور وہ اپنے ماننے والوں کو بے سہارا چھوڑ دے تو پھر کوئی اور ایسی قوت نہیں جو اس کے بعد مومن کی مدد کر سکے۔ اس مضبوط عقیدے پر ایمان دراصل توکل ہے اور ایسے صاحبِ ایمان لوگوں کو سب سے زیادہ یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ اور توکل کریں اور یہ توکل ہی ہے جو مسلمان کو باقی قوموں سے الگ کرتا ہے۔ اقبال کا نہایت سادہ سا شعر دراصل اسی بات کی تفسیر ہے لوگوں نے نہ جانے اس کے کیسے دوسرے معنی مراد لے لئے ہیں۔ وہ کہتا ہے

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

Marfat.com

یعنی وہ امکانی حد تک اسلحۂ جنگ فراہم کرتا ہے لیکن اس پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بھروسہ چونکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے اس لئے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اسے بے تیغ بھی لڑنا پڑے تو محض اس لئے میدان سے جی نہیں چراتا کہ میرے پاس تیغ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اسباب کی فراہمی بھی اللہ کے اختیار میں ہے اس نے اگر ساری کوششوں کے باوجود اسباب نہیں دیئے اور حق و باطل کا معرکہ برپا ہو گیا ہے تو اب شاید وہ یہی چاہتا ہے کہ مجھے بے تیغ بھی میدانِ جنگ میں اتر جانا چاہیے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

(اور ایک نبی کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے دن آئے گا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے) (۱۶۱)

غلول کا مفہوم اور یہاں اس سے مراد؟

غَلَّ یَغُلُّ کا مصدر ہے غُلُوْلٌ ۔عام طور پر مالِ غنیمت میں کسی طرح کی خیانت یا چوری پر غلول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ عام خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ نَصَحَ کا ضد ہے۔ جس کا معنی ''خیر خواہی'' اور ''خیر سگالی'' کے ہیں۔ جن اہلِ علم نے مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ کا یہ معنی کیا ہے کہ ''کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ مالِ غنیمت میں چوری یا خیانت کرے'' انہوں نے اس کیلئے ترمذی کی ایک روایت کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ بدر میں ایک قبا یا ایک چادر چوری ہو گئی تھی بعض لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے لی ہے۔ کہنے والوں کا گمان یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو شاید ہر طرح کا اختیار حاصل ہے وہ مالِ غنیمت میں سے جو چیز چاہیں لے سکتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین نے اسے چوری قرار دیا ہو۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی الزام کا ذکر کر کے اس کی تردید فرمائی گئی ہے۔ لیکن ان آیات کے مفہوم کے سلسلے میں دشواری یہ پیش آتی ہے کہ یہ تمام آیات جنگِ احد کے واقعات پر تبصرہ ہیں اور جنگِ بدر اس سے ایک سال پہلے پیش آنے والا واقعہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جنگِ احد کے واقعات پر تبصرہ کے ضمن میں بدر کے ایک واقعہ کا ذکر کیا جائے۔ جنگِ بدر میں یہ واقعہ ضرور پیش آیا ہو گا اس سے انکار نہیں لیکن موجودہ سیاق و سباق میں اس واقعہ کا ذکر نہ سمجھ آنے والی بات ہے۔ اس لئے بعض دوسرے اہلِ علم نے اس کا ایک اور مفہوم مراد لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن تیر اندازوں کو نبی کریم ﷺ نے عقب کی حفاظت کیلئے پہاڑ پر بٹھایا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے اور مسلمانوں نے مالِ غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے تو انہیں گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو لوگ مالِ غنیمت سمیٹیں وہ سارا انہی کو دے دیا جائے اور ہم تقسیم کے موقعہ پر محروم رہ جائیں۔ یہ خیال کر کے اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے جواب میں جو کچھ کہا وہ کوئی ایسا قابلِ قبول نہ تھا۔ تو آپ نے فرمایا:

Marfat.com

اظننتم اننا نغل ولانقسم لکم (کیاتم یہ خیال کرتے تھے کہ ہم خیانت کریں گےاور تمہیں کچھ نہ دیں گے؟)
اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور تقریب کلام سے مالِ غنیمت میں چوری کی شناعت اور اہمیت بھی بیان فرمادی۔

بعض اہلِ علم نے ایک اور مفہوم بیان کیا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ کا مالِ غنیمت کا چوری سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں منافقین کے الزام کی تردید کی جارہی ہے۔منافقین کا الزام یہ تھا کہ ہم نے تو نبی کریم ﷺ پر ہر طرح کا اعتماد کیا ان کے ہاتھ پر بیعت کی اپنے نیک وبد کا ان کو مالک بنایا لیکن وہ ہمارے اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھارہے ہیں۔دشمن کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہم نے یہ مشورہ دیا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن انہوں نے ہمارے مشوروں اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدروقیمت نہ سمجھی اور اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کو پورا کرنے کیلئے ہمیں قربان کرڈالا۔یہ ایک خیانت ہے جو انہوں نے ہمارے اعتماد میں کی ہے اور یہ ایک بدخواہی اور بے وفائی ہے جو انہوں نے اعتماد کرنے والوں سے کی ہے۔اس کے جواب میں یہاں فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر اپنی کوئی ذاتی آرزوئیں یا امنگیں نہیں رکھتا وہ معصوم ہوتا ہے۔وہ کبھی اپنی امت کے ساتھ بیوفائی اور بدعہدی نہیں کرسکتا۔نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔ان اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ یہ تاویل سیاقِ کلام کے عین مطابق ہے اور تفسیر ابن جریر سے بھی یہی مفہوم واضح ہوتا ہے۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝

(کیا وہ شخص جو اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اس شخص کے مانند ہوجائے گا جو اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہے؟ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے ۝ اللہ کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے اور یہ جو کچھ کررہے ہیں اللہ اس کو دیکھ رہا ہے) (۱۶۲ تا ۱۶۳)

حق وباطل کے معرکے میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔حق کے علمبردار اور باطل پرست۔اہلِ حق کے پیشِ نظر ہمیشہ اللہ کی رضا ہوتی ہے۔وہ کوئی سا قدم اٹھانے سے پہلے اللہ کی خوشنودی کے بارے میں سوچتے ہیں اور اہلِ باطل کے سامنے ہمیشہ اپنی ذاتی خواہشات ہوتی ہیں۔منافقین اور دیگر کفار اہلِ باطل کی نمائندگی کررہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا انجام اللہ کی ناراضگی اور اس کے نتیجے میں اس کا جہنم ہے اور اہلِ حق چونکہ ہر کام اللہ کی رضا کیلئے کرتے ہیں تو اللہ کی رضا ہی سے نوازے جاتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں بالآخر جنت سے نوازا جائے گا۔یہ دو قافلے ہیں جو پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ہر آدمی کو ان میں سے کسی ایک گروہ کا ساتھ دینا ہے۔اس لئے اسے یہ دیکھ کر ساتھ دینا چاہئے کہ ایک گروہ کا انجام جہنم ہے اور دوسرے کا جنت۔مزید یہ بات بھی کہ اللہ کے یہاں نیکی کے بھی درجات ہیں اور برائی کے بھی۔ان درجات کا حصول اعمال پر موقوف ہے۔جیسے اعمال ہوں گے ویسے درجات سے واسطہ پڑے گا اور اللہ برابر اپنے بندوں کے اعمال کو دیکھتا ہے تاکہ انہیں کے مطابق ان سے سلوک کرے۔

Marfat.com

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(تحقیق اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے کہ انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے) (۱۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، کیوں؟

یہ آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ البقرۃ میں گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام اجزا کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ بدبخت منافقین جس پر خیانت اور بدخواہی کا الزام لگا رہے ہیں۔ اس ذاتِ والا صفات کی اہمیت اللہ کے احسانِ عظیم کی سی ہے پروردگار نے انسانوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں لیکن کسی احسان کو جتلانا گوارا نہیں فرمایا حالانکہ ان میں سے ایک ایک احسان اس قابل ہے کہ آدمی ساری زندگی اس کے شکر میں گزار دے تو اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی احسان کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا بجز اس احسان کے، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کائنات میں سب سے بڑی مخلوق اور کائنات کا گلِ سرسبد "انسان" ہے۔ اسی کی وجہ سے دنیا میں سرگرمی ہے، رونق ہے، اس کی صلاحیتوں کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت ہیچ ہے۔ اس کے عزائم کے سامنے پہاڑوں کی بلندی سرنگوں ہے۔ اس نے لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کی ہے۔ اس نے چند دھاتوں کے ڈبے میں انسانی دماغ اور حافظے کی قوت پیدا کر دی ہے۔ اس نے ایسے کیمرے ایجاد کئے ہیں جو زمین کے ناقابلِ عبور حصوں کی تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ اس کے راکٹ اور سیارے خلا کو عبور کر رہے ہیں۔ اس کے دل کی قوتوں کے سامنے سمندروں کی گہرائیاں ہیچ ہیں۔ اس کے دماغ کی وسعتوں کے مقابلے میں کائنات کی وسعتیں محدود ہیں۔ اس کے آنسوؤں کی گرمی سے فضا کی پہنائیاں پگھلنے لگتی ہیں۔ اس کے سوز و گداز سے عالمِ ملکوت میں حیرانیاں ہیں۔ اس کی عبادت کا شوق اور اس کی قربانیوں کا جوش ملائے اعلیٰ میں بھی اس کے تذکرے کا باعث بنتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات میں سے چند احسانات ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی کا بھی احسان نہیں جتلایا کیونکہ یہ تمام صلاحیتیں اور نعمتیں اللہ تعالیٰ کی دَین ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی منفرد حیثیت نہیں رکھتی۔ ان صلاحیتوں کا اچھا یا برا ہونا، بالا قیمت یا کم قیمت ہونا اس کا تعلق حضرتِ انسان سے ہے۔ اگر انسان کے ارادوں میں کمزوری ہے، اس کی نیت میں فساد ہے، اس کے دل میں اخلاص کی کمی ہے، اس کی جہتِ سفر غیر واضح ہے، اس کی منزل نامعلوم ہے، اس کے زاویۂ نگاہ میں کجی ہے، تو وہ اپنی ساری خصوصیات کے باوجود انسانیت کیلئے بدنما داغ ہے۔ لیکن اگر اس کے ارادوں میں مضبوطی، اس کے دل میں اخلاص، اس کے اخلاص میں سوز و گداز کی کارفرمائی اور اس کی جہتِ سفر واضح اور منزل معلوم و معین ہے تو یہ انسان کائنات کا گلِ سرسبد اور کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے اللہ کا سب سے بڑا احسان ہیں کہ انہوں نے انسان کی تمام توانائیوں اور رعنائیوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کیلئے کامیابی سے محنت فرمائی۔ آپ نے اس مشتِ خاک کو ارادوں کی وسعت، استقلال کی عظمت، دلوں کا اخلاص، احساس کا سوز و گداز

Marfat.com

جہتِ سفر معلوم اور ہموار اور منزل متعین فرما کر ایک ایسا اعلیٰ و برتر وجود بنایا کہ جس پر فرشتے بھی رشک کرنے لگے اور ایسے نمونے کے انسان تیار کیے جس کی نظیر اس سے پہلے چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا اسوہ انسانوں کی زندگی کی ضمانت ہے۔ اس کی تعلیم انسانی فکر کی صحت کی علامت ہے۔ وہ جب تک نہ آیا تھا تو دنیا نمرود اور فرعون، ہامان اور شداد جیسے انسانوں سے بھرپور تھی لیکن ان کے خلاف کوئی احتجاج نہ تھا۔ اس کے آجانے کے بعد انسان کو حقیقی شعور نصیب ہوا۔ آج اگرچہ برائی کی علامتیں توانا ہوگئی ہیں لیکن ان کے خلاف احتجاج اور شدتِ احساس اسی کی دین ہے اور یہ جب تک زندہ ہے انسان کی قسمت دھندلا تو سکتی ہے مردہ نہیں ہو سکتی۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی کہ پہنچا چکے تھے تم اس سے دونی، تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو! یہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (۱۶۵)

"أ" حرفِ استفہام ہے اور "و" حرفِ ربط ہے۔ یہ حرفِ استفہام اظہارِ تعجب کیلئے ہے اور حرفِ ربط اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بھی منجملہ ان اعتراضات کے ایک اعتراض ہے جس کے جواب اوپر دیئے گئے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر حق و باطل کی کشمکش کے حوالے سے تصورات بنا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ جب کبھی حق و باطل کی کشمکش ہو اور ان میں خود اللہ کے نبی موجود ہوں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایسی صورت میں اہلِ حق کو شکست ہو۔ اللہ کا نبی چونکہ دنیا میں اللہ کا نمائندہ ہے اس لئے اللہ اپنے نمائندہ کو کبھی شکست سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ اس کی مدد کیلئے آسمانوں سے فرشتے اتارتا ہے اس تصور کی موجودگی میں جب انہیں احد کی شکست سے دوچار ہونا پڑا تو ان کے لئے یہ بات سمجھنا مشکل ہو گیا کہ آخر یہ شکست کیسے ہوگئی؟ وہ سوچ میں ڈوب گئے کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں تو پھر شکست ہو جانے کا کیا مطلب؟ منافقین نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں آنحضرت ﷺ اور خود دین کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ وہ بار بار اس شکست کا حوالہ دیتے تھے کہ یہ شکست آخر کہاں سے آگئی؟ قرآنِ کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اگر آج اس نقصان سے دوچار ہوئے ہو تو اس سے ایک سال پہلے میدانِ بدر میں تم کفار کو دوگنا نقصان پہنچا چکے ہو۔ یعنی تمہارے ستر افراد شہید ہوئے تو ان کے بھی ستر افراد مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور اس جنگ میں بھی پہلے مرحلے پر تم نے ان کے کئی افراد مار ڈالے اور وہ شکست کھا کر بھاگے بعد میں حالات نے تمہاری غلطیوں کی وجہ سے پلٹا کھایا اور تمہاری فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ جہاں تک اللہ کی طرف سے تائید اور نصرت کا تعلق ہے اس نے جنگ کے پہلے مرحلے میں تمہیں فتح یاب فرمایا تھا۔ لیکن تم نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں تبدیل کر دیا تو اب تم پوچھتے ہو کہ یہ شکست کہاں سے

Marfat.com

آ گئی۔اس شکست کا سبب کوئی اور نہیں بلکہ تم خود ہو۔یہ شکست تمہارے نفسوں کی طرف سے آئی ہے۔اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے،وہ اپنے بندوں کو فتح سے بھی نواز سکتا ہے اور اگر اس کے بندے کہلاتے ہوئے بھی نافرمانی کریں،تو شکست سے بھی دوچار کرسکتا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(اور جو پہنچی تمہیں مصیبت دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن پس وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کردے ۝ اور منافقین کو بھی ممیز کردے اور جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفعہ کرو۔انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہوتے یہ لوگ اس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں ۝ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا حالانکہ وہ خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ کئے جاتے۔ان سے کہہ دو! ذرا دور تو کردکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو) (۱۶۶ تا ۱۶۸)

حق و باطل کا معرکہ من جانب اللہ ایک کسوٹی ہے

پہلی آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچی ہے اور جو کچھ پیش آیا ہے یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا ہے۔مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو ہر طرح کی کمزوریوں اور نفاق سے پاک کردینا چاہتا ہے۔میدانِ جنگ ایک ایسی کسوٹی ہے جس میں کھرا اور کھوٹا خوب پہچانا جاتا ہے۔جس امت کے سپرد دنیا کی اصلاح کا کام ہو اس کا ایک ایک فرد اپنے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتا ہے کہ جس سے بڑی ذمہ داری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔اسے قدم قدم پر مخالفین سے واسطہ پڑتا ہے۔فکری تضادات کی جنگ لڑنا پڑتی ہے،تہذیب کے ایک ایک مظہر پر ثباتِ قدم سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے،رسم و رواج اور میل جول کے معاملات میں سخت تنقید کا نشانہ بننا پڑتا ہے،اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے وقت کی قوتوں سے ٹکرانا پڑتا ہے،ایسے جانگسل اور پرخطر کام میں اگر اس امت اور گروہ کے چند افراد بھی اخلاص سے تہی دامن اور یکسوئی سے خالی ہیں تو وہ پوری جماعت کیلئے سوہانِ روح بن جاتے ہیں۔کسی بھی نازک موقعہ پر وہ دشمن کے ہاتھ میں کھیل سکتے ہیں اور اس طرح سے جیتی ہوئی بازی بھی پلٹ سکتی ہے۔اس لیے قرآنِ کریم بار بار اس بات کو واضح کرتا ہے کہ تم اہلِ دنیا میں اپنی حیثیت کو سمجھو اور پھر فیصلہ کرو کہ کیا تم

Marfat.com

میں منافقین کا وجود گوارا کیا جاسکتا ہے؟ اگر منافقین کے گروہ کو امت کے قائد اور امیر امت سے نکلنے کا حکم دے دیں تو اس کو مختلف معنی پہنا کر امت میں تفریق کیلئے راستہ کھل سکتا ہے۔ اس لئے اس ناگزیر کام کیلئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو انسانی مصالح کیلئے زیادہ مناسب ہے اور وہ طریقہ وہی ہے جو احد میں پیش آیا کہ حق و باطل کے معرکے نے کسوٹی کی طرح ایک ایک شخص کو اس کے اصل مقام پر کھڑا کر دیا۔ مخلصین الگ ہو گئے اور منافقین الگ۔ کمزور مسلمان الگ پہچانے گئے اور جان پر کھیل جانے والے الگ اپنا نقش چھوڑ گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اس آیت میں مثال بھی دی گئی کہ تم نے دیکھا کہ تمہاری جمعیت میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اٹھو میدانِ جہاد پکار رہا ہے یا کم از کم شہر کا دفاع تم سے اٹھنے کا تقاضا کر رہا ہے۔ تو ان لوگوں نے اپنی بزدلی اور نفاق پر پردہ ڈالنے کیلئے عجیب بات بنائی کہ ہمیں علم ہے کہ اس موقعہ پر لڑائی نہیں ہوگی اگر لڑائی ہونا ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اصلاً جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ اپنی زبان پر لانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ ان کے دل میں تھا اس کو لفظوں میں چھپا کر اپنے نفاق میں اخفا پیدا کیا۔ لیکن دوسری آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس راز کو کھول دیا کہ وہ درحقیقت یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی اور موت آدمی کے اپنے قبضے میں ہے۔ اگر بے تدبیری نہ کی جائے تو موت سے بچا جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ان بھائیوں کے بارے میں جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے اور میدانِ جنگ میں نہ جاتے تو وہ قتل نہ ہوتے۔ یہی موت کا خوف ہے جو درحقیقت انہیں نفاق پر مجبور کرتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے سے روکتا ہے۔ رہی ان کی سخن سازیاں تو وہ صرف بہانے ہیں اور اس آیت کے آخر میں یہ فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ زندگی اور موت کے راز سے واقعی واقف ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ موت سے بچا جاسکتا ہے تو پھر ان سے کہئے کہ تم اپنے آپ سے موت کو دور رکھو دیکھنا موت کبھی تمہارے قریب نہ آنے پائے۔ اگر اس تدبیر سے تم ہمیشہ جیتے رہے اور کبھی تمہیں موت نہ آئی تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ تم واقعی اپنی بات میں سچے ہو۔ لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ:

موت ہے ہنگامہ آراء قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(اور ہرگز یہ خیال نہ کرو ان لوگوں کو جو قتل کیے گئے ہیں اللہ کے راستے میں، مردہ، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔ خوش ہیں ان نعمتوں سے جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں۔ اور وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے ہیں ان کے اخلاف میں سے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا) (۱۶۹ تا ۱۷۱)

Marfat.com

شہداء کو مردہ مت کہو، وہ زندہ اور رزق دیئے جاتے ہیں

جنگِ احد میں جن لوگوں کو شہادت کی عزت نصیب ہوئی منافقین ان کے پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو مردہ قرار دیتے اور ان کے پسماندگان کو صبر کی تلقین کرتے اور اس طرح سے قافلۂ حق کی ہمتوں کو سلب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پروردگار نے ان منافقین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ خبردار اللہ کے راستے میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو۔ مردہ تو تم ہو جن کی وجہ سے زندگی بخش پیغام کو زخم لگے ہیں۔ وہ لوگ کیسے مردہ ہوسکتے ہیں جن کے خون کے ایک ایک قطرے سے صداقتیں توانا ہوتیں اور دین کی فصل لہلہاتی ہے کیونکہ:

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بڑی شاداب ہوتی ہے

اللہ کے راستے میں جان دینے والے موت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کی زندگی جاوداں ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے رب کے پاس زندہ رہتے ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ احادیث میں شہدا کے زندہ ہونے اور ان کی لاشوں کے سلامت رہنے کا کئی دفعہ تذکرہ ہوچکا ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہارے بھائی احد میں شہید ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے قالب عطا فرمائے۔ وہ جنتی محلوں پر سیر کرتے پھرتے ہیں جنتی میوے کھاتے ہیں، طلائی قندیلیں جو زیرِ عرش معلق ہیں ان میں رہتے ہیں، جب انہوں نے کھانے پینے، رہنے کے پاکیزہ عیش پائے تو کہا کہ ہمارے بھائیوں کو کون خبر دے کہ ہم جنت میں زندہ ہیں تاکہ وہ جنت سے بے رغبتی نہ کریں اور جنگ سے بیٹھ نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں انہیں تمہاری خبر پہنچاؤں گا۔ اللہ کے رسول کی یہ حدیث بھی صحیح ہے اور اللہ کی کتاب کی یہ آیت بھی سچی ہے۔ جنت میں رہتے ہوئے شہداء کی روحوں کا تعلق اپنے بدنوں سے اس طرح قائم ہے کہ ہم اس کی کیفیت کو نہیں جانتے اور جنت میں وہ اللہ کے عطا کردہ جسموں کے ساتھ رہ رہے ہیں ان کی زندگی برزخی زندگی سے توانا زندگی ہے۔ وہ اللہ کے ہاں سے خصوصی رزق پاتے ہیں، دنیا میں جس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اسی خصوصیت کے باعث آنحضرت ﷺ ہر سال شہدائے احد کی قبور پر تشریف لے جاتے تھے اور انہیں اپنی دعاؤں سے محظوظ فرماتے تھے۔ اللہ کے یہاں اپنی قدر افزائی اور بندہ نوازی کو دیکھتے ہوئے اپنے پیچھے رہ جانے والے عزیزوں کے بارے میں آرزوئیں کرتے ہیں کہ کاش! انہیں بھی شہادت نصیب ہو اور وہ بھی اس عیش کی زندگی میں ہم سے آملیں۔ قرآنِ کریم خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان شہداء کو بشارت مل رہی ہے کہ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے اخلاف کو تم سے ملایا جائے گا اور انہیں بھی انہیں نعمتوں سے نوازا جائے گا جن سے تم نوازے گئے۔ وہ اگر اپنے مقام و مرتبہ میں ان سے فروتر بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے مقام میں اضافہ فرمادے گا۔ اس بشارت کے بعد اب ان شہداء کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

شہداء کے مقام و مرتبہ کو واضح فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان تمام اسباب کا سدِ باب کردیا ہے جو منافقین مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے بلکہ شہادت ہر مسلمان کی آرزو و تمنا بن گئی ہے۔

Marfat.com

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ
اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٢﴾
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ
فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿١٧٣﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿١٧٤﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ
اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٥﴾
وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا
اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ
يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا
اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ
عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ

Marfat.com

اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٩﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ
مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١٨٠﴾ ع

رکوع: ۱۸۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا اس کے بعد کہ وہ زخمی ہو چکے تھے ان میں سے جنہوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیا اور جو تقویٰ کی راہ چلے ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے ○ یہ وہ ہیں جن کو لوگوں نے کہا کہ بیشک لوگوں نے تمہارے خلاف بہت طاقت اکٹھی کی ہے تو ان سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے ○ سو یہ لوگ واپس آئے اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر ان کو کوئی گزند نہیں پہنچی اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ○ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تم ان سے نہ ڈرو مجھ ہی سے ڈرو اگر تم مومن ہو ○ نہ غمگین کریں آپ کو وہ لوگ جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، ان کیلئے بڑا عذاب ہے ○ بے شک جن لوگوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے ○ گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں ان کیلئے بہتر ہے۔ ہم تو اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کیلئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ○ اللہ تعالیٰ کی (یہ سنت) نہیں کہ وہ چھوڑے رکھتا مومنوں کو اس حال پر جس پر تم تھے جب تک الگ الگ نہ کر دے پلید کو پاک سے اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہیں غیب پر آگاہ کر دے۔ البتہ! اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے ○ گمان نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو ان کو اللہ نے اپنے فضل سے عطا کی ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کریں گے ان کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے) (۱۷۲ تا ۱۸۰)

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ

Marfat.com

يَمۡسَسۡهُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡفَضۡلٍ عَظِيۡمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝

(جن لوگوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا اس کے بعد کہ وہ زخمی ہو چکے تھے ان میں سے جنھوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیا اور جو تقویٰ کی راہ چلے ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے ۝ یہ وہ ہیں جن کو لوگوں نے کہا کہ بیشک لوگوں نے تمہارے خلاف بہت طاقت اکٹھی کی ہے تو ان سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے ۝ سو یہ لوگ واپس آئے اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر ان کو کوئی گزند نہیں پہنچی اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۝ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تم ان سے نہ ڈرو مجھ ہی سے ڈرو اگر تم مومن ہو) (۱۷۲ تا ۱۷۵)

ان آیات کے مضمون کا پس منظر

ان آیاتِ کریمہ میں جنگِ احد میں اور اس کے بعد پیش آنے والے بعض حالات کی طرف اشارے ہیں اور مقصود ان سے مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور سرفروشی کے رویے کو واضح کرنا ہے جو مسلمان کا اصل سرمایہ اور اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے اور مقصود یہ بھی ہے کہ ان واقعات سے اس حقیقتِ ابدی کی تائید ہو جائے جس کا ذکر ان آیاتِ کریمہ سے پیشتر آیاتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

جن واقعات کی طرف اشارے فرمائے گئے ہیں ہم ان کی روداد اور تفصیل ''الرحیق المختوم'' سے نقل کرتے ہیں۔

اہلِ سیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معرکۂ احد کے دوسرے دن یعنی یک شنبہ ۸ شوال ۳ھ کو علی الصبح اعلان فرمایا کہ دشمن کے مقابلے کیلئے چلنا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان فرمایا کہ ہمارے ساتھ صرف وہی آدمی چل سکتا ہے جو معرکۂ احد میں موجود تھا۔ تاہم عبداللہ بن ابی نے اجازت چاہی کہ آپ کا ہمرکاب ہو مگر آپ نے اجازت نہ دی۔ ادھر جتنے مسلمان تھے اگرچہ زخموں سے چور، غم سے نڈھال اور اندیشہ و خوف سے دوچار تھے، لیکن سب نے بلا تردد سرِ اطاعت خم کر دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ نے بھی اجازت چاہی جو جنگِ احد میں شریک نہ تھے۔ حاضر خدمت ہو کر عرض پرداز ہوئے۔ ''یارسول اللہ ﷺ! میں چاہتا ہوں کہ آپ جس کسی جنگ میں تشریف لے جائیں میں بھی حاضر خدمت رہوں اور چونکہ (اس جنگ میں) میرے والد نے مجھے اپنی بچیوں کی دیکھ بھال کیلئے گھر پر روک دیا تھا۔ لہٰذا آپ مجھے اجازت دیدیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں''۔ اس پر آپ نے انہیں اجازت دے دی۔

پروگرام کے مطابق رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو ہمراہ لے کر روانہ ہوئے اور مدینے سے آٹھ میل دور ''حمراء الاسد'' پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔

Marfat.com

اثناء قیام میں معبد بن ابی معبد خزاعی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوا---- اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے شرک ہی پر قائم تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کا خیر خواہ تھا کیونکہ خزاعہ اور بنو ہاشم کے درمیان حلف (یعنی دوستی اور تعاون کا عہد) تھا۔ بہر کیف اس نے کہا: ''اے محمد (ﷺ)! آپ کو اور آپ کے رفقاء کو جو زک پہنچی ہے وہ واللہ ہم پر سخت گراں گزری ہے۔ ہماری آرزو تھی کہ اللہ آپ کو بعافیت رکھتا۔'' ---- اس اظہار ہمدردی پر رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ابوسفیان کے پاس جائے اور اس کی حوصلہ شکنی کرے۔

ادھر رسول اللہ ﷺ نے جو اندیشہ محسوس کیا تھا کہ مشرکین مدینے کی طرف پلٹنے کی بات سوچیں گے، وہ بالکل برحق تھا۔ چنانچہ مشرکین نے مدینے سے ۳۶ میل دور مقام ''روحاء'' پر پہنچ کر جب پڑاؤ ڈالا تو آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کی ۔ کہنے لگے: ''تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا ان کی شوکت وقوت توڑ کر انہیں یوں ہی چھوڑ دیا حالانکہ ابھی ان کے اتنے سرباقی ہیں کہ وہ تمہارے لئے پھر دردِ سر بن سکتے ہیں۔ لہٰذا واپس چلو اور انہیں جڑ سے صاف کر دو۔''

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سطحی رائے تھی جو ان لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی جنہیں فریقین کی قوت اور ان کے حوصلوں کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اسی لئے ایک ذمہ دار افسر صفوان بن امیہ نے اس رائے کی مخالفت کی اور اور کہا: ''لوگو! ایسا نہ کرو۔ مجھے خطرہ ہے کہ جو (مسلمان غزوۂ احد میں) نہیں آئے تھے وہ بھی اب تمہارے خلاف جمع ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس حالت میں واپس چلے چلو کہ فتح تمہاری ہے۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ مدینے پر چڑھائی کرو گے تو گردش میں پڑ جاؤ گے ۔'' لیکن بھاری اکثریت نے یہ رائے قبول نہ کی اور فیصلہ کیا کہ مدینے واپس چلیں گے۔ لیکن ابھی پڑاؤ چھوڑ کر ابوسفیان اور اس کے فوجی ہلے بھی نہ تھے کہ معبد بن ابی معبد خزاعی پہنچ گیا۔ ابوسفیان کو معلوم نہ تھا کہ یہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اس نے پوچھا! معبد! پیچھے کی کیا خبر ہے؟ معبد نے پروپیگنڈے کا سخت اعصابی حملہ کرتے ہوئے کہا: محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو لے کر تمہارے تعاقب میں نکل چکے ہیں۔ ان کی جمعیت اتنی بڑی ہے کہ میں نے ویسی جمعیت کبھی دیکھی ہی نہیں۔ سارے لوگ تمہارے خلاف غصے سے کباب ہوئے جا رہے ہیں۔ احد میں پیچھے رہ جانے والے بھی آ گئے ہیں۔ وہ جو کچھ ضائع کر چکے اس پر سخت نادم ہیں اور تمہارے خلاف اس قدر بھڑکے ہوئے ہیں کہ میں نے اس کی مثال دیکھی ہی نہیں۔

ابوسفیان نے کہا: ارے بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو؟

معبد نے کہا: ''واللہ میرا خیال ہے کہ تم کوچ کرنے سے پہلے پہلے گھوڑوں کی پیشانیاں دیکھ لو گے یا لشکر کا ہراول دستہ اس ٹیلے کے پیچھے نمودار ہو جائے گا۔''

ابوسفیان نے کہا: واللہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان پر پلٹ کر حملہ کریں اور ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دیں۔

معبد نے کہا: ایسا نہ کرنا، میں تمہاری خیر خواہی کی بات کر رہا ہوں۔

یہ باتیں سن کر مکی لشکر کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ ان پر گھبراہٹ اور رعب طاری ہو گیا اور انہیں اسی میں عافیت نظر آئی کہ مکے کی جانب اپنی واپسی جاری رکھیں۔ البتہ! ابوسفیان نے اسلامی لشکر کو تعاقب سے باز رکھنے اور اس طرح

Marfat.com

دوبارہ مسلح ٹکراؤ سے بچنے کیلئے پروپیگنڈے کا ایک جوابی اعصابی حملہ کیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ ابوسفیان کے پاس قبیلہ عبدالقیس کا ایک قافلہ گزرا۔ ابوسفیان نے کہا: کیا آپ لوگ میرا ایک پیغام محمد (ﷺ) کو پہنچادیں گے ؟ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس کے بدلے جب آپ لوگ مکہ آئیں گے تو عکاظ کے بازار میں آپ لوگوں کو اتنی کشمش دوں گا جتنی آپ کی یہ اونٹنی اٹھا سکے گی۔

ان لوگوں نے کہا: جی ہاں۔

ابوسفیان نے کہا: محمد (ﷺ) کو یہ خبر پہنچادیں کہ ہم نے ان کی اور ان کے رفقاء کی جڑ کاٹ دینے کیلئے دوبارہ پلٹ کر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ حمراء الاسد میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے پاس سے گذرا تو ان سے ابوسفیان کا یہ پیغام کہہ سنایا اور کہا کہ لوگ تمہارے خلاف جمع ہیں، ان سے ڈرو۔ مگر ان کی باتیں سن کر مسلمانوں کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا اور انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) (اس ایمانی قوت کی بدولت) وہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹے۔ انہیں کسی برائی نے نہ چھوا اور انہوں نے اللہ کی رضا مندی کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

صحابہؓ کا بے مثال کردار

یہ ہے ان آیات کا پس منظر جو آپ نے تفصیل سے پڑھ لیا۔ اب ان آیاتِ کریمہ کے ایک ایک جملے پر غور فرمائیں۔ سب سے پہلے جملے میں پروردگار نے صحابہ کرام کے حوالے سے دو باتوں کا اعتراف فرمایا ہے۔ پہلی یہ بات کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے یہ فرمایا کہ ہم نے قریش کے لشکر کے تعاقب کیلئے نکلنا ہے تو ان میں سے کسی شخص نے تعمیلِ حکم میں انکار تو دور کی بات ہے تساہل سے بھی کام نہیں لیا۔ بلکہ ان میں ایک ایک فرد لبیک کہتا ہوا تعمیلِ حکم کیلئے اٹھ کھڑا ہوا اور دوسری بات جس کا اعتراف فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام وہ لوگ تھے جو ایک روز پہلے زخموں سے گھائل ہو چکے تھے۔ جو ہتھیار اتار کر مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف تھے کہ ان پر دوطرفہ حملہ ہوا۔ پیادہ فوج نے ان کو تلواروں پر رکھ لیا اور سواروں نے انہیں گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا۔ بہت بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس کے باوجود یہ تاریخ کا عجیب واقعہ ہے کہ ایسی زخمی اور غم واندوہ میں دبی ہوئی فوج نے تعمیلِ حکم میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ نپولین کی جنگوں کے حالات پڑھ لیجئے، کتنی دفعہ اس کی فوج نے تنگ آکر نپولین پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ تیمور لنگ کی فوج نے اپنے ملک کی طرف واپسی کیلئے شدید اصرار کیا اور آگے بڑھنے میں پس وپیش کرتے رہے۔ سکندر کی فوج میں بھی ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ لیکن یہ عجیب خدائی فوجدار ہیں کہ بے ساکھیوں کے سہارے چل کر اپنے سے کئی گناہ طاقتور فوج کے مقابلے میں جانے کیلئے لبیک کہہ رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو دنیا میں انقلاب لانے کیلئے منتخب کرتا ہے تو اس کا ہراول دستہ ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس جذبے کے بغیر بڑی سے بڑی فوج بھی کرائے کی فوج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

Marfat.com

حکمِ خدا اور حکمِ رسول میں واجب الاطاعت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں

یہاں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ فرمایئے جو اس جملے کے بین السطور میں جھلکتی ہے۔ وہ یہ کہ قریش کے تعاقب میں نکلنے کیلئے مسلمانوں کو حکم اللہ کے رسول نے دیا تھا اللہ نے نہیں کیونکہ اس کا قرآنِ کریم میں کہیں ذکر نہیں۔ لیکن یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں لبیک کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں جس طرح قرآنِ کریم کی آیات واجب التعمیل تھیں اور قرآنِ کریم کے ایک ایک حکم پر وہ سرتاپا عمل رہتے تھے۔ یہی حیثیت ان کی نگاہوں میں اللہ کے رسول کی تھی۔ وہ اللہ اور رسول کے حکم میں کوئی فرق کرنا نہ جانتے تھے اور قرآنِ کریم نے اس رویے کی تحسین فرما کر اسے شریعت کا ایک لازمی حصہ بنا دیا اور قیامت تک ان لوگوں کیلئے کوئی موقعہ باقی نہیں رہنے دیا جو صرف قرآنِ پاک کے احکام کی اطاعت کو تو واجب اور فرض سمجھتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے احکام کی اطاعت کو سربراہِ مملکت کی اطاعت کے برابر قرار دیتے ہیں۔

حُسنِ عمل اور تقویٰ اجرِ عظیم کی ضمانت ہے

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ سے تمام وہ لوگ مراد ہیں جن کا ذکر پہلے جملے میں ہے۔ جو قریش کے تعاقب میں آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب ہیں۔ ان میں سے ایک ایک فرد احسان اور تقویٰ کی چلتی پھرتی تصویر ہے لیکن آنے والی دنیا کیلئے ان کے رویے کی تحسین کے بعد بطورِ اصول یہ بات فرمائی کہ اللہ کے یہاں صفات میں مراتب ہیں۔ لیکن وہ درجہ اور مرتبہ جو اجرِ عظیم کا مستحق ثابت ہوتا ہے وہ وہ ہے جس میں احسان بھی ہو اور تقویٰ بھی۔ احسان سے مراد یہ ہے کہ جاں نثاری اور فداکاری کے عمل کو اسقدر بہتر انداز میں بروئے کار لانا کہ ہر دیکھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ عمل کی اس سے بہتر اور خوبصورت شکل شاید ممکن نہیں۔ اپنی پوری صلاحیتوں کو اس میں نچوڑ دینا اور اخلاص میں کسی قسم کا شائبہ نہ آنے دینا اور تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ ایمان و عمل میں نفاق کی جتنی آلائشیں بھی تصور میں لائی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک آلائش سے پرہیز کرنا۔ مصلحتوں کا غبار اڑ کر بھی ایمان و عمل کی خوبصورتی کو گدلا نہ کر سکے۔ مفادات کا کوئی حوالہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ جو ایمان و عمل اس طرح نفاق کی تمام آلائشوں سے پاک ہوگا اور اس کا اخلاص عمل میں سعیِ بلیغ کی آخری حدوں کا چھونے لگے گا تو ایسے لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے صرف اجر ہی نہیں رکھا بلکہ اجرِ عظیم رکھا ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کا عظیم ہونا کہنے والے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جب غریب آدمی کسی سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں تمہیں اس کا بہت بڑا معاوضہ دوں گا۔ تو وہ معاوضہ اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ لیکن یہی بات جب کسی امیر آدمی کے منہ سے یا بادشاہ کے منہ سے نکلتی ہے تو معاوضے کی وسعت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب عبدالرحیم خان خاناں کے پاس ایک عالمِ دین بیٹھے تھے انہوں نے نواب سے کہا کہ میں نے آج تک ایک لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ نواب نے حکم دیا کہ ہمارے سامنے ایک لاکھ روپے کا ڈھیر لگا دیا جائے۔ اس زمانے میں نوٹ نہیں چاندی کے روپے چلتے تھے۔ ڈھیر لگایا گیا تو ایک ٹیلہ بن گیا۔ عالمِ دین نے تعجب سے دیکھا اور خوش ہو کر کہا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے ایک لاکھ کا ڈھیر دیکھنے کو تو ملا۔ وہ دیکھ لینے کو بھی بہت بڑی بات سمجھ رہے تھے۔ نواب نے یہ سن کر خزانچی کو حکم دیا کہ ایک لاکھ روپیہ انہیں دے دیا جائے۔ وہ لاکھ روپیہ انہیں مل گیا تو نواب نے کہا: اللہ جیسے کریم کا محض ایک لاکھ روپے

Marfat.com

دیکھ لینے پر شکر بجالانا کوئی معنی نہیں رکھتا اب آپ کو مل گیا ہے تو شکر بجالایئے تو خیر ایک بات بھی ہے۔اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی چیز کے بڑا یا چھوٹا ہونے پر اصل اہمیت کہنے والے کی ہوتی ہے۔ یہاں پروردگار جس اجر کو عظیم قرار دے رہے ہیں اس کا اندازہ بھی پروردگار ہی کر سکتے ہیں کیونکہ مخلوق کے بس میں نہیں کہ وہ پروردگار کے جود وعطا کا اندازہ کر سکے۔

صحابہ کی پامردی واستقلال

دوسری آیتِ کریمہ میں، جن اصحابِ احسان وتقویٰ کو پہلی آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے انہی کے ایک اور امتحان کا ذکر فرمایا جارہا ہے کہ یہ زخمی اور محدود تعداد میں لیکن شجاعت اور وجاہت کی علامت ابھی گھر سے نکلنے نہیں پائے یا راستے میں ہیں کہ ان تک افواہیں پہنچنا شروع ہوگئیں اس کی تفصیل آپ پس منظر میں پڑھ چکے ہیں۔لیکن الناس کے لفظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک شخص (جو ابوسفیان کا قاصد بن کر آیا تھا) نے تنہا مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ الناس کا لفظ بول رہا ہے کہ ایک بڑی تعداد تھی ایسے لوگوں کی جنہیں قریش کی طاقت اور قوت کے بارے میں مبالغہ آمیز افواہیں پھیلانے پر لگایا گیا تھا۔لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ افواہیں پھیلانے میں بے مزد بھی چاکری کرتے ہیں۔جو سنتے ہیں آگے پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ان میں کچھ لوگ تو قریش کے زرخرید ہوں گے اور کچھ لوگ اپنی عادت کے مطابق ان میں شامل ہوگئے ہوں گے نتیجتاً ایک بڑی تعداد نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی اور نجانے کیسی کیسی مبالغہ آمیز خبریں ان تک پہنچائیں۔جن کا حاصل یہ تھا کہ قریش اتنی بڑی فوج لے کر مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں جن کے مقابلے کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔پس تم ان سے ڈرو اور اپنے انجام کی فکر کرو اور ان سے ڈر کر اپنی عافیت کیلئے ان سے کوئی ایسا معاہدہ کر لو جس میں جان بچ جائے اور مدینہ کی حدود بھی محفوظ رہیں۔وہ ان تمام مساعی مذمومہ سے یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر گھٹنے ٹیک دیں گے اور ابوسفیان سے چند مراعات حاصل کرنے کیلئے کوشش کریں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس میں عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں کا بھی عمل دخل ہو۔ہم اس سے پہلے یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کے انتقال پر ملال کی خبر اڑی تو بعض لوگوں نے مخلص مسلمانوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ؟ چلو عبداللہ بن ابی کے پاس چلیں اور اسے کہیں کہ وہ ہمارا معاملہ ابوسفیان سے کرادے۔اب بھی یقیناً اسی طرح کی باتیں کی جارہی ہوں گی۔لیکن اس جذبے، جرأت اور بہادری کی مثال کہاں تلاش کیجائے کہ یہ زخمی مسلمان بجائے صورتحال سے متاثر ہونے کے اور زیادہ ثابت قدمی کی تصویر بن گئے۔ان کا ایمان جو پہلے ہی کسی کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا اب تو اور بھی روشن ہو کر روشنی دینے لگا۔اور انہوں نے وہ بات کہی جو ہمیشہ وہ لوگ کہا کرتے ہیں جنہیں اللہ پر بے پناہ یقین ہوتا ہے۔بے ساختہ ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین کارساز ہے)

ہر قوت کی ایک انتہا ہے، اللہ کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔انسانی لشکر بہت مختصر ہیں، اللہ کے لشکروں کا کوئی شمار نہیں۔حوصلہ اور ولولہ حالات دیکھ کر بنتا اور بگڑتا ہے۔لیکن جن لوگوں کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا راستہ بحرِ قلزم نے روک لیا اور خبر ملی کہ فرعون اور اس کی فوجیں سر پر پہنچا ہی چاہتی ہیں۔بنی اسرائیل چیخ اٹھے کہ اب ہمارے پکڑے جانے اور تباہی اور بربادی میں کیا دیر ہے۔لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اللہ پر بھروسے کی علامت تھے پوری قوت سے دھاڑے:

Marfat.com

كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنَ (ہرگز نہیں! بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے بحرِ قلزم کی موجوں میں بھی راستہ دے گا)

یہی جذبہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں بھی تھا۔ حالات کچھ اور کہہ رہے ہیں لیکن ان کا ایمان صرف ایک زبان جانتا ہے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے، جس کی کارسازی وہ کرتا ہے اور جس کا پشت پناہ وہ بن جاتا ہے اسے دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ صحابہ ہراساں ہونے کی بجائے پہلے سے زیادہ عزیمت واستقلال کا پیکر بن کر اٹھے۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو جب یہ خبر پہنچی کہ ہماری افواہیں پھیلانے اور مسلمانوں کے زخمی ہونے کے باوجود بجائے اس کے کہ مسلمان حوصلہ ہارتے اور کسی کمزوری کا اظہار کرتے ان کی ایمانی قوت کا عالم تو یہ ہے کہ وہ تو ہمارے تعاقب میں چل پڑے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو یہ سمجھتے تھے کہ وہ کمزور پڑ گئے ہیں، وہ کمزور نہیں ہوئے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ وہ تو مصائب کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے ہیں۔ تو ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے یہی مناسب سمجھا کہ جو فتح میسر آ گئی ہے اسی کو غنیمت سمجھا جائے۔ اور زیادہ کی خواہش میں پہلی عزت بھی نہ گنوادی جائے۔ چنانچہ قریش کا لشکر بجائے مدینہ کی طرف آنے کے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا مسلمان حمراء لاسد تک پہنچے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ دوشنبہ، منگل اور بدھ یعنی ۹، ۱۰، ۱۱ شوال تک وہیں مقیم رہے۔ قرب وجوار کی بستیوں او رقبائل سے بھی لوگ پہنچے اور عربوں کی روایت کے مطابق وہاں ایک بازار لگ گیا اور تجارت شروع ہو گئی۔ چنانچہ مسلمانوں نے تین دن تک خوب تجارت سے فائدہ اٹھایا اور قرب وجوار کی بستیوں میں خود بخود یہ پیغام پہنچ گیا کہ مسلمان زخمی ضرور ہیں لیکن کمزور نہیں۔ وہ زخمی شیر کی طرح پہلے سے زیادہ دشمن کیلئے خطرناک ہو گئے ہیں۔ اسی کو اگلی آیتِ کریمہ میں پروردگار نے فرمایا کہ تین چار روز کے بعد مسلمان مدینہ طیبہ کو واپس لوٹے اور ان تین چار دنوں میں اللہ کی نعمت اور اس کے احسان سے خوب فائدہ اٹھایا اور کسی قسم کی تکلیف اور ناگواری سے انہیں کوئی سابقہ پیش نہیں آیا۔ اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اللہ کی رضا کو اپنی منزل بنالیا تھا تو جو قوم اللہ کی رضا کو اپنی منزل بنالیتی ہے اور وہی اس کا مقصد ومنہاج بن جاتا ہے وہی اس کا ہدف ٹھہرتا ہے اور وہ اسی کیلئے جیتی اور مرتی ہے تو اللہ کبھی انہیں مایوس نہیں ہونے دیتا۔ اللہ بڑے فضل والا ہے، اس کے یہاں فضل وانعام کی کوئی کمی نہیں۔ دنیا کے پاس سوائے جھوٹے بہلاووں کے اور کیا رکھا ہے۔ جس نے اس راز کو پالیا اس کی زندگی پر ناکامی کے سائے نہیں لہراتے۔

مومن صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے

اگلی آیتِ کریمہ میں ایک ایسی بات فرمائی گئی ہے جو حق وباطل کے معرکے میں نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ دشمن کبھی اپنی افرادی قوت اور کبھی اپنے وسائلِ جنگ سے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دشمن کے یہ حربے دراصل شیطان کی چالیں ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی طرح مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی ہر چال اور اس کی ہر تدبیر پیشاب کے اٹھتے ہوئے جھاگ کی طرح بظاہر اٹھتا ہوا طوفان دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت سوائے شیطان کی تدبیر کے اور کچھ بھی نہیں اور شیطان کی تدبیر اصحابِ ایمان کے سامنے مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ہے۔ اس لئے جب بھی کبھی کفر کی قوتوں سے سابقہ پیش آئے تو مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے امکان کی حد تک تیاری کریں اپنے گھوڑے تیار رکھیں، مناسب تدبیر سے گریز نہ کریں۔ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ دلوں کے کسی

Marfat.com

گوشے میں خوف کے سائے کو کبھی اترنے نہ دیں۔ دشمن سے ڈرنے کی بجائے ڈر صرف اللہ کا ہونا چاہئے کہ میرے کسی عمل یا میری کسی کوتاہی سے اللہ کے احکام کی تعمیل میں کمی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ ہر طرح کی صورتحال کے مطابق اللہ کے احکام کو سمجھ کر اس کی اطاعت و بندگی میں لگ جانا اور لگے رہنا یہ ایک مومن کی ذمہ داری ہے۔ رہی راستے کی مشکلات تو ان کے لئے وسائل فراہم کرنا یہ بھی ایک مومن کا فریضہ ہے۔ لیکن اس کے بعد بھروسہ اور توکل صرف اللہ پر ہونا چاہئے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ مومن کبھی اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا (وسائل اگر ہوں تو وسائل کو اپنے ساتھ لیتا ہے۔ لیکن وسائل میں کمی اس کے دل میں ہیجان کا باعث نہیں بنتی) وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ پر ایمان سب سے بڑی قوت ہے۔ اگر میں مومن ہوں تو پھر غیر اللہ سے ڈرنا زیب نہیں دیتا۔ اس لیئے یہاں زور دے کر فرمایا کہ کافروں سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو یعنی مومن کیلئے یہ رویہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کافر اسے بیشک ڈرائے کہ ہم تمہیں تباہ و برباد کر دیں گے، تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، تمہارا ملک تباہ کر دیا جائے گا، تمہارے ملک کو غاروں میں تبدیل کر دیا جائے گا، تمہیں پتھر کے دور میں داخل کر دیا جائے گا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایک ہی جواب ہونا چاہئے کہ مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور کسی کے ظلم کے سامنے جھکتا بھی نہیں۔ وہ شیخی نہیں بگھارتا لیکن شیخی بگھارنے والوں کے سامنے ریشہ ختمی بھی نہیں بنتا۔ یہی وہ حقیقی قوت ہے جو سب سے بڑا ہتھیار ہے (اقبال نے اس ہتھیار کے بعد ہر ہتھیار سے بے نیاز ہو جانے کی بات کی ہے) لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ وسائل کی فراہمی بھی جائز حد تک امت پر فرض ہے۔ لیکن حوصلے اور امنگیں صرف اللہ کے ساتھ توانا ہوتی ہیں۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(نہ غمگین کریں آپ کو وہ لوگ جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، ان کیلئے بڑا عذاب ہے ○ بے شک جن لوگوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے) (۱۷۶ تا ۱۷۷)

حالات کی دگرگونی کے باوجود آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو التفاتِ خصوصی سے نوازا گیا ہے اور تسلی دی گئی ہے کہ جنگِ احد کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی ہے آپ اس سے ہرگز غمگین نہ ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے جنگِ بدر کے بعد نفاق کا نقاب اوڑھ لیا تھا انہوں نے نقاب الٹ دیا ہے۔ اب وہ اعلانیہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہیں بلکہ آیت کے اسلوب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف ان کی تگ و دو صرف مدینہ تک محدود نہیں بلکہ وہ قریش اور دوسرے مسلمان دشمن قبائل سے رابطے میں

Marfat.com

ہیں اور وہ برابر انہیں اکسا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی طاقت کو جنگِ احد میں بہت نقصان پہنچا ہے یہ موقعہ ہے کہ مسلمانوں پر کاری ضرب لگائی جائے اور انہیں سنبھلنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جس کا اعجاز اور جس کی تاثیر بے مثال ہے۔ اس کا سننے والا مشکل سے ہی اپنے آپ پر قابو رکھ سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کی دلآویز شخصیت اور آپ کی تبلیغ و دعوت اپنے اندر اپیل کی وہ شان رکھتی ہے کہ جس سے عہدہ برآہ ہونا کفار کیلئے آسان نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہ تھی کہ جو کرنا ہے وہ جلدی کیا جانا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کو جتنا موقعہ ملے گا وہ اتنا ہی لوگوں پر اثر انداز ہو کر اپنی افرادی قوت بڑھاتے چلے جائیں گے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ کفر کی ساری قوتیں بھی ان کے سامنے بے بس ہوں گی۔ آنحضرت ﷺ ان کی اس دوڑ بھاگ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی مساعی مذمومہ اور اسلام دشمنی کیلئے بے چینی آپ کے سامنے تھی۔ اس لئے اس کا دل پر اثر ہونا ایک ناگزیر بات تھی۔ پیغمبر کا دل تو ایک آئینہ ہوتا ہے، حالات کی ہر لہر اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ انسانوں کا ایمان سے دور رہنا پیغمبر کیلئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں رحمت بن کر آیا ہے۔ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ کوئی شخص جہنم کے راستے کا مسافر نہ رہے۔ لیکن جب لوگ ان کے اخلاص، وفا کوشی، لوگوں کیلئے ہمدردی و خیر خواہی اور ایمان کیلئے ان کی تڑپ سے متاثر ہونے کی بجائے کفر کی قوتوں کو توانا کرنے میں دوڑ بھاگ میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ تو ان کا دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے پروردگار نے مداخلت فرمائی اور آپ کو تسلی دی کہ یہ لوگ جو کرتے ہیں انہیں کرنے دیجئے ان کے رویے کو آپ اپنے دل کا روگ مت بنائیے۔ یہ لوگ ہزار کوشش کریں اللہ کا، آپ کا اور اس کے دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ان لوگوں نے چونکہ آپ کے ساتھ دشمنی اور منافقت میں انتہا کر دی ہے اور حالات کے ساتھ مسلسل اپنا بہروپ بدلتے رہتے ہیں اس لئے پروردگار ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ آخرت میں انہیں بھی اللہ کی رحمت سے کچھ حصہ ملے چنانچہ ان کیلئے عذابِ عظیم کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان میں بطورِ خاص وہ لوگ جو اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے رہے لیکن جیسے ہی حالات نے پلٹا کھایا تو انہوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دینا ضروری سمجھا اور ایمان سے نکل کر کافر ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ شائد یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ طرزِ عمل اللہ کو یعنی اسلامی قوتوں کو نقصان پہنچائے گا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ نے ان کیلئے دردناک عذاب کا فیصلہ کر دیا ہے اب وہ کسی رعائت کے مستحق نہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں ان کیلئے بہتر ہے، ہم تو اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کیلئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے) (۱۷۸)

کفار کو وارننگ

انسان میں اللہ نے بہت سی خوبیاں اور صلاحیتیں رکھی ہیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ حیوانیت سے پہلو بچا سکے کیونکہ اس کے اندر قدرت نے ایک حیوان بھی بٹھا رکھا ہے۔ اسے اگر انسانی صفات کا جامہ نہ پہنایا جائے یا اگر اس کی انسانی صفات کو اجاگر کرنے کیلئے ایمان کی پابندیاں نہ لگائی جائیں تو یہ کبھی بہیمانہ حرکتوں سے باز نہیں آتا اور ہمیشہ حیوانی فطرت کے مطابق اپنے اعمال

Marfat.com

بروئے کار لاتا ہے۔ آپ کسی بھی حیوان کو دیکھئے اگر آپ اس کے گلے میں رسہ ڈال کر رکھیں گے یا چابک آپ کے ہاتھ میں رہے گا تو وہ آپ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہے گا۔ لیکن اگر آپ اسے کھیت میں کھلا چھوڑ دیں گے تو وہ پورے کھیت کو ویران کر دے گا۔ یہ حیوانیت یقیناً انسان میں موجود ہے اور اکثر اس کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ حیوان کو اللہ تعالیٰ نے جوہرِ عقل جیسی نعمت عطا نہیں فرمائی اور اسے خیر و شر کے معاملے میں وحیِ الٰہی کے نور سے بھی بہرہ ور نہیں فرمایا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ دو نعمتیں دے کر مکلف زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ معقولات میں عقل سے کام لے کر حیوانیت کے تقاضوں کو صحیح نہج دینے کی کوشش کرے اور جو معاملات بالائے عقل یا اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ان کیلئے وحیِ الٰہی کی راہنمائی قبول کرنے کا پابند ٹھہرایا۔ پھر مختلف وقتوں میں اپنے رسول بھیج کر اس راہنمائی کی ترغیب کا سامان کیا تاکہ انسانوں کیلئے اسے قبول کرنا آسان ہو جائے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اللہ کریم کی یہ تمام عنایات دھری رہ جاتی ہیں اور انسان اپنی بہیمانہ فطرت پر زندگی گزارنے پر اصرار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اس لئے سزا نہیں دیتے کہ ممکن ہے کبھی وہ راہِ راست اختیار کر لے اسے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا موقعہ ملنا چاہئے۔ پیغمبر بار بار انہیں ہدایت کی طرف لانے کی کوشش جاری رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں تنبیہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انسان جب دیکھتا ہے کہ میرے رویے پر منجانب اللہ کوئی قدغن عائد نہیں کی جا رہی اور میری بدعنوانیوں پر میری گرفت بھی نہیں ہو رہی تو وہ اس سے یہ سمجھتا ہے کہ میرا رویہ بالکل صحیح ہے ورنہ قدرت کیلئے کیا مشکل تھا کہ مجھے زبردستی اس سے روک دیا جاتا۔ اس آیتِ کریمہ میں اور دیگر مواقع پر بھی قرآنِ کریم نے جابجا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل قرار دیا ہے کہ ہم پکڑنے میں اس لئے جلدی نہیں کرتے کہ جنہیں راہِ راست پر آنا ہے انہیں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا موقعہ دیں اور جنہیں بہر صورت غلط راستے پر ہی چلنا ہے ہم انہیں بھی مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ گناہ کرنے اور اللہ کی نافرمانی کرنے میں جہاں تک جا سکتے ہیں چلے جائیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کوئی کمزور حکمران نہیں کہ اسے یہ اندیشہ ہو کہ اگر ان باغیوں کو جلدی نہ پکڑا گیا تو یہ مضبوط ہو جائیں گے اور پھر انہیں پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔ اللہ کی طاقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور اس کی مملکت کی حدود سے کون نکل سکتا ہے؟ جو بھی گناہ پر اصرار کرے گا یا باغیانہ روش پر بڑھتا چلا جائے گا وہ اپنا ہی پیمانہ بھرے گا اور اپنی فائل کو اتنا ضخیم کر لے گا کہ قیامت کے دن پھر اس کیلئے عذر کا کوئی موقعہ نہیں ہو گا۔ یہاں وہ اپنی جن حرکتوں کو عزت و افتخار کی علامت سمجھتا رہا ہو گا وہی اس کیلئے توہین آمیز عذاب بن جائیں گی۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

(اللہ تعالیٰ کی (یہ سنت) نہیں کہ وہ چھوڑے رکھتا مومنوں کو اس حال پر جس پر تم تھے جب تک الگ الگ نہ کر دے پلید کو پاک سے اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہیں غیب پر آگاہ کر دے۔ البتہ! اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے) (۱۷۹)

Marfat.com

احد کے حادثے کی حکمتِ الٰہی

آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی انسانی دنیا کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ تک کی طرف سے اصلاح کی کوششوں کی آخری کڑی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ کی امت کے بعد کوئی امت نہیں آئے گی۔ آپ پر نازل ہونے والی کتاب کے بعد کوئی کتاب نہیں آئے گی اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دنیا کو گمراہی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے جبکہ بر و بحر میں فساد غالب آگیا ہے۔ اتنے بڑے کام کی بجا آوری اور اتنے عظیم انقلاب کے برپا کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک ایسی مضبوط جماعت کی ضرورت تھی جس جماعت کا ایک ایک فرد اخلاص اور تقویٰ میں کامل ہوتا۔ وہ باہمی فکری ہم آہنگی میں اس حد تک مضبوط ہوتے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے اور ان سے ٹکرانا کفر کی طاقتوں کیلئے آسان نہ ہوتا۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس جماعت کا یہ حال ہوتا کہ نہ ان میں فکری ہم آہنگی ہوتی، نہ دلوں میں اخلاص ہوتا اور نہ عمل میں وحدت ہوتی تو بے شک ان کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہوجاتی لیکن وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے دین پر مبنی صالح انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔

اللہ کا نبی جب لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتا ہے تو جیسے جیسے حالات آگے بڑھتے ہیں ویسے ویسے مومن اور کافر کے علاوہ ایک تیسرا عنصر بھی پیدا ہونے لگتا ہے جو حالات کے تیور پہچان کر اپنی وابستگیوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر اپنا رخ بدلتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہیں منافق کہا جاتا ہے۔ ہر نظریاتی جماعت میں جو دنیا کو بدلنے کیلئے اٹھتی ہے بہت کم ایسا ہوتا کہ اس طرح کے لوگ نہ پائے جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد موجود تھی اور جنگِ احد کے پہلے مرحلے میں اس کا اظہار بھی ہوگیا۔ مسلمانوں کی یہ جماعت جو دنیا کے سب سے نازک اور کٹھن کام کیلئے اٹھی تھی اگر اس تیسرے گروہ سے محفوظ نہ ہوتی تو وہ مارِ آستین کی مانند انہیں کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے تھے کیونکہ جس قوم میں منافق اور غدار ہوتے ہیں وہ قوم قلعوں کی مالک بھی ہو تو اس کا کوئی قلعہ محفوظ نہیں ہوتا۔ چنانچہ مسلمانوں کی حیثیتِ ملی کو دیکھتے ہوئے یہ بات ازبس ضروری تھی کہ ان کی صفوں کو ایسی ہر آلائش سے پاک کردیا جائے اور مسلمانوں میں سے ایک ایک فرد کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے دائیں بائیں لڑنے والا سپاہی کس کا ہے اور اس پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس تطہیری عمل کی دو صورتیں ممکن ہوسکتی تھیں ایک تو یہ کہ ہر مسلمان کو غیبی طور پر یہ بتادیا جاتا کہ تمہاری جماعت اور معاشرے میں فلاں فلاں شخص منافق ہے اس پر اعتماد کی غلطی نہ کرنا۔ دوسرے لفظوں میں ہر مسلمان کو غیب کا علم دے دیا جاتا۔ ظاہر ہے یہ طریقہ اللہ کی سنت کے مطابق نہیں۔ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے اسی کا علم ذاتی اور کلی ہے۔ انسانوں کو حصولِ علم کے کئی ذرائع بخشے گئے ہیں وہ انہی سے کام لینے کا مکلف ہے۔ لیکن غیب کا علم اسے نہیں بخشا گیا اگر ایسا علم اسے بخشا جاتا تو یہ جماعت میں تفریق اور انتشار کا باعث بن جاتا۔ البتہ! مغیبات کا علم ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو عطا کرتا ہے کیونکہ اللہ اور پیغمبر کے درمیان جو علم اور اعتماد کا رشتہ ہے اور جس کے نتیجے میں پیغمبر دنیا کی ہدایت کیلئے آتا ہے اور وہ ہدایت کو جس طرح یقین اور ایمان کی قوت سے پیش کرتا ہے اور انسانوں میں یقین اور اذعان کی نعمت کو جس طرح عام کرتا ہے وہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے اللہ کے ساتھ ایسا تعلق نہ رکھتا ہو۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو علم کا بحرِ زخار بخشا ہے۔ اس معاملے میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ لیکن اس علم کو قرآنِ کریم نے اطلاع علی الغیب یا اظہار علی الغیب کے

Marfat.com

نام سے تو یاد کیا ہے علمِ غیب کے نام سے یاد نہیں کیا کیونکہ علمِ غیب کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ذاتی ہو کسی ذریعے اور واسطہ سے نہ ہو۔ کوئی اس کا عطا کرنے والا نہ ہو اور دوسری یہ بات کہ کلی ہو جزئی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جو علم دینا چاہیں جس کی ضرورت سمجھیں وہ عطا فرمادیں لیکن اپنے طور پر علمِ غیب کے خزانوں تک رسائی یہ صرف اللہ کی شان ہے۔ شیخ سعدیؒ مرحوم نے اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح فرمایا ہے۔

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند ۔۔۔ کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی ۔۔۔ چرا در چاہِ کنعانش ندیدی
بگفت احوالِ ما برقِ جہانست ۔۔۔ دم پیدا و دیگر دم نہانست
گہے بر طارِ اعلیٰ می نشینیم ۔۔۔ گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم
اگر درویش بر حالے بماندے ۔۔۔ سرِ دست از دو عالم برفشاندے

(مفہوم یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ جناب والا! آپ کے صاحبزادے یوسف علیہ السلام کا پیراہن مصر سے چلا تو آپ کو اپنے گھر میں اس کی خوشبو آ گئی۔ لیکن کنعان کے کنویں میں جو چند میل کے فاصلے پر تھا آپ کو پتہ نہ چل سکا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا حال تو بجلی کی مانند ہے ادھر چمکتی ہے ادھر ڈوب جاتی ہے۔ کبھی تو ہمیں بلند بالاخانے پر بٹھا دیا جاتا ہے کہ ہم دنیا کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر درویش کو ایک ہی حالت پر رکھا جاتا تو وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہ رہتا۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہے ضرورت کے مطابق وہ ہر علم سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ساری دنیا سے الگ ممتاز اور بے مثل ہوتا ہے۔ اللہ کے مقابلے میں اس کا علم اتنا بھی نہیں جتنا سمندر کے مقابلے میں قطرہ۔ لیکن باقی مخلوق کے مقابلے میں وہ بحرِ ناپیدا کنار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس علم کو علمِ غیب کے نام سے قرآنِ کریم نے یاد کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ:

لا اقول لکم انی اعلم الغیب (میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں)

اور دوسری جگہ فرمایا کہ "غیب کا علم صرف اللہ جانتا ہے" اس لئے **سعدی علیہ الرحمۃ** نے کہا:

علم غیبے کس نمی داند بجز پروردگار
ہر کسے گوید کہ می داند ازو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرائیل
جبرائیل ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے کردگار

(اللہ کے سوا علمِ غیب کوئی نہیں جانتا، جو کہے جانتا ہے اس کا یقین نہ کرو کیونکہ مصطفیٰ ﷺ بھی کچھ نہیں فرماتے جب تک حضرت جبرائیل وحی لے کر نہیں آتے اور جبرائیل بھی کچھ نہیں کہتے جب تک اللہ تعالیٰ ارشاد نہیں فرماتے۔)

Marfat.com

مختصر یہ کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو تمام وہ علوم بخشے گئے جو آپ کی شان کے لائق تھے اور جن کی آپ کے فریضۂ منصبی کیلئے ضرورت تھی اور اس لحاظ سے کوئی آپ کی مثل نہیں۔ لیکن یہ آپ کا علم جس کی وسعتوں کو ہم نہیں جانتے علمِ غیب نہیں ہے۔ علمِ غیب صرف اللہ کی صفت ہے۔ عالم الغیب صرف اسی کو کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اصطلاحی بحث ہے جو شخص آنحضرت ﷺ کے علم کا انکار کرے وہ غلط ہے اور جو آپ کے علم کو علمِ غیب قرار دے وہ بھی غلط ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں۔ جزئی ہے کلی نہیں۔ انسانوں میں آپ جیسا کوئی نہیں اور اللہ کی شان سب سے بالا اور بلند ہے وہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔

انسانوں کو غیب کا علم دینا چونکہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے اس لئے مسلمانوں کی پاکیزہ جماعت کو منافقین سے الگ کرنے کیلئے ایک ہی شکل باقی تھی کہ ایک ایسا معرکہ کارزار بپا ہوتا جس میں زرِ خالص الگ ہو جاتا اور کھوٹ الگ نکل جاتا۔ مخلصین پہچانے جاتے اور منافقین چھٹ جاتے چنانچہ جنگِ احد ایک ایسا ہی معرکہ تھا جس نے اس تلچھٹ کو الگ کر دیا۔ خالص سونا باقی رہ گیا اور کھوٹ اور ہر طرح کی ملاوٹ والی چیز خود بخود الگ ہو کر پہچانی گئی۔ جنہیں خلعتِ شہادت سے نوازا گیا ان کی عزت میں چار چاند لگے اور جنہیں باقی رکھا گیا ان کے سر پر اسلامی انقلاب کا تاج سجایا گیا۔ منافقین میں سے بہت سوں کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی اور جو نفاق پر قائم رہے وہ ذلیل اور رسوا ہو کر طبعی موت مرے یا وطن چھوڑ گئے۔ آخر میں فرمایا کہ تمہارا کام اللہ کے ہر فیصلے پر یقین رکھنا اور اسے تسلیم کرنا ہے اور اس امتحان کی برکات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ اگر تم نے ایمان و تقویٰ کے ان تقاضوں کو سمجھا اور ان کو بروئے کار لانے میں اپنی صلاحیتوں کو جھونک دیا تو تمہارے لئے اجرِ عظیم ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی خوشخبری نہیں ہو سکتی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

(گمان نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو ان کو اللہ نے اپنے فضل سے عطا کی ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کریں گے ان کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے) (۱۸۰)

بخل بھی نفاق کی طرح اسلامی قافلہ کیلئے نقصان دہ ہے

نفاق کا مرض جس طرح انسان کو اخلاص تقویٰ اور جہادی روح سے محروم کر دیتا ہے اسی طرح اس کے اندر مال و دولت کی محبت بڑھ جانے کے باعث اسے بخیل بھی بنا دیتا ہے چونکہ اللہ سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے اس لئے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے میں قسم قسم کے اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ایسا شخص سوچتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے اگر میں نے اسے خرچ کر ڈالا پھر میرا کیا ہوگا؟ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ پہلے بھی اسے اللہ نے عطا کیا ہے اور آئندہ بھی اس کے خزانے بند نہیں۔ آدمی چونکہ اکتسابِ مال کیلئے محنت کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس مال

Marfat.com

و دولت میری محنت کا نتیجہ ہے لیکن اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ محنت کا جذبہ، محنت کا موقعہ اور محنت کے وسائل کس نے مہیا کئے۔ یہ سب کچھ یقیناً اللہ کا عطا کردہ ہے تو اس کے عطا کیے ہوئے مال میں سے اسی کے راستے میں خرچ کرنے میں بخل ایک بڑی جسارت ہے اور ساتھ ساتھ ایک بڑا جرم۔ اس لئے فرمایا گیا کہ قیامت کے دن تمہارا جمع کیا ہوا مال سانپوں اور بچھوؤں کی شکل میں تمہارے گلے میں طوق کی شکل میں ڈال دیا جائے گا اور تمہیں بتایا جائے گا کہ یہ ہے تمہارا وہ مال جسے تم خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ مزید یہ فرمایا گیا کہ بخیل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال بچا کر رکھیں گے وہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے گا حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ تمہاری زندگی چند روزہ ہے کوئی پتہ نہیں کب بلاوا آجائے اور خود زمین اور اس کے بسنے والے بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے اور آسمان کی چھت بھی ہمیشہ تنی نہیں رہے گی۔ ایک دن سب کو فنا ہونا ہے اور جو کچھ یہاں ہے اس کا اصل مالک اللہ ہے اور زمین و آسمان کی میراث اسی کی ملکیت ہے تو تم آخر مال و دولت کو بچا کر کہاں لے جاؤ گے؟ ان میں سے ہر چیز اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والی ہے۔ انسانوں کو بطورِ امانت ہر چیز بخشی گئی ہے اور اسی میں انسان کا امتحان ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کیا حقوق و فرائض میں خرچ کرتا ہے یا اسے روک روک کر رکھتا ہے۔ جو شخص اس امتحان میں ناکام رہے گا وہ قیامت کے دن اس کی سزا پائے گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس کا مال اس کی گردن کا طوق بن جائے گا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا

اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ
الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ۚ
اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى
يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ
الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ

Marfat.com

النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ
الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى
كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾
وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِھِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ
بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع

رکوع: ۱۹۔ اللہ نے سن لی ہے ان لوگوں کی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں ہم لکھ رکھیں گے ان کی بات اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتلِ انبیاء کو بھی اور ہم کہیں گے اب چکھو آگ کا عذاب ○ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی ہی کرتوت ہے اللہ تعالیٰ بندوں کیلئے ظالم نہیں ○ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ نے ہم سے اقرار لیا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جس کو کھانے کیلئے آگ اترے۔ ان سے کہیے کہ تمہارے پاس مجھ سے پہلے کئی رسول آئے کھلی نشانیاں لے کر اور اس معجزہ کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے انہیں قتل کیوں کیا اگر تم سچے ہو ○ پس اگر وہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں) تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے۔ جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے ○ ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم قیامت کے دن پورے پورے اجر دیئے جاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچایا گیا اور جنت

Marfat.com

میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے O تم اپنے مالوں اور جانوں کے بارے میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور تم ضرور سنو گے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ عزیمت کے احوال میں سے ہے O اور یاد کرو جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے پھیلاؤ گے، اسے پوشیدہ نہیں رکھو گے مگر انہوں نے کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں O تم گمان نہ کرو ان لوگوں کو جو اتراتے پھرتے ہیں اپنی کرتوتوں پر اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انہوں نے نہیں کیے ہیں۔ ان کو عذاب سے بری مت سمجھو، حقیقت میں ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے O اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (۱۸۱ تا ۱۸۹)

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَاقَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ O ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ O

(اللہ نے سن لی ہے ان لوگوں کی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں ہم لکھ رکھیں گے ان کی بات اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتلِ انبیاء کو بھی اور ہم کہیں گے اب چکھو آگ کا عذاب O یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی ہی کرتوت ہے اللہ تعالیٰ بندوں کیلئے ظالم نہیں) (۱۸۱ تا ۱۸۲)

حق و باطل کی کشمکش میں جذبۂ انفاق بھی ضروری ہے

میں اس سے پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ حق و باطل کی کشمکش میں ہر دور کے مسلمانوں میں جس طرح جذبۂ سرفروشی اور جذبۂ جہاد ضروری ہے کیونکہ اس جذبہ کے بغیر حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی ممکن نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جذبۂ جہاد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں جذبۂ انفاق بھی ہو کیونکہ کوئی جنگ مصارفِ جنگ کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوتی۔ آج جبکہ ریاستیں اور حکومتیں مستحکم ہیں اور پھر ہر ریاست کے پاس مستقل ایک بڑی تعداد میں تنخواہ دار فوج بھی ہوتی ہے اس کے باوجود جب جنگ چھڑتی ہے تو قوم اگر فوجی مصارف کی ادائیگی میں تعاون نہ کرے اور اپنی فوج کی پشت پناہی کا فرض انجام نہ دے تو وہ ریاست کبھی جنگ میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں تو اسلامی ریاست نئی نئی وجود میں آئی تھی جس کا ابھی تک بیت المال مستحکم نہیں ہوا تھا۔ کوئی تنخواہ دار فوج موجود نہ تھی جب بھی جنگ کی صورتحال پیدا ہوتی اسی وقت سپاہی بھرتی ہوتے اور اسی وقت مصارفِ جنگ کی فراہمی کا انتظام کیا جاتا۔ اگر مسلمانوں میں جذبۂ جہاد نہ ہوتا تو لڑنے والے سپاہی کہاں سے آتے اور اگر جذبۂ انفاق نہ ہوتا تو مصارفِ جنگ کہاں سے پورے ہوتے؟ گزشتہ آیات میں جنگِ احد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروردگار نے پہلے ان کوتاہیوں کی نشاندہی کی جن سے جذبۂ جہاد متاثر ہوسکتا تھا پھر بخل کی مذمت فرمائی کیونکہ بخل کی موجودگی میں جذبۂ انفاق پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

Marfat.com

منافقین اللہ کی عظمت سے بے بہرہ ہیں

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ جو منافقین جذبۂ جہاد سے عاری ہیں وہی جذبۂ انفاق سے بھی تہی دامن ہیں اوران دونوں خوبیوں سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ خداوندِ ذوالجلال کی عظمت سے بھی جاہل اور غافل ہیں۔ان کے پیش رو یہودی جن میں متذکرہ بالا دونوں عیوب موجود تھے، توراۃ گواہی دیتی ہے کہ ان کی جسارتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ وہ بارگاہِ رب العالمین میں گستاخی کرتے ہوئے گھبراتے نہیں تھے اور یہ منافقین بھی جو مسلمانوں میں موجود ہیں یہ یا تو یہودہی سے نکل کر آئے ہیں اور یا ان سے میل جول کی وجہ سے ان کی خباثتوں کے امین ہیں۔اس لئے یہ بھی ایسی باتیں کررہے ہیں جو اس سے پہلے یہود کرتے تھے۔چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا اور اللہ کے راستے میں بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے کی تلقین فرمائی تو اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے بھی اور آنحضرت ﷺ نے بھی یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ مسلمانو! اللہ تم سے قرض مانگتا ہے۔اس اسلوب سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی سے قرض لیتا ہے تو اس کا مفہوم طے شدہ ہے کہ اسے وعدے کے مطابق وقتِ مقررہ پر ادا بھی کرنا ہے اور اگر ادا نہ ہو تو قرض دینے والے کا حق ہے کہ وہ مطالبہ کرے۔اس طرح سے ہر قرض دینے والا اپنے اللہ سے اس قدر قریب ہوجاتا ہے کہ جس سے زیادہ قربت کا تصور بندے اور اللہ کے درمیان نہیں ہوسکتا۔لیکن یہود نے بجائے حقیقی مفہوم سمجھنے کے اس کا مذاق اڑایا کہ قرض چونکہ غریب آدمی مانگا کرتا ہے اور قرض دینے والا ہمیشہ امیر آدمی ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل اللہ میاں غریب ہوگئے ہیں اور ہم امیر ہیں، اس لئے پروردگار ہم سے قرض مانگ رہے ہیں۔اسی طرح کی باتیں منافقین نے بھی کیں کیونکہ یہ انہیں کے پروردہ اور انہی کی زبان بولنے والے لوگ تھے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی طرف سے ایسے واقعات ظہور میں آئے کہ جس سے آج بھی ایمان میں گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔

ابولدحداح ایک صحابی ہیں انہیں جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے قرض مانگا ہے اور آنحضرت ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان نے اس کا اعلان فرمایا ہے تو وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ سرکار میں نے سنا ہے اللہ نے ہم ناچیز بندوں سے قرض مانگا ہے۔آپ نے فرمایا: ہاں۔پوچھا: حضور اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت۔ابولدحداح نے کہا: حضور ہاتھ آگے بڑھائیے۔آپ نے ہاتھ بڑھایا۔انہوں نے اپنا ہاتھ حضور کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے عرض کیا کہ میرے پاس دو باغ ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں دونوں ہی نذر کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے فرمایا: نہیں۔اس پر وہ بولے کہ میرے دو باغوں میں سے ایک بڑا ہے اور زیادہ قیمتی ہے دوسرا چھوٹا ہے۔میں بڑا باغ آپ کو گواہ بنا کر اللہ کو قرض دیتا ہوں۔پھر اجازت لے کر اٹھے تو باغ کے کنارے پر کھڑے ہوکر اپنی بیوی کو آواز دی کہ بچوں کو لے کر باہر آجاؤ۔انہوں نے حیران ہوکر کہا کہ آپ اندر کیوں نہیں آتے؟ انہوں نے کہا: میں اپنا باغ، اپنا گھر اور گھر میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کو قرض دے چکا ہوں۔اس لئے تم بچوں کو لے کر نکل آؤ، اب اس پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔اس پر وہ جنتی خاتون بولیں کہ دحداح کے باپ آپ نے بہت اچھا سودا کیا، اس سے بہتر سودا ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن منافقین چونکہ اس جذبے سے عاری تھے بلکہ اس کے بالمقابل ان کے اندر دوسرے جذبات پرورش پاچکے تھے انہوں نے مذاق اڑایا۔ایک بدچلن اور اوباش آدمی کا مذاق جواب کے قابل نہیں ہوتا۔اس لئے پروردگار نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔البتہ! اس پر نہایت اختصار سے ایک بات فرمائی جو بلاغت کی شاہکار ہے اور جس کے اندرون میں اللہ کا جو غضب مضمر ہے اسے محسوس کرتے ہوئے پتہ پانی ہونے

Marfat.com

لگتا ہے۔فرمایا: ''ان منافقین نے جو کچھ کہا ہم اس کو لکھ رکھیں گے''۔لکھ رکھنے کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ ان کی یہ یاوہ گوئی اگر چہ جواب کے قابل نہیں لیکن نظر انداز کرنے کے بھی قابل نہیں۔ یہ دنیا دار العمل ہے سزا کی جگہ نہیں۔اس لئے ان کی یہ فائل اس وقت نکالی جائے گی جب یہ جواب دہی کیلئے اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور مزید فرمایا کہ ہم نے ان کے صرف اسی جرم کو نہیں لکھا بلکہ ان کے پیش رو جن کے تربیت یافتہ اور جن کی اولا دیں آج قوم کو ایسی جسارتیں دے رہی ہیں ان کے اس عمل کو بھی ہم لکھ رکھیں گے جو انہوں نے ناحق نبیوں کے قتل کی صورت میں کیا تھا۔دھرتی کے سب سے سچے لوگ جن سے دھرتی کی آبرو باقی ہے اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔لیکن ان ظالموں نے تو اللہ کے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا اور وہ قتل کرتے ہوئے جانتے تھے کہ ہم انہیں حق گوئی کی پاداش میں قتل کر رہے ہیں کسی حق کی بنا پر نہیں۔جس طرح اللہ کے نبی کو قتل کرنا سب سے بڑا جرم ہے کیونکہ وہ دنیا میں اللہ کا سفیر ہوتا ہے اور سفیر کا قتل ریاست کی عزت وحرمت کے قتل کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح اللہ کی کسی بات کا مذاق اڑانا براہِ راست اللہ کی عزت وحرمت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔یہ دونوں جرم چونکہ ایک ہی نوعیت کے ہیں اس لئے دونوں کو ایک ہی فائل میں محفوظ رکھیں گے اور قیامت کے دن یہ فائل ان کے سامنے کھلے گی اور ہم ان سے یہ کہیں گے کہ یہ ہیں تمہارے جرائم اور ان کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ بھسم کر دینے والی آگ کا عذاب چکھو۔اب تم کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو۔دوسری آیت میں فرمایا کہ لاریب یہ سزا بہت سخت ہے۔لیکن یہ تمہارے کرتوتوں کی جزا ہے۔تمہارے کرتوت تو اس سے بڑی سزا کے طالب ہیں۔ اللہ بندوں کیلئے ہرگز ظالم نہیں کہ وہ بے سبب کسی کو سزا دے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ نے ہم سے اقرار لیا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جس کو کھانے کیلئے آگ اترے۔ان سے کہیے کہ تمہارے پاس مجھ سے پہلے کئی رسول آئے کھلی نشانیاں لے کر اور اس معجزہ کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے انہیں قتل کیوں کیا اگر تم سچے ہو) (۱۸۳)

یہود کا خود ساختہ بہانہ

روئے سخن تو منافقین کی طرف ہی ہے لیکن یہاں ایک ایسی بات ذکر فرمائی جارہی ہے جس کا تعلق براہِ راست یہود سے ہے۔منافقین چونکہ یہود کے تربیت یافتہ اور انہی کی سی حرکتیں کرنے لگے تھے۔گذشتہ آیتِ کریمہ میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ سراسر یہود ہی کی صدائے بازگشت تھی۔ان کے تربیت دینے والوں کے بارے میں چونکہ بات چھڑ چکی ہے اس لئے مزید ان کی ایک بات کا حوالہ دیا جارہا ہے کہ ان کا حال تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانے کے بارے میں عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم سے ہماری کتابوں میں یہ عہد لیا گیا ہے کہ ہم ایسے کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جس کی قربانی کو آسمان سے آگ نازل ہو کر نہ کھاتی ہو۔آنحضرت ﷺ اور صحابہ جو قربانیاں دیتے تھے ان کی قبولیت کی شرط صرف دلوں کا اخلاص اور تقویٰ تھا اور اس کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا۔یہود نے کہا چونکہ آپ کی قربانیاں سابقہ رسولوں کی طرح قبولیت کیلئے جلائی نہیں جاتیں اس لئے ہم آپ پر ایمان لانے سے قاصر ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائبل میں متعدد مقامات

Marfat.com

پر یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔ لیکن یہ بات کہیں نہیں فرمائی گئی کہ اس طرح کی قربانی سچا نبی ہونے کی علامت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیائے کرام کو مختلف معجزات عطا کئے ہیں کیونکہ یہی معجزات اللہ کے نبی کی پہچان ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض نبی اور رسولوں کو یہ معجزہ دیا گیا ہو تو کوئی مستبعد بات نہیں۔ لیکن یہود کا اسے نبوت کی علامت بنا لینا سراسر ایجادِ بندہ ہے۔ جس کا بائبل میں کوئی ثبوت نہیں اور مزید یہ بات بھی کہ نبی کریم ﷺ جس دور میں تشریف لائے ہیں یہ دور وہ تھا جب دنیا علم کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ انسانی صلاحیتیں آگے بڑھنے کیلئے بے چین ہو رہی تھیں۔ دنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آنے والی تھی جس کی وجہ سے افادہ اور استفادہ میں آسانیاں بڑھ رہی تھیں۔ اس لئے اب وہ زمانہ قصۂ پارینہ بن جانے والا تھا۔ جب لوگوں کو حیرت انگیز چیزیں دکھا کر حق کی طرف مائل کیا جاتا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی نہیں تھی کہ قربانی کو آگ جلائے بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ انسان قربانی اور ایثار کا مجسمہ بنے اور بھوکا رہ کر بھی انسانوں کی ضروریات کو پورا کرے اور جتنا وہ قربانی اور ایثار میں آگے بڑھے گا اور جان مار کر اخفا کے ساتھ اللہ کے بندوں کی خدمت کرے گا اللہ اسے اتنی جلدی قبول فرمائے گا۔ اب اگر ایسا ہوتا کہ جو کچھ اللہ کے راستے میں پیش کیا جاتا قبولیت کے لئے آگ اسے جلاتی تو غریبوں کے کیا ہاتھ آتا؟ قربان کرنے والے کو ایک سکون ضرور ملتا کہ میں قبولیت سے نواز دیا گیا ہوں لیکن انسانی برادری کو اس سے کیا فائدہ پہنچتا۔ اسی لئے ہم عیسیٰ علیہ السلام کے محیر العقول معجزات میں قربانی کا معجزہ نہیں دیکھتے۔ بائبل اور قرآنِ کریم نے بعض بڑے بڑے انبیاء کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں ہمیں اس قربانی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ایسی بے سروپا بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ! ان کی زبان درازی کو روکنے کیلئے ایک ایسی چبھتی ہوئی بات فرمائی ہے جس سے ان کی زبانیں یقیناً گنگ ہو کر رہ گئی ہوں گی۔

آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا ہے ان یہود سے کہئے کہ مجھ سے پہلے کئی ایسے رسول آئے جن کے ساتھ واضح معجزات موجود تھے اور وہ معجزہ بھی موجود تھا جس کا تم ذکر کر رہے ہو یعنی قربانی کو آگ کا جلانا۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ ایسے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کی بجائے تم انہیں قتل کیوں کرتے رہے ہو۔ تمہارے لئے تو یہ کافی تھا کہ چونکہ ان کی قربانی کو آگ جلاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے رسول ہیں تو ان پر ایمان لانے کی بجائے ان کے قتل کے درپے ہونا آخر کس بات کا ثبوت ہے؟ حق سے محبت کا یا حق دشمنی کا؟ بائبل میں حضرت الیاس (ایلیاہ) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک انبوہِ کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاس کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاس کی دشمن ہو گئی اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے خون کے درپے ہوا اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا آتشیں قربانی کا معجزہ کیا معنی رکھتا ہے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝

ع (پس اگر وہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں) تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے۔ جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے) (۱۸۴)

Marfat.com

نبی کریم ﷺ کی طرف التفات اور تسلی

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے۔قرآنِ کریم میں یہ مضمون متعدد مواقع پر گزر چکا ہے کہ اللہ کے نبیوں کو دل و دماغ کے ایسے احساسات کے ساتھ پروردگار پیدا فرماتا ہے جن میں دنیوی نفع ونقصان کا احساس ہمیشہ مغلوب رہتا ہے البتہ! جو احساس ہمیشہ انہیں پریشان اور دل گرفتہ رکھتا ہے وہ لوگوں کا ایمان نہ لانا ہے۔اس سے بعض دفعہ پیغمبر کو یہ خدشہ ہونے لگتا ہے کہ لوگ جو ہدایت قبول کرنے کیلئے آگے نہیں بڑھتے تو اس میں میری کسی کوتاہی کا دخل نہ ہو۔شاید میری مساعی ناتمام ہوں۔میرے دعوت دینے کے انداز میں کوئی کمزوری ہو، میں شاید اپنی بات کو پوری طرح سمجھا نہیں پارہا۔اس طرح کے مختلف خیالات ہیں جو اللہ کے رسولوں کے آئینۂ دل پر بال کی طرح اترتے ہیں اور ان کے نہاں خانہ کو ویران کرجاتے ہیں۔آنحضرت ﷺ یقیناً ایسے خیالات سے سب سے زیادہ دوچار ہوتے تھے کیونکہ آپ کا کام سب سے زیادہ وسیع اور سب سے کٹھن تھا۔اس لئے قرآنِ کریم بار بار آپ کو تسلی دیتا ہے کہ آپ کی قوم کی طرف سے آپ کا جھٹلایا جانا کوئی نئی بات نہیں قومیں اپنے محسنوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی معاملہ کرتی رہی ہیں۔کتنے ایسے رسول گزرے ہیں کہ جنہوں نے زندگی بھر اپنی قوم کی اصلاح کی کوشش کی لیکن ان ظالموں نے یا تو انہیں قتل کرڈالا اور یا ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا۔دنیا کی یہ عجیب رسم ہے کہ یہ اپنے محسنوں سے لڑتی اور اپنے دشمنوں سے سازگاری پیدا کرتی ہے۔وہ خونِ جگر پی پی کر ان کی بھلائی چاہتے ہیں اور یہ ان کے خون کے پیاسے بنے رہتے ہیں۔ٹھیک کہا حفیظ نے

زمانہ یوں ہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

مزید فرمایا کہ آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ آپ پر ایمان نہ لانے کا سبب شاید یہ ہو کہ کفار جو آئے دن نئے نئے معجزات طلب کرتے رہتے ہیں ان کے مطلوبہ معجزات انہیں دکھائے نہیں جارہے ورنہ ممکن تھا کہ وہ لوگ ایمان لے آتے۔فرمایا: بگڑی ہوئی قومیں اپنے خاص اطوار رکھتی ہیں۔ان کی طرف سے معجزات کی طلب ہدایت پانے کیلئے نہیں ہوتی بلکہ جیسے جیسے انہیں معجزات دکھائے جاتے ہیں وہ اور زیادہ بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ہر معجزہ کو جادو اور شعبدہ بازی کا نام دے کر ٹھکرادیا جاتا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہود کی طرف مختلف زمانوں میں جو رسول آتے رہے ان میں سے جو رسول بھی آیا وہ بینات لے کر، زُبر اور کتابِ منیر لے کر آیا۔

بیّنات ، ''حسی معجزات اور مضبوط دلائل'' کو کہتے ہیں۔قرآنِ کریم کی آیات کو بھی بینات قرار دیا گیا ہے۔زُبر، زبور کی جمع ہے اس کے معنی ''ٹکڑے، قطعے اور صحیفے'' کے ہیں۔یہاں اس سے مراد انبیائے کرام کے وہ صحیفے ہیں جو توراۃ کے مجموعہ میں شامل ہیں اور کتاب منیر سے مراد یوں تو ہر کتاب ہوسکتی ہے لیکن یہود کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد توراۃ ہے۔آنحضرت سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ وہ رسول بڑے بڑے معجزات بھی لے کر آئے، ان پر آسمانی صحیفے بھی اترے، توراۃ بھی ان کے ہاتھوں میں تھی، اس کے باوجود کتنے ایسے رسول ہیں جن کو ان کی دشمنی اور بدباطنی سے واسطہ پڑا۔اس لئے اگر آپ کی تکذیب کی جارہی ہے تو آپ اس سے پریشان نہ ہوں یہ تو اس راستے کی سنت ہے جسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

Marfat.com

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○

(ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم قیامت کے دن پورے پورے اجر دیئے جاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے) (۱۸۵)

ایک دلیل اور اس کا جواب

اللہ کے رسول پر ایمان نہ لانے والوں اور دین کے دشمنوں کی ہمیشہ ایک دلیل رہی ہے کہ ہم اگر برسرِ باطل ہوتے اور ہماری زندگی اللہ کو ناپسند ہوتی تو ہمیں دنیا کے عیش ونشاط سے نہ نوازا جاتا اور تم اگر برسرِ حق ہوتے تو تمہارا یہ حال نہ ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص شہنشاہِ کائنات کا نمائندہ بن کر آئے نہ اسے ڈھب کا کھانے کو ملے نہ پہننے کو اور معاشرے میں کوئی اسے منہ نہ لگائے اور اس پر ایمان لانے والے نانِ شبینہ کو ترسیں اور جو لوگ ان کے مخالف ہیں یعنی ہم، ہمیں نئی سے نئی نعمتوں سے نوازا جائے، قسم قسم کی آسودگیاں ہمیں میسر ہوں۔ کاروبار ہمارا چلے، باغ ہمارے لہلہائیں، معاشرے میں رسوخ ہمیں حاصل ہو، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو برسرِ حق ہونے کا دعویٰ ہے ان کا دعویٰ غلط ہے۔ انہیں اپنے دعوے پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ قرآنِ کریم اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ نادانوں ذرا غور کرو! کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں جو موت کا مزہ چکھنے سے بچ جائے۔ جو شخص دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ یہاں کی چند روزہ زندگی دارالعمل بھی ہے اور امتحان بھی اور قیامت کے بعد کی زندگی ہمیشہ رہنے والی اور دارالجزا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر دنیا کی خوش عیشی برسرِ حق ہونے کی دلیل ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ موت کی تلخی سب کو پیش آنے والی ہے۔ امراء بھی مریں گے اور غرباء بھی مریں گے۔ انجام تو سب کا ایک ہے۔ اس لئے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا بہت غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اصل فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ قیامت کے بعد کی زندگی جو ہمیشہ کی زندگی ہے اور جو ہر عمل کا بدلہ ملنے کی اصل جگہ ہے وہاں ہر شخص کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اگر یہاں کی خوش عیشیاں جہنم کا باعث بن گئیں تو اندازہ کیجئے! کتنا بڑا خسران کا فیصلہ ہے اور اگر یہاں کی تلخیاں جہنم سے بچنے اور جنت کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوئیں تو پھر سوچ لو یہ چند روزہ تلخ زندگی کس قدر کامیابی کا باعث ہوگی۔ یہ سراسر ایک فریب ہے کہ یہاں کی خوش عیشی اور یہاں کا مال و دولت انسان کی کامیابی ہے۔ اگر یہ کامیابی ہوتا تو موت کے ایک جھٹکے سے فنا نہ ہوتا۔ حقیقی کامیابی جہنم سے بچ جانا اور جنت میں داخل ہونا ہے۔ یہ ایسی کامیابی ہے جس پر محرومی کا سایہ کبھی نہیں پڑے گا۔ جس شخص نے یہاں کی خوش عیشی کو مقصد بنا کر اپنی زندگی اس کی نذر کر دی وہ ایک ایسے فریب کا شکار ہوا جس سے نکلنا آسان نہیں۔ اس کی مال و دولت جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس فریب کا جال اسے اپنے اندر کستا جاتا ہے۔ اس کی کڑیاں مضبوطی سے باندھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسے نہ کھانے کا وقت ملتا ہے نہ سونے کا۔ اس کی زندگی قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ دولت سمیٹنے میں صرف کر دیتا ہے۔ اسے اس وقت ہوش آتا ہے جب موت کی طرف بلانے والا اس کے سر پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اس جال سے نکلنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور چیختا ہے کہ میں نے ساری زندگی برباد کر دی لیکن اب اس کی چیخ و پکار پر کوئی کان نہیں دھرتا موت کا عفریت اسے کھینچتے ہوئے وہاں لے جاتا ہے جہاں ڈوبنے والوں نے کبھی سر نہیں اٹھایا۔

Marfat.com

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ O

(تم اپنے مالوں اور جانوں کے بارے میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور تم ضرور سنو گے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ عزیمت کے احوال میں سے ہے) (۱۸۶)

مزید آزمائشوں کی خبر

جنگِ احد پر تبصرہ کے سلسلے میں اس سے پہلے یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ جنگِ احد مسلمانوں کیلئے آزمائش تھی، اس آزمائش کے ذریعے مسلمانوں میں جو مخلص اور منافق ملے جلے تھے انہیں الگ الگ نمایاں کر دیا گیا تا کہ آئندہ کسی معرکے میں مسلمان اس سے بڑی کسی افتاد سے دوچار نہ ہوں۔ احد کے حادثے نے اگر چہ مومن اور منافق کو بہت حد تک الگ الگ کر دیا لیکن ابھی تک منافقین کی ایک محدود تعداد مسلمانوں کے اندر موجود تھی اور جو لوگ اس وقت جنگ میں شریک ہونے سے قصداً پیچھے رہ گئے تھے بلکہ عین وقت پر انہوں نے دھوکہ دیا ان میں سے بھی کسی کو مسلمانوں کی صفوں سے نکلنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ انہیں یہ موقع دیا گیا کہ وہ اپنی اصلاح کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ البتہ! مسلمانوں کو اندازہ ضرور ہو گیا کہ کون کس جگہ کھڑا ہے۔ لیکن منافقین اور کمزور مسلمانوں کی ایک ٹکڑی تو آخر تک مسلمانوں کے ساتھ رہی۔ شاید اسی ضرورت کے تحت یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تم ابھی اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے بارے میں مزید آزمائے جاؤ گے اور یہی آزمائش ہے جو تمہارے زرِ خالص کو الگ کر دے گی اور کھوٹ پوری طرح الگ ہو جائے گا۔ اسی طرح عام حالات میں بھی تمہیں اہلِ کتاب کی طرف سے نہایت تکلیف دہ باتوں کے زخم سہنے پڑیں گے اور مشرکین مکہ بھی اس معاملے میں پیچھے رہنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ وہ الزامات کے تیر بھی چلائیں گے اور وقتاً فوقتاً شب خون بھی ماریں گے۔ اہلِ کتاب چونکہ مسلمانوں کے پڑوس میں رہتے تھے۔ اس لئے ان کی طرف سے تو برابر تکلیف دہ باتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کعب بن اشرف ایک نامور شاعر تھا۔ یہود کے ایک قبیلے کا سردار نہایت دولت مند اور نہایت خوبصورت تھا۔ اس نے مسلمانوں کی عزتوں سے کھیلنے کو معمول بنا لیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی ہجو کہنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کوئی بھی قصیدہ کہتا تو اس کی تشبیب میں مسلمانوں کی بچیوں کے نام لے لے کر عشق کا اظہار کرتا۔ عرب میں چونکہ سب سے کثیر الاشاعت ذریعہ شعر ہی تھا وہ ہوا کے پر لگا کر اڑتا اور اس طرح سے مسلمانوں کی بچیوں کی عزتیں ہواؤں میں اڑتی پھرتیں۔ ممکن ہے اس آیتِ کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ ہو۔ اس کی دریدہ دہنی چونکہ حد سے گزر گئی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن باقی یہود بھی اس دل پسند مشغلے میں ایک دوسرے سے پیچھے رہنے والے نہ تھے۔ وہ بھی بقدرِ ہمت ایسی کمینہ حرکتوں سے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے تھے۔ لیکن مسلمان جن کے سامنے دنیا کی اصلاح کا عظیم کام تھا وہ اس کام میں ملوث نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے ان کو حکم دیا کہ اہلِ کتاب اور مشرکین کی حرکتیں اگر چہ ناقابلِ برداشت ہیں لیکن تم ان پر صبر کرو اور اپنے ہر معاملے میں تقویٰ کی تصویر بنے رہو۔ تمہارا کوئی کام بھی تقویٰ کے پیراہن سے باہر نہ ہو۔ تمہاری زبانیں ذکر اللہ کی خوگر اور لغویات سے مجتنب رہیں۔ حدودِ الٰہی کا احترام ہمیشہ تمہارے پیشِ نظر رہے۔ اللہ کے دین کی

Marfat.com

سربلندی تمہاری زندگی کا اصل ہدف ہو۔یہی وہ عزیمت کے کام ہیں اور یہی عزیمت کا مقام ہے جو اللہ کے خاص بندوں کا حصہ ہے جو اس کی روشنی میں زندگی کا سفر جاری رکھتا ہے اس کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ ۡ فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُہُوْرِہِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ○ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّہُمْ بِمَفَازَۃٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

(اور یاد کرو جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے پھیلاؤ گے ،اسے پوشیدہ نہیں رکھو گے مگر انہوں نے کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں ○ تم گمان نہ کرو ان لوگوں کو جو اتراتے پھرتے ہیں اپنی کرتوتوں پر اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انہوں نے نہیں کئے ہیں۔ان کو عذاب سے بری مت سمجھو، حقیقت میں ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے ○ اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (۱۸۷ تا ۱۸۹)

اہلِ کتاب کو آخری تنبیہ

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کو تنبیہ کی گئی ہے اور ان کی مخصوص روش پر سرزنش کی گئی ہے کہ تمہیں یہ تو خوب یاد ہے کہ اللہ نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ ایسے پیغمبر پر ایمان نہ لانا جس کی قربانی کو آسمان سے آگ اتر کر نہ کھائے یعنی سوختنی قربانی جس کی پہچان نہ ہو حالانکہ ایسا کوئی عہد توراۃ میں موجود نہیں۔لیکن جو عہد یہود اور نصاریٰ دونوں سے لیا گیا اور جس کی انتہائی تاکید کی گئی اس پر نہ صرف تم عامل نہیں رہے بلکہ تم نے اسے پسِ پشت ڈال دیا اور کبھی بھول کر بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا اور حال یہ ہے کہ وہ عہد بائبل کی کتاب استثناء میں بھی ہے اور اسے انجیل میں بھی مختلف اسالیب میں دہرایا گیا ہے۔کتاب استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے،اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں انہیں اپنے دل پر نقش کرلو۔انہیں اپنی آئندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا۔اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر انہیں لکھ دینا۔پھر اپنی آخری وصیت میں انہوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ ''کوہِ عیبال'' پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے توراۃ کے احکام ان پر کندہ کردینا۔نیز بنی لاوی کو توراۃ کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عیدِ خیام کے موقع پر قوم کے مردوں،عورتوں اور بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بہ لفظ ان کو سناتے رہنا۔لیکن ان تمام تاکیدات کے باوجود بنی اسرائیل کی غفلت اس حد تک پہنچی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سات سو برس بعد ہیکلِ سلیمانی کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرمانروا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں توراۃ نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲۔سلاطین۔۲۲۔۸:۱۳)

Marfat.com

اسی طرح انجیلوں میں بھی مختلف اسالیب میں یہ ہدایت نامے جابجا ملتے ہیں خاص طور پر یہ فقرہ تو زبان زدِ عوام ہونے کے ساتھ ساتھ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

(جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کردو۔)

اس کے بعد ان کی دیدہ دلیری اور عذابِ خداوندی سے لاپرواہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اللہ کی کتابوں کے احکام کو نظر انداز کیا اور انہیں پسِ پشت ڈالا بلکہ انہوں نے اللہ کی کتاب جو آخرت کی منزل دکھاتی اور آخرت کی تڑپ پیدا کرتی ہے کی بجائے دنیا کو اپنی منزل بنایا ہے اور دولتِ دنیا کی محبت میں اندھے ہو گئے ہیں۔ قوم کے ہر قابلِ ذکر طبقہ نے دولت کے ذخیرے سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ علماء نے اپنے فتاویٰ کو بیچا اور اس کے بدلے میں دنیا حاصل کی۔ سجادہ نشینوں نے فتوحات کی صورت میں اپنے مریدوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالے۔ حکمرانوں نے ہر وہ راستہ اختیار کیا جس میں دنیا اور دولتِ دنیا کے حصول میں آسانی پیدا ہو سکتی تھی۔ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عہدہ اور منصب کے دوام کیلئے راستے کھولے اور دولتِ دنیا کی افزائش کیلئے نئی نئی سہولتیں پیدا کیں۔ عوام نے جب اوپر والوں کا یہ رنگ دیکھا تو قوم کا پورا کلچر دنیا طلبی میں ڈھلتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ سیرت و کردار کا ہدف بدلنے لگا، زمین کا نور بجھنے لگا، نفسانی قوتیں توانا ہونے لگیں اور قلب و دماغ کی قوتوں نے ان کی چاکری شروع کر دی۔ کل تک جن باتوں کو زمین کی روشنی میں برائی سمجھا جاتا تھا آج وہی باتیں خوبیاں بن کر تہذیب کی علامتیں بننے لگیں۔ کبھی اعلیٰ اخلاق دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ایثار و قربانی کا داعیہ اور بے نفسی کے مظاہر عزت و وجاہت کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ اب ان کے برعکس ایک ایک بداخلاقی، خود غرضی، ہوسِ زر کے مظاہر، تکثیرِ مال کیلئے کمینے سے کمینہ ذریعہ بھی عزت اور عظمت کی پہچان بن گیا۔ پہلے لوگ خدمت کرتے اور اپنی خدمت کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے تھے اب ایسے کاموں کا ذکر کر کے داد و تحسین چاہتے تھے جس کام کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ باکمال لوگ اپنے کمال کو چھپا کر خوش ہوتے تھے۔ اب نالائقوں نے باکمال لوگوں کی مسندیں سنبھالیں اور محض مسندوں پر فروکش ہو کر یہ چاہنے لگے کہ باکمال لوگوں کے تمام کمالات ان کی طرف منسوب کر کے ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگیں اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی کہ ہم تو خدا رسیدہ لوگ ہیں، اللہ نے دنیا اور آخرت کی نعمتیں ہمارے لئے مخصوص کر رکھی ہیں، ہمیں نہ یہاں کسی بات کا اندیشہ ہے نہ وہاں ہوگا ہم یہاں بھی اللہ کے خوف سے محفوظ ہیں اور قیامت کے دن بھی اللہ کے ہاں سرخرو ہوں گے۔ ان کے کرتوتوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا کہ تم انہیں اللہ کے عذاب سے محفوظ مت سمجھو۔

مَفَازَۃٌ کا معنی ہے "نجات یا پناہ"۔ ہر دنیا دار آدمی اپنی دنیوی فتوحات کو اپنے لئے پناہ گاہ سمجھتا ہے اور اپنے عہدہ و منصب اور دنیوی جاہ و جلال کو اپنی نجات کا ذریعہ گردانتا ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری خوش فہمیاں تمہاری تباہی کا سبب ہیں اسی نے تمہاری دنیا تباہ کی ہے یہی تمہاری آخرت کی بربادی کا سبب ہیں۔ تم اہلِ کتاب ہو اتنی بات تو جانتے ہو کہ زمین و آسمان کی حکومت اللہ کے قبضے میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے آگے بڑھاتا ہے جسے چاہتا ہے نیچے گراتا ہے۔ آج کے بادشاہ اسی کے اشارے سے کل کے فقیر بن جاتے ہیں اور آج کے فقیر اس کے حکم سے تخت نشین ہو جاتے ہیں۔ جب سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کی طاقت پوری کائنات پر حاوی ہے اور کائنات کا کوئی گوشہ اس کی مملکت سے باہر نہیں اور کوئی پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں گرتا۔ پھر تم نے کس بل بوتے پر اللہ کے احکام کی نافرمانی پر اپنی عزت و وجاہت کی بنیاد رکھی ہے۔ تم کس حوالے سے اللہ کے آخری نبی کو ماننے سے انکار کر رہے ہو اور تمہیں اس بات پر اصرار ہے کہ آخری نبی بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تم کب سے اللہ کے فیصلوں میں دخیل ہو گئے ہو، جب زمین و آسمان اور ان دونوں میں جو کچھ ہے سب کا مالک اللہ ہے تو پھر تمہیں اپنی جسارتوں پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے اپنی اصل حقیقت کو سمجھ کر راہِ راست اختیار کرنی چاہیے۔

Marfat.com

اِنَّ فِيْ

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ
لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ
عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾
رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ
اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا
وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ
لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ
لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾
لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ قف

Marfat.com

ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا
رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ قف
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع

رکوع: ۲۰۔ (بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں ○ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، تو سب عیبوں سے پاک ہے سو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا ○ اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا سو اس کو رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ○ اے ہمارے رب! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت دے اپنے وفادار بندوں کے ساتھ ○ اے ہمارے رب! ہمیں عطا کر وہ سب کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ○ پس ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو سو جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ان سے ان کے گناہ دور کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ

Marfat.com

ہوگا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے ○ تجھے مغالطہ میں نہ ڈالیں ملک میں سرگرمیاں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ○ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کیلئے ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے ○ لیکن جن لوگوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تو پہلی مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو ابدی نعمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں اس کے وفادار بندوں کیلئے ○ اور بیشک اہلِ کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر بھی جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان پر اتاری گئی ہے اللہ سے ڈرتے ہوئے وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ بیشک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے ○ اے ایمان والو! صبر کرو، ثابت قدم رہو، مقابلے کیلئے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ (۱۹۰ تا ۲۰۰)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○

(بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں ○ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، تو سب عیبوں سے پاک ہے سو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا ○ اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اس کو رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں) (۱۹۰ تا ۱۹۲)

اربابِ دانش کا طرزِ عمل

یہ رکوع اس سورۃ کا آخری رکوع ہے اور یہ آیات خاتمہ سورۃ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سابقہ آیات میں اہلِ کتاب پر تنقید ہے۔ ان کی مختلف گمراہیوں کا ذکر کرنے کے بعد آخری آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم ایک اہلِ کتاب امت ہو، تمہیں اللہ نے شریعت سے نوازا تمہاری ہمعصر دنیا کی ہدایت کا تمہیں ذمہ دار بنایا، توحید کی امانت تمہارے سپرد کی گئی، اللہ کے بے شمار انعامات تم پر ہوئے۔ باایں ہمہ! تمہاری ذہنیت یہ ہے کہ تمہیں وہ عہد تو یاد ہیں جو تم سے نہیں لئے گئے۔ البتہ! بعض انبیائے کرام کے معجزات کے حوالے سے آسمانی کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔ لیکن دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے جو عہد تم سے لیا گیا اور جس کی انتہائی تاکید کی گئی اس کی یاد تمہیں کبھی بھول کر بھی نہیں آئی۔ تم اپنے آپ کو انبیاء کا وارث سمجھتے ہو اور نہ جانے تم نے اپنے لئے کیسے کیسے امتیازات پیدا کر لئے ہیں۔ لیکن جو دین تمہاری وجہ اختصاص تھا اس سے تم بالکل لاتعلق ہو چکے ہو۔ تمہارا ہر عمل اس سے دوری کی علامت ہے۔ تم جیسے لوگوں کا انجام عذابِ الیم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ وہ انتہا

Marfat.com

ہے جو دنیا طلبی میں اندھا ہونے کے باعث پیدا ہوتی ہے اور جب کوئی قوم اللہ کے انعامات کی قدر نہیں کرتی اور اپنے فرائض منصبی کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے تو اس کا انجام اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہدایت وضلالت کے اس باب کو مکمل کرنے کے بعد پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ایک نیا باب کھولا جا رہا ہے۔ جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ دنیا کی محبت سے جب قومیں اندھی ہو جاتی ہے تو وہ اہلِ کتاب ہو کر بھی ہدایت سے دور رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ بصیرت کا ثبوت دیتی ہیں اور اخلاص سے اللہ کے راستے کی طرف آتی ہیں تو ان کیلئے اس کائنات کا ایک ایک ورق کتابِ ہدایت بن جاتا ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ ان کیلئے ہدایت کی نشانی بن جاتا ہے۔ وہ جب ان مخلوقات کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے اور آزاد عقل سے ملاحظہ کرتے ہیں تو انہیں ہر طرف اللہ کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا شریک لہ گوید

شانِ نزول

ان آیات کا شانِ نزول جو بیان کیا گیا ہے اس سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ محدث ابنِ عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ عطا ابن رباح رضی اللہ عنہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی ہو وہ مجھے بتلایئے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: آپ کی کس شان کو پوچھتے ہیں؟ ان کی تو ہر شان عجیب ہی تھی۔ ہاں ایک واقعہ عجیب سناتی ہوں وہ یہ کہ حضور اکرم ﷺ ایک رات میرے پاس تشریف لائے اور لحاف میں میرے ساتھ داخل ہو گئے پھر فرمایا کہ اجازت دو میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔ بستر سے اٹھے، وضو فرمایا، پھر نماز کیلئے کھڑے ہو گئے اور قیام میں اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک پر بہنے لگے پھر رکوع فرمایا اس میں بھی روئے پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر روئے پھر سر اٹھایا اور مسلسل روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ حضرت بلالؓ آئے اور آپ کو نماز کی اطلاع دی۔ بلالؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضور اس قدر کیوں گریہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ اور شکریہ میں گریہ زاری کیوں نہ کروں جب کہ اللہ تعالیٰ نے آج کی شب مجھ پر یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پیشِ نظر آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

اربابِ دانش کے اوصاف

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ زمین اور آسمان کی پیدائش اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں اور پھر عقل مندوں کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر وہ شخص عقلمند نہیں جسے ہم عقلمند قرار دیتے ہیں بلکہ عقلمند کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ جب آسمان اور زمین کی پیدائش اور اختلاف لیل ونہار میں مضمر نشانیوں پر غور کرتے ہیں تو ان کا طریقہ یہ نہیں کہ وہ ان مخلوقات میں گم ہو کر رہیں۔ اگر وہ فلکیات میں غور کرتے ہیں تو وہ ساری عمر ان کی حرکتیں اور گردشیں نوٹ کرتے نہیں رہتے اور نہ ان سے لوگوں کی قسمتوں کا حال معلوم کرتے ہیں۔ اگر وہ زمین پر غور کرتے ہیں تو اس کے بھی مختلف عوامل، اس

Marfat.com

کے انفعالات، اس کی قوت روئیدگی، اس میں مضمر خزانوں پر ہی غور کرتے ہوئے زندگی نہیں گزار دیتے بلکہ جب وہ فلکیات کو دیکھتے ہیں اور اس میں ان کو دکھائی دیتا ہے کہ اس میں ایک سے ایک بڑا کرہ محوِ پرواز ہے، ان کا مدار، ان کی منزلیں، ان کی کیفیتِ سفر، ان کی حرکتوں کی رفتار اس قدر منظم و مرتب ہے کہ کبھی ان میں ایک لمحے کا توقف نہیں ہوتا اور کبھی تقدیم و تاخیر پیش نہیں آتی، کبھی اپنے راستے گم نہیں کرتے، کبھی اپنے مدار سے نہیں نکلتے، کبھی ان میں تصادم نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ انہیں وجود کس نے بخشا ہے؟ یہ بے سہارا محوِ پرواز کیسے ہیں؟ ان میں جو ثوابت ہیں وہ کس کھونٹے سے بندھے ہوئے ہیں؟ اور جو محوِ پرواز ہیں ان کی سمتِ سفر اور رفتارِ سفر کس نے مقرر کی ہیں؟ بڑی سے بڑی حکومتیں اپنے دارالخلافہ تک میں افراط و تفریط کو نہیں روک سکتیں۔ آئے دن مختلف قسم کے تصادم ہوتے ہیں جبکہ ان کے احتسابی ادارے رات دن نظام کی نوک پلک سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ تو یہ زمین اور آسمان کو تھامنے والی وہ کون سی قوت ہے کہ جس کی نافرمانی کا کبھی کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا، جس کے احکام کبھی توڑے نہیں جاتے، جس نے اس طرح اپنی مخلوقات کو جن میں غیر معمولی طور پر بڑے بڑے کرے بھی شامل ہیں ایک نظام میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ مجال نہیں ہے کہ اس سے کوئی سرتابی کر سکے۔ ان کی عقلیں ہر مخلوق کے ارد گرد گھومنے کی بجائے اس کے خالق کو تلاش کرتی ہیں۔ ہر مخلوق میں وہ اپنے خالق کی جھلک دیکھتی ہیں۔ وہ ریل کے انجن کو دیکھتے ہیں کہ وہ سرخ جھنڈی کو دیکھ کر رکتا اور روانہ ہوتا ہے تو وہ سرخ جھنڈی کو طاقت کا سرچشمہ نہیں سمجھتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس کا ڈرائیور اس کو کنٹرول کرتا ہے لیکن وہ اسے بھی تمام طاقتوں کا منبع یقین نہیں کرتے۔ پھر اس میں بھرا ہوا سٹیم یا بھاپ یا پٹرول کو دیکھ کر بھی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انجن کی تمام طاقت اس میں ہے بلکہ ان تنگنائیوں سے نکل کر وہ غور کرتے ہیں کہ سٹیم یا بھاپ کو طاقت کس نے دی ہے؟ پٹرول کو پیدا کس نے کیا ہے؟ ڈرائیور کو جسمانی توانائی اور دماغی رعنائی کس نے عطا کی ہے؟ اس سے وہ اپنے خالق کو پہچاننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کا نہایت سادہ سا براہِ راست اور صحیح طریقہ ہے جس سے وہ اپنی عقل کا حق ادا کرتے ہیں کہ وہ تعمیر سے معمار کو پہچانتے ہیں۔ نظم کے راستے سے ناظم سے شناسا ہوتے ہیں۔ شعر سے شاعر تک پہنچتے ہیں اور مخلوق سے خالق تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسا نکتہ ہے جسے قرآنِ کریم نے فاش کیا ہے یہ بہت سادہ بھی ہے اور بہت صحیح بھی۔ لیکن انسان نہ جانے اس کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتا؟ ایک بنا سنورا صاحب بہادر چمن میں چہل قدمی کرتے ہوئے پھول توڑ کر یہ سمجھتا ہے کہ اس کا کام مشامِ جان کو معطر کرنا ہے اور یا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف اسے کالر یا گریبان میں لگانا ہے اور اگر اس کی عقل نے بہت کام دیا تو وہ یہ سمجھنے کو کافی سمجھتا ہے کہ اس سے گلقند بھی تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن کبھی وہ پھول کی خوشبو، اس کی پنکھڑیوں کی نزاکت، اس کی پتیوں کی خوش رنگی، پر دھیان نہیں دیتا کہ یہ کس کی تخلیق کا شاہکار ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو جو بصیرت عطا کی تھی وہ یہی بصیرت تھی جس نے ان کیلئے خالق و مخلوق کے رشتے کو پہچاننا آسان کر دیا تھا۔ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے پروردگار کو کیسے پہچانا؟ آپ نے فرمایا: شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر کہا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: شہتوت کا پتہ اگر بکری کھاتی ہے تو وہ مینگنیاں کر دیتی ہے، اگر ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو وہ ریشم بنتا ہے اور اگر ختن کا ہرن کھاتا ہے تو اس کے ناف سے کستوری نکلتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر پتے کی کوئی خصوصیت ہے تو ہر جگہ یکساں ہونی چاہئے لیکن ہم تینوں جگہ مختلف خصوصیات کا اظہار دیکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پتے کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ اصل قوت اس ہاتھ میں ہے جو کہیں اسے گوبر میں بدل دیتا ہے، کہیں ریشم کے دھاگے میں اور کہیں کستوری میں۔ وہ ہاتھ جو یہ تبدیلیاں عمل میں لاتا ہے دراصل وہی میرے اللہ کا ہاتھ ہے۔

Marfat.com

وہ عقل والے جن کی یہاں تعریف کی گئی ہے وہ جب مخلوقات کی نشانیوں کو دیکھتے ہیں تو اسی طریقے سے مخلوق کے واسطے سے خالق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح سے ہوا کا ایک ایک جھونکا، پانی کی ایک ایک بوند، روشنی کی ایک ایک کرن، درخت کا ایک ایک پتہ، پھول کی ایک ایک پنکھڑی، حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات اللہ کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے

ہر کہ بینم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

چنانچہ اپنے خالق کی معرفت کے بعد بے ساختہ بندے کی زبان پر اس کا ذکر جاری ہو جاتا ہے۔ وہ جیسے جیسے اپنی ذات، اپنی صفات، اپنے احساسات، اپنی صلاحیتوں اور اپنی توانائیوں کو دیکھتا ہے ویسے ویسے اسے اپنے خالق کی یاد ایک محبوب مشغلہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے جاگتے، اللہ کی یاد کو اپنا معمول بنا لیتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس کی یاد محبوب ہو جائے اس کی ذات بھی محبوب ہو جاتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس محبوب ذات کا حکم یہ ہے، وہ مجھ سے فلاں فلاں بات کا تقاضا کرتی ہے، اسے یہ یہ طور اطوار پسند ہیں اور یہ یہ باتیں اسے ناپسند ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ ایک عاشقِ صادق اپنے محبوب کی یاد سے دل تو بہلائے لیکن اس کے احکام اور اس کی پسند و ناپسند کو کبھی اہمیت نہ دے۔ اس لئے بعض علماء نے کہا کہ اللہ کی یاد کا مفہوم جہاں اللہ کا ذکر ہے وہیں اس کی اطاعت بھی ہے۔ ذکر بغیر اطاعت کے محض زبان کا جمع خرچ ہے اور اطاعت بغیر ذکر کے محض عادت ہے۔

عقل والوں کی دوسری علامت آسمان اور زمین کی تخلیق میں تفکر کرنا ہے۔ وہ جب مخلوقات کو دیکھ کر اپنے خالق تک پہنچ جاتے ہیں تو اب وہ مخلوقات میں تفکر کرنا شروع کرتے ہیں (تفکر کا لفظی معنی "غور کرنا" اور "کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش" ہے) اس آیتِ کریمہ میں جس طرح ان عقلمندوں کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اسی طرح یہ بات فرمائی کہ وہ مخلوقات میں تفکر بھی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ذکر ایک عبادت ہے اس طرح فکر اور تفکر بھی عبادت ہے۔ البتہ! یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ جو تفکر عبادت ہے اس کا تعلق مخلوقات سے ہے۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات سے نہیں کیونکہ پروردگار کی ذات و صفات کی حقیقت کا ادراک انسان کی عقل سے ماورا ہے۔ اس کی ذات و صفات میں تدبر اور تفکر حیرانی کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ جیسے جیسے آدمی اس راستے میں بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایک مخلوق اپنے فہم و ادراک کی وسعتوں کے باوجود مخلوق ہی ہے وہ اپنے دستیاب وسائل میں خالق کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتی۔ انسانی ذہن مخلوقات میں قدرت کا شاہکار ہے لیکن وہ بہر حال مخلوق اور محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود کبھی نہیں سما سکتا۔ اکبر مرحوم نے خوب کہا

جو ذہن میں گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

البتہ! انسان کو اگر اپنی ذات میں فہم و ادراک کی نارسائی اور اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف نصیب ہو جائے تو یہ وہ دولت ہے جو عبدیت کی معراج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ عرفان و بصیرت کی راہ کے سالک ہیں۔ ان کے ادراک کا منتہا ہمیشہ یہی رہا

رب زدنی فیک تحیرا (اے اللہ! ہمیں اپنے بارے میں ایسا کر کہ تیرے بارے میں ہمارا تحیر ہمیشہ بڑھتا رہے)

Marfat.com

عارف رومی نے خوب فرمایا:

دور بینانِ بارگاہِ الست
غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

اس لئے اس راہ کے رمز شناس لوگوں نے وصیت کی۔

تَفَکَّرُ فِیْ اٰیَاتِ للّٰہِ وَلَا تَتَفَکَّرُ فِی اللّٰہِ

(اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور وفکر کرو مگر خود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں غور وفکر نہ کرو کہ وہ تمہاری رسائی سے بالاتر ہے۔)

چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں آسمان وزمین کی پیدائش میں غور کرنے کو اہلِ خرد کا شعار قرار دیا ہے۔ تفکر وتدبر کا کوئی ایک گوشہ نہیں پوری کائنات تفکر کرنے والے کیلئے ایک مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس راہ میں تگ وتاز کرنے والے کیلئے ایک میدان کی مانند ہے۔ وہ ایک ذرے اور ایک قطرے سے لے کر سورج اور چاند تک اور حشرات الارض سے لے کر ملائکہ مقربین تک کو اپنے تفکر وتدبر کا موضوع بنا سکتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ اللہ کے قرب کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے حسن بصری رحمۃ اللہ نے فرمایا:

تَفَکُّرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ قِیَامِ لَیْلَۃٍ (ایک گھڑی آیاتِ قدرت میں غور کرنا پوری رات کی عبادت سے بہتر اور زیادہ مفید ہے)

تفکر کا ایک پہلو

آیتِ کریمہ میں غور وفکر کے ایک زاویے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ہم اس کی راہنمائی میں غور وفکر کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ہم آسمانوں اور زمین پر غور کرتے ہیں تو سب سے بڑی حیرت انگیز چیز جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آسمان پر بے شمار کرے ہیں کچھ ثوابت ہیں کچھ سیارے ہیں۔ ان کی مختلف حرکتیں ہیں ہر ایک کا اپنا مدار ہے اور ہر ایک کی اپنی سمتِ سفر۔ اسی طرح زمین کی بھی دو حرکتیں اور گردشیں ہیں جن کی رفتار بھی مقرر ہے اور اوقاتِ کار بھی معین ہیں۔ ان میں جو سب سے حیرت انگیز چیز دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر مخلوقات کو اللہ نے انسان کی چاکری پر لگا رکھا ہے۔ سورج اس لئے چمکتا ہے تاکہ زمین پر بسنے والوں کو روشنی اور گرمی مہیا کرے۔ سمندر سے کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچے اور اس کے پانی کو فلٹر کرنے کے بعد فضا میں ابر کی چادروں کی شکل میں پھیلا دے (پھر ہوا کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق جہاں زمین کیلئے آبیاری کی ضرورت ہے وہاں اس بادل کو ہانکتی ہوئی لے جائے اور وہاں جا کر برسا دے۔ فضائے آسمانی کا کام یہ ہے کہ وہ پہاڑوں پر برف جمائے اور سورج کا کام یہ ہے کہ وہ گرمیوں میں اس برف کو پگھلا کر ندی نالوں اور دریاؤں میں پہنچا دے تاکہ انسان اپنی ضرورت کے مطابق ان سے پانی حاصل کر سکے (زمین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی قوتِ روئیدگی کو عمل میں لائے اور انسان کی ضرورت کے ایک ایک دانے کو اپنی آغوش میں اس طرح پالے جس طرح ماں اپنے بچے کو پالتی ہے پھر اسے دھیرے دھیرے پودے کی شکل دے، ہوائیں آکر اسے لوریاں دیں، سورج اس کے دانے کو پکائے اور چاند اس میں گداز پیدا کرے، زمین میں کام کرنے والی مختلف قوتیں جو گیسز کی شکل میں موجود ہیں وہ غلے کی افزائش میں اپنا کام کریں۔ اس طرح سے بادل، ہوا، سورج، چاند، زمین اور اس کے مختلف عوامل اور آسمان کی مختلف

Marfat.com

قوتیں رات دن مصروف عمل ہیں تا کہ انسان کو خوراک مہیا کی جائے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے اس کارخانے کو باوجود اس کے کہ ان کے اپنے اندر کتنا تخالف پایا جاتا ہے اور کس طرح قدم قدم پر ان میں تضادات ہیں۔لیکن مقصد کی ہم رنگی، ہم آہنگی اور وحدت کبھی ان کو ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔وہ ہمہ تن انسان کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں جب سے انسان دنیا میں آیا ہے اس وقت سے یہی ان کا وظیفہ ہے۔ان کے اس وظیفہ اور عمل کو دیکھتے ہوئے انسان کے غور و فکر پر یہ نکتہ فاش ہوتا ہے کہ اے نالائق انسان تو تو ایک معمولی مخلوق ہے جس کی اپنی ذاتی کوئی حیثیت نہیں۔تیرے پاس بظاہر کوئی طاقت نہیں، تیرے دائیں بائیں بڑی بڑی مخلوقات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ نے عناصرِ قدرت اور عناصرِ فطرت کو تیری خدمت پر لگا دیا ہے سورج تیرے لئے چمکتا ہے، چاند تیرے لیے دمکتا ہے، ستارے تیرے لئے ٹمٹماتے ہیں، روشنی تجھ پر قربان ہوتی ہے، تاریکی تیرے سکون کا باعث بنتی ہے، پانی تیری پیاس بجھاتا اور تیری کھیتیاں اگاتا ہے، غلہ تیری بھوک مٹاتا ہے، درختوں کا سایہ تجھے فرحت دیتا ہے، خوبصورت پرندے تیرے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث ہیں، ان کی مختلف بولیاں موسیقی کا کام دیتی ہیں، آبشاریں تیرے لیے گرتی ہیں، فوارے تیرے لئے ابلتے ہیں، گھنگھور گھٹائیں تیرے لئے تل کر آتی ہیں، بجلی تجھ سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے، بادلوں کی گرج تیری اولوالعزمی کو دعوت دیتی ہیں۔بعض موانع کا سر اٹھانا، چٹانوں کا حائل ہو جانا اور پانی جیسی نعمت کا سیلاب کی صورت اختیار کر جانا تیرے عزائم اور قوتِ ایجاد کا امتحان ہے۔مختصر یہ کہ تو پوری کائنات میں ایک مخدوم کی حیثیت رکھتا ہے اور تیرے چاروں طرف تیرے خادم پھیلے ہوئے ہیں حالانکہ بظاہر تو ان میں بہتر نہیں لیکن تو نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ان کو تو پیدا کرنے والے نے ان کے مخدوم کی خبر دی اور انہوں نے اپنے مخدوم کو تلاش کر کے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دیا۔تو نے مختلف قسم کی کھانے کی چیزوں کو جیسے چاہا پکایا، جیسے چاہا بھون ڈالا۔لیکن کبھی کسی نے تیرے سامنے سر ہلانے کی جرأت نہیں کی۔تو نے ہاتھی جیسے جانور پر سواری کر ڈالی، تو نے لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کر دی، تو نے بجلی کو تاروں میں بند کر دیا۔لیکن کسی قوت نے تیری نافرمانی کی جرأت نہیں کی۔لیکن تجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ ان کا تو میں مخدوم ہوں کیا میرا کوئی مخدوم نہیں؟ انہیں تو اللہ نے میرے لئے پیدا کیا ہے تو مجھے بھی تو کسی کیلئے پیدا کیا ہوگا؟ وہ مخلوقات میں سے تو کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام مخلوقات میری خادم بنائی گئی ہیں میں مخدوم ہو کر تو خادم کی بندگی نہیں کر سکتا۔کس قدر احمق ہوگا وہ شخص جو اپنے نوکروں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے، ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے، ان کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، مصیبتوں میں ان سے مدد طلب کرے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میرا مخدوم اگر کوئی ہے اور یقیناً ہے تو وہ صرف وہ ذات ہے جس نے مجھے اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔یہی وہ بات ہے جو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ فرمائی

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (میں نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا تا کہ وہ میری عبادت کریں)

مقدمات کی ترتیب

عبادت صرف ذکر و فکر کو نہیں کہتے بلکہ یہ پوری زندگی کو کسی کے تابع فرمان بنا دینے اور کسی کی اطاعت میں دے دینے کا نام ہے۔جب آدمی کی سوچ یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہی میرا معبود، مسجود، مطلوب، محبوب، اور حاکمِ حقیقی ہے تو پھر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں اس کا اگر بندہ ہوں اور وہ میرا معبود ہے تو میری بندگی کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ مجھے کس طرح اللہ کی عبادت کرنی چاہیئے؟ وہ کیا احکام ہیں جس میں مجھے اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے؟ وہ کیا کام ہیں جن سے اللہ کی اطاعت میں مجھے رک جانا چاہیئے؟ اور وہ اللہ کے

Marfat.com

پسندیدہ مقاصد کیا ہیں جن کی خاطر مجھے زندگی قربان بھی کرنا پڑے تو کر دینی چاہئے؟ اور اس سے یہ نتیجہ بھی آپ سے آپ نکلتا ہے کہ ایک دن ایسا ہونا چاہئے کہ جب میں اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہی کے لئے حاضر کیا جاؤں وہ مجھ سے تمام اعمال کا حساب لے۔ کامیابی کی صورت میں جزا سے نوازے اور ناکامی کی صورت میں سزا دے۔ یہ وہ پورا پراسس ہے جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن تفکر کرنے والے کے غور وفکر پر اعتماد کرتے ہوئے صراحت سے ذکر نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ جب وہ زمین وآسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں تو غور وفکر کے نتیجے میں بالآخر وہ اپنے رب کو پکارنے لگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس دنیا کی کسی چیز کو باطل پیدا نہیں کیا۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد اور کوئی نہ کوئی منزل ہے۔ یقیناً میری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن اس مقصد کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہوگی جو کامیاب ٹھہرا وہ نوازا جائے گا اور جو ناکام ہو گیا وہ جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا۔ اس لئے اے میرے مالک! میں اپنی کمزوریوں کا واسطہ دیتا ہوں تو پاک ہے کہ کسی کو بے سبب پکڑے، تیری رحمت تیرے غضب سے وسیع ہے۔ تو تو سراپا معافی ہے، بندوں کو معاف کر دینا تیرا شیوہ ہے۔ تو کبھی کسی کو ناحق سزا نہیں دیتا۔ اگر تو مجھے پکڑے گا تو میری خطاؤں پر پکڑے گا یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے اور جہنم کے عذاب سے بچالے کیونکہ جہنم کا عذاب صرف عذاب نہیں وہ ایسی رسوائی ہے جس کی برداشت کسی کے بس میں نہیں۔ جسے تو جہنم میں داخل کرتا ہے تو اسے رسوا کر دیتا ہے۔ ساری دنیا کے سامنے اس کی رسوائی کا اعلان ہوتا ہے۔ یا اللہ! ہمیں اس رسوائی سے محفوظ رکھنا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ظالموں کو تیرے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں اور کسی کو تیرے فیصلے کے خلاف مدد کرنے کی جرأت نہیں۔

ظلم کا مفہوم

ظلم کہتے ہیں: وضع الشیء فی غیر محله ''کسی چیز کا ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی جگہ نہ ہو، کسی چیز کا ایسا استعمال جو اس کا صحیح استعمال نہ ہو''۔ اس لحاظ سے جو آدمی اللہ کی کسی طرح بھی نافرمانی کرتا ہے وہ اپنے جسم وجان پر ظلم کرتا ہے۔ اللہ نے سر اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اس کے سامنے جھکے۔ جو شخص غیر اللہ کے سامنے سر جھکاتا ہے وہ اپنے سر پر ظلم کرتا ہے۔ جسم کا ایک ایک رونگٹا اللہ کی عبادت کیلئے وجود میں آیا ہے۔ جب وہ غیر اللہ کی خدمت میں استعمال ہوتا ہے تو وہ ظلم کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ جان بوجھ کر اپنی صلاحیتوں کو لادینی قوتوں کی خدمت کیلئے کام میں لاتے ہیں وہ اپنے آپ پر ظلم ڈھاتے ہیں یہی وہ ظالم ہیں جن کا قیامت کے دن کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

(اے ہمارے رب! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت دے اپنے وفادار بندوں کے ساتھ ۝ اے ہمارے رب! ہمیں عطا کر وہ سب کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا) (۱۹۳ تا ۱۹۴)

Marfat.com

اربابِ دانش کی دعائیں

اولوالالباب یعنی عقل مند لوگ جن کے عقلمند ہونے کا اللہ کے ہاں اعتراف ہے۔ وہ مخلوقات کو دیکھ کر خالق تک پہنچتے ہیں۔ پھر اس کائنات کی تخلیق میں غوروفکر اور تفکر کا عمل جاری رکھتے ہیں تو بالآخران کی فراست پر یہ نکتہ فاش ہوتا ہے کہ اللہ نے کسی چیز کو بے مقصد پیدا نہیں فرمایا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جو کائنات کا گل سرسبد ہے اس کا کوئی مقصدِ حیات نہ ہو؟ اس طرح وہ مقصدِ حیات تک پہنچنے کے بعد اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اثاثہ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں آخرت میں جہنم کے عذاب سے بچانا کیونکہ مقصدِ حیات عطا ہونے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ اس مقصد سے متعلق باز پرس کیلئے کوئی دن نہ آئے۔ یقیناً ایک دن ایسا آنے والا ہے جسے آخرت یا قیامت کہا جاتا ہے۔ اس میں اگر مقصدِ حیات کی تعمیل اور تکمیل میں کوتاہیاں رہ گئیں تو اندیشہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے واسطہ پڑے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ تو وہ رسوائی ہے جس سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آدمی اللہ کے دامن میں پناہ لے لے رسول کی پکار کو سمجھے اور آگے بڑھ کر اسے قبول کرلے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ان عقلمندوں کا یہ اعزاز ذکر کیا جارہا ہے کہ چونکہ وہ قلبِ منیر، عقلِ سلیم اور روشن دماغ کے لوگ ہیں اس لئے جیسے ہی انہوں نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ جو ایمان کے لئے پکار رہا ہے اور ترغیب دے رہا ہے کہ لوگو اپنے رب کو مانو اس پر ایمان لاؤ اور اس کی تصدیق کرو۔ چنانچہ عقلمند لوگ اپنی عقلِ رسا کے باعث اور اللہ کی توفیق سے اس پکارنے والے کی پکار کی طرف بڑھے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے حالانکہ انہوں نے نہ تو پیغمبر سے کوئی معجزہ طلب کیا نہ دلیل مانگی، انہوں نے جب دیکھا کہ یہ پکار ہمارے تفکر کے نتیجے کے عین مطابق ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ پکار ہمارے اندر سے اٹھ رہی ہے اور پھر مزید یہ کہ پکارنے والے کی دلآویز شخصیت جس پر معصومیتیں قربان ہو رہی ہیں، جس کی دلآویزی دلوں کو کھینچ رہی ہے، جس کا مستحکم لہجہ اللہ کی آواز معلوم ہوتا ہے، جس کا اپنی دعوت سے گہرا تعلق، گہرا انہماک اور دعوت کیلئے ہر طرح کا ایثار خود بول رہا ہے کہ میں ایک سچائی ہوں جو دنیا کے سب سے بڑے سچے انسان کی زبان پر آ گئی ہے۔ چنانچہ عقلمندوں نے اس سچائی کو قبول کیا اور حالات کی ناساعدت کے باوجود نہایت جرأت سے اس کا اعلان بھی کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اب تک جو زندگی گزاری ہے اس میں نہ تو مقصدِ حیات کا شعور تھا نہ اس کے مطابق زندگی گزارنے کی تڑپ، ایک بہیمانہ زندگی تھی جو زندگی کی ضروریات کیلئے شب و روز کی مساعی میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں نہ جانے کیسے کیسے جرائم کیے اور کیسی کیسی قبیح حرکتیں عادتیں بنتی چلی گئیں۔ اب اللہ نے ایمان کی دولت دی ہے تو ان بری عادتوں اور قبیح ماضی کا کیا علاج ہوگا۔ اس لئے سب سے پہلے اپنے گناہوں اور اپنے جرائم کا تصور کر کے اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ اب تک جو کچھ بے خبری یا جہالت سے ہوتا رہا ہے اسے معاف فرمادے۔ قیامت کے دن اس کی باز پرس نہ کرنا۔ جس طرح تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والا شخص اپنی ٹامک ٹوئیوں میں معذور سمجھا جاتا ہے اسی طرح ہماری گذشتہ زندگی بھی تاریکی میں گزری اور اس میں ہم نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ اس لئے ہمیں معذور سمجھ کر ان گناہوں کو معاف کر دیا جائے اور دوسری دعا یہ فرمائی کہ یا اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف بھی فرما لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی التجا ہے کہ برے دنوں میں جو بری عادتیں ہماری طبیعت کا حصہ بن گئی ہیں اور جن کمزوریوں کے ہم خوگر ہو کر رہ گئے ہیں ان میں ایک ایک برائی اور ایک ایک کمزوری کو ہم سے دور فرمادے تاکہ ہم آزاد ہو کر نئی زندگی کی بنیاد اٹھا سکیں۔ تیسری دعا یہ فرمائی کہ ہمارا مرنا ابرار کے ساتھ فرما۔ جس طرح ہم زندگی نیک لوگوں میں گزارنا چاہتے ہیں اسی طرح ہماری آخرت کا سفر بھی ابرار کے ساتھ ہونا چاہئے۔

Marfat.com

ابرار کا مفہوم

ابـرار ، بار کی جمع ہے۔ بـر ، ''وفاداری بشرطِ استواری، حقوق وفرائض کی بتمام وکمال ادائیگی اور ہر حال میں موت تک حق پر استقامت اور ثابت قدمی'' کو کہتے ہیں۔ایمان تو صرف حق کو قبول کر لینے کا نام ہے۔لیکن پوری زندگی اس حق پر گزارنا حق کیلئے اپنا وقت صرف کرنا اور مال دینا اور ضرورت پڑے تو اپنی جان اس پر قربان کر دینا یہ ''بـر'' ہے اور ایسا کرنے والے کو'بار' کہا جاتا ہے'ابرار'اس کی جمع ہے۔عقلمند لوگ اپنے اللہ سے آرزو کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی توفیق عطا فرما جس سے ہماری پوری زندگی اسلام کی تصویر بن جائے اور ہماری زندگی میں کبھی وہ وقت نہ آئے جب ہم حق سے روگرداں ہوں۔ہمیں موت آئے تو مسلمان ہونے کی حالت میں آئے اور اللہ کے وفادار بندوں کے ساتھ آئے کیونکہ حق پر ثابت قدمی اور استقامت ہی اللہ کے یہاں قابلِ اعتبار اور فضل وانعام کے لائق ہے۔زندگی بھر کی نیکیاں بھی آخری لمحوں کی بے وفائی سے بھسم ہو جاتی ہیں کیونکہ استقامت کے بغیر کوئی سا عمل بھی قابلِ لحاظ نہیں ٹھہرتا اور اگر اس میں استقامت ہو تو غالب کے نزدیک تو وہ کفر بھی اس قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔غالب نے اپنے ایک شعر میں اگرچہ شوخی کا اظہار کرتے ہوئے کسی حد تک حدودِ شریعت کو پامال کیا ہے لیکن اس کے شعر کی اصل روح وہی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔وہ کہتا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شاعر یہاں برہمن کو استقامت پر داد دے رہا ہے کہ اس کی استقامت تو ایسی ہے کہ جو کعبے میں گاڑنے کا تقاضا کرتی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ استقامت کفر پر ہے اسلام پر نہیں۔لیکن استقامت بجائے خود قابلِ تعریف ہے۔

چوتھی دعا ان عقلمندوں نے یہ کی کہ الٰہی ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صاحبِ ایمان اور صاحبِ عمل لوگوں کیلئے تو نے جو کچھ عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے اس میں ایک ایک بات پوری ہوگی۔لیکن ہمیں اندیشہ اپنی ذات سے ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان انعامات کا مستحق ثابت کر سکیں گے یا نہیں۔اس لئے التجا یہ ہے کہ جو کچھ آپ نے نیک بندوں کیلئے اپنے رسولوں کے واسطے سے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اسے ضرور عطا فرمائیے۔ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائیے،ہماری فروگزاشتوں کو رحمت سے دھوڈالئے کیونکہ اگر آپ نے ہم نالائقوں کی نالائقی دیکھ کر اپنے وعدوں کا ایفا روک لیا تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی رسوائی ہوگی جس کے دور ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔مشرکین اور منافقین ہم پر ہنسیں گے کہ انہوں نے دنیا کی ہر نعمت سے محض اس لئے منہ پھیر لیا تھا کیونکہ انہیں آخرت میں بیش بہا نعمتوں کے ملنے کا یقین تھا اور اگر قیامت میں وہ نعمتیں نہ ملیں یا دنیا میں وہ وعدے پورے نہ ہوئے تو دشمنانِ دین ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ہم پر پھبتی کسیں گے کہ یہ لوگ دنیا میں بھی بے سہارا اور محرومی کی زندگی گزارتے رہے اور آج آخرت میں بھی ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا

Marfat.com

وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝

(پس ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو سو جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ان سے ان کے گناہ دور کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہو گا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے) (۱۹۵)

قبولیتِ دعا

ان عقلمندوں کے نصیب کا کیا کہنا کہ ادھر انہوں نے اپنے رب سے دعائیں مانگیں ادھر درِ اجابت کھل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ انہوں نے جس طرح عاجزی اور بے چینی سے اپنے رب کو پکارا ان کے رب نے ان کو پذیرائی بخشتے ہوئے ان کی دعائیں قبول کر لیں۔ پرودگار فرماتے ہیں "اب تمہیں مطمئن رہنا چاہئے میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، یہ اندیشہ دلوں سے نکال دو کہ تمہاری فروگزاشتیں تمہارے اعمالِ صالحہ کو لے بیٹھیں گی۔ میں تمہاری غلطیوں سے درگزر کروں گا اور تمہارے ہر مخلصانہ عمل کو ضائع ہونے سے بچاؤں گا"۔ ضائع ہونے سے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دانہ گندم ضائع ہونے سے بچ جائے تو وہ پھوٹتا اور برگ وبار لاتا ہے۔ جو گٹھلی سڑنے سے محفوظ رہے اس سے ایک سوئی پھوٹتی ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک بلند و بالا درخت کی صورت اختیار کرتی ہے اور یہ درخت کبھی سایہ دیتا ہے اور کبھی پھل عطا کرتا ہے۔ اسی طرح ان مسلمان عقلمندوں کے اعمال جب ضائع ہونے سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے گا تو پھر اپنی رحمت کے سائے میں انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دے گا۔ دنیا میں ان کے اعمال غلبۂ دین کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے اور آخرت میں جنت کے محلات کی صورت اختیار کر جائیں گے۔

اعمال کی میزان میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں

مزید فرمایا کہ اس میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں جس طرح مردوں کے اعمال اپنے روحانی ثمرات حاصل کریں گے اسی طرح عورتوں کے اعمال بھی اپنے طبعی منطقی اور روحانی نتائج کو پہنچیں گے۔ اس کے بعد اس کی دلیل بیان فرمائی: بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ "تم ایک دوسرے سے ہو" یعنی عورتوں اور مردوں میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں ایک ہی جنس سے اور ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ دونوں کا دین ایک ہے، دونوں کا خدا ایک، دونوں کا نبی ایک اور دونوں کی کتاب ایک۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اجر وثواب کے حوالے سے مرد کو عورت پر ترجیح حاصل ہو۔ یہ وہ رعد آسا اعلان ہے کہ جسے دنیا نے پہلی بار سنا ورنہ اس سے پہلے مرد و عورت کی برابری کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کوئی مذہب عورت کو جائز حقوق دینے کیلئے تیار نہ تھا، کسی سماج نے عورت کو انسانی احترام دینے کیلئے بھی آمادگی ظاہر نہ کی تھی۔ بعض معاشرے تو ایسے تھے جس میں عورت کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسی دنیا میں اجر وثواب میں عورت کی مرد کے ساتھ برابری کا اعلان ایک ایسی بات تھی جس کی جسارت صرف اللہ کی کتاب ہی کر سکتی تھی اور جس کا اعلان صرف اللہ کے نبی کی زبان ہی سے ہو سکتا تھا۔

Marfat.com

فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا ...... الخ سے ان حالات کی طرف اشارہ ہے جن حالات میں اللہ کے یہ عظیم بندے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اور غلام بھی جرأت واستقامت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک نئی تاریخ رقم کررہے تھے۔ایک مدت تک اذیتیں برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی صعوبتیں اٹھائیں، گھروں سے نکالے گئے اور اللہ کے راستے میں ہر ممکن ایذائیں پہنچائی گئیں۔ جہاد وقتال کی نوبت آئی تو آگے بڑھ کر حقِ شجاعت ادا کیا، لڑے بھی اور شہید بھی ہوئے۔ایسے لوگ تو اس قابل ہیں کہ انہیں ان کی قربانیوں کا بیش از بیش صلہ ملے۔اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں عورتیں اور غلام اذیت کا زیادہ نشانہ بنائے گئے، معاشرے میں جس کو کمزور دیکھا گیا اس کیلئے ظلم برہنہ ہوگیا۔اذیتوں کے دانتوں کی تیزی بڑھ گئی۔ آج بھی اگر ان کے حالات پڑھیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ان کمزور لوگوں کیلئے بطورِ خاص یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرے گا ہر ایک کو اجر وثواب سے نوازے گا۔ مرد بھی نوازے جائیں گے اور عورتیں بھی۔ آزادوں کو بھی مالا مال کیا جائے گا اور غلاموں کو بھی۔ اللہ کی رحمت کے استحقاق میں یہ سب لوگ برابر ہیں، کسی کو کسی پر کوئی ترجیح حاصل نہیں۔

''ثواب''عمل کا ردِ عمل

آیت کے آخری ٹکڑے میں اللہ نے اپنے عاجز بندوں کا مرتبہ اور مقام بڑھانے اور ان کے اعمال کی قدر وقیمت میں اضافے کیلئے ارشاد فرمایا: ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (یہ اللہ کی جانب سے ثواب ہے) ثواب ''عمل کے ثمرے اور نتیجے'' کو کہتے ہیں اچھے عمل کا نتیجہ اور ردِ عمل اچھا ہوتا ہے اور برے کا برا۔ بندوں کے اعمال کو دیکھتے ہوئے ان کے اجر وثواب کے حوالے سے کوئی بڑی بات کہنا آسان نہیں کیونکہ عمل کی پذیرائی کیلئے جس تقویٰ اور اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے اس میں بار بار شگاف پڑتے اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ایسے اعمال کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہی بجائے خود محلِ نظر ہے۔کہاں اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس اور کہاں معمولی انسان۔لیکن اللہ تعالیٰ جب قدر افزائی فرماتے ہیں تو ان کی عنایات کا کیا ٹھکانہ ہے۔فرماتے ہیں کہ تمہیں اللہ کی جانب سے جو کچھ ملے گا وہ اس کی عطا ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے اعمال کا ردِ عمل اور صلہ بھی ہے اور یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے تمہارے پتھروں کو ہیروں کی قیمت دی ہے اور اس کی سخاوت کے خزانوں میں اس بات کی کمی نہیں کہ وہ جتنا چاہے کسی کو عطا کردے کیونکہ حسنِ ثواب تو اسی کے پاس ہے۔

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ○ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ○

(تجھے مغالطہ میں نہ ڈالیں ملک میں سرگرمیاں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ○ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کیلئے ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے ○ لیکن جن لوگوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تو پہلی مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو ابدی نعمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں اس کے وفادار بندوں کیلئے) (۱۹۶ تا ۱۹۸)

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لَا یَغُرَّنَّکَ میں ''ک'' ضمیر واحد کیلئے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خطاب ہر مسلمان کیلئے ہے۔آیت کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب مدینے میں خصوصاً اور جزیرۂ عرب میں عموماً کفر کا پلڑا بھاری تھا۔ملک کے تمام ذرائع کافروں کے قبضے میں تھے ہر شہر میں ان کی سرگرمیاں غالب حیثیت رکھتی تھیں۔مسلمان ابھی تک کوئی بڑی طاقت بن نہیں سکے تھے۔ایسی صورتحال میں کمزور مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اگر ہم حق پر ہیں اور کفر ناحق پر، تو پھر کفر کا پلڑا بھاری کیوں ہے؟ ہر جگہ بات ان کی چلتی ہے، دولت کے منابع پر ان کا قبضہ ہے۔وہ کسی وقت بھی مسلمانوں کیلئے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔اللہ کے آخری نبی کی تشریف آوری کے بعد تیزی سے اس صورتحال کو بدلنا چاہئے لیکن اس میں تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔اس آیتِ کریمہ میں اس غلط فہمی کو دور فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جو کفار کی چلت پھرت، دوڑ بھاگ اور کاروبار کی فراوانی نظر آتی ہے یہ چند روزہ زندگی کا محدود سامان اور محدود لطف اندوزی کا ذریعہ ہے۔ان کی بنیادیں اکھڑ چکی ہیں، ان کی فکر صلابت سے محروم ہے، ان کے اعمال نیکی اور خیر سے خالی ہیں۔ان کے پاس کوئی مقصدِ حیات نہیں، خواہشات کی دنیا میں جیتے اور مرتے ہیں۔وہ اس دنیا کو صرف لطف اندوزی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔مسلمانوں کی قوت اگرچہ کم ہے لیکن اس قوت میں ایک ارتقاء ہے، یہ ایک صالح بیج کی طرح آہستہ آہستہ برگ و بار لا رہا ہے۔یہ جیسے جیسے بڑھے گا ویسے ویسے معاشرے کیلئے سکون واطمینان کا ذریعہ بنے گا۔اس کے برعکس کفر کا انجام یہاں ناکامی اور رسوائی ہے اور آخرت میں جہنم ان کا ٹھکانہ ہے۔

ایک دوسرے پہلو سے اس آیتِ کریمہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کیلئے تسلی بھی ہے اور آنے والے دنوں کی پیشگوئی بھی کہ تمہیں بظاہر کفر کی سرگرمیاں اور دوڑ بھاگ ان کی قوت اور طاقت کا اظہار معلوم ہوتی ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے وہ اس قوت سے بالکل محروم ہو چکے ہیں جو قوت کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ان کے پاس جو کچھ ہے وہ مصنوعی اور تصنع ہے۔ان کا وہی حال ہے جو اقبال نے تہذیبِ مغرب کے بارے میں کہا:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

کفر ایک ایسی دیوار کی مانند ہے جو ہل چکی ہے اور گرنا جس کا مقدر ہو چکا ہے۔اس کے برعکس مسلمان صحیح نظریات اور صالح عمل کی وجہ سے ایک ابلتی ہوئی قوت ہیں۔ان کی سرفروشیاں اور ان کی مخلصانہ جدوجہد بہت جلد صالح نتائج پیدا کریں گی۔

جہاں تک آخرت کا تعلق ہے یہاں اگرچہ مسلمان تنگ دستی سے دن گزار رہے ہیں لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کیلئے وہ باغات مہیا فرمائے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔اہلِ جنت ہمیشہ اس میں رہیں گے انہیں یہ کھٹکا نہیں ہوگا کہ ہمیں کبھی یہاں سے نکلنا بھی ہوگا۔یہ اتنا بڑا انعام اللہ کی طرف سے ''نزل'' کے طور پر ہوگا۔نزل عربی زبان میں اس ضیافت کو کہتے ہیں جو میزبان مہمان کے گھر پہنچتے ہی فوری مہمانی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ہمارے معاشرے میں بھی جب مہمان آتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں ٹھنڈے یا گرم کا پوچھا جاتا ہے یعنی کوئی مشروب پلایا جاتا ہے یا چائے پیش کی جاتی ہے اور ساتھ ہی میزبان یہ کہتا ہے کہ ابھی آپ اس سے دل بہلائیے کھانا تیار ہوتا ہے تو پھر کھانا کھاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ بھی اپنی بے کراں جنت اور ہمیشہ رہنے کی سند ابتدائی مہمانی کے طور پر پیش

Marfat.com

فرمائے گا۔ اس کے بعد مسلسل نعمتوں کی بارش ہوگی۔ ہر نئی نعمت گزشتہ نعمت کی یاد بھلا دے گی۔ آئے دن ملنے والی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ کسی دل میں نہ ان کا خیال گزر سکتا ہے، نہ کسی کے مشاہدے میں آسکتی ہیں اور نہ بصارت ان کی متحمل ہوسکتی ہے۔ ان کا ہلکا سا تصور دینے کیلئے صرف یہ فرمایا: وَمَا عِنْدَاللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ابرار یعنی اللہ کی عبادت و اطاعت اور اس سے محبت میں زندگی کے آخری لمحے تک ثابت قدمی دکھانے والوں کیلئے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ سب سے بہتر ہے۔ اللہ کے پاس کیا ہے، ایک بندے کی مجال نہیں کہ وہ اس پر رائے دے سکے۔ جب پروردگار اسے سب سے بہتر قرار دے رہے ہیں تو انسان کے خیال میں پرواز کی وہ قوت کہاں جو اس کی بہتری کا اندازہ کرسکے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کیا کچھ عطا فرمائے گا۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

(اور بے شک اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر بھی جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان پر اتاری گئی ہے اللہ سے ڈرتے ہوئے وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) (۱۹۹)

اہلِ کتاب میں صاحبِ ایمان لوگوں کی تحسین

ہم نے دیکھا ہے کہ اس پوری سورۃ میں اہلِ کتاب کے افعال و اعمال پر شدید تنقید ہوئی ہے اور بعض جگہ تو شدید مذمت سے کام لیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کا انداز چونکہ انتہائی منصفانہ ہے وہ گفتگو کے کسی مرحلے پر بھی تنقید کو عدل و انصاف کی حدود سے نکلنے نہیں دیتا۔ یہاں بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ عدل کے پلڑوں کو درست رکھنے کیلئے اگر مذمت ضروری ہے تو اس طبقے کی تعریف بھی ہونی چاہئے جو اسلام کی آغوش میں آیا اور اس نے اسلامی خدمات سرانجام دیں۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ کی بڑی تعداد غیر مسلم رہی لیکن ان میں ایک قابلِ ذکر تعداد مسلمان بھی ہوئی۔ خاص طور پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے علماء کا اسلام قبول کرلینا مسلمانوں کیلئے بڑی قوت کا باعث بنا۔ یہاں اسی گروہ کی تحسین کی جارہی ہے۔ نئی بنیادوں پر اٹھنے والے اور نئی نظریاتی شکل اختیار کرنے والے معاشروں میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی گروہ کی ایک محدود اقلیت کسی دوسرے نظریاتی گروہ کا ساتھ دیتی ہے تو ادھر ادھر سے نگاہیں کبھی حیرانی سے اور کبھی شک کی نمائندہ بن کر ان کی نگرانی کرنے لگتی ہیں۔ انہیں اس بات کا مشکل سے یقین آتا ہے کہ یہ لوگ واقعی وفادار ہوں گے۔ ایسی صورتحال میں خود وہ لوگ اخلاص رکھتے ہوئے بھی اپنے انجام کے بارے میں یکسو نہیں ہوتے، اس لئے پروردگار نے یہ ضروری سمجھا کہ ان نئے آنے والوں کی تحسین کی جائے تاکہ ناقدانہ نگاہیں اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور یہ نئے آنے والے لوگ اپنے انجام کے بارے میں یکسو ہوسکیں۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت اس آیتِ کریمہ میں نہ صرف ان کی تحسین فرمائی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی اور یہ کہہ کر ان کے اجر و ثواب میں اضافے کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم جس طرح

Marfat.com

نبی کریم ﷺ اور قرآنِ کریم پر ایمان لائے ہو اسی طرح تم اپنے پہلے مذہب اور پہلی کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہو۔ ان دونوں میں کوئی بُعد نہیں اور پھر ان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا ایمان صرف زبانی ایمان نہیں بلکہ ان کے دل خشوع کی دولت سے مالا مال ہیں اور ان کے رویے میں حُبِ دنیا کے غلبے کی بجائے اسلام سے محبت غالب ہے۔ ساری قوم یہود حبِ دنیا کی اسیر ہو کر ہر اخلاقی قدر سے تہی دامن ہو گئی ہے۔ لیکن یہ ان میں سے نکلنے والا خالص سونا خزف ریزوں کو ہیرے سمجھنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ اللہ کی آیات کے بدلے میں پوری دنیا کو بھی لینے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کے مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اجر اللہ کے پاس ہے اور وہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اس اجر و ثواب کے ملنے میں تاخیر ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سریع الحساب ہے۔ وہ تیزی سے حساب کرنے والا ہے وہ جس طرح سزا دینے کیلئے تیزی سے حساب کرتا ہے اسی طرح جزا دینے اور نوازنے کیلئے بھی تیزی سے حساب کرتا ہے۔ نہ کوئی اس کی سزا سے بچ سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کے انعامات سے محرومی کا شکوہ ہو گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(اے ایمان والو! صبر کرو، ثابت قدم رہو، مقابلے کیلئے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ) (۲۰۰)

یہ اس سورۃ کی آخری آیتِ کریمہ ہے جس میں وہ تمام ہدایات دے دی گئی ہیں جو شریعت کے حقوق ادا کرنے اور جن حالات سے مسلمان گزر رہے تھے ان سے عہدہ برآہ ہونے کیلئے ضروری تھیں۔ یہ چار ہدایات ہیں۔ جن میں سے تین الگ الگ ہیں اور چوتھی کا ہر ایک سے تعلق ہے۔

پہلی ہدایت

پہلی ہدایت یہ ہے کہ اے مسلمانو! صبر کرو۔ صبر کے لفظی معنی "روکنے اور باندھنے" کے ہیں۔ قرآن و سنت کی اصطلاح میں شریعت کے اتباع میں خلافِ طبع چیزوں پر نفس کو جمائے رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱. **صبر علی الطاعات** اللہ اور اس کے رسول نے جن احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور جس رویے کو اپنانے کی تاکید فرمائی ہے اور پسند اور ناپسند کے جو معیارات ٹھہرائے ہیں ان پر نفس کو جمائے رکھنا صبر علی الطاعات ہے۔ نفس عام طور پر کسی پابندی کو قبول نہیں کرتا، خاص طور پر ایسی پابندی جس میں محنت اور مشقت کرنی پڑے وہ تو اسے بالکل گوارا نہیں۔ ایسے تمام معاملات میں نفس کو اس کی طبیعت کے خلاف چلانا اور اس کا پابند بنانا صبر علی الطاعات کہلاتا ہے۔

۲. **صبر عن المعاصی** جن چیزوں اور جن کاموں سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے، چاہے وہ نفس کو کیسی ہی مرغوب کیوں نہ ہوں ان سے نفس کو روکے رکھنا اور ان کے قریب نہ جانے دینا صبر عن المعاصی ہے۔

۳. **صبر علی المصائب** اللہ کے دین پر چلنا اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا ایک ایسا مشکل کام ہے جس میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی ہیں۔ خواہشاتِ نفس سے تصادم ہوتا ہے، جھوٹی امنگوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، بعض دفعہ صحیح راستے پر

Marfat.com

استقامت کی وجہ سے اصحابِ اقتدار ناراض ہو جاتے ہیں یا معاشرہ بگڑ جاتا ہے یا عزیز و اقارب تک ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگتے ہیں ۔شریعت کی پابندی میں جوسمٹ کر زندگی گزارنی پڑتی ہے، بیوی بچے بعض دفعہ اس کے خلاف سرتاپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ایسے تمام احوال میں اللہ کی شریعت پر جمے رہنا اور ہر طرح کے مخالف حالات کا مقابلہ کرنا اور تکلیفیں آئیں تو انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور حق سے کبھی روگردانی نہ کرنا یہ صبر علی المصائب ہے۔

آیتِ کریمہ میں ان تمام قسموں کے صبر پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

دوسری ہدایت

دوسری چیز جو آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔وہ ہے ''مصابرت''۔یہ لفظ صبر سے ماخوذ ہے۔لیکن اس کا معنی صبر سے کچھ مختلف ہے۔اس کے معنی ہیں ''دشمن کے مقابلے میں نہ صرف ثابت قدم رہنا بلکہ دشمن، دین دشمنی اور مسلم دشمنی میں جتنا ثابت قدم ہے اس سے زیادہ ثابت قدمی دکھانا اور اس وصف میں اس سے بازی لے جانے کی کوشش کرنا''۔قرآنِ کریم نے بعض مواقع پر اس مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ تم جو راہِ حق میں تکلیفیں اٹھاتے ہو تو یہ اگر چہ نہایت قابلِ تعریف بات ہے لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ آج کی ایک ایک تکلیف قیامت کے دن اللہ کی جانب سے اجر و ثواب کا ایک چمن بن جائے گی۔جس میں جابجا تعریف و تحسین اور نعمت و انعام کے پھول کھلے ہوں گے۔اس وقت مومن تمنا کرے گا کہ کاش! میں نے اس سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہوتیں حتی کہ میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تا کہ آج میں اس کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ پاسکتا۔اجر و ثواب کی یہ امید ایک ایک مومن کو بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی ہے ۔لیکن کافر جنہیں دوسری دنیا کا یقین ہی نہیں وہ صرف اسی دنیا کی نعمتوں کیلئے لڑتے ہیں اور اسی دنیا کی بقا و قیام انہیں تکلیفیں اٹھانے پر اکساتا ہے۔کتنی دفعہ وہ اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا کیونکہ انہیں تو مر کر فنا ہو جانا ہے ۔تو وہ اس ناامیدی میں بھی اگر اتنے دکھ اٹھاتے اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیتے ہیں تو مسلمانوں کو تو ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مصابرت کا ثبوت دینا چاہئے کیونکہ

ترجون من الله مالا يرجون (تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے)

مسلمانوں کو مصابرت کا حکم اس لئے بھی دیا جا رہا تھا کہ اس وقت مسلمانوں اور کافروں میں مسلح کشمکش شروع ہو چکی تھی۔کفر اپنی پوری قوت میدان میں جھونک چکا تھا۔جزیرۂ عرب کی مسلمان دشمن قوتیں ایک اتحاد بنا چکی تھیں وہ ہر قیمت پر اس نوزائیدہ قوت کو فنا کر دینا چاہتی تھیں۔ایسی صورتحال میں مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہارے وسائل تو ان کے وسائل کا مقابلہ نہیں کر سکتے ،البتہ! وہ چیز جو جنگ میں فیصلہ کن ہوتی ہے اور جس سے تم کفر کو شکست دے سکتے ہو وہ تمہارے کردار کی پختگی استقلال اور ثابت قدمی ہے۔بڑی بڑی جماعتیں وسائلِ جنگ سے مالا مال لیکن اس اخلاقی قوت سے محروم ہونے کی وجہ سے تاریخ میں عبرت کا نشان بن گئیں۔تمہیں پامردی اور استقلال سے ان پر ثابت کرنا ہے کہ تم اخلاقی توانائی اور استقلال میں ان سے ہر لحاظ سے بہتر ہو۔اس کا نتیجہ انشاء اللہ یہ ہوگا کہ اثر قبول کرنے والی طبیعتیں تمہاری طرف مائل ہوں گی اور ہٹ دھرم قوتیں میدان سے پسپا ہو جائیں گی یا شکست و ریخت کا شکار ہو جائیں گی (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

Marfat.com

تیسری ہدایت

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے وہ "مرابطہ" ہے۔ مرابطہ کا لفظ "ربط الخیل" سے بنا ہے۔ اس کے اصلی معنی "باندھنے" کے ہیں۔ اسی وجہ سے رباط اور مرابطہ کے معنی "گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری" کے لئے جاتے ہیں یعنی دشمن کے مقابلے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کیلئے جنگی گھوڑے تیار رکھنا اور آج کی زبان میں ہر طرح کے جدید ہتھیار فراہم کرنا مرابطہ کے مفہوم میں شامل ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جنگ کی سب سے بڑی ضرورت چونکہ جنگی گھوڑے تھے اس لئے یہاں گھوڑے باندھنے کا ذکر فرمایا گیا ہے اور آج کے دور کے جنگی گھوڑے چونکہ ٹینک، جنگی طیارے، راکٹ اور ایٹم بم ہیں اس لئے اب ہر طرح کی مادی تیاری، اخلاقی اور روحانی تیاری کے ساتھ ساتھ جس کی جنگ میں ضرورت پیش آسکتی ہے، امتِ مسلمہ اور اس کے حکمرانوں کی شرعی ذمہ داری ہے۔ جس طرح نماز کی فرضیت کیلئے اقیموا الصلٰوۃ صیغہ امر استعمال ہوا ہے، اسی طرح دشمن کے مقابلے کیلئے ہر طرح کی تیاری اور طاقت کی فراہمی کیلئے بھی "اعدوا" امر ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے عالمِ اسلام میں ہر ملک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ممکن ذرائع سے کام لے کر اپنے ملک کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنا دے۔ نبی کریم ﷺ باوجود اس کے کہ اللہ کے آخری رسول تھے اور آپ کی نصرت و تائید کیلئے آسمان سے فرشتے اترتے تھے۔ آپ کی دعائیں مستجاب تھیں۔ بااین ہمہ! آپ نے وسائلِ جنگ کے سلسلے میں ممکن تیاری میں کبھی کوتاہی نہیں فرمائی۔ جو ہتھیار میسر آسکتے آپ انہیں ضرور مہیا فرماتے جنگ کی تیاری کیلئے مسلمانوں سے تعاون کی اپیل فرماتے۔ جنگِ حنین کے سلسلے میں ابنِ کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے۔

دو صحابی صرف اس لئے جنگِ حنین میں شامل نہ ہو سکے کیونکہ آپ نے انہیں شام کے مشہور صنعتی شہر "حبرش" میں بھیج رکھا تھا تا کہ وہ وہاں سے منجنیق، دبابہ اور ضبور کی صنعت سیکھ کر آئیں اور یہاں آکر وہ ہتھیار تیار کریں۔ دبابہ اور ضبور کو اس زمانے کے ٹینک سمجھنا چاہئے اور منجنیق تو مشہور ہتھیار ہے جو قلعوں کی دیواریں توڑنے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ جنگِ حنین میں خود آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے منجنیق تیار کی اور اس سے طائف کے قلعوں پر سنگ باری کی۔ مسلمان اپنی زندگی اور بیداری کے زمانے میں ہمیشہ اس ضرورت کیلئے فکرمند رہے اور صدیوں تک دنیا کی سب سے بڑی قوت بنے رہے۔ ایک طویل مدت تک سمندر پر صرف مسلمانوں کی حکومت تھی۔ ترکوں کے مقابلے میں کسی کو سمندر میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

مادی تیاری کے ساتھ ساتھ اسلامی جذبہ پیدا کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ نے سرحدوں کی حفاظت کے فضائل بیان فرمائے کیونکہ مرابطہ جس طرح جنگی تیاری کیلئے گھوڑے تیار رکھنے کا نام ہے اسی طرح سرحدوں کی حفاظت کیلئے بھی مستعد رہنے کا نام بھی ہے۔ اس لئے مختلف مواقع پر آنحضرت ﷺ نے اس کے فضائل بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ کے راستے میں ایک دن کا رباط تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" اور صحیح مسلم میں بروایت سلمانؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

Marfat.com

ایک دن یارات کا رباط ایک مہینہ کے مسلسل روزے اور تمام شب عبادت قمیں گزارنے سے بہتر ہے اور اگر وہ اسی حال میں مرگیا تو اس کے عملِ رباط کا روزانہ ثواب ہمیشہ اس کیلئے جاری رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا اور وہ شیطان سے مامون ومحفوظ رہے گا۔

چوتھی ہدایت

چوتھی چیز جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ ''تقویٰ'' ہے۔تقویٰ ''دل کی اس پاکیزگی، اخلاص، نیکی کی تڑپ، حقوق وفرائض کی پاسداری کا جذبہ اور ہر کام میں اللہ کی رضا کے حصول کے احساس'' کا نام ہے۔سورۃ البقرۃ میں چونکہ اس پر تفصیل سے بات ہو چکی ہے اس لئے مزید کچھ کہنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔البتہ! یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ تقویٰ دل ودماغ کی ایسی صفت ہے جو ایک مومن سے کبھی الگ نہیں ہو سکتی اور جس کے بغیر کوئی نیکی بھی بار آور نہیں ہوتی۔اس لئے موقعہ صبر کا ہو، مصابرت کا ہو یا مرابطہ کا ہر صورت میں تقویٰ کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر اعمالِ خیر میں وہ پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ اختتام کو پہنچی اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔اس کے درس میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی صحیح باتوں کو دل میں جگہ دے اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔آمین

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَانِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ ...

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ ...

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری ...

تفسیر روح القرآن

(جلد ...)

سورۃ البقرۃ آیت ...

سورۃ آل عمران

مولانا ...

Marfat.com